مجموعہ مقالات

مولانا وحید الدین خان

المکتبۃ الاشرفیۃ
جامعہ اشرفیہ ○ فیروزپور روڈ لاہور
پاکستان

مجموعہ مقالات

مولانا وحیدالدین خان

○

جلد اول

المکتبۃ الاشرفیہ

جامعہ اشرفیہ ○ فیروزپور روڈ ○ لاہور

پیغمبر اسلام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کے پیغام

کے بارے میں غیر مسلم علماء اور محققین کے مضامین

طبع فی المطبعة العربیة
۳۰- لیک روڈ، بالمقابل فرشی چیمبر، پرانی انارکلی، لاہور- پاکستان

فہرست مجموعہ مقالات

جلد اول

صفحہ نمبر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امریکہ سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے "ایک سو"۔ اس کتاب میں ساری انسانی تاریخ کے ایک سو ایسے آدمیوں کا تذکرہ ہے جنھوں نے، مصنف کے نزدیک، تاریخ پر سب سے زیادہ اثرات ڈالے۔ کتاب کا مصنف نسلی طور پر عیسائی اور تعلیمی طور پر سائنس داں ہے۔ مگر اپنی فہرست میں اس نے نمبر ایک پر نہ حضرت مسیح کا نام رکھا ہے اور نہ نیوٹن کا۔ اس کے نزدیک وہ شخصیت جس کو اپنے غیر معمولی کارناموں کی وجہ سے نمبر ایک پر رکھا جائے وہ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ آپ نے انسانی تاریخ پر جو اثرات ڈالے وہ کسی بھی دوسری شخصیت، خواہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی، نے نہیں ڈالے۔ مصنف نے آپ کے کمالات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

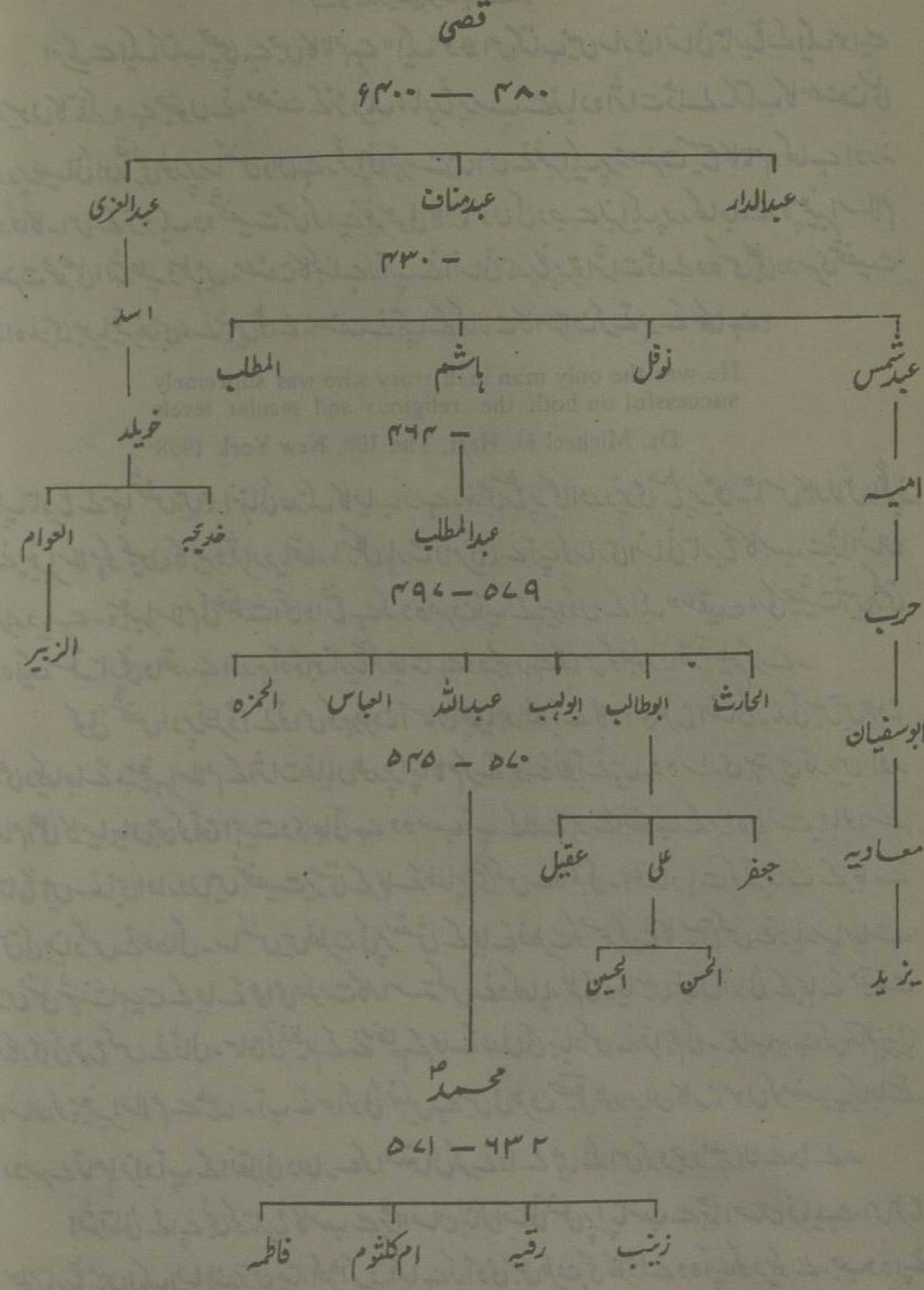
He was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels

Dr. Michael H. Hart, The 100, New York 1978

آپ تاریخ کے تنہا شخص ہیں جو انتہائی حد تک کامیاب رہے۔ مذہبی سطح پر بھی اور دنیوی سطح پر بھی۔ ٹامس کارلائل (انگریز) نے پیغمبر اسلام کو نبیوں کا ہیرو قرار دیا تھا۔ مائیکل ہارٹ (امریکی) نے آپ کو ساری انسانی تاریخ کا سب سے بڑا انسان قرار دیا ہے۔ پیغمبر اسلام کی عظمت اتنی واضح ہے کہ وہ صرف آپ کے پیروؤں کے ایک "عقیدہ" کی حیثیت نہیں رکھتی۔ وہ ایک مسلّمہ تاریخی واقعہ ہے اور ہر آدمی جو تاریخ کو جانتا ہے وہ مجبور ہے کہ اس کو بطور واقعہ تسلیم کرے۔

کوئی شخص اوپر نظر ڈالے تو اس کو ہر طرف آسمان چھایا ہوا نظر آئے گا۔ اسی طرح انسانی زندگی میں جس طرف بھی دیکھا جائے، پیغمبر اسلام کے اثرات نمایاں طور پر اپنا کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ساری بہترین قدریں اور تمام اعلیٰ کامیابیاں جن کو آج اہمیت دی جاتی ہے وہ سب آپ کے لائے ہوئے انقلاب کے براہ راست یا بالواسطہ نتائج ہیں۔ مذہبی اداروں میں شخصیت پرستی کے بجائے خدا پرستی کس نے قائم کی۔ اعتقادیات کو توہمات کے بجائے حق کی بنیاد کس نے عطا کی۔ سائنس میں فطرت کی پرستش کے بجائے فطرت کو مسخر کرنے کا سبق کس نے دیا۔ سیاسیات میں نسلی شہنشاہیت کے بجائے عوامی حکومت کا راستہ کس نے دکھایا۔ علم کی دنیا میں خیال آرائی کے بجائے حقیقت نگاری کی طرح کس نے ڈالی۔ سماج کی تنظیم کے لئے ظلم کے بجائے عدل کی بنیاد کس نے فراہم کی۔ جواب یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں انسان کو پیغمبر اسلام سے ملیں۔ آپ کے سوا کوئی نہیں ہے جس کی طرف حقیقی طور پر ان کارناموں کو منسوب کیا جاسکے۔ دوسرے تمام افراد آپ کے انقلابی دھارے کو استعمال کرنے والے ہیں نہ کہ اس کو وجود میں لانے والے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو تاریخ کا سب سے بڑا انسان بنا کر انسانی نسل پر اپنا سب سے بڑا احسان فرمایا ہے۔ اس طرح معلوم تاریخ میں ایک ایسا بلند ترین مینار کھڑا کر دیا گیا ہے کہ آدمی جس طرف بھی نظر ڈالے وہ آپ کو دیکھ لے۔ جب وہ اپنے رہنما کی تلاش میں نکلے تو اس کی نظر سب سے پہلے آپ پر پڑے۔ جب وہ حق کا راستہ جاننا چاہے تو آپ کا بلند و بالا وجود اس کو سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرے۔ آپ ساری انسانیت کے لئے ہادی اعظم کی حیثیت رکھتے ہیں، اسی لئے آپ کو اتنے بلند تاریخی مقام پر کھڑا کیا گیا ہے کہ کوئی آنکھ والا جب آنکھ اٹھائے تو آپ کو دیکھے بغیر نہ رہ سکے۔



محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مرۃ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان

حضرت محمدؐ

۱

جب وقت حضرت محمدؐ صاحب کے ظہور کا ہوا، ملک عرب میں بہت سی مذہبی، مجلسی اور اخلاقی برائیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ انسانی زندگی کو لوگ کھلونوں کی طرح بے حقیقت سمجھتے تھے۔ ذرا سی بات پر کسی کی جان لے لینا ان کے لئے محض تماشا تھا۔ عورتوں کو بہت ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ ایک ایک مرد آٹھ آٹھ دس دس بلکہ اس سے بھی زیادہ شادیاں کر سکتا تھا۔ لڑکیوں کا پیدا ہونا بہت برا خیال کیا جاتا تھا۔ لڑکیوں کو زندہ قبر میں دبا دیا جاتا تھا۔ غلاموں کی تجارت عام تھی۔ شراب خوری کی یہ حالت تھی کہ لوگوں کے گھروں میں گھڑے کے گھڑے بھرے رکھے رہتے تھے۔ لوگ شراب میں بدمست ہو کر بہت سی بے ہودہ کارروائیاں کرتے تھے۔ قمار بازی بہت زوروں پر تھی۔ بت پرستی کا یہ حال تھا کہ ہر ایک گھرانے اور خاندان میں علیٰحدہ علیٰحدہ بت موجود تھے۔

عرب کی اس افسوس ناک حالت کا نقشہ مولانا حالی صاحب نے اپنی مشہور نظم مسدس حالی میں خوب کھینچا ہے۔ جب عرب کی یہ حالت تھی تو ضروری تھا کہ اس کو دور کرنے کے لئے خداوند تعالےٰ کے اٹل قانون کے مطابق کوئی اس کا خاص بندہ آتا اور اس حالت کو دور کرتا۔

چنانچہ قریش قبیلے میں عبدالمطلب کے بیٹے عبداللہ کے ہاں ۲۹ راگست ۵۷۱ء کو حضرت محمد صاحب پیدا ہوئے۔ مگر افسوس کہ ان کے باپ ان کی پیدائش سے چند ماہ پیشتر ہی چوبیس برس کی عمر میں اس جہان سے چل بسے تھے، اور ان کے دادا عبدالمطلب نے ان کی پرورش کا انتظام کیا۔ کچھ روز ان کی والدہ حضرت آمنہ نے انھیں اپنا دودھ پلایا پھر ان کو ایک دایہ حلیمہ نامی کے سپرد کر دیا۔ ابھی چھ سال کے ہونے نہ پائے تھے کہ والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور کچھ عرصے بعد ان کے دادا بھی انتقال فرما گئے، اب ان کی پرورش ان کے چچا ابوطالب کے ذمے ہوئی۔

ان میں شروع سے ہی غور و فکر کی عادت تھی۔ اکثر چپ چاپ بیٹھے زندگی کے مختلف مسائل سوچا کرتے تھے۔ ان کے چچا ان کا دل بہلانے اور کچھ کاروبار سکھلانے کی غرض سے، جب وہ تجارت کے سلسلے میں باہر جاتے تو انھیں اپنے ساتھ لے جاتے۔ قدرت نے ان کے اندر شروع سے ہی راست بازی اور دیانت داری کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ بہت سے لوگ آ کر ان سے اپنے جھگڑوں اور تنازعوں کا فیصلہ کراتے تھے۔ ان سفروں میں پہاڑوں اور سمندروں کے نظاروں نے ان کے دل پر خدا کی قدرت کا سکہ خوب بٹھا دیا۔

۲

جب ان کی عمر پچیس برس کی تھی۔ تو انھیں خدیجہ نامی ایک بیوہ نے ان کی شہرت اور دیانت داری کا حال سن کر بلا بھیجا اور بہت سا مال دے کر تجارت کی غرض سے یمن کی طرف بھیجا۔ انھیں چچا کے ساتھ رہتے رہتے تجارت کا کافی تجربہ ہو گیا تھا۔ انھوں نے خدیجہ کے مال کو بہت نفع پر فروخت کیا۔ ان کو دوگنی تنخواہ پیش کی گئی۔ اور ان کی خوبیوں سے

متاثر ہوکر خدیجہ نے ان سے شادی کی درخواست کی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے چچا ابو طالب کے مشورہ سے خدیجہ کی درخواست منظور کر کے اس سے شادی کرلی۔ اس وقت خدیجہ کی عمر چالیس برس کی تھی۔ اور حضرت صاحب پچیس برس کے تھے۔ پندرہ سال کے بعد حضرت خدیجہ کا انتقال ہوگیا، اور انھیں بہت رنج ہوا۔ ان کی موت کے بعد اکثر حضرت صاحب بہت محبت اور شکر گزاری سے انھیں یاد کیا کرتے تھے۔ حضرت صاحب نے ایک غلام زید نامی کی حالت کم زور دیکھ کر اسے خدیجہ سے مانگ لیا اور فوراً آزاد کردیا۔ آزادی ملنے پر زید نے اپنے گھر جانا پسند نہیں کیا، بلکہ تمام عمر حضرت محمدؐ صاحب کے پاس رہنے کا فیصلہ کرلیا۔

حضرت صاحب اپنے ہم وطنوں کی جہالت اور خرابیوں کو دیکھ کر ہر وقت اداس رہتے تھے۔ اکثر تنہائی میں اپنا وقت گزارتے اور گڑگڑا کر خدا کی درگاہ میں دعا کرتے کہ اے خدا، انھیں گناہوں سے بچا اور ان کا دل اپنی طرف پھیر۔ آخر خدا نے ان کے پاک دل کو اپنے نور سے بھر دیا۔ اور یہ محسوس کرنے لگے کہ خدا چاہتا ہے کہ میں اس کا رسول بن کر لوگوں کو اس کی پرستش کی طرف راغب کروں۔ جب ان کی عمر چالیس برس کی تھی۔ اور غار حرا میں بیٹھے ہوئے خدا کے دھیان میں محو تھے، تو اچانک ایک آواز ان کے کان میں پڑی کہ "اے محمدؐ! اٹھ اور خدا کا نام لے کر پڑھ، تجھ پر وہ راستہ کھولا گیا ہے، جس کی تو تلاش میں تھا"۔ یہ آواز سن کر وہ کانپ اٹھے۔ گھبرائے ہوئے اور پسینوں میں تر گھر پہنچے اور سارا قصہ حضرت خدیجہ رضؓ کو سنایا۔ انھوں نے حضرت کو تسلی دی اور کہا کہ آپ خدا کے رسولؐ ہیں اور آپ کو ضرور کامیابی حاصل ہوگی۔ یہ کہہ کر وہ ان پر ایمان لائیں۔ اور بعد میں حضرت علیؓ، حضرت ابو بکرؓ اور حضرت زیدؓ اور چند لوگوں نے انھیں تسلیم کیا۔ اور ان پر ایمان لے آئے۔

تین سال تک تو حضرت محمدؐ صاحب چپکے چپکے اپنے چند دوستوں اور رشتے داروں کو خدا کا حکم سناتے رہے۔ آخر ایک دفعہ تمام اپنے رشتے داروں، دوستوں اور قبیلے والوں کو جمع کر کے ان کو بتلایا کہ میں خدا کی طرف سے تمھیں اس وحدہٗ لاشریک کی پرستش کی تلقین کرنے اور برائیوں سے بچانے کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ یہ سن کر لوگوں نے بہت شور مچایا۔ اور کہا کہ تو غلط کہتا ہے۔ مگر انھوں نے کچھ پرواہ نہیں کی اور باقاعدہ مختلف مقامات پر وعظ کرنا شروع کردیا۔ لوگوں نے حضرت کے چچا ابو طالب کے پاس جاکر کہا تو اپنے بھتیجے کو سمجھا کہ اس کفر سے باز آئے ورنہ ہم اس کے ساتھ بہت برا سلوک کریں گے۔ ابو طالب نے بہت سمجھایا کہ بیٹا مفت میں تم کیوں لوگوں سے بیر باندھتے ہو۔ مزے سے زندگی بسر کرو۔ نہ جانے یہ لوگ غصہ میں آکر کیا کر بیٹھیں۔ مگر محمدؐ صاحب نے کہا کہ چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے میں اپنے ارادے سے باز نہیں آسکتا۔ خدا نے میرے سپرد یہ کام کیا ہے۔ اس کا بجالانا میرا فرض ہے۔ چاہے ایسا کرنے میں میری جان تک بھی جاتی رہے۔ جب ابو طالب کو یہ معلوم ہوا کہ محمدؐ اپنے ارادے میں پہاڑ کی طرح مضبوط ہے تو کہا۔ اچھا کچھ ہی ہو میں تیری حفاظت کروں گا۔ چچا کی زبان سے یہ حوصلہ افزا الفاظ سن کر ان کا جوش بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اور خوب زور سے اپنے مشن کا پرچار کرنا شروع کردیا۔

اب حضرت صاحب کے پیروؤں کی تعداد روز بروز زیادہ ہوتی گئی اور ساتھ ہی ساتھ قریشیوں کی مخالفت بھی بڑھ گئی۔ انھوں نے ان کو طرح طرح کے لالچ دئے۔ دھمکیاں بھی دیں۔ ان کو قتل کرنے کا ارادہ بھی کیا۔ مگر انھوں نے ان کی

مخالفتوں کی مطلق پرواہ نہ کی۔ خود حضرت صاحب کے چچا ابولہب اور اس کی بیوی ان کے سخت مخالف ہو گئے۔ اور انھیں طرح طرح کی اذیتیں پہنچانے لگے یہاں تک کہ جب وہ صبح کو منھ اندھیرے عبادت کے لیے جنگل میں جاتے تو چچی ان کے راستے میں کانٹے بچھا دیتی اور ان کے پاؤں اور پنڈلیاں زخمی ہو جاتے۔ ایک دفعہ جب یہ نماز پڑھ رہے تھے تو ایک شخص نے ان کے گلے میں پٹکا ڈال کر گلا گھونٹنا چاہا۔ مگر حضرت ابوبکرؓ موقع پر پہنچ گئے اور انھوں نے ان کی جان بچائی۔ جب وہ کھانا کھانے بیٹھتے تو لوگ ان کے کھانے میں کوڑا کرکٹ گرا دیتے۔ کئی دفعہ ان پر گندگی پھینک دیتے۔ ان کی لڑکی کپڑوں پر پانی ڈالتی جاتی اور روتی جاتی۔ مگر یہ کہتے بیٹی کچھ پرواہ نہیں۔ خدا خود میری حفاظت کرے گا۔

اسی طرح ان کے پیروؤں کو بھی لوگ طرح طرح کی تکلیفیں دیتے تھے۔ ان کی چھاتیوں پر پتھر کی سلیں رکھ دیتے، ان کو گرم ریت پر لٹا دیتے۔ ان کی عورتوں کو ننگا کر کے بہت بے عزت کرتے۔ مگر یہ لوگ اعتقاد کے ایسے پکے تھے کہ ہر قسم کا دکھ اٹھا کر بھی اسلام کو نہ چھوڑتے اور ہر حالت میں خدا کا شکر کرتے۔

— ۳ —

قریش کے ظلم و ستم سے تنگ آکر بہت سے مسلمان حبش کے علاقے میں چلے گئے۔ اور وہاں کے عیسائی بادشاہ نجاشی کی پناہ لی لیکن وہاں بھی مخالفوں نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور بادشاہ سے جا کر کہا کہ ان لوگوں نے اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ دیا ہے۔ اور ایک نیا دین نکالا ہے۔ جو آپ کے دین کے بھی مخالف ہے۔ انھیں پناہ نہ دو۔ نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر سب حال دریافت کیا۔ اور جب جعفرؓ نے بادشاہ کو بتلایا کہ ہم لوگ پہلے جاہل تھے۔ بت پرستی کرتے تھے۔ گندی اور فحش باتیں بکتے تھے۔ لڑکیوں کو مار ڈالتے تھے۔ شراب پیتے تھے۔ جوا کھیلتے تھے۔ غرض ہر قسم کی بدکاریوں میں مبتلا تھے۔ خدا نے ہمارے لئے رسولؐ بھیجا۔ اور اس نے ہمیں نیکی کی طرف مائل کیا۔ یہ سن کر نجاشی کے دل پر بہت اچھا اثر ہوا۔ اور اس نے کہہ دیا کہ یہ میری پناہ میں آئے ہیں، میں انھیں یہاں سے نکال نہیں سکتا۔ یہ سن کر مخالفین اپنا سا منھ لے کر واپس چلے گئے۔

مسلمانوں کے حبش میں چلے جانے کے بعد حضرت صاحبؐ مکہ میں برابر وعظ کرتے رہے۔ اس اثنا میں دو زبردست ہستیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ایک تو خود ان کے چچا حمزہؓ جو بہت بارسوخ شخص تھے اور دوسرے عمرؓ جو بعد میں حضرت عمرؓ کہلائے۔ حضرت عمرؓ پہلے ان کے جانی دشمن تھے۔ اور تلوار گلے میں ڈال کر ان کے قتل کو نکلے تھے۔ مگر قرآن شریف کی چند آیتیں سن کر ان کے پیرو بن گئے۔ اور چار یاروں میں شمار ہونے لگے۔ جب ان کے چچا ابوطالب کا انتقال ہو گیا تو لوگوں کی مخالفت اور بھی بڑھ گئی۔ انھوں نے مکہ چھوڑ کر طائف میں قیام کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر وہاں کے لوگ پہلے ہی ان کے مخالف تھے۔ جب ان کا وعظ سنا تو بہت برافروختہ ہوئے۔ اور انھیں وہاں سے نکال دیا۔ مکہ والوں نے انھیں شہر میں داخل نہ ہونے دیا۔ مگر ایک شخص مطعم نامی نے لوگوں کو بہت لعنت ملامت کی اور کہا کہ میں محمدؐ کو اپنی پناہ میں لیتا ہوں۔ اس طرح وہ مکہ میں رہنے لگے۔ مگر شریر لوگ مخالفت سے کب باز آتے تھے۔ انھوں نے مطعم کو بھی تنگ کرنا شروع کر دیا۔ حضرت صاحبؐ نے جب دیکھا کہ میری وجہ سے بے چارے مطعم کو بھی سخت تکلیف دی جاتی ہے تو انھوں نے کہہ دیا کہ میں اب آپ کی پناہ میں رہنا نہیں چاہتا۔ خدا میرا محافظ ہے۔ جو ہوگا میں برداشت کروں گا۔ مجھے ہرگز یہ گوارا نہیں کہ میرے سبب سے آپ کو تکلیف ہو۔

اب ان کا وعظ سن کر بہت سے لوگ ان کے پیرو بن گئے۔ فضیل نامی رئیس جو اس ڈر سے کہ ان کا کلام اس کے کان میں نہ پڑ جائے اور اس پر اثر ہو جائے اپنے کان میں روئی ٹھونس لیتا تھا ایک دفعہ جلدی میں ٹھونسنا بھول گیا اور ان کا وعظ سن کر ان کا پیرو بن گیا۔ ایک دفعہ جب وہ تاجروں اور جاتریوں کو وعظ کر رہے تھے۔ تو چند مدینے کے لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ ان کا وعظ سن کر وہ ان کے پیرو بن گئے۔ اور اپنے ساتھ اسلام کا واعظ لے گئے۔ وہاں بہت لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ پھر ان کو مدینہ بلایا۔ چنانچہ بہت سے مسلمان مدینے چلے گئے۔ مدینہ والوں نے حضرت صاحب اور مسلمانوں کا بہت تپاک سے استقبال کیا۔ مسلمانوں کو اپنے گھروں پر ٹھیرایا۔ ان کو کاشت کے لئے اپنی زمینیں دے دیں اور ہر طرح ہر ان کو برادرانہ حقوق عطا کئے۔

حضرت صاحبؐ نے کچھ روز مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر قبا نامی آبادی میں قیام کیا۔ حضرت علیؓ بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہاں انھوں نے پہلی مسجد نماز کے لئے بنوائی۔ اس کے بنانے میں خود آپ نے صحابہ کے ساتھ مل کر مزدوروں کا کام کیا۔ مدینہ والوں کے زور دینے پر آپ مدینہ گئے۔ اور ارادہ کیا کہ جہاں میری اونٹنی ٹھیر جائے گی وہیں قیام کروں گا۔ چنانچہ حضرت ابوایوبؓ کے مکان کے پاس اونٹنی ٹھیر گئی اور آپ نے وہیں قیام کیا۔ وہاں اگرچہ زمین مفت ملتی تھی مگر آپ نے قیمت دے کر زمین خریدی اور یہاں انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ محنت مزدوری کر کے مسجد بنائی۔ اس وقت مسلمانوں کو آزادی کے ساتھ نماز پڑھنا نصیب ہوا۔ اور جمعہ کا دن جماعت کے ساتھ مل کر نماز پڑھنے کے لئے مقرر ہوا۔ مدینے میں مسلمانوں کی رہائش اور گزارے کا تسلی بخش انتظام کر کے آں حضرتؐ نے یہودیوں کے ساتھ عہد نامہ کر کے ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کر لئے۔ اگرچہ افسوس ہے کہ یہودی لوگ اپنے اقرار پر قائم نہ رہے۔ اور بعد میں مسلمانوں کے مخالفوں کے ساتھ سازباز کر کے انھیں بہت تکلیف دیتے رہے۔

۴

گو اب مسلمان مدینے میں امن وامان سے رہتے تھے۔ لیکن ان کے دشمنوں کو یہ گوارا نہ تھا۔ کہ وہ اس طرح پر آزادی سے اپنا کام کرتے رہیں۔ وہ تو چاہتے تھے کہ اگر ان کا بس چلے تو مسلمانوں کا نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔ انھوں نے عبداللہ نامی ایک شخص سے جو مدینے میں رہتا تھا اور دل ہی دل میں حضرت صاحب کا روز افزوں رسوخ دیکھ کر بہت جلتا تھا، خط وکتابت کرنی شروع کی اور اس سے کہا کہ حضرت صاحب کو مدینے سے نکال دے۔ مگر جب وہ کچھ نہ کر سکا تو اس نے اور مخالفوں نے آس پاس کے قبیلوں کو مسلمانوں کے برخلاف بہت بھڑکایا۔ اور یہ سب لوگ بہت سی جمعیت لے کر بدر کے مقام پر پہنچ گئے۔ آں حضرت جنگ نہ چاہتے تھے۔ مگر مسلمانوں کی حفاظت کے لئے خدا سے دعا کر کے تین سو آدمی لے کر آگے بڑھے اور ان جاں باز لوگوں نے ایک ہزار آدمیوں کو سخت شکست دی اور بہت سے آدمی قید کر لئے۔ حضرت محمدؐ صاحب نے ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا اور ضمانت لے کر انھیں چھوڑ دیا۔

اس شکست سے مخالفوں کو بہت صدمہ پہنچا۔ اور انھوں نے مسلمانوں سے بدلہ لینے کی زبردست تیاریاں شروع کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے تین ہزار آدمیوں کی زبردست فوج تیار کی اور بہت سا سامان جنگ جمع کیا۔ بہت سی

عورتیں بھی فوج کے ساتھ ہولیں۔ یہ فوج مدینے کی طرف روانہ ہوئی۔ حضرت صاحب نہیں چاہتے تھے کہ مقابلہ کیا جائے۔ مگر اور مسلمانوں کے زور دینے پر لڑائی کے لئے تیار ہو گئے۔ ان کے پاس صرف سات سو جوان تھے۔ خوب گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ دشمنوں کے بہت سے آدمی کام آئے۔ خود آنحضرت زخمی ہوئے۔ اس خبر سے مسلمان مایوس ہو گئے اور ان کی فوج میں کھلبلی مچ گئی۔ اس لڑائی کے متعلق تحقیق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ کس کو شکست ہوئی۔ بہر حال طرفین کا سخت نقصان ہوا۔ اس لڑائی میں حضرت صاحبؐ نے اپنے دشمنوں کے لئے دعا مانگی کہ اے خدا انھیں معاف کر کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔

اس جنگ کے بعد مخالفوں کے حوصلے بڑھ گئے اور انھوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اب ہم اسلام کو بالکل نیست و نابود کر کے چھوڑیں گے۔ کئی قبیلوں کے لوگوں نے مسلمان بننے کا بہانہ کر کے مسلمانوں کے بہت سے واعظوں کو قتل کر ڈالا۔ یہودی لوگ بھی اسلام کے دشمنوں کے ساتھ مل گئے۔ چنانچہ چوبیس ہزار فوج تیار ہو گئی۔ مگر خدا کی غیبی طاقت مسلمانوں کی امداد کر رہی تھی اور ان کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ چنانچہ انھوں نے مدینے کے اس طرف جہاں پہاڑ نہ تھے۔ ایک خندق کھودنے کا ارادہ کیا۔ جس میں خود حضرت صاحبؐ نے ہاتھ میں پھاوڑہ لے کر مزدوروں کا کام کیا۔ خدا کی کرنی ایسی ہوئی کہ ایک رات سخت آندھی چلی اور موسلا دھار مینہ برسا۔ اور دشمنوں کے سب خیمے اکھڑ گئے۔ ان پر غضب کا خوف طاری ہو گیا۔ وہ سمجھے کہ خدا کی طرف سے قیامت نازل ہوئی ہے۔ ان میں سخت ابتری پھیل گئی اور سب لوگ اپنا بدھنا بوریا باندھ کر چلتے بنے۔ اس طرح پر میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ درحقیقت اسے غیبی امداد ہی سمجھنا چاہئے۔ ورنہ اگر لڑائی ہوتی تو ایک بھی مسلمان نہ بچ سکتا تھا۔

یہودیوں کی شرارتیں برابر جاری تھیں۔ حضرت صاحبؐ تو ہر چند چاہتے تھے کہ انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ دی جائے اور وہ مسلمانوں کے ساتھ صلح کر کے چین سے مدینے میں رہیں۔ لیکن خندق کی لڑائی میں انھوں نے سخت غداری کا ثبوت دیا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی تقریروں اور نظموں میں مسلمانوں اور خصوصاً حضرت صاحبؐ کی ہجو کرتے رہتے تھے۔ مسلمان عورتوں کو وہ آتے جاتے بہت تنگ کرتے تھے۔ ایک دفعہ زینب نامی یہودی عورت نے حضرت صاحبؐ اور بہت سے مسلمانوں کو دعوت دی اور کھانے میں زہر ملا دیا۔ حضرت صاحبؐ کو شبہ ہو گیا۔ اور خدا کی مہربانی سے سب کی جان بچ گئی۔ اس سازش میں بہت سے بڑے بڑے یہودی شامل تھے۔ اور کوئی ہوتا تو سب یہودیوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیتا۔ مگر آنحضرتؐ نے چند سرغنوں کو ہی سزا دینا کافی سمجھا۔

— ۵ —

اب سب کو یقین ہو گیا تھا کہ قریش اب خاموش ہو کر بیٹھ جائیں گے۔ کیوں کہ مسلمانوں کو نیست و نابود کرنا خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ حضرت صاحبؐ کا بھی یہ خیال تھا کہ اب قریش دل چھوڑ بیٹھے ہیں۔ اس لئے انھوں نے حج کے ارادہ سے مکے جانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ تیرہ چودہ سو مسلمانوں کو ساتھ لے کر کعبے کی زیارت کو روانہ ہوئے۔ اپنے ساتھیوں کو پہلے ہی حکم دے دیا تھا کہ کوئی شخص ہتھیار یا لڑائی کا سامان اپنے ساتھ نہ لے جائے۔ اور صرف ایک تلوار میان میں

اپنی حفاظت کے لئے رکھے۔ جب وہ مکے کے قریب پہنچے۔ تو قریش کو شبہ ہوا کہ مسلمان مکے پر حملہ کرنے آئے ہیں۔ جب قریش کا قاصد ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے کہا کہ ہم محض حج کی نیت سے یہاں آئے ہیں۔ اور ہم چاہتے کہ قریش کے ساتھ صلح ہو جائے۔ چنانچہ کچھ قیل و قال کے بعد صلح کی چند شرطیں طے ہو گئیں۔ اور مسلمان بغیر حج کئے واپس آگئے۔ بعض مسلمانوں نے اس کو بہت برا سمجھا۔ حضرت صاحبؐ نے اس موقع پر صلح کرنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ اگر لڑائی ہوتی تو ایک مسلمان بھی زندہ واپس نہ آتا۔ کیوں کہ وہ بالکل جنگ کے لئے تیار تھے۔ یہ واقعہ صلح حدیبیہ کہلاتا ہے۔

اس صلح کے بعد مسلمانوں کی طاقت دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگی۔ حضرت صاحبؐ نے مختلف مقامات پر اپنے واعظ بھیجے۔ اور مختلف سلطنتوں کے حکمرانوں کو دعوت اسلام دی۔ کئی سلطنتوں نے اسلام کی بہت قدر کی اور مسلمانوں کو وعظ کرنے کی کھلی اجازت مل گئی۔

قریش کے لوگ صلح تو ضرور کر چکے تھے۔ مگر اسلام کی ترقی انھیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی اور وہ اسی تاک میں رہتے تھے کہ جب موقع ملے اسلام کا خاتمہ کر دیں۔ چنانچہ وہ برابر چھیڑ چھاڑ کرتے رہے۔ ایک دفعہ انھوں نے مسلمانوں کے حلیف بنو خزاعہ کے آدمی کو عین کعبے میں قتل کر ڈالا۔ آنحضرتؐ نے قاصد بھیجا کہ کیا آپ حدیبیہ کے صلح نامے کو برقرار رکھنا نہیں چاہتے۔ قریش نے ٹال مٹول کرنا چاہا۔ اور آخر کہہ دیا کہ وہ صلح نامہ قائم نہیں رہ سکتا۔

اب آنحضرتؐ نے فیصلہ کیا کہ روز روز کی جھک جھک ٹھیک نہیں ہے۔ اب قریش کو ایسا سبق سکھانا چاہئے کہ آئندہ سر اٹھانے کی جرأت نہ کریں۔ چنانچہ انھوں نے زور شور سے مکے پر چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اور دس ہزار جرار فوج لے کر ۸ھ ہجری میں مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ قریش پر مسلمانوں کا خوف طاری ہو جائے۔ اور وہ بلا جنگ کئے اطاعت قبول کر لیں۔ چنانچہ مکے سے چند میل کے فاصلے پر ڈیرے ڈال دئے۔ اور سب نے اپنے اپنے خیمہ کے سامنے آگ جلا دی۔ قریش یہ دیکھ کر کہ اس قدر اسلامی لشکر مکے پر چڑھ آیا ہے ڈر گئے۔ ابو سفیان جو اسلام کا جانی دشمن تھا، گو وہ دل میں اسلام کی روحانی قوت کو محسوس کرتا تھا، قاصد بن کر گیا۔ لیکن حضرت صاحبؐ کے نیک سلوک سے متاثر ہو کر اس نے اپنے قصوروں کی معافی مانگ لی۔ حضرت صاحبؐ نے دریا دلی سے اسے معاف کر دیا۔ اور اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس نے واپس جا کر اعلان کر دیا کہ اب اسلام کا مقابلہ کرنا بے سود ہے جو شخص امان چاہتا ہے یا تو میرے گھر میں چلا آئے یا اپنا دروازہ بند کرے۔ کسی کو ایذا نہیں پہنچے گی۔

اب اسلامی لشکر مختلف طرفوں سے مکے میں داخل ہوا۔ حضرت صاحب نے فوج کے افسروں کو سخت حکم دے دیا کہ مکے والوں پر کسی قسم کی سختی نہ کی جائے۔ آنحضرتؐ نے اپنے رفیقوں کے ساتھ کعبہ میں جا کر نماز پڑھی۔ شہر کے لوگ تھر تھر کانپ رہے تھے کہ نہ جانے اب کیا ہو گا۔ شاید آنحضرتؐ قتل عام کا ہی حکم دے دیں۔ اس لئے بہت سے لوگ شہر سے بھاگ جانے کا انتظام کر رہے تھے۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ لوگ اس قدر خوف زدہ ہو رہے ہیں تو آپ نے اعلان کر دیا "کوئی مسلمان تلوار نہ چلائے۔ اور کوئی شخص شہر چھوڑ کر نہ جائے۔ آج لڑائی اور انتقام کا دن نہیں ہے بلکہ آج شفقت اور رحمت کا دن ہے۔ میں تمھارا دشمن ہو کر نہیں آیا ہوں۔ اور نہ تم سے کسی قسم کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔

میں تم سے وہی سلوک کروں گا۔ جو یوسفؑ نے مصر میں اپنے بھائیوں سے کیا تھا۔ میں تم کو جھڑکی تک بھی نہ دوں گا۔"
یہ اعلان سن کر لوگوں کی جان میں جان آئی۔ اور انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب وہ واقعات پیش آئے جن کی مثال شاید ہی دنیا کی تواریخ میں کہیں ملتی ہو۔ ابو سفیان کو جو پہلے مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا، آنحضرتؐ نے مکے میں داخل ہونے سے پہلے ہی معاف کر دیا تھا۔ اس کی بیوی ہندہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کے خاوند نے اسلام قبول کر لیا ہے تو وہ غصے میں آپے سے باہر ہو گئی۔ اور اپنے خاوند کی داڑھی پکڑ کر اسے جوتیوں سے خوب پیٹا۔ اور اس کے منہ پر تھوکا۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ کہ نہ جانے مجھے کیا سزا ملے۔ کیوں کہ اس نے لڑائی میں آنحضرتؐ کے چچا حمزہؓ کی لاش کا پیٹ چاک کر کے اور کلیجہ نکال کر دانتوں سے چبایا تھا۔ جب وہ آں حضرتؐ کے سامنے آئی تو شرم کے مارے منہ پر نقاب ڈال کر آئی۔ آں حضرتؐ نے کہا۔ اے ہندہ میں خوش ہوں کہ تو اپنے اعمال پر پشیمان ہے۔ تو صرف ایک خدا کی پرستش کیا کر۔ ہرگز جھوٹ نہ بولا کر اور ہمیشہ بدکرداری سے پرہیز کیا کر۔ یہ کہہ کر اسے بالکل معاف کر دیا۔ وہ آنحضرتؐ پر ایمان لے آئی۔

عکرمہ کو جس نے مکے میں داخل ہوتے ہی دو بے گناہ مسلمانوں کو تیر مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس کی بیوی کی سفارش پر معاف کر دیا۔ اسی طرح ایک شخص ہبار نامی کو جس نے آں حضرتؐ کی لڑکی زینب کو جب کہ وہ حاملہ تھیں، پتھر مار کر ہلاک کر دیا تھا معاف کر دیا۔

طائف کے لوگوں نے جب آں حضرتؐ وہاں گئے تھے تو انھیں پتھر مار مار کر گھائل کر دیا تھا پھر سر اٹھایا۔ ان پر چڑھائی کر کے ان کے قلعے فتح کر لئے۔ اور چھ ہزار فوجیوں کو قید کر لیا۔ لیکن وہاں کے لوگوں کی طرف سے یہ یقین دلانے پر کہ وہ ہمیشہ وفادار رہیں گے سب قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ اور کسی کو بھی مسلمان بننے پر مجبور نہ کیا۔ حالاں کہ اگر وہ چاہتے تو سب کو مسلمان بنا سکتے تھے۔

اب اسلام تمام عرب میں پھیل چکا تھا۔ اور عربوں نے آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا تھا۔ آپ نے تمام صیغوں کے انتظام کی طرف توجہ کی۔ محصول اور لگان کی وصولی کے قواعد بنائے۔ فوجوں کی باقاعدہ ترتیب اور تربیت کا انتظام کیا۔ سرحد کی حفاظت کے لئے چھاؤنیاں بنائیں۔ ہر ایک کے لئے آمدنی کا خاص حصہ زکوٰۃ میں دینا ضروری قرار دیا۔ مختلف قبیلوں کی بغاوتوں کو رفع کرنے کا خاص انتظام کیا۔

آس پاس کی عیسائی حکومتوں کو اسلام کی ترقی بہت ناگوار گزرتی تھی۔ اور وہ اکثر کچھ نہ کچھ چھیڑ چھاڑ کرتی رہتی تھیں۔ ان کی سرکوبی کا بھی خوب انتظام کیا اور تمام اردگرد کے حاکموں کے ساتھ عہد نامے کر لئے تاکہ تمام ملکوں میں امن و امان قائم رہ سکے۔ اب انھوں نے نہایت دھوم دھام سے حج کی تیاریاں کیں اور اس حج کے موقع پر ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمان شامل ہوئے۔ چند ہی سال میں اسلام کا تمام عرب میں پھیل جانا اور مختلف مخالف فرقوں اور قبیلوں کا آں حضرتؐ کا پیرو دین جانا دراصل ایک معجزہ تھا۔ شاید ہی کسی اور پیغمبر کو اپنی زندگی میں اس قدر کامیابی نصیب ہوئی ہو اس حج کے موقع پر ہر طرف بہشتی نظارہ دکھائی دیتا تھا۔ جہاں چھوٹے بڑے امیر و غریب کی کچھ تمیز نہ تھی۔ ہر طرف

انسانی مساوات کا دلکش اور دل فریب منظر تھا۔ اور سب اپنے محبوب کے گرد جمع ہو کر اپنے خالق خداوند تعالیٰ کی پرستش اور عبادت میں مصروف تھے۔

اب بیس بائیس سال کی لگاتار محنت اور مخالفوں کی سختیوں اور اذیتوں اور نیز جنگ و جدل و ملکی انتظام کی اہم ذمہ داریوں کی وجہ سے آپ کا جسم بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید ان مشکلات کا کبھی کا شکار ہو گیا ہوتا۔ مگر انسان آخر انسان ہے اس کی جسمانی طاقتیں آخر جواب دینے لگتی ہیں

چنانچہ آپ ۱۱ھ میں بیمار ہو گئے۔ حضرت عائشہ رضؓ اور ان کے رفیقوں نے ان کی تیمارداری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ آخری دن مسواک سے منہ صاف کیا اور دوشنبہ کے دن ۸۔جون ۶۳۲ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ مسلمانوں کو ان کی جدائی کا بے حد رنج ہوا۔ مگر حضرت ابوبکر رضؓ نے ان کو بہت بہت دلاسا دیا۔ آخر وہ سب اس واقعہ کو خدا کی مرضی سمجھ کر چھاتی پر پتھر رکھ کر کے بیٹھ گئے۔

— ۶ —

آں حضرتؐ کی عادات بہت سیدھی سادی تھیں۔ ہمیشہ موٹا کپڑا استعمال کرتے تھے۔ کرتہ، چادر اور تہ بند کے سوائے اور کپڑا نہ پہنتے تھے۔ خوراک کی سادگی کا تو یہ حال تھا کہ شاید غریب مزدور بھی آج کل ایسی سادہ خوراک نہ کھاتا ہو۔ جو کا آٹا ہانڈی میں آگ پر چڑھا دیا اور اوپر سے کچھ زیتون کا تیل، زیرہ اور کالی مرچیں ڈال دیں اور آپ کا کھانا تیار ہو گیا۔ اکثر کھجوریں کھا کر ہی گزارہ کر لیا کرتے۔ غرض جو سامنے آتا وہی خدا کا شکر کر کے کھا لیتے تھے۔

صفائی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ خود اپنے ہاتھ سے اپنے مکان میں جھاڑو دے لیا کرتے تھے۔ اپنے کپڑے خود دھو لیا کرتے تھے اور پھٹے پرانے کپڑے خود سی لیا کرتے تھے۔ ان کے مکان میں ایک چارپائی، ایک پانی کی ٹھلیا اور ایک بورئے کے سوائے اور سامان موجود نہ رہتا تھا۔ ہمیشہ وہ اپنا کام خود اپنے ہاتھ سے کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اوائل عمر میں وہ بکریاں چرایا کرتے تھے۔ گھر بار کے کام کاج میں اپنی بیویوں کا ہمیشہ ہاتھ بٹاتے تھے۔ بکریوں کا دودھ دوہ لیتے تھے۔ جوتیاں خود گانٹھ لیتے تھے۔ بازار سے سودا سلف خرید لاتے۔ اونٹوں کو باندھ لیتے۔ اور ان کے آگے چارہ ڈالتے تھے۔ غرض کسی قسم کے کام سے انھیں عار نہ تھی۔ مسلمانوں کے ساتھ مل کر انھوں نے مسجدیں بنائیں۔ مزدوروں کا کام کیا۔ کھانے سے پہلے اور پیچھے ہاتھ دھوتے اور منہ کو خوب صاف کرتے تھے۔ داتن (مسواک) کیا کرتے تھے۔ بالوں میں ہمیشہ کنگھی کرتے اور کبھی کبھی تیل بھی لگایا کرتے تھے۔

انھوں نے اپنی سادہ زندگی سے یہ ثابت کر دیا کہ کسی قسم کا کام یا پیشہ ذلیل نہیں، بشرطیکہ راست بازی اور دیانت داری کو مدنظر رکھا جائے۔

مزاج میں انکساری غضب کی تھی۔ کوئی تعظیم کو کھڑا ہوتا تو اسے منع کر دیتے۔ خواہ کوئی غلام بھی کھانے کو بلاتا تو اس کے ہاں بلا تکلف چلے جاتے اور سب کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے۔ جب کسی مجمع میں جاتے تو سب کے ساتھ مل کر بیٹھتے تھے۔ جب کوئی دوسرا بات کرتا تو اس میں ہرگز دخل نہ دیتے تھے۔ اگر کچھ کہنا ضروری ہوتا تو بہت حلیمی اور عاجزی

سے کہتے۔ آپ کا دل دشمنی عداوت، انتقام، سخت گیری اور درشت کلامی کے ناپاک جذبات سے پاک تھا۔ ہمیشہ معافی اور درگزر کے لئے تیار رہتے تھے۔ جیساکہ مکے کی فتح کے وقت بہت سے واقعات سے ظاہر ہوا۔ سچائی، دیانت داری اور الطاف اِن کی فطرت کے جزو بن گئے تھے ہر وقت اپنے پیروؤں کو راست بازی کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ ان کی فیاضی بے مثال تھی۔ حتی الامکان کسی کے سوال کو رد نہ کرتے تھے۔ خود تکلیف اٹھاکر اور بھوکا رہ کر دوسروں کے سوال کو پورا کرتے تھے۔ مال و دولت ہرگز جمع نہ کرتے تھے بلکہ جب تک مال تقسیم نہ کردیتے ان کو چین نہ پڑتا تھا۔ غریب، یتیم اور محتاجوں کی امداد کو ہر وقت تیار رہتے تھے۔ انھوں نے غلاموں کے حقوق آقاؤں پر قائم کئے۔ اور عورتوں اور بچوں کے حقوق مردوں پر قائم کئے۔

جب کسی کی بیماری کی خبر سن لیتے تو اس کی بیمار پرسی کے لئے جاتے۔ جب کوئی فوت ہوجاتا تو اس کے جنازے کے ساتھ جاتے۔ انسان کا تو ذکر کیا وہ بے زبان جانوروں پر بھی بہت ترس کھاتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے جانوروں کی لڑائی کو عرب کے ہر مقام پر بالکل بند کردیا تھا۔ لاغر جانوروں کو دیکھتے تو کہا کرتے اے لوگو! بے زبانوں کے بارے میں خدا سے ڈرو۔ مہمان نواز اول درجے کے تھے۔ جب کوئی مہمان آجاتا تو اپنا کھانا اس کو کھلا دیتے۔ آپ بہت شیریں زبان تھے، سب سے بہت نرمی اور ملائمت سے گفتگو کرتے تھے۔ آپ ہرگز کسی کو بد دعا نہیں دیتے تھے۔ خداوند تعالیٰ کی بخشش و رحمت پر ایسا زبردست اعتقاد رکھتے تھے کہ بڑی بڑی مصیبتوں میں حوصلہ نہ ہارتے تھے۔ اسی وجہ سے مٹھی بھر آدمیوں سے دشمنوں کے بڑی دل کا مقابلہ کامیابی سے کرتے رہے۔ غار ثور میں جب جاکر ابوبکرؓ کے ساتھ چھپے تھے تو دشمنوں کی آہٹ سن کر ابوبکرؓ گھبرا گئے اور کہا کہ اے رسول اب ہم دو ہیں۔ زور سے کہا نہیں ہم تین ہیں۔ یعنی تیسرا خدا ہمارے ساتھ ہے۔ کیسا زبردست ایمان ہے۔

حضرتؐ کے چند واقعات

ہم ذیل میں حضرت صاحبؐ کے متعلق چند روایات درج کرتے ہیں جن سے صاف معلوم ہوجائے گا کہ خداوند تعالیٰ نے ان کو کیسی کیسی خوبیاں عطا کی تھیں۔

۱۔ ایک یہودی کا کسی مسلمان سے جھگڑا ہوگیا اور فیصلہ آں حضرت پر چھوڑا گیا۔ حضرت نے بے رو رعایت تحقیقات کی اور فیصلہ یہودی کے حق میں دے دیا۔ اور مسلمانوں کی ناراضگی کی مطلق پروا نہ کی۔

۲۔ ایک شخص کو چوری کے الزام میں گرفتار کرکے ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ کئی بڑے بڑے آدمیوں نے اس کی سفارش کی مگر آں حضرتؐ نے انصاف کو مدنظر رکھ کر سفارشوں کی مطلق پروا نہ کی۔ اور حکم دے دیا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کے لئے یہ ہی حکم دیتا کہ اس کے ہاتھ کاٹ دئے جائیں۔

۳۔ ایک دفعہ ایک یہودی کا کچھ روپیہ حضرت کو دینا تھا۔ وہ یہودی تقاضا کرنے آیا اور سخت کلامی کرنے لگا۔ حضرت عمرؓ کو اس پر بہت غصہ آیا مگر حضرت صاحبؐ نے فرمایا۔ اے عمرؓ یہ بات ٹھیک نہیں۔ تجھے چاہئے تھا کہ ہم دونوں کو نصیحت کرتا کہ قرض خواہ کو نرمی سے مطالبہ کرنا چاہئے۔ اور مجھے نیکی سے روپیہ واپس کرنا چاہئے۔ حضرت نے یہودی

کو پاس بٹھایا اور اس کو قرضے سے کچھ زیادہ دے کر رخصت کیا۔ اس نیک سلوک کا یہودی پر ایسا اثر ہوا کہ وہ ان کا مرید بن گیا۔

۴۔ ایک دفعہ آپ اپنے احباب کے ساتھ کہیں دور جنگل میں سیر کو گئے۔ جب کھانا بنانے کی ضرورت پیش آئی تو آپ نے جنگل سے لکڑیاں لانے کا کام اپنے ذمے لیا۔ غرض وہ کبھی اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھتے تھے۔ اور ہمیشہ خواہ کیسا ہی چھوٹا کام ہو کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔

۵۔ ایک دفعہ ایک شخص کو کسی قصور کے عوض آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ آپ کو دیکھ کر کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا۔ ارے ڈرتا کیوں ہے۔ میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو ایک غریب قریش عورت کا لڑکا ہوں جو کئی دفعہ غریبی کی وجہ سے سوکھا گوشت کھا کر ہی گزارہ کر لیتی تھی۔

۶۔ ایک دفعہ کئی صحابی جنگ پر گئے ہوئے تھے۔ ان کے گھر کوئی مرد نہ تھا اور عورتوں کو دودھ دوہنا نہ آتا تھا۔ آپ ہر روز ان کے گھر جا کر دودھ دوہ آیا کرتے تھے۔ اسی طرح غریب عورتیں ان کے پاس آکر مختلف کام بتلا دیتی تھیں۔ اور وہ اٹھ کر سب کے کام کر آتے تھے۔

۷۔ ایک دفعہ مدینے کے چند بدو ان کے ہاں مہمان ہو کر آئے۔ ایک بدو کو زیادہ کھانے کی وجہ سے رات کو بہت دست آگئے اور بستر خراب ہو گیا۔ وہ صبح ہی شرم کے مارے اٹھ کر چلا گیا۔ آپ نے اٹھ کر اس کی غلاظت کو اپنے ہاتھوں سے صاف کیا۔ لوگوں نے کہا ہمارے ہوتے ہوئے آپ ایسا کام کیوں کرتے ہیں۔ فرمایا اپنے مہمان کی ہر ایک قسم کی خدمت کا میں ہی ذمہ دار ہوں۔

۸۔ ایک دفعہ ایک رئیس نے چار اونٹوں پر غلہ لاد کر آپ کے پاس بھیجا۔ حضرت بلال رضؓ نے غلہ بیچ کر یہودیوں کا قرضہ ادا کیا۔ جب بلال رضؓ واپس آئے تو پوچھا کیا کچھ غلہ بچا ہے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ ابھی غلہ باقی ہے۔ تو فرمایا کہ جب تک باقی غلہ غریبوں میں تقسیم نہ ہو جائے میں گھر میں نہیں جا سکتا۔ چنانچہ اس رات مسجد میں ہی قیام کیا۔ اور اگلے دن تمام غلہ تقسیم کرا کے گھر گئے۔

حضرت صاحب کی تعلیم

آپ نے مسلمانوں کے چار فرائض قائم کئے۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکواۃ۔ پچھلے دو ان لوگوں کے لئے ضروری قرار دئے جنھیں روپیہ خرچ کرنے کی طاقت ہو۔

انھوں نے ایک خدا اور صرف ایک ہی خدا کی پرستش کی تعلیم دی۔ وہ یہ تعلیم دیتے تھے کہ سب انسان برابر ہیں اور ان کے حقوق بھی برابر ہیں۔

ایسے شخص کو جو بدی کی زندگی بسر کرتا ہے نماز بھی نہیں بچا سکتی۔ تمھارا چلن ہی ہے جس پر سزا اور جزا کا انحصار ہے۔

اے مسلمانو! تم دوسروں کے لئے وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو۔ تب ہی تمھارا ایمان ٹھیک ہو سکتا ہے۔

کسی شخص کی ضرورت کو پورا کر دینا تمام عمر خدا کی عبادت کے برابر ہے۔

ایمان کے بعد سب سے بڑی نیکی خلقت کو آرام پہنچانا ہے۔

جو بڑوں کی تعظیم نہیں کرتا اور بچوں پر شفقت نہیں کرتا وہ میری امت میں نہیں ہے۔

جھگڑا کرنے والا انسان خدا کے نزدیک سب سے زیادہ قابل نفرت ہے۔

جس نے اپنی زبان اور خواہشات نفسانی کو قابو میں رکھا ہے میں اس کے واسطے جنت کا ضامن ہوتا ہوں۔

تمھارا ہمسایہ اگر تم سے امداد مانگے تو اس کی امداد کرو۔ قرض مانگے تو قرض دو۔ اگر تم سے اسے کوئی کام پڑے تو پورا کرو۔ بیمار ہو تو اس کی مزاج پرسی کرو۔ اور مر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ۔ جب کوئی خوشی کا موقع ہو تو اسے مبارک باد دو۔ جب اس پر کوئی مصیبت نازل ہو تو اس کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرو۔

کچھ پرواہ نہیں اگر دنیا کی اور چیزیں تیرے پاس نہ ہوں۔ مگر یہ چیزیں ضرور ہونی چاہئیں (۱) راست گفتاری (۲) دیانت داری (۳) خوش خلقی (۴) حلال کی کمائی۔

خادم کا قصور دن میں ستر دفعہ معاف کرو۔

اللہ تعالےٰ تمھاری صورتوں اور دولت کو نہیں دیکھتا۔ بلکہ تمھارے کاموں اور دلوں کو دیکھتا ہے۔

ہر ایک نیک کام خیرات ہے۔ کسی کو نیک کام کی ہدایت کرنا بھی خیرات ہے۔ بھولے بھٹکے کو راستہ دکھانا۔ اندھے کی مدد کرنا۔ راستہ میں سے پتھر اور کانٹے اٹھا دینا۔ پیاسے کو پانی پلا دینا۔ یہ سب خیرات کے کام ہیں۔

اے مسلمانو! یاد رکھو۔ ایک بھائی کو دوسرے بھائی کی عزت کرنا لازمی ہے۔ پرائے مال پر نگاہ رکھنا حرام ہے۔ جو جیسا کرے گا۔ ویسا بھرے گا۔ عورتوں کے ساتھ ہمیشہ نیک برتاؤ کرنا۔ کسی کی حق تلفی نہ کرنا۔ اور کسی پر کسی قسم کا ظلم نہ کرنا۔

خدا ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ سارے جہانوں کا مالک ہے۔ اسی کے قبضے میں سب کچھ ہے۔ وہ قادر مطلق ہے۔

جو چیز اولاد کے لئے بازار سے لاؤ سب سے پہلے لڑکی کو دو۔

جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ بدلہ نہیں لیتا۔

ایسا اشارہ کرنا بھی حرام ہے جس سے دوسروں کو رنج پہنچے۔

..

نوٹ: یہ مضمون رائے صاحب شری لالہ رگھوناتھ سہائے بی اے کا لکھا ہوا ہے۔ وہ تقسیم سے پہلے انجمن اتحاد مذاہب (لاہور) کے صدر تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۰ میں پنجاب آرٹ پریس، بیرون موری دروازہ، لاہور سے ایک کتاب شائع کی تھی۔ اس کے ۱۸۳ صفحات تھے اور اس کا نام تھا: "روشن ستارے"۔ اس کتاب میں دس "نامور مذہبی بزرگوں کے حالات" درج تھے۔ اس کا ایک باب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا۔ یہ باب مکمل طور پر یہاں نقل کیا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام

مسلم مورخین کے مطابق، محمدؐ ۲۰ اپریل ۵۷۱ کو عرب کے صحرا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے نام کا مطلب ہے "بہت تعریف کیا ہوا"۔ میرے نزدیک وہ تمام فرزندانِ عرب میں سب سے زیادہ عالی دماغ انسان تھے۔ سرخ ریت کے اس ناقابل عبور صحرا میں جتنے شاعر اور بادشاہ ان سے پہلے یا ان کے بعد ہوئے، ان سب پر وہ بدرجہا زیادہ فوقیت رکھتے تھے۔ محمدؐ کا ظہور ہوا تو عرب ایک صحرا تھا، وہ کچھ بھی نہ تھا۔ خالی صحرا سے محمدؐ کی طاقت در روح نے ایک نئی دنیا بنائی۔ نئی زندگی، نیا کلچر، نئی تہذیب اور نئی سلطنت پیدا کی جو مراکش سے انڈیز تک پھیلی ہوئی تھی اور جس نے تین براعظموں (ایشیا، افریقہ، یورپ) کے خیالات اور زندگی کو متاثر کیا۔

میری اس تحریر کا موضوع ایک ایسے مذہب کے اصولوں کی بابت لکھنا ہے جو کہ تاریخی ہے اور اس کا پیغمبر بھی ایک تاریخی شخصیت ہے۔ سر ولیم میور جیسا ایک معاند ناقد بھی قرآن کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے: "دنیا میں غالباً قرآن کے سوا کوئی دوسری کتاب نہیں ہے جس کا متن بارہ سو سال گزرنے کے بعد بھی اس درجہ خالص صورت میں محفوظ ہو"۔ میں یہ بھی اضافہ کروں گا کہ حضرت محمدؐ ایک تاریخی شخصیت ہیں۔ آپ کی زندگی کا ہر واقعہ نہایت احتیاط سے منضبط کیا گیا ہے حتیٰ کہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات بھی آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کر دی گئی ہیں۔ آپ کی زندگی اور آپ کا کام پُراسراریت کے پردہ میں چھپا ہوا نہیں ہے۔ یہ ضرورت نہیں ہے کہ ایک شخص صحیح معلومات کے لئے اس مشکل مہم کو سر کرے کہ وہ بھُس کے ڈھیر میں سے چھان کر سچائی کے دانے نکالے۔

میرا کام اس لئے بھی ہلکا ہو چکا ہے کہ وہ زمانہ اب بہت تیزی سے رخصت ہو رہا ہے جب کہ کچھ ناقدین سیاسی اور غیر سیاسی وجوہ سے اسلام کو بہت بگاڑ کر پیش کرتے تھے۔ پروفیسر بیوان "کیمبرج میڈیول ہسٹری" میں لکھتے ہیں "محمدؐ اور اسلام کے بارے میں کتابیں جو یورپ میں ۱۹ویں صدی کے آغاز سے پہلے چھپتی تھیں آج ان کو محض قلمی عجوبے سمجھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اسلام اور تلوار کا نظریہ آج کہیں بھی قابل لحاظ نہیں سمجھا جاتا۔ اسلام کا یہ اصول کہ مذہب میں کوئی زبردستی نہیں، آج سب کو پوری طرح معلوم ہے۔ مشہور مورخ گبن نے لکھا ہے "مسلمانوں کی طرف ایک مجرمانہ اصول منسوب کیا جاتا رہا ہے کہ ہر مذہب کو تلوار کے زور سے ختم کر دیا جائے"۔ مگر گبن کہتا ہے کہ جہالت اور تعصب کا یہ الزام قرآن سے، مسلم فاتحین کی تاریخ سے نیز مسلم عوام کے رویہ سے غلط ثابت ہوتا ہے جو کہ ہمیشہ قانونی اور سماجی طور پر مسیحی عبادت کے ساتھ رواداری کا طریقہ اختیار کرتے رہے ہیں۔ محمدؐ کی زندگی کی عظیم کامیابی صرف اخلاقی طاقت کے ذریعہ ہوئی، تلوار کی کسی مار کے بغیر۔

— ۲ —

قدیم زمانہ میں عربوں کا یہ حال تھا کہ اتنی معمولی سی بات پر وہ چالیس سال تک لڑتے رہے کہ ایک قبیلہ کا ایک اونٹ بھٹک کر دوسرے قبیلہ کی چراگاہ میں چلا گیا۔ اس جنگ میں دونوں قبیلوں کے ستر ہزار آدمی مارے گئے

اور خطرہ پیدا ہوگیا کہ دونوں قبیلوں کی نسل ختم ہو جائے گی۔ ایسے جھگڑالو عربوں کو پیغمبر اسلام نے خود انضباطی اور تنظیم کی تعلیم یہاں تک دی کہ میدان جنگ میں بھی ان کو نماز پڑھنے کا حکم دیا۔

صلح کے لئے آپ کا منصوبہ جب بار بار کوشش کے باوجود ناکام ہوگیا تو ایسے حالات پیدا ہوئے جو آپ کو کھینچ کر میدان جنگ میں لے آئے۔ آپ کا یہ اقدام محض دفاع کے لئے تھا۔ تاہم انھوں نے میدان جنگ کے پورے طریق عمل کو بالکل بدل دیا۔ ان کی پوری زندگی میں جو لڑائیاں ہوئیں، ان سب میں مرنے والوں کی مجموعی تعداد، جب کہ پورا جزیرہ نمائے عرب ان کے جھنڈے کے نیچے آگیا، چند سو سے زیادہ نہیں۔ انھوں نے عرب وحشیوں کو نماز پڑھنا سکھایا، محض انفرادی طور پر نہیں، بلکہ اجتماعی طور پر، حتیٰ کہ انھوں نے ہدایت کی کہ جنگ کے طوفان میں بھی اپنے خدا کے آگے سجدہ کرو۔ جب بھی عبادت کا وقت آجائے، اور یہ روزانہ پانچ وقت آتا ہے، تو اجتماعی عبادت چھوڑی نہیں جا سکتی، حتیٰ کہ ملتوی بھی نہیں کی جا سکتی۔ لشکر کا ایک حصہ اگر دشمنوں سے مقابلہ میں مصروف رہے تو اس کا دوسرا حصہ اپنے خدا کے سامنے اپنے سروں کو جھکا دے۔ جب ایک فریق اپنی عبادت ختم کرلے تو وہ مورچہ سنبھال لے اور دوسرا فریق آکر اپنی عبادت کرے۔

وحشت و بربریت کے زمانہ میں میدان جنگ تک پر انسانیت کا اصول جاری کیا گیا۔ سخت ہدایات جاری کی گئیں کہ خیانت نہ کی جائے۔ دھوکا نہ دیا جائے۔ عہد کو توڑا نہ جائے۔ ہاتھ پاؤں نہ کاٹے جائیں۔ عورتوں اور بچوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کیا جائے۔ پھل دار درختوں کو نہ کاٹا جائے اور نہ جلایا جائے۔ عبادت گاہوں میں عبادت کرنے والے لوگوں پر زیادتی نہ کی جائے۔ پیغمبر کا خود اپنا طرز عمل اپنے سخت ترین دشمنوں کے ساتھ نمونہ کا طرزِ عمل تھا۔ مکہ کی فتح کے بعد ان کو پورا اقتدار حاصل ہوگیا تھا، وہ شہر جس نے آپ کا پیغام سننے سے انکار کر دیا تھا۔ جس نے آپ کے اوپر اور آپ کے ساتھیوں کے اوپر شدید ظلم کئے تھے۔ جس نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ جب آپ اپنا وطن چھوڑ کر دو سو میل دور (مدینہ) چلے گئے، اس وقت بھی انھوں نے آپ کا بائیکاٹ کرنے اور آپ کو تکلیفیں پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ آج وہ شہر مکہ آپ کے قدموں کے نیچے تھا۔ جنگ کے مسلمہ قوانین کے مطابق وہ ان تمام مظالم کا بدلہ لے سکتے تھے جو آپ پر اور آپ کے لوگوں پر کئے گئے تھے۔ مگر آپ نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ محمدؐ کا دل رحم اور محبت کے دودھ سے بھر گیا۔ آپ نے اعلان کیا:

آج تمھارے اوپر کوئی الزام نہیں۔ آج تم سب آزاد ہو۔

یہ ان مقاصد میں سے ایک اہم مقصد تھا کہ کیوں آپ نے دفاع میں جنگ کرنے کی اجازت دی —— اس لئے تاکہ انسانوں کو متحد کیا جا سکے۔ اور جب یہ مقصد حاصل ہوگیا تو آپ کے بدترین دشمن تک معاف کر دیئے گئے۔ وہ لوگ جنھوں نے آپ کے محبوب چچا حمزہؓ کو قتل کیا تھا، ان کے مردہ جسم کا مثلہ کیا تھا وہ بھی آپ کی مہربانیوں سے محروم نہ رہے۔

عالمی اخوت اور انسانی مساوات کا اصول جس کی آپ نے تبلیغ کی وہ انسانیت کی سماجی ترقی میں بہت بڑا درجہ رکھتے ہیں۔ تمام بڑے مذاہب نے اس قسم کے اصولوں کی تبلیغ کی ہے مگر پیغمبر اسلام نے اس نظریہ کو حقیقی عمل کی صورت

دے دی اور اس کی اہمیت شاید کچھ دنوں بعد پوری طرح سمجھی جا سکے جب کہ بین اقوامی شعور جاگے گا، نسلی تعصبات ختم ہوجائیں گے اور انسانی اخوت کا ایک طاقت ور نظریہ وجود میں آجائے گا۔ سروجنی نائیڈو اسلام کے اس پہلو پر بولتی ہوئی کہتی ہیں: "وہ پہلا مذہب تھا جس نے جمہوریت کی تبلیغ کی اور اس کو عمل کی صورت دی، کیوں کہ مسجد میں جب اذانیں بلند ہوتی ہیں اور نمازی ایک ساتھ جمع ہوتے ہیں تو اسلام کی جمہوریت روزانہ پانچ بار مجسم ہوتی ہے جب کہ معمولی آدمی اور بادشاہ ایک صف میں شامل ہوکر جھکتے ہیں اور کہتے ہیں: "خدا سب سے بڑا ہے"۔ ہندوستان کی یہ مشہور شاعرہ مزید لکھتی ہے: "میں اسلام کی اس ناقابل تقسیم وحدت کو دیکھ کر بار بار حیران ہوتی ہوں جو کہ آدمی کو طبعی طور پر بھائی بھائی بنا دیتی ہے۔ جب آپ ایک مصری، ایک الجیریائی، ایک ہندستانی یا ترکی سے لندن میں ملتے ہیں تو ان میں جو فرق ملے گا وہ صرف اتنا سا کہ ایک کی پیدائش مصر میں ہوئی اور دوسرے کی ہندستان میں"۔

مہاتما گاندھی اپنے ناقابل تقلید انداز میں لکھتے ہیں "کسی نے کہا ہے کہ جنوبی افریقہ کے لوگ اسلام کے ظہور سے ڈر رہے ہیں —— وہ اسلام جس نے اسپین کو مہذب بنایا، وہ اسلام جو روشنی کی شمع کو مراکش تک لے گیا اور دنیا کو اخوت کا مقدس پیغام دیا۔ جنوبی افریقہ کے یورپی لوگ اسلام کے ظہور سے ڈر رہے ہیں کیوں کہ اسلام آئے گا تو وہ کالوں اور گوروں میں برابری کا اعلان کرے گا۔ ان کو اس سے ڈرنا ہی چاہئے۔ اگر اخوت ایک گناہ ہے۔ اگر مختلف نسلوں میں برابری وہ چیز ہے جس سے وہ ڈرتے ہیں تب ان کا ڈر بالکل بجا ہے"۔

ہر سال حج کے موسم میں دنیا اسلام کے اس حیرت ناک بین اقوامی مظاہرہ کو دیکھتی ہے جو کہ نسل، رنگ اور رتبہ کے تمام فرق کو برابر کر دیتا ہے۔ نہ صرف یورپی، افریقی، ایرانی، ہندستانی، چینی سب کے سب ایک خدائی خاندان کے ممبر کی حیثیت سے مکہ میں ملتے ہیں۔ بلکہ سب کے سب ایک قسم کے لباس پہنے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر آدمی معمولی سفید بغیر سلے ہوئے کپڑے کے دو ٹکڑے لپیٹے ہوئے ہوتا ہے۔ ایک ٹکڑا کمر کے گرد اور دوسرا ٹکڑا کندھے کے اوپر، اسی کے ساتھ ننگے سر، بغیر کسی رسم اور کسی دھوم دھام کے اور یہ آواز لگاتے ہوئے "میں حاضر ہوں، خدایا میں حاضر ہوں، تو ایک ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔ حکم صرف تیرا ہی ہے"۔ اس طرح یہاں ایسی کوئی چیز باقی نہیں رہتی جو چھوٹے اور بڑے کے درمیان فرق کرے اور ہر حاجی یہ احساس لے کر گھر واپس آتا ہے کہ اسلام ایک بین اقوامی اہمیت رکھنے والا دین ہے۔

پروفیسر ہر گرونجی کے الفاظ میں "اقوام کی جمعیت جو پیغمبر اسلام نے بنائی، اس نے بین اقوامی اتحاد اور انسانی اخوت کے اصول کو ایسی عالمی سطح پر قائم کیا ہے جو دوسری قوموں کو روشنی دکھانے والا ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ دنیا کی کوئی بھی دوسری قوم اتحاد اقوام کے لئے اس کے برابر کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔

پیغمبر اسلام نے جمہوری حکومت کو اس کی بہترین صورت میں قائم کیا۔ خلیفہ عمرؓ، خلیفہ علی رضؓ، جو پیغمبر کے داماد بھی تھے، خلیفہ منصور عباسی جو خلیفہ مامون کے بیٹے تھے اور دوسرے بہت سے خلفاء اور سلاطین اسلامی عدالتوں میں معمولی آدمی کی طرح حاضر ہوئے۔ آج بھی ہم سب جانتے ہیں کہ کالے نیگروؤں کے ساتھ مہذب سفید نسلوں کا سلوک کیا ہوتا ہے۔ اب بلالؓ کی بابت غور کرو جو چودہ سو سال پہلے پیغمبر اسلام کے زمانے میں ایک نیگر و غلام تھے۔ نماز کے

لئے اذان دینے کا کام ابتدائی اسلام کے زمانے میں ایک عزت کا کام سمجھا جاتا تھا اور یہ باعزت کام اس نیگرو غلام کے سپرد کیا گیا تھا۔ مکہ فتح ہونے کے بعد، پیغمبر نے ان کو حکم دیا کہ وہ نماز کے لئے اذان دیں۔ اور یہ نیگرو غلام، اپنے کالے رنگ اور اپنے موٹے ہونٹوں کے ساتھ مقدس کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوا۔ جو کہ اسلامی دنیا میں سب سے زیادہ تاریخی اور سب سے زیادہ مقدس جگہ ہے۔ اس وقت کچھ مغرور عرب تکلیف کے ساتھ بولے: اُف، یہ کالا حبشی غلام، برا ہو اس کا، وہ مقدس کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوا ہے اذان دینے کے لئے۔"

غرور اور تعصب کا یہ مزاج پیغمبر اسلام ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے آپ نے اس کا جواب دیتے ہوئے اپنی ایک تقریر میں کہا: ساری حمد اور شکر اللہ کے لئے ہے جس نے ہم کو جاہلیت کے زمانہ کے فخر اور برائی سے نجات بخشی۔ اے لوگو یاد رکھو، تمام انسان صرف دو قسموں میں بٹے ہوئے ہیں، متقی اور اللہ سے ڈرنے والے جو اللہ کے پسندیدہ بندے ہیں۔ دوسرے گنہ گار اور سخت دل جو اللہ کے نزدیک حقیر اور بے قیمت ہیں۔ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا تھا۔" یہی بات قرآن میں اس طرح کہی گئی ہے: اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنا دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ یقیناً اللہ کے نزدیک تمہارا سب سے باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو۔ اللہ خوب جاننے والا پوری طرح خبردار ہے (حجرات)

پیغمبر اسلام نے اس طرح اتنی زبردست تبدیلی پیدا کی کہ وہ لوگ جو خالص عرب تھے اور اعلیٰ ترین خاندان سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے اپنی لڑکیاں اس نیگرو غلام کے لئے شادی میں پیش کیں۔ اسلام کے دوسرے خلیفہ جو عمر فاروق کے نام سے مشہور ہیں، جب وہ اس نیگرو غلام کو دیکھتے تو وہ فوراً ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے اور ان الفاظ کے ساتھ ان کا استقبال کرتے: یہ ہمارے مُلم آگئے، یہ ہمارے سردار آگئے۔" قرآن اور محمدؐ کے ذریعہ کیسا حیرت ناک انقلاب تھا جو عربوں کے درمیان آیا، وہ عرب جو اس زمانہ میں سب سے زیادہ مغرور قوم کی حیثیت رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ عظیم ترین جرمن شاعر گوئٹے نے قرآن پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا: "یہ کتاب تمام زمانوں میں سب سے زیادہ مؤثر کتاب کی حیثیت سے باقی رہے گی۔" اور یہی وجہ ہے کہ برنارڈ شا کو یہ کہنا پڑا "اگر کوئی مذہب ہے جو انگلینڈ، نہیں بلکہ یورپ پر اگلے.. اسال کے اندر حکومت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو وہ اسلام ہے۔"

اسلام کی یہی جمہوری اسپرٹ ہے جس نے عورت کو مرد کی غلامی سے نکالا — سرچارلس ایڈورڈ آرچیبالڈ ہملٹن نے کہا ہے: "اسلام بتاتا ہے کہ انسان پیدائشی طور پر بے گناہ ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ مرد اور عورت دونوں ایک ہی جوہر سے پیدا ہوئے ہیں، دونوں کے اندر ایک ہی روح ہے اور دونوں ذہنی، روحانی اور اخلاقی ترقی کی یکساں قابلیت رکھتے ہیں۔" عربوں کے یہاں یہ زبردست روایت چلی آرہی تھی کہ وراثت کا حق دار وہی ہے جو برچھا چلاتا ہے اور تلوار کے قبضہ کو پکڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر اسلام صنف نازک کا حامی بن کر ظاہر ہوا اور عورتوں کو یہ حق دیا کہ وہ اپنے سرپرستوں کی وراثت میں حصہ دار بن سکتی ہیں۔ اسلام بہت پہلے عورت کو یہ حق دے چکا تھا کہ وہ جائداد کی مالک بن سکتی ہیں۔ اس کے بارہ صدیوں بعد ایسا ہو سکا کہ ۱۸۸۱ میں انگلستان نے، جو کہ جمہوریت کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے، اسلام کی اس تعلیم کو

اختیار کیا اور وہاں ایک قانون پاس ہوا جس کا نام تھا شادی شدہ عورتوں کا قانون (دی میرڈ ویمنز ایکٹ) مگر صدیوں پہلے پیغمبر اسلام یہ اعلان کر چکے تھے کہ "عورتیں مرد کا نصف ثانی ہیں۔ عورتوں کا حق ہر حال میں محترم ہے۔" "نگرانی رکھو کہ عورتوں کو وہ حق ملتا رہے جو ان کو دیا گیا ہے۔"

۳

اسلام براہ راست طور پر سیاسی اور اقتصادی نظام سے تعلق نہیں رکھتا۔ مگر بالواسطہ طور پر اور، جہاں تک سیاسی اور اقتصادی معاملات انسان کے طور طریقے اور اخلاقیات کو متاثر کرتے ہیں، وہ اقتصادی زندگی کے لئے کچھ نہایت اہم اصول مقرر کرتا ہے۔ پروفیسر میسی نن کے مطابق، اسلام مبالغہ آمیز انتہاؤں کے درمیان توازن کو برقرار رکھتا ہے اور ہمیشہ کردار کی تعمیر پر زور دیتا ہے جو کہ تہذیب کی بنیاد ہے۔ اس کی ضمانت چند بنیادی احکام کے ذریعہ کی گئی ہے —— اس کا وراثت کا قانون، زکوٰۃ کا نظم اور لازمی نظام، اقتصادی میدان میں تمام سماج دشمن طریقوں کو غیر قانونی قرار دینا جیسے اجارہ داری، سود، پیشگی طور پر طے کی ہوئی اور بغیر کمائی ہوئی آمدنیاں، بازار کا سب سامان خرید لینا، ذخیرہ اندوزی، کسی چیز کی مصنوعی قلت پیدا کرنا تاکہ قیمتوں میں اضافہ ہو۔ اسی طرح جوا غیر قانونی ہے۔ اس کے برعکس تعلیم گاہوں، عبادت خانوں، اسپتالوں، کنوؤں، یتیم خانوں کو امداد دینا بہت بڑی نیکی قرار دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلی بار ایسا ہوا کہ پیغمبر اسلام کی تعلیم کے تحت یتیم خانے قائم ہوئے۔ دنیا اپنے یتیم خانوں کے لئے اسی پیغمبر اسلام کی احسان مند ہے جو خود بھی ایک یتیم تھے۔ کارلائل نے محمدؐ کے بارے میں لکھا ہے: "یہ تمام خوبیاں، انسانیت کی فطری آواز، پارسائی اور مساوات، فطرت کے اس صحرائی فرزند کے دل میں جاگزیں ہونے کی وجہ سے، آشکارا تھیں۔"

ایک مورخ نے کہا ہے کہ کسی عظیم انسان کا امتحان تین باتوں کی روشنی میں لینا چاہئے۔ کیا وہ اپنے معاصرین کی رائے میں حقیقی طور سے اونچے اخلاق کا حامل تھا؟ کیا وہ واقعتہً اتنا عظیم تھا کہ اپنے زمانہ کے معیاروں سے بھی بلند ہو گیا ہو؟ کیا اس نے اپنے بعد آنے والی دنیا کے لئے کوئی مستقل میراث چھوڑی؟ اس فہرست کو مزید بڑھایا جا سکتا ہے، لیکن یہ بات اپنی جگہ واضح ہے کہ پیغمبر محمدؐ عظمت کے اس معیار پر اعلیٰ ترین درجہ میں پورے اترتے ہیں۔ آخری دو باتوں کے بارے میں پہلے ہی اشارہ کیا جا چکا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ کیا پیغمبر اسلام کو ان کے معاصرین نے حقیقتہً اونچے اخلاق کا حامل پایا۔ تاریخی دستاویزیں بتاتی ہیں کہ محمد کے تمام معاصرین، دوست ہوں یا دشمن، سبھی نے ان کی پاک خوبیوں، بے داغ امانت داری، عظیم اچھائیوں، زندگی کے تمام شعبوں میں کامل اخلاص اور امانت کو تسلیم کیا ہے۔ یہاں تک کہ یہودی، اور وہ لوگ بھی جو کہ آپ کے پیغام کو نہ مانتے تھے، وہ بھی اپنے ذاتی اختلافات کے سلسلے میں آپ کی انتہائی غیر جانب داری کی وجہ سے آپ کو ثالث مانتے تھے۔ یہاں تک کہ جو آپ کے پیغام کو تسلیم نہیں کرتے تھے وہ بھی یہ کہنے پر مجبور تھے: "اے محمدؐ ہم تم کو جھوٹا نہیں کہتے، بلکہ جس نے آپ کو کتاب اور پیغام دیا ہے اس کا انکار کرتے ہیں۔" ان کا خیال تھا کہ آپؐ

پر کسی جنّ کا سایہ ہے۔ انھوں نے آپ کے علاج کے لئے تشدد کو بھی اپنایا۔ لیکن ان میں جو عمدہ ترین لوگ تھے انھوں نے دیکھا کہ ایک نیا نور آپ پر نازل ہوا ہے اور انھوں نے اس نور کو پانے کے لئے پیش قدمی کی۔ پیغمبر اسلام کی تاریخ کا قابل ذکر واقعہ ہے کہ آپؐ کے قابل ترین رشتہ دار، چچازاد بھائی، آپؐ کو قریب سے جاننے والے عزیز دوست، سب پر آپ کے پیغام کا گہرا اثر ہوا اور سب آپ کے خدائی الہام کی صداقت سے متاثر ہوئے۔ اگر یہ شریف ذی عقل، صاحب علم اور آپ کی ذاتی زندگی کو قریب سے جاننے والے مرد اور عورت آپ کے اندر ذرہ برابر بھی حیلہ سازی، دھوکہ، دنیا داری یا ایمان کی کمی پاتے تو اخلاقی زندگی، روحانی بیداری اور اجتماعی اصلاح کے بارے میں محمدؐ کا منصوبہ ناکام ہو گیا ہوتا اور ساری عمارت چند لمحوں میں ٹوٹ کر زمین پر آ رہتی۔ اس کے برعکس ہم پاتے ہیں کہ آپ کے ماننے والے آپ پر اتنا زیادہ فدا تھے کہ خود اختیاری طور پر انھوں نے آپ کو اپنی زندگی کا قائد مان لیا تھا۔ انھوں نے آپ کی خاطر ظلم اور بھوک کا مقابلہ کیا۔ شدید ترین تشدد اور قبیلہ سے اخراج کی وجہ سے انتہائی ذہنی کرب کے باوجود آپ کے لئے ان لوگوں کا ایمان، بھروسہ، اطاعت اور تعظیم برقرار رہی۔ اگر انھوں نے اپنے لیڈر میں ذرا سی بھی خامی دیکھی ہوتی تو کیا ایسا ہو سکتا تھا۔

اسلام کے ابتدائی مومنین کی تاریخ پڑھئے تو بے گناہ مردوں اور عورتوں پر ہونے والے ظلم سے ہر دل پگھل اٹھے گا۔ معصوم عورت سمیہ کو نیزے مار مار کر ٹکڑے کر دیا گیا۔ خباب بن ارت کو جلتے ہوئے کوئلے پر لیٹنے پر مجبور کیا گیا۔ اور وہ بھی اس حال میں کہ بے رحم ظالم اپنا پیر ان کے سینے پر رکھے ہوئے تھا، تاکہ وہ حرکت نہ کر سکیں جس کی وجہ سے ان کی جلد کے اندر کی چربی پگھل گئی۔ خباب بن عدی کو ظالمانہ طور سے جسم کے ایک حصہ کو کاٹ کر اور ان کا زندہ گوشت تراش کر ہلاک کیا گیا اور جب اس ظلم کے درمیان ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ یہ تمنا نہیں کرتے کہ خود محمدؐ ان کی جگہ ہوتے جو کہ اس وقت اپنے گھر میں اپنے خاندان کے ساتھ تھے۔ اس حالت میں بھی مظلوم نے چیخ کر کہا کہ اگر محمدؐ کو کانٹا بھی چبھے تو وہ خود کو اور اپنے پورے خاندان کو قربان کر دیں گے تاکہ آپ کو کانٹے کی تکلیف نہ ہو۔ اس قسم کے درجنوں دل سوز واقعات بیان کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ واقعات کیا ظاہر کرتے ہیں؟ ایسا کیوں ہوا کہ اسلام کے ان مرد عورت جاں نثاروں نے نہ صرف اپنا ایمان محمدؐ کے حوالے کر دیا، بلکہ انھوں نے اپنے جسموں، دلوں اور روحوں کو بھی آپ پر نچھاور کر دیا۔ کیا محمدؐ کے قریب ترین معتقدین کا یہ مضبوط ایمان و یقین اس بات کی اعلیٰ ترین گواہی نہیں ہے کہ آپ اپنے پیغام کے بارے میں مخلص تھے اور اپنے کام میں انتہائی حد تک خود کو کھپائے ہوئے تھے۔

اور یہ لوگ معمولی حیثیت یا کمتر ذہنی سطح کے لوگ نہیں تھے۔ بالکل ابتدائی دور سے ہی، آپ کے گرد مکہ کا مکھن جمع ہو گیا تھا۔ یہ شریف ترین لوگ تھے جو کہ منصب، جاہ، ثروت اور ثقافت کے مالک تھے۔ ان میں آپ کے قریبی رشتہ دار بھی تھے جو کہ آپ کی زندگی کے داخلی اور خارجی پہلوؤں سے خوب واقف تھے۔ اور آپ کے بعد اسلام کے پہلے چار خلیفہ بھی اسی ابتدائی زمانہ کے مومنین میں سے تھے جنھوں نے عظیم ذمہ داریاں اٹھائیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کا کہنا ہے کہ "محمدؐ تمام نبیوں اور دینی شخصیات میں سب سے زیادہ کامیاب ہیں"۔ لیکن یہ کامیابی کسی اتفاقی واقعہ کی

مرہونِ منت نہیں ہے۔ یہ کوئی غیر متوقع واقعہ نہیں تھا۔ یہ کامیابی صرف اس لئے ہو سکی کہ معاصرین نے پیغمبرؐ کو حقیقی اخلاق اور عالی ظرفی کا حامل پایا۔ یہ کامیابی آپ کی قابلِ تعریف اور پوری طرح چھا جانے والی شخصیت کا نتیجہ تھی۔

۴

محمدؐ کی شخصیت کے بارے میں مکمل صداقت کو جاننا بہت ہی مشکل ہے۔ میں تو صرف اس کی بعض جھلکیوں کو پا سکتا ہوں۔ کتنے خوبصورت مناظر یکے بعد دیگرے ڈرامائی طور پر سامنے آتے رہتے ہیں ——— محمدؐ پیغمبر، محمدؐ جنرل، محمدؐ حکمراں، محمدؐ غازی، محمدؐ تاجر، محمدؐ مبلغ، محمدؐ فلسفی، محمدؐ سیاست داں، محمدؐ خطیب، محمدؐ مصلح، محمدؐ یتیموں کا ملجا، غلامی کا حامی، محمدؐ جج، محمدؐ پیشوا۔ ان تمام خوبصورت ادوار میں، انسانی اعمال کے ان تمام دائروں میں آپؐ ایک ہیرو معلوم ہوتے ہیں۔

یتیمی کی حالت بے چارگی کی آخری انتہا ہے اور اس دنیا میں آپ کی زندگی اسی انتہا سے شروع ہوئی — حکمرانی مادی طاقت کی انتہا ہے، اور اس دنیا میں آپ کی زندگی اسی پر ختم ہوئی۔

ایک یتیم بچے اور مظلوم مہاجر سے ابتدا کر کے آپ ایک پوری قوم کے روحانی اور مادی حاکم اعلیٰ اور اس کی تقدیر کے مالک بن گئے۔ اس عمل کے دوران پیش آنے والے امتحانات و ترغیبات، مشکلات و تغیرات، روشنیاں اور سائے، اونچ نیچ، دہشت اور عظمت کے دوران وہ دنیا کے امتحان میں کامیاب ہو کر زندگی کے ہر میدان میں ایک نمونہ بن کر ظاہر ہوئے۔ ان کی کامیابیاں زندگی کے کسی ایک میدان سے متعلق نہیں بلکہ انسانی زندگی کے تمام احوال پر حاوی ہیں۔

مثال کے طور پر عظمت اگر یہ ہے کہ بربریت اور مکمل اخلاقی تاریکی میں پڑی ہوئی قوم کو پاک کیا جائے تو جس نے اس پوری قوم کی کایا پلٹ دی، اس گری ہوئی قوم کو اتنا اونچا اٹھا دیا کہ وہ تہذیب و معرفت کی روشنی کی حامل بن گئی، اس عظیم شخصیت کو عظمت کا دعویٰ کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ اگر عظمت یہ ہے کہ کسی سوسائٹی کے متنفر عناصر کو آپس میں بھائی چارگی اور خیر خواہی کے روابط میں جوڑ دیا جائے تو صحرا میں ہونے والے نبی کو عظمت کے امتیاز کا پورا حق حاصل ہے۔ اگر عظمت ذلیل کن توہمات اور ہر قسم کی مہلک عادتوں میں مبتلا قوم کی اصلاح کرنا ہے، تو پیغمبر اسلام نے لاکھوں آدمیوں کے دل سے توہمات اور غیر معقول خوف کو نکال باہر کیا۔ اگر عظمت بلند اخلاق کا مظاہرہ ہے، تو محمدؐ کے دوستوں، دشمنوں سبھی نے ان کو "الامین" اور "الصادق" کا لقب دیا تھا۔ اگر فاتح عظیم ہوتا ہے، تو محمدؐ بھی ایک مجبور یتیم اور عام انسان کی زندگی سے بلند ہو کر جزیرۂ عرب کے حاکم بن گئے جو کہ خسرو اور قیصر کا ہم پلّہ منصب تھا۔ محمدؐ وہ تھے جنھوں نے ایک عظیم سلطنت قائم کی جو کہ ان گزری ہوئی چودہ صدیوں میں بھی برقرار ہے۔ اگر لیڈر کے لئے اس کے تابعین کا احترام اس کی عظمت کا معیار ہے تو پیغمبر کا نام آج بھی دنیا بھر میں پھیلے ہوئے کروڑوں لوگوں کے لئے جادو کی حیثیت رکھتا ہے۔

انھوں نے ایتھنز، روم، فارس، ہندوستان یا چین میں فلسفہ کی تعلیم نہیں حاصل کی تھی۔ لیکن انھوں

Unlettered himself, he could yet speak with an eloquence and fervour which moved men to tears of ecstasy. Born an orphan and blessed with no worldly goods, he was loved by all. He had studied at no military academy; yet he could organise his forces against tremendous odds and gained victories through the moral forces which he marshalled. Gifted men with a genius for preaching are rare. Descartes included the perfect preacher among the rarest kind in the world. Hitler in his *Mein Kampf* has expressed a similar view. He says: "A great theorist is seldom a great leader. An agitator is far more likely to possess these qualities. He will always be a better leader. For, leadership means ability to move masses of men. The talent to produce ideas has nothing in common with capacity for leadership". But, he says: "the union of the theorist, organiser, and leader in one man is the rarest phenomenon on this earth; therein consists greatness." In the person of the Prophet of Islam the world has seen this rarest phenomenon on the earth, walking in flesh and blood.

And more wonderful still is what the Reverend Bosworth Smith remarks: "Head of the State as well as the Church, he was Caesar and Pope in one; but, he was Pope without the Pope's claims, and Caesar without the legions of Caesar, without a standing army, without a bodyguard, without a palace, without a fixed revenue. If ever any man had the right to say that he ruled by a right divine, it was Muhammad, for he had all power without its instruments ,and without its supports. He cared not for the dressings of power. The simplicity of his private life was in keeping with his public life."

نے انسانیت کو لافانی حیثیت کے حامل عظیم ترین حقائق سے باخبر کیا۔ محمدؐ خود تو ان پڑھ تھے، لیکن وہ اتنی فصاحت اور جوش سے بولتے تھے کہ لوگ بے اختیار رو پڑتے تھے۔ اگرچہ محمدؐ یتیم اور دنیا کی دولتوں سے محروم پیدا ہوئے تھے، لیکن پھر بھی سب ان سے محبت کرتے تھے۔ انھوں نے کسی فوجی کالج میں تعلیم نہیں حاصل کی تھی، لیکن پھر بھی بڑی بڑی مشکلات پر قابو پا کر انھوں نے اپنی فوجوں کو منظم کیا اور اپنی ماہرانہ اخلاقی قوتوں کے بل پر جنگیں جیت لیں۔ خوبیوں سے بھرپور ایسے لوگ بہت نادر ہیں جن میں دوسروں کو بھی دعوت دینے کا ملکہ ہو۔ ڈیکارٹ نے کہا ہے کہ مکمل داعی دنیا کی سب سے نادر مخلوقات میں سے ایک ہے۔ ہٹلر نے بھی اپنی سوانح عمری "میری جدوجہد" میں اسی قسم کی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے: ایک عظیم نظریہ ساز شاذ و نادر ہی ایک عظیم قائد ہوتا ہے۔ احتجاجی لیڈر ان خوبیوں کا اور بھی کم حامل ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایسا آدمی بہتر لیڈر ہو کیوں کہ قیادت کے لئے عوام کو حرکت میں لانے کی خصوصیت ضروری ہے۔ افکار پیدا کرنے کی صلاحیت، قائدانہ صلاحیت کے ساتھ کوئی قدر مشترک نہیں رکھتی۔ پیغمبر اسلام کی ذات میں دنیا نے اس نادر ترین مظہر کو بھی حقیقی وجود کی صورت میں دیکھ لیا۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات وہ ہے جس کا اظہار پروفیسر باسورتھ اسمتھ نے کیا ہے: "وہ ریاست اور چرچ (دینی تنظیم) دونوں کے سربراہ تھے، وہ ایک ساتھ پوپ اور قیصر دونوں تھے۔ لیکن وہ ایسے پوپ تھے، جو پوپ کے دعووں سے خالی تھا۔ وہ ایسے قیصر تھے جو قیصر کی فوجوں کے بغیر تھا۔ نہ ان کے پاس ہر وقت تیار کھڑی رہنے والی فوج تھی، نہ ذاتی حفاظتی کارکن نہ ہی محل، نہ ہی کوئی مقررہ ٹیکس کی آمدنی۔ اگر کسی کو کبھی یہ دعویٰ کرنے کا حق ہو کہ اس نے خدائی حق کے ذریعہ حکومت کی ہے، تو وہ محمدؐ ہی ہوں گے، کیوں کہ ان کے پاس تمام اختیارات تھے، لیکن ان تمام ذرائع و وسائل کے بغیر جن سے وہ اختیارات حاصل کئے جاتے ہیں اور باقی رکھے جاتے ہیں۔ انھوں نے طاقت کے نمائش اور رکھ رکھاؤ کا کبھی خیال نہیں کیا۔ ان کی نجی زندگی کی سادگی ویسی ہی تھی جیسی ان کی عام زندگی۔"

مکہ فتح ہونے کے بعد ایک ملین مربع میل سے زیادہ زمین ان کے قدموں کے نیچے آگئی۔ پورے جزیرۂ عرب کا حکمراں ہونے کے باوجود وہ اپنے جوتے اور کھردرے اونی کپڑے خود ٹھیک کرتے تھے۔ بکریوں کو دوہتے تھے۔ زمین کو جھاڑو دیتے تھے۔ آگ جلاتے تھے اور خاندان کے چھوٹے چھوٹے کام کرتے تھے۔ مدینہ کا پورا شہر، جہاں آپ رہتے تھے، آپ کے آخری دنوں میں بہت مال دار ہو گیا تھا۔ ہر جگہ وہاں سیم و زر کی فراوانی تھی۔ لیکن خوش حالی کے ان دنوں میں بھی کئی کئی ہفتے اس طرح گزرتے تھے کہ جزیرۂ عرب کے حکمراں کے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ ان کا سارا کھانا ان دنوں میں پانی اور کھجور ہوتی تھی۔ پورا خاندان بہت سی راتوں کو بھوکا سوتا تھا کیوں کہ شام کو انھیں کھانے کو کچھ بھی میسر نہ ہو سکا تھا۔ ایک لمبے مشغول دن کے بعد وہ کسی نرم بستر پر نہیں سوتے تھے، بلکہ کھجور کے پتے کی بنی ہوئی چٹائی پر۔ راتوں کو وہ اکثر رو رو کر اپنے خالق سے دعا کرتے تھے کہ انھیں اپنے مشن کو پورا کرنے کی طاقت عطا فرمائے۔ روایتوں میں آیا ہے کہ ان کی آواز رونے کی وجہ سے ایسی ہو جاتی تھی جیسے کہ کوئی پتیلی آگ پر ہو اور اس کا ابلنا شروع ہو گیا ہو۔ ان کی موت کے دن ان کا سارا اثاثہ چند سکے تھے، جس کا کچھ حصہ قرضہ ادا کرنے کے لئے دے دیا گیا اور باقی ایک غریب کو دے دیا گیا جو ان کے گھر خیرات مانگنے آیا تھا۔ جس کپڑے

ہیں ان کی زندگی تمام ہوئی اس میں بہت سے پیوند لگے ہوئے تھے۔ وہ گھر، جس سے ساری دنیا میں روشنی پھیلی، تاریک تھا کیوں کہ اس کے پاس دیا جلانے کے لئے تیل نہیں تھا۔ حالات بدل گئے، لیکن اللہ کے پیغمبر نہیں بدلے۔ جیت میں اور ہار میں، حکرانی میں یا بدحالی میں، فراوانی میں یا محتاجی میں وہ ایک ہی آدمی تھے۔ ہر حال میں ان کا سلوک ایک ہی تھا۔ جس طرح اللہ پاک کے طریقے اور قوانین ایک ہیں اسی طرح سے اللہ کے انبیاء بھی بدلنے والے نہیں ہوتے۔

۵

ایک ضرب المثل میں کہا گیا ہے کہ امانت دار آدمی اللہ کی بہترین مخلوق ہے۔ محمدؐ امانت دار سے بھی کچھ زیادہ تھے ان کے پور پور میں انسانیت رچی بسی ہوئی تھی۔ انسانی ہمدردی، انسان دوستی ان کی روح کی موسیقی تھی۔ ان کا مشن ہی یہ تھا کہ انسان کی خدمت کی جائے۔ انسان کو بلند کیا جائے، پاک کیا جائے، تعلیم دی جائے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کو انسان بنایا جائے۔ یہی ان کی زندگی کا سارا مدعا تھا۔ ان کے خیالات، الفاظ اور اعمال سب کا مقصد انسانیت کی بہتری تھی۔

دکھاوا ان میں بالکل نہیں تھا اور وہ انتہائی حد تک بے غرض تھے۔ انھوں نے اپنے لئے کون سے ٹائٹیل چنے؟ صرف دو: اللہ کا بندہ اور اس کا رسول۔ پہلے بندہ پھر رسول۔ وہ اسی طرح پیغمبر تھے، جس طرح دوسرے بہت سے پیغمبر تھے جو دنیا کے مختلف حصوں میں آچکے ہیں، جن میں بعضوں کو ہم جانتے تھے اور بعض دوسرے ہمارے لئے نامعلوم ہیں۔ اگر کوئی ان حقائق پر ایمان نہیں رکھتا ہے تو وہ مسلم نہیں باقی رہتا۔ اس بات پر ایمان ہر مسلم کے عقیدہ کا جزء ہے۔ ایک یوربین مؤلف نے لکھا ہے: "ان کے زمانے کے حالات اور ان کے پیروؤں کا آپ پر انتہائی حد تک اعتقاد کو دیکھتے ہوئے سب سے بڑی معجزانہ بات یہ ہے کہ محمدؐ نے کبھی معجزات پر قادر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا"۔ محمدؐ سے معجزے بھی ہوئے، لیکن ان کا مقصد اپنے دین کا پروپیگنڈہ کرنا نہ تھا بلکہ انھوں نے ان معجزات کو صرف اللہ سے اور اللہ کے فہم و ادراک سے بالا طریقۂ کار سے منسوب کیا۔ وہ صاف کہتے تھے کہ دوسروں کی طرح وہ بھی ایک عام آدمی ہیں۔ وہ زمین و آسمان کے خزانوں کی ملکیت کا دعویٰ نہیں کرتے تھے، نہ ہی وہ غیب کو جاننے کا دعویٰ کرتے تھے۔ یہ سب اس وقت ہوا جب معجزات کو عام بات سمجھا جاتا تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ کوئی بھی مقدس شخص چٹکیوں میں معجزات لا سکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جزیرۂ عرب کے اندر اور باہر ہر جگہ مافوق الفطرت عقائد کی حکرانی تھی۔ انھوں نے اپنے پیروؤں کی توجہ فطرت اور فطری قوانین پر غور کرنے کے لئے دلائی، تاکہ وہ اللہ کی عظمت کو صحیح طرح سے سمجھ سکیں۔ قرآن کا کہنا ہے: آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو ہم نے کھیل کے طور پر نہیں بنایا۔ ان کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے (دخان ۳۹-۳۸)

دنیا کوئی واہمہ نہیں ہے، نہ ہی دنیا بلا مقصد پیدا کی گئی ہے۔ دنیا برحق پیدا کی گئی ہے۔ قرآن کی وہ آیات جو فطرت کا مطالعہ کرنے کی دعوت دیتی ہیں وہ نماز، روزہ، حج وغیرہ کے بارے میں حکم دینے والی آیات کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہیں۔ قرآن کے اثر کے تحت مسلمانوں نے فطرت کا عمیق مطالعہ شروع کیا، اور اسی وجہ سے سائنسی مطالعہ اور تجربہ کا وہ مزاج پیدا ہوا جو کہ یونانیوں کے یہاں معدوم تھا۔ جبکہ مسلم ماہر نباتات ابن بیطار نے (علم نباتات) پر ساری دنیا کے پودے جمع کر کے ایک ایسی کتاب لکھی جس کو مئیر (Mayer) نے اپنی کتاب (Gesch der Botanika) میں "محنت کا مینار" بتایا ہے،

جب کہ البیرونی نے چالیس سال تک سفر کرکے معدنیات کے نمونے حاصل کئے، جبکہ مسلم علمائے فلکیات بارہ بارہ سال سے زیادہ کے مطالعہ کو مدوّن کر رہے تھے، ارسطو نے فزکس پر بغیر ایک بھی تجربہ کئے ہوئے قلم اٹھایا، طبعی تاریخ پر اس نے اتنی لاپرواہی سے لکھا کہ اس نے اس بات کی بھی ضرورت نہیں سمجھی کہ "انسان کے دانت جانور سے زیادہ ہوتے ہیں" کا دعویٰ کرنے سے پہلے اس کی تصدیق بھی کر لیتا جو کہ کتنا آسان کام تھا۔ جالینوس نے، جس کو قدیم علم تشریح کا سب سے بڑا استاد سمجھا جاتا ہے، لکھا ہے کہ نچلا جبڑا دو ہڈیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس بات کو صدیوں تک تسلیم کیا جاتا رہا یہاں تک کہ عبداللطیف نے انسانی ڈھانچہ کا مطالعہ کیا۔ اس قسم کے بہت سے واقعات بیان کرنے کے بعد روبرٹ بریفالٹ نے (The Making of History) میں لکھا ہے: "ہماری سائنس عربوں کی صرف اس حد تک مقروض نہیں ہے کہ انھوں نے حیرت انگیز دریافتیں کیں یا انقلابی نظریات کی بنیاد ڈالی۔ ہماری سائنس عرب تہذیب کی اس سے کہیں زیادہ مقروض ہے: وہ خود اپنے وجود کے لئے عرب تہذیب کی مقروض ہے"۔ اسی مؤلف نے مزید لکھا ہے: "یونانیوں نے نظاموں کی بنیاد رکھی، عمومیات کا رواج دیا اور نظریات بنائے، لیکن تلاش کے صبر آزما طریقے، ایجابی معلومات کا جمع ہونا، سائنس کے دقیق طریقے، مفصل اور طویل تجربات، تجرباتی مطالعہ — یہ سب چیزیں یونانی مزاج کے لئے اجنبی تھیں۔ جس چیز کو ہم یورپ میں سائنس کہتے ہیں، وہ تلاش کے نئے طریقوں، تجربات، مطالعہ، وزن کرنے اور ریاضیات کی ترقی کی وجہ سے وجود میں آئی ہے اور یہ طور و طریقے یونانیوں کو معلوم نہ تھے۔ ... عربوں نے اس مزاج اور طور طریقوں کو یورپ میں روشناس کرایا"۔

پیغمبر محمدؐ کی تعلیمات کی عملی نوعیت نے ہی سائنسی اسپرٹ کو جنم دیا۔ ان کی تعلیمات نے روزمرہ کی محنت اور دنیاوی امور کو احترام و تقدس عطا کیا۔ قرآن کا کہنا ہے کہ اللہ نے انسان کو عبادت کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ لیکن یہاں عبادت کا اپنا خاص مفہوم ہے۔ اسلام میں اللہ کی عبادت صرف نماز تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہر وہ کام جو اللہ کی خوشنودی اور انسانیت کی بھلائی کے لئے کیا جائے وہ بھی عبادت ہی کا جزء ہے۔ زندگی کے تمام معاملات اسلام کی نظر میں تقدس کے حامل ہیں بشرطیکہ ان کو امانت داری، انصاف اور خالص نیت سے کیا جائے۔ اسلام نے "دینی" اور "غیر دینی" معاملات کی حدبندی کا خاتمہ کر دیا۔ قرآن کا کہنا ہے کہ اگر تم پاک و طاہر غذا کھا کر اللہ کا شکر ادا کرو تو یہ بھی ایک عبادت ہے۔ پیغمبر اسلام کا کہنا ہے کہ اپنی بیوی کے منھ میں لقمہ رکھنا بھی ایک نیکی ہے جس کا بدلہ اللہ عطا کریں گے۔ پیغمبر کے ایک قول میں آیا ہے کہ "اگر کوئی اپنی دل کی خواہش کو بھی پورا کرے تو اللہ پاک اس کو اجر دے گا بشرطیکہ اس کو حاصل کرنے کے طریقے جائز رہے ہوں"۔ یہ سن کر ایک صحابی نے کہا: اے اللہ کے رسول ایسا کر کے وہ انسان صرف اپنے دل کی خواہش کو پورا کر رہا ہے۔ پیغمبر نے فوراً جواب دیا: "اگر وہ اپنی خواہش پورا کرنے کے لئے کوئی غلط طریقہ اپناتا تو اس کو سزا ملتی، تو صحیح طریقہ اپنانے کی وجہ سے اسے انعام کیوں نہیں ملے گا"۔

دین کو پوری طرح سے زندگی کو بہتر بنانے کے لئے وقف ہونا چاہئے نہ کہ وہ صرف چند دنیوی زندگی سے ماورا امور سے متعلق ہو۔ دین کے اس نئے تصور نے نئی اخلاقی قدروں کو جنم دیا۔ پیغمبر اسلام کی تعلیمات کی ایک خاص بات یہ ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں انسانیت کے مختلف امور پر اس کا اثر بہت قوی ہے، عوام پر اس کا گہرا اثر، حقوق و واجبات

کے تصورات کا تعین، جاہل وحشی اور عقل مند فلسفی دونوں کے لئے یکساں طور پر مناسب اور بدلنے کی صلاحیت رکھنے والا ہونا ان تعلیمات کی خصوصیات میں سے ہے۔

لیکن یہ بات ٹھیک سے ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اچھے اعمال کی تاکید اعتقاد کی درستگی کو قربان کر کے نہیں گی گئی ہے۔ ایسے مدارس فکر بھی ہیں جو اعمال کو قربان کر کے متعینہ اعتقاد کی دعوت دیتے ہیں، یا اعتقاد کو قربان کر کے عمدہ اعمال کی دعوت دیتے ہیں، لیکن اسلام صحیح اعتقاد اور صحیح اعمال پر قائم ہے۔ وسائل اتنے ہی اہم ہیں جتنے نتائج۔ اور نتائج اتنے ہی اہم ہیں جتنے وسائل۔ ان دونوں کے درمیان زندہ وحدت ہے۔ دونوں ایک ساتھ زندہ ہیں اور نشوونما پاتے ہیں۔ اگر آپ ان دونوں کو الگ الگ کر دیں تو دونوں میں اضمحلال پیدا ہو جائے گا اور دونوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسلام میں عقیدہ کا تعلق اعمال سے ختم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ صحیح علم کو صحیح عمل میں تبدیل کر کے صحیح نتائج حاصل کئے جاتے ہیں ——— "جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے اعمال کرتے ہیں وہی جنت میں داخل ہوں گے" ——— یہ الفاظ قرآن میں بار بار کم از کم پچاس بار دہرائے گئے ہیں۔ غور و فکر کی ہمت افزائی کی گئی ہے، لیکن غور و فکر خود ایک مقصد نہیں ہے۔ اسلام کے دائرہ میں ان لوگوں کا وجود نہیں ہے جو اعتقاد تو رکھتے ہیں لیکن ان پر عمل نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کا تصور بھی ناقابل فہم ہے جو ایمان تو رکھیں لیکن عمل غلط کریں۔ الہٰی قانون صرف معیاروں کا قانون نہیں، بلکہ محنت و عمل کا قانون ہے۔ الہٰی قانون نے انسان کے لئے دائمی ترقی کا راستہ بتایا ہے جس میں انسان علم سے عمل کی طرف اور عمل سے اطمینان کی طرف ترقی کرتا ہے۔

وہ صحیح اعتقاد کون سا ہے جس سے صحیح عمل خود بخود ابلتا ہے اور جس سے مکمل سکینت حاصل ہوتی ہے؟ یہ مرکزی اعتقاد توحید ہے۔ "خدا کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے" کا اعتقاد ہی وہ محور ہے جس کے گرد اسلام کی ساری تعلیمات اور سارے اعمال گھومتے ہیں۔ خدا ہر طرح سے ایک نادر شے ہے، نہ صرف اپنے الہٰی وجود کی وجہ سے بلکہ اپنی الہٰی صفات کی وجہ سے بھی۔

ٹامس کارلائل نے لکھا ہے کہ اسلامی تعلیم کے مطابق ہماری ساری طاقت خدا کی اطاعت میں چھپی ہوئی ہے۔ چاہے وہ ہمارے ساتھ کچھ بھی کر رہا ہو، چاہے وہ موت یا موت سے بدتر کوئی چیز بھیج رہا ہو، وہ بہر حال ہمارے لئے اچھی ہے اور یوں ہم اپنے کو خدا کے سپرد کر دیتے ہیں۔ کارلائل مزید لکھتا ہے "گوئٹے کا کہنا ہے کہ اگر اسلام یہی ہے تو کیا ہم سب اسلام میں نہیں رہ رہے ہیں۔ ہاں ہم سب جو اخلاقی زندگی رکھتے ہیں اسلام ہی میں رہ رہے ہیں۔ یہ وہ سب سے بڑی حکمت ہے جو کہ اب تک آسمان نے زمین پر آشکارا کی ہے۔

نوٹ: یہ مضمون ایک انگریزی کتاب "محمد دی پرافٹ آف اسلام" کے کچھ اجزاء کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب پروفیسر کے۔ ایس۔ راما کرشنا راؤ (ہیڈ ڈپارٹمنٹ آف فلاسفی، گورنمنٹ کالج فار ویمن، میسور) کی لکھی ہوئی اور بورڈ آف اسلامک پبلی کیشنز دہلی کی طرف سے پہلی بار ۱۹۷۹ میں شائع ہوئی ہے۔

MOHAMMAD:
ON TOP OF THE HUNDRED BESTS

(Mohammad) was the only man in history who was supremely successful on both the religious and the secular levels. Of humble origins, Mohammad founded and promulgated one of the world's greatest religions and became an immensely effective political leader. Today, thirteen centuries after his death, his influence is still powerful and pervasive. The Bedouine tribesmen of Arabia had been no match for the larger armies of the kingdomes in the settled agricultural areas to the north. However, unified by Mohammad for the first time in history, and inspired by their fervent belief in the one true God, these small Arab armies now embarked upon one of the most astonishing series of conquests in human history. For a while, it must have seemed that the Muslims would overwhelm all of Christian Europe. However, in 732, at the famous battle of Tours, a Muslim army which had advanced into the centre of France, was at last defeated by the Franks. Nevertheless, in a scant century of fighting, these Bedouin tribesmen,, inspired by the word of the prophet, had carved out an empire stretching from the borders of India to the Atlantic ocean—the largest empire that the world had yet seen. Of many important historical events, one might say that they were inevitable and would have occured even without the particular political leader who guided them. But this cannot be said of the Arab conquests. Nothing similar had occured before Mohammad, and there is no reason to believe that the conquests would have been achieved without him We see then, that The Arab conquests of the seventh century have continued to play an important role in human history, down to the present day. It is this unparalleled combination of secular and religious influence which I feel entitles Mohammad to be considered the most influential single figure in human.history.

Dr. Michael H. Hart, The 100, New York 1978.

آپ سب سے بڑے تھے

میرا یہ انتخاب کہ محمدؐ دنیا کی تمام انتہائی با اثر شخصیتوں میں سرفہرست ہیں، کچھ قارئین کو اچنبھے میں ڈال سکتا ہے۔ کچھ اور لوگ اس پر معترض ہوسکتے ہیں۔ مگر محمد تاریخ کے واحد شخص تھے جنھوں نے اعلیٰ ترین کامیابی حاصل کی، مذہبی سطح پر بھی اور دنیاوی سطح پر بھی۔ محمدؐ نے معمولی حیثیت سے آغاز کرکے ایک عظیم ترین مذہب کی بنیاد رکھی اور اس کو پھیلایا۔ وہ انتہائی مؤثر سیاسی لیڈر بن گئے۔ ان کی وفات کے تیرہ صدیوں بعد آج بھی ان کے اثرات غالب اور طاقتور ہیں۔

اس کتاب میں جن اہم تاریخی شخصیتوں کا انتخاب کیا گیا ہے، ان کی اکثریت اس خوش قسمتی کی مالک تھی کہ وہ تہذیب کے مرکزوں میں پیدا ہوئی اور وہاں پلی بڑھی۔ وہ ایسی قوموں کے فرد تھے جن میں اعلیٰ تمدن تھا یا ان کو سیاسی مرکزیت حاصل تھی۔ مگر محمد ۵۷۰ء میں مکہ کے شہر میں پیدا ہوئے جو جنوبی عرب میں واقع تھا اور اس وقت دنیا کا ایک پس ماندہ علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ تجارت، آرٹ اور علم میں اس کو کوئی مرکزیت حاصل نہ تھی۔ چھ سال کی عمر میں یتیم ہوکر ان کی پرورش ایک معمولی ماحول میں ہوئی۔ اسلامی روایات مزید بتاتی ہیں کہ وہ بے پڑھے لکھے تھے۔ ان کی اقتصادی حالت ۲۵ سال کی عمر میں صرف اس وقت بہتر ہوئی جب کہ انھوں نے ایک دولت مند بیوہ سے شادی کی جن کی عمر ۴۵ سال تھی۔ تاہم چالیس سال کی عمر تک بظاہر کوئی ایسی علامت نہ تھی کہ وہ کوئی ممتاز شخصیت کے انسان ہیں۔

بیشتر عرب اس وقت آسمانی کتاب سے محروم تھے۔ وہ بہت سے دیوتاؤں پر عقیدہ رکھتے تھے۔ تاہم مکہ میں محدود تعداد میں کچھ یہودی اور عیسائی تھے۔ محمدؐ نے سب سے پہلے انھیں سے واحد اور قادر مطلق خدا کا تصور لیا جو تمام کائنات کا حکمراں تھا۔ جب ان کی عمر چالیس سال کی ہوئی تو محمدؐ کو یقین ہوگیا کہ یہ ایک سچا خدا (اللہ) ان سے کلام کر رہا ہے۔ اور اس نے سچے مذہب کی تبلیغ کے لئے ان کا انتخاب کر لیا ہے۔

تین سال تک محمدؐ صرف اپنے قریبی دوستوں اور متعلقین پر تبلیغ کرتے رہے۔ پھر تقریباً ۶۱۳ء میں انھوں نے عوام میں تبلیغ شروع کی۔ دھیرے دھیرے لوگوں نے ان کے مذہب کو قبول کرنا شروع کیا تو مکہ کے سرداران کو اپنے لئے ایک خطرناک مصیبت سمجھنے لگے۔ ۶۲۲ء میں محمدؐ کو اپنی حفاظت کا خطرہ محسوس ہونے لگا اور وہ مدینہ چلے گئے جو مکہ کے شمال میں تقریباً ۲۰۰ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ یہاں ان کو قابل لحاظ سیاسی طاقت کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

یہ ہجرت پیغمبر کی زندگی میں ایک نقطۂ انقلاب تھا۔ مکہ میں ان کے ساتھیوں کی تعداد صرف چند تھی۔ مدینہ میں ان کے ساتھیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ انھوں نے جلد اتنا اثر پیدا کر لیا کہ عملاً وہ مدینہ کے مطلق حکمراں بن گئے۔ اگلے چند سال میں، جب کہ محمدؐ کے ساتھیوں کی تعداد تیزی سے بڑھی، مدینہ اور مکہ کے درمیان جنگوں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا یہ جنگ ۶۳۰ء میں ختم ہوئی جب کہ محمدؐ دوبارہ فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے۔ ان کی زندگی کے بقیہ ڈھائی سالوں میں عرب قبیلے بہت تیزی سے ان کے نئے مذہب میں داخل ہوگئے۔ ۶۳۲ء میں جب محمدؐ کا انتقال ہوا تو وہ تمام جنوبی عرب کے حکمراں بن چکے تھے۔

عرب کے بدو قبائل ماضی سے سخت جنگ جو چلے آ رہے تھے۔ مگر ان کی تعداد کم تھی اور وہ اختلاف اور باہمی لڑائیوں کے نتیجہ میں برباد ہو رہے تھے۔ وہ شمالی عرب کے زرعی علاقوں میں آباد شہنشاہیتوں کی بڑی فوجوں سے کوئی نسبت نہ رکھتے تھے۔ تاہم محمدؐ نے پہلی بار ان کو منظم کیا۔ ایک خدا پر پُرجوش اعتقاد سے مسلح ہو کر یہ چھوٹی عرب فوجیں انسانی تاریخ کی سب سے حیرت ناک فتوحات کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ عرب کے شمال مشرق میں ساسانیوں کی عظیم نو پارسی شہنشاہیت تھی، عرب کے شمال جنوب میں بازنطینی یا مشرقی رومی شہنشاہیت تھی جس کا مرکز قسطنطنیہ تھا۔ عددی اعتبار سے عرب اپنے حریفوں کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہ رکھتے تھے۔ تاہم جنگ کے میدان میں، پُرجوش عربوں نے بہت تیزی سے تمام میسوپوٹامیہ، شام اور فلسطین کو فتح کر لیا۔ ۶۴۲ء میں مصر کو بازنطینی سلطنت سے توڑ لیا گیا۔ ایرانی فوجیں ۶۳۷ء میں قادسیہ اور ۶۴۲ء میں نہاوند کی جنگوں میں پسپا کر دی گئیں۔

مگر یہ عظیم فتوحات، جو کہ محمدؐ کے قریبی ساتھیوں اور ابتدائی خلفاء ابوبکرؓ اور عمر بن الخطابؓ کی رہنمائی میں انجام پائیں، عرب پیش قدمیوں کی انتہا نہ تھیں۔ ۷۱۱ء تک عرب فوجوں نے شمالی افریقہ سے لے کر بحر اٹلانٹک تک مکمل طور پر فتح کر لیا تھا۔ یہاں سے وہ شمال میں مڑے اور آبنائے جبرالٹر کو پار کرتے ہوئے اسپین کی گاتھ سلطنت کو مغلوب کر کے اس پر قبضہ حاصل کر لیا۔

تھوڑی دیر کے لئے محسوس ہونے لگا کہ مسلمان تمام مسیحی یورپ پر قابض ہو جائیں گے۔ مگر ۷۳۲ء میں تورس کی مشہور جنگ میں ایک مسلمان فوج، جو کہ فرانس کے مرکز تک پہنچ چکی تھی، بالآخر فرانسیسیوں کے ہاتھوں شکست کھا گئی۔ تاہم ان بدو قبائل نے، جو کہ پیغمبرؐ کی تعلیمات سے متاثر تھے، ایک صدی کی قلیل مدت میں ایک ایسی سلطنت قائم کر لی جو ہندوستان کی سرحدوں سے لے کر بحر اٹلانٹک کے ساحل تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ اتنی بڑی سلطنت تھی جیسی سلطنت اس سے پہلے تاریخ نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ تمام ممالک جو عربوں نے فتح کئے، ہر جگہ بہت بڑے پیمانہ پر لوگوں نے نئے مذہب کو قبول کر لیا۔

یہ تمام فتوحات مستقل ثابت نہ ہو سکیں۔ ایرانی اگرچہ پیغمبرؐ کے مذہب پر قائم رہے، تاہم انھوں نے عربوں کے اقتدار سے آزادی حاصل کر لی۔ اسپین میں سات سو سال کی جنگوں کے بعد آخرکار عیسائیوں نے پورے جزیرہ نما کو دوبارہ فتح کر لیا۔ تاہم میسوپوٹامیہ اور مصر جو کہ قدیم تہذیب کے گہوارہ رہے ہیں، بدستور عرب باقی رہے اور اسی طرح شمالی افریقہ کا پورا ساحلی علاقہ بھی۔ نیا مذہب، بلاشبہ درمیانی صدیوں میں مسلمانوں کی ابتدائی مقبوضہ سرحدوں سے بہت آگے تک پھیلتا رہا۔ آج اس کے ماننے والوں کی تعداد افریقہ اور وسط ایشیا میں دسیوں ملین ہے اور پاکستان اور شمالی ہندوستان اور انڈونیشیا میں اور بھی زیادہ ہے۔ انڈونیشیا میں اسلام ایک اتحادی عامل ثابت ہوا ہے۔ تاہم برصغیر ہند میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کشاکش اتحاد کے راستہ میں ایک بڑی رکاوٹ رہی ہے

اب اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محمدؐ کے اثرات مجموعی طور پر انسانی تاریخ کے اوپر کیا ہیں۔ تمام مذاہب کی طرح اسلام اپنے پیروؤں کی زندگی کو غیر معمولی طور پر متاثر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام بڑے مذاہب کے بانیوں نے

ہماری اس کتاب میں نمایاں طور پر جگہ پائی ہے۔ چوں کہ عیسائی سرسری اندازہ کے مطابق، دنیا میں مسلمانوں کے مقابلہ میں تقریباً دگنی تعداد میں ہیں۔ ابتدائی طور پر یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ محمدؐ کو ہم نے اس کتاب میں مسیحؑ سے اوپر رکھا ہے۔ ہمارے اس فیصلہ کے دو بڑے وجوہ ہیں۔ اول محمدؐ نے اسلام کی ترقی میں اس سے کہیں زیادہ اہم حصہ ادا کیا ہے جتنا مسیحؑ نے عیسائی مذہب کی ترقی کے لئے کیا ہے۔ مسیحیت کی بنیادی اخلاقیات، جس حد تک وہ یہودیت سے مختلف ہیں، ان کی تعلیم اگرچہ حضرت مسیح نے دی۔ مگر مسیحی الٰہیات کا وضع کرنے والا اصلاً سینٹ پال ہے۔ وہی اس کا اصل مبلغ ہے اور عہد نامہ جدید کے بڑے حصہ کا مصنف بھی۔

مگر اسلام کی الٰہیات اور اس کے بنیادی اخلاقی اصول دونوں کو دینے والے خود محمدؐ تھے۔ مزید یہ کہ نئے مذہب کی تبلیغ میں انھوں نے کلیدی حصہ ادا کیا اور اسلام کے مذہبی اعمال کو قائم کیا۔ پھر دہی ہیں جو کہ مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن کے مصنف ہیں، جو کہ محمدؐ کے کچھ واردات قلب کا ریکارڈ ہے اور جس کی بابت ان کا یقین تھا کہ وہ براہ راست خدا کی طرف سے ان پر الہام کیا گیا ہے۔ ان الہامات کا اکثر حصہ محمدؐ کی زندگی ہی میں صحت کے ساتھ لکھ لیا گیا تھا اور ان کی وفات کے جلد ہی بعد ان کو ایک مستند مجموعہ کی صورت میں مرتب کر لیا گیا۔ اس لئے قرآن قریبی طور پر محمدؐ کے خیالات اور تعلیمات کی نمائندگی کرتا ہے اور بڑی حد تک ان کے بولے ہوئے اصل الفاظ کا بھی۔ مسیحؑ کی تعلیمات کے بارے میں اس قسم کا تفصیلی مجموعہ موجود نہیں۔ قرآن چوں کہ مسلمانوں کے لئے اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ بائبل مسیحیوں کے لئے۔ اس لئے قرآن کے واسطے سے مسلمانوں کے اوپر محمدؐ کا اثر غیر معمولی رہا ہے۔ اغلب ہے کہ محمدؐ کے اضافی اثرات اسلام پر اس سے بہت زیادہ ہوں جتنا کہ مسیحؑ اور سینٹ پال کا مجموعی اثر مسیحیت پر۔ البتہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خالص مذہبی سطح پر محمدؐ کے اثرات انسانی تاریخ پر اتنے ہی ہیں جتنے مسیحؑ کے ہیں۔ مزید یہ کہ محمدؐ (بمقابلہ مسیحؑ کے) دنیاوی لیڈر بھی تھے اور مذہبی لیڈر بھی۔ درحقیقت عرب فتوحات کے پیچھے قوت محرکہ کی حیثیت سے ان کو تمام زمانوں میں سب سے زیادہ باا ثر سیاسی لیڈر کہا جا سکتا ہے۔

اکثر اہم تاریخی واقعات کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ناگزیر تھے اور جس خاص سیاسی لیڈر نے اس کی رہنمائی کی، اس کے بغیر بھی وہ وقوع میں آتے۔ مثال کے طور پر، جنوبی امریکہ اس وقت بھی اسپین سے آزادی حاصل کر لیتا اگر سائمن بولیور کا سرے سے وجود نہ ہوتا۔ مگر یہی بات عرب فتوحات کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ محمدؐ سے پہلے عرب میں اس قسم کا کوئی واقعہ ظہور میں نہیں آیا۔ اور یہ یقین کرنے کی کوئی بنیاد نہیں ہے کہ ان کے بغیر بھی یہ فتوحات حاصل ہوتیں۔ انسانی تاریخ میں اس سے ملتی جلتی فتوحات صرف منگولوں کی ہیں جو انھوں نے تیرھویں صدی میں حاصل کیں۔ یہ فتوحات بنیادی طور پر چنگیز خاں کے اثر سے ہوئیں۔ تاہم یہ فتوحات عربوں کی فتوحات سے وسیع تر ہونے کے باوجود مستقل قائم نہ رہ سکیں اور آج منگولوں کے پاس صرف وہی علاقے ہیں جو ان کے پاس چنگیز خاں سے پہلے تھے۔

عربوں کی فتوحات کا معاملہ بالکل مختلف ہے، عراق سے مراکش تک عرب قوموں کا ایک پورا سلسلہ پھیلا ہوا ہے جو نہ صرف اسلام میں اپنے عقیدہ کی وجہ سے متحد ہیں بلکہ عربی زبان، تاریخ اور کلچر بھی سب کا ایک ہے۔ مسلم مذہب میں قرآن

کی مرکزیت اور یہ واقعہ کہ وہ عربی زبان میں لکھا گیا ہے، اس نے غالباً عربی کو اس سے بچایا ہے کہ وہ مختلف اور ایک دوسرے کے لئے ناقابل فہم زبانوں میں تقسیم ہو جائے۔ حالاں کہ درمیانی تیرہ صدیوں میں ایسا ہونا بالکل قرین قیاس تھا۔ عرب ریاستوں میں اختلاف اور تقسیمیں یقیناً موجود ہیں اور وہ قابل لحاظ ہیں، مگر جزئی عدم اتحاد کو دیکھ کر ہمیں اتنا اندھا نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم ان اہم اتحادی اجزار کو نہ دیکھیں جو مسلسل ان کے درمیان پائے جارہے ہیں۔ مثال کے طور پر ۷۴-۱۹۷۳ کی سردیوں میں عربوں نے تیل کا بائیکاٹ کیا تو ایران اور انڈونیشیا اس میں شریک نہیں ہوئے۔ مگر یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ تمام عرب ریاستیں اور صرف عرب ریاستیں اس منصوبہ میں شریک ہوئیں۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ ساتویں صدی میں عربوں کی فتوحات انسانی تاریخ میں مسلسل اہم حصہ ادا کر رہی ہیں۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ مذہبی اور دنیاوی اثرات کا یہی بے نظیر اجتماع ہے جو میری نظر میں محمد کو اس لائق بناتا ہے کہ ان کو تاریخ کا سب سے زیادہ بااثر واحد شخص قرار دیا جائے۔ (انگریزی سے ترجمہ)

یہ مضمون مائیکل ہارٹ (پیدائش ۱۹۳۲) کی کتاب ایک سو (The 100) سے ماخوذ ہے۔ مصنف ایک امریکی عالم فلکیات ہیں اور اسی کے ساتھ مورخ بھی۔ انھوں نے اور ان کی اعلیٰ تعلیم یافتہ بیوی نے مل کر دنیا کی مشہور شخصیتوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اس مطالعہ کا حاصل انھوں نے ۵۷۲ صفحات کی ایک انگریزی کتاب کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں ایک سو ایسے آدمیوں کے حالات درج ہیں جنھوں نے مصنف کے نزدیک تاریخ پر نمایاں ترین اثرات ڈالے۔ کتاب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو سرفہرست رکھا گیا ہے۔ کیوں کہ مصنف کے مطالعہ کے مطابق وہ تاریخ کے سب سے بڑے انسان ہیں۔ انسانی تاریخ پر آپ نے جو اثرات ڈالے وہ کسی دوسرے واحد شخص نے نہیں ڈالے۔ اس کتاب میں نمبر ۳ پر حضرت مسیحؑ، نمبر ۱۶ پر حضرت موسیٰؑ اور نمبر ۵۱ پر حضرت عمر بن الخطابؓ کو رکھا گیا ہے۔ یہاں کتاب کے اس حصہ کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے۔

کتاب میں اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیر معمولی خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ تاہم طریق مطالعہ کے اعتبار سے اس میں وہ خامیاں موجود ہیں جو غیر مسلم سیرت نگاروں کے یہاں اکثر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ آپ نے ابتداءً یہودیوں اور عیسائیوں سے توحید کا تصور لیا۔ یا یہ کہ آپ قرآن کے مصنف تھے۔ یہ باتیں نہ صرف ہمارے عقائد کے خلاف ہیں بلکہ خالص علمی پہلو سے بھی بالکل بے بنیاد ہیں اور ان کے رد میں اب تک بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ ان مزعومات کے علمی اور تاریخی طور پر باطل ثابت ہونے کے باوجود مغربی علمار کیوں انھیں دہراتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کا مخصوص ذہن ہے، وہ "علم" کے کسی غیر زمینی ماخذ کو نہیں مانتے۔ اس لئے ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک شخص نے زمین سے ماورا کسی ذریعہ سے کیسے علم حاصل کر لیا۔ جب آدمی کے ذہن میں کوئی بات بیٹھ جائے تو اس کے خلاف کوئی بات، خواہ وہ کتنی ہی مدلل ہو، اس کے ذہن کی پکڑ میں نہیں آتی۔ وہ اپنی بات کو اس طرح دہراتا رہتا ہے جیسے کہ وہ بدستور ایک مسلمہ صداقت ہے۔ خواہ اس کو کتنے ہی معقول دلائل سے رد کیا جاچکا ہو (مترجم)

اسلام
پندرھویں صدی میں

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلی صدی ہجری میں اسلام کا مقابلہ شرک سے پیش آیا تھا، چودھویں صدی ہجری میں اسلام کا مقابلہ الحاد سے پیش آیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ پہلے مرحلہ میں صرف چوتھائی صدی کی کوششوں سے نظام شرک کی جڑ اکھڑ گئی۔ اس کے بعد ایسا انقلاب آیا جس کے اثرات تقریباً ایک ہزار سال تک پوری قوت کے ساتھ باقی رہے۔ اس کے برعکس دوسرے مرحلہ میں بے پناہ کوشش کرنے کے بعد بھی نتیجہ بالکل صفر رہا۔ دور الحاد میں جد وجہد اور قربانی کی غیر معمولی مقدار پیش کرنے کے باوجود وہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی جو دور شرک میں اس کو حاصل ہوئی تھی۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ کیا اسلام اب ایک ختم شدہ طاقت (Spent Force) ہے۔ کیا موجودہ دور میں اسلام اپنی وہ فکری اہمیت کھو چکا ہے جو قدیم دور میں اس کو حاصل تھی۔ اس سوال کا جواب یقینی طور پر نفی میں ہے۔ اسلام قیامت تک کا دین ہے اور اسلام کے لئے کائنات کے مالک نے مقدر کر دیا ہے کہ وہ غالب رہے (الاسلام یعلو ولا یعلی علیہ) اس لئے اسلام نہ اپنی نظریاتی معنویت کو کبھی کھو سکتا اور نہ یہ ممکن ہے کہ اس کو سربلند کرنے کی مطلوبہ جد وجہد کی جائے اس کے باوجود اس کو سربلندی حاصل نہ ہو۔

اصل یہ ہے کہ یہ امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں خدا نے مختلف قسم کے لوگوں کو یکساں طور پر اپنا کام کرنے کا موقع دیا ہے۔ یہاں خود خدا کی مقررہ سنت کے مطابق یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کا دشمن بنتا ہے۔ ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو گرا کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہے (بعضکم لبعض عدو) اس لئے موجودہ دنیا میں کسی کی کامیابی کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ماحول میں کام کرنے والی دوسری قوتوں کو سمجھے، ان کے مخالفانہ منصوبوں کو ناکام بنا کر اپنے لئے راستہ نکالے۔ اس دنیا میں کبھی کسی کو خالی میدان نہیں مل سکتا جس میں وہ بے روک ٹوک مارچ کرتا ہوا چلا جائے۔

مخالف قوتوں کو ناکام بنا کر غالب آنے کی صراط مستقیم (فتح) خدا نے اپنی کتاب میں واضح طور پر بتادی ہے اور رسول کی سنت میں اس کا کامل عملی نمونہ موجود ہے۔ جس طرح زراعت کے بارے میں قوانین قدرت کی پابندی کر کے فصل اگائی جاتی ہے اسی طرح یہ بالکل ممکن ہے کہ اس صراط مستقیم کی پیروی کر کے تمام مخالف سازشوں کو ناکام بنا دیا جائے اور اسلام کو غلبہ کا وہ مقام دلا دیا جائے جو ازل سے اس کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔

اس صراط مستقیم کا خلاصہ یہ ہے کہ تحریک کو خالص مثبت بنیادوں پر اٹھایا جائے۔ مخالفین کے ہر قسم کے اشتعال کے باوجود اہل اسلام کا سکینہ (تحمل) برہم نہ ہو۔ ان کی خدا پرستی اس بات کی یقینی ضمانت بن جائے کہ وہ کسی حال میں حمیت جاہلیہ کا جواب حمیت جاہلیہ سے نہ دیں گے بلکہ ہمیشہ تقوی کی روش پر قائم رہیں گے (فتح ۲۶)

موجودہ زمانہ میں اسلام کی سربلندی کی جد وجہد کے کامیاب نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کو خدا کی مقرر کردہ صراط مستقیم پر نہیں چلایا گیا بلکہ خود ساختہ راہوں پر چلایا گیا۔ اور خدا کی دنیا میں خدا ہی کی صراط مستقیم پر چل کر کامیابی ممکن ہے۔ کسی اور راہ پر دوڑنے والا یہاں کبھی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔

ایک واقعہ دو انجام

تیرھویں صدی عیسوی میں جب کہ مسلمان سیاسی طاقت ۔ تمدنی ترقی اور علوم وفنون میں دنیا کی تمام قوموں سے بڑھے ہوئے تھے ۔یورپ نے طے کیا کہ اس کو عربی پڑھنی ہے اور مسلمانوں کے علوم سیکھنے ہیں۔ یہی فیصلہ تھا، جو سولہویں صدی کے اس عظیم واقعہ کا سبب بنا جس کو دنیا یورپ کی نشأۃ ثانیہ (Renaissance) کے نام سے جانتی ہے ۔مسلمانوں کے علوم سیکھ کر اور ان میں اضافہ کر کے بالآخر یورپ اتنا طاقت ور ہو گیا کہ نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ ساری دنیا پر چھا گیا۔

اس واقعہ کے چار سو برس بعد یہی صورت حال برعکس شکل میں مسلمانوں کے سامنے تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ یورپ سیاست وتمدن اور علوم وفنون میں سب سے آگے بڑھ گیا ہے ۔ ان کے اندر یہ رجحان ابھرا کہ وہ یورپی زبانیں سیکھیں اور یورپ کے علوم کو حاصل کریں۔ مگر یہاں نتیجہ برعکس نکلا۔یورپی طرز کی تعلیم نے ہم کو یورپ کا ذہنی غلام بنا دیا۔ ہم اپنے علیحدہ قومی وجود کو بھول کر یورپ کے رنگ میں رنگ گئے ۔

ایک ہی نوعیت کے دو واقعات میں انجام کا یہ فرق کیوں ہے ۔ اس کا جواب ذہنیت کے اس فرق میں ہے جو دونوں جگہ پایا جاتا ہے ۔یورپ نے ہمارے علوم کو اس جذبہ کے تحت سیکھا تھا کہ وہ ہمارے ہتھیاروں سے ہم کو شکست دے سکے ۔ اس کے برعکس ہم یورپی علوم کی طرف اس لیے بڑھے کر ہم اس کے نقال بن کر اس کی نظروں میں باعزت ہو جائیں اور جہاں ذہنیت میں اس قسم کا فرق پایا جائے وہاں انجام میں فرق پایا جانا لازمی ہے ۔

مسلمانوں کو ایک ہزار سال تک دنیا میں وہی حیثیت حاصل رہی ہے جو آج روس یا امریکہ کو حاصل ہے ۔ اس وقت جب کہ یورپ پر ابھی قرون مظلمہ (Dark Ages) کا اندھیرا چھایا ہوا تھا، عرب مسلمان ایک شان دار تہذیب کو وجود میں لا چکے تھے ۔اور اپنی تحقیقات اور یونانی اور دوسرے علوم کے ترجموں کی مدد سے سائنس اور فلسفہ میں دنیا کی امامت کر رہے تھے ،اس وقت مسلمان ساری دنیا میں علم اور تہذیب کے تنہا مالک تھے ۔عربی زبان دنیا کی واحد علمی زبان تھی اور ساری دنیا کے لوگ علوم وفنون کے اکتساب کے لیے مسلم مرکزوں (دمشق ، بغداد ، قرطبہ ، غرناطہ) کا اسی طرح سفر کرتے تھے جیسے آج لوگ اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ اور امریکہ کے شہروں میں جاتے ہیں۔

بارہویں اور تیرہویں صدی میں جب کہ مسلمانوں کی طاقت عروج پر تھی اور وہ عرب سے بڑھتے بڑھتے فرانس تک پہونچ گئے تھے اس وقت یورپ نے مسلمانوں کے خلاف اپنی شدید ترین جنگ چھیڑ دی اور گیارہویں صدی کے آخر (۱۰۹۶) سے لے کر تیرہویں صدی کے آخر تک دو سو برس پورا یورپ مسلمانوں کے خلاف خوفناک جنگ لڑتا رہا، یہ جنگ

جو صلیبی لڑائیوں (Crusades) کے نام سے مشہور ہے، بالآخر یورپ کی مکمل ناکامی پر ختم ہوئی۔

مگر یورپ نے ہمت نہیں ہاری۔ اب اس کے اندر ایک نیا رجحان ابھرا۔ صلیبی جنگوں کے درمیان اہل یورپ کو تجربہ ہو گیا تھا کہ مسلمان علم اور سائنس میں ان سے بہت آگے ہیں۔ اس وقت کا تصور کیجئے جب مصری فوج نے منجنیقوں کے ذریعہ فرانسیسی لشکر پر آگ کے بان پھینکنا شروع کئے۔ یہ بان جب منجنیقوں سے نکل کر دشمن کی طرف بڑھتے تو ایسا نظر آتا جیسے بڑے بڑے آتشیں اژدہے ہوا میں اُڑ رہے ہوں۔ فرانسیسی، جن کے پاس اس وقت پُرانے دستی ہتھیاروں کے سوا اور کچھ نہ تھا، ان کے لیے یہ بان ایسے ہی بھیانک تھے جیسے آج کسی پس ماندہ اور بے سروسامان ملک پر جدید ترین راکٹوں کے ذریعہ حملہ کر دیا جائے۔ اسی طرح مسلمان تہذیب و تمدن کے تمام پہلوؤں میں نمایاں طور پر اہل یورپ سے بڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ صلیبی جنگوں کے ناکام تجربہ کے بعد یورپ نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو شکست دینے کے لیے اب اس کو دوسرے قسم کی جنگ چھیڑنی ہے، اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے ہنر اور ان کے علوم کو سیکھ کر انہیں کے ہتھیاروں سے انہیں شکست دی جائے۔

اب ایک طرف یورپ کے مذہبی طبقہ نے روحانی صلیبی جنگ (Spiritual Crusades) کا نعرہ دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی علوم کو سیکھا جائے، اور مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے عقائد کو اس طرح بگاڑ کر پیش کیا جائے کہ مسلمان اپنے دین سے متنفر ہو جائیں اور عیسائیت قبول کر لیں تاکہ وہ قوم جس کو فوجی میدان میں شکست نہیں دی جا سکی ہے، اس کو عددی حیثیت سے کمزور کر کے مغلوب کیا جا سکے۔ عیسائی مشنری تحریک پہلی بار صلیبی جنگوں کے زمانے میں شروع ہوئی۔ پہلا شخص جس نے ۱۱۴۵ء میں ماؤنٹ کارمل پر مشنری نظام قائم کیا۔ وہ ایک صلیبی ہی تھا۔ بعد کو فرانسس کن ۱۲۱۹ء نے اس کی پیروی کی۔ یہ مشنری تحریک آج ساری دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور تبلیغی ادارہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ اس کی کوششیں اس حد تک کامیاب ہوئی ہیں کہ ساری دنیا کا لٹریچر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غلط قسم کی باتوں سے بھر گیا ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں کا فلسفہ و سائنس اور ان کے علوم و فنون سیکھنے کی تحریک زور شور سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ یورپ کی درسگاہوں میں عربی زبان پڑھانے کا انتظام کیا گیا۔ مسلمانوں کی تصنیفات کے ترجمے یورپ کی زبانوں میں کئے جانے لگے۔ یورپ کے طلبہ مسلم شہروں میں تحصیل علم کے لیے جانا شروع ہوئے۔

جنگ کی یہ نئی تکنیک اختیار کرنے کی وجہ سے یورپ کو اندرونی طور پر مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت یورپ کے قدامت پسند حلقوں میں عربی زبان کی توسیع کی حوصلہ افزائی کے سلسلہ میں ناراضگی پائی جاتی تھی جس کی وجہ خاص طور پر یہ اندیشہ تھا کہ عربی سیکھنے سے عیسائیوں کے درمیان اسلامی خیالات پھیلنا شروع ہو جائیں گے۔ مثال کے طور پر فرانسس کن راہب راجر بیکن (۱۲۱۴-۹۴) جو اپنے وقت کا مشہور انگلستانی عالم تھا، اس نے جب عربی زبان کی اہمیت پر زور دیا تو آکسفورڈ کے علما چلا اٹھے "بیکن مسلمان (Saracen) ہو گیا"۔

مگر اس طرح کی مخالفتوں کے باوجود مسلمانوں کی زبان اور ان کے علوم سیکھنے کا رجحان بڑھتا رہا۔ مسلم محققین کے حاصل

کوے کر یورپ نے اپنی کوشش سے اس میں اضافے کیے اور اتنی ترقی کی کہ تاریخ میں پہلی بار قوت کا معیار بدل دیا اور بالآخر مسلمانوں کو ہر میدان میں شکست دے کر علم و عمل کی پوری دنیا کا مالک بن گیا۔ جدید مورخین نے تقریباً متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا اہم ترین محرک وہ علوم تھے جو مسلمانوں کی معرفت یورپ تک پہونچے (ویسٹرن سویلزیشن، اڈورڈ میکنال برن)

اس کے پانچ سو برس بعد تاریخ دوسرا منظر دیکھتی ہے۔ یورپ کی ترقی اور عروج سے متاثر ہو کر مسلمانوں کے اندر یہ رجحان ابھرا کہ وہ یورپ کے علوم و فنون کو سیکھیں۔ مگر یہاں اس رجحان کا محرک اس سے بالکل مختلف تھا جو یورپ کی تاریخ میں ہمیں نظر آتا ہے۔ سر سید احمد خاں (۹۸-۱۸۱۷) جو پروفیسر گب کے الفاظ میں اسلام میں پہلی جدت پسند تنظیم (Modernist Organisation) کے بانی تھے۔ انہوں نے ۱۸۷۵ میں علی گڑھ کالج قائم کیا اور اس پر اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۰ میں وہ یونیورسٹی بن گیا، وہ یورپی طرز کی تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ ان کا مقصد اس تعلیم سے کیا تھا اس کی ترجمانی ان کے رفیق خاص مولانا حالی نے ان الفاظ میں کی ہے:

"حالی اب آؤ پیروئ مغربی کریں"

سر سید نے جب انگلستان سے واپس آ کر دسمبر ۱۸۷۰ میں تہذیب الاخلاق نکالنا شروع کیا تو انہوں نے پہلے پرچہ کے شروع میں لکھا:

> "اس پرچہ کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلائیں۔"

سر سید جب ترقی کا تصور کرتے تو ان کے ذہن میں "زرق برق وردیاں پہنے کرنل اور میجر بنے ہوئے مسلمان نوجوان" ہوتے تھے۔ ان کا منتہائے مقصود ایسی تعلیم تھی جو مسلمانوں کو اعلیٰ عہدوں تک پہونچا سکے۔ سر سید کی تہذیب کو مہدی افادی نے بجا طور پر "اینگلو محمڈن کلچر" کا نام دیا ہے۔

کمال اتاترک (۱۹۳۸-۱۸۸۱) جو اس گروہ کا دوسرا نمایاں ترین نام ہے، وہ اس معاملے میں سر سید سے بھی آگے تھے ترکی میں مغربی تعلیم و تہذیب کی اشاعت سے کمال اتاترک کا مقصد کیا تھا، اس کا اندازہ اس عنوان سے ہوتا ہے جو اس مہم کو وہاں دیا گیا۔ کمال اتاترک اور ان کے ساتھیوں کے نزدیک یہ "غرب دوغرو" تھا، جس کے معنی ترکی زبان میں — "سمت مغرب میں سفر" کے ہیں۔ سمت مغرب میں سفر کا یہ کام اس درجہ اہم تھا کہ صرف رومن رسم الخط جاری کرنے اور ترکی باشندوں کو ہیٹ پہنانے کے لیے ہزاروں آدمی اس طرح ہلاک کر دیے گئے گویا وہ ریاست سے بغاوت کے مجرم ہوں۔

اسی تقلیدی ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ ہمارے ان مصلحین کی ساری توجہ بس یورپ کی تہذیب اور یورپ کے زبان و ادب کے حصول پر لگی رہی۔ سائنس اور ٹکنالوجی جو مغربی قوموں کی ترقی کا اصل راز ہے، اس کو مسلمانوں کے اندر رائج کرنے کی انہوں نے زیادہ کوشش نہیں کی۔ سر سید نے تو صراحۃً مسلمانوں کے لیے ٹکنیکل ایجوکیشن کی مخالفت کی اور "اعلیٰ درجہ کی دماغی تعلیم" کو سب سے مقدم قرار دیا۔ یہی اس زمانہ میں تعلیم جدید کے حامیوں کا عام نقطۂ نظر تھا۔ ان حضرات نے ساری توجہ صرف اس پر

دی کہ ایک ایسا گروہ پیدا ہو جائے جو مغربی تمدن اور یورپی ادب میں کمال حاصل کیے ہوئے ہو۔ کمال اتاترک کا نام نہاد انقلاب اور روس کے اشتراکی انقلاب میں صرف چند سال کا فرق ہے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ روس آج خلائی دور میں داخل ہو چکا ہے اور ترکی ابھی تک زمین پر بھی مستحکم مقام حاصل نہ کر سکا۔

یورپ جس ذہن کے تحت ہمارے علوم کی طرف بڑھا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں سے ان کے علوم اور ان کے ہنر کو لے کر اس کے ذریعہ سے انہیں شکست دی جائے۔ ان چیزوں کو اس نے وقت کی طاقت سمجھا اور اس کو اپنے دشمن کے مقابلے میں استعمال کیا۔ چنانچہ اپنی اس مہم کو یورپ نے "تقلید مشرق" یا "تقلید مسلم" کا نام نہیں دیا بلکہ اس کو روحانی صلیبی جنگ (Spiritual Crusades) کہا، جس کا مطلب یہ تھا کہ صلیبی لڑائیوں کی ہاری ہوئی بازی کو نئی تکنیک سے کامیاب بنایا جائے اور جب اس کوشش سے وہ اپنے کو ایک نئے انقلاب تک پہونچانے میں کامیاب ہو گئے تو اس کو انہوں نے یہ حیثیت دی گویا انہوں نے خود اپنی کھوئی ہوئی حیثیت دوبارہ حاصل کی ہے۔ چنانچہ یورپ میں اس نئے انقلاب کا تاریخی نام نشأۃ ثانیہ (Renaissance) رکھا گیا ہے۔ یہ فرانسیسی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے ـــــ نیا جنم (Rebirth) گویا یہ کوئی غیر سے حاصل کی ہوئی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ یورپ کی اپنی ہی متاع ہے جو اس نے دوبارہ پائی ہے۔ یورپ نے یہتے وقت اگرچہ ان علوم کو مسلمانوں سے لیا تھا۔ مگر اس نے حال کی کڑی کو حذف کر کے اس کا رشتہ ماضی سے ملایا اور اس کو مغرب کے ایک ملک ـــ یونان ـــ کی چیز قرار دے کر اس کو نشأۃ ثانیہ کہا۔ اس کے برعکس ہم نے ایسا نہیں کیا، حالانکہ یورپ جو چیز ہمیں دے رہا تھا وہ اضافہ شدہ حالت میں وہی سرمایہ تھا جو یورپ کو ہم نے عطا کیا تھا۔ مسلمان مغربی علوم کی طرف خالص تقلیدی ذہن کے ساتھ بڑھے ان کا یہ عمل سرسید کے یہاں "پیروئ مغرب" اور اتاترک کے یہاں "مغرب دوعزوہ" کے ہم معنیٰ تھا۔ ذہنیت کے اس فرق کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ یورپ ہمارے علوم کو سیکھ کر ہمیں شکست دے اور اس کے برعکس ہم مغرب کے علوم کو سیکھ کر صرف مغرب کے بھونڈے نقال بن کر رہ جائیں۔

مصطفےٰ کمال کی تحریک کا آخری نشانہ یہ تھا کہ ترک قوم ہیٹ اور پتلون پہننے لگے۔ اور سرسید کا منتہائے نظر یہ تھا کہ مسلم نوجوان مغربی ادبیات میں کمال حاصل کر لیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے ذہن کے تحت مغرب کی طرف بڑھنے کا وہی نتیجہ برآمد ہو سکتا تھا جو عملاً برآمد ہوا۔

یہ تاریخ جہاں ایک طرف ہماری غلطی کو بتاتی ہے وہیں اس کے اندر اس کا بھی نشان ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ہمیں وہی کرنا چاہیے جو مغربی قوموں نے ہمارے ساتھ کیا۔ مغربی علوم کو اس لیے سیکھنا تاکہ اس کے ذریعہ مغربی تہذیب کو شکست دے کر اسلام کو غالب کیا جائے۔ اگر ہمارے اندر یہ ذہن پیدا ہو جائے تو وہی نتیجہ برعکس شکل میں ظاہر ہوگا جو مغربی قوموں کے لیے ہمارے مقابلے میں ظاہر ہوا تھا۔

اسلام اور سائنس

ایک بار میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جنھوں نے سائنس میں ڈگری لی تھی اور اسی کے ساتھ انھوں نے مذہب اور تاریخ کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ وہ خدا اور مذہب کو نہیں مانتے تھے۔ بات چیت کے دوران انھوں نے کہا: اسلام کو اگر تاریخ سے نکال لیا جائے تو انسانی تاریخ میں کیا کمی رہ جائے گی۔ میں نے کہا: وہی کمی جو اسلام سے پہلے انسانی تاریخ میں تھی۔

زمین پر انسان ہزارہا سال سے آباد ہے۔ مگر معلوم تاریخ کے مطابق اسلام سے پہلے کسی بھی دور میں انسان کی رسائی اس شعبۂ فن تک نہ ہو سکی جس کو آج سائنس کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ بہت سادہ ہے۔ اسلام سے پہلے ہر دور میں انسان کے اوپر شرک کا غلبہ تھا۔ یہی شرک عالم فطرت پر تحقیق کرنے میں مانع تھا۔ کیونکہ شرک کے عقیدہ کے تحت فطرت کے مظاہر پوجنے کی چیز بنے ہوئے تھے، جب کہ سائنس کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب کہ ان مظاہر کو تحقیق و تسخیر کی چیز سمجھا جائے۔ مشرک انسان چاند کو دیوتا سمجھتا تھا، اس لئے اس کا ذہن اس رخ پر چل ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ چاند پر اپنے قدم رکھے۔ وہ سیلاب کو خدا کا جزء سمجھتا تھا، اس لئے اس کے لئے یہ سوچنا ممکن نہ تھا کہ سیلاب کو قابو میں لاکر اس سے بجلی پیدا کرے۔ اسلام نے معلوم تاریخ میں پہلی بار شرک کو مغلوب کر کے توحید کو غالب کیا۔ بالفاظ دیگر، اس ذہن کو فروغ دیا کہ خدا صرف ایک ہے، باقی تمام چیزیں مخلوق ہیں۔ اس طرح اسلام نے عالم فطرت کی تحقیق کا راستہ کھولا۔ اور بالآخر وہ تمام ترقیاں وجود میں آئیں جو قدرت پر فتح کے نتیجہ میں انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قدیم سائنسی پس ماندگی شرک کا بالواسطہ نتیجہ تھی اور جدید سائنسی ترقی توحید کا بالواسطہ نتیجہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام اس لئے نہیں آیا کہ وہ دنیا کو سائنس دے۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر اسلام نہ آتا تو سائنسی ترقیوں کا دروازہ انسان کے اوپر بند رہتا، جیسا کہ اس سے پہلے وہ انسان کے اوپر بند پڑا ہوا تھا۔ سائنسی تحقیق اور ترقی کے سلسلے میں توحید کی اس اہمیت کو آرنلڈ ٹائن بی (۱۹۷۵ - ۱۸۸۹) نے کھلے لفظوں میں تسلیم کیا ہے (ظہور اسلام، صفحہ ۱۳۶)

سائنس اسلامی انقلاب سے پیدا ہوئی

توحید کی بنیاد پر جو فکری انقلاب آیا اس کے بہت سے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ تھا کہ انسان عالم فطرت کو اس نظر سے دیکھنے لگا کہ وہ بے بس مخلوق ہے اور انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کو جانے اور اس کو اپنے کام میں لائے۔ اس ذہن کا آغاز اموی دور (۷۵۰ - ۶۶۱ء) میں دمشق میں ہوا۔ قدیم یونانی حکماء کے یہاں کیمیا چاندی سے سونا بنانے کے خبط کا نام تھا۔ خالد بن یزید بن معاویہ غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے کیمیا کو ایک طبیعی علم کی حیثیت سے ترقی دینے کی کوشش کی۔ عباسی خلافت کے زمانہ میں اس شعبہ علم نے بغداد میں مزید فروغ پایا اور اسپین اور سسلی تک پھیلتا چلا گیا۔ اس زمانہ میں مسلمان علمی اور تمدنی ترقی میں دنیا کی تمام قوموں سے آگے بڑھے

ہوئے تھے۔ تاریخ کے اس دور کو یورپ کے مورخین تاریک دور (Dark Ages) کہتے ہیں۔ مگر وہ صرف یورپ کے لئے تاریک تھا، نہ کہ مسلم دنیا کے لئے۔ ورلڈ بک انسائیکلوپیڈیا کا مقالہ نگار "ڈارک ایجز" کے عنوان کے تحت لکھتا ہے:

The term dark 'ages' cannot be applied to the splendid Arab culture which spread over North Africa and into Spain.

تاریک دور کی اصطلاح شاندار عرب کلچر پر چسپاں نہیں ہوتی جو اس زمانہ میں شمالی افریقہ اور اسپین میں پھیلا ہوا تھا
شرک کس طرح سائنسی تحقیق میں رکاوٹ تھا، اس کی وضاحت کے لئے یہاں ہم ایک مثال نقل کریں گے۔

قدیم یونان میں زمین اور سورج کی گردش کے بارے میں دو نظرئے پیش کئے گئے تھے۔ ایک تھا ارسٹارکس کا نظریہ جس میں زمین کو سورج کے گرد گھومتا ہوا فرض کیا گیا تھا۔ دوسرا ٹالمی کا نظریہ جس کے مطابق سورج زمین کے گرد گھوم رہا تھا۔ پہلے نظریہ کے مطابق زمین بظاہر گول تھی اور دوسرے نظریہ میں چپٹی۔ قسطنطین (۲۷۲-۳۳۷) کے مسیحیت قبول کرنے کے بعد جب مسیحیوں کو یورپ میں غلبہ ہوا تو انھوں نے ٹالمی کے نظریہ کی سرپرستی کی اور دوسرے نظریہ کو بزور دبا دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسیحیت نے حضرت مسیح کو خدا فرض کر لیا تھا اس عقیدہ کے مطابق زمین کو یہ تقدس حاصل تھا کہ وہ خداوند کی جنم بھومی ہے۔ اور جو کرہ خداوند کی جنم بھومی ہو وہ کسی دوسرے کرہ کا تابع (Satellite) کس طرح ہو سکتا تھا۔ زمین کو اس طرح مقدس سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بارے میں تحقیقی کام آگے نہ بڑھ سکا۔ مشرکانہ مذہب اور سائنس کے درمیان ٹکراؤ کی مزید تفصیلی مثالیں ڈریپر (۱۸۱۱-۱۸۸۲) کی کتاب مذہب اور سائنس کا تصادم (Conflcit between Science and Religion) میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

عباسی خلیفہ المامون (۷۸۶-۸۳۳) کے زمانہ میں بیت الحکمت قائم ہوا اور حکومت کے خصوصی تعاون کے تحت دونوں قسم کے ترجمے عربی زبان میں کئے گئے۔ مسلمانوں نے جب اعتقادی پیچیدگی سے آزاد ہو کر دونوں نظریات کو جانچا تو ان کو پہلا نظریہ حقیقت سے قریب تر نظر آیا۔ خلیفہ المامون جو خود بھی بہت بڑا عالم تھا اس نے اس مسئلہ کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اس نے ہیئت و جغرافیہ کے عالموں کو حکم دیا کہ وہ زمین کو گول فرض کرتے ہوئے اس کا محیط (Circumference) معلوم کریں اور اس کے لئے کسی کھلے میدان میں ایک زمینی درجہ (Terrestrial Degree) کی لمبائی کی پیمائش کریں اور اس کے بعد اس سے زمین کی پوری گولائی کا اندازہ کریں۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے پاس آلات حساب کے نام سے صرف زاویہ ناپنے کا سادہ آلہ (Quadrant) اصطرلاب، دھوپ گھڑی اور معمولی گلوب تھے۔ اس قسم کی چند چیزوں کے ذریعہ انھوں نے اپنی جدوجہد شروع کر دی۔

اس مقصد کے لئے سنجا (Palmyra) کا وسیع ہموار میدان منتخب کیا گیا۔ ایک مقام پر قطب شمالی کی بلندی کے ساتھ زاویہ قائم کر کے شمال کی جانب جریب سے ناپنا شروع کیا۔ ۵۶ ⅔ میل شمال کی جانب جانے سے قطب شمالی کی بلندی کے زاویہ میں ایک درجہ کی لمبائی بڑھ گئی۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ جب ایک درجہ کی مسافت سطح زمین پر

۵۶ ۲/۳ میل ہے تو زمین کا کل محیط (Circumference) ۲۰ ہزار میل سے زیادہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ ہر نقطہ پر تمام زاویوں کا مجموعہ ۳۶۰ درجہ ہوتا ہے۔ اور ۳۶۰ کو ۵۶ ۲/۳ میں ضرب دینے سے ۲۰۴۰۱ میل کا فاصلہ برآمد ہوتا ہے۔ دوبارہ یہی تجربہ دریائے فرات کے شمال میں صحرائے کوفہ میں کیا گیا اور دوبارہ وہی نتیجہ نکلا ——— یہ پیمائش حیرت انگیز طور پر قریب بہ صحت تھی۔ کیونکہ موجودہ زمانہ میں صحیح ترین پیمائش کے مطابق زمین کا محیط خط استوار پر ۲۵ ہزار میل ہے۔ قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کی سائنسی ترقی کی تفصیلات پروفیسر فلپ ہٹی (۱۸۸۶ -) کی کتاب تاریخ عرب (*History of the Arabs*) میں دیکھی جا سکتی ہے (۳۷۵)

سائنس کی مسلم دنیا سے علیحدگی

علم کے مختلف میدانوں میں یہ ترقیاں جاری تھیں کہ باہمی اختلافات کے نتیجہ میں عرب خلافت کا نظام ٹوٹ گیا۔ اور اسلام کا جھنڈا عثمانی ترکوں (۱۵۱۷ - ۱۹۲۴) نے سنبھالا۔ اس طرح سولھویں صدی عیسوی میں اسلام کی سیاسی نمائندگی کا مرکز عرب سے نکل کر ترکی کی طرف منتقل ہو گیا۔ یہاں سے تاریخ میں ایک نیا انقلاب آیا جس نے واقعات کے رخ کو بالکل دوسری طرف موڑ دیا۔

تاریخ کا یہ عجیب المیہ ہے کہ ایک شخص جو کسی پہلو سے مفید خدمت انجام دیتا ہے، وہی کسی دوسرے پہلو سے بہت بڑی مصیبت کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال اموی خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کی ہے۔ اس کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے خلفاء راشدین کی فہرست میں پانچویں خلیفہ راشد (عمر بن عبد العزیز) کا اضافہ کیا۔ مگر مورخ اسی خلیفہ کے تذکرہ میں اس ہیبت ناک غلطی کو بھی لکھتا ہے کہ اس نے اپنے زمانہ کے انتہائی اہم فوجی سرداروں کو ختم کرا دیا۔ جس کا نقصان یہ ہوا کہ ایشیا اور افریقہ میں اسلام کی بڑھتی ہوئی پیش قدمی اچانک ٹھپ ہو کر رہ گئی۔

یہی صورت عثمانی ترکوں کے ساتھ پیش آئی۔ ترکوں نے عین اس وقت اسلام کا جھنڈا سنبھال لیا جب کہ کمزور ہاتھوں میں پہنچ کر اس کے گرنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ کئی سو سال تک یورپ کی مسیحی طاقتوں کے مقابلہ میں اسلام کی دیوار بنے رہے۔ اس اعتبار سے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ یہی ترک ہیں جو اس حادثہ کا باعث بنے کہ مسلم دنیا میں ہونے والی سائنسی تحقیقات رک جائیں اور ان کا مرکز یورپ کی طرف چلا جائے۔

ترک انتہائی بہادر اور حوصلہ مند تھے۔ مگر ان کی کمزوری یہ تھی کہ وہ جاہل تھے۔ علمی تحقیق کے کام کی اہمیت نہ صرف یہ کہ وہ سمجھ نہیں سکتے تھے بلکہ وہ اس کو اپنے لئے ایک سیاسی خطرہ خیال کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ علم کے بڑھنے سے رعایا میں ان کے حق میں وفاداری کم ہو جائے گی اور ان کو قابو میں رکھنا نسبتاً زیادہ مشکل ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے علمی کام کے ساتھ سخت غیر رواداری کا ثبوت دیا۔ جب مسلم سیاست کا مرکز بدلا تو وہ لوگ جو بغداد اور دوسرے مراکز میں سائنس کی تحقیق کا کام کر رہے تھے، وہ منتقل ہو کر ترک دار السلطنت آستانہ میں جمع ہو گئے۔ عباسی خلفاء ان لوگوں کی بے حد قدر دانی کرتے تھے۔ انھوں نے ان کے اوپر درہم و دینار کی بارش کر رکھی تھی۔ مگر ترک ان کو اپنے لئے خطرہ سمجھ کر ان سے نفرت کرنے لگے۔ انھوں نے ان کی اس قدر حوصلہ شکنی کی کہ ترک حکومت میں ان کو اپنا

مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ چنانچہ یہ لوگ ترکی چھوڑ کر اٹلی اور فرانس جانا شروع ہو گئے۔ سائنسی تحقیق کا کام مسلم دنیا سے نکل کر مغربی دنیا میں منتقل ہو گیا۔ ترکوں نے علم اور اہل علم کی جس طرح حوصلہ شکنی کی اس کی دردناک تفصیل محمد کرد علی شامی کی کتاب تاریخ الحضارۃ العربیہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

مغربی دنیا میں ان سائنس دانوں کی زبردست پذیرائی ہوئی۔ صلیبی جنگوں (۱۲۷۱-۱۰۹۵) میں مسلمانوں کے مقابلہ میں یورپی قوموں کو شکست اس لئے ہوئی تھی کہ مسلمان علم و فن میں ان سے بڑھے ہوئے تھے۔ ان جنگوں میں ابتداءً رومی فوجوں نے یونانی آگ (Greek Fire) استعمال کی جس سے مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ "یونانی آگ" ایک قسم کی پچکاری تھی جس میں آتش گیر کیمیائی مرکب بھر کر دشمن کی طرف پھینکا جاتا تھا۔ مسلم سائنس دانوں نے اس کے مقابلہ میں ایک اور چیز ایجاد کی۔ اس میں روغن نفط (معدنی تیل) استعمال ہوتا تھا۔ اس کی مار زیادہ دور تک تھی اور اس کا نقصان بھی یونانی آگ سے بہت بڑھا ہوا تھا۔

یورپ کے مسیحی قدرتی طور پر مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنی علمی پس ماندگی کو دور کرنے کے لئے بیتاب تھے۔ اب جو مسلم دنیا کے اہل علم ان کے یہاں پہنچے تو انھوں نے ان کے ساتھ زبردست تعاون کیا۔ یورپ میں علمی تحقیق کا وہ کام دگنی شدت کے ساتھ ہونے لگا جو اس سے پہلے مسلم دنیا میں ہو رہا تھا۔ سولھویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی تک، تقریباً تین سو سالہ عمل کے نتیجہ میں یورپ میں وہ انقلاب آیا جس کو سائنسی اور صنعتی انقلاب کہا جاتا ہے۔ مغرب کی سائنسی ترقی میں مسلمانوں کے حصہ کے بارے میں مزید تفصیل بریفالٹ کی کتاب تعمیر انسانیت (Making of Humanity) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

سولھویں صدی تک مسلمان علم کے میدان میں استادی کے مقام پر تھے۔ مگر اس کے بعد کی صدیوں میں یورپ نے جو ترقیاں کیں اس نے مسلمانوں کو شاگردی کے مقام پر پہنچا دیا۔ مسلمان خود اپنی لائی ہوئی انقلابی دنیا میں دوسری قوموں سے پیچھے ہو گئے۔ تاہم اب بھی یہ موقع تھا کہ وہ یورپ کی تحقیقات سے فائدہ اٹھا کر آگے بڑھیں اور وہ واقعہ دوبارہ نئی شکل میں ظہور میں آئے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں یورپ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ مسلمانوں کے علوم کو بنیاد بنا کر یورپ ان سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اب مسلمان یورپ کے علوم کو لے کر مزید آگے کی ترقیاں حاصل کر سکتے تھے۔ مگر یہاں دو خاص وجہیں راستہ میں حائل ہو گئیں۔ ایک تاریخی امکان واقعہ بننے سے رہ گیا۔

سائنس کے معاملہ میں موجودہ مسلمانوں کی غفلت

۱۔ صدیوں تک سائنسی علوم سے دور رہنے کے بعد یورپ کے ذریعہ جب سائنس مسلمانوں کی طرف آئی تو وہ صرف ایک علم کے طور پر نہیں آئی۔ بلکہ وہ ملک گیری اور استعمار کے جلو میں آئی۔ مسلمانوں کے پاس یہ سائنس لے کر وہ لوگ آرہے تھے جنھوں نے مسلمانوں سے ان کی عظمت اور ان کے اقتدار کو چھینا تھا۔ ان کی تہذیب اور ان کے مذہبی شعائر پر حملے کئے تھے۔ اس موقع پر مسلمان اس دانش مندی کا ثبوت نہ دے سکے کہ وہ مغربی سائنس کو مغربی سیاست سے الگ کر کے دیکھیں۔ انھوں نے دونوں کو ایک سمجھا۔ وہ جس طرح مغربی قوموں کے دشمن بنے، اسی طرح

وہ مغربی علوم کے بھی دشمن بن گئے۔ جب کہ دوسری قومیں مغرب سے ان کے علوم سیکھ رہی تھیں، مسلمان ان کو دشمن کی چیز سمجھ کر ان سے دور بھاگ رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان دوسری قوموں سے کم از کم سو سال علم میں پیچھے ہو گئے، قوموں کے اوپر علمی امام بننے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔

۲۔ مزید نقصان یہ ہوا کہ طویل غفلت کے بعد مسلمانوں میں جو لوگ علم کے مبلغ بن کر اٹھے وہ اس کام کے پوری طرح اہل نہ تھے۔ انھوں نے ایک صحیح کام کو غلط طریقہ سے انجام دینے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں ان کو وہ قبولیت حاصل نہ ہو سکی جو باعتبار حقیقت انھیں حاصل ہونی چاہئے تھی۔

مثال کے طور پر علم جدید کی اہمیت ثابت کرنے کے لئے انھوں نے یہ کیا کہ قرآن و حدیث میں جہاں جہاں "علم" کا لفظ آیا ہے اس کو انھوں نے ان سیکولر علوم کا مصداق بتایا جو آج یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ یہ ایک صحیح بات کے لئے غلط دلیل پیش کرنا تھا۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن و حدیث میں جس علم کی فضیلت بیان ہوئی ہے اس سے مراد علم دین ہے نہ کہ سیکولر یا سائنسی علوم۔ ان علوم کو حاصل کرنا یقیناً مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔ مگر ان علوم کی اہمیت آیتِ قوت سے ثابت ہوتی ہے نہ کہ آیتِ علم سے — قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اس قوت کو حاصل کرو جس سے تمھارے حریف کے اوپر تمھاری دھاک قائم ہو۔ موجودہ زمانہ میں سائنسی علوم نے یہی مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس لئے سائنسی علوم کا حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔ سائنسی علوم میں دستگاہ حاصل کئے بغیر مسلمان آج کی دنیا میں قوت مرہبہ (انفال ۶۰) کے مالک نہیں بن سکتے، اس لئے اس قرآنی حکم کی تعمیل میں موجودہ حالات کے لحاظ سے یہ بات بھی شامل ہو گی کہ وہ ان علوم کو حاصل کریں اور ان کو اسلام اور مسلمانوں کی تقویت کا ذریعہ بنائیں۔

موجودہ زمانہ کے تعلیمی مصلحین کی اسی غلطی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کا دینی طبقہ ان کا سخت مخالف ہو گیا۔ طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم (حدیث) جیسی نصوص کا مطلب دینی طبقہ کے نزدیک متفقہ طور پر یہ تھا کہ اس سے مراد کتاب و سنت کا علم حاصل کرنا ہے۔ جب تعلیمی مصلحین نے اس طرح کی آیتوں اور حدیثوں کو موجودہ زمانہ کے "دنیاوی" علوم پر چسپاں کیا تو دینی طبقہ کو یہ بات سراسر اسلام کی تحریف نظر آئی۔ وہ اس کا دشمن بن کر کھڑا ہو گیا۔ تعلیمی مصلحین بلاشبہ غلطی پر تھے۔ مگر دینی نمائندوں سے بھی یہ غلطی ہوئی کہ وہ مقصد اور استدلال دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہ دیکھ سکے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو انھیں نظر آتا کہ تعلیمی مصلحین جن علوم کی اہمیت کو آیت علم سے غلط طور پر ثابت کر رہے ہیں وہ آیت قوت سے بالکل درست طور پر ثابت ہو رہی ہے۔ اس لئے اس معاملہ میں اصل کام استدلال کی تصحیح ہے نہ کہ خود مقصد کو باطل قرار دینا۔

اسلام میں سائنس کی اہمیت

اسلام میں سائنس کی اہمیت کے متعدد وجوہ ہیں۔ یہاں چند چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ سائنس، سادہ طور پر، عالم حقائق کے مطالعہ کا نام ہے۔ قرآن میں یہی صفت اہل ایمان کی بتائی گئی ہے

کہ وہ زمین و آسمان کی بناوٹ پر غور کرتے ہیں (یتفکرون فی خلق السماوات والارض، آل عمران ۱۹۱) اس اعتبار سے ایک سائنس داں وہی کام کرتا ہے جو ایک مومن کرتا ہے۔ تاہم دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ سائنس داں کا عمل صرف تحقیق کے لئے ہوتا ہے اور مومن کا عمل عبرت کے لئے۔ سائنس داں کے پیش نظر علم برائے علم ہوتا ہے اور مومن کے پیش نظر علم برائے مقصد۔ سائنس داں اضافۂ علم پر مطمئن ہوتا ہے اور مومن اضافۂ ایمان پر۔

ذہن کا یہ فرق دونوں کے طرز مطالعہ میں بہت بڑا فرق پیدا کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سائنسداں اشیاء کی ماہیت کو چھوڑ کر صرف اشیاء کے خواص کے مطالعہ تک اپنے کو محدود رکھتا ہے۔ وہ اشیاء کی کارکردگی کو ان کی معنویت سے جدا کر دیتا ہے۔ سائنس داں کو ایسا اس لئے کرنا پڑتا ہے کہ وہ صرف اپنی عقل کی رہنمائی میں کائنات کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اور انسان کی عقل قطعیت کے ساتھ صرف قابل تجربہ چیزوں کو دیکھ پاتی ہے، اس لئے اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ کائنات کے قابل تجربہ پہلوؤں تک اپنے مطالعہ کو محدود رکھے۔ مگر مومن اپنی عقل کے ساتھ نبوت کی رہنمائی کو تسلیم کئے ہوئے ہوتا ہے۔ اس لئے وہ خواص اشیاء سے گزر کر حقائق اشیاء تک اپنے مطالعہ کو لے جاتا ہے۔ وہ "مخلوق" کو اس کے "خالق" کے ساتھ شامل کر کے دیکھتا ہے۔ یہ فرق مومن کے مشاہدۂ کائنات میں زبردست معنویت پیدا کر دیتا ہے۔ اس کو ساری کائنات صفات خداوندی کا ظہور نظر آنے لگتی ہے۔ کائنات کو پاتے ہی وہ اس خدا کو بھی پالیتا ہے جس پر وہ پیغمبر کے واسطہ سے ایمان لایا ہے۔

۲۔ قرآن میں کائناتی واقعات کو قرآنی پیغام کے حق میں بطور استدلال پیش کیا گیا ہے۔ گویا قرآن میں جو بات نظری طور پر کہی گئی ہے، کائنات اس کے حق میں واقعاتی دلیل ہے۔ اس اعتبار سے پوری سائنس قرآن کا علم کلام ہے۔ کیونکہ سائنس کسی سائنس داں کے خود ساختہ علم کا نام نہیں بلکہ وہ خدا کی کائنات میں کام کرنے والے قوانین کی تلاش کا نام ہے۔ ان قوانین کا جو حصہ بھی سائنس دریافت کرتی ہے وہ خدا کی کارفرمائیوں کی ایک جھلک ہوتی ہے، وہ خدا کی آیتوں میں سے ایک آیت (نشانی) کا انسانی علم میں آنا ہوتا ہے۔ سائنس داں کے لئے سائنس علم برائے علم ہے یا زیادہ سے زیادہ علم برائے تعمیر دنیا۔ مگر مومن کے لئے سائنس ایک علمی ہتھیار ہے جس سے وہ دعوت حق کی جدوجہد میں کام لیتا ہے، جس سے وہ اپنی بات کو مدلل کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

۳۔ سائنس کا تیسرا پہلو، اسلامی نقطۂ نظر سے، وہی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔ یعنی وہ موجودہ زمانہ میں قوت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے اسلام اور مسلمانوں کو سربلند کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سائنس کی قوت کو پوری طرح فراہم کیا جائے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ مسلمان سائنس کی تحقیق و تحصیل میں آگے بڑھیں۔ حتیٰ کہ وہ اس میں امامت کا درجہ حاصل کر لیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں ساری مسلم دنیا میں سیاسی آزادی کی تحریکیں اٹھیں۔ ان تحریکوں کے مسلم قائدین کا یہ خیال تھا کہ بیرونی سیاسی قبضہ سے آزاد ہونے کا نام غلبہ ہے۔ وہ سیاسی آزادی کو

اسلام کی سربلندی کے ہم معنی سمجھتے تھے۔ مگر آج جب کہ بے شمار قربانیوں کے بعد تمام مسلم ممالک آزاد ہو چکے ہیں، آج بھی وہ ان غیر مسلم قوموں کے محکوم ہیں جو سائنس اور ٹکنالوجی میں ان سے بڑھی ہوئی ہیں۔ ان کی سیاسی آزادی ان کو آج کی دنیا میں برتری کا مقام نہ دے سکی۔ کیونکہ وقت بتانے والی گھڑی سے لے کر جنگ لڑنے والے سامان تک ہر چیز کے لئے وہ انھیں قوموں کے محتاج ہیں، حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہر چیز کا تعلق سائنس اور ٹکنالوجی سے ہوگیا ہے۔ اس لئے جو قوم ان چیزوں میں پیچھے ہو وہ مقابلہ کی اس دنیا میں آگے کی صف میں جگہ نہیں پا سکتی۔

آخری بات

نئی دہلی میں جنتر منتر روڈ سے گزرنے والا ایک عجیب وغریب طرز کی عمارت دیکھتا ہے جس کا نام "جنتر منتر" ہے۔ اسی کے اوپر سڑک کا نام جنتر منتر روڈ رکھا گیا ہے۔ جنتر منتر دراصل پرانے زمانہ کی رصد گاہ ہے جس کو اٹھارویں صدی کے نصف اول میں جے پور کے راجہ جے سنگھ نے بنوایا تھا۔ جے سنگھ کو علم فلکیات کا بہت شوق تھا۔ ہندوستان کے اس راجپوت راجہ نے اپنے اس شوق کی تکمیل کے لئے صرف جے پور میں ہی ایک بڑی رصد گاہ نہیں بنوائی بلکہ دہلی، متھرا، بنارس اور اجین میں بھی رصد گاہیں تعمیر کرائیں۔ دہلی کا جنتر منتر آج بھی راجہ کے اس شوق کی یاد دلاتا ہے۔

ان رصد گاہوں کے ذریعہ اس دور کے علمائے فلکیات چاند اور ستاروں کی رفتار معلوم کرتے تھے۔ ان رصد گاہوں کے ذریعہ موسم کا پتہ چلایا جاتا تھا۔ وہ اس کی مدد سے ستاروں اور زمین کا فاصلہ ناپتے تھے۔ رات کو چاند کی روشنی اور دن کو سورج کی روشنی کی مدد سے وقت کا اندازہ کرتے تھے۔ عمارت کی کھڑکیاں، دریچے اور دیواروں کے سوراخ خود بخود سال کا پورا کیلنڈر ترتیب دے دیتے تھے۔

قرون وسطیٰ میں ساری دنیا کا علمی اور تعمیری کام مسلمانوں کی علمی اور تعمیری ترقیوں کی نقل ہوتا تھا۔ چنانچہ مہاراجہ جے سنگھ کی یہ رصد گاہ بھی عباسی رصد گاہوں کی نقل تھی۔ وہ ٹھیک اس انداز سے بنائی گئی تھی جیسی خلیفہ مامون رشید نے ایک ہزار سال پہلے بغداد میں بنوائی تھی۔

قدیم دور میں علم کی امامت مسلمانوں کو حاصل تھی۔ چنانچہ ساری دنیا میں ان کے طریقوں کی تقلید کی جاتی تھی۔ مگر بعد کے زمانہ میں ان کی غفلت سے امامت کا یہ مقام مغربی قوموں نے حاصل کر لیا۔ تین سو سال پہلے جب ایک شخص فلکیات کے مطالعہ کے لئے "رصد گاہ" بنانا چاہتا تو وہ بغداد کے نمونہ کی نقل کرتا تھا۔ مگر آج جب کسی ملک میں "رصد گاہ" تعمیر کی جاتی ہے تو اس کا نقشہ اور سامان مغرب کے ماہرین سے حاصل کیا جاتا ہے ـــــــ یہی وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں کی عزت وسربلندی کا سفر ختم ہوا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے مسلمان دوبارہ اپنے سفر کا آغاز کر سکتے ہیں۔

نوٹ: علی گڑھ کے آل انڈیا سمینار بعنوان اسلام اور سائنس (۱۱-۱۲ نومبر ۱۹۸۰) میں پڑھنے کے لیے لکھا گیا۔

اسلام پندرھویں صدی ہجری میں

جب بارش کا موسم آتا ہے اور ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ کالے بادل فضا میں منڈلانا شروع کرتے ہیں تو خدا کا فرشتہ خاموش زبان میں یہ اعلان کرتا ہے کہ کون ہے جو اپنا بیج زمین میں ڈالے تاکہ خدا سارے کائناتی نظام کو اس کی موافقت میں جمع کر دے اور اس کے بعد اس کے بیج کو سات سو گنا زیادہ فصل کی صورت میں اس کی طرف لوٹائے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ آج دین کا بھی ہے۔ خدا نے آج سارے اسباب دین کی موافقت پر جمع کر دئے ہیں۔ سیکڑوں برس کی گردش کے بعد زمانہ نے فیصلہ کی جو بنیاد فراہم کی ہے وہ عین ہمارے حق میں ہے۔ اب ان امکانات کو بروئے کار لانے کے لئے ضرورت ہے کہ کچھ خدا کے بندے اٹھیں جو صرف خدا کے لئے اپنے آپ کو اس مشن میں دے دیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو اس مشن کے حوالے کریں گے ان کے لئے خدا کا وعدہ ہے کہ وہ ان کے عمل کا سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ انعام آخرت میں لوٹائے گا اور اسی کے ساتھ اگر اس نے چاہا تو موجودہ دنیا میں بھی۔

اسلامی تاریخ دو بڑے مرحلوں سے گزر چکی ہے اور اب اس کے تیسرے مرحلہ کا آغاز ہونا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون لوگ ہیں جن کو اس تیسرے مرحلہ کو شروع کرنے کی سعادت حاصل ہوگی۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ آج اس سے بڑا کوئی کام نہیں۔ آج اس سے بڑا کوئی میدان عمل نہیں جس میں قوت والے اپنی قوت لگائیں اور اس سے بڑی کوئی مد نہیں جس میں پیسہ والے اپنا پیسہ خرچ کریں۔

اسلام کیا ہے

اسلام ایک لفظ میں توحید کا نام ہے۔ جس طرح درخت اصلاً ایک بیج کا نام ہوتا ہے اسی طرح اسلام کی اصل حقیقت توحید ہے اور بقیہ تمام چیزیں اسی توحید کے مظاہر اور تقاضے۔ توحید بظاہر یہ ہے کہ خدا کئی نہیں ہیں بلکہ خدا ایک ہے۔ مگر یہ توحید کوئی خشک گنتی کا عقیدہ نہیں ہے جو کچھ مقرر الفاظ دہرا کر آدمی کو حاصل ہو جائے۔ یہ اپنی ذات کی نفی کی قیمت پر خدا کا اثبات ہے، یہ خدا کے مقابلہ میں اپنے آپ کو دریافت کرنا ہے۔ خدا قادر مطلق ہے اور بندہ عاجز مطلق۔ کوئی بندہ جب خدا کے ساتھ اپنی اس نسبت کو پالیتا ہے تو اسی کا نام توحید ہے۔

توحید یا ایک اللہ پر ایمان ایک شعوری فیصلہ ہے۔ یہ حق کا انکار کرنے کی قدرت رکھتے ہوئے حق کو مان لینا ہے۔ اس اعتبار سے ایمان حقیقت واقعہ کے اعتراف کا دوسرا نام ہے۔ اور حقیقت واقعہ کا شعوری اعتراف بلاشبہ اس دنیا کی سب سے بڑی نیکی ہے۔

یہی توحید دنیا کی تمام چیزوں کا دین ہے۔ زمین اور سورج انتہائی کامل صورت میں خدا کی تابعداری

کررہے ہیں۔ شہد کی مکھی کمال درجہ پابندی کے ساتھ خدا کی مقرر کی ہوئی راہوں پر چل رہی ہے۔ مگر ان میں سے کسی کی محکومی شعوری محکومی نہیں۔ وہ خود اپنی بناوٹ کے اعتبار سے ویسے ہی ہیں جیسا کہ انھیں ہونا چاہئے۔ ساری کائنات میں یہ صرف انسان ہے جو ارادہ اور شعور کے ساتھ اپنے کو محکوم بناتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز کامل طور پر خدا کی فرماں برداری کررہی ہے۔ مگر انسان کی فرماں برداری اختیاری ہے اور دوسری چیزوں کی فرمانبرداری بے اختیاری۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں خدا کو سجدہ کررہی ہیں۔ مگر ایک انسان جب سجدہ کرتے ہوئے زمین پر اپنا سر رکھتا ہے تو یہ تمام عالم کائنات کا سب سے زیادہ عجیب واقعہ ہوتا ہے۔ کیونکہ دوسری چیزیں مجبورانہ سجدہ کررہی ہیں مگر انسان شعور اور ارادہ کے تحت اپنا سر خدا کے آگے جھکا دیتا ہے۔

انسان کے ذریعہ اس کائنات میں شعوری اور اختیاری محکومی کا واقعہ وجود میں آتا ہے جس سے بڑا کوئی دوسرا واقعہ نہیں۔ یہی انسان کی اصل قیمت ہے۔ انسان وہ نادر مخلوق ہے جو اس کائنات میں شعور قدرت کے مقابلہ میں شعور عجز کی دوسری انتہا بناتا ہے۔ وہ کائنات کے صفحہ پر "عدد" کے مقابلہ میں "صفر" کا ہندسہ تحریر کرتا ہے۔ وہ خداوندی انا کے مقابلہ میں اپنے بے انا ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ ایک شخص کا موحد بننا اس آسمان کے نیچے ظاہر ہونے والے تمام واقعات میں سب سے بڑا واقعہ ہے جس کا انعام کوئی سب سے بڑی چیز ہی ہوسکتی ہے۔ اسی سب سے بڑی چیز کا نام جنت ہے۔ جنت کسی کے عمل کی قیمت نہیں۔ جنت کسی بندے کے لئے خدا کی یہ بخشش ہے کہ اس کے بندے نے اپنے رب کو وہ چیز پیش کردی جو کائنات میں کسی نے پیش نہ کی تھی۔ اس لئے خدا نے بھی اس کو وہ چیز دے دی جو اس نے کسی دوسری مخلوق کو نہیں دیا تھا۔

جنت کیا ہے

جنت ایک انتہائی حیرت انگیز دنیا ہے جو خدا نے اپنے خاص بندوں کے لئے بنائی ہے۔ وہاں خدا کی صفات کمال اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ جنت کے بارے میں قرآن میں ہے کہ وہاں نہ حزن ہوگا اور نہ خوف۔ یہ ناقابل قیاس حد تک انوکھی صفت ہے۔ کیوں کہ دنیا میں ہم جانتے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا دولت مند یا حکمراں اس پر قادر نہیں کہ وہ غموں اور اندیشوں سے خالی زندگی اپنے لئے حاصل کرلے۔ جنت کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ وہاں ہر طرف "سلام سلام" کا چرچا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت ایسے بلند انسانوں کی آبادی ہے جو ہر قسم کے منفی جذبات سے خالی ہوں گے۔ ان کے دلوں میں دوسروں کے لئے سلامتی اور خیرخواہی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ جنت کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ وہاں آدمی جو غذا کھائے گا اور جو مشروبات پئے گا وہ بول و براز کی شکل میں نہیں خارج ہوگا بلکہ ایک خوشبودار ہوا نکلے گی اور اس کے ذریعہ تمام کثافت خارج ہوجائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت ایسا لطیف مقام ہے جہاں غلاظت بھی بشکل خوشبو خارج

ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جنت میں نیند نہیں ہوگی جب کہ وہاں آدمی کی ہر خواہش پوری کی جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت اتنی لذیذ جگہ ہے کہ آدمی ایک رات کی نیند کے بقدر بھی اس سے جدا ہونا پسند نہ کرے گا حالاں کہ وہ اس کے اندر کھرب ہا کھرب سال سے بھی زیادہ مدت تک رہے گا۔ کیسا عجیب ہوگا جنت کا پڑوسں اور کیسی عجیب ہوگی جنت کی زندگی۔ پھر ان سب سے بڑھ کر یہ کہ جنت وہ مقام ہے جہاں آدمی اپنے خدا کو دیکھ سکے گا۔ وہ خدا جو ہر قسم کی ناقابل قیاس خوبیوں کا مالک ہے۔ وہ خدا جس نے عدم سے وجود کو پیدا کیا۔ وہ خدا جو آسمان کی عظمتوں کا خالق ہے۔ وہ خدا جس نے سورج کو چمکایا۔ وہ خدا جو درختوں کی سرسبزی اور پھولوں کی مہک میں ظاہر ہوا۔ ایسا خدا کیسا عظیم اور کیسا حسین ہوگا اس کا تصوراتی قیاس بھی کسی کے لیے ممکن نہیں۔ جس جنت میں ایسا نفیس ماحول ہو، جہاں کائنات کے رب کا دیدار حاصل ہوتا ہو اس کی لذتوں اور راحتوں کو کون بیان کر سکتا ہے

مومنانہ زندگی

ایسی قیمتی جنت کسی کو سستے داموں نہیں مل سکتی۔ یہ تو اسی خوش نصیب روح کا حصہ ہے جو حقیقی معنوں میں خدا کا مومن بندہ ہونے کا ثبوت دے۔ مومن ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی عام دنیادارانہ زندگی کے ساتھ کچھ اسلامی عملیات کا جوڑ لگالے۔ مومن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام ہی آدمی کی پوری زندگی بن جائے۔ اسلام ہاتھ کی چھنگلیا نہیں بلکہ وہ آدمی کا پورا ہاتھ ہے۔ جو شخص اسلام کو اپنی زندگی میں غیر موثر ضمیمہ بنا کر رکھے اس نے اسلام کی توہین کی۔ اسی طرح مومن ہونے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ آدمی "خدائی فوجدار" بن کر کھڑا ہو جائے اور حکمرانوں کے خلاف اپوزیشن کا پارٹ ادا کرنے کو اسلام کا کمال سمجھنے لگے۔ اس قسم کی چیزیں اسلام نہیں، وہ خود ساختہ سیاست کو اسلام کا نام دینا ہے۔ پہلی قسم کے لوگ اگر دین کی کم قدری کے مجرم ہیں تو دوسری قسم کے لوگ دین کی تحریف کے۔ اور یہ دونوں ہی چیزیں آدمی کو خدا کی ناراضگی کا مستحق بناتی ہیں نہ کہ خدا کے انعام کا۔

مومن وہ ہے جس کے سینہ میں اسلام ایک نفسیاتی طوفان بن کر داخل ہوا ہو۔ جو خدا کو اتنا قریب پائے کہ اس سے اس کی سرگوشیاں جاری ہو جائیں۔ جس کی تنہائیاں خدا کے فرشتوں سے آباد رہتی ہوں۔ جس کے اسلام نے اس کی زبان میں خدا کی لگام دے رکھی ہو۔ اور جس کے ہاتھوں اور پیروں میں خدا کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہوں۔ جس کے اسلام نے اس کو حشر کی آمد سے پہلے حشر کے میدان میں کھڑا کر دیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کافر پر مرنے کے بعد گزرنے والا ہے وہ مومن پر جیتے جی اسی دنیا میں گزر جاتا ہے۔ دوسرے لوگ جن باتوں کو اس وقت پائیں گے جب کہ خدا غیب کا پردہ پھاڑ کر سامنے آجائے گا، مومن ان باتوں کو اس وقت پالیتا ہے جب کہ خدا ابھی غیب کے پردہ

میں چھپا ہوا ہے۔ مومن پر قیامت سے پہلے قیامت گزر جاتی ہے جب کہ دوسروں پر قیامت اس وقت گزرے گی جب کہ وہ عملاً آچکی ہو گی۔

اسلامی دعوت

آگ کا انگارہ جب خارج کو اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے تو اسی کو ہم آنچ کہتے ہیں۔ برف کا تودہ جب اپنے ماحول کو اپنی حقیقت سے متعارف کرتا ہے تو اسی کو ٹھنڈک کہا جاتا ہے۔ یہی معاملہ مومن کا بھی ہے۔ زمین پر کسی مومن کا وجود میں آنا خود ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ اسلامی دعوت ضرور وجود میں آئے گی۔ کسی نفس انسانی میں جب وہ خدائی بھونچال آتا ہے جس کو اسلام کہا گیا ہے تو اس کے بعد لازمی نتیجہ کے طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے باہر کی دنیا اس سے باخبر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہی اسلامی دعوت کا آغاز ہے۔

اسلامی دعوت فرد انسانی میں انقلاب لانے کی دعوت ہے نہ کہ کسی قسم کے قومی یا بین اقوامی ڈھانچہ میں الکھیڑ پچھاڑ کرنے کی۔ اسلامی انقلاب اصلاً ایک نفسیاتی انقلاب ہے اور نفسیاتی انقلاب کسی نفس ہی کے اندر وقوع میں آسکتا ہے۔ نفس کا وجود صرف ایک فرد میں ہوتا ہے اس لئے اسلام کی گھنٹی بھی ایک فرد ہی میں گھنٹی ہے۔ قومی یا بین اقوامی ڈھانچہ کا اپنا کوئی نفسیاتی وجود نہیں۔ اس لئے قومی یا بین اقوامی ڈھانچہ کو اسلامی دعوت کا نشانہ بنانا ایسا ہی ہے جیسے خالی فضا میں تیر مارنا۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کسی گروہ کے قومی حالات یا کسی جغرافیہ کے تمدنی احوال لوگوں میں ہلچل پیدا کرتے ہیں اور اس کے بعد ان کے درمیان ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر مسلمانوں کے اندر ان کے قومی یا سیاسی حالات کے نتیجہ میں کوئی حرکت اٹھ کھڑی ہو تو اس کا نام اسلامی تحریک نہیں ہو جائے گا۔ اگر مسلمان اپنے قومی دشمن سے تصادم کو جہاد کہیں یا اپنی قومی تعمیر کو اسلامی نظام کی اصطلاحوں میں بیان کریں تو یہ اسلام نہیں بلکہ غیر اسلام کو اسلام کا نام دینا ہے جو آدمی کو صرف سزا کا مستحق بناتا ہے نہ یہ کہ اس کی بنا پر آدمی کو کوئی اسلامی انعام دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں اس قسم کی اسلامی تحریکیں عظیم الشان پیمانہ پر اٹھیں مگر عملاً وہ اس طرح بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں جیسے خدا کے نزدیک ان کی کوئی قیمت ہی نہ تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کے سب قومی ہنگامے ہیں اور کسی قوم کے قومی ہنگاموں کا نام اسلام نہیں۔

اسلامی دعوت کی تحریک ایک لفظ میں جنت کی طرف بلانے کی تحریک ہے۔ جنت خدا کی لطیف و نفیس دنیا ہے جہاں وہ لوگ بسائے جائیں گے جو اخلاق خداوندی کی سطح پر جئے ہوں۔ جنھوں نے دنیوی تعلقات میں کمال انسانیت کا ثبوت دیا ہو، جو خدا کی ابدی دنیا کے اثر سے متحرک ہوئے ہوں نہ کہ سیاسی اور معاشی حالات کے اثر سے۔ آج کی دنیا میں اسی کا چناؤ ہو رہا ہے۔ جو لوگ اپنی نفسیات اور کردار کے اعتبار سے جنتی ماحول میں بسانے کے قابل

ٹھہریں گے ان کو چھانٹ کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد بقیہ تمام لوگ خدا کی رحمتوں سے محروم کر کے دور پھینک دئے جائیں گے تاکہ ابدی طور پر تاریکیوں کے غار میں بھٹکتے رہیں۔

انسان کے سوا بقیہ دنیا بے حد حسین ہے۔ ہرے بھرے درختوں اور نرم و نازک پھولوں کو دیکھئے، زمین و آسمان کے قدرتی مناظر کا معائنہ کیجئے۔ ان کی بے پناہ کشش آپ کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لے گی کہ ان سے نظر ہٹانے کا جی نہ چاہے گا۔ مگر اس کے مقابلہ میں انسانی دنیا ظلم اور گندگی کا کوڑا خانہ بنی ہوئی ہے۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بقیہ دنیا کی سطح پر خدا کی مرضی براہ راست اپنی پوری شکل میں نافذ ہے، یہ دنیا ویسی ہی ہے جیسا کہ خدا چاہتا ہے کہ وہ ہو۔ اس کے برعکس انسان کو خدا نے آزادی دے دی ہے۔ اسی آزادی کے غلط استعمال نے انسانی دنیا کو جہنم کدہ بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام خوبیوں کا مالک صرف خدا ہے۔ خدا جہاں اپنے اختیار کو روک لے وہیں سے جہنم شروع ہو جاتی ہے اور خدا جب اپنے اختیار کو نافذ کر دے تو اسی کا نام جنت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ خدا نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا کہ انسان کو آزادی دے دی کہ وہ خدا کی حسین دنیا کو اپنی باغیانہ کارروائیوں سے عذاب خانہ بنا دے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بغیر وہ قیمتی انسان چنے نہیں جا سکتے تھے جو جنت میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔ خدا کی وسیع دنیا اپنی ان گنت چیزوں کے ساتھ مکمل طور پر خدا کی اطاعت گزار ہے۔ حقیر چیونٹی سے لے کر عظیم کہکشانی نظاموں تک کوئی چیز بھی نہیں جو خدا کی مرضی سے ادنیٰ انحراف کرتی ہو۔ تاہم یہ تمام چیزیں اس لئے محکوم ہیں کہ وہ بے اختیار ہیں۔ فرماں برداری کے سوا کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا ان کے لئے ممکن نہیں۔ اب خدا کو ایسی باشعور اور حقیقت پسند مخلوق درکار تھی جو اختیار رکھتے ہوئے بے اختیار ہو جائے۔ جو کسی جبر کے بغیر خود اپنے آزاد ارادہ سے اپنے کو خدا کا محکوم بنا لے۔ یہی وہ انتہائی نادر ہستیاں ہیں جن کو چھانٹنے کے لئے خدا کا یہ عظیم کارخانہ آباد کیا گیا ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے لے کر آج تک انسانی ذہن کو جو چیز سب سے زیادہ پریشان کرتی رہی ہے وہ انسان کی دنیا میں خرابی کا مسئلہ (Problem of Evil) ہے۔ ایک مفکر کے الفاظ میں ساری انسانی تاریخ ظلم اور برائی کا رجسٹر معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان اپنی آزادی کا انتہائی ظالمانہ استعمال کرتا ہے۔ مگر اتنی بڑی برائی کو خدا نے صرف اس لئے گوارا کیا کہ اس کے بغیر اس اعلیٰ نوع کا انتخاب نہیں کیا جا سکتا تھا جو جنت میں بسائے جانے کے قابل ہو۔ اختیار اور آزادی کے ماحول ہی میں وہ انسان چنے جا سکتے ہیں جن کے متعلق خدا کے نگراں فرشتے یہ گواہی دیں کہ یہ وہ افراد ہیں جنھوں نے مکمل اختیار رکھتے ہوئے اپنے کو خدا کی خاطر بے اختیار کر لیا تھا۔ دنیا کی بے پناہ برائیاں دراصل ایک بے پناہ بھلائی کی قیمت ہیں۔ یہ بھلائی کہ انسانوں کے جنگل

سے وہ سعید روحیں چھان کر نکالی جائیں جو پورے شعور اور مکمل ارادہ کے ساتھ اپنے کو خدا کا محکوم بنالیں۔ جو محض حقیقت پسندی کی بنا پر خدا کی محکومی اختیار کریں نہ کہ مجبوری کی بنا پر۔

یہ وہ انوکھی ہستیاں ہیں جن کو یہ موقع تھا کہ وہ حق کو جھٹلادیں مگر انھوں نے حق کو نہیں جھٹلایا۔ جن کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنی انا کا جھنڈا اونچا کریں۔ مگر وہ اپنے کو پچھلی سیٹ پر بٹھا کر خدا کو صدر نشین بنانے پر راضی ہوگئے۔ جن کو پوری طرح یہ آزادی ملی ہوئی تھی کہ وہ اپنی قیادت اور اپنے مفادات کا گنبد کھڑا کریں مگر انھوں نے ہر "اپنے" کو خود اپنے ہاتھوں سے ڈھادیا اور صرف حق کا گنبد کھڑا کرکے انھوں نے خوشی حاصل کی۔ اس قسم کی نادر روحیں اس کے بغیر چنی نہیں جاسکتی تھیں کہ ان کو مکمل آزادی کے ماحول میں رکھا جائے اور آزادی کا حقیقی ماحول قائم کرنے کی ہر قیمت برداشت کی جائے ـــــ اسلامی دعوت کا مقصد ایسی ہی روحوں کو تلاش کرنا ہے

اسلامی انقلاب

دنیا میں سیاسی اور تمدنی انقلاب اسلامی دعوت کا براہ راست نشانہ نہیں۔ تاہم وہ اس کا بالواسطہ نتیجہ ہے۔ کسی معاشرہ میں جب قابل لحاظ تعداد ایسے افراد کی جمع ہوجائے جو اللہ کے لئے جینا اور اللہ کے لئے مرنا چاہتے ہوں تو قدرتی طور پر وقت کی سیاست اور تمدن پر انھیں کا غلبہ ہوجاتا ہے۔ اسلامی سیاست یا اسلامی نظام نام ہے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کا جو اللہ کے آگے اپنے کو بےنفس کرچکے ہوں۔ جنھوں نے اپنی "میں" کو خدا کے "عظیم تر" میں "گم کردیا ہو۔ جن کے جذبات واحساسات آخرت سے اتنا زیادہ متعلق ہوجائیں کہ دنیا میں ان کا کوئی حوصلہ باقی نہ رہے جو دوسرے کے دل کے درد کو اپنے سینہ میں محسوس کرتے ہوں۔ ایسے ہی افراد اسلامی نظام قائم کرتے ہیں اور ایسے افراد اسی وقت بنتے ہیں جب کہ ہر قسم کے دنیوی مقصد سے بلند ہوکر خالص آخرت کے لئے تحریک چلائی جائے۔ اس کے برعکس اگر نعروں اور جلسوں کے زور پر کوئی انقلاب برپا کیا جائے تو وہ انقلاب نہیں ایک ٹربوننگ ہوگا جہاں اسلام کے نعرے تو بہت ہوں گے مگر اسلام کے عمل کا کہیں وجود نہ ہوگا۔ ایسے لوگ حق کے تقاضوں کا نام لیں گے مگر عملاً اپنے گروہ کے تقاضوں کے سوا کوئی چیز ان کے سامنے نہ ہوگی۔ وہ انقلاب اسلامی کے ہنگامے برپا کریں گے مگر حقیقۃً ان کا مدعا یہ ہوگا کہ دوسروں کو تخت سے ہٹا کر خود اس پر قابض ہوجائیں۔ وہ انسانیت اور اخلاق کے نام پر جلسوں اور تقریروں کی دھوم مچائیں گے مگر اس کا مقصود صرف یہ ہوگا کہ ایک خوبصورت عنوان پر اپنی قیادت کی شان قائم کریں۔ اسلامی انقلاب کی واحد لازمی شرط "بےمیں" انسانوں کی فراہمی ہے اور موجودہ طرز کی تحریکوں سے سب سے کم جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ یہی ہے۔ بلکہ سیاسی اور قومی انداز کی یہ تحریکیں تو "میں" کی غذا ہیں نہ کہ "میں" کی نفسیات کو ختم کرنے والی ـــــ خارجی انقلاب کو نشانہ بنانے والی تحریک افراد کے اندر کردار نہیں پیدا کرسکتی۔ کردار ہمیشہ ذاتی محرک سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ خارجی محرک سے۔

کوئی آدمی دوسرے کے لئے نہیں کماتا۔ اسی طرح کوئی آدمی بیرونی محرک کے لئے باکردار بھی نہیں بنتا۔ جو لوگ "نظام" کے نام پر افراد سے باکردار بننے کی اپیلیں کرتے ہیں وہ صرف اپنی سطحیت کا ثبوت دیتے ہیں اور دوسرے کے بارہ میں کمتر اندازہ کا۔

پیغمبر کا کام

اسلام کا مشن ایک ہی مشن ہے۔ اور وہ ہے توحید کا پیغام لوگوں تک پہنچانا۔ ایک ایک شخص کو موحد بنانے کی کوشش کرنا۔ یہی قدیم ترین زمانہ سے تمام نبیوں کا مشن تھا۔ مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تمام زمانوں میں توحید کی دعوت جان کی قربانی کی قیمت پر دینی ہوتی تھی۔ توحید کا پیغام لے کر اٹھنے والے آگ کے الاؤ میں ڈال دئے جاتے اور آروں سے چیر دئے جاتے۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قدیم زمانہ میں شرک کو فکری غلبہ کا مقام حاصل تھا۔ حتیٰ کہ سیاست کی بنیاد بھی شرک پر قائم تھی۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ لوگوں کو یہ باور کرا کے ان کے اوپر حکومت کرتے تھے کہ وہ دیوتاؤں کی اولاد ہیں۔ ان کے اندر خدا حلول کر آیا ہے۔ اس لئے جب توحید کا داعی یہ آواز بلند کرتا کہ خدا صرف ایک ہے، کوئی اس کا شریک نہیں، تو قدیم زمانہ کے بادشاہوں کو یہ آواز براہ راست ان کے حق حکمرانی کو چیلنج کرنے والی نظر آتی تھی۔ اس میں انھیں اپنی مشرکانہ سیاست کی تردید دکھائی دیتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے سیاسی مفاد کی بنا پر توحید کے داعیوں کے دشمن بن جاتے اور بے رحمی کے ساتھ ان کو کچل دیتے۔

اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اس صورت حال کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ قرآن میں پیغمبر آخر الزماں اور آپ کے ساتھیوں کو سکھایا گیا کہ تم اس طرح دعا کرو: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا (خدایا ہمارے اوپر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے کے لوگوں پر ڈالا تھا)۔ یہ دعا کے انداز میں اس خدائی فیصلہ کا اظہار تھا کہ خدا انسانی تاریخ میں ایک نیا انقلاب لانے والا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اقتدار کا رشتہ شرک سے ٹوٹ جائے گا۔ اب حکومت ایک خالص سیاسی معاملہ ہوگا نہ کہ اعتقادی معاملہ۔ یہی وہ خدائی منصوبہ تھا جس کی تکمیل کے لئے قرآن میں حکم دیا گیا: وقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ (انفال ۳۹) یعنی مشرکوں سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ کی حالت باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کا ہو جائے۔

فتنہ کے معنی آزمائش کے ہیں۔ فَتَنَ فلاناً عن رأیہ کے معنی ہیں رائے سے پھیر دینا۔ قرآن میں آیا ہے: موسیٰ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا، فرعون اور اپنی قوم کے بڑے لوگوں کے ڈر سے جن کو اندیشہ تھا کہ فرعون ان کو ستائے گا (یونس ۸۳) اس آیت میں ان یفتنھم کا لفظ ہے جو ستانے اور عذاب دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ گویا فتنہ کے معنی تقریباً وہی ہیں جس کو انگریزی زبان میں Persecution کہتے ہیں۔ یعنی کوئی رائے یا عقیدہ رکھنے کی بنا پر کسی کو ستانا۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سا فتنہ تھا جس کو ختم کرنے کا حکم دیا گیا۔ وہ شرک کا فتنہ تھا۔ چنانچہ مفسرین نے ان آیات میں فتنہ کی تفسیر "شرک" سے کی ہے۔ تاہم یہاں فتنہ سے مراد مطلق شرک نہیں بلکہ شرک جارح ہے۔ کیونکہ شرک جب جارح ہو تبھی وہ روکنے والا بنتا ہے۔ حتیٰ لا تکون فتنۃ کا مطلب ہے حتی لا یُفتَن رجلٌ عن دینہ۔ یعنی شرکِ جارح سے لڑ کر اسے ختم کر دو تاکہ دین شرک بے زور اور مغلوب ہو کر رہ جائے اور غالب دین کی حیثیت سے صرف دینِ توحید دنیا میں باقی رہے۔

شرک اپنی ابتدائی صورت میں محض ایک عقیدہ ہے۔ مگر قدیم زمانہ میں اس نے "فتنہ" کا مقام حاصل کر لیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قدیم زمانہ میں انسانی فکر پر شرک کا غلبہ تھا۔ زندگی کے ہر معاملہ کو شرک کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ سیاست و حکومت کی بنیاد بھی شرک کے اوپر قائم تھی۔ لوگ سورج اور چاند جیسی چیزوں کو دیوتا سمجھتے تھے اور شاہی خاندان اپنے آپ کو ان دیوتاؤں کی اولاد بتا کر لوگوں کے اوپر حکومت کرتا تھا۔ اس بنا پر جب توحید کا داعی یہ کہتا کہ خدا صرف ایک ہے، باقی تمام چیزیں اس کی مخلوق اور محکوم ہیں تو قدیم بادشاہوں کو یہ نظریہ ان کے حق حکمرانی کی تردید کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ اس کو اپنا حریف سمجھ کر اس کو مٹانے کے درپے ہو جاتے۔ عرب میں اور اطرافِ عرب میں توحید کی بنیاد پر جو اسلامی انقلاب آیا اس نے شرک کو فکری غلبہ کے مقام سے ہٹا دیا۔ اب شرک کی حیثیت ایک ذاتی عقیدہ کی ہو گئی نہ کہ ایک ایسے عوامی نظریہ کی جس کے اوپر سماجی زندگی کا پورا نظام قائم ہو۔ نتیجۃً شرک کا رشتہ اقتدار سے ٹوٹ گیا۔ کیونکہ اب شرک کی بنیاد پر کسی کے لئے حق حکمرانی کا دعویٰ کرنے کا موقع باقی نہیں رہا تھا۔

معلوم انسانی تاریخ میں یہ تبدیلی بالکل پہلی بار آئی۔ اس کے ہمہ گیر اثرات میں سے دو چیزیں یہاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ جب یہ معلوم ہوا کہ خدا صرف ایک ہے اور بقیہ تمام چیزیں اس کی مخلوق اور محکوم ہیں تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر مظاہر فطرت کے تقدس کا ذہن ختم ہو گیا۔ وہ چیزیں جو اب تک انسان کے لئے پرستش کا عنوان بنی ہوئی تھیں۔ وہ اس کو اپنی خادم نظر آنے لگیں (خلق لکم ما فی الارض جمیعا، بقرہ ۲۹) اب آدمی نے چاہا کہ وہ ان چیزوں کو جانے اور ان کو استعمال کرے۔ انسانی ذہن کی یہی وہ تبدیلی ہے جس نے تاریخ میں توہماتی دور کو ختم کر کے سائنس کے دور کو شروع کیا۔ اسی کے ساتھ دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہت کا دور کم از کم نظریاتی طور پر ختم ہو گیا اور عوامی حکمرانی کے دور کا آغاز ہوا۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ تمام انسان یکساں ہیں، کسی انسان کے اندر کوئی خدائی صفت نہیں تو اس کے بعد بالکل قدرتی طور پر خدائی حق حکمرانی کے لئے زمین باقی نہیں رہی۔

ان دونوں انقلابات کا آغاز مدینہ سے ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ دمشق، بغداد، اسپین اور سسلی ہوتا ہوا

قدیم آباد دنیا کے بڑے حصہ میں پھیل گیا۔ اس مدت میں قدیم حالات کے اثر سے اس فکری تحریک کو بار بار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم اس کا سفر جاری رہا۔ مخالف طاقتوں کی کوئی بھی کوشش اس میں کامیاب نہ ہو سکی کہ وہ مظاہر فطرت کے تقدس کے دور کو دوبارہ اس کی سابقہ عظمت کے ساتھ واپس لا سکے۔ اور نہ کسی حکمراں کے لئے کبھی یہ ممکن ہوا کہ وہ اس طرح مقدس بادشاہ ہونے کا مقام حاصل کرے جیسا کہ عراق کے نمرود اور مصر کے فرعون کو قدیم زمانہ میں حاصل تھا۔

مسلم دنیا سے مغربی دنیا کی طرف

ابتداءً تقریباً ایک ہزار سال تک یہ عمل مسلم دنیا میں ہوتا رہا۔ مگر سولھویں صدی عیسوی میں ایک نیا انقلاب آیا۔ مسلمانوں کے آپس کے اختلاف کی وجہ سے ایک طرف بغداد کی عباسی خلافت ٹوٹ گئی اور دوسری طرف اسی باہمی اختلاف کے نتیجہ میں اسپین کا مسلم اقتدار ختم ہو گیا۔ اس کے بعد مسلم دنیا میں کوئی ادارہ ان لوگوں کی سرپرستی کرنے والا نہ رہا جو علمی وفکری تحقیق کا کام کر رہے تھے۔ چنانچہ علماء اور مفکرین کی بڑی تعداد دھیرے دھیرے اٹلی اور فرانس کی طرف منتقل ہو گئی۔ مخصوص اسباب کی بنا پر یورپ میں ان لوگوں کو بہت پذیرائی ملی۔ انقلابی عمل جو اس سے پہلے مسلم دنیا میں ہو رہا تھا، وہ یورپ کی دنیا میں ہونے لگا۔ تاہم یورپ پہنچ کر اس کے اندر ایک تبدیلی آگئی۔ مسلم دنیا میں یہ کام اسلام کے زیر اثر ہو رہا تھا، یورپ کو اسلام سے دلچسپی نہ تھی، اس نے اس کو اسلام سے جدا کر کے خالص علمی حیثیت سے فروغ دینا شروع کیا۔ اگرچہ مسلم علوم اور عربی زبان کی اس منتقلی کا اثر یورپ کے مسیحی عقائد پر بھی پڑا۔ حتیٰ کہ مارٹن لوتھر (۱۵۴۶ – ۱۴۸۳) براہ راست طور پر یورپ کے اوپر اسلامی اثرات کی پیداوار تھا۔ تاہم علمی وفکری تحریک کا ارتقاء یورپ میں آزاد سیکولر شعبہ کے طور پر ہوا نہ کہ مذہب کے ایک ذیلی شعبہ کے طور پر۔ جدید مغرب کا سائنسی اور جمہوری انقلاب تمام تر اسلامی انقلاب کی دین ہے۔ البتہ مغرب نے اس کو مذہب سے جدا کر کے سیکولر شکل دے دی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید مغربی انقلاب، اسلامی انقلاب کی ایک دنیوی صورت ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے ایٹم بم آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کی فوجی صورت ہے اور قومی ملکیت مارکسی نظریہ کی معاشی صورت۔

جدید انقلاب کی اسلامی اہمیت

جدید مغربی انقلاب، اپنی عمومی حیثیت میں، خود اسلام کا پیدا کردہ تھا۔ اس کے نتائج اسلامی نقطۂ نظر سے بے حد اہم تھے۔ اس انقلاب نے دنیوی اعتبار سے اس دعا کی تکمیل کر دی تھی جس کو خدا نے ان الفاظ میں ہمیں تلقین کیا تھا: اے ہمارے رب، ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے پچھلے لوگوں پر ڈالا (البقرہ) اس انقلاب کے نتیجہ میں زندگی کے نظام میں ہمارے موافق جو تبدیلیاں ہوئیں وہ خاص طور پر یہ تھیں:

۱۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ لوگوں میں یہ عقیدہ بٹھا کر حکومت کرتے تھے کہ وہ سورج دیوتا یا چاند دیوتا کی اولاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ میں توحید کی دعوت فوراً سیاسی اقتدار کی حریف بن جاتی تھی اور مشرک بادشاہوں کے ظلم کا نشانہ بنتی تھی۔ شرک کی تردید کو وہ اپنے حق حکمرانی کی تردید کے ہم معنی سمجھتے تھے۔ اسلامی انقلاب کی تکمیل کے طور پر یورپ میں جو جمہوری انقلاب آیا ہے اس نے اس نزاکت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا کیونکہ آج کا حکمراں عوامی رائے سے حکمرانی کا حق حاصل کرتا ہے نہ کہ خدا کے ساتھ اپنا مفروضہ الوہی رشتہ جوڑ کر۔ اس تبدیلی نے تاریخ میں پہلی بار یہ امکان کھول دیا کہ توحید کی تبلیغ اس اندیشہ کے بغیر کی جائے کہ پہلے ہی مرحلہ میں غیر ضروری طور پر اس کا ٹکراؤ سیاسی ادارہ سے ہو جائے اور وہ اس کو کچل کر رکھ دے، جیسا کہ اسلام سے پہلے ساری تاریخ میں ہوتا رہا ہے۔

۲۔ قدیم زمانہ میں مظاہر فطرت (سورج، چاند، دریا وغیرہ) کو مقدس سمجھا جاتا تھا۔ توحید کی بنیاد پر ہونے والے اسلامی انقلاب اور اس کے زیر اثر پیدا ہونے والے مغرب کے سائنسی انقلاب کے بعد یہ ہوا کہ فطرت کے واقعات خدائی مظاہر کے بجائے عام مادی مظاہر سمجھے جانے لگے۔ جو چیز پہلے پوجنے کی چیز سمجھی جاتی تھی وہ اب تحقیق و تجسس کی چیز بن گئی۔ اس کے نتیجہ میں جدید سائنسی اور تکنکی انقلاب پیدا ہوا جس نے بے شمار نئی طاقتیں انسان کے قبضہ میں دے دیں۔ اس انقلاب کے ذریعہ تیز رفتار سواریاں وجود میں آئیں اور جدید ذرائع ابلاغ (پریس، ریڈیو وغیرہ) تک انسان کی دسترس ہوئی۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہو گیا کہ کسی عقیدہ کی تبلیغ عالمی اور بین اقوامی سطح پر کی جا سکے۔ خدا کے دین کی دعوت مقامی دعوت کے مرحلہ سے گزر کر عالمی دعوت کے مرحلہ میں داخل ہو گئی۔

۳۔ اسی انقلاب کے ذریعہ کائنات کے وہ چھپے ہوئے حقائق سامنے آئے جو توحید اور اس سے متعلق نظریات کے حق میں اعلیٰ علمی دلائل فراہم کر رہے ہیں۔ جنھوں نے قرآن کے کائناتی اشاروں کو کھول کر ہر ایک کے لئے انھیں قابل فہم بنا دیا ہے۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار وہ دور آیا جب کہ کائناتی نشانیاں معجزہ کا بدل بن جائیں۔ دینی حقیقتوں کو مشاہداتی دلائل کی سطح پر ثابت کیا جا سکے۔

۴۔ پھر اسی انقلاب کے ذریعہ تاریخ میں پہلی بار معاملات پر غور و فکر کا سائنسی، بالفاظ دیگر، واقعاتی نقطۂ نظر پیدا ہوا۔ کائنات کا علم صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا تھا جب کہ انتہائی حقیقت پسندانہ انداز میں اس پر غور کیا جائے۔ اس لئے اس کے اثر سے علمی دنیا میں یہی عام ذہن بن گیا۔ اب واقعات کو واقعات کی رو سے دیکھا جانے لگا نہ کہ خوش عقیدگی یا توہمات کے اعتبار سے۔ اب یہ فضا پیدا ہوئی کہ مذاہب کی خالص علمی اور تاریخی تحقیق کی جائے۔ اسی انداز مطالعہ کا یہ نتیجہ تھا کہ موجودہ زمانہ میں علمی سطح پر یہ تسلیم کر لیا گیا کہ اسلام کے سوا جتنے

مذاہب ہیں سب کے سب غیر تاریخی (اور اس بنا پر ناقابل اعتبار) ہیں۔ مذاہب کے درمیان جس مذہب کو تاریخی اعتباریت کا درجہ حاصل ہے وہ صرف اسلام ہے (ملاحظہ ہو دی بائبل دی قرآن اینڈ سائنس)

مغرب کا غلبہ مسلم دنیا پر

مسلم دنیا نے صلیبی جنگوں (۱۰۹۵ – ۱۲۷۱) میں مسیحی یورپ پر فتح پائی تھی۔ مگر اس فتح کے بعد ہی برعکس عمل بھی شروع ہو گیا۔ مسیحی یورپ نے محسوس کیا کہ اس کی شکست کا سبب علمی اور فکری میدان میں مسلم دنیا سے اس کا پیچھے ہونا تھا۔ چنانچہ صلیبی جنگوں کے بعد یورپ نے تیزی سے مسلمانوں کے علوم اور عربی زبان کو سیکھنا شروع کر دیا۔ بعد کی صدیوں میں جب مسلم دنیا کے اہل علم یورپ کے ملکوں میں منتقل ہوئے تو وہاں یہ عمل اور تیزی سے جاری ہو گیا۔ بالآخر مغرب کی ترقی اس نوبت کو پہنچی کہ وہ علم و عمل کے تمام شعبوں میں مسلم قوموں سے آگے بڑھ گیا۔ اب اس نے مسلم ممالک میں داخل ہونا شروع کیا اور انیسویں صدی تک یہ حال ہوا کہ تقریباً تمام مسلم دنیا پر مغربی قوموں کا تسلط قائم ہو گیا۔

یہی سیاسی حادثہ اس بات کا سبب بن گیا کہ مذکورہ قیمتی امکانات اسلامی دعوت کے حق میں استعمال نہ ہو سکیں۔ صلیبی جنگوں میں ہاری ہوئی قوموں کو دوبارہ مسلم علاقوں میں گھستے ہوئے دیکھ کر لوگ بھڑ اٹھے۔ ساری مسلم دنیا میں مغرب کے خلاف سیاسی زور آزمائی شروع ہو گئی۔ حتی کہ بہت سے لوگ سیاسی مقابلہ آرائی ہی کو عین اسلام ثابت کرنے لگے تاکہ لوگ جب اجنبی حکمرانوں سے لڑ کر فارغ ہوں تو خود اپنے ملکی حکمرانوں کے خلاف مقدس سیاسی جہاد چھیڑ دیں۔ اس فضا میں کسی کو یہ سوچنے کا موقع ہی نہ ملا کہ جدید دنیا نے کچھ نئے امکانات کھولے ہیں اور وہ اسلام کے حق میں کامیابی کے ساتھ استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ جدید مواقع انتظار کرتے رہے کہ ہم ان کو استعمال کر کے اسلام کی دعوت کو سارے عالم میں پھیلا دیں اور نتیجۃً خدا کی نصرت کے مستحق ہوں۔ مگر ہماری سیاسی نفسیات نے ہم کو اُدھر توجہ دینے کی فرصت ہی نہ دی۔

سیاسی انقلاب کی نوعیت

سیاسی انقلاب کی اہمیت اسلام میں کیا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے سیاسی انقلاب دراصل اس کا نام ہے کہ اہلِ حق کو اہلِ باطل پر غلبہ حاصل ہو جائے (الصف) قرآن کی صراحت کے مطابق یہ غلبہ خدا کی توفیق اور نصرت سے حاصل ہوتا ہے (وما النصر الا من عند اللہ) اور خدا کی نصرت کا استحقاق حاصل کرنے کی واحد لازمی شرط دعوت ہے۔ اہل حق جب دعوت کے عمل کو اس کی تمام صالح شرائط کے ساتھ شروع کریں اور اس کو کرتے ہوئے اتمام حجت کے قریب پہنچا دیں تو اس وقت اس دعوتی عمل کی تکمیل کے نتیجہ میں ایک طرف اہل حق انعام کے مستحق ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف اہل باطل سزا کے مستحق۔ اس وقت خدائی منصوبہ کے تحت حالات میں تبدیلی

شروع ہو جاتی ہے۔ اہل حق خدائی طاقت سے مسلح ہو کر اہلِ باطل پر غالب آتے ہیں۔ دعوت حق اور اتمام حجت کے بغیر محض سیاسی کارروائیوں سے کبھی کسی مسلم گروہ کو غیر مسلم طاقتوں پر غلبہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہ خدا کی سنت ہے اور خدا کی سنت میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی (انعام ۱۳۱)

غیر مسلم اقوام کے لئے غلبہ کا فیصلہ خدا کے عام قانونِ امتحان کے تحت ہوتا ہے (یونس ۱۴) مگر اہل ایمان کے لئے غلبہ کا فیصلہ قانون اتمام حجت کے تحت ہوتا ہے۔ اگر ہم غیر مسلم گروہ پر دعوتی عمل کو انجام نہ دیں تو ہم کو یہ امید بھی نہ کرنی چاہئے کہ غیر مسلم گروہ پر ہمیں غلبہ عطا کیا جائے گا۔ دعوتی عمل ہی تو غیر مسلم گروہ پر غلبہ کی قیمت ہے۔ پھر جب قیمت ادا نہ کی گئی ہو تو متاع مطلوب آخر کس طرح حاصل ہوگی۔

مسلم دنیا میں سیاسی ردعمل

چودھویں صدی ہجری کا آغاز اس وقت ہوا جب کہ انیسویں صدی عیسوی کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ اس اعتبار سے چودھویں صدی ہجری اسلامی تاریخ کی اہم ترین صدی تھی۔ کیوں کہ یہ اس وقت آئی جب کہ اسلامی انقلاب کے بعد شروع ہونے والا عمل اپنی آخری تکمیل کے مرحلہ تک پہنچ گیا تھا۔ خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جس عالمی ہدایت کا دروازہ کھولا تھا، اس کو بروئے کار لانے کے حالات اور ضروری وسائل اپنی کامل صورت میں مہیا ہو کر ہمارے سامنے آچکے تھے۔ مگر تاریخ کا غالباً یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ یہ دروازہ عین اس وقت خود مسلمانوں کے ہاتھوں بند ہو گیا جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں کھولا تھا۔

جدید انقلاب نے یورپ کو جو طاقتیں دی تھیں ان کو اس نے اسی طرح اپنے قومی عزائم کی تکمیل کے لئے استعمال کیا جس طرح کوئی بھی قوم ان حالات میں کرتی ہے۔ مغربی قوموں کی دسترس جیسے ہی جدید طاقتوں پر ہوئی ان کے یہاں وہ چیز وجود میں آئی جس کو مغربی استعمار کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے جغرافیہ سے نکل کر خشکی اور تری میں اپنے جھنڈے گاڑے۔ قوموں کے درمیان اپنی تہذیب پھیلائی۔ جن لوگوں نے ان کے راستہ میں رکاوٹ ڈالی ان کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا۔ مغربی قوموں کے ان عزائم کا براہ راست شکار ہونے والے زیادہ تر مسلمان تھے۔ کیونکہ اس وقت یورپ کے باہر اکثر آباد دنیا مسلمانوں ہی کے زیر اقتدار تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چیز جس کو ہم نے اسلامی انقلاب کا سیکولر نتیجہ کہا ہے، اس کا تعارف مسلمانوں سے اپنے پہلے ہی مرحلہ میں اس حیثیت سے ہوا گویا کہ وہ ایک دشمن طاقت ہے جو مسلمانوں کو ان کی تمام عظمتوں سے محروم کرکے ان کو ایک مغلوب اور پسماندہ قوم بنا دینا چاہتی ہے۔ مغربی انقلاب کا افادی پہلو ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، وہ اس کو اپنے سیاسی اور اقتصادی حریف کی حیثیت سے دیکھنے لگے۔

چودھویں صدی ہجری اسلام کی پوری تاریخ میں پہلی صدی تھی جب کہ یہ امکان پیدا ہوا تھا کہ اسلام

کی دعوت توحید کو یُسر (آسانی) کے حالات میں انجام دیا جائے جب کہ اس سے پہلے صرف عُسر (سختی) کے حالات ہی میں اس کو انجام دینا ممکن ہوتا تھا۔ اسی طرح یہ واقعہ بھی پہلی بار ہوا کہ خود انسان کے اپنے مسلّمات کے مطابق اسلام کا دیگر ادیان کے مقابلہ میں واحد معتبر دین ہونا ثابت کیا جائے اور اس کو اعلیٰ ترین علمی شواہد سے اس طرح مدلل کر دیا جائے کہ کسی کے لئے انکار کی جرأت باقی نہ رہے۔ نیز اس صدی میں پہلی بار تیز رفتار سواریاں اور تبلیغ کے جدید ذرائع انسان کے قبضہ میں آئے جن سے کام لے کر اسلام کے پیغام کو بین اقوامی سطح پر پھیلایا جا سکتا تھا۔ مگر جو قومیں ان خدائی برکتوں کو ہماری طرف لا رہی تھیں وہ اتفاقی حالات کے نتیجہ میں ہماری سیاسی حریف بن گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری مسلم دنیا مغرب کے بارے میں مخالفانہ نفسیات کا شکار ہو گئی، مغرب کی طرف سے آنے والے انقلاب کا افادی پہلو اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ حالاں کہ خدا نے مسلمانوں کے لئے ایسا امکان کھولا تھا کہ وہ خود مغرب کے پیدا کردہ حالات کو اپنے دعوتی مقاصد میں استعمال کر کے مغرب کو نظریاتی طور پر فتح کر سکتے تھے۔ اگر مسلمانوں نے بروقت اس دانش مندی کا ثبوت دیا ہوتا تو چودھویں صدی ہجری میں وہ واقعہ دوبارہ نئے انداز سے پیش آتا جو آٹھویں صدی ہجری میں تاتاری فاتحین کے خادمانِ اسلام بن جانے کی صورت میں پیش آ چکا ہے۔

موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکیں

چودھویں صدی ہجری میں ساری مسلم دنیا میں بے شمار اسلامی تحریکیں اٹھیں۔ مگر ضمنی فرق کے باوجود یہ تمام تحریکیں ردعمل کی تحریکیں تھیں نہ کہ حقیقی معنوں میں مثبت تحریکیں۔ جدید مسلم قیادت "مغرب" کے نام سے جس چیز سے واقف ہوئی وہ صرف یہ تھا کہ یہ ایک حملہ آور قوم ہے جو ہمارے لئے سیاسی چیلنج بن کر اٹھی ہے، وہ اس بات سے بے خبر رہے کہ مغرب دراصل کچھ جدید قوتوں کی دریافت کا نام ہے اور یہ قوتیں اسلام کے لئے عین مفید ہیں بلکہ بالواسطہ طور پر خود اسلامی انقلاب کی پیدا کردہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مسلم تحریکیں نئے امکانات سے فائدہ نہ اٹھا سکیں، وہ جدید قوموں کے مقابلہ میں صرف ایک منفی رول ادا کر کے رہ گئیں۔

اس صورت حال کا مزید نقصان یہ ہوا کہ دوسری قوموں سے ہمارا صحیح اسلامی رشتہ قائم نہ ہو سکا۔ مسلمان کے لئے دوسری قومیں مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر مذکورہ منفی نفسیات کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہم نے ان قوموں کو مدعو نہ سمجھا، ان کو صرف حریف کی نظر سے دیکھا۔ اسلامی تحریکیں پیغام آخرت کی تحریکیں نہ رہیں بلکہ پیغام سیاست کی تحریکیں بن گئیں۔ ان تحریکوں نے انداز کے فرق کے ساتھ، جدید دنیا کو جس "اسلام" سے واقف کرایا وہ محض ایک قسم کا قومی اسلام تھا نہ کہ خدا کا وہ دین جو انسانوں کو آخرت کی ابدی کامیابی کا راستہ دکھانے کے لئے آیا ہے۔ داعی اور مدعو کا تعلق حریف اور مدمقابل کا تعلق بن کر رہ گیا۔

یہ مسلم تحریکیں اپنی جس معذوری کی وجہ سے "مغرب بحیثیت استعمار" اور "مغرب بحیثیت جدید قوت" کو الگ الگ کر کے نہ دیکھ سکیں، اسی معذوری کا یہ نتیجہ بھی ہوا کہ انھوں نے جدید قوموں کے خلاف اپنی مہم میں نہ تو نئی قوتیں فراہم کیں اور نہ نئے حالات کی رعایت کی۔ حد درجہ نادانی کے ساتھ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ تک جان و مال کی قربانیاں دی جاتی رہیں جب کہ ان قربانیوں کے لئے قطعی طور پر مقدر تھا کہ اسباب کی اس دنیا میں وہ باطل رائگاں ہو کر رہ جائیں۔ اس طویل غیر حقیقت پسندانہ سیاست کی اب یہ نفسیاتی قیمت مسلمانوں کو دینی پڑ رہی ہے کہ پوری کی پوری مسلم دنیا ایک قسم کے فرضی جنونِ عظمت (Paranoia) کا شکار ہو کر رہ گئی ہے اور اب کوئی حقیقت پسندانہ بات اسے اپیل ہی نہیں کرتی۔

فخر نہیں ذمہ داری

پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیار الحق نے یکم اکتوبر ۱۹۸۰ کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایک تقریر کی۔ ان کی ڈیڑھ گھنٹہ کی یہ تقریر ان کے اپنے الفاظ میں دنیا بھر کے ۹۰ کروڑ مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے تھی۔ ان کی لکھی ہوئی تقریر کا ایک پیراگراف یہ تھا:

> As they enter the 15th Century Hijra, the Islamic peoples, who have rediscovered their pride in their religion, their great culture and their unique social and economic institutions, are confident that the advent of this century would mark the beginning of a new epoch, when their high ideals of peace, justice, equality of man, and their unique understanding of the universe, would once again enable them to make a worthy contribution to the betterment of mankind.

اب کہ اسلامی قومیں پندرھویں صدی ہجری میں داخل ہو رہی ہیں، انھوں نے اپنے مذہب، اپنے عظیم کلچر اور اپنے بے مثل سماجی اور معاشی اداروں میں اپنے فخر کو دوبارہ دریافت کر لیا ہے۔ ان کو یقین ہے کہ اس صدی کا آغاز ایک نئے عہد کی ابتدا ثابت ہوگا جب کہ امن، انصاف، انسانی برابری اور کائنات کے بارے میں ان کا بے مثل شعور ان کو دوبارہ اس قابل بنائے گا کہ وہ انسانیت کی بھلائی میں قابل قدر حصہ ادا کر سکیں۔

جنرل محمد ضیار الحق نے یہ بات موجودہ مسلمانوں کی تعریف کے طور پر کہی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسی میں مسلمانوں کا وہ المیہ بھی چھپا ہوا ہے جس نے موجودہ زمانہ میں ان کی تمام اسلامی کوششوں کو بے قیمت بنا دیا ہے۔ آج ساری مسلم دنیا میں اسلام کے نام پر زبردست سرگرمیاں جاری ہیں مگر یہ ساری دھوم فخر (Pride) کے طور پر ہے نہ کہ ذمہ داری کے طور پر۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی سرگرمی فخر کے احساس کی بنیاد پر اٹھتی ہے (حدید ۲۰) اور اخروی سرگرمی عبدیت کے احساس کی بنیاد پر (ذاریات ۵۶) فخر سے انانیت اور مطالبہ کا جذبہ ابھرتا ہے اور عبدیت سے عجز اور ذمہ داری کا۔ اسلامی تحریک وہ ہے جو جہنم سے ڈرانے کے لئے اٹھے۔ مگر موجودہ زمانہ کی

اسلامی تحریکیں دنیا میں بڑائی حاصل کرنے کے جذبہ سے اٹھی ہیں۔ قومی سربلندی کے احساس نے ان کو کھڑا کیا ہے۔ آج کے مسلمانوں کے لئے اسلام ایک ناز کی چیز ہے نہ کہ حقیقۃً آخرت کی صراط مستقیم۔ یہ واقعہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہ تحریکیں مسلمانوں کی قومی تحریکیں ہیں نہ کہ حقیقی معنوں میں اسلامی تحریکیں۔ مسلمانوں کے یہاں آج جس مذہب کی دھوم ہے وہ قومی مذہب ہے نہ کہ خدائی مذہب۔ کیونکہ قومی مذہب سے ہمیشہ فخر کی نفسیات ابھرتی ہے اور خدائی مذہب سے ذمہ داری کی نفسیات۔

حقیقی اسلام آدمی کے اندر عجز اور تواضع پیدا کرتا ہے اور جہاں عجز اور تواضع ہو وہاں گویا ساری بھلائیاں جمع ہوگئیں۔ کیونکہ ہر خرابی کی جڑ کبر اور ہر اچھائی کی جڑ عجز ہے۔ ایسے افراد میں ان کے اسلام کے لازمی نتیجہ کے طور پر خدا کا خوف، آخرت کی طلب، باہمی اتحاد، ایک دوسرے کی خیر خواہی، شکایتوں سے درگزر کرنا، تعمیری کاموں کی طرف توجہ اور حقوق کے مقابلہ میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ اور جس سماج میں ایسی نفسیات والے انسان قابل لحاظ تعداد میں پیدا ہو جائیں وہ اپنے آپ دنیا میں سب سے اونچا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس قومی اسلام آدمی کے اندر فخر و ناز کی نفسیات پیدا کرتا ہے اور جہاں فخر و ناز کے جذبات ہوں وہاں گویا تمام برائیاں جمع ہوگئیں۔ ایسے افراد کے اندر انانیت، آخرت سے بے خوفی، اپنی غلطیوں کو دیکھنے کے بجائے دوسروں کا احتساب اور پھر ان کیفیات کے نتیجہ میں اختلاف اور باہمی ٹکراؤ عام ہو جاتا ہے۔ وہ خاموش تعمیری کام کے مقابلہ میں نمائشی کاموں کی طرف رغبت رکھتے ہیں۔ وہ پیچھے چلنے کے بجائے ہمیشہ آگے چلنے کے خواہاں رہتے ہیں۔ وہ اپنے معمولی کام کو بڑے بڑے الفاظ میں بیان کرتے ہیں تاکہ اپنے برتری کے جذبہ کو تسکین دے سکیں۔ اسلام ایسے لوگوں کے درمیان کرنے سے زیادہ کہنے کی چیز ہوتا ہے — اور جہاں ایسا اسلام ہو وہاں لوگوں کے اوپر خدا کا غضب نازل ہوتا ہے نہ کہ خدا کی رحمت و نصرت۔

یہودیوں کی صیہونی تحریک قدیم اسرائیلی عظمت کو واپس لانے کی تحریک ہے۔ ہندوؤں کی آر ایس ایس تنظیم اپنے شاندار ماضی کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے اٹھی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی بھی ایک پُر فخر دنیوی تاریخ ہے اور موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکیں کسی نہ کسی اعتبار سے اسی پُر فخر ماضی کو واپس لانے کے جذبہ سے ابھری ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہودیوں اور ہندوؤں کی تحریکیں مذہبی اصطلاحات استعمال کرنے کے باوجود حقیقی معنوں میں مذہبی تحریکیں نہیں ہیں، وہ یقینی طور پر صرف قومی تحریکیں ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کی اسی قسم کے جذبات کے تحت اٹھنے والی تحریکیں بھی محض اس لئے اسلامی تحریکیں نہیں بن جائیں گی کہ وہ اپنے مقصد کو اسلامی الفاظ میں بیان کرتی ہیں۔ خدا کسی کے عمل کو حقیقت کے اعتبار سے دیکھتا ہے نہ کہ ظاہر کے اعتبار سے۔ جو تحریک قومی نفسیات کے ساتھ اٹھے وہ خدا کی نظر میں قومی تحریک ہی رہے گی، اس کا قرآن و حدیث کے الفاظ استعمال کرنا کسی بھی طرح اس کو اسلامی

تحریک کا مقام نہیں دے سکتا۔ اور نہ اس پر خدا کے وہ وعدے پورے ہو سکتے جو صرف حقیقی اسلامی تحریک کے لئے مقدر ہیں۔

کرنے کا کام

اسلام چونکہ آخری دین ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے وجود کے اعتبار سے قیامت تک باقی رہے۔ اسی لئے دین کا تحفظ بھی ایک ضروری اور مطلوب کام ہے۔ موجودہ زمانہ کی بعض تحریکوں نے اس اعتبار سے یقیناً مفید خدمات انجام دی ہیں۔ وہ اسلام کے فکری اور عملی نقشہ کی محافظ ثابت ہوئی ہیں۔ بعض ادارے قرآن اور حدیث اور اسلامی مسائل کے علم کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ بعض جماعتیں اسلامی عبادات کے ڈھانچہ کو ایک نسل سے دوسری تک پہنچانے کا کام کر رہی ہیں۔ کچھ اور ادارے قرآن و حدیث کا متن صحت و صفائی کے ساتھ چھاپ کر ہر جگہ پھیلا رہے ہیں۔ یہ تمام کام بجائے خود مفید ہیں مگر بہر حال وہ تحفظ دین کے کام ہیں نہ کہ دعوتِ دین کے۔ جہاں تک اسلام کو دعوتی قوت کی حیثیت سے زندہ کرنے کا سوال ہے وہ موجودہ زمانہ میں ابھی تک واقعہ نہ بن سکا۔ حتیٰ کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو شاید اس کا شعور بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر ایسے کاموں کو اسلامی دعوت کا عنوان دے دیتے ہیں جن کا اسلامی دعوت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

پندرھویں صدی ہجری میں کسی حقیقی اسلامی کام کے آغاز کی واحد صورت یہ ہے کہ ہم اس صورت حال کو ختم کریں جس نے ساری دنیا میں اسلامی تحریک کو سیاسی تحریک کے ہم معنی بنا رکھا ہے۔ مسلمان ہر ملک میں وقت کے حکمرانوں کے خلاف شور و شر برپا کرنے میں مشغول ہیں۔ کہیں ان کی یہ تحریک غیر مسلم اقتدار کے خلاف برپا ہے اور کہیں مسلم اقتدار کے خلاف۔ کہیں وہ مسلح جدوجہد کے روپ میں ہے اور کہیں زبانی اور قلمی احتجاج کے روپ میں۔ کہیں وہ ایک اسلامی سیاسی فلسفہ کے زیر سایہ کام کر رہی ہے اور کہیں فلسفہ اور نظریہ کے بغیر متحرک ہے۔ کہیں اس نے ملی عنوان اختیار کر رکھا ہے اور کہیں نظامی عنوان۔ تاہم سارے فرق و اختلاف کے باوجود نتیجہ سب کا ایک ہے — جدید امکانات کو دعوت توحید اور انذارِ آخرت کے لیے استعمال نہ کرنا اور اپنی قوتوں کو بے فائدہ طور پر مفروضہ حریفوں کے خلاف محاذ آرائی میں ضائع کرتے رہنا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں بالکل الٹی کارکردگی کا ثبوت دیا ہے خدا نے دعوتِ حق کی راہ سے سیاسی رکاوٹ کو دور کر کے انہیں موقع دیا تھا کہ وہ آزادانہ حالات میں خدا کے تمام بندوں تک خدا کا پیغام پہونچا دیں۔ وہ خدا کے بندوں کو خدا کی اس اسکیم سے باخبر کر دیں جس کے تحت اس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جس کے مطابق وہ ایک ایک شخص کا حساب لینے والا ہے۔ مگر انہوں نے دوبارہ نئے نئے عنوان سے اپنے خلاف سیاسی رکاوٹیں کھڑی کر لیں۔ خود ساختہ سیاسی جہاد میں ہر ایک مشغول ہے مگر دعوتی جہاد میں اپنا حصہ ادا کرنے کی فرصت کسی کو نہیں۔

قرآن میں ہے کہ اللہ اس کی مدد کرتا ہے جو اللہ کی مدد کرے (حج ۴۰) ہر دور میں خدا اپنے دین کے حق میں کچھ امکانات کھولتا ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ کچھ لوگ ہوں جو خدا کے اشارہ کو سمجھیں اور خدا کے منصوبہ میں اپنے آپ کو شامل کر دیں۔ صحابہ کرام وہ خوش نصیب لوگ ہیں جنھوں نے اپنے زمانہ میں خدائی منصوبہ کو سمجھا اور اپنے آپ کو پوری طرح اس کے حوالہ کر دیا۔ اس کا نتیجہ وہ عظیم انقلاب تھا جس نے انسانی تاریخ کے رخ کو موڑ دیا۔

بارش کا آنا خدا کے ایک منصوبہ کا خاموش اعلان ہے۔ یہ کہ آدمی اپنا بیج زمین میں ڈالے تاکہ خدا اپنے کائناتی انتظام کو اس کے موافق کر کے اس کے بیج کو ایک پوری فصل کی صورت میں اس کی طرف لوٹائے۔ کسان اس خدائی اشارہ کو فوراً سمجھ لیتا ہے اور اپنے آپ کو اس خدائی منصوبہ میں پوری طرح شامل کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ ایک لہلہاتی ہوئی فصل کی صورت میں اس کو واپس ملتا ہے۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں، ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں، اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے حق میں کچھ نئے مواقع کھولے تھے۔ یہ مواقع کہ اقتدار کا حریف بنے بغیر توحید اور آخرت کی دعوت کو عام کیا جائے۔ جو کام پہلے معجزاتی سطح پر انجام دینا پڑتا تھا، اس کو عام طبیعیاتی استدلال کی سطح پر انجام دیا جائے۔ جو کام پہلے تعصب کے ماحول میں کرنا پڑتا تھا اس کو مذہبی رواداری کے ماحول میں کیا جائے۔ جو کام پہلے "حیوانی رفتار" سے کیا جاتا تھا اس کو "مشینی رفتار" کے ساتھ انجام دیا جائے۔

یہ موجودہ زمانہ میں خدا کا منصوبہ تھا۔ خدا نے سارے بہترین امکانات کھول دئے تھے اور اب صرف اس کی ضرورت تھی کہ خدا کے کچھ بندے ان کو استعمال کر کے ان امکانات کو واقعہ بننے کا موقع دیں۔ مگر مسلم قیادت خدا کے اس منصوبہ میں شامل ہونے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ اس نے نئے نئے عنوانات کے تحت وہی سیاسی جھگڑے دوبارہ چھیڑ دئے جن کو خدا نے ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں ختم کیا تھا۔ انھوں نے اسلامی دعوت کو سیاسی اور قومی دعوت بنا کر دوبارہ اسلام کو اقتدار کا حریف بنا دیا اور کہا کہ یہی عین خدا کا پسندیدہ دین ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدعو قوموں کے ساتھ ہر جگہ بالکل بے فائدہ قسم کی مقابلہ آرائی شروع ہو گئی اور سارے نئے امکانات غیر استعمال شدہ حالت میں پڑے رہ گئے۔

کام کی ایک سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت مسلمانوں نے کھو دی۔ یہاں تک کہ شیطان نے بیدار ہو کر قدیم شرک کی جگہ جدید شرک (کمیونزم) کی صورت میں کھڑا کر دیا۔ اب کم از کم کمیونزم کے زیر تسلط علاقوں میں دوبارہ کام کرنے کی وہی مشکلات پیدا ہو گئی ہیں جو اس سے پہلے شرک کے زیر تسلط علاقوں میں پائی جاتی تھیں۔ تاہم غیر کمیونسٹ دنیا میں اب بھی کام کے مواقع کھلے ہوئے ہیں اور یہاں پندرھویں صدی ہجری میں اس صالح جدوجہد کا آغاز کیا جا سکتا ہے جو چودھویں صدی ہجری میں نہ کیا جا سکا۔

نوٹ: یہ مقالہ اسلامی سیمینار (بھوپال) میں ۱۸ جنوری ۱۹۸۱ کو پڑھا گیا۔

احیاءِ اسلام

فہرست

دیباچہ

وسط افریقہ میں نیروبی کے پاس ایک پہاڑی مقام ہے جس کا نام کیگالی (Kigali) ہے۔ یہاں قدرتی مناظر کے خوبصورت ماحول میں ایک جدید اسلامی مرکز قائم کیا گیا ہے جس کا فرانسیسی نام (Le Centre Culturel Islamique) ہے۔ اس مرکز میں تعلیم یافتہ عرب نوجوانوں کا ایک اجتماع دسمبر ۱۹۸۱ میں ہوا جس میں راقم الحروف کو دعوت دین اور احیار اسلام کے موضوع پر لکچر دینے کے لئے بلایا گیا۔ اس موقع پر پیش کرنے کے لئے چند لکچر ترتیب دئے گئے تھے۔ تاہم بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر میں اس میں شریک نہ ہوسکا۔ اب یہ مجموعہ زیر نظر کتاب کی صورت میں شائع کیا جارہا ہے۔ موجودہ کتاب ان لکچروں کا اردو ایڈیشن ہے۔ ان کا عربی ایڈیشن علیٰحدہ کتاب کی صورت میں شائع ہوگا۔

ان خطبات میں مختلف پہلوؤں سے جس بات پر زور دیا گیا ہے وہ یہ کہ اسلام کے احیار کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ گہرا فکر اور دور رس منصوبہ بندی ہے۔ سطحی خوش فہمیوں اور وقتی کارروائیوں سے یہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہوسکتا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام (۲۱۶۰-۱۹۸۵ ق م) نے اپنی اولاد کو حجاز میں بسایا اور کعبہ کی تعمیر کرتے ہوئے یہ دعا کی کہ خدایا، تو ان کے اندر ایک پیغمبر بھیج جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ یقیناً تو عزیز وحکیم ہے (البقرہ ۱۲۹)

حضرت ابراہیم کی یہ دعا پوری طرح قبول ہوگئی۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، نبی عربی کا ظہور اس دعا کے ڈھائی ہزار سال بعد چھٹی صدی عیسوی میں ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا کا یہ طریقہ نہیں کہ اچانک واقعات کو ظاہر کردے۔ خدا اپنے فیصلہ کو حالات کے درمیان ظاہر کرتا ہے نہ کہ طلسمات کے درمیان۔ حضرت ابراہیم کی دعا کی قبولیت کے باوجود نبی عربی کا ظہور اس وقت ہوا جب کہ حالات اپنی فطری رفتار سے چل کر وہاں پہنچ چکے تھے جہاں پہنچنے کے بعد وہ وقت آگیا تھا کہ اب آخری رسول کو دنیا میں بھیج دیا جائے۔

اسلام کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے ربانی حکمت درکار ہے۔ اس کے لئے اس یقین کی ضرورت ہے کہ مستقبل میں چھپی ہوئی فصل کی خاطر ہم اپنے دانہ کو زمین میں دفن کرسکیں۔ اس کے لئے اس صبر کی ضرورت ہے کہ چنار کے پودے کو درخت کی صورت میں دیکھنے کے لئے ہم سو سال کا انتظار کرسکیں۔ اس کے لئے وہ بلند نظری درکار ہے کہ پھول کی طرح ہم دوست دشمن سب کے لئے مہکیں اور

سورج کی طرح ہر پست و بلند کے لئے چمکیں۔ پیغمبر کی دعا جب حقائق کی پوری رعایت کرتے ہوئے اپنی تکمیل کو پہنچی تو ہماری کوئی جدوجہد حقائق کی رعایت کے بغیر کس طرح واقعہ کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔

کسی نظام زندگی کا غلبہ ہمیشہ نظامِ فکر میں غلبہ کے بعد ہوتا ہے۔ جمہوری نظام جدید دنیا میں اس وقت رائج ہو سکا جب کہ طویل نظریاتی جدوجہد کے بعد بادشاہی طرزِ فکر پر جمہوری طرزِ فکر کو عمومی غلبہ حاصل ہو گیا۔ اسی طرح اشتراکی نظام اس وقت قائم ہوا جبکہ اعلیٰ ترین دماغوں کی مسلسل کوشش نے اجتماعی ملکیت کے تصور کو انفرادی ملکیت کے تصور پر نظری فتح دے دی۔ اسلام کا احیاء بھی آج کی دنیا میں اسی طرح ہوگا۔

قدیم زمانہ میں شرک کے نظام کو غلبہ حاصل تھا۔ رسول اور آپ کے اصحاب نے بے پناہ دعوتی کوشش سے موحدانہ طرزِ فکر کو مشرکانہ طرزِ فکر پر غالب کیا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ توحید کی بنیاد پر زندگی کا عملی نظام بنایا جا سکے۔ دورِ اول میں جو انقلاب آیا تھا اس کے اثرات تقریباً ایک ہزار سال تک جاری رہے۔ اس کے بعد حالات بدلنا شروع ہوئے۔ اب موجودہ زمانہ میں یہ تبدیلی اس انتہا کو پہنچی ہے کہ قدیم شرک کی جگہ جدید ہیومنزم نے لے لی ہے۔ آج کی دنیا میں ہر طرف انسان پرستی کا غلبہ ہے۔ جو معاملہ پہلے توحید بمقابلہ شرک تھا، وہ اب خدا پرستی بمقابلہ انسان پرستی ہو گیا ہے۔ اس صورت حال کو ختم کرنے کے لئے پہلے ہمیں فکری انقلاب لانا ہوگا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ کوئی حقیقی عملی انقلاب وجود میں آسکے۔

جس طرح قدیم زمانہ میں ڈھائی ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں خدا نے شرک کے مقابلہ میں توحید کو غالب کرنے کے حالات فراہم کئے تھے، اسی طرح موجودہ زمانہ میں ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں توحید کے مقابلہ میں انسان پرستی کو زیر کرنے کے لئے بھی بہترین موافق حالات جمع کر دئے گئے ہیں۔ تاہم ان کو استعمال کرنے کے لئے صبر اور ہوش مندی کی ضرورت ہے۔ ہمارے اسلاف نے پچھلے مواقع کو صبر اور ہوش مندی کے ساتھ استعمال کر کے دورِ اول میں توحید کو غالب کیا تھا۔ اسی طرح اب دورِ ثانی میں بھی جدید پیدا شدہ مواقع کو صبر اور ہوش مندی کے ساتھ استعمال کر کے ہی اسلام کو دوبارہ غالب اور سربلند کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام آسمانی خوش فہمیوں سے ہوگا اور نہ پرجوش ہنگامہ آرائیوں سے۔ اسلام کے غلبۂ اول کی تاریخ اس کے غلبۂ ثانی کے طریقہ کو بتانے کے لئے بالکل کافی ہے۔

وحید الدین

۸ر مئی ۱۹۸۲

معرفت کی دو سطحیں

زمین و آسمان کا نظام انتہائی حیرت انگیز نظام ہے۔ سائنس داں اس پر غور کرتا ہے۔ مگر سائنسداں کائنات کے مطالعہ سے کیا پاتا ہے۔ سائنس داں کے لئے کائنات بس حسابات اور اعداد و شمار کی ایک چیز ہوتی ہے —— زمین کا قطر ۲۵ ہزار میل ہے۔ سورج زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا ہے۔ زمین سے سورج کا فاصلہ ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے۔ زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتی ہے، وغیرہ۔ سائنس داں کو کائنات کے مطالعہ سے بس اس قسم کی کچھ شماریاتی تفصیلات حاصل ہوتی ہیں۔

مگر اسی کائنات کو جب ایک مومن دیکھتا ہے تو وہ اس کے لئے حقیقت اعلیٰ سے ملاقات کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات دن کے آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں، جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی بناوٹ پر غور کرتے ہیں، وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب، تونے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب، تونے جسے آگ میں ڈالا اس کو تونے بڑی رسوائی میں ڈال دیا۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں، اے ہمارے رب، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف پکارتا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لائے۔ اے ہمارے رب، پس تو ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ اے ہمارے رب، تونے جو وعدے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے کئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہم کو رسوائی میں نہ ڈال۔ بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے ——

(آل عمران رکوع آخر)

سائنس داں نے بھی کائنات کو دیکھا اور مومن نے بھی اسی کائنات کو دیکھا۔ مگر سائنس داں کائنات کو سائنسی نظر سے دیکھتا ہے اور مومن کائنات کو ایمانی نظر سے۔ نظر کا یہ فرق دونوں کے مشاہدہ کے حاصل میں غیر معمولی فرق پیدا کر دیتا ہے۔ سائنسی نظر سے کائنات کو دیکھنے والے کو صرف شماریات کی قسم کی کچھ ظاہری چیزیں ملی تھیں۔ مگر جس نے کائنات کو ایمانی نظر سے دیکھا اس کے لئے کائنات خدائی جلووں کا معنوی خزانہ بن گئی۔ اس کو یہاں ایک خدائی اسکیم نظر آئی۔ اس نے کائنات کے پردے میں جنت اور جہنم کو دیکھ لیا۔ اس میں اس کو اعتراف حق کی غذائیں ملنے لگیں۔ اس میں اس نے کائنات کے بامقصد ہونے کا راز دریافت کر لیا۔ وہ اس کے ذریعہ سے خالق کے عین قریب پہنچ گیا۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ معرفت کی دو سطحیں ہیں۔ ایک ظاہری سطح اور دوسری باطنی اور گہری سطح۔ یہی بات ہر چیز کے بارے میں ہے اور یہی بات قرآن کے بارے میں بھی ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن سات حرفوں پر اترا ہے۔ اس کی ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔ اور ہر حد کے لئے ایک مطلع ہے (عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما اُنزِلَ القرآنُ علی سبعۃِ احرفٍ لکلّ آیۃٍ منہا ظہرٌ وبطنٌ ولکلّ حدٍّ مُطَّلَعٌ، شرح السنۃ)

مُطَّلَع عربی زبان میں جھانکنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اگر آپ عام جگہ پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو آپ کو صرف قریب کی چیزیں دکھائی دیں گی۔ اور اگر آپ زیادہ بلندی پر کھڑے ہوں تو بہت دور تک کی چیزیں آپ کو نظر آنے لگیں گی۔ اسی طرح قرآن سے استفادہ کے بھی دو مطلع (مقام مشاہدہ) ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن کو سمجھنے کی دو سطحیں بن جاتی ہیں۔ قرآن کا ایک ظاہری مفہوم ہے جو سادہ طور پر اس کو پڑھنے سے سمجھ میں آتا ہے۔ اسی کے ساتھ قرآن کا ایک گہرا مفہوم ہے جو غور وفکر کے ذریعہ واضح ہوتا ہے۔ ظاہری مطلع سے قرآن کو سمجھنا یہ ہے کہ آپ اس کے ظاہری الفاظ پر ٹھہر جائیں۔ الفاظ قرآن سے بظاہر جو مفہوم نکل رہا ہے اس سے آگے جانے کی کوشش نہ کریں۔ باطنی مطلع سے قرآن کو سمجھنا یہ ہے کہ آپ الفاظ کے گہرے معانی تک پہنچنے کی کوشش کریں، سطروں کے ساتھ بین السطور میں چھپے ہوئے معانی پر بھی غور کریں۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے یہاں ہم دو مثالیں نقل کریں گے۔

۱۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو۔ اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں۔ اس میں اس کے لئے ہر قسم کے پھل ہوں۔ پھر وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کے بچے ابھی کمزور ہوں۔ اس وقت باغ پر تیز گرم بگولا آئے اور باغ جھلس جائے۔ اللہ اس طرح اپنی نشانیاں تمھارے سامنے بیان کرتا ہے تاکہ تم غور کرو (بقرہ ۲۶۶)

خلیفہ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک روز اپنی مجلس میں یہ آیت پڑھی اور کہا کہ اس آیت نے آج کی رات مجھے سونے نہیں دیا۔ پھر آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ تمھارا کیا خیال ہے کہ کس کے بارہ میں یہ آیت اتری ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ کی مثال دی گئی ہے اور یہ یاد دلایا گیا ہے کہ یہ چیزیں خدا کی نعمتیں ہیں۔ خدا جب چاہے ان کو دے اور جب چاہے گرم ہوائیں بھیج کر انھیں جلا دے۔ گویا ان لوگوں کے نزدیک اس آیت کا مطلب بس وہی تھا جو بظاہر اس کے الفاظ سے نکل رہا تھا۔

آخر میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بولے جو اس وقت نوجوان تھے۔ انھوں نے کہا کہ اس میں انسانی عمل کی تمثیل ہے۔ حضرت عمر نے پوچھا کہ کون سا عمل۔ انھوں نے کہا: یہ ایسے آدمی کی مثال ہے جو مال دار ہے۔ وہ اللہ کی

اطاعت کر رہا ہے۔ پھر اللہ نے اس کی آزمائش کے لئے اس کے پاس شیطان کو بھیجا۔ اس سے متاثر ہو کر وہ آدمی گناہ کا کام کرنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کے اعمال ختم ہو گئے۔ حضرت عمر نے فرمایا: میرے بھتیجے تو نے سچ کہا۔ اس کے بعد حضرت عمر نے ان الفاظ میں آیت کی تشریح کی:

عُنی بہا العمل۔ ابن آدم افقر ما یکون الی جنتہ اذا کبر سنہ وکثرت عیالہ وابن آدم افقر ما یکون الیٰ عملہ یوم القیامۃ (تفسیر ابن کثیر)

اس مثال سے عمل مراد لیا گیا ہے۔ انسان اپنے باغ کا اس وقت زیادہ محتاج ہوتا ہے جب کہ اس کی عمر بڑھے اور اولاد زیادہ ہو جائے۔ اور انسان اپنے عمل کا سب سے زیادہ محتاج قیامت کے دن ہوگا

جو لوگ قرآن کی مذکورہ آیت کو ظاہری مطلع سے دیکھ رہے تھے، انھوں نے باغ کو لفظی طور پر بس باغ کے معنی میں لے لیا۔ مگر جو لوگ آیت کو باطنی مطلع سے دیکھ رہے تھے انھوں نے اس کو تمثیل کے معنی میں لیا۔ پہلے مفہوم میں آیت صرف دنیا کے پھل کے ملنے اور پھر چھن جانے کے معنی میں تھی۔ مگر دوسرے مفہوم میں وہ آخرت کی عظیم حقیقت کو واضح کرنے کا ذریعہ بن گئی۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو خلافت کے معاملہ میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ کوئی کہتا خلیفہ کا انتخاب مہاجرین میں سے ہونا چاہئے، کوئی کہتا کہ انصار میں سے۔ کوئی اس منصب کے لئے ایک شخصیت کا نام لیتا اور کوئی دوسری شخصیت کا۔ اس سلسلے میں ابن ابی شیبہ نے ابن سیرین سے جو روایت نقل کی ہے اس کا ایک حصہ یہ ہے:

واتی الناس عند بیعۃ ابی بکر ابا عبیدۃ بن الجراح فقال: تاتونی وفیکم ثالث اثنین (کنز العمال، جلد ۳ صفحہ ۱۴۰)

ابو بکرؓ سے بیعت کے وقت کچھ لوگ ابو عبیدہ بن جراحؓ کے پاس آئے۔ انھوں نے جواب دیا: تم لوگ خلافت کے لئے میرے پاس آئے ہو جب کہ تمہارے درمیان ثانی اثنین (ابو بکر) ہیں۔

ہجرت کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ کی طرف سفر کیا تو آپ کا قافلہ صرف دو آدمیوں پر مشتمل تھا۔ ایک آپ اور دوسرے حضرت ابو بکر۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: جب کافروں نے اس کو نکالا، جب وہ دو میں کا دوسرا تھا۔ جب وہ دونوں غار میں تھے (اذ اخرجہ الذین کفروا ثانی اثنین اذ ھما فی الغار، توبہ ۴۰)

جو لوگ لفظی سطح پر قرآن کو دیکھ رہے تھے، ان کے لئے یہ مسئلہ ابھی غیر طے شدہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کس کو خلیفہ بنایا جائے۔ مگر جو لوگ قرآن کو معنوی سطح سے دیکھ رہے تھے، ان کے لئے قرآن کی یہ

آیت خلافت کی ترتیب کے سوال کو پہلے ہی طے کر چکی تھی۔ قرآن میں ثانی اثنین (دو میں کا دوسرا) کے لفظ میں انھوں نے خدا کی اس منشا کو پالیا کہ اس کے نزدیک ابوبکر دو میں کے دوسرے ہیں، وہ رسول خدا کے بعد نمبر دو پر ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں یہ معنوی اشارہ پانے کے بعد ان کے لئے اس معاملہ میں اختلاف و انتشار کا کوئی سوال نہ تھا ——— جن لوگوں نے آیت کو ظاہری مطلع سے دیکھا ان کو یہ آیت صرف غار ثور کے ایک تاریخی واقعہ سے متعلق نظر آئی۔ مگر جن لوگوں نے قرآن کی آیت کو باطنی مطلع سے دیکھا ان کے لئے وہ ترتیب خلافت کے نازک سوال کا جواب بن گئی۔

یہی معاملہ پورے دین اور پورے قرآن کا ہے۔ ایک دین داری اور قرآن فہمی وہ ہے جو ظاہری سطح پر ہوتی ہے۔ آدمی بس ظاہری چیزوں کو جانتا ہے اور ان کے مطابق عمل کرتا ہے۔ دوسری دینداری اور قرآن فہمی وہ ہے جو گہرائیوں میں اتری ہوئی ہو۔ آدمی الفاظ یا ظواہر سے گزر کر اندر چھپے ہوئے حقائق تک پہنچ جائے۔ وہ خدا کو اس کے غیبی روپ میں دیکھ لے۔ یہ دوسرا آدمی بھی بظاہر دیکھنے میں پہلے آدمی کی طرح ہوتا ہے مگر نفسیات کے اعتبار سے وہ بالکل دوسرا انسان ہوتا ہے۔ اس کی منصوبہ بندی اور پہلے شخص کی منصوبہ بندی میں اتنا ہی فرق ہوتا ہے جتنا خدائی منصوبہ بندی اور انسانی منصوبہ بندی میں۔

معرفت کی اس دہری سطح کا تعلق شخصی دینداری سے بھی ہے اور اجتماعی دینداری سے بھی۔ ایک شخص جس کی رسائی "سطور" تک ہو وہ قرآن کی آیتوں سے صرف ایک ایسا دین لے سکے گا جو اس کے ظاہری جسم کو چھوئے مگر اس کے اندرون تک نہ اترے۔ اس کے برعکس جس کی رسائی "بین السطور" تک ہوگی وہ قرآن کی اسی آیت میں ایسے معانی پائے گا جو اس کی روح کے لئے ربانی غذا بن جائیں۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ تقویٰ کا لباس زیادہ بہتر ہے (الاعراف ۲۶) یہاں عام آدمی نے لباس سے جسمانی کپڑا مراد لے لیا اور لباس تقویٰ کا مطلب یہ سمجھا کہ وہ لباس جس کی وضع قطع شرعی حدود کے مطابق ہو۔ مگر اسی آیت کو عروہ بن الزبیر نے پڑھا تو انھوں نے پایا کہ یہاں لباس کا لفظ تمثیلی مفہوم میں ہے۔ انھوں نے لباس التقویٰ کی تشریح خشیۃ اللہ سے کی۔ یعنی جس طرح جسم انسانی کی زینت یہ ہے کہ وہ ملبوس ہو اسی طرح روح انسانی کی زینت یہ ہے کہ وہ اللہ سے ڈرنے والی ہو (تفسیر ابن کثیر)

یہی معاملہ دین کے اجتماعی پہلو کا ہے۔ اجتماعیات میں دین کو قائم کرنا ایک ظاہری سطح کے اعتبار سے ہوتا ہے اور ایک باطنی سطح کے اعتبار سے۔ غزوۂ حدیبیہ (سنہ ۶ھ) کے موقع پر عام مسلمان اس انداز میں سوچتے تھے کہ جہاد یہ ہے کہ کافروں سے لڑ جائیں۔ کیونکہ عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے۔ مگر پیغمبر خدا اور ابوبکر صدیق کو نظر آیا کہ اسلام کی فتح اس میں ہے کہ کافروں کی تمام شرطیں مان کر ان سے ناجنگ معاہدہ کر لیا

جائے تاکہ حالات معتدل ہوں اور اسلام کے لئے دعوتی عمل کی راہ کھل جائے۔ ظاہر بیں لوگ معاملہ کو تلوار کی سطح پر حل کرنا چاہتے تھے۔ مگر حکمت وبصیرت کی نگاہ سے دیکھنے والوں کو نظر آیا کہ معاملہ کو دعوت کے میدان تک لے جائیں۔ کیونکہ دعوت کا میدان وہ میدان ہے جہاں اسلام کو ابدی فوقیت حاصل ہے۔

یہی مثال ایک اور پہلو سے حضرت حسن اور حضرت حسین کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ دونوں کو بالکل یکساں قسم کی صورت حال سے سابقہ پیش آیا۔ حضرت حسن کے سامنے معاویہ بن ابی سفیان کا مسئلہ تھا اور حضرت حسین کے سامنے یزید بن معاویہ کا۔ حضرت حسین نے معاملہ کو اس کی نظری صورت میں بس حق اور ناحق کے اعتبار سے دیکھا۔ وہ حق کے علم بردار بن کر ناحق سے لڑ گئے۔ اس کے برعکس حضرت حسن نے معاملہ کو عملی نقطۂ نظر سے دیکھا۔ ان کو مفید بات یہ نظر آئی کہ وہ ٹکراؤ کو ختم کرکے خانہ نشیں ہوجائیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت حسین کے حصہ میں صرف یہ آیا کہ وہ ناحق کو بدستور زندہ چھوڑ کر کربلا کے میدان میں شہید ہوجائیں۔ اور حضرت حسن کے طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کو سیاسی استحکام مل گیا اور باہمی لڑائی ختم ہوکر اسلام کی توسیع کا کام ازسرنو پوری قوت کے ساتھ شروع ہوگیا۔

اجتماعی معاملات میں گہری سیاست کو پانے کا راز صبر ہے۔ اس کے برعکس سطحی سیاست کا سبب بے صبری۔ مسلمان اس زمین پر اکیلے نہیں ہیں بلکہ دوسرے گروہوں کے ساتھ ہیں۔ یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے اور یہاں ہر ایک کو عمل کا موقع ہے، خواہ وہ عادل ہو یا ظالم۔ اب اگر ایسا ہو کہ مسلمانوں کو جب بھی کسی شخص یا گروہ کی طرف سے کوئی گزند پہنچے تو وہ فوراً مشتعل ہوجائیں اور وقتی جذبات کے تحت اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں تو وہ ہمیشہ سطحی کارروائیاں کریں گے اور اس کے نتیجہ میں ہمیشہ ناکام رہیں گے۔

لیکن اگر مسلمان ایسا کریں کہ گزند کے ابتدائی جھٹکے کو سہہ لیں، وہ مشتعل نہ ہوکر معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کریں۔ وہ اپنی کمزوریوں اور فریق ثانی کی قوتوں کا جائزہ لیں اور خالص حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے یہ رائے قائم کریں کہ واقعہ کا اصل سبب کیا ہے اور اس کو کوئی مزید خرابی لائے بغیر کس طرح دور کیا جاسکتا ہے۔ اگر مسلمان اس "صابرانہ" طریقہ کو اختیار کریں تو یقینی طور پر وہ گہری سیاست کو پالیں گے اور گہری سیاست اختیار کرنے والے کے لئے کبھی ناکامی کا کوئی سوال نہیں۔

بے صبری آدمی کو جذباتی عمل یا سطحی کارروائیوں کی طرف لے جاتی ہے اور صبر آدمی کو منصوبہ بند عمل کا راستہ دکھاتا ہے اور امتحان کی اس دنیا میں سطحی عمل کے مقابلہ میں منصوبہ بند عمل ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے۔

طریق مطالعہ

حضرت آدم علیہ السلام کی امت دجلہ وفرات کے درمیانی علاقہ میں بسی ہوئی تھی جس کو تاریخ میں میسوپوٹامیا کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اس وقت کے مسلمان تھے۔ جب ان میں بگاڑ آیا تو ان کی اصلاح کے لئے خدا کے پیغمبر حضرت نوح بھیجے گئے۔ مگر قوم اپنی غفلت اور سرکشی کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوئی۔ بالآخر ان پر عظیم سیلاب کی صورت میں خدا کا عذاب آیا۔ حضرت نوح اپنے تھوڑے سے پیرووں کے ساتھ ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔ صرف یہی کشتی اور اس کے سوار سیلاب کی زد سے بچے، باقی تمام لوگ غرق کر دئے گئے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت نوح کا ایک لڑکا آنجناب کا ساتھ دینے پر راضی نہیں ہوا تھا، وہ بھی عمومی سیلاب کی زد میں آگیا۔ حضرت نوح نے اس کو پکارا کہ ہماری کشتی میں آجاؤ۔ لڑکے نے جواب دیا کہ میں پہاڑ پر چڑھ جاتا ہوں، وہ مجھ کو اس طوفان سے بچالے گا۔ پیغمبر نے کہا کہ آج کوئی چیز کسی کو امر اللہ سے بچانے والی نہیں (ہود ۴۳) حضرت نوح سیلاب کو ایک خدائی معاملہ سمجھتے تھے اس لئے وہ اس کو دیکھ کر خدا کی کشتی میں داخل ہو گئے۔ مگر ان کے لڑکے نے اس کو صرف ایک موسمی معاملہ سمجھا اس لئے وہ پہاڑ کی طرف بھاگا۔ یہ فرق اتنا بنیادی تھا کہ ایک نے نجات پائی اور دوسرے کو سیلاب کی موجوں نے نگل لیا ——— کسی طوفان کو اگر آپ خدائی معاملہ سمجھیں تو آپ خدا کی طرف دوڑیں گے، آپ کے اندر تضرع کی کیفیت ابھرے گی (انعام ۴۲) اس کے برعکس اگر آپ اس کو عام اسباب کے تحت واقع ہونے والا معاملہ قرار دیں تو آپ کے اندر صرف غفلت اور سرکشی پیدا ہوگی، جیسا کہ حضرت نوح کے لڑکے میں پیدا ہوئی۔

موجودہ زمانہ میں بھی مسلمان ایک بہت بڑے طوفان سے دوچار ہیں۔ وہ یہ کہ مسلمان ساری دنیا میں کافر قوموں اور بے دین طاقتوں کی زد میں آگئے ہیں۔ خواہ مسلم اکثریت کے علاقے ہوں یا مسلم اقلیت کے، غیر مسلم قومیں ہر جگہ مسلم قوموں کو اپنے نشانہ پر لئے ہوئے ہیں۔ یہ قومیں کہیں براہ راست طور پر مسلمانوں کو مغلوب کئے ہوئے ہیں اور کہیں خود مسلمانوں میں سے ایک گروہ کو ان کے دوسرے گروہ کے خلاف استعمال کرکے بالواسطہ طور پر اپنے ظالمانہ ارادے پورے کر رہی ہیں۔

اہل ایمان کے بارے میں خدا نے بار بار وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کے ساتھ ہے (الانفال ۱۹) وہ اہل ایمان کی طرف سے دفاع کرتا ہے (الحج ۳۸) وہ ہرگز کافروں کو ان پر غالب آنے کا موقع نہیں دے گا (النساء ۱۴۱) اس لئے لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ مسلمانوں کے حق میں خدائی تنبیہ ہے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک خدائی معاملہ ہے نہ کہ محض ایک انسانی معاملہ۔ مگر مسلمانوں کے سوچنے کا انداز اس سلسلے

میں کیا ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان آج مختلف الفاظ میں ایک ہی بات کو دہرا رہے ہیں : یہ مسلمانوں کے خلاف اسلام دشمن طاقتوں کی سازش ہے۔ ہمارے تمام لکھنے والے قلم اور تمام بولنے والی زبانیں اسی ایک بات کو ثابت کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔ کسی کو بھی ان واقعات میں خدا کا ہاتھ کام کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ البتہ کسی نے اس میں "وھائٹ ہاؤس" کا ہاتھ دریافت کر رکھا ہے اور کسی نے "ریڈ ہاؤس" کا۔ کوئی کسی مشرک قوم کو الزام دے رہا ہے اور کوئی کسی کافر قوم کو۔

یہ واحد سب سے بڑی گمراہی ہے جس میں موجودہ زمانہ کے تمام مسلم قائدین مبتلا ہیں۔ انھوں نے ایک کھلے ہوئے خدائی واقعہ کو انسانی واقعہ کے خانہ میں ڈال دیا ہے۔ حضرت نوح کے لڑکے نے اپنے زمانہ کے طوفان کے بارے میں جو غلطی کی تھی ٹھیک وہی غلطی مسلمان موجودہ زمانہ کے طوفان کے بارے میں کر رہے ہیں۔ وہ ایک خدائی معاملہ کو انسانی معاملہ سمجھ رہے ہیں۔ اگر وہ اس کو خدائی معاملہ سمجھتے تو وہ اللہ کی طرف رجوع کرتے۔ ان کے اندر اپنی اصلاح کا جذبہ ابھرتا۔ ان کی ساری سوچ خدارخی سوچ بن جاتی۔ مگر جب اس کو انھوں نے انسانی سازش قرار دیا تو اس کے بعد یہی ہو سکتا تھا کہ ان کے اندر دوسری قوموں کے خلاف نفرت اور انتقام کا جذبہ ابھرے۔ خدا کو آدمی قادر مطلق جانتا ہے۔ اس لئے جب کسی سختی کو خدا کی طرف سے سمجھا جائے تو اس کے جواب میں اس کے اندر عجز کی نفسیات ابھرتی ہے۔ اس کے برعکس انسان کو وہ اپنے جیسا سمجھتا ہے اس لئے جب کسی سختی کو انسان کی طرف منسوب کیا جائے تو اس کے جواب میں نفرت اور انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ آج ساری دنیا کے مسلمانوں میں بہت بڑے پیمانہ پر یہی دوسرا واقعہ پیش آیا ہے۔

کتاب آسمانی کی حامل قوموں کے لئے خدا کا یہ خاص قانون ہے کہ ان کے اندر جب بگاڑ آتا ہے تو ان پر خدا کی طرف سے تنبیہی سزائیں آتی ہیں تاکہ وہ جاگیں اور اپنی اصلاح کریں۔ یہود جو پچھلے دور کے حامل دین تھے، ان پر ان کے بگاڑ کے نتیجہ میں بار بار اس قسم کی تنبیہی سزائیں آتی رہیں۔ بائبل میں تفصیل سے ان تنبیہات کا ذکر ہے۔ حضرت مسیح کی پیدائش سے پہلے کی سزاؤں کا ذکر زبور، یسعیاہ، یرمیاہ اور حزقی ایل میں موجود ہے اور حضرت مسیح کے بعد کی سزا کا ذکر متی اور لوقا کی انجیلوں میں ملتا ہے۔ مثلاً ایک کتاب میں یہود کے بگاڑ کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے: اس لئے خداوند کا قہر اپنے لوگوں پر بھڑکا اور اسے اپنی میراث (اسرائیل) سے نفرت ہو گئی اور اس نے ان کو قوموں کے قبضہ میں کر دیا اور ان سے عداوت رکھنے والے ان پر حکمراں بن گئے (زبور باب ۱۰۶)

یہود کے ساتھ خدا نے جو معاملہ کیا اس کا ذکر قرآن میں ان لفظوں میں آیا ہے : اور ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے اس فیصلہ سے کتاب میں آگاہ کر دیا تھا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔ پس جب ان میں سے پہلی سرکشی کا موقع پیش آیا تو ہم نے تمہارے اوپر ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زور آور تھے۔

وہ تمھارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے۔ یہ ایک وعدہ تھا جو پورا ہو کر رہا۔ پھر ہم نے تمھاری باری ان پر لوٹائی اور مال واولاد سے تمھاری مدد کی اور تمھاری تعداد بڑھادی۔ اگر تم اچھے کام کروگے تو اپنے لئے کروگے۔ اور اگر تم برے کام کروگے تو اپنے لئے کروگے۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تمھارے اوپر مسلط کیا تاکہ وہ تمھارے چہرے بگاڑدیں اور مسجد (بیت المقدس) میں گھس پڑیں جس طرح پہلی بار گھس پڑے تھے اور تاکہ جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے اس کو تہس نہس کر ڈالیں۔ ہو سکتا ہے کہ تمھارا رب تم پر رحم فرمائے اور اگر تم پھر وہی کروگے تو ہم بھی وہی کریں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لئے قیدخانہ بنا رکھا ہے (بنی اسرائیل ۸-۴)

جیسا کہ اوپر کے حوالوں سے ظاہر ہے، یہود پر خدا کی یہ سزائیں انسانی ہاتھوں سے جاری کی گئیں۔ مثلاً ۷۲۱ ق م میں سامریہ کو مغلوب کر کے حکومت اسرائیل کا خاتمہ کر دیا گیا۔ ہزاروں یہودی مار ڈالے گئے۔ فلسطین کے بڑے حصہ سے یہودیوں کو نکال کر وہاں غیر قوم کے لوگوں کو بسا دیا گیا۔ یہ کام خدا کے فرشتوں نے آکر انجام نہیں دیا بلکہ یہ اشوری فرماں روا سارگون (Sargon II) تھا جس نے اس خدائی سزا کو یہود کے اوپر نافذ کیا — ۵۸۶ ق م میں جب یروشلم کے یہودی قتل کئے گئے اور غلام بنائے گئے اور بیت المقدس کو جلا دیا گیا تو یہ کام بھی آسمانی طاقتوں کے ذریعہ نہیں ہوا بلکہ بابل کے بادشاہ بخت نصر (Nebuchadnezzar) نے یہ سارے کام انجام دئے۔ ۱۶۸ ق م میں بیت المقدس پر حملہ ہوا۔ یہودیوں کو غلام بنا کر ان کے مقدس صحیفوں کو جلا دیا گیا۔ اس بار بھی یہ کام مافوق ذرائع سے نہیں ہوا بلکہ شام کا بادشاہ انطیوخوس چہارم (Antiochus IV) تھا جس نے یہود کے خلاف یہ تمام سفاکیاں کیں۔ ۶۳ ق م میں ایک اجنبی قوم فلسطین میں داخل ہوئی۔ اس نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے یہودیوں کو اپنا غلام بنا لیا۔ یہ واقعہ جس کے ذریعہ سے ہوا وہ دوبارہ کوئی آسمانی مخلوق نہیں تھی بلکہ یہ رومی فاتح پومپی (Pompey) تھا جس نے اس عمل کو انجام دیا۔ اسی طرح ۷۰ء میں بیت المقدس پر حملہ ہوا اور ہیکل سلیمانی کو ڈھا دیا گیا۔ یہود کے مقدس شہر کو ملبہ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا گیا۔ تقریباً ڈیڑھ لاکھ یہودی قتل ہوئے اور بقیہ غلام بنا لئے گئے۔ اس بار بھی یہ کام خود خدا نے ظاہر ہو کر نہیں کیا بلکہ یہ رومی بادشاہ ٹیٹس (Titus) تھا جس نے اس تخریبی منصوبہ کو مکمل کیا۔

اس طرح کے تمام واقعات کے بارے میں یہود یہی کہتے ہیں کہ وہ اسرائیل دشمن طاقتوں کی سازش تھی، ان کا خدائی سزا سے کوئی تعلق نہیں۔ ان واقعات کی انسانی نوعیت انھیں یہ کہنے کا پورا موقع دے رہی ہے۔ مگر قرآن اور بائبل دونوں سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب یہود کے حق میں خدا کی تنبیہی سزائیں تھیں جو انسانوں کے ہاتھوں ان کے اوپر جاری کی گئیں۔ یہود اگر ان واقعات کو خدا کی طرف سے سمجھتے تو ان کے اندر توبہ اور انابت

کا جذبہ ابھرتا، وہ تقویٰ اور اطاعت کی زندگی اختیار کرتے۔ مگر جب انھوں نے ان واقعات کو اسرائیل دشمن طاقتوں کا ظلم قرار دیا تو اس نے صرف ان کی غفلت اور سرکشی میں اضافہ کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا اپنی سزا کو کھلے فرشتوں کے ذریعہ نہیں بھیجتا۔ بلکہ عام انسانی واقعات کے درمیان ان کا نفاذ کرتا ہے۔ تاکہ امتحان کا پردہ باقی رہے۔ جن کے اندر کچھ صلاحیت موجود ہے وہ اس کو خدائی معاملہ سمجھ کر چونکتے ہیں اور اپنی اصلاح کر لیں۔ اور جو لوگ بے حسی اور غفلت میں ڈوب چکے ہیں وہ اس کو انسان کا ظلم اور سازش قرار دے کر اپنی سرکشی میں اضافہ کرتے رہیں۔

مسلمان آج جن ناموافق حالات میں اپنے کو گھرا ہوا پاتے ہیں ان کو دشمنوں کی کارروائی قرار دینے کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کا پورا طرز فکر منفی اور غیر حقیقت پسندانہ ہو کر رہ گیا ہے۔ ان کے اندر وہ مثبت ذہن نہیں ابھرا جو کسی صالح اور نتیجہ خیز جد و جہد کی لازمی بنیاد ہے۔

حالات کو ظلم اور سازش کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی بنا پر انھیں کسی معاملہ میں اپنی غلطی نظر نہیں آتی، وہ بس دوسروں کو یک طرفہ الزام دیتے رہتے ہیں۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کا دینی طرز فکر بالکل سیاست رخی ہو گیا ہے جب کہ صحیح مسلم فکر وہ ہے جو آخرت رخی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک بے کردار قوم بن کر رہ گئے ہیں، کیونکہ کردار اپنے آپ پر ذمہ داری لینے کے بعد پیدا ہوتا ہے اور مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ حقوق طلبی کے سوا اپنی کوئی ذمہ داری جانتے ہی نہیں۔ اسی سبب سے ایسا ہوا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا طرز عمل اصولی کے بجائے قومی ہو گیا ہے، کیونکہ جو لوگ دوسروں کو اپنا قومی حریف سمجھیں ان کی روش قدرتی طور پر قومی ہو جائے گی۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آپس کی لڑائی آج مسلمانوں میں تمام قوموں سے زیادہ پائی جاتی ہے، کیونکہ غیروں کو جب وہ اپنی جھنجلاہٹ کا شکار نہیں بنا پاتے تو اپنوں ہی کے اوپر اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔

پھر اسی غلط فکری کا یہ عظیم نقصان مسلمانوں کے حصہ میں آیا ہے کہ موجودہ زمانہ میں ان کے اندر دعوتی ذہن نہیں ابھرا جو کہ امت مسلمہ کا اصل مقصد وجود ہے۔ دوسری قوموں کو خدا کے دین رحمت کا مدعو بنانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ داعی کے دل میں ان کے لئے محبت اور خیر خواہی کا جذبہ پایا جاتا ہو۔ مگر ظلم اور سازش کی اصطلاحوں میں سوچنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کے بارے میں مسلمانوں کے اندر مخالفانہ نفسیات پیدا ہو گئی۔ مسلمانوں کے دل میں ان مدعو اقوام کے لئے نفرت اور بیزاری کے سوا کسی اور جذبہ کی گنجائش ہی نہ تھی، پھر وہ ان کو دین رحمت کا مخاطب بناتے تو کیوں کر بناتے۔

ذہنی بیداری

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ بستیوں کے لوگ اگر ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے۔ مگر انھوں نے جھٹلایا (الاعراف ۹۶) یہی بات یہود کے بارے میں کہی گئی ہے کہ انھوں نے نبی آخر الزماں کو جھٹلا دیا، اگر وہ ان پر ایمان لاتے تو وہ اپنے اوپر سے بھی کھاتے اور اپنے قدموں کے نیچے سے بھی اپنا رزق حاصل کرتے (المائدہ ۶۶)

ایک رسول کا اقرار کرنے پر اتنی زیادہ برکتوں کی خوش خبری کیوں دی گئی — بہت سے لوگ اس کی وجہ یہ سمجھتے ہیں کہ کلمۂ ایمان میں طلسماتی اوصاف چھپے ہوئے ہیں اور زبان سے اس کا تلفظ کرتے ہی اسی طرح تمام خزانوں کے دروازے کھل جاتے ہیں جس طرح قدیم افسانوی کہانی میں "سم سم" کہنے سے ایک شخص کے لئے خزانوں کا محل کھل گیا تھا۔ مگر اس قسم کا خیال سراسر بے بنیاد ہے۔ اگر ان برکتوں کا تعلق کلمۂ ایمان کی لفظی ادائگی سے ہوتا تو آج مسلمانوں کی زندگیوں میں ہر زمانہ سے زیادہ اس کا ظہور ہو رہا ہوتا۔ کیونکہ کلمۂ ایمان کا تلفظ کرنے والے آج ہر زمانہ سے زیادہ عظیم مسلم امت (ایک ارب) کی صورت میں زمین کے اوپر موجود ہیں۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ ایمان کے مدعیوں کی بے پناہ کثرت کے باوجود آج ان کے لئے نہ آسمانی برکتوں کے دروازے کھل رہے ہیں اور نہ زمینی برکتوں کے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں ایمان کا لفظ فکری انقلاب کے ہم معنی ہے۔ اس وقت جو لوگ آپ پر ایمان لائے ان کے لئے ایمان کا مطلب واضح طور پر ایک ذہنی فیصلہ تھا۔ اس حقیقت کو بآسانی اس وقت سمجھا جاسکتا ہے اگر یہ دیکھا جائے کہ جب یہ آیتیں اتریں اس وقت یہود کے لئے یا عرب کے لوگوں کے لئے ایمان لانے کا مطلب عملاً کیا تھا۔

آج جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیتے ہیں تو یہ لفظ بولتے ہی ہمارے ذہن میں ایک مسلّمہ شخصیت آجاتی ہے جس کے ساتھ ڈیڑھ ہزار برس کی تاریخی عظمتیں وابستہ ہو چکی ہیں۔ مگر بعثت کے وقت لوگوں کی نظر میں آپ صرف "محمد بن عبداللہ" تھے۔ اس وقت یہ ساری تاریخ ابھی مستقبل کے پردہ میں چھپی ہوئی تھی۔ لوگوں کو آپ عام انسانوں کی طرح بس ایک معمولی انسان نظر آتے تھے۔ مگر یہود کا اور مشرکین عرب کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ یہود کو ایک ایسے دین کا حامل ہونے کا فخر حاصل تھا جس کی حیثیت معروف و مسلّم تھی۔ ان کے دین کے ساتھ موسیٰ اور داؤد اور سلیمان علیہم السلام جیسے کتنے سابق پیغمبروں کے نام شامل تھے جو لمبی تاریخ کے نتیجہ میں لوگوں کے ذہنوں پر اپنی عظمت قائم کر چکے تھے۔ یہی حال عرب کے مشرکین کا تھا۔

وہ اپنے سلسلہ کو ابراہیمؑ و اسماعیلؑ جیسے قدیم پیغمبروں سے جوڑے ہوئے تھے۔ وہ اپنے کو کعبہ کا وارث اور ملت ابراہیمی کا حامل سمجھتے تھے، اور یہ وہ چیزیں تھیں جن کی تاریخی اہمیت سیکڑوں برس کی روایات کے نتیجہ میں تسلیم شدہ بن چکی تھی۔ بالفاظ دیگر، پیغمبر اسلام اپنی تاریخ کے آغاز پر تھے اور یہود اور قبائل عرب اپنی تاریخ کے اختتام پر۔

ایسی حالت میں چودہ سو سال پہلے والے پیغمبر اسلام کو ماننا اور آپ کا ساتھ دینا ان لوگوں کے لئے کوئی سادہ واقعہ نہ تھا۔ یہ قائم شدہ دین سے نکل کر ایک ایسے دین کو اختیار کرنا تھا جو ابھی قائم نہیں ہوا تھا۔ یہ مفادات سے وابستہ سچائی کو چھوڑ کر مجرد سچائی کو اختیار کرنا تھا۔ یہ مادی عظمتوں سے اوپر اٹھ کر غیر مادی عظمتوں کا ادراک کرنا تھا۔ یہ حال کے پردہ میں مستقبل کا مشاہدہ کرنا تھا۔ یہ محسوس خداؤں سے گزر کر چھپے ہوئے خدا کو پالینا تھا۔

اس قسم کا واقعہ کسی انسان کی زندگی میں اس طرح پیش نہیں آتا جیسے وہ ایک کمرہ سے نکل کر دوسرے کمرہ میں چلا گیا ہو۔ اس قسم کا واقعہ آدمی کی زندگی میں ہمیشہ بھونچال بن کر داخل ہوتا ہے۔ یہ ایک شعوری انقلاب ہوتا ہے جب کہ آدمی سوچے سمجھے ارادہ کے تحت ایک چیز کو چھوڑتا ہے اور سوچے سمجھے ارادہ کے تحت دوسری چیز کو لے لیتا ہے۔ اس میں آدمی کی قوت فیصلہ متحرک ہوتی ہے۔ اس کے جذبات میں عظیم ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ اس کو قربانیوں کے پل کو پار کر کے ایک طرف سے دوسری طرف جانا پڑتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کی پوری زندگی اس طرح ہل جاتی ہے جیسے کوئی طوفان کسی درخت کو ہلا دے۔ جب کچھ لوگ اس طرح انقلابی انداز میں ایک نظریہ کو اختیار کریں تو اس کے بعد عین قانون قدرت کے تحت ایسا ہوتا ہے کہ زمین پر بالکل نئے قسم کے انسان وجود میں آتے ہیں۔ اور ان کے ملنے سے وہ سماج بنتا ہے جس سے ایسے حیرت ناک نتائج برآمد ہوں جو اس سے پہلے آسمان نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ جب عرب میں اسلام کی آواز بلند کی تو اس وقت دوسرے ادیان کا حال یہ تھا کہ وہ پہلے سے چلے آرہے تھے اور اس بنا پر وہ جمے ہوئے مفادات کی بنیاد پر قائم ہو چکے تھے۔ اسلام ابھی ایک مجرد نظریہ تھا، جب کہ دوسرے ادیان نے منظم ادارہ (Institution) کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ایسی حالت میں اسلام کو اپنا دین بنانا ماحول کے اندر بے قیمت ہو جانے کے ہم معنی تھا۔ دوسرے ادیان سے وابستہ ہو کر آدمی کے تمام مفادات محفوظ رہتے تھے۔ وہ سماج کا معزز رکن شمار ہوتا تھا۔ مگر اسلام کو اختیار کرتے ہی وہ ایک ایسے دین کا فرد بن جاتا تھا جس نے سماج کے اندر اپنی حیثیت مسلّم نہیں کی تھی۔ جس کے ساتھ ابھی تک مفادات وابستہ نہیں ہوئے تھے۔ وہ پُر فخر روایات والے

گروہ سے چھوٹ کر ایک ایسے گروہ کا جزء بن جاتا تھا جس کے ساتھ ابھی پُر فخر روایات وابستہ نہ ہوئی ہوں۔ ایسی حالت میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ان کے لئے اسلام محض ایک کلمہ کا تلفظ نہ تھا بلکہ ایک انقلابی فیصلہ کے ہم معنی تھا۔ اسلام کی آواز نے ان کے خیالات کی دنیا میں ایک زبردست ہلچل پیدا کی۔ ان کی تمام فکری قوتیں جاگ اٹھیں۔ ان کے اندر شدت سے یہ ذہن ابھرا کہ اپنے آپ پر نظر ثانی کریں۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ انھوں نے بے پناہ ارادہ کے تحت ایک چیز کو چھوڑا اور بے پناہ ارادہ کے تحت دوسری چیز کو اختیار کر لیا۔

ایسا کرتے ہوئے انھوں نے تعصبات کے پردہ کو چاک کیا۔ مفادات اور مصلحتوں کو نظر انداز کیا۔ یہ خطرہ مول لیا کہ اپنے خاندان، اپنے قبیلہ اور اپنے سماج سے کٹ کر وہ دنیا میں اکیلے رہ جائیں۔ انھوں نے ایک شعوری فیصلہ کے تحت اپنے آپ کو تقلیدی زمین سے کھینچ کر ہٹایا اور شعوری فیصلہ کے تحت ایک زندہ عقیدہ کی زمین پر اپنے کو کھڑا کیا ——— دور اول کے مسلمانوں کے لئے ایمان ایک فکری انقلاب کے ہم معنی تھا اس لئے اس ایمان سے جو لوگ پیدا ہوئے وہ بھی انقلابی انسان تھے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لئے ایمان ایک بے روح عقیدہ ہے اس لئے اس ایمان سے جو افراد تیار ہوتے ہیں وہ بھی بے روح انسان ہیں، ان میں نہ فکر کے اعتبار سے کوئی جان ہوتی ہے اور نہ کردار کے اعتبار سے۔

کتاب روپی دین اور سماج روپی دین

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ اسلام اجنبی حالت میں شروع ہوا اور پھر وہ پہلے کی طرح اجنبی ہو جائے گا۔ پس مبارکی ہے اجنبیوں کے لئے (بدأ الاسلام غريبا وسيعود كما بدأ فطوبى للغرباء) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دور اول میں جس طرح اجنبی بننے کی قیمت پر لوگوں کو اسلام ملا تھا اسی طرح بعد کے دور میں بھی جس کو اسلام ملے گا اجنبی بننے کی قیمت پر ملے گا۔

غور سے دیکھئے تو آج تاریخ دوبارہ وہیں لوٹ آئی ہے جہاں سے وہ شروع ہوئی تھی۔ آج ایک دین وہ ہے جو قرآن میں محفوظ ہے، دوسرا دین وہ ہے جو مسلمانوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ پہلے دین کو کتاب روپی دین کہہ سکتے ہیں اور دوسرے دین کو سماج روپی دین۔ کتاب روپی دین وہ ہے جو قرآن و سنت میں محفوظ ہے۔ یہ دین گویا آج پیغمبر کا نمائندہ ہے۔ مگر یہ دین آج ماحول کے اندر اسی طرح اجنبی بن گیا ہے جس طرح وہ چودہ سو سال پہلے اجنبی تھا۔ دوسری طرف سماج روپی دین اسی طرح مکمل طور پر ایک منظم ادارہ بنا ہوا ہے جس طرح قدیم زمانہ میں یہودیت تھی۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام بڑی بڑی تحریکیں اسی دوسرے اسلام کی زمین پر چل رہی ہیں۔ بظاہر کوئی کلّی اسلام کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہے اور کوئی جزئی اسلام کا۔ مگر یہ تمام تحریکیں حقیقۃً سماج روپی دین کی سطح پر ابھری ہیں نہ کہ کتاب روپی دین کی سطح پر۔

صورت حال یہ ہے کہ آج اسلام میں اسی طرح گدیاں بن چکی ہیں جس طرح وہ پہلے یہودیت میں پائی جاتی تھیں۔ اسلام اب ایک ایسا نام بن گیا ہے جس کے اوپر چندے اور عہدے ملیں۔ جس کے نعرے پر عوام کی بھیڑ جمع کی جاسکے۔ جس کی بنیاد پر شخصیتیں بنیں اور قیادتیں ابھریں۔ اسلام آج ایک ایسا عنوان ہے جس کے سہارے ادارے قائم ہوں اور خطابات حاصل ہوں۔ اسلام آج ہر اعتبار سے ایک عظیم ترین مارکٹ ہے جس سے وہ تمام مادی فائدے حاصل کئے جاسکتے ہیں جو دنیا کے عام بازاروں سے کسی کو حاصل ہوتے ہیں۔

دوسری طرف کتاب روپی دین عملاً بے جگہ ہو چکا ہے۔ وہ محض ایک ذہنی تخیل کے طور پر فضا میں باقی ہے۔ کوئی شخص اگر اس کتاب والے دین کو اپنائے تو فوراً وہ محسوس کرے گا کہ وہ اپنے ماحول کے درمیان اجنبی ہو گیا ہے۔ ایسے آدمی کو اپنے اسلام کی یہ قیمت دینی پڑے گی کہ وہ لوگوں کو نئے دین کا حامل معلوم ہو۔ وہ بڑی بڑی دینی مجالس میں شرکت کے لئے نااہل قرار پائے۔ اونچی گدیوں میں سے کوئی گدی اس کو نہ ملے۔ قرآن سے گہرا تعلق رکھنے کے باوجود اس کو قرآنی جشن کی صدارت کے لئے نہیں بلایا جائے گا۔ حدیث کا عالم ہونے کے باوجود وہ کسی دینی مدرسہ کا شیخ الحدیث نہ بن سکے گا۔ مخلص اور متقی ہونے کے باوجود اس کا شمار بزرگوں میں نہیں ہوگا۔ دین کا گہرا فہم رکھنے کے باوجود دینی مسائل میں اس سے رجوع نہیں کیا جائے گا۔ خدا اور رسول کی خاطر اپنی زندگی وقف کر دینے کے باوجود اس کو کسی دینی خطاب کا اہل نہیں سمجھا جائے گا۔ اور ان سب کی وجہ یہ ہوگی کہ ایسا آدمی جس دین پر قائم ہے وہ کتاب وسنت والا دین ہے اور منظم مذہب (Institutionalized Religion) کو ماننے والوں کے درمیان خالص کتاب و سنت والا دین اجنبی بن چکا ہے۔ لوگ دین کے نام سے جس چیز سے واقف ہیں وہ کچھ خارجی نقشے ہیں نہ کہ گہری ربانی حقیقتیں۔ وہ واقعات انسانی سے اپنا دین لے رہے ہیں نہ کہ واقعات خداوندی سے۔

شاہ ضرب

کیرم ایک گھریلو کھیل ہے۔ یہ کھیل ایک تختہ (بورڈ) پر کھیلا جاتا ہے۔ ایک بڑے چوکور تختہ کے بیچ میں روپیہ جیسی ۱۹ گوٹیں مرتب مجموعہ کی صورت میں سمیٹ دی جاتی ہیں۔ اس کے بعد کھیل کا آغاز کرنے والا ایک خاص گوٹ (اسٹرائکر) لے کر تختہ کے ایک کونہ سے گوٹوں کے درمیانی مجموعہ پر نشانہ لگا کر پوری قوت سے مارتا ہے۔ اس کی مار اگرچہ مجموعہ کے صرف ایک نقطہ پر پڑتی ہے۔ لیکن مار اگر کامیاب ہے تو وہ گوٹوں کے پورے مجموعہ کو متاثر کر دیتی ہے۔ اب ایک ایک گوٹ اپنی جگہ سے ہٹ کر کھلاڑی کی زد میں آجاتی ہے۔ ایسی کامیاب مار کو کیرم بورڈ کی اصطلاح میں شاہ ضرب (Master Stroke) کہتے ہیں۔

خدا کے دین کو از سر نو زندہ کرنے کے لئے بھی اسی قسم کے ایک شاہ ضرب کی ضرورت ہے۔ یہ شاہ

ضرب وہ ہے جو تنظیمی مذہب یا سماج روپی دین پر جمے ہوئے لوگوں کو اپنی جگہ سے ہلا دے اور ان کو ذہنی اعتبار سے اس مقام پر لائے جہاں وہ کتاب و سنت والے دین کے مخاطب بن سکیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہی واقعہ پیش آیا تھا۔ اب اسی واقعہ کو دوبارہ ظہور میں لانے کی کوشش کا نام تجدید دین ہے۔ آج تجدید دین کا مطلب اسی کار نبوت کو دہرانا ہے۔ نبی نے اپنے زمانہ میں سابقہ ادیان کی بنیاد پر قائم شدہ ڈھانچہ کے مقابلہ میں خدا کے دین کو زندہ کیا تھا۔ آج خود اسلام کی بنیاد پر قائم شدہ ڈھانچہ کے مقابلہ میں خدا کے خالص دین کو از سر نو زندہ کرنا ہے۔

اس عمل کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ لوگوں کا دینی جمود ٹوٹے۔ شخصیتوں اور اداروں میں اٹکے ہوئے لوگ براہ راست خدا کو اپنا مرکز توجہ بنائیں۔ جزئی مسائل کو دین سمجھنے والے اساسی امور کو دین سمجھیں اور طلسماتی فضائل پر بھروسہ کرنے والے لوگ حقائق کی بنیاد پر اپنے دین کی تعمیر کریں۔ جن لوگوں نے بے روح عملیات کو دین کے ہم معنی سمجھ لیا ہے وہ زندہ دین کی لذتوں سے آشنا ہوں۔ جن کے یہاں دین ابھی تک چھنگلیا کی مانند ایک ضمیمہ بنا ہوا ہے وہ ان کی زندگیوں میں اس طرح داخل ہو کہ وہ ان کے کردار کے لئے قوت محرکہ بن جائے۔ جو لوگ کچھ مصنوعی اعمال کو دین داری سمجھے ہوئے ہیں وہ حقیقی دین داری کی فضا میں داخل ہوں۔

پھر اسی میں دور جدید کی اس سب سے بڑی خرابی کا حل بھی ہے جس نے اسلام کو تمام دنیا میں مسلمانوں کی قومی تحریکوں کا ضمیمہ بنا دیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ یہ المیہ پیش آیا کہ وہ ساری دنیا میں غیر مسلم اقوام کی زد میں آ گئے۔ اس کے بعد قدرتی طور پر یہ ہوا کہ مسلمانوں کو دوسری قومیں ظالموں اور غاصبوں کے روپ میں دکھائی دینے لگیں۔ ان کے اندر ہر جگہ مقابلہ آرائی کا ذہن ابھر آیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اب وہی باتیں اپیل کرتی ہیں جن میں دفاعی نفسیات کو تسکین ملتی ہو۔ مثلاً اسلام کی عسکری تعبیر، انبیاء کے مشن کو حکومت و سیاست کی اصطلاحوں میں بیان کرنا، دوسری قوموں کو ظالم قرار دے کر ان کے خلاف ہنگامہ آرائی، مصالحت (Adjustment) کے بجائے ٹکراؤ اور لڑائی کی باتیں، وغیرہ۔ یہ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اب اگر خاموش تعمیر اور دعوت آخرت کی بات کی جائے تو اس کو لوگ اس نظر سے دیکھتے ہیں جیسے یہ کوئی سازش ہے جو ان کو اپنے دشمنوں کے محاذ سے ہٹا کر غیر متعلق چیزوں میں مصروف کرنے کے لئے کی گئی ہے۔ دین کو اگر قومی نقشوں میں بننے والے ڈھانچہ سے الگ کر کے ابدی حقیقتوں کی بنیاد پر کھڑا کر دیا جائے تو اس قسم کے تمام خیالات اپنے آپ بے زمین ہو جائیں گے۔ اسلام کی قومی تشریحات کسی آدمی کو اسی وقت تک اپیل کرتی ہیں جب کہ اس کا فکر قومی حالات کے نقشہ میں اٹکا ہوا ہو۔ اگر وہ قومی حالات سے اوپر اٹھ کر خدا کی ابدی کائنات میں جینے لگے تو اس قسم کی تشریحات و تعبیرات خود بخود اس کے لئے

بے کشش ہو کر رہ جائیں گی۔

یہ ذہنی بیداری یا فکری انقلاب ہی آج ملت اسلامی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ کسی حقیقی کام کا واحد آغاز یہ ہے کہ ملت کے افراد جو سماج روپی اسلام کی زمین پر ٹھہرے ہوئے ہیں، ان کو اس سے ہٹا کر دوبارہ کتاب روپی اسلام کی زمین پر کھڑا کیا جائے۔ اس کام کے قابل لحاظ حد تک انجام پانے کے بعد ہی ان کے اندر ربانی شعور اور الٰہی کردار پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ ابتدائی مقصود جب تک حاصل نہ ہو، کوئی بڑا اقدام کرنا یا تو غیر سنجیدہ انسان کا کام ہو سکتا ہے یا اس شخص کا جس کی عقل جاتی رہی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسری وہ تمام چیزیں جن کو ہم چاہتے ہیں وہ سب اسی فکری انقلاب کا ضمنی حاصل (By-product) ہیں۔ وہ سارے اہم ترین نتائج جن کے ہم منتظر ہیں وہ اسی ذہنی انقلاب کے بطن سے ظہور میں آتے ہیں۔ یہ فکری انقلاب توہمات کی زنجیروں کو توڑتا ہے جس سے علمی ترقیاں وجود میں آتی ہیں۔ یہ فکری انقلاب افراد کے اندر حوصلہ مندی پیدا کرتا ہے جس کے بعد وہ مختلف میدانوں میں بڑے بڑے کارنامے انجام دینے لگتے ہیں۔ یہ فکری انقلاب لوگوں کے اندر آفاقیت پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں وہ غیر مفتوح کردار کے مالک بن جاتے ہیں۔ یہ فکری انقلاب اپنے متاثر افراد کے اندر ربانی شعور ابھارتا ہے جس کے بعد وہ ایسی بے پناہ منصوبہ بندی کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں جس کا توڑ کسی کے لئے ممکن نہ ہو۔ ذہنی انقلاب قوموں اور آبادیوں کو مسخر کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کے ماننے والوں کا دبدبہ زمین پر قائم ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ ذہنی انقلاب جہاں برپا ہوتا ہے وہاں بالکل قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے قدموں کے نیچے سے بھی رزق ابلتا ہے اور ان کے سروں کے اوپر بھی رزق برستا ہے۔ خدا اپنی دنیا بھی ان کے لئے لکھ دیتا ہے اور اپنی آخرت بھی۔

شریعتوں میں فرق کی حکمت

مذہبی جمود کو توڑنا اللہ تعالیٰ کو اتنا زیادہ مطلوب ہے کہ اس کے لئے اس نے ایک پیغمبر اور دوسرے پیغمبر کی شریعت میں فرق رکھا۔ مختلف پیغمبروں کا دین اگرچہ ایک تھا مگر ان کی شریعتوں میں باہم فرق رکھا گیا۔ اس فرق کی خاص حکمت یہی تھی۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک طریق عمل مقرر کیا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا۔ مگر اس نے ایسا اس لئے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ پس تم بھلائیوں کی طرف سبقت کرو (المائدہ ۴۸) ہر امت کے لئے ہم نے ایک طریق عبادت مقرر کیا ہے جس کے وہ پیرو ہیں۔ پس وہ اس امر میں تم سے جھگڑا نہ کریں اور تم اپنے رب کی طرف

دعوت دو، یقیناً تم سیدھے راستہ پر ہو (الحج ۶۸) یہی بات تحویل قبلہ کے ذیل میں اس طرح فرمائی گئی ہے:
اور ہر ایک کے لئے ایک رخ ہے جس کی طرف وہ مڑتا ہے۔ پس تم بھلائیوں کی طرف سبقت کرو (البقرہ ۱۴۸)
اس سلسلہ میں مزید ارشاد ہوا ہے کہ جس قبلہ پر تم اب تک تھے اس کو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لئے مقرر کیا تھا تاکہ ہم جان لیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹا پھر جاتا ہے (البقرہ ۱۴۳)

شریعتوں میں فرق کی توجیہہ عام طور پر ارتقار کی اصطلاحوں میں کی جاتی ہے۔ یعنی خدا کی شریعت سادہ اور غیر کامل صورت سے ترقی کر کے کامل صورت تک پہنچی ہے اور شریعتوں کا باہمی فرق اسی سبب سے ہے۔ مگر یہ توجیہہ سراسر بے بنیاد ہے۔ قرآن میں واضح طور پر تبدیلیٔ شریعت کا سبب ابتلار بتایا گیا ہے نہ کہ ارتقار۔

شریعت اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے دینی عقائد کا زندہ اظہار ہے۔ مگر ایک طریقہ پر نسل در نسل عمل کرتے کرتے ایسا ہوتا ہے کہ شریعت سے اس کی روح نکل جاتی ہے۔ وہ ایک ایسا خشک ڈھانچہ بن جاتی ہے جس سے آدمی کا نفسیاتی رشتہ ٹوٹ چکا ہو۔ اس وقت خدا شریعت کے قدیم ڈھانچہ کو بدل دیتا ہے تاکہ تقلیدی عمل کا خاتمہ ہو اور لوگ زندہ احساس اور تازہ فیصلہ کے تحت نئی شریعت کو اپنی زندگیوں میں اختیار کریں۔ اس وقت کھل جاتا ہے کہ کون شعور کے تحت خدا کی عبادت کر رہا تھا اور کون جمود اور تقلید کے تحت۔ بیت المقدس کے بجائے کعبہ کو قبلہ قرار دینا تبدیلیٔ شریعت کی ایک مثال ہے۔ اور اس کی وجہ قرآن میں یہ بتائی گئی ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کون رسول کا متبع ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔ یعنی اس بات کا امتحان کہ کون حقیقت کا پیرو ہے اور کون تقلیدی روایات کا۔ تقلیدی روایات کا پیرو اپنی مانوس عصبیتوں سے چمٹا رہے گا اور جو حقیقت کا پیرو ہے وہ تقلیدی عمل کو چھوڑ دے گا اور فوراً اصلی حکم پر قائم ہو جائے گا۔

اسلامی دعوت

جب بارش کا موسم آتا ہے اور ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ کالے بادل فضا میں منڈلانا شروع کرتے ہیں تو خدا کا فرشتہ خاموش زبان میں یہ اعلان کرتا ہے کہ کون ہے جو اپنا بیج زمین میں ڈالے تاکہ خدا سارے کائناتی نظام کو اس کی موافقت میں جمع کر دے اور اس کے بعد اس کے بیج کو سات سو گنا زیادہ فصل کی صورت میں اس کی طرف لوٹائے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ آج دین کا بھی ہے۔ خدا نے آج سارے اسباب دین کی موافقت پر جمع کر دئے ہیں۔ سیکڑوں برس کی گردش کے بعد زمانہ نے فیصلہ کی جو بنیاد فراہم کی ہے وہ عین ہمارے حق میں ہے۔ اب ان امکانات کو بروئے کار لانے کے لئے ضرورت ہے کہ کچھ خدا کے بندے اٹھیں جو صرف خدا کے لئے اپنے آپ کو اس مشن میں دے دیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو اس مشن کے حوالے کریں گے ان کے لئے خدا کا وعدہ ہے کہ وہ ان کے عمل کا سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ انعام آخرت میں لوٹائے گا اور اسی کے ساتھ اگر اس نے چاہا تو موجودہ دنیا میں بھی۔

اسلامی تاریخ دو بڑے مرحلوں سے گزر چکی ہے اور اب اس کے تیسرے مرحلہ کا آغاز ہونا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون لوگ ہیں جن کو اس تیسرے مرحلہ کو شروع کرنے کی سعادت حاصل ہوگی۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ آج اس سے بڑا کوئی کام نہیں۔ آج اس سے بڑا کوئی میدان عمل نہیں جس میں قوت والے اپنی قوت لگائیں اور اس سے بڑی کوئی مد نہیں جس میں پیسہ والے اپنا پیسہ خرچ کریں۔

اسلام کیا ہے

اسلام ایک لفظ میں توحید کا نام ہے۔ جس طرح درخت اصلاً ایک بیج کا نام ہوتا ہے اسی طرح اسلام کی اصل حقیقت توحید ہے اور بقیہ تمام چیزیں اسی توحید کے مظاہر اور تقاضے۔ توحید بظاہر یہ ہے کہ خدا کئی نہیں ہیں بلکہ خدا ایک ہے۔ مگر یہ توحید کوئی خشک گنتی کا عقیدہ نہیں ہے جو کچھ مقرر الفاظ دہرا کر آدمی کو حاصل ہو جائے۔ یہ اپنی ذات کی نفی کی قیمت پر خدا کا اثبات ہے، یہ خدا کے مقابلہ میں اپنے آپ کو دریافت کرنا ہے۔ خدا قادر مطلق ہے اور بندہ عاجز مطلق۔ کوئی بندہ جب خدا کے ساتھ اپنی اس نسبت کو پالیتا ہے تو اسی کا نام توحید ہے۔ توحید یا ایک اللہ پر ایمان ایک شعوری فیصلہ ہے۔ یہ حق کا انکار کرنے کی قدرت رکھتے ہوئے حق کو مان لینا ہے۔ اس اعتبار سے ایمان حقیقت واقعہ کے اعتراف کا دوسرا نام ہے۔ اور حقیقت واقعہ کا شعوری اعتراف بلاشبہ اس دنیا کی سب سے بڑی نیکی ہے۔

یہی توحید دنیا کی تمام چیزوں کا دین ہے۔ زمین اور سورج انتہائی کامل صورت میں خدا کی تابعداری

کر رہے ہیں۔ شہد کی مکھی کمال درجہ پابندی کے ساتھ خدا کی مقرر کی ہوئی راہوں پر چل رہی ہے۔ مگر ان میں سے کسی کی محکومی شعوری محکومی نہیں۔ وہ خود اپنی بناوٹ کے اعتبار سے ویسے ہی ہیں جیسا کہ انھیں ہونا چاہئے۔ ساری کائنات میں یہ صرف انسان ہے جو ارادہ اور شعور کے ساتھ اپنے کو محکوم بناتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز کامل طور پر خدا کی فرماں برداری کر رہی ہے۔ مگر انسان کی فرماں برداری اختیاری ہے اور دوسری چیزوں کی فرمانبرداری بے اختیاری۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں خدا کو سجدہ کر رہی ہیں۔ مگر ایک انسان جب سجدہ کرتے ہوئے زمین پر اپنا سر رکھتا ہے تو یہ تمام عالم کائنات کا سب سے زیادہ عجیب واقعہ ہوتا ہے۔ کیونکہ دوسری چیزیں مجبورانہ سجدہ کر رہی ہیں مگر انسان شعور اور ارادہ کے تحت اپنا سر خدا کے آگے جھکا دیتا ہے۔

انسان کے ذریعہ اس کائنات میں شعوری اور اختیاری محکومی کا واقعہ وجود میں آتا ہے جس سے بڑا کوئی دوسرا واقعہ نہیں۔ یہی انسان کی اصل قیمت ہے۔ انسان وہ نادر مخلوق ہے جو اس کائنات میں شعور قدرت کے مقابلہ میں شعور عجز کی دوسری انتہا بناتا ہے۔ وہ کائنات کے صفحہ پر "عدد" کے مقابلہ میں "صفر" کا ہندسہ تحریر کرتا ہے۔ وہ خداوندی انا کے مقابلہ میں اپنے بے انا ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ ایک شخص کا موحد بننا اس آسمان کے نیچے ظاہر ہونے والے تمام واقعات میں سب سے بڑا واقعہ ہے جس کا انعام کوئی سب سے بڑی چیز ہی ہو سکتی ہے۔ اسی سب سے بڑی چیز کا نام جنت ہے۔ جنت کسی کے عمل کی قیمت نہیں۔ جنت کسی بندے کے لئے خدا کی یہ بخشش ہے کہ اس کے بندے نے اپنے رب کو وہ چیز پیش کر دی جو کائنات میں کسی نے پیش نہ کی تھی۔ اس لئے خدا نے بھی اس کو وہ چیز دے دی جو اس نے کسی دوسری مخلوق کو نہیں دیا تھا۔

جنت کیا ہے

جنت ایک انتہائی حیرت انگیز دنیا ہے جو خدا نے اپنے خاص بندوں کے لئے بنائی ہے۔ وہاں خدا کی صفاتِ کمال اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ جنت کے بارے میں قرآن میں ہے کہ وہاں نہ حزن ہوگا اور نہ خوف۔ یہ ناقابل قیاس حد تک انوکھی صفت ہے۔ کیوں کہ دنیا میں ہم جانتے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا دولت مند یا حکمراں اس پر قادر نہیں کہ وہ غموں اور اندیشوں سے خالی زندگی اپنے لئے حاصل کرے۔ جنت کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ وہاں ہر طرف "سلام سلام" کا چرچا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت ایسے بلند انسانوں کی آبادی ہے جو ہر قسم کے منفی جذبات سے خالی ہوں گے۔ ان کے دلوں میں دوسروں کے لئے سلامتی اور خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ جنت کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ وہاں آدمی جو غذا کھائے گا اور جو مشروبات پئے گا وہ بول و براز کی شکل میں نہیں خارج ہوگا بلکہ ایک خوشبودار ہوا نکلے گی اور اس کے ذریعہ تمام کثافت خارج ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت ایسا لطیف مقام ہے جہاں غلاظت بھی بہ شکل خوشبو خارج

ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جنت میں نیند نہیں ہوگی جب کہ وہاں آدمی کی ہر خواہش پوری کی جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت اتنی لذیذ جگہ ہے کہ آدمی ایک رات کی نیند کے بقدر بھی اس سے جدا ہونا پسند نہ کرے گا حالاں کہ وہ اس کے اندر کھرب ہا کھرب سال سے بھی زیادہ مدت تک رہے گا۔ کیسا عجیب ہوگا جنت کا پڑوس اور کیسی عجیب ہوگی جنت کی زندگی۔ پھر ان سب سے بڑھ کر یہ کہ جنت وہ مقام ہے جہاں آدمی اپنے خدا کو دیکھ سکے گا۔ وہ خدا جو ہر قسم کی ناقابل قیاس خوبیوں کا مالک ہے۔ وہ خدا جس نے عدم سے وجود کو پیدا کیا۔ وہ خدا جو آسمان کی عظمتوں کا خالق ہے۔ وہ خدا جس نے سورج کو چمکایا۔ وہ خدا جو درختوں کی سرسبزی اور پھولوں کی مہک میں ظاہر ہوا۔ ایسا خدا کیسا عظیم اور کیسا حسین ہوگا اس کا تصوراتی قیاس بھی کسی کے لئے ممکن نہیں۔ جس جنت میں ایسا نفیس ماحول ہو، جہاں کائنات کے رب کا دیدار حاصل ہوتا ہو اس کی لذتوں اور راحتوں کو کون بیان کر سکتا ہے

مومنانہ زندگی

ایسی قیمتی جنت کسی کو سستے داموں نہیں مل سکتی۔ یہ تو اسی خوش نصیب روح کا حصہ ہے جو حقیقی معنوں میں خدا کا مومن بندہ ہونے کا ثبوت دے۔ مومن ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی عام دنیادارانہ زندگی کے ساتھ کچھ اسلامی عملیات کا جوڑ لگائے۔ مومن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام ہی آدمی کی پوری زندگی بن جائے۔ اسلام ہاتھ کی چھنگلیا نہیں بلکہ وہ آدمی کا پورا ہاتھ ہے۔ جو شخص اسلام کو اپنی زندگی میں غیر موثر ضمیمہ بنا کر رکھے اس نے اسلام کی توہین کی۔ اسی طرح مومن ہونے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ آدمی "خدائی فوجدار" بن کر کھڑا ہو جائے اور حکمرانوں کے خلاف اپوزیشن کا پارٹ ادا کرنے کو اسلام کا کمال سمجھنے لگے۔ اس قسم کی چیزیں اسلام نہیں، وہ خود ساختہ سیاست کو اسلام کا نام دینا ہے۔ پہلی قسم کے لوگ اگر دین کی کم قدری کے مجرم ہیں تو دوسری قسم کے لوگ دین کی تحریف کے۔ اور یہ دونوں ہی چیزیں آدمی کو خدا کی ناراضگی کا مستحق بناتی ہیں نہ کہ خدا کے انعام کا۔

مومن وہ ہے جس کے سینہ میں اسلام ایک نفسیاتی طوفان بن کر داخل ہوا ہو۔ جو خدا کو اتنا قریب پائے کہ اس سے اس کی سرگوشیاں جاری ہو جائیں۔ جس کی تنہائیاں خدا کے فرشتوں سے آباد رہتی ہوں۔ جس کے اسلام نے اس کی زبان میں خدا کی لگام دے رکھی ہو۔ اور جس کے ہاتھوں اور پیروں میں خدا کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہوں۔ جس کے اسلام نے اس کو حشر کی آمد سے پہلے حشر کے میدان میں کھڑا کر دیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کافر پر مرنے کے بعد گزرنے والا ہے وہ مومن پر جیتے جی اسی دنیا میں گزر جاتا ہے۔ دوسرے لوگ جن باتوں کو اس وقت پائیں گے جب کہ خدا غیب کا پردہ پھاڑ کر سامنے آجائے گا، مومن ان باتوں کو اس وقت پا لیتا ہے جب کہ خدا ابھی غیب کے پردہ

میں چھپا ہوا ہے۔ مومن پر قیامت سے پہلے قیامت گزر جاتی ہے جب کہ دوسروں پر قیامت اس وقت گزرے گی جب کہ وہ عملاً آچکی ہوگی۔

اسلامی دعوت

آگ کا انگارہ جب خارج کو اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے تو اسی کو ہم آنچ کہتے ہیں۔ برف کا تودہ جب اپنے ماحول کو اپنی حقیقت سے متعارف کرتا ہے تو اسی کو ٹھنڈک کہا جاتا ہے۔ یہی معاملہ مومن کا بھی ہے۔ زمین پر کسی مومن کا وجود میں آنا خود ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ اسلامی دعوت ضرور وجود میں آئے گی۔ کسی نفس انسانی میں جب وہ خدائی بھونچال آتا ہے جس کو اسلام کہا گیا ہے تو اس کے بعد لازمی نتیجہ کے طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے باہر کی دنیا اس سے باخبر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہی اسلامی دعوت کا آغاز ہے۔

اسلامی دعوت فرد انسانی میں انقلاب لانے کی دعوت ہے نہ کہ کسی قسم کے قومی یا بین اقوامی ڈھانچہ میں الٹ پھیر کرنے کی۔ اسلامی انقلاب اصلاً ایک نفسیاتی انقلاب ہے اور نفسیاتی انقلاب کسی نفس ہی کے اندر وقوع میں آسکتا ہے۔ نفس کا وجود صرف ایک فرد میں ہوتا ہے اس لئے اسلام کی گھٹنا بھی ایک فرد ہی میں گھٹتی ہے۔ قومی یا بین اقوامی ڈھانچہ کا اپنا کوئی نفسیاتی وجود نہیں۔ اس لئے قومی یا بین اقوامی ڈھانچہ کو اسلامی دعوت کا نشانہ بنانا ایسا ہی ہے جیسے خالی فضا میں تیر مارنا۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کسی گروہ کے قومی حالات یا کسی جغرافیہ کے تمدنی احوال لوگوں میں ہلچل پیدا کرتے ہیں اور اس کے بعد ان کے درمیان ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر مسلمانوں کے اندر ان کے قومی یا سیاسی حالات کے نتیجہ میں کوئی حرکت اٹھ کھڑی ہو تو اس کا نام اسلامی تحریک نہیں ہو جائے گا۔ اگر مسلمان اپنے قومی دشمن سے تصادم کو جہاد کہیں یا اپنی قومی تعمیر کو اسلامی نظام کی اصطلاحوں میں بیان کریں تو یہ اسلام نہیں بلکہ غیر اسلام کو اسلام کا نام دینا ہے جو آدمی کو صرف سزا کا مستحق بناتا ہے نہ یہ کہ اس کی بنا پر آدمی کو کوئی اسلامی انعام دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں اس قسم کی اسلامی تحریکیں عظیم الشان پیمانہ پر اٹھیں مگر عملاً وہ اس طرح بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں جیسے خدا کے نزدیک ان کی کوئی قیمت ہی نہ تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کے سب قومی ہنگامے ہیں اور کسی قوم کے قومی ہنگاموں کا نام اسلام نہیں

اسلامی دعوت کی تحریک ایک لفظ میں جنت کی طرف بلانے کی تحریک ہے۔ جنت خدا کی لطیف و نفیس دنیا ہے جہاں وہ لوگ بسائے جائیں گے جو اخلاق خداوندی کی سطح پر جئے ہوں، جنھوں نے دنیوی تعلقات میں کمال انسانیت کا ثبوت دیا ہو، جو خدا کی ابدی دنیا کے اثر سے متحرک ہوئے ہوں نہ کہ سیاسی اور معاشی حالات کے اثر سے۔ آج کی دنیا میں اسی کا چناؤ ہو رہا ہے۔ جو لوگ اپنی نفسیات اور کردار کے اعتبار سے جنتی ماحول میں بسانے کے قابل

ٹھہریں گے ان کو چھانٹ کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد بقیہ تمام لوگ خدا کی رحمتوں سے محروم کر کے دور پھینک دئے جائیں گے تاکہ ابدی طور پر تاریکیوں کے غار میں بھٹکتے رہیں۔

انسان کے سوا بقیہ دنیا بے حد حسین ہے۔ ہرے بھرے درختوں اور نرم و نازک پھولوں کو دیکھئے ، زمین و آسمان کے قدرتی مناظر کا معائنہ کیجئے۔ ان کی بے پناہ کشش آپ کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لے گی کہ ان سے نظر ہٹانے کا جی نہ چاہے گا۔ مگر اس کے مقابلہ میں انسانی دنیا ظلم اور گندگی کا کوڑا خانہ بنی ہوئی ہے۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بقیہ دنیا کی سطح پر خدا کی مرضی براہ راست اپنی پوری شکل میں نافذ ہے، یہ دنیا ویسی ہی ہے جیسا کہ خدا چاہتا ہے کہ وہ ہو۔ اس کے برعکس انسان کو خدا نے آزادی دے دی ہے۔ اسی آزادی کے غلط استعمال نے انسانی دنیا کو جہنم کدہ بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام خوبیوں کا مالک صرف خدا ہے۔ خدا جہاں اپنے اختیار کو روک لے وہیں سے جہنم شروع ہو جاتی ہے اور خدا جب اپنے اختیار کو نافذ کر دے تو اسی کا نام جنت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ خدا نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا کہ انسان کو آزادی دے دی کہ وہ خدا کی حسین دنیا کو اپنی باغیانہ کارروائیوں سے عذاب خانہ بنا دے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بغیر وہ قیمتی انسان چنے نہیں جا سکتے تھے جو جنت میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔ خدا کی وسیع دنیا اپنی ان گنت چیزوں کے ساتھ مکمل طور پر خدا کی اطاعت گزار ہے۔ حقیر چیونٹی سے لے کر عظیم کہکشانی نظاموں تک کوئی چیز بھی نہیں جو خدا کی مرضی سے ادنیٰ انحراف کرتی ہو۔ تاہم یہ تمام چیزیں اس لئے محکوم ہیں کہ وہ بے اختیار ہیں۔ فرماں برداری کے سوا کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا ان کے لئے ممکن نہیں۔ اب خدا کو ایسی باشعور اور حقیقت پسند مخلوق درکار تھی جو اختیار رکھتے ہوئے بے اختیار ہو جائے۔ جو کسی جبر کے بغیر خود اپنے آزاد ارادہ سے اپنے کو خدا کا محکوم بنا لے۔ یہی وہ انتہائی نادر ہستیاں ہیں جن کو چھانٹنے کے لئے خدا کا یہ عظیم کارخانہ آباد کیا گیا ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے لے کر آج تک انسانی ذہن کو جو چیز سب سے زیادہ پریشان کرتی رہی ہے وہ انسان کی دنیا میں خرابی کا مسئلہ (Problem of Evil) ہے۔ ایک مفکر کے الفاظ میں ساری انسانی تاریخ ظلم اور برائی کا رجسٹر معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان اپنی آزادی کا انتہائی ظالمانہ استعمال کرتا ہے۔ مگر اتنی بڑی برائی کو خدا نے صرف اس لئے گوارا کیا کہ اس کے بغیر اس اعلیٰ نوع کا انتخاب نہیں کیا جا سکتا تھا جو جنت میں بسائے جانے کے قابل ہو۔ اختیار اور آزادی کے ماحول ہی میں وہ انسان چنے جا سکتے ہیں جن کے متعلق خدا کے نگراں فرشتے یہ گواہی دیں کہ یہ وہ افراد ہیں جنھوں نے مکمل اختیار رکھتے ہوئے اپنے کو خدا کی خاطر بے اختیار کر لیا تھا۔ دنیا کی بے پناہ برائیاں دراصل ایک بے پناہ بھلائی کی قیمت ہیں۔ یہ بھلائی کہ انسانوں کے جنگل

سے وہ سعید روحیں چھان کر نکالی جائیں جو پورے شعور اور مکمل ارادہ کے ساتھ اپنے کو خدا کا محکوم بنالیں۔ جو محض حقیقت پسندی کی بنا پر خدا کی محکومی اختیار کریں نہ کہ مجبوری کی بنا پر۔

یہ وہ انوکھی ہستیاں ہیں جن کو یہ موقع تھا کہ وہ حق کو جھٹلادیں مگر انھوں نے حق کو نہیں جھٹلایا۔ جن کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنی انا کا جھنڈا اونچا کریں۔ مگر وہ اپنے کو پچھلی سیٹ پر بٹھا کر خدا کو صدر نشین بنانے پر راضی ہو گئے۔ جن کو پوری طرح یہ آزادی ملی ہوئی تھی کہ وہ اپنی قیادت اور اپنے مفادات کا گنبد کھڑا کریں مگر انھوں نے ہر "اپنے" کو خود اپنے ہاتھوں سے ڈھادیا اور صرف حق کا گنبد کھڑا کر کے انھوں نے خوشی حاصل کی۔ اس قسم کی نادر روحیں اس کے بغیر چنی نہیں جا سکتی تھیں کہ ان کو مکمل آزادی کے ماحول میں رکھا جائے اور آزادی کا حقیقی ماحول قائم کرنے کی ہر قیمت برداشت کی جائے —— اسلامی دعوت کا مقصد ایسی ہی روحوں کو تلاش کرنا ہے

اسلامی انقلاب

دنیا میں سیاسی اور تمدنی انقلاب اسلامی دعوت کا براہ راست نشانہ نہیں۔ تاہم وہ اس کا بالواسطہ نتیجہ ہے۔ کسی معاشرہ میں جب قابل لحاظ تعداد ایسے افراد کی جمع ہو جائے جو اللہ کے لئے جینا اور اللہ کے لئے مرنا چاہتے ہوں تو قدرتی طور پر وقت کی سیاست اور تمدن پر انھیں کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اسلامی سیاست یا اسلامی نظام نام ہے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کا جو اللہ کے آگے اپنے کو بے نفس کر چکے ہوں۔ جنھوں نے اپنی "میں" کو خدا کے "عظیم تر" میں، میں گم کر دیا ہو۔ جن کے جذبات و احساسات آخرت سے اتنا زیادہ متعلق ہو جائیں کہ دنیا میں ان کا کوئی حوصلہ باقی نہ رہے جو دوسرے کے دل کے درد کو اپنے سینہ میں محسوس کرتے ہوں۔ ایسے ہی افراد اسلامی نظام قائم کرتے ہیں اور ایسے افراد اسی وقت بنتے ہیں جب کہ ہر قسم کے دنیوی مقصد سے بلند ہو کر خالص آخرت کے لئے تحریک چلائی جائے۔ اس کے برعکس اگر نعروں اور جلسوں کے زور پر کوئی انقلاب برپا کیا جائے تو وہ انقلاب نہیں ایک ہڑبونگ ہو گا جہاں اسلام کے نعرے تو بہت ہوں گے مگر اسلام کے عمل کا کہیں وجود نہ ہو گا۔ ایسے لوگ حق کے تقاضوں کا نام لیں گے مگر عملاً اپنے گروہ کے تقاضوں کے سوا کوئی چیز ان کے سامنے نہ ہوگی۔ وہ انقلاب اسلامی کے ہنگامے برپا کریں گے مگر حقیقۃً ان کا مدعا یہ ہو گا کہ دوسروں کو تخت سے ہٹا کر خود اس پر قابض ہو جائیں۔ وہ انسانیت اور اخلاق کے نام پر جلسوں اور تقریروں کی دھوم مچائیں گے مگر اس کا مقصود صرف یہ ہو گا کہ ایک خوبصورت عنوان پر اپنی قیادت کی شان قائم کریں۔ اسلامی انقلاب کی واحد لازمی شرط "بے میں" انسانوں کی فراہمی ہے اور موجودہ طرز کی تحریکوں سے سب سے کم جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ یہی ہے۔ بلکہ سیاسی اور قومی انداز کی یہ تحریکیں تو "میں" کی غذا ہیں نہ کہ "میں" کی نفسیات کو ختم کرنے والی —— خارجی انقلاب کو نشانہ بنانے والی تحریک افراد کے اندر کردار نہیں پیدا کر سکتی۔ کردار ہمیشہ ذاتی محرک سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ خارجی محرک سے۔

کوئی آدمی دوسرے کے لئے نہیں کماتا، اسی طرح کوئی آدمی بیرونی محرک کے لئے باکردار بھی نہیں بنتا۔ جو لوگ "نظام" کے نام پر افراد سے باکردار بننے کی اپیلیں کرتے ہیں وہ صرف اپنی سطحیت کا ثبوت دیتے ہیں اور دوسرے کے بارہ میں کمتر اندازہ کا۔

پیغمبر کا کام

اسلام کا مشن ایک ہی مشن ہے۔ اور وہ ہے توحید کا پیغام لوگوں تک پہنچانا۔ ایک ایک شخص کو موحد بنانے کی کوشش کرنا۔ یہی قدیم ترین زمانہ سے تمام نبیوں کا مشن تھا۔ مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تمام زمانوں میں توحید کی دعوت جان کی قربانی کی قیمت پر دینی ہوتی تھی۔ توحید کا پیغام لے کر اٹھنے والے آگ کے الاؤ میں ڈال دئے جاتے اور آروں سے چیر دئے جاتے۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قدیم زمانہ میں شرک کو فکری غلبہ کا مقام حاصل تھا۔ حتیٰ کہ سیاست کی بنیاد بھی شرک پر قائم تھی۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ لوگوں کو یہ باور کرا کے ان کے اوپر حکومت کرتے تھے کہ وہ دیوتاؤں کی اولاد ہیں۔ ان کے اندر خدا حلول کر آیا ہے۔ اس لئے جب توحید کا داعی یہ آواز بلند کرتا کہ خدا صرف ایک ہے، کوئی اس کا شریک نہیں، تو قدیم زمانہ کے بادشاہوں کو یہ آواز براہ راست ان کے حق حکمرانی کو چیلنج کرنے والی نظر آتی تھی۔ اس میں انھیں اپنی مشرکانہ سیاست کی تردید دکھائی دیتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے سیاسی مفاد کی بنا پر توحید کے داعیوں کے دشمن بن جاتے اور بے رحمی کے ساتھ ان کو کچل دیتے۔

اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اس صورت حال کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ قرآن میں پیغمبر آخر الزماں اور آپ کے ساتھیوں کو سکھایا گیا کہ تم اس طرح دعا کرو: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا (خدایا ہمارے اوپر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے کے لوگوں پر ڈالا تھا)۔ یہ دعا کے انداز میں اس خدائی فیصلہ کا اظہار تھا کہ خدا انسانی تاریخ میں ایک نیا انقلاب لانے والا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اقتدار کا رشتہ شرک سے ٹوٹ جائے گا۔ اب حکومت ایک خالص سیاسی معاملہ ہوگا نہ کہ اعتقادی معاملہ۔ یہی وہ خدائی منصوبہ تھا جس کی تکمیل کے لئے قرآن میں حکم دیا گیا: وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين كله لله (انفال ۳۹) یعنی مشرکوں سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ کی حالت باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کا ہو جائے۔

فتنہ کے معنی آزمائش کے ہیں۔ فَتَنَ فلاناً عن رأيه کے معنی ہیں رائے سے پھیر دینا۔ قرآن میں آیا ہے: موسیٰ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا، فرعون اور اپنی قوم کے بڑے لوگوں کے ڈر سے جن کو اندیشہ تھا کہ فرعون ان کو ستائے گا (یونس ۸۳) اس آیت میں ان یفتنہم کا لفظ ہے جو ستانے اور عذاب دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ گویا فتنہ کے معنی تقریباً وہی ہیں جس کو انگریزی زبان میں Persecution کہتے ہیں۔ یعنی کوئی رائے یا عقیدہ رکھنے کی بنا پر کسی کو ستانا۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سا فتنہ تھا جس کو ختم کرنے کا حکم دیا گیا۔ وہ شرک کا فتنہ تھا۔ چنانچہ مفسرین نے ان آیات میں فتنہ کی تفسیر "شرک" سے کی ہے۔ تاہم یہاں فتنہ سے مراد مطلق شرک نہیں بلکہ شرک جارح ہے۔ کیونکہ شرکِ جب جارح ہو تبھی وہ روکنے والا بنتا ہے۔ حتیٰ لا تکون فتنۃ کا مطلب ہے حتیٰ لا یُفتَن رجلٌ عن دینہ۔ یعنی شرکِ جارح سے لڑکر اسے ختم کر دو تاکہ دین شرک بے زور اور مغلوب ہوکر رہ جائے اور غالب دین کی حیثیت سے صرف دینِ توحید دنیا میں باقی رہے۔

شرک اپنی ابتدائی صورت میں محض ایک عقیدہ ہے۔ مگر قدیم زمانہ میں اس نے "فتنہ" کا مقام حاصل کرلیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قدیم زمانہ میں انسانی فکر پر شرک کا غلبہ تھا۔ زندگی کے ہر معاملہ کو شرک کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا تھا حتیٰ کہ سیاست وحکومت کی بنیاد بھی شرک کے اوپر قائم تھی۔ لوگ سورج اور چاند جیسی چیزوں کو دیوتا سمجھتے تھے اور شاہی خاندان اپنے آپ کو ان دیوتاؤں کی اولاد بتاکر لوگوں کے اوپر حکومت کرتا تھا۔ اس بنا پر جب توحید کا داعی یہ کہتا کہ خدا صرف ایک ہے، باقی تمام چیزیں اس کی مخلوق اور محکوم ہیں تو قدیم بادشاہوں کو یہ نظریہ ان کے حق حکمرانی کی تردید کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ اس کو اپنا حریف سمجھ کر اس کو مٹانے کے درپے ہو جاتے۔ عرب میں اور اطرافِ عرب میں توحید کی بنیاد پر جو اسلامی انقلاب آیا اس نے شرک کو فکری غلبہ کے مقام سے ہٹا دیا۔ اب شرک کی حیثیت ایک ذاتی عقیدہ کی ہوگئی نہ کہ ایک ایسے عوامی نظریہ کی جس کے اوپر سماجی زندگی کا پورا انتظام قائم ہو۔ نتیجۃً شرک کا رشتہ اقتدار سے ٹوٹ گیا۔ کیونکہ اب شرک کی بنیاد پر کسی کے لئے حق حکمرانی کا دعویٰ کرنے کا موقع باقی نہیں رہا تھا۔

معلوم انسانی تاریخ میں یہ تبدیلی بالکل پہلی بار آئی۔ اس کے ہمہ گیر اثرات میں سے دو چیزیں یہاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ جب یہ معلوم ہوا کہ خدا صرف ایک ہے اور بقیہ تمام چیزیں اس کی مخلوق اور محکوم ہیں تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر مظاہر فطرت کے تقدس کا ذہن ختم ہوگیا۔ وہ چیزیں جو اب تک انسان کے لئے پرستش کا عنوان بنی ہوئی تھیں۔ وہ اس کو اپنی خادم نظر آنے لگیں (خلق لکم ما فی الارض جمیعا، بقرہ ۲۹) اب آدمی نے چاہا کہ وہ ان چیزوں کو جانے اور ان کو استعمال کرے۔ انسانی ذہن کی یہی وہ تبدیلی ہے جس نے تاریخ میں توہماتی دور کو ختم کرکے سائنس کے دور کو شروع کیا۔ اسی کے ساتھ دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہت کا دور کم از کم نظریاتی طور پر ختم ہوگیا اور عوامی حکمرانی کے دور کا آغاز ہوا۔ جب یہ معلوم ہوگیا کہ تمام انسان یکساں ہیں، کسی انسان کے اندر کوئی خدائی صفت نہیں تو اس کے بعد بالکل قدرتی طور پر خدائی حق حکمرانی کے لئے زمین باقی نہیں رہی۔

ان دونوں انقلابات کا آغاز مدینہ سے ہوگیا تھا۔ اس کے بعد وہ دمشق، بغداد، اسپین اور سسلی ہوتا ہوا

دیم آباد دنیا کے بڑے حصہ میں پھیل گیا۔ اس مدت میں قدیم حالات کے اثر سے اس فکری تحریک کو بار بار مشکلات ا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم اس کا سفر جاری رہا۔ مخالف طاقتوں کی کوئی بھی کوشش اس میں کامیاب نہ ہو سکی ہ وہ مظاہر فطرت کے تقدس کے دور کو دوبارہ اس کی سابقہ عظمت کے ساتھ واپس لا سکے۔ اور نہ کسی حکمراں ے نے کبھی یہ ممکن ہوا کہ وہ اس طرح مقدس بادشاہ ہونے کا مقام حاصل کرے جیسا کہ عراق کے نمرود اور مصر کے رعون کو قدیم زمانہ میں حاصل تھا۔

مسلم دنیا سے مغربی دنیا کی طرف

ابتداءً تقریباً ایک ہزار سال تک یہ عمل مسلم دنیا میں ہوتا رہا۔ مگر سولھویں صدی عیسوی میں ایک نیا انقلاب یا۔ مسلمانوں کے آپس کے اختلاف کی وجہ سے ایک طرف بغداد کی عباسی خلافت ٹوٹ گئی اور دوسری طرف اسی ہی اختلاف کے نتیجہ میں اسپین کا مسلم اقتدار ختم ہو گیا۔ اس کے بعد مسلم دنیا میں کوئی ادارہ ان لوگوں کی سرپرستی رنے والا نہ رہا جو علمی وفکری تحقیق کا کام کر رہے تھے۔ چنانچہ علماء اور مفکرین کی بڑی تعداد دھیرے دھیرے اٹلی ور فرانس کی طرف منتقل ہو گئی۔ مخصوص اسباب کی بنا پر یورپ میں ان لوگوں کو بہت پذیرائی ملی۔ انقلابی عمل جو س سے پہلے مسلم دنیا میں ہو رہا تھا، وہ یورپ کی دنیا میں ہونے لگا۔ تاہم یورپ پہنچ کر اس کے اندر ایک تبدیلی ئی۔ مسلم دنیا میں یہ کام اسلام کے زیر اثر ہو رہا تھا، یورپ کو اسلام سے دلچسپی نہ تھی، اس نے اس کو اسلام ے جدا کر کے خالص علمی حیثیت سے فروغ دینا شروع کیا۔ اگرچہ مسلم علوم اور عربی زبان کی اس منتقلی کا اثر یورپ کے سیحی عقائد پر بھی پڑا۔ حتی کہ مارٹن لوتھر (۱۴۸۳-۱۵۴۶) براہ راست طور پر یورپ کے اوپر اسلامی اثرات پیداوار تھا۔ تاہم علمی وفکری تحریک کا ارتقاء یورپ میں آزاد سیکولر شعبہ کے طور پر ہوا نہ کہ مذہب کے ایک یلی شعبہ کے طور پر۔ جدید مغرب کا سائنسی اور جمہوری انقلاب تمام تر اسلامی انقلاب کی دین ہے۔ البتہ مغرب نے اس کو مذہب سے جدا کر کے سیکولر شکل دے دی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید مغربی انقلاب، اسلامی انقلاب ا ایک دنیوی صورت ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے ایٹم بم آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کی فوجی صورت ہے اور ومی ملکیت مارکسی نظریہ کی معاشی صورت۔

جدید انقلاب کی اسلامی اہمیت

جدید مغربی انقلاب، اپنی عمومی حیثیت میں، خود اسلام کا پیدا کردہ تھا۔ اس کے نتائج اسلامی نقطۂ نظر سے بے حد اہم تھے۔ اس انقلاب نے دنیوی اعتبار سے اس دعا کی تکمیل کر دی تھی جس کو خدا نے ان الفاظ یں ہمیں تلقین کیا تھا: اے ہمارے رب، ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے پچھلے لوگوں پر ڈالا (بقرہ) اس انقلاب کے نتیجہ یں زندگی کے نظام میں ہمارے موافق جو تبدیلیاں ہوئیں وہ خاص طور پر یہ تھیں:

۱۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ لوگوں میں یہ عقیدہ بٹھاکر حکومت کرتے تھے کہ وہ سورج دیوتا یا چاند دیوتا کی اولاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ میں توحید کی دعوت فوراً سیاسی اقتدار کی حریف بن جاتی تھی اور مشرک بادشاہوں کے ظلم کا نشانہ بنتی تھی۔ شرک کی تردید کو وہ اپنے حق حکمرانی کی تردید کے ہم معنی سمجھتے تھے۔ اسلامی انقلاب کی تکمیل کے طور پر یورپ میں جو جمہوری انقلاب آیا ہے اس نے اس نزاکت کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا کیونکہ آج کا حکمراں عوامی رائے سے حکمرانی کا حق حاصل کرتا ہے نہ کہ خدا کے ساتھ اپنا مفروضہ الوہی رشتہ جوڑ کر۔ اس تبدیلی نے تاریخ میں پہلی بار یہ امکان کھول دیا کہ توحید کی تبلیغ اس اندیشہ کے بغیر کی جائے کہ پہلے ہی مرحلہ میں غیر ضروری طور پر اس کا ٹکراؤ سیاسی ادارہ سے ہوجائے اور وہ اس کو کچل کر رکھ دے، جیساکہ اسلام سے پہلے ساری تاریخ میں ہوتا رہا ہے۔

۲۔ قدیم زمانہ میں مظاہر فطرت (سورج، چاند، دریا وغیرہ) کو مقدس سمجھا جاتا تھا۔ توحید کی بنیاد پر ہونے والے اسلامی انقلاب اور اس کے زیر اثر پیدا ہونے والے مغرب کے سائنسی انقلاب کے بعد یہ ہوا کہ فطرت کے واقعات خدائی مظاہر کے بجائے عام مادی مظاہر سمجھے جانے لگے۔ جو چیز پہلے پوجنے کی چیز سمجھی جاتی تھی وہ اب تحقیق و تجسس کی چیز بن گئی۔ اس کے نتیجہ میں جدید سائنسی اور تکنیکی انقلاب پیدا ہوا جس نے بے شمار نئی طاقتیں انسان کے قبضہ میں دے دیں۔ اس انقلاب کے ذریعہ تیز رفتار سواریاں وجود میں آئیں اور جدید ذرائع ابلاغ (پریس، ریڈیو وغیرہ) تک انسان کی دسترس ہوئی۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہوگیا کہ کسی عقیدہ کی تبلیغ عالمی اور بین اقوامی سطح پر کی جاسکے۔ خدا کے دین کی دعوت مقامی دعوت کے مرحلہ سے گزر کر عالمی دعوت کے مرحلہ میں داخل ہوگئی۔

۳۔ اسی انقلاب کے ذریعہ کائنات کے وہ چھپے ہوئے حقائق سامنے آئے جو توحید اور اس سے متعلق نظریات کے حق میں اعلیٰ علمی دلائل فراہم کر رہے ہیں۔ جنھوں نے قرآن کے کائناتی اشاروں کو کھول کر ہر ایک کے لئے انھیں قابل فہم بنا دیا ہے۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار وہ دور آیا جب کہ کائناتی نشانیاں معجزہ کا بدل بن جائیں۔ دینی حقیقتوں کو مشاہداتی دلائل کی سطح پر ثابت کیا جاسکے۔

۴۔ پھر اسی انقلاب کے ذریعہ تاریخ میں پہلی بار معاملات پر غور و فکر کا سائنسی، بالفاظ دیگر، واقعاتی نقطہ نظر پیدا ہوا۔ کائنات کا علم صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا تھا جب کہ انتہائی حقیقت پسندانہ انداز میں اس پر غور کیا جائے۔ اس لئے اس کے اثر سے علمی دنیا میں یہی عام ذہن بن گیا۔ اب واقعات کو واقعات کی رو سے دیکھا جانے لگا نہ کہ خوش عقیدگی یا توہمات کے اعتبار سے۔ اب یہ فضا پیدا ہوئی کہ مذاہب کی خالص علمی اور تاریخی تحقیق کی جائے۔ اسی انداز مطالعہ کا یہ نتیجہ تھا کہ موجودہ زمانہ میں علمی سطح پر یہ تسلیم کرلیا گیا کہ اسلام کے سوا جتنے

مذاہب ہیں سب کے سب غیر تاریخی (اور اس بنا پر ناقابل اعتبار) ہیں۔ مذاہب کے درمیان جس مذہب کو تاریخی اعتباریت کا درجہ حاصل ہے وہ صرف اسلام ہے (ملاحظہ ہو دی بائبل دی قرآن اینڈ سائنس)

مغرب کا غلبہ مسلم دنیا پر

مسلم دنیا نے صلیبی جنگوں (۱۲۷۱ — ۱۰۹۵) میں مسیحی یورپ پر فتح پائی تھی۔ مگر اس فتح کے بعد ہی برعکس عمل بھی شروع ہو گیا۔ مسیحی یورپ نے محسوس کیا کہ اس کی شکست کا سبب علمی اور فکری میدان میں مسلم دنیا سے اس کا پیچھے ہونا تھا۔ چنانچہ صلیبی جنگوں کے بعد یورپ نے تیزی سے مسلمانوں کے علوم اور عربی زبان کو سیکھنا شروع کر دیا۔ بعد کی صدیوں میں جب مسلم دنیا کے اہل علم یورپ کے ملکوں میں منتقل ہوئے تو وہاں یہ عمل اور تیزی سے جاری ہو گیا۔ بالآخر مغرب کی ترقی اس نوبت کو پہنچی کہ وہ علم و عمل کے تمام شعبوں میں مسلم قوموں سے آگے بڑھ گیا۔ اب اس نے مسلم ممالک میں داخل ہونا شروع کیا اور انیسویں صدی تک یہ حال ہوا کہ تقریباً تمام مسلم دنیا پر مغربی قوموں کا تسلط قائم ہو گیا۔

یہی سیاسی حادثہ اس بات کا سبب بن گیا کہ مذکورہ قیمتی امکانات اسلامی دعوت کے حق میں استعمال نہ ہو سکیں۔ صلیبی جنگوں میں ہاری ہوئی قوموں کو دوبارہ مسلم علاقوں میں گھستے ہوئے دیکھ کر لوگ بھڑ اٹھے۔ ساری مسلم دنیا میں مغرب کے خلاف سیاسی زور آزمائی شروع ہو گئی۔ حتی کہ بہت سے لوگ سیاسی مقابلہ آرائی ہی کو عین اسلام ثابت کرنے لگے تاکہ لوگ جب اجنبی حکمرانوں سے لڑ کر فارغ ہوں تو خود اپنے ملکی حکمرانوں کے خلاف مقدس سیاسی جہاد چھیڑ دیں۔ اس فضا میں کسی کو یہ سوچنے کا موقع ہی نہ ملا کہ جدید دنیا نے کچھ نئے امکانات کھولے ہیں اور وہ اسلام کے حق میں کامیابی کے ساتھ استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ جدید مواقع انتظار کرتے رہے کہ ہم ان کو استعمال کر کے اسلام کی دعوت کو سارے عالم میں پھیلا دیں اور نتیجۃً خدا کی نصرت کے مستحق ہوں۔ مگر ہماری سیاسی نفسیات نے ہم کو اُدھر توجہ دینے کی فرصت ہی نہ دی۔

سیاسی انقلاب کی نوعیت

سیاسی انقلاب کی اہمیت اسلام میں کیا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے سیاسی انقلاب دراصل اس کا نام ہے کہ اہلِ حق کو اہلِ باطل پر غلبہ حاصل ہو جائے (الصف) قرآن کی صراحت کے مطابق یہ غلبہ خدا کی توفیق اور نصرت سے حاصل ہوتا ہے (وما النصر الا من عند اللہ) اور خدا کی نصرت کا استحقاق حاصل کرنے کی واحد لازمی شرط دعوت ہے۔ اہل حق جب دعوت کے عمل کو اس کی تمام صالح شرائط کے ساتھ شروع کریں اور اس کو کرتے ہوئے اتمام حجت کے قریب پہنچا دیں تو اس وقت اس دعوتی عمل کی تکمیل کے نتیجہ میں ایک طرف اہلِ حق انعام کے مستحق ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف اہل باطل سزا کے مستحق۔ اس وقت خدائی منصوبہ کے تحت حالات میں تبدیلی

شروع ہو جاتی ہے۔ اہل حق خدائی طاقت سے مسلح ہو کر اہل باطل پر غالب آتے ہیں۔ دعوت حق اور اتمام حجت کے بغیر محض سیاسی کارروائیوں سے کبھی کسی مسلم گروہ کو غیر مسلم طاقتوں پر غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ خدا کی سنت ہے اور خدا کی سنت میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی (انعام ۱۳۱)

غیر مسلم اقوام کے لئے غلبہ کا فیصلہ خدا کے عام قانون امتحان کے تحت ہوتا ہے (یونس ۱۴) مگر اہل ایمان کے لئے غلبہ کا فیصلہ قانون اتمام حجت کے تحت ہوتا ہے۔ اگر ہم غیر مسلم گروہ پر دعوتی عمل کو انجام نہ دیں تو ہم کو یہ امید بھی نہ کرنی چاہئے کہ غیر مسلم گروہ پر ہمیں غلبہ عطا کیا جائے گا۔ دعوتی عمل ہی تو غیر مسلم گروہ پر غلبہ کی قیمت ہے۔ پھر جب قیمت ادا نہ کی گئی ہو تو متاع مطلوب آخر کس طرح حاصل ہوگی۔

مسلم دنیا میں سیاسی ردعمل

چودھویں صدی ہجری کا آغاز اس وقت ہوا جب کہ انیسویں صدی عیسوی کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ اس اعتبار سے چودھویں صدی ہجری اسلامی تاریخ کی اہم ترین صدی تھی۔ کیوں کہ یہ اس وقت آئی جب کہ اسلامی انقلاب کے بعد شروع ہونے والا عمل اپنی آخری تکمیل کے مرحلہ تک پہنچ گیا تھا۔ خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جس عالمی ہدایت کا دروازہ کھولا تھا، اس کو بروئے کار لانے کے حالات اور ضروری وسائل اپنی کامل صورت میں مہیا ہو کر ہمارے سامنے آچکے تھے۔ مگر تاریخ کا غالباً یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ یہ دروازہ عین اس وقت خود مسلمانوں کے ہاتھوں بند ہو گیا جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں کھولا تھا۔

جدید انقلاب نے یورپ کو جو طاقتیں دی تھیں ان کو اس نے اسی طرح اپنے قومی عزائم کی تکمیل کے لئے استعمال کیا جس طرح کوئی بھی قوم ان حالات میں کرتی ہے۔ مغربی قوموں کی دسترس جیسے ہی جدید طاقتوں پر ہوئی ان کے یہاں وہ چیز وجود میں آئی جس کو مغربی استعمار کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے جغرافیہ سے نکل کر خشکی اور تری میں اپنے جھنڈے گاڑے۔ قوموں کے درمیان اپنی تہذیب پھیلائی۔ جن لوگوں نے ان کے راستہ میں رکاوٹ ڈالی ان کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا۔ مغربی قوموں کے ان عزائم کا براہ راست شکار ہونے والے زیادہ تر مسلمان تھے۔ کیونکہ اس وقت یورپ کے باہر اکثر آباد دنیا مسلمانوں ہی کے زیر اقتدار تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چیز جس کو ہم نے اسلامی انقلاب کا سیکولر نتیجہ کہا ہے، اس کا تعارف مسلمانوں سے اپنے پہلے ہی مرحلہ میں اس حیثیت سے ہوا گویا کہ وہ ایک دشمن طاقت ہے جو مسلمانوں کو ان کی تمام عظمتوں سے محروم کر کے ان کو ایک مغلوب اور پسماندہ قوم بنا دینا چاہتی ہے۔ مغربی انقلاب کا افادی پہلو ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، وہ اس کو اپنے سیاسی اور اقتصادی حریف کی حیثیت سے دیکھنے لگے۔

چودھویں صدی ہجری اسلام کی پوری تاریخ میں پہلی صدی تھی جب کہ یہ امکان پیدا ہوا تھا کہ اسلام

کی دعوت توحید کو یُسر (آسانی) کے حالات میں انجام دیا جائے جب کہ اس سے پہلے صرف عُسر (سختی) کے حالات ہی میں اس کو انجام دینا ممکن ہوتا تھا۔ اسی طرح یہ واقعہ بھی پہلی بار ہوا کہ خود انسان کے اپنے مسلّمات کے مطابق اسلام کا دیگر ادیان کے مقابلہ میں واحد معتبر دین ہونا ثابت کیا جائے اور اس کو اعلیٰ ترین علمی شواہد سے اس طرح مدلل کر دیا جائے کہ کسی کے لئے انکار کی جرأت باقی نہ رہے۔ نیز اس صدی میں پہلی بار تیز رفتار سواریاں اور تبلیغ کے جدید ذرائع انسان کے قبضہ میں آئے جن سے کام لے کر اسلام کے پیغام کو بین اقوامی سطح پر پھیلایا جا سکتا تھا۔ مگر جو قومیں ان خدائی برکتوں کو ہماری طرف لا رہی تھیں وہ اتفاقی حالات کے نتیجہ میں ہماری سیاسی حریف بن گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری مسلم دنیا مغرب کے بارے میں مخالفانہ نفسیات کا شکار ہو گئی، مغرب کی طرف سے آنے والے انقلاب کا افادی پہلو اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ حالاں کہ خدا نے مسلمانوں کے لئے ایسا امکان کھولا تھا کہ وہ خود مغرب کے پیدا کردہ حالات کو اپنے دعوتی مقاصد میں استعمال کر کے مغرب کو نظریاتی طور پر فتح کر سکتے تھے۔ اگر مسلمانوں نے بروقت اس دانش مندی کا ثبوت دیا ہوتا تو چودھویں صدی ہجری میں وہ واقعہ دوبارہ نئے انداز سے پیش آتا جو آٹھویں صدی ہجری میں تاتاری فاتحین کے خادمانِ اسلام بن جانے کی صورت میں پیش آ چکا ہے۔

موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکیں

چودھویں صدی ہجری میں ساری مسلم دنیا میں بے شمار اسلامی تحریکیں اٹھیں۔ مگر ضمنی فرق کے باوجود یہ تمام تحریکیں ردعمل کی تحریکیں تھیں نہ کہ حقیقی معنوں میں مثبت تحریکیں۔ جدید مسلم قیادت "مغرب" کے نام سے جس چیز سے واقف ہوئی وہ صرف یہ تھا کہ یہ ایک حملہ آور قوم ہے جو ہمارے لئے سیاسی چیلنج بن کر اٹھی ہے، وہ اس بات سے بے خبر رہے کہ مغرب دراصل کچھ جدید قوتوں کی دریافت کا نام ہے اور یہ قوتیں اسلام کے لئے عین مفید ہیں بلکہ بالواسطہ طور پر خود اسلامی انقلاب کی پیدا کردہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مسلم تحریکیں نئے امکانات سے فائدہ نہ اٹھا سکیں، وہ جدید قوموں کے مقابلہ میں صرف ایک منفی رول ادا کر کے رہ گئیں۔

اس صورت حال کا مزید نقصان یہ ہوا کہ دوسری قوموں سے ہمارا صحیح اسلامی رشتہ قائم نہ ہو سکا۔ مسلمان کے لئے دوسری قومیں مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر مذکورہ منفی نفسیات کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہم نے ان قوموں کو مدعو نہ سمجھا، ان کو صرف حریف کی نظر سے دیکھا۔ اسلامی تحریکیں پیغام آخرت کی تحریکیں نہ رہیں بلکہ پیغام سیاست کی تحریکیں بن گئیں۔ ان تحریکوں نے انداز کے فرق کے ساتھ، جدید دنیا کو جس "اسلام" سے واقف کرایا وہ محض ایک قسم کا قومی اسلام تھا نہ کہ خدا کا وہ دین جو انسانوں کو آخرت کی ابدی کامیابی کا راستہ دکھانے کے لئے آیا ہے۔ داعی اور مدعو کا تعلق حریف اور مدمقابل کا تعلق بن کر رہ گیا۔

یہ مسلم تحریکیں اپنی جس معذوری کی وجہ سے "مغرب بحیثیت استعمار" اور "مغرب بحیثیت جدید قوت" کو الگ الگ کر کے نہ دیکھ سکیں، اسی معذوری کا یہ نتیجہ بھی ہوا کہ انھوں نے جدید قوموں کے خلاف اپنی مہم میں نہ تو نئی قوتیں فراہم کیں اور نہ نئے حالات کی رعایت کی۔ حد درجہ نادانی کے ساتھ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ تک جان و مال کی قربانیاں دی جاتی رہیں جب کہ ان قربانیوں کے لیے قطعی طور پر مقدر تھا کہ اسباب کی اس دنیا میں وہ بالکل رائگاں ہو کر رہ جائیں۔ اس طویل غیر حقیقت پسندانہ سیاست کی اب یہ نفسیاتی قیمت مسلمانوں کو دینی پڑ رہی ہے کہ پوری کی پوری مسلم دنیا ایک قسم کے فرضی جنونِ عظمت (Paranoia) کا شکار ہو کر رہ گئی ہے اور اب کوئی حقیقت پسندانہ بات اسے اپیل ہی نہیں کرتی۔

فخر نہیں ذمہ داری

پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے یکم اکتوبر ۱۹۸۰ کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایک تقریر کی۔ ان کی ڈیڑھ گھنٹہ کی یہ تقریر ان کے اپنے الفاظ میں دنیا بھر کے ۹۰ کروڑ مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے تھی۔ ان کی لکھی ہوئی تقریر کا ایک پیراگراف یہ تھا:

> As they enter the 15th Century Hijra, the Islamic peoples, who have rediscovered their pride in their religion, their great culture and their unique social and economic institutions, are confident that the advent of this century would mark the beginning of a new epoch, when their high ideals of peace, justice, equality of man, and their unique understanding of the universe, would once again enable them to make a worthy contribution to the betterment of mankind.

اب کہ اسلامی قومیں پندرھویں صدی ہجری میں داخل ہو رہی ہیں۔ انھوں نے اپنے مذہب، اپنے عظیم کلچر اور اپنے بے مثل سماجی اور معاشی اداروں میں اپنے فخر کو دوبارہ دریافت کر لیا ہے۔ ان کو یقین ہے کہ اس صدی کا آغاز ایک نئے عہد کی ابتدا ثابت ہوگا جب کہ امن، انصاف، انسانی برابری اور کائنات کے بارے میں ان کا بے مثل شعور ان کو دوبارہ اس قابل بنائے گا کہ وہ انسانیت کی بھلائی میں قابل قدر حصہ ادا کر سکیں۔

جنرل محمد ضیاء الحق نے یہ بات موجودہ مسلمانوں کی تعریف کے طور پر کہی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسی میں مسلمانوں کا وہ المیہ بھی چھپا ہوا ہے جس نے موجودہ زمانہ میں ان کی تمام اسلامی کوششوں کو بے قیمت بنا دیا ہے۔ آج ساری مسلم دنیا میں اسلام کے نام پر زبردست سرگرمیاں جاری ہیں۔ مگر یہ ساری دھوم فخر (Pride) کے طور پر ہے نہ کہ ذمہ داری کے طور پر۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی سرگرمی فخر کے احساس کی بنیاد پر اٹھتی ہے (حدید ۲۰) اور اخروی سرگرمی عبدیت کے احساس کی بنیاد پر (ذاریات ۵۶) فخر سے انانیت اور مطالبہ کا جذبہ ابھرتا ہے اور عبدیت سے عجز اور ذمہ داری کا۔ اسلامی تحریک وہ ہے جو جہنم سے ڈرانے کے لیے اٹھے۔ مگر موجودہ زمانہ کی

اسلامی تحریکیں دنیا میں بڑائی حاصل کرنے کے جذبہ سے اٹھی ہیں۔ قومی سربلندی کے احساس نے ان کو کھڑا کیا ہے۔ آج کے مسلمانوں کے لئے اسلام ایک نازکی چیز ہے نہ کہ حقیقۃً آخرت کی صراط مستقیم۔ یہ واقعہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہ تحریکیں مسلمانوں کی قومی تحریکیں ہیں نہ کہ حقیقی معنوں میں اسلامی تحریکیں۔ مسلمانوں کے یہاں آج جس مذہب کی دھوم ہے وہ قومی مذہب ہے نہ کہ خدائی مذہب۔ کیونکہ قومی مذہب سے ہمیشہ فخر کی نفسیات ابھرتی ہے اور خدائی مذہب سے ذمہ داری کی نفسیات۔

حقیقی اسلام آدمی کے اندر عجز اور تواضع پیدا کرتا ہے اور جہاں عجز اور تواضع ہو وہاں گویا ساری بھلائیاں جمع ہو گئیں۔ کیونکہ ہر خرابی کی جڑ کبر اور ہر اچھائی کی جڑ عجز ہے۔ ایسے افراد میں ان کے اسلام کے لازمی نتیجہ کے طور پر خدا کا خوف، آخرت کی طلب، باہمی اتحاد، ایک دوسرے کی خیر خواہی، شکایتوں سے درگزر کرنا، تعمیری کاموں کی طرف توجہ اور حقوق کے مقابلہ میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ اور جس سماج میں ایسی نفسیات والے انسان قابل لحاظ تعداد میں پیدا ہو جائیں وہ اپنے آپ دنیا میں سب سے اونچا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس قومی اسلام آدمی کے اندر فخر و ناز کی نفسیات پیدا کرتا ہے اور جہاں فخر و ناز کے جذبات ہوں وہاں گویا تمام برائیاں جمع ہو گئیں۔ ایسے افراد کے اندر انانیت، آخرت سے بے خوفی، اپنی غلطیوں کو دیکھنے کے بجائے دوسروں کا احتساب اور پھر ان کیفیات کے نتیجہ میں اختلاف اور باہمی ٹکراؤ عام ہو جاتا ہے۔ وہ خاموش تعمیری کام کے مقابلہ میں نمائشی کاموں کی طرف رغبت رکھتے ہیں۔ وہ پیچھے چلنے کے بجائے ہمیشہ آگے چلنے کے خواہاں رہتے ہیں۔ وہ اپنے معمولی کام کو بڑے بڑے الفاظ میں بیان کرتے ہیں تاکہ اپنے برتری کے جذبہ کو تسکین دے سکیں۔ اسلام ایسے لوگوں کے درمیان کرنے سے زیادہ کہنے کی چیز ہوتا ہے — اور جہاں ایسا اسلام ہو وہاں لوگوں کے اوپر خدا کا غضب نازل ہوتا ہے نہ کہ خدا کی رحمت و نصرت۔

یہودیوں کی صہیونی تحریک قدیم اسرائیلی عظمت کو واپس لانے کی تحریک ہے۔ ہندوؤں کی آر ایس ایس تنظیم اپنے شان دار ماضی کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے اٹھی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی بھی ایک پرفخر دنیوی تاریخ ہے اور موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکیں کسی نہ کسی اعتبار سے اسی پرفخر ماضی کو واپس لانے کے جذبہ سے ابھری ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہودیوں اور ہندوؤں کی تحریکیں مذہبی اصطلاحات استعمال کرنے کے باوجود حقیقی معنوں میں مذہبی تحریکیں نہیں ہیں، وہ یقینی طور پر صرف قومی تحریکیں ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کی اسی قسم کے جذبات کے تحت اٹھنے والی تحریکیں بھی محض اس لئے اسلامی تحریکیں نہیں بن جائیں گی کہ وہ اپنے مقصد کو اسلامی الفاظ میں بیان کرتی ہیں۔ خدا کسی کے عمل کو حقیقت کے اعتبار سے دیکھتا ہے نہ کہ ظاہر کے اعتبار سے۔ جو تحریک قومی نفسیات کے ساتھ اٹھے وہ خدا کی نظر میں قومی تحریک ہی رہے گی، اس کا قرآن و حدیث کے الفاظ استعمال کرنا کسی بھی طرح اس کو اسلامی

تحریک کا مقام نہیں دے سکتا۔ اور نہ اس پر خدا کے وہ وعدے پورے ہو سکتے جو صرف حقیقی اسلامی تحریک کے لئے مقدر ہیں۔

ایک حقیقی درخت خود اپنے بیج سے اگتا ہے نہ کہ پلاسٹک کے ہم شکل بیج سے۔ اسی طرح وہی اسلامی تحریک خدا کے وعدہ کئے ہوئے نتائج تک پہنچتی ہے جو حقیقی اسلامی بنیادوں پر اٹھی ہو۔ ایک تحریک جو حقیقتاً قومی محرکات کے تحت اٹھے وہ صرف اس لئے اسلامی نتائج ظاہر نہیں کرنے لگے گی کہ اس کے رہنما جب اس کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں تو وہ اس کو اسلامی الفاظ اور اسلامی اصطلاحات میں بیان کرتے ہیں۔

اسلامی تحریک دراصل معرفت خداوندی کا عملی اظہار ہے۔ وہ آخرت کے نظام کو دنیا کی زندگی میں اتار لانا ہے۔ خدا نے بقیہ کائنات میں جن اخلاقیات کو بزور قائم کر رکھا ہے انھیں اخلاقیات کو انسان کی سطح پر خود اپنے ارادے سے قائم کرنا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اسلامی تحریک ایک ابدی حقیقت کے زیر اثر اٹھنے والی تحریک ہے نہ کہ ایسی تحریک جو قومی واقعات کے وقتی ردعمل کے طور پر ظہور میں آئی ہو۔

مومن خدا کی زمین میں اُگنے والا خدا کا سرسبز درخت ہے۔ اور مومنین کی جماعت خدا کا سرسبز باغ۔ جو لوگ وقتی تماشوں یا قومی ہنگاموں کو اسلامی دعوت کا نام دیتے ہیں وہ گویا اپنے ٹھنٹھ کو خدا کا سرسبز باغ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ خدا کے نام پر استغلال کرنے کے مجرم ہیں، وہ اپنے اس عمل کے لئے کسی کریڈٹ کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

غلبۂ اسلام

اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا سوال آج ساری دنیا کے مسلمانوں میں سب سے زیادہ ابھرا ہوا سوال ہے۔ مگر اس سلسلے میں ان کی کوششوں کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اسباب سے ان کے اندر عظمت ماضی کو دوبارہ واپس لانے کی ایک مجہول خواہش تو ضرور پیدا ہوگئی ہے مگر ماضی کی تاریخ کو حال کا واقعہ بنانے کے لئے جو ضروری عمل درکار ہے اس کا واضح شعور انھیں حاصل نہیں۔

ایک طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کو فضائل اسلام کی طلسماتی کہانیاں سنا کر مسجدوں کی آبادی میں اضافہ کرو، اور اس کے بعد ساری دنیا اپنے آپ تمھاری ہو جائے گی۔ مگر یہ حل ایسا ہی ہے جیسے ٹونے ٹوٹکے کے ذریعہ ہمالیہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے کھسکانے کی امید قائم کرلی جائے۔ دوسرا طبقہ پر جوش تقریریں کرنے اور شاعرانہ الفاظ بولنے کو مسئلہ کا حل سمجھتا ہے۔ وہ بھول گیا ہے کہ خدا کی دنیا محکم قوانین کی دنیا ہے۔ یہاں لفظوں کا کمال دکھا کر کسی واقعہ کو ظہور میں نہیں لایا جا سکتا۔ ایک اور طبقہ اس انقلابی غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اپنے کسی بادشاہ کو تخت سے اتار کر یا اپنے کسی حکمراں کو پھانسی پر چڑھا کر وہ اسلام کی عظمت رفتہ کو واپس لانے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس کو معلوم نہیں کہ یہ مسئلہ عالمی طاقتوں کو زیر کرنے کا مسئلہ ہے نہ کہ قوم کے کچھ افراد کو اسلام دشمنی کی "علامت" ٹھہرا کر ان کو کسی نہ کسی تدبیر سے ہلاک کر دینے کا۔

تبدیلی اقتدار کا قانون

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حکومت کا مالک اللہ ہے۔ وہی جس کو چاہتا ہے حکومت عطا کرتا ہے (آل عمران ۲۶) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کسی گروہ کا غلبہ و اقتدار حاصل کرنا کوئی سادہ واقعہ نہیں ہے۔ یہ براہ راست خدا کے فیصلہ کے تحت ہوتا ہے۔ ایک گروہ کا غلبہ ہمیشہ دوسرے گروہ کی مغلوبیت کی قیمت پر ہوتا ہے۔ ایسے ایک واقعہ کے ظہور کے لئے خارجی دنیا میں ایسی وسیع تر تبدیلیوں کا پیش آنا ضروری ہے جو ایک گروہ کے حق میں حالات کو موافق کر دیں اور دوسرے گروہ کے حق میں اس کو مخالف بنا دیں۔

اجتماعی زندگی میں اس قسم کا غیر معمولی تغیر ہمیشہ مافوق اسباب کے تحت ہوتا ہے۔ انقلاب خواہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، ہمیشہ ان اسباب کے زیر اثر آتا ہے جو کبھی کسی شخص یا جماعت کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتے۔ روس کا اشتراکی انقلاب (۱۹۱۷) پہلی جنگ عظیم کے پیدا کردہ ہنگامی حالات کے بطن سے نکلا۔ موجودہ صدی کے وسط میں ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کی مغربی استعمار سے آزادی دوسری جنگ

عظیم کے پیدا کئے ہوئے ہنگامی حالات کے اندر سے برآمد ہوئی۔ جب کہ اس قسم کی عالمی جنگ کو برپا کرنا نہ اشتراکی تحریک کے اختیار میں تھا اور نہ وطنی آزادی کی تحریک کے اختیار میں۔ اسی طرح دور اول میں مسلمانوں کی تیز فتوحات کا خاص سبب یہ تھا کہ ایران و روم کی سلطنتیں عین اسی زمانہ میں لمبی لڑائیاں لڑ کر بالکل کمزور ہو چکی تھیں۔ اور ظاہر ہے کہ وقت کی دو سب سے بڑی طاقتوں کے درمیان اس قسم کی تباہ کن جنگ چھیڑنا صرف خدا کے اختیار میں تھا نہ کہ کسی انسان کے اختیار میں۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ عام قوموں کے درمیان سیاسی تبدیلیاں خدا کے قانون دفع (البقرہ ۲۵۱) کے تحت ظہور میں آتی ہیں۔ یعنی ایک ظالم اور مفسد کی سیاسی اجارہ داری کو ختم کرنے کے لئے اس کی جگہ کسی دوسرے کو لے آنا، ایک گروہ کے ذریعہ کسی دوسرے گروہ کو ہٹا دینا۔ بالفاظ دیگر، عام سیاسی تبدیلیاں زیادہ تر سلبی مقصد کے تحت ہوتی ہیں۔ مگر جہاں تک اسلامی انقلاب کا تعلق ہے وہ ایجابی مقصد کے تحت وقوع میں آتا ہے۔ اسلامی انقلاب اس لئے برپا کیا جاتا ہے کہ اللہ اپنے ان خاص بندوں پر احسان کرے جنھوں نے خدا کے مطلوبہ معیار کے مطابق اپنے شعور اور اپنے کردار میں صالحیت کا ثبوت دے دیا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا (النور ۵۵)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کو زمین میں حکومت عطا کرے گا جیسا کہ ان لوگوں کو حکومت دی جو ان سے پہلے گزرے۔ اور ان کے دین کو جما دے گا جس کو ان کے لئے پسند کیا ہے اور ان کی خوف کی حالت کو امن سے بدل دے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا مسئلہ اس سے کہیں زیادہ بڑا ہے کہ وہ عام طرز کی سیاسی یا غیر سیاسی تدبیروں سے وقوع میں آجائے، یہ کفر و شرک کی عالمی بالادستی کو ختم کرنے کا مسئلہ ہے۔ یہ غالب تہذیب کو مغلوب کرنے اور مغلوب تہذیب کو دوبارہ غلبہ کا مقام دینے کا مسئلہ ہے۔ یہ ایک تاریخی دور کو ختم کر کے دوسرا تاریخی دور واپس لانے کا مسئلہ ہے۔ مختصر الفاظ میں، یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے حل کے لئے خدائی طاقتوں کی کارفرمائی درکار ہے۔

اس کے لئے ضرورت ہے کہ ایک طوفان نوح برپا ہو جس میں شیطان کی تمام نسل غرق ہو کر رہ جائے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ معجزۂ موسوی ظاہر ہو جو فرعون اور اس کے ساتھیوں کو سمندر کی موجوں کے حوالے کر دے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ خدا کے فرشتے آسمان سے اتریں اور "بدر" کے میدان میں وقت کے تمام بڑوں کو جمع کر کے انھیں مسلمانوں کے قبضہ میں دے دیں۔ یہ واقعہ خدائی مدد سے ظہور میں آنے والا واقعہ ہے۔

مسلمان صرف اپنی محدود کوششوں سے اس کو بروئے کار نہیں لا سکتے۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کا قافلہ اپنے ہی قدموں پر چل کر آگے بڑھے گا مگر اس میں بھی شک نہیں کہ اس کے لئے زینہ خدا کی طرف سے فراہم ہوگا جس سے چھلانگ لگا کر وہ اپنی منزل تک پہنچ جائیں۔ حالات میں اس قسم کی غیر معمولی تبدیلی کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اس کا اہتمام ہمیشہ کائنات کے رب کی طرف سے ہوتا ہے۔

آج مسلمان جس مغلوبیت کی حالت میں ہیں اس سے نکلنے کی سبیل محض معمول کی تحریکی کوششوں میں نہیں ہے بلکہ غیر معمولی حالات کے ظہور میں ہے۔ ہمارے حوصلوں کی کامیابی کا امکان صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ خدائی مداخلت ہماری جد و جہد کو ہمارے لئے سازگار بنا دے۔ جب زمین و آسمان کا مالک اپنی مافوق قوتوں سے سیاسی اور تمدنی چٹانوں میں ایسے درے پیدا کر دے جن سے نفوذ کر کے ہم آگے جا سکتے ہوں۔ وہ ایسی موافق آندھیاں چلائے جس سے ایک طرف مخالف کیمپ کی طنابیں اکھڑیں اور دوسری طرف ملت اسلامیہ کی راہ ہموار ہوتی ہو۔ وہ ایسی بارش برسائے جو ایک کے لئے کیچڑ اور دلدل بنے اور دوسرے کے لئے سیرابی اور تازگی کا سامان پیدا کرے۔ وہ ایسا زلزلہ برپا کرے جس سے بلندیاں پست ہو جائیں اور پستیاں ابھر کر اوپر آ جائیں۔ وہ مقابلہ کے وقت ایک فریق کے اوپر رعب اور دوسرے فریق کے اوپر اَمَنَۃ نازل کرے۔ جب تک اس قسم کی غیر معمولی آسمانی مدد ہمارا ساتھ نہ دے، محض سیاسی کارروائیاں یا جلسہ جلوس ہم کو کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچا سکتے۔ دور اول کا اسلامی قافلہ بھی اسی قسم کی خداوندی نصرت سے کامیاب ہوا تھا اور آج بھی وہ کامیاب ہوگا تو اسی قسم کی نصرتوں سے کامیاب ہوگا

غلبہ کا ذریعہ دعوت الی اللہ

خدا کی اس برتر نصرت کا مستحق بننے کے لئے کسی مومن گروہ کو جس اہلیت کا ثبوت دینا ہے وہ ذاتی اصلاح کے بعد دعوت ہے۔ مومنین کے گروہ کے لئے خدا نے جس اجتماعی نصرت کا وعدہ کیا ہے وہ تمام تر اس پر موقوف ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں صاحب ایمان ہو، اور پھر داعی الی اللہ ہونے کا ثبوت دے۔ موجودہ دنیا میں اہل ایمان کی اصل ذمہ داری شہادت علی الناس (حج) ہے۔ اہل ایمان دنیا کی قوموں کے اوپر خدا کی طرف سے حق کے گواہ ہیں (انتم شهداء الله في الارض، حدیث) اس لئے بالکل فطری ہے کہ اسی اصل حیثیت کے تحقق پر ان کو خدا کا وہ عظیم انعام ملے جس کو غلبہ و سرفرازی کہا جاتا ہے۔

مسلمان دوسری قوموں کے ساتھ ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں ایک گروہ دوسرے گروہ کو لوٹتا ہے، جہاں ایک طبقہ دوسرے طبقہ پر غالب آنے کے لئے سرگرمیاں دکھاتا ہے۔ اس بنا پر مسلمانوں کے لئے دوسری

بوں کی طرف سے بار بار مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ وہ بار بار دوسرے گروہ کی زد میں آجاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اندر دوسری قوموں کے خلاف جذبات ابھرتے ہیں۔ وہ دوسری قوموں کی طرف سے پنے کو خطرہ میں پاکر ان کے خلاف "جہاد" کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اس مسئلہ کو قرآن کی روشنی میں دیکھئے تو اس کا واب اس سے بالکل مختلف ملے گا جو ایک عام قومی لیڈر ایسے حالات میں سوچتا ہے۔ قرآنی جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ مسئلہ خواہ جان و مال کے نقصان کی سطح پر پیدا ہو مگر اس کا حل تمھارے لئے ابدی طور پر دعوتی عمل میں بھ دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے لئے ہر حال میں جد وجہد کا مقام دعوت الی اللہ ہے نہ کہ وہ دنیوی محاذ جہاں ظاہراً ان کا حریف انھیں خطرہ بنا ہوا نظر آتا ہے۔ قرآن کی اس آیت میں پیغمبر کے واسطہ سے امت کو یہی سبق دیا گیا ہے:

یا ایھا الرسول بلّغ ما اُنزل الیک من ربّک — اے رسول جو کچھ تم پر تمھارے رب کی طرف سے اترا ہے
وان لم تفعل فما بلّغت رسالتہ واللہ یعصمک — اسے پہنچا دو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کا پیغام نہ پہنچایا
من النّاس (مائدہ ۶۷) — اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا

س آیت سے واضح ہوتا ہے کہ عصمت من الناس کا راز دعوت الی اللہ میں چھپا ہوا ہے۔ جب بھی اہل ایمان کے لئے دوسروں کی طرف سے عدم تحفظ کا خطرہ ہو یا مغلوبیت کا سوال پیدا ہو تو ان کو دعوت الی اللہ کے کام کی طرف دوڑنا چاہئے۔ اسی کام میں لگنے سے خدا کا قانون ان کے حق میں متحرک ہوگا اور وہ غیر معمولی اسباب پیدا ہوں گے جو بالآخر ان کے لئے نجات اور کامیابی کا زینہ بن جائیں۔

دعوت دین کے کام کی ایک خاص فوقیت (Advantage) یہ ہے کہ فطرت کو ابدی طور پر اس کا ہم نوا بنا دیا گیا ہے۔ تعصب کی سطح پر کوئی آدمی خواہ کتنا ہی مخالف ہو مگر فطرت کی سطح پر حق کی آواز تمام انسانوں کے لئے اپنے دل کی آواز ہے۔ حق کی پکار ایک ایسی پکار ہے جس کا ایک شِق ہر آدمی کے دل میں موجود ہوتا ہے۔ خدا کا دین اور انسان کی فطرت دونوں ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ ہر آدمی پیدائشی طور پر اپنے خالق کا تصور لئے ہوئے ہے۔ ہر آدمی کا باطن اس کی اپنی بناوٹ کے اعتبار سے ہر لمحہ زور کر رہا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے خالق و مالک کے آگے ڈال دے۔ گویا دین حق ایک ایسا سودا ہے جس کا ہر آدمی پہلے سے خریدار بنا ہوا ہے۔

اس فطری مساعدت کے ساتھ اسلام کو ایک تاریخی مساعدت بھی حاصل ہے۔ وہ یہ کہ دوسرے تمام مذاہب اپنے ماننے والوں کی تحریفات کے نتیجہ میں اپنا اصلی حسن کھو چکے ہیں۔ وہ اتنا بدل چکے ہیں کہ ان میں اور فطرت انسانی میں وہ مطابقت باقی نہیں رہی جو فی الواقع دونوں کے خالق نے دونوں کے درمیان رکھی تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا میں جتنے لوگ کسی دوسرے مذہب کو مانتے ہیں وہ صرف روایت پرستی کی بنا پر اس کو مانتے

ہیں۔ وہ تعصب کی زمین پر کھڑے ہوئے ہیں نہ کہ فی الواقع فطری تصدیق کی زمین پر۔ کیونکہ فطری تصدیق وہاں سرے سے موجود ہی نہیں۔ اگر ہم کسی طرح تعصب کا پردہ ہٹادیں تو تمام دوسرے مذاہب بے زمین ہوجائیں گے اور لوگوں کو اس کے سوا کوئی راستہ دکھائی نہ دے گا کہ وہ اسلام کے سایہ میں پناہ لیں۔

دعوتی تسخیر کی مثالیں

دعوت میں ہمارے لئے زندگی کا راز چھپا ہوا ہے، یہ کوئی قیاسی بات نہیں۔ اسلام کی تاریخ اس نظریہ کے حق میں واضح تائید پیش کرتی ہے۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں اپنے پیغمبرانہ کام کا آغاز فرمایا۔ مگر مکہ کی زمین آپ کے لئے انتہائی سخت ثابت ہوئی۔ نبوت کے بارھویں سال بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کی تاریخ مکہ سے شروع ہوکر مکہ ہی میں ختم ہوجائے گی۔ مگر اس کے بعد حیرت انگیز طور پر یثرب (مدینہ) میں یہ مواقع پیدا ہوگئے کہ آپ ہجرت کرکے وہاں جائیں اور وہاں اسلام کا مرکز قائم کریں۔ مدینہ میں یہ نیا امکان کیونکر پیدا ہوا۔ اس کا ایک ہی جواب ہے، اور وہ یہ کہ دعوت وتبلیغ کے ذریعہ۔ مدینہ میں چند لوگوں کی دعوتی جدوجہد کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہاں گھر گھر اسلام پھیل گیا (حتّٰی لم تبقَ دارٌ من دُور الانصار الا وفیھا رجال ونساء مسلمون، سیرۃ ابن ہشام جلد اول) اس طرح انتہائی مشکل اور مایوس کن حالات میں اسلام کی اشاعت کے ذریعہ مدینہ میں مسلمانوں کے لئے زندگی کے مواقع کھلے۔

۲۔ ہجرت نے اگرچہ مسلمانوں کے لئے اپنا ایک علاقہ مہیا کردیا تھا۔ مگر مخالفین اسلام نے باقاعدہ جنگ چھیڑکر دوبارہ اسلام کے لئے شدید حالات پیدا کردئے۔ اسلام ایسی مشکلات میں گھر گیا کہ ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ اسلام کے دشمن شاید اسلام کا وجود مٹادیں گے۔ اس وقت پھر دعوت ہی تھی جس نے دوبارہ اسلام کے لئے نئے حالات کا دروازہ کھولا۔ حدیبیہ کی صلح کی صورت میں ہر ممکن قیمت دے کر جنگ وجدال کا ماحول ختم کردیا گیا اور پُرامن حالات میں از سرِ نو دعوتی عمل جاری کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو سال میں مسلمانوں کی تعداد چوگنے سے بھی زیادہ ہوگئی۔ بالآخر قریش کے سردار اتنا مرعوب ہوئے کہ لڑے بھڑے بغیر ہتھیار ڈال دئے۔

۳۔ فتح مکہ کے بعد پھر ایک بہت بڑا مسئلہ قبیلہ ثقیف کی صورت میں پیدا ہوا۔ وہ بے حد سرکش تھے اور دیواری شہر کے مالک ہونے کی وجہ سے ان پر فوجی کارروائی کرنا مسلمانوں کے لئے اپنے حالات کے لحاظ سے بظاہر ناممکن تھا۔ اس وقت قبیلہ ثقیف کو جس چیز نے زیر کیا وہ دعوت ہی تھی۔ قبیلہ ہوازن (۶ ہزار) کے ساتھ تالیف قلب کا طریقہ اختیار کرکے انھیں اسلام میں داخل کرلیا گیا۔ قبیلہ ہوازن طائف کے قبیلہ ثقیف کا

حلیف تھا۔ چنانچہ ان کے عمومی طور پر اسلام قبول کرتے ہی قبیلہ ثقیف کو محسوس ہوا کہ ان کا بازو ٹوٹ چکا ہے اور اب ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ مدینہ جاکر اسلام قبول کرلیں اور مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہوجائیں ——— طائف کا دروازہ فوجی مہم کے لئے بند تھا، مگر دعوتی مہم کے لئے وہ کھلا ہوا نظر آیا۔

۴۔ اس کے بعد اسلامی تاریخ مختلف مراحل طے کرتی ہوئی آٹھویں صدی ہجری میں پہنچتی ہے۔ تاتاری قبائل ملکوں اور شہروں کو زیر وزبر کرتے ہوئے اسلامی دنیا میں داخل ہوجاتے ہیں اور بغداد کی عظیم مسلم سلطنت کو تاراج کر کے رکھ دیتے ہیں۔ چنگیز خاں وسط ایشیا سے ۱۲۱۶ء میں ساٹھ ہزار وحشی انسانوں کو لے کر نکلا۔ یہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہوکر اور تیر اور تلوار لئے ہوئے آبادیوں پر ٹوٹ پڑے اور تمام تمدنی نشانات کو برباد کر ڈالا۔ عراق، ایران، ترکستان ان کے قدموں کے نیچے زیر وزبر ہوگئے جہاں اس وقت کی طاقت ور ترین سلطنت قائم تھی۔ سارے عالم اسلام پر دہشت کا سناٹا چھا گیا۔ ۱۲۵۳ء میں چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو کی سرکردگی میں یہ طوفان دوبارہ اٹھا اور ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو بھی تہس نہس کر ڈالا جو عظیم مسلم خلافت کی بربادی کے بعد ابھرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ہم عصر مورخ ابن اثیر (م ۶۳۸ھ) کے الفاظ میں "اگر کوئی شخص کہے کہ آدم سے لے کر اب تک ایسا کوئی حادثہ دنیا میں پیش نہیں آیا تو اس کا کہنا غلط نہ ہوگا" ایک مغربی مورخ کے نزدیک یہ واقعہ اتنا ہولناک تھا کہ اس کے قلم سے یہ الفاظ نکلے:

"آسمان نے زمین پر گر کر تمام چیزوں کو مٹا دیا۔"

Jenghiz Khan, by Harold Lamb, P. 266

اس نازک وقت میں اسلام کی دعوتی طاقت ہی تھی جس نے تاتاریوں کے نہ رکنے والے سیلاب سے اسلام کو بچایا۔ تاتاری اپنی مفتوح رعایا کے ذریعہ اسلام سے متعارف ہونا شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ اسلام نے انھیں جیت لیا اور ان کی اکثریت نے اسلام قبول کرلیا۔ اسلام کے دشمن اسلام کے پاسبان بن گئے۔ یہ کام کن مسلمانوں کے ذریعہ انجام پایا۔ اس سلسلہ میں وقت کی قابل ذکر شخصیتوں کا نام تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتا۔ غالباً یہ واقعہ بھی اسی طرح ظہور میں آیا جس طرح موجودہ زمانہ میں قبول اسلام کے واقعات ظہور میں آرہے ہیں۔ آج مختلف ملکوں میں لوگ کثرت سے اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مگر ان نومسلموں تک اسلام کو پہنچانے کا کام اکابر کے ذریعہ نہیں ہو رہا ہے۔ یہ دراصل کچھ غیر معروف اصاغر ہیں جو خاموشی کے ساتھ دعوت دین کا کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح آٹھویں صدی ہجری میں تاتاریوں میں تبلیغ اسلام کا کام بھی غالباً کچھ غیر مشہور مسلمانوں کے ذریعہ انجام پایا۔ تاتاریوں کے سلسلے میں اسلام کی دعوتی قوت کا اعتراف عام طور پر مورخین نے کیا ہے۔ یہاں ہم دو غیر مسلم محققین کے اقتباسات نقل کرتے ہیں:

Although in after years this great empire was split up and the political power of Islam diminished, still its spiritual conquests went on uninterruptedly. When the Mongols hordes sacked Baghdad (AD 1258) and drowned in blood the faded glory of the Abbasid dynasty, Islam had just gained a footing in the island of Sumatra and was just about to commence its triumphant progress through the island of the Malay Archipelago. In the hours of its political degradation, Islam has achieved some of its most brilliant spiritual conquests: on two great historical occasions, infidel barbarians have set their feet on the necks of the followers of the Prophet the Saljuq Turks in the eleventh and the Mongols in the thirteenth century and in each case the conquerers have accepted the religion of the conquered.

T.W. Arnold, The Preaching of Islam (1896) P. 2

بعد کے سالوں میں اگرچہ یہ عظیم سلطنت ٹوٹ گئی اور اسلام کی سیاسی قوت کم ہوگئی۔ مگر اس کی روحانی فتوحات بغیر وقفہ کے برابر جاری رہیں۔ مغل قبائل نے جب ۱۲۵۸ء میں بغداد کو تباہ کیا اور عباسی خلافت کی شان و شوکت کو خون میں غرق کر دیا، اس وقت اسلام جزیرہ سماترا میں اپنی جگہ بنا چکا تھا اور جزائر ملایا میں اپنا فاتحانہ سفر شروع کر رہا تھا۔ اپنے سیاسی زوال کے زمانہ میں اسلام نے اپنی بعض انتہائی نمایاں روحانی فتوحات حاصل کی ہیں۔ دو بڑے مواقع پر کافر قبائل نے اپنے پاؤں محمد کے پیرودوں کی گردن پر رکھ دیے تھے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں سلجوق ترکوں نے اور تیرھویں صدی عیسوی میں مغلوں نے، مگر ہر بار فاتح نے اپنے مفتوح کے مذہب کو قبول کر لیا۔

Hard pressed between the mounted archers of the wild Mongols in the Fast and the mailed knights of the Crusaders on the West, Islam in the early part of the 13th century seemed for ever lost. How different was the situation in the last part of the same century, The last crusader had by that time been driven into the sea. The seventh of the Īl-Khans, many of whom had been flirting with Christianity, had finally recognised Islam as the state religion - A Dazzling victory for the faith of Mohammad. Just as in the case of the Seljuqs, the religion of the Muslims had conquered where their arms had failed. Less than half a century after Hulagu's merciless attempt at the destruction of Islamic culture, his great-grandson Ghazan, as a devout Muslim, was consecrating much time and energy to the revivification of the same culture.

History of the Arabs, The Macmillan press Ltd., London, 1968, P.488

مشرق میں وحشی منگولوں کے تیراندازوں کی یلغار اور مغرب میں زرہ پوش صلیبی سرداروں کے درمیان تیرھویں صدی عیسوی کے ابتدائی حصہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ مگر اسی صدی کے آخری حصہ میں صورت حال کتنی مختلف ہو چکی تھی۔ آخری صلیبی اس وقت سمندر میں دھکیلا جا چکا تھا۔ گیارہ تاتاری خانوں میں سے ساتویں خان نے، جن میں سے اکثر (کے یہاں عیسائی بیویاں تھیں اور) وہ عیسائیت کی طرف مائل تھے، بالآخر اسلام کو سرکاری مذہب کے طور پر تسلیم کر لیا۔ محمد کے مذہب کی یہ کیسی شاندار فتح تھی۔ بالکل سلجوقوں کے معاملہ کی طرح، مسلمانوں کے مذہب نے وہاں کامیابی حاصل کر لی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہو چکے تھے۔ ہلاکو کے ہاتھوں اسلامی تہذیب کی بے رحمانہ تباہی کے بعد نصف صدی سے بھی کم مدت میں اس کا پوتا غازان مسلمان ہو کر اسی تہذیب کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت اور قوت خرچ کر رہا تھا۔ (فلپ کے ہٹی)

ایک تاریخی سبق

تاتاریوں کا یہ قیامت خیز واقعہ امام تقی الدین ابن تیمیہ (۷۲۸ — ۶۶۱ھ) کے زمانہ میں ہوا۔ اسلام کی عظمت کو مٹتا ہوا دیکھ کر انھیں جوش آیا۔ امام ابن تیمیہ مجاہدانہ جذبہ کے تحت اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے شام و مصر کے مسلمانوں کو یہ نعرہ دیا کہ جنگ کا علاج جنگ ہے (الحرب النفی للحرب[۵]) وہ ۷۰۲ھ میں مصر کے سلطان الناصر کے ساتھ تاتاریوں سے جنگ کے لئے نکلے۔ ابتدائی طور پر انھیں تاتاریوں کے ایک دستہ کے مقابلہ میں کچھ فوجی کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر بالآخر تاتاری غالب رہے اور امام ابن تیمیہ کچھ دن دمشق کے قلعہ میں اور کچھ دن تدریس و تصنیف میں زندگی گزار کر اس دنیا سے چلے گئے۔

امام ابن تیمیہ تاتاریوں کے مسئلہ کو فوجی قوت سے ختم کرنا چاہتے تھے مگر وہ اس کو ختم نہ کر سکے۔ عین اس وقت اسلام کی دعوتی قوت ظاہر ہوئی اور اس نے تاتاریوں کے مسئلہ کو نہ صرف ختم کیا بلکہ ان کو اسی اسلام کا خادم بنا دیا جس کی جڑوں کو اکھاڑنے کے لئے وہ قسمیں کھا چکے تھے —— آٹھویں صدی ہجری کا یہ تجربہ مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے سبق دے رہا تھا کہ اسلام کی حفاظت اور اس کی سربلندی کے لئے انھیں کیا کرنا چاہئے۔ مگر عجیب بات ہے کہ مسلمانوں نے اس عظیم تاریخی واقعہ سے کوئی سبق نہیں لیا۔ موجودہ زمانہ میں دور جدید کے "تاتاریوں" کی طرف سے اسلام کے لئے مسائل پیدا ہوئے تو دوبارہ مسلمانوں کی پوری قیادت حملہ آوروں کے خلاف سیاسی جہاد میں مصروف ہو گئی۔ اس پوری مدت میں کوئی قابل ذکر شخص نظر نہیں آتا جو دعوتی جہاد کو جہاد سمجھے اور اس کے لئے سرگرم ہو۔

اسلام جدید دور میں

نپولین نے ۱۷۹۸ء میں مصر و شام پر حملہ کیا۔ اس سے دو سو سال پہلے سولھویں صدی عیسوی میں پرتگالی تاجر ہندستان اور دوسرے ایشیائی ملکوں میں داخل ہو چکے تھے۔ اس کے بعد دوسری مغربی قومیں آئیں۔ اس طرح پچھلی چند صدیوں میں پرتگال، ہالینڈ، فرانس اور برطانیہ نے پوری مسلم دنیا پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اولاً برصغیر ہند کی مغل سلطنت اور اس کے بعد ترکی کی عظیم عثمانی خلافت ختم ہو گئی۔ موجودہ صدی میں اگرچہ سیاسی استعمار ختم ہو چکا ہے مگر تکنکی استعمار کی صورت میں مغرب اب بھی پوری طرح مسلم دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ دفاعی ہتھیاروں کی خریداری سے لے کر قرآن مقدس کی طباعت و اشاعت تک تمام کاموں کے لئے مسلمان انھیں مغربی قوموں کے دست نگر ہیں۔

---

۵ محمود مہدی الاستانبولی، ابن تیمیہ بطل الاصلاح الدینی، مکتبہ دار المعرفۃ، دمشق، ۱۳۹۷ھ، صفحہ ۳۶

مغربی تسلط کا مسئلہ پیدا ہوتے ہی پوری مسلم دنیا میں اس کے خلاف تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں اور اب بھی بدستور جاری ہیں۔ پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کے درمیان جتنی بھی تحریکیں اٹھی ہیں سب کے پیچھے اصل قوت محرکہ یہی اجنبی تسلط کا مسئلہ نظر آتا ہے۔ یہ تحریکیں بظاہر ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔ مگر ایک چیز سب میں مشترک ہے۔ سب کا طرز فکر بنیادی طور پر سیاسی ہے۔ ان سب کو ایک عنوان کے تحت جمع کرنا ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کا مقصد اجنبی اقوام کے پیدا کردہ مسائل کا سیاسی حل تلاش کرنا تھا۔

یہ تحریکیں تقریباً بلا استثنا صدفی صد ناکام رہیں۔ جان و مال کی بے پناہ قربانیوں کے باوجود ان کا کوئی حقیقی حاصل مسلمانوں کے حصہ میں نہیں آیا ——— مسلمانوں کے عالمی سیاسی اتحاد کے لئے اتحاد اسلامی (پان اسلام ازم) کی تحریک چلائی گئی۔ مگر اس کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ عثمانی خلافت اور مغل سلطنت دونوں ٹوٹ گئیں اور ان کے زیر حکومت علاقے درجنوں الگ الگ مسلم خطے میں بٹ گئے۔ مسلمانوں نے مغرب کے سیاسی استعمار سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے بے شمار جانیں قربان کیں اور بے حساب مال لٹادیا مگر عملاً صرف یہ ہوا کہ سیاسی استعمار ختم ہو کر سائنسی اور تکنکی استعمار ان کے اوپر مسلط ہو گیا۔ مسلمانوں نے اجنبی محکومی سے نجات پانے کے لئے اپنی ساری طاقت لگا دی مگر جب اجنبی محکومی ختم ہوئی تو خود اپنے ملک کے ملحدوں اور باغیوں کی محکومی ان کے اوپر قائم ہو چکی تھی۔ مسلمانوں نے ایک اسلامستان بنانے کے لئے تاریخ کی سب سے بڑی قربانی دی۔ مگر جب وہ بنا تو صرف یہ ہوا کہ ایک واحد ملک کے مسلمان کئی چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تقسیم ہو گئے ـــــ فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کے سوال پر ساری مسلم دنیا ایک ہو گئی اور اس کے لئے وہ سب کچھ کر ڈالا جو ان کے بس میں تھا۔ مگر اسرائیل کا حال یہ ہے کہ اس کی طاقت اور رقبہ میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے جس جس میدان میں بھی کوشش کی ہے ہر میدان میں انھوں نے صرف کھویا ہے، انھوں نے کچھ بھی حاصل نہیں کیا ہے۔ بائبل کے نبی حجیؔ کے الفاظ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "مزدور اپنی مزدوری سوراخ دار تھیلی میں جمع کر رہا ہے" مگر اس عمومی محرومی کی فضا میں حیرت انگیز طور پر ایک ایسا میدان موجود ہے جہاں اسلام اپنے آپ پیش قدمی کر رہا ہے۔ جب کہ بقیہ میدانوں میں بے شمار کوششیں اور قربانیاں بھی کوئی نتیجہ پیدا کرنے میں ناکام ہیں، یہاں کسی قابل ذکر کوشش کے بغیر اپنے آپ مفید نتیجہ ظاہر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

یہ میدان اسلام کی اشاعت کا میدان ہے۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں اسلام کو غیر مسلموں تک پہنچانے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ تقریباً ساری دنیا میں اسلام اپنے آپ غیر مسلم

قوموں میں پھیلتا جا رہا ہے — ہندستان میں ہریجن عمومی پیمانہ پر اسلام قبول کر رہے ہیں - جاپان میں سنجیدہ طبقہ بہت تیزی سے اسلام کی طرف مائل ہو رہا ہے - امریکہ میں کالی نسل کے لوگ کثرت سے اسلام قبول کر رہے ہیں - افریقہ کے پس ماندہ قبائل ہر دن ہزاروں کی تعداد میں اسلام کے دائرہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ وغیرہ۔ اسلام کی یہ لہر صرف نچلے طبقات تک محدود نہیں ہے۔ موجودہ زمانہ میں تقریباً ہر ملک میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اونچی حیثیت کے لوگوں نے بھی اسلام قبول کیا ہے، اور یہ سب کچھ مسلمانوں کی کسی کوشش کے بغیر اپنے آپ ہو رہا ہے۔

مواقع انتظار کرتے رہے

۱۹ویں صدی کے نصف ثانی اور ۲۰ ویں صدی کے نصف اول میں جب کہ مسلم قائدین انتہائی بے فائدہ طور پر سیاست کی چٹان سے اپنا سر ٹکرا رہے تھے، متعدد ایسے نمایاں واقعات ظہور میں آئے جو کھلا ہوا اشارہ دے رہے تھے کہ کرنے کا کام دعوت و تبلیغ ہے نہ کہ حکمرانوں سے سیاسی تصادم۔ نمونہ کے طور پر ایک واقعہ ملاحظہ ہو:

كان ميكادو اليابان قد ارسل فى زمن وجود السيد بالاستانه (١٨٩١) كتابا الى السلطان عبد الحميد يطلب فيه مودته ويقول: ان كلا منا ملك شرقى، ومن مصلحتنا ومصلحة شعوبنا ان نتعارف ونتزاور وتكون الصلات بيننا قوية تجاه الدول والشعوب الغربية التى تنظر الينا بعين واحدة. اننى ارى شعوب الغرب يرسلون الى بلادنا دعاة الى دينهم لحرية الدين عندنا ولا اراكم تفعلون ذلك، فانا احب ان ترسلوا الينا دعاة يدعون الى دينكم (الاسلام) ويمكن ان يكون هولاء صلة معنوية بيننا وبينكم (صفحہ ۳۲)

محمود ابوریہ۔ جمال الدین افغانی، لجنۃ التعریف بالاسلام، القاہرہ، ۱۳۸۶ھ

۱۸۹۱ میں جب کہ سید جمال الدین افغانی آستانہ (ترکی) میں تھے، جاپان کے شہنشاہ میجی (۱۹۱۲ - ۱۸۶۸) نے سلطان عبد الحمید ثانی کے پاس ایک خط بھیجا۔ اس خط میں اس نے دوستی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا: ہم دونوں مشرقی بادشاہ ہیں۔ ہماری مصلحت اور ہماری قوم کی مصلحت یہ ہے کہ ہم باہم متعارف ہوں اور ملیں جلیں۔ اور ہمارے درمیان مضبوط رشتہ ہو تاکہ ہم مغربی قوموں اور سلطنتوں کا مقابلہ کر سکیں جو ہم سب کو ایک نظر سے دیکھتی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ مغربی قومیں ہمارے ملک میں اپنے دینی مبلغ بھیج رہی ہیں کیونکہ ہمارے ملک میں مذہبی آزادی ہے۔ مگر میں نہیں دیکھتا کہ آپ بھی ایسا کرتے ہوں۔ میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ آپ بھی جاپان میں ایسے لوگ بھیجیں جو یہاں آپ کے دین اسلام کی تبلیغ کریں۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح ہمارے اور آپ کے درمیان مضبوط معنوی رشتہ قائم ہو جائے۔

شہنشاہ جاپان کا یہ خط جب ترکی کے دارالسلطنت پہنچا، اس وقت سید جمال الدین افغانی اور دوسرے بڑے بڑے علماء اور اکابر وہاں موجود تھے۔ سلطان عبد الحمید ثانی نے ان لوگوں کو جمع کر کے شہنشاہ جاپان کا

خط دکھایا مگر کسی نے اس میں کوئی خاص دل چسپی نہ لی۔ جاپان کا سرکاری قاصد رسمی شکریہ کا جواب لے کر واپس چلا گیا۔

قریبی ماضی میں اس طرح کے عظیم مواقع کو استعمال نہ کرنے کی وجہ صرف ایک تھی، دعوتی کام کی اہمیت سے مسلمانوں کا غافل ہونا۔ لوگ بطور خود جن سیاسی یا غیر سیاسی سرگرمیوں میں مصروف تھے بس اسی کو وہ کام سمجھتے رہے۔ اور غیر مسلموں میں تبلیغ ودعوت کے کام کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ حتٰی کہ اس وقت بھی جب کہ غیر مسلموں کا قافلہ خود ان کے یہاں آکر ان کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

خدائی فیصلہ

انیسویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں برطانیہ کے شاہی خاندان کے ایک فرد لارڈ ہیڈلے فاروق نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ بیسویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں گابون (افریقہ) کے صدر مملکت محمد عمر بانگو نے اسلام کو اپنا دین بنانے کا اعلان کیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسی طرح غیر مسلم اقوام کے لاکھوں لوگ اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر اسلام کے دائرہ میں داخل ہوتے رہے ہیں۔ ان میں نہ صرف عوام ہیں بلکہ تاجر، ڈاکٹر، انجینئر، اہل علم اور سرکاری عہدہ دار جیسے لوگ بھی کثیر تعداد میں شامل ہیں۔ ہندستان میں مسلمانوں کی انتہائی نادان سیاست کے نتیجہ میں اسلام اور مسلمان سخت مغلوبیت کی حالت میں پہنچ گئے تھے، اچانک اسلام کی دعوتی قوت نے اپنا کرشمہ دکھایا اور یہاں کے پس ماندہ طبقات نے عمومی پیمانہ پر اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ یہ واقعہ کتنا عظیم ہے۔ اس کا اندازہ ایک اقتباس سے ہوگا۔ مسٹر کرشنا دھن سردار (رامیشور پور، مغربی بنگال) اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ہندو دوسرے جنم میں عقیدہ رکھتے ہیں۔ اور ہندوازم کا نیا جنم عمومی طور پر اسلام قبول کرنے کی صورت میں فروری کے وسط میں تامل ناڈو میں شروع ہوگیا ہے:

Hindus believe in re-birth and the re-birth of Hinduism has taken place in Meenakshipuram (Tamil Nadu) in the middle of February (1981) in the form of mass conversion to Islam.

Radiance Weekly, August 9, 1981

اس قسم کے واقعات جو دنیا بھر میں ہو رہے ہیں وہ مسلمانوں کی تمام موجودہ تحریکوں کو خدا کی نظر میں بے اعتبار (Discredit) ٹھہرانے کے ہم معنی ہیں۔ مسلمان جن میدانوں میں جان ومال کی قربانی دے کر اپنا مستقبل تلاش کرتے رہے وہاں سے کسی بھی درجہ میں مطلوبہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ ان میدانوں میں ان کی کوششیں حبطِ اعمال کا مصداق بنتی رہیں۔ دوسری طرف وہ میدان جہاں جدید مسلم قیادت نے دنیا بھر میں کہیں سرے سے کوئی کوشش ہی نہ کی تھی وہاں اپنے آپ لہلہاتی ہوئی فصل نکلی چلی آرہی ہے۔ اس طرح خدا بتا رہا ہے کہ تم جن مقامات پر میری مدد تلاش کر رہے ہو وہاں مجھے مدد دینا مطلوب ہی نہیں ہے۔ یہ زمین

وہ زمین ہی نہیں جہاں میرے انعامات کی فصل اگتی ہو۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میری وہ مدد تمھیں حاصل ہو جس سے بند دروازے کھلتے ہیں اور چٹانیں اپنی جگہ سے کھسکنے لگتی ہیں تو تم دعوت کی زمین میں اپنی کوششیں صرف کرو جس کو میں نے اتنا زرخیز بنایا ہے کہ کسی عمل کے بغیر ہی اس کے اندر سے شاندار فصل نکلی چلی آرہی ہے۔

خدا ہم کو دعوت و تبلیغ کے میدان میں سرگرم ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر مسلمان قدرت کے اس اشارہ کو سمجھیں اور اپنی کوششوں کو غیر مسلموں کے درمیان دعوت الی اللہ کے کام میں لگادیں تو موجودہ نتائج کی رفتار کئی گنا بڑھ جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ موجودہ نسل ہی میں غلبۂ اسلام کا وہ خواب پورا ہو جائے جس کی تعبیر ہم صدیوں سے دوسرے میدانوں میں تلاش کر رہے ہیں مگر وہ کسی طرح پورا نہیں ہوتا۔

عبرتناک منظر

مغرب کے مشہور مفکر جارج برنارڈ شا (۱۹۵۰ – ۱۸۵۶) نے کہا تھا کہ اگر کوئی مذہب ہے جو اگلے سو سال میں انگلستان پر حکومت کرے، نہیں بلکہ سارے یورپ پر حکومت کرے تو وہ صرف اسلام ہوگا۔ میں نے محمد کے مذہب کو ہمیشہ بڑی قدر کی نظر سے دیکھا ہے۔ کیونکہ اس کے اندر حیرت انگیز طاقت ہے۔ یہ واحد مذہب ہے جس کے متعلق میرا خیال ہے کہ اس کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ بدلتی ہوئی دنیا کو اپنے اندر جذب کر سکے، جس کے اندر ہر دور کے لئے اپیل ہے:

> If any religion has the chance of ruling over England, nay Europe, within the next hundred years, it can only be Islam. I have always held the religion of Muhammad in high estimation because of its wonderful vitality. It is the only religion which appears to me to possess the assimilating capability to the changing face of existance, which can make its apeal to every age.

ہندستان کے مشہور ہندو مفکر سوامی ویویکانند (۱۹۰۲ – ۱۸۶۳) نے لکھا تھا کہ ادویتا واد مذہب اور فکر کی دنیا میں آخری لفظ ہے اور واحد پوزیشن ہے جہاں سے ایک شخص تمام مذاہب اور فرقوں کو محبت کی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ تاہم عملی ادویتا واد جو تمام انسانیت کو خود اپنی طرح دیکھتی ہے اور اپنوں کا سا سلوک کرتی ہے، کبھی ہندوؤں میں پیدا نہ ہو سکی۔ دوسری طرف میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی مذہب قابل لحاظ حد تک اس مساوات کو پہنچا ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اسی لئے میں قطعی طور پر یہ خیال رکھتا ہوں کہ عملی اسلام کی مدد کے بغیر ویدانت کے نظریات بالکل ہی بے قیمت ہیں۔ ہمارے مادر وطن (ہندستان) کے لئے جو دو عظیم نظامات، ہندو ازم اور اسلام کا مقام اتحاد ہے، ویدانت کا دماغ اور اسلام کا جسم ہی واحد امید ہے۔ میں اپنے تصور کی نگاہ سے دیکھ رہا ہوں کہ مستقبل کا معیاری ہندستان موجودہ انتشار اور اختلاف سے نکل کر شاندار اور غیر مفتوح بن رہا ہے، اور یہ ویدانت کے دماغ اور

اسلام کے جسم کے ذریعہ ہو رہا ہے :

I see in my mind's eye the future perfect India rising out of this chaos and strive, glorious and invincible, with Vedanta brain and Islam body.

Letters of Swami Vivikanand (1970) P.453

کیسی عجیب بات ہے۔ جدید انسان کو جہاں اپنی زندگی کی کہانی اسلام کے بغیر نامکمل دکھائی دیتی ہے، وہاں ہمیں کرنے کا کوئی کام نظر نہیں آتا۔ اور جہاں جدید انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسلام کے بغیر اس کی کہانی آخری حد تک مکمل ہے، وہاں ہم اس کی پتھریلی دیوار سے اپنا سر ٹکرا رہے ہیں۔ اس سے زیادہ عبرتناک منظر شاید آسمان نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہی واحد امید ہے، دنیا کی بھی اور خود مسلمانوں کی بھی۔ دنیا اپنی تمام ترقیوں کے باوجود، اس لئے بے چین ہے کہ اس کو مالک کائنات کی سچی رہنمائی حاصل نہیں۔ مسلمان اس لئے برباد ہیں کہ ان کے ذمہ خدا کی سچائی کو دوسروں تک پہنچانے کا کام سپرد کیا گیا تھا اور اس کو انھوں نے چھوڑ دیا۔ بقیہ دنیا حق سے محرومی کی سزا بھگت رہی ہے اور مسلمان حق سے غفلت کی۔ یہ صورت حال اس وقت تک باقی رہے گی جب تک مسلمان حق کے داعی بن کر کھڑے نہ ہوں۔ دوسرے کاموں میں مشغول ہونا یا دوسرے کاموں کو دعوت و تبلیغ کا نام دینا صرف ان کے جرم میں اضافہ کرتا ہے، نہ کہ وہ انھیں خدا کی رحمتوں کا مستحق بنائے — مسلمان اگر دعوت الی اللہ کا کام کریں تو ان کے لئے اس دنیا میں سب کچھ ہے۔ اور اگر وہ اس مطلوبہ کام کے لئے نہ اٹھیں تو خدا کی اس دنیا میں ان کے لئے کچھ نہیں۔

آسٹریلیا کی ایک مسیحی خاتون نے اپنی کتاب میں اسلام کا تعارف کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے :

This is the passing glimpse of Islam. And it has much to offer to our restless world. But it seems to be an abandoned treasure, abandoned by those who bear its name. No wonder their lives are so different from the glory I described. And unless they return back to it again, they will remain in bewilderment in the re~r of humanity's procession. For it is remedy, light and guidance from God, for them and for the world. (P.44)

Dr Cheris Wady, The Muslim Mind, Macmillan Co. Ltd. Bombay

یہ اسلام کا ایک سرسری خاکہ ہے۔ اور اس میں ہماری بے چین دنیا کے لئے بہت کچھ ہے۔ مگر یہ بظاہر ایک چھوڑا ہوا خزانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کو ان لوگوں نے چھوڑ رکھا ہے جو اس کا نام لیتے ہیں۔ یہ تعجب کی بات نہیں کہ ان کی زندگیاں اس عظمت سے بہت مختلف ہیں جو میں نے بیان کیا۔ اور جب تک وہ دوبارہ اس اسلام کی طرف واپس نہ ہوں وہ حیران و پریشان انسانیت کے قافلہ سے بچھڑے ہی رہیں گے۔ کیونکہ خدا کی طرف سے یہی ایک علاج اور روشنی اور رہنمائی ہے ان کے لئے بھی اور ساری دنیا کے لئے بھی۔

اوپر ہم نے قرآن کے اس ارشاد کا تاریخی مطالعہ کیا ہے کہ عصمت من الناس کا راز تبلیغ ما انزل اللہ میں ہے (مائدہ ۶۷) یہ بات جب پہلی بار پیغمبر کی زبان پر جاری کی گئی تو وہ واقعات سامنے نہیں آئے تھے جن کا اوپر ذکر ہوا۔ یہ تاریخ ابھی مستقبل کے پردہ میں چھپی ہوئی تھی۔ ایسے وقت میں ان الفاظ پر یقین لانا اور اس کی راہ میں اپنے جان و مال کو وقف کرنا بلاشبہ مشکل ترین کام تھا۔ تاریخ کو اس کے اختتام پر دیکھنا جتنا آسان ہے، تاریخ کو اس کے آغاز پر دیکھنا اتنا ہی زیادہ مشکل ہے۔ دور اول کے مسلمانوں نے تاریخ کے مشکل ترین کام کو انجام دیا۔ انھوں نے واقعہ کے ظہور میں آنے سے پہلے واقعہ کو دیکھا اور اس کی خاطر مطلوبہ عمل کیا۔ اس کے مقابلہ میں ہمارے حصہ میں تاریخ کا آسان ترین کام آیا تھا۔ ایک اصول کے تاریخی واقعہ بن جانے کے بعد ہمیں اپنی زندگیوں میں اسے دہرانا تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ ہمارے پیش رو تو مشکل ترین امتحان میں پورے اترے اور ہم آسان ترین امتحان میں بھی ناکام ہو گئے۔

بے شک اللہ انکار کرنے والوں کو راستہ نہیں دکھاتا (مائدہ ۶۷) اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ مسلمان اگر خدا کے بتائے ہوئے اصول پر دعوت الی اللہ کا کام کریں تو خدا ان کے مخالفین کو ایسا اندھا کر دے گا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف کوئی مؤثر منصوبہ بندی نہ کر سکیں اور ان کو برباد کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہوں۔ تاہم دوسرے پہلو کے اعتبار سے اس کا تعلق خود داعی سے بھی ہے۔ اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی طرف سے مسئلہ کی وضاحت کے بعد اگر مسلمان اس کو نہ مانیں اور اس طریقہ کو چھوڑ کر وہ اپنے تحفظ اور احیاء کے لئے دوسرے راستوں میں محنت کریں تو خدا ان کی محنتوں کو بار آور ہونے نہ دے گا۔ وہ ان کو کامیابی کے رخ پر نہیں چلائے گا۔ ان کی بڑی بڑی کوششیں بھی عملاً بے نتیجہ ہو کر رہ جائیں گی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آج مسلمانوں کی کوششوں کے ساتھ یہی کچھ پیش آیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اپنے احیاء کے لئے جان و مال کی بے حساب قربانیاں دیں مگر ان کی تمام قربانیاں بالکل لاحاصل ہو کر رہ گئیں۔ حضرت مسیح سے پہلے نبی حجّی نے جو کچھ یہود کے بارے میں کہا تھا وہ آج پوری طرح مسلمانوں کے اوپر چسپاں ہو رہا ہے ——— تم نے بہت سا بویا پر تھوڑا کاٹا۔ تم کھاتے ہو پر آسودہ نہیں ہوتے۔ تم پیتے ہو پر پیاس نہیں بجھتی۔ اور مزدور اپنی مزدوری سوراخ دار تھیلی میں جمع کرتا ہے۔ تم نے بہت کی امید رکھی اور تم کو تھوڑا ملا اور جب تم اپنے گھر میں لائے تو میں نے اسے اڑا دیا۔

مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں بڑی بڑی تحریکیں اٹھائیں۔ مگر خدا نے ان کے "کھلیان" کو ہوا میں اڑا دیا۔ یہ خدائی تنبیہ اگر مسلمانوں کے لئے کافی نہیں تو اس کے بعد ان کی بیداری کے لئے صور اسرافیل کا انتظار کرنا چاہیے۔

ضابطۂ فطرت

خدا نے جتنی چیزیں پیدا کی ہیں ان کی کارکردگی کا اس نے ایک پیمانہ مقرر کر دیا ہے۔ ہر چیز ٹھیک اسی پیمانہ کے مطابق اپنا عمل کرتی ہے (الفرقان ۲) سورج، چاند اور ستاروں کی گردش کے نہایت محکم ضابطے ہیں اور ایک لمحہ کے فرق کے بغیر وہ ٹھیک اسی کے مطابق اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں (یٰس ۳۹) ایک عورت کے پیٹ میں بچہ کی پرورش کا آغاز ہوتا ہے، وہ اس کے اندر دھیرے دھیرے بڑھتا ہے اور بالآخر ایک مکمل انسان کی صورت میں تیار ہو کر ایک متعین وقت پر باہر آجاتا ہے۔ اسی طرح ہر چیز کے لئے خدا کے یہاں ایک مقدار مقرر ہے (کل شیٔ عندہ بمقدار ۔ الرعد ۸) اسی ضابطہ بندی کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ ہر چیز کا سفر اس طرح جاری رہے کہ دوسرے سے ٹکرائے بغیر وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے (لا الشمس ینبغی لہا ان تدرک القمر ولا اللیل سابق النہار کل فی فلک یسبحون، یٰس ۴۰)۔

یہ اصول صرف ان چیزوں کے متعلق نہیں ہے جہاں خدا کے براہ راست حکم کے تحت کوئی نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔ ٹھیک یہی اصول ان انسانی معاملات میں بھی ہے جہاں انسان کی اپنی کوششوں سے واقعات ظہور میں آتے ہیں۔

انسانی واقعات کے لئے مقرر ضابطہ

قدیم عربوں میں یہ رواج تھا کہ جب بھی کسی کو اپنی بیوی پر غصہ آیا، فوراً اس نے تین طلاق بلکہ سو طلاق دے دی اور اس کے بعد ہی عورت کو گھر سے نکال دیا۔ اس کے نتیجہ میں بے شمار ذاتی، خاندانی اور سماجی مسائل پیدا ہوتے تھے۔ قرآن میں یہ اصول مقرر کیا گیا کہ جس کو طلاق دینا ہو وہ عدت کے حساب سے طلاق دے اور اس عدت کا اہتمام کے ساتھ شمار کرے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دو طہروں کے اندر دو مہینوں میں ایک ایک بار طلاق دے۔ پھر تیسرے مہینہ کے تیسرے طہر میں اگر چاہے تو رجوع کرے اور چاہے تو دستور کے مطابق طلاق کو مکمل کر کے عورت کو رخصت کر دے۔ اس طرح ایک ناخوش گوار واقعہ، کوئی مزید خرابی پیدا کئے بغیر، اپنی فطری ترتیب سے آخری نوبت کو پہنچ جاتا ہے۔ نیز اس غیر عاجلانہ طریقہ کا یہ فائدہ بھی ہے کہ عورت اگر حاملہ ہے تو اس دوران میں اس کا حمل معلوم ہو جائے گا اور اس کی عدت وضع حمل تک مقرر کی جا سکے گی تاکہ جو شخص اس کے حمل کا سبب بنا ہے اس کے خرچ پر وہ اس کے گھر رہ کر وضع حمل کی مدت پوری کر سکے۔

جلد بازی کے بجائے اس طرح صبر اور انتظار کے اصول پر عمل کرنے کے بہت سے فائدے ہیں۔ اس دوران میں ہر دو فریق کے لئے ایسے نئے امکانات کھل جاتے ہیں جن کا ابتدائی وقت میں اندازہ نہیں کیا

جاسکتا تھا۔ اس طرح ایک خاندانی واقعہ اپنی فطری رفتار سے اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے کوئی غیر ضروری قسم کی پیچیدگی بھی پیدا نہیں ہوتی۔ عمل کا یہ انداز قرآن کے الفاظ میں بالغ الامر انداز ہے:

ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ ان اللہ بالغ امرہ قد جعل اللہ لکل شئ قدرا	اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے تو اللہ اس کے لئے کافی ہے۔ اللہ اپنے امر کو پورا کر کے رہتا ہے، اللہ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ ٹھہرا رکھا ہے۔
(الطلاق ۳)	

یعنی جو شخص خدا کے مقرر کئے ہوئے طریقہ کو صحیح ترین طریقہ سمجھ کر اس پر اعتماد کرے گا اور صبر و انتظار کی تلخیوں کے باوجود اس کی پیروی میں اپنے معاملات انجام دے گا تو اس کی یہ روش اس کے معاملات کے حسن تکمیل کی ضمانت بن جائے گی۔ خدا تمام چیزوں سے آخری حد تک باخبر ہے اور اس نے انسان کے لئے کارکردگی کا جو ضابطہ طے کیا ہے اس میں تمام پہلوؤں کی کامل رعایت شامل ہے۔ اس نے اپنے علم کلی کے تحت ہر چیز کے عملدرآمد کا ایک انتہائی درست نظام مقرر کر دیا ہے۔ خدا کی اس دنیا میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جو اس مقررہ نظام کی کامل پابندی کرے۔

خاموش تدبیر

قرآن میں کائناتی واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے: اللہ ہر کام کا انتظام کر رہا ہے اور وہ نشانیوں کو کھول کر بیان کرتا ہے (یدبر الامر یفصل الآیات، الرعد ۲) یعنی قرآن اور کائنات دونوں ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ قرآن میں جو باتیں بتائی گئی ہیں وہ وہی ہیں جن پر خدا نے کائنات کو بالفعل قائم کر رکھا ہے۔ کائنات قرآن کی عملی تصدیق ہے۔ اس بات کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ قرآن جس ربانی حقیقت کا لفظی بیان ہے، بقیہ کائنات اسی کا عملی مظاہرہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ اہل باطل کے مقابلہ میں اہل حق مضبوط بنیادوں پر اپنی تعمیر کریں۔ وہ اپنے وقت، اپنے مال اور اپنے طاقت ور کردار سے خدا کے دین کی عمارت کو اتنا مستحکم کر دیں کہ خدا کے دشمن اس کو ہلا نہ سکیں۔ خدا اپنے دین کو زمین پر غالب و سربلند دیکھنا چاہتا ہے اور یہ کام اہل ایمان کی جد و جہد اور قربانیوں ہی کے ذریعہ انجام پا سکتا ہے۔ قرآن میں ایک مثال مکڑی کے گھر کی دی گئی ہے (وان اوھن البیوت لبیت العنکبوت، عنکبوت) دوسری مثال لوہے کی ہے (وانزلنا الحدید فیہ بأس شدید، الحدید) بیت العنکبوت معمولی جھٹکے کو بھی سہار نہیں سکتا۔ مگر بیت الحدید کے مقابلہ میں بڑے بڑے طوفان بھی بے اثر ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرح خدا نے دو عملی مثالوں کے ذریعہ بتایا کہ تم اپنے دین کا گھر مکڑی کے گھر کی طرح نہ بناؤ بلکہ لوہے کے گھر کی طرح بناؤ۔

مضبوط اور یقینی تعمیر کے لئے خدا کا جو طریقہ ہے اس کا اہم پہلو یہ ہے کہ خاموش تدبیر کے ذریعہ دشمن کو بے زور کر دیا جائے اور اس کی جگہ حق کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا جائے۔ اس اصول کی وضاحت کے لئے یہاں دو آیتیں نقل کی جاتی ہیں:

قد مکرالذین من قبلھم فاتی اللہ بنیانھم من القواعد فخر علیھم السقف من فوقھم و اتاھم العذاب من حیث لا یشعرون (النحل ۱۶)

ان سے پہلے والوں نے تدبیریں کیں۔ پھر اللہ ان کی عمارت پر بنیادوں سے آگیا۔ پھر ان کی چھت اوپر سے ان پر گر پڑی اور ان پر عذاب وہاں سے آیا جہاں سے ان کو خیال بھی نہ تھا

ھوالذی اخرج الذین کفروا من اھل الکتاب من دیارھم لاول الحشر ماظننتم ان یخرجوا و ظنوا انھم مانعتھم حصونھم من اللہ فاتاھم اللہ من حیث لم یحتسبوا وقذف فی قلوبھم الرعب یخربون بیوتھم بایدیھم وایدی المومنین فاعتبروا یا اولی الابصار (الحشر ۲)

وہ اللہ ہی ہے جس نے اہل کتاب میں سے منکروں کو ان کے گھروں سے نکال دیا اول حشر پر۔ تمھارا گمان نہ تھا کہ وہ نکلیں گے اور وہ خیال کرتے تھے کہ ان کے قلعے ان کو اللہ سے بچانے والے ثابت ہوں گے۔ پھر اللہ ان پر وہاں سے آگیا جہاں سے ان کو خیال نہ تھا۔ اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ وہ اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں سے اجاڑنے لگے۔ اے آنکھ والو عبرت پکڑو

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ خاموشی کے ساتھ دشمن کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا جائے۔ یہ عمل اپنی تکمیل تک اس طرح جاری رہے کہ دشمن کو خبر نہ ہو اور اچانک ایک روز اس کی پوری چھت اس کے سامنے گر پڑے۔

خدائی طریق کار کے بارے میں قرآن میں کچھ مثالیں دی گئی ہیں۔ تاہم یہ علامتی مثالیں ہیں۔ وہ اس لئے ہیں تاکہ ہم خدائی حکمت کو سمجھ جائیں اور دنیا میں اس طرح زندگی گزاریں کہ چاروں طرف بکھری ہوئی نشانیوں سے سبق لیتے رہیں۔

مثال کے طور پر دیمک کو دیکھئے۔ دیمک انسان کا ایک دشمن کیڑا ہے۔ دیمک چیونٹی کی طرح چھوٹا ہونے کے علاوہ اتنا نازک ہوتا ہے کہ کھلی ہوا یا دھوپ میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مٹی کی نالی بنا کر چلتا ہے۔ اس کمزوری کے باوجود دیمک ہمیشہ انسان کو نقصان پہنچانے میں کامیاب رہتا ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ دیمک اتنی خاموشی کے ساتھ اپنا عمل کرتا ہے کہ انسان کو صرف اس وقت اس کی خبر ہوتی ہے جبکہ وہ اپنا کام کر چکا ہو۔

آپ کے کمرہ کا دروازہ اگر لکڑی کا ہے تو اس کے بازوؤں میں نہایت خاموشی کے ساتھ دیمک داخل

ہو جائے گی۔ وہ اندر ہی اندر لکڑی کو کھانا شروع کرے گی۔ بازوؤں کے اوپر آپ نے جو خوبصورت پالش کرا رکھی ہے اس کو کاغذ کی طرح چھوڑ دے گی۔ مزید یہ کہ وہ لکڑی کا جتنا حصہ کھائے گی اتنا ہی اس کے اندر مٹی بھرتی چلی جائے گی۔ اس طرح دیمک پوری لکڑی کھا ڈالے گی اور آپ کو اس کی خبر نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ وہ لکڑی کی اوپری پرت کو چھوڑ کر صرف اس کا اندرونی حصہ کھا رہی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ کھائے ہوئے حصہ میں مٹی بھرتی جاتی ہے جس کی وجہ سے لکڑی پولی نہیں ہوتی اور بدستور کھڑی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ دیمک جب پورے بازو کو کھا جاتی ہے تو ایک روز آپ کا دروازہ بے جان ہو کر گر پڑتا ہے۔

دوسری طرف اسی دنیا میں ایک اور مثال ہے۔ یہ کتے کی مثال ہے۔ کتا بھی انسان کو کاٹنا چاہتا ہے۔ مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ آدمی کو کاٹ پائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتا آدمی کو دیکھ کر دور ہی سے بھونکنا شروع کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی چوکنا ہو کر اپنے بچاؤ کا انتظام کر لیتا ہے ——— دیمک اپنے مقصد میں ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے اور کتا اپنے مقصد میں ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔ کتے کے حصہ میں صرف بھونکنا آتا ہے اور دیمک کے حصہ میں اپنے منصوبہ کو آخری حد تک مکمل کرنا۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ دیمک خاموش تدبیر کے ذریعہ اپنا کام کرتا ہے۔ اور کتا شور وغل کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ اس طرح خدا دو زندہ نمونوں کے ذریعہ دکھا رہا ہے کہ اس دنیا میں کامیابی کا طریقہ کیا ہے اور ناکامی کا طریقہ کیا۔

غیر عاجلانہ طریقہ

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان بے صبر اور جلد باز واقع ہوا ہے (بنی اسرائیل ۱۱) بلکہ جلد بازی ہی انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے (انبیاء ۳۷) صحیح طریقہ یہ بتایا گیا کہ اولوالعزمی کے ساتھ صبر و انتظار کا طریقہ اختیار کیا جائے، جلد نتیجہ دیکھنے کی خواہش نہ کی جائے (الاحقاف ۳۵) جلد بازی یہ ہے کہ کسی حاصل کو پانے کے لئے جو ابتدائی شرائط ضروری ہیں ان کی تکمیل کے بغیر قبل از وقت اس کو پانے کی کوشش کرنا۔ مثلاً چنار کا درخت اگر قدرتی طور پر سو سال میں مکمل ہوتا ہے تو آدمی یہ چاہے کہ وہ صرف چند سال میں مکمل درخت بن کر اس کے لئے کھڑا ہو جائے۔ اس قسم کی جلد بازی اس دنیا میں ممکن نہیں۔ انسان کو یہ اختیار ضرور ملا ہوا ہے کہ وہ جلد بازی کا طریقہ اختیار کر کے اپنے وقت اور قوت کو ضائع کرتا رہے مگر خدا کے یہاں کسی واقعہ کے ظہور کے لئے جو فطری مدت مقرر ہے اس کو بدلنا کسی کے لئے ممکن نہیں۔

یہ ضابطہ اتنا محکم ہے کہ اس میں پیغمبر تک کا کوئی استثناء نہیں، کسی واقعہ کے ظہور کے لئے وقت کی جو حد ہے اور کسی مقصود تک پہنچنے کے لئے جو طریقہ مقرر ہے، اس کی خلاف ورزی لازمی طور پر نقصان کا سبب بنے گی، خواہ یہ خلاف ورزی پیغمبر کی طرف سے ہوئی ہو۔

اس سلسلے میں ایک واضح مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہے۔ حضرت موسیٰ اپنی قوم کے ساتھ جب صحرائے سینا میں پہنچے تو خدا نے ان کے لئے ایک ماہ کی مدت مقرر کی اور فرمایا کہ تم طور پہاڑ پر آکر ۳۰ دن ذکر اور عبادت میں گزارو۔ اس کے بعد ذی الحجہ کی دس تاریخ کو تمھیں شریعت دی جائے گی۔ اس اعتبار سے حضرت موسیٰ کو ۱۰ ذی قعدہ کو طور پر پہنچنا چاہئے تھا۔ مگر وہ دس دن پہلے یکم ذی قعدہ کو طور پر پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا اے موسیٰ، تم اپنی قوم کو چھوڑ کر جلدی کیوں چلے آئے۔ موسیٰ نے کہا کہ وہ لوگ میرے پیچھے ہیں اور میں جلدی اس لئے آگیا تاکہ تو مجھ سے راضی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے تمھاری قوم کو تمھارے پیچھے ایک فتنہ میں ڈال دیا اور سامری نے اس کو بہکا دیا (طہ ۸۵ ـ ۸۳)

حضرت موسیٰ کو جلد طور پر پہنچنے کا شوق ہوا۔ وہ بنی اسرائیل کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اپنے بھائی ہارون کے سپرد کرکے وقت سے دس دن پہلے پہاڑ پر چلے گئے۔ حضرت موسیٰ کا یہ فعل تمام تر رضائے الٰہی کے جذبہ سے تھا۔ مگر وہ قوم کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوا۔ قوم کی قیادت ابھی تک حضرت موسیٰ کر رہے تھے، اس کے اجتماعی نظم پر حضرت ہارون کی گرفت ابھی مضبوط نہیں ہوئی تھی کہ حضرت موسیٰ قبل از وقت اس سے علٰحدہ ہو کر پہاڑ پر چلے گئے۔ چنانچہ قوم کے مفسدین نے ابھر کر غلبہ پایا اور قوم کو بچھڑے کی پرستش میں مبتلا کر دیا۔ یہ عجلت اگرچہ نبی کی طرف سے ظاہر ہوئی تھی اور خالص اللہ کی خوشنودی کے لئے تھی۔ مگر نہ تو اللہ نے ایسا کیا کہ وہ مقررہ تاریخ سے پہلے حضرت موسیٰ کو توراۃ کی تختیاں حوالے کر دے اور نہ ایسا ہوا کہ اخلاص اور نیک نیتی کی بنا پر وہ نتیجہ نہ نکلے جو از روئے حقیقت نکلنا مقدر تھا۔

تدریجی اصلاح

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسان کے لئے صلاح و فلاح کا جو نظام لے کر آئے تھے اس میں شراب کی حرمت بھی مطلوب کے درجہ میں شامل تھی۔ مگر آپ نے اپنی نبوت کے تقریباً نصف عرصہ تک اس معاملہ کا کوئی ذکر نہیں چھیڑا۔ عملاً لوگوں کو ان کے حال پر رہنے دیا، صرف توحید اور آخرت کی باتوں سے لوگوں کے دلوں کو نرم کرتے رہے۔

شراب کے متعلق پہلا حکم آیا تو اس میں صرف ناپسندیدگی کا اظہار کرکے چھوڑ دیا گیا تاکہ ذہنوں کو اس کی حرمت قبول کرنے کے لئے تیار کیا جائے۔ چنانچہ ارشاد ہوا: لوگ تم سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ ان چیزوں میں بڑی خرابی ہے اور ان میں لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں (البقرہ ۲۱۹) اگرچہ اس وقت لوگوں کے ذہنوں میں شراب کا حکم جاننے کے لئے سوال پیدا ہونے لگا تھا، اس کے باوجود اس کی بابت واضح حکم لوگوں کو نہیں بتایا گیا۔

اس کے بعد ۳ھ میں شراب کے متعلق دوسرا حکم آیا۔ مگر ابھی اس کی مکمل ممانعت نہیں کی گئی۔ ایک ایسی

بات کہی گئی جس سے شراب کا ناپاک ہونا واضح ہوتا تھا اور شراب نوشی کے اوقات پر اس کا اثر پڑتا تھا۔ یعنی یہ کہ نشہ کی حالت میں خدا کی عبادت کرنے کی ممانعت۔ حکم ہوا کہ اے ایمان والو، جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ، جب تک ایسا نہ ہو کہ جو کچھ تم نماز میں کہتے ہو اس کو سمجھنے لگو (النساء ۴۳)

مذکورہ حکم کے کچھ مدت بعد شراب کی مکمل حرمت نازل ہوئی۔ قرآن میں ارشاد ہوا: اے ایمان والو، شراب اور جوا اور آستانے اور پانسے سب گندے شیطانی کام ہیں۔ ان سے پرہیز کرو۔ امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔ شیطان یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ وہ تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تم کو خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے (المائدہ ۹۱ ـ ۹۰) اب لوگوں کے ذہن تیار ہو چکے تھے۔ چنانچہ یہ آیت آتے ہی لوگ کہہ اٹھے: انتھینا ربنا انتھینا ربنا (اے ہمارے رب ہم باز آئے، اے ہمارے رب ہم باز آئے) اور شراب کے ذخیروں کو زمین پر بہا دیا۔

شراب کی حرمت کے متعلق جو حکمتِ تدریج اختیار کی گئی اس کے بارے میں حضرت عائشہ رض کی ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے:

انما نزل اول ما نزل سورۃ من المفصل فیھا ذکر الجنۃ والنار حتی اذا ثاب الناس الی الاسلام نزل الحلال والحرام۔ ولو نزل اول ما نزل لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابدا ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابدا (بخاری باب تالیف القرآن)

قرآن میں سب سے پہلے مفصل سورتیں اتریں جن میں جنت اور جہنم کا تذکرہ ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگوں کے دل اسلام کے لئے ہموار ہو گئے تو حرام و حلال کی آیتیں اتریں۔ اگر پہلے ہی یہ اترتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے۔ اور اگر پہلے ہی اترتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہ چھوڑیں گے۔

استحکام کے بعد اقدام

عرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک خاص مقصد یہ تھا کہ حرم کو ہر قسم کی مشرکانہ آلائشوں سے پاک کر کے اس کو دوبارہ خالص توحید کا مرکز بنا دیں۔ جیسا کہ وہ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے زمانہ میں تھا۔ آپ کی بعثت کے وقت صورت حال یہ تھی کہ کعبہ کے اندر ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ مشرک لوگ اپنے بیہودہ عقائد کے تحت کعبہ کا ننگا طواف کرتے تھے۔ کبیسہ کا اصول اختیار کر کے انھوں نے حج کی ابراہیمی تاریخوں کو بدل دیا تھا۔

اپنی نبوت کے ابتدائی دور میں آپ تقریباً ۱۳ سال تک مکہ میں رہے مگر آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ اپنے ساتھیوں کو لے کر مکہ کی گلیوں میں احتجاجی جلوس نکالیں یا موقع پاکر حرم کے بتوں کو توڑنا شروع کر دیں۔ آپ صرف نظریاتی طور پر توحید و آخرت کی دعوت دیتے رہے مگر بتوں کے خلاف کسی قسم کے عملی اقدام سے مطلق پرہیز کیا۔

روایات بتاتی ہیں کہ ۸ھ میں جب مکہ فتح ہوگیا اور عرب کا مرکز اقتدار آپ کے قبضہ میں آگیا اس وقت آپ اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر مکہ میں داخل ہوئے اور کعبہ کے گرد طواف کرنا شروع کیا۔ اس وقت کعبہ کے چاروں طرف ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ آپ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ آپ اس چھڑی سے ایک ایک بت کو ٹھوکر دے رہے تھے اور بت زمین پر گرتے جاتے تھے۔ اس طرح تمام بت اوندھے منہ زمین پر گر پڑے اور اس کے بعد انھیں توڑ کر پھینک دیا گیا، جب آپ ایسا کر رہے تھے اُس وقت آپ کی زبان پر یہ آیت تھی: جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا (بنی اسرائیل ۸۱)

حرم کعبہ کو بتوں سے پاک کرنا اول دن سے مطلوب تھا۔ مگر اقتدار کے حصول سے پہلے آپ نے بتوں کو بالکل نہیں چھیڑا۔ آپ صرف شرک کی تردید اور توحید کے اثبات پر اپنی ساری دعوتی مہم کو مرتکز کر کے چلاتے رہے۔ حرم کو عملاً بتوں سے صاف کرنے کی طرف اقدام آپ نے صرف اس وقت کیا جب کہ مکہ پوری طرح آپ کے زیر اقتدار آگیا اور وہاں آپ کی کسی کارروائی کے خلاف مزاحمت کرنے والا کوئی باقی نہ رہا۔

اقتدار کے باوجود حکمت کا لحاظ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو عرب میں یہ رواج تھا کہ لوگ ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کعبہ مقدس ترین جگہ ہے۔ اس لئے ہر قسم کی دنیوی آلائشوں، حتیٰ کہ کپڑے سے بھی پاک ہو کر اس کا طواف کرنا چاہئے۔ یہ ایک انتہائی بری رسم تھی اور یقینی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حد ناپسند تھی۔ مگر آپ بعثت کے بعد تیرہ سال تک مکہ میں رہے اور کبھی اس کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کیا۔ قیام مکہ کے آخری دنوں میں جب کہ آپ کے پیروؤں کی تعداد کئی سو ہو چکی تھی، آپ برہنہ طواف کو اشو بنا کر اس کے خلاف جلوس نکال سکتے تھے۔ مگر آپ نے اس قسم کی کسی بھی کارروائی سے مکمل پرہیز کیا۔

اس کے بعد تاریخ آگے بڑھی اور رمضان ۸ھ میں مکہ فتح ہو گیا۔ مکہ قدیم عرب میں ملک کی قیادت کا مرکز تھا۔ مکہ پر قبضہ ملنے کا مطلب یہ تھا کہ پورا عرب آپ کے قبضہ میں آگیا۔ مگر اب بھی آپ نے برہنہ طواف کے خلاف کوئی اقدام نہیں فرمایا۔ فتح مکہ کے چار ماہ کے بعد حج کا موسم آیا تو مشرکین حسب معمول حج کی ادائگی کے لئے آئے اور پہلے کی طرح ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کیا۔ مگر ان پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔ مسلمانوں نے اپنے مطابق حج کے مراسم ادا کئے اور مشرکین نے اپنے مطابق

اس کے بعد اگلے سال (۹ھ) کا حج پڑا۔ یہ عرب میں اسلامی اقتدار قائم ہونے کے بعد دوسرا حج تھا۔ مگر اس سال بھی مشرکین کو برہنہ طواف سے نہیں روکا گیا۔ مسلمانوں نے حضرت ابوبکر کی قیادت میں اپنے طریقہ پر حج کیا اور مشرکین نے اپنے طریقہ پر۔ البتہ دوسرے سال یہ مزید کارروائی کی گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے حضرت علی کو مکہ بھیجا اور ہدایت کی کہ حج کے اجتماع میں لوگوں کے درمیان یہ اعلان کر دیں کہ اِس سال کے بعد آئندہ کوئی مشرک حج کے لئے مکہ نہ آئے اور نہ اب سے کوئی شخص ننگی حالت میں کعبہ کا طواف کرے (لا یحج بعد العام مشرک ولا یطوف بالبیت عریان)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فتح مکہ کے باوجود، ۸ھ اور ۹ھ میں حج کے لئے مکہ نہیں گئے۔ آپ نے فرمایا کہ مشرکین آئیں گے اور ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کریں گے۔ مجھے پسند نہیں کہ میں حج کروں جب تک یہ چیزیں ختم نہ ہو جائیں (انما یحضر المشرکون فیطوفون عراۃ فلا احب ان احج حتی لا یکون ذلک، تفسیر ابن کثیر، سورۃ التوبہ) اقتدار حاصل ہو جانے کے باوجود آپ دو سال تک برہنہ طواف کو برداشت کرتے رہے اور خود حج کے لئے نہیں گئے۔ تیسرے سال (۱۰ھ) میں آپ نے ننگے طواف کو بالکل بند کر دیا اور اسی سال مکہ جاکر حج ادا فرمایا۔ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری حج (حجۃ الوداع) تھا۔

تبدیلی فطری رفتار سے

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے کعبہ کی تعمیر کے بعد حج کا جو نظام قائم کیا تھا وہ قمری سال کی بنیاد پر تھا۔ اس بنا پر حج کی تاریخ مختلف موسموں میں آتی تھی۔ کبھی سردیوں میں اور کبھی گرمیوں میں۔ بعد کے زمانہ میں اہل مکہ نے دیکھا کہ اس فرق سے ان کی تجارتوں کو نقصان ہوتا ہے۔ حج کا موسم اہل مکہ کی خوش حالی کا اصل ذریعہ تھا۔ مگر قمری حساب کی بنا پر حج کا مختلف موسموں میں آنا اس راہ میں رکاوٹ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عرب میں کھجور کے پکنے کا زمانہ گرمی کا زمانہ تھا۔ قدیم عرب میں گرمی کا زمانہ ایسا ہی تھا جیسے زرعی ہندستان میں چیت کا زمانہ۔ ان دنوں قبائل کے پاس پیسہ ہوتا تھا اور وہ سفر کرنے اور خریداری کرنے کی پوزیشن میں ہوتے تھے۔ چنانچہ گرمیوں کا حج تجارتی نقطہ نظر سے بہت کامیاب رہتا تھا۔ اس کے برعکس جاڑوں کے حج بہت پھیکے ہوتے تھے۔ تجارتی چہل پہل ختم ہو جاتی تھی۔ اہل مکہ کے لئے ان کی دنیوی مصلحتیں دینی مصلحتوں کے اوپر غالب آگئیں۔ انھوں نے یہود و نصاریٰ سے نسئی یا کبیسہ (Intercalation) کا طریقہ سیکھا اور حج کو ہمیشہ گرمی میں کرنے کے لئے قمری مہینوں کو ہٹا کر شمسی مہینوں کے مطابق کرنے کا اصول اختیار کر لیا۔

قمری سال کے مقابلہ میں شمسی سال تقریباً گیارہ دن زیادہ ہوتا ہے۔ قمری سال کو شمسی سال کے مطابق کرنے کے لئے اہل مکہ یہ کرتے تھے کہ قمری سال میں ہر سال کمی کے بقدر اضافہ کر دیتے تھے۔ اس تدبیر کے نتیجہ میں ایسا ہوتا تھا کہ ہر آٹھ سالوں میں تین مہینے بڑھ جاتے تھے۔ اس طرح ہر تیسرے سال کے خاتمہ پر ایک ماہ کبیسہ کا ہوتا تھا۔ قمری سال کو شمسی سال میں تبدیل کرنے کی یہ کارروائی حرام مہینوں میں (بشمول ذوالحجہ) کی جاتی تھی جس کے نتیجہ میں یہ ہوتا کہ مہینے ۳۲ سال کے لئے اپنی جگہ سے ہٹ جاتے تھے اور اسی طرح حج کا

موسم بھی ۳۳ سال کی گردش کے بعد پھر یہ مہینے ایک مرتبہ کے لئے اپنی اصل جگہ پر واپس آتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ذمہ داری تھی کہ حج کے معاملہ میں اس جاہلانہ رسم کو بدلیں اور حج کی تاریخوں کو ابراہیمی سنت کے مطابق قمری ماہ (ذی الحجہ) میں مقرر کریں۔ رمضان ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو آپ اس حیثیت میں ہو گئے کہ سابقہ رسم کے فوری طور پر ختم کیے جانے کا اعلان کر دیں۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ جاہلی رسم کے مطابق ۸ھ اور ۹ھ کا حج ذی قعدہ میں پڑ رہا تھا۔ اور ۱۰ھ کا حج (۳۳ سال پورے کرکے) ذی الحجہ میں۔ اگر آپ چاہتے تو فتح مکہ کے بعد فوراً اعلان کر دیتے کہ اس سال آنے والا حج ابراہیمی سنت کے مطابق (ذی قعدہ کے بجائے) ذی الحجہ میں ادا کیا جائے گا۔ مگر آپ نے عجلت سے کام نہیں لیا۔ بلکہ دو سال انتظار فرمایا۔ اقتدار حاصل ہونے کے باوجود آپ نے اس کو برداشت کیا کہ دو سال تک حج کی ادائگی ذیقعدہ کے مہینہ میں ہو۔ اور تیسرے سال جب خود فطری رفتار کے مطابق حج کا موسم ذی الحجہ میں آجائے اس وقت اعلان کر دیں کہ اب آئندہ حج کی ادائگی اسی طرح ہو گی جس طرح اس سال ہو رہی ہے۔

یہی بات ہے جو آپ نے حجۃ الوداع کے خطبہ (۱۰ھ) میں ان لفظوں میں فرمائی تھی:

ان الزمان قد استدار کھیأتہ یوم خلق اللہ السماوات والارض (تفسیر ابن کثیر)	زمانہ گردش کرتا ہوا اپنی اس حالت پر آگیا ہے جو زمین و آسمان کی تخلیق کے اعتبار سے اس کی اصل حالت ہے

روایات توڑے بغیر اصلاح

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے ایک غزوہ وہ ہے جس کو غزوۂ مُریسیع یا بنی المصطلق (۵ھ) کہا جاتا ہے۔ آپ کو خبر ملی کہ قبیلہ بنی المصطلق کے سردار حارث بن ابی ضرار نے فوج جمع کی ہے اور مدینہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ آپ نے بریدہ بن حصیب اسلمیؓ کو خبر لینے کے لئے بھیجا۔ انھوں نے واپس آکر تصدیق کی کہ خبر صحیح ہے۔ آپ نے بھی اپنی فوج تیار کی اور تیزی سے چل کر اچانک ان کے اوپر حملہ کر دیا۔ وہ لوگ مقابلہ نہ کر سکے۔ ان کے دس آدمی قتل ہوئے اور تمام مرد و عورت بوڑھے بچے گرفتار کر لئے گئے۔ مال غنیمت میں دو ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں ہاتھ آئیں۔

جو لوگ گرفتار ہوئے وہ کل دو سو گھرانے تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کرکے انھیں اسلام کی طرف مائل کریں۔ مگر روایت کو توڑ کر آپ نے ایسا کرنا پسند نہیں فرمایا۔ اس زمانہ کی روایت کے مطابق یہ تمام قیدی فوج کے افراد کی ملکیت تھے۔ اگر آپ ان کی آزادی کا اعلان کرتے تو اس روایت کو توڑنا پڑتا۔ آپ نے اس کی نہایت خاموش تدبیر اختیار فرمائی۔

قبیلہ کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیوہ لڑکی جویریہ بھی گرفتار شدگان میں تھی۔ تقسیم غنیمت کے وقت وہ

ثابت بن قیس انصاری کے حصہ میں آئیں۔ ثابت بن قیس نے ان سے مکاتبہ کا معاملہ کرنا چاہا۔ یعنی اگر وہ اتنی رقم ادا کر دیں تو وہ آزاد ہیں۔ جویریہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور آپ سے بطور امداد اتنی رقم چاہی جس کو دے کر وہ آزاد ہوسکیں۔ آپ نے فرمایا: کیا میں تم کو اس سے بہتر چیز بتاؤں۔ وہ یہ کہ میں تمھاری طرف سے کتابت کی رقم ادا کر دوں اور تم کو آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لے لوں۔ وہ راضی ہوگئیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جویریہ کو آزاد کر کے انھیں اپنی زوجیت میں لے لیا۔ جویریہ چونکہ قبیلہ کے سردار کی لڑکی تھیں اس لئے قبائلی رواج کے مطابق اب آپ پورے قبیلہ کے داماد ہوگئے۔ مہاجرین وانصار کو جب یہ معلوم ہوا کہ انھوں نے جن لوگوں کو قیدی بنایا ہے ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامادی کا رشتہ ہے تو ایسے لوگوں کو قید رکھنا انھیں شاق معلوم ہوا۔ انھوں نے تمام قیدیوں کو اپنی طرف سے رہا کر دیا۔ ان قیدیوں کے دل اپنے "داماد" اور اس کے دین کے بارے میں پہلے ہی نرم ہو چکے تھے۔ جنگ میں شکست کے بعد آزاد کر دیا جانا ان کو غیر معمولی طور پر متاثر کرنے کا ذریعہ بن گیا کیونکہ یہ ایسا سلوک تھا جس کا قدیم قبائلی دور میں تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ اس کے جلد ہی بعد پورا قبیلہ مسلمان ہوگیا۔ اسی بنا پر حضرت عائشہ نے جویریہ کے بارے میں کہا: مجھے کوئی ایسی عورت نہیں معلوم جو جویریہ سے زیادہ اپنی قوم کے لئے بابرکت ثابت ہوئی ہو (ما اعلم امرأۃ کانت اعظم علیٰ قومھا برکۃ منھا، سیرۃ ابن ہشام)

موجودہ زمانہ کی تحریکیں

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے احیاء اسلام کے لئے بے شمار تحریکیں اٹھائیں۔ ان تحریکوں کو غیر معمولی مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ مگر اصل مقصود کو حاصل کرنے میں تمام تحریکیں ناکام رہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان تحریکوں نے فطرت کے ضابطہ کو اختیار نہیں کیا۔ انھوں نے اس طریق کار کو نہیں اپنایا جو خدا نے ان کے لئے مقرر کیا تھا اور جس کا عملی نمونہ قائم کر کے انھیں دکھا دیا تھا۔

ان تحریکوں نے خاموش تدبیر کے بجائے شور وغل کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے فطری رفتار سے چلنے کے بجائے عاجلانہ اقدام کر کے منزل تک پہنچنا چاہا۔ انھوں نے تدریج کے بجائے چھلانگ کا طریقہ اختیار کیا۔ وہ اپنی پوزیشن کو مستحکم کئے بغیر بڑی بڑی کارروائیاں کرنے لگے۔ انھوں نے حکمت کے بجائے شوق اور جذبات کو اپنا رہنما بنایا۔ انھوں نے بنیاد کا کام کئے بغیر اپنی آرزوؤں کا محل کھڑا کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑے سے زیادہ کی طرف بڑھنے کے بجائے انھوں نے چاہا کہ پہلے ہی دن انھیں زیادہ حاصل ہو جائے۔ اس طریقہ کا لازمی نتیجہ ناکامی تھا اور وہی ان کے حصہ میں آیا۔

خدا کی دنیا میں خدا کے مقررہ ضابطہ پر چل کر ہی کامیابی ہوسکتی ہے۔ کسی اور طریقہ کو اختیار کرنے

کے بعد خدا کی دنیا میں کامیابی کا حصول ممکن نہیں۔ خدا نے اپنی دنیا میں کامیابی کا راز اگر صبر میں رکھا ہے تو آپ اس کو جلد بازی کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتے۔ خدا نے اگر ایک واقعی نتیجہ کو خاموش جد وجہد سے وابستہ کر دیا ہے تو آپ تقریروں اور بیانات کی دھوم مچا کر اس نتیجہ کو اپنے لئے برآمد نہیں کر سکتے۔ خدا نے کوششوں کا حاصل پانے کے لئے اگر ایک مدت مقرر کر دی ہے تو آپ مدت کی تکمیل سے پہلے اس حاصل کے مالک نہیں بن سکتے۔ خدا نے اگر اپنی دنیا میں نتیجہ خیز عمل کے لئے تدریج کا اصول مقرر کیا ہے تو آپ چھلانگ لگا کر اچانک اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔ خدا اگر چاہتا ہے کہ ضروری استحکام کے بغیر کوئی اقدام نہ کیا جائے تو آپ استحکام کے بغیر اقدام کر کے کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ خدا نے اس دنیا کے مسائل کا حل اگر حقیقت پسندانہ طریق عمل میں رکھا ہے تو آپ جذباتیت کے طریقہ پر چل کر اپنے مدعا کو نہیں پا سکتے۔ خدا نے اگر افراد کے اندر کردار کی تعمیر میں قومی اصلاح کا راز رکھا ہے تو آپ اجتماعی ہنگاموں سے قومی اصلاح کے مقصد تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ خدا کا قانون ہے اور خدا کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اسلام اور سائنس

ایک بار میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جنھوں نے سائنس میں ڈگری لی تھی اور اسی کے ساتھ انھوں نے مذہب اور تاریخ کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ وہ خدا اور مذہب کو نہیں مانتے تھے۔ بات چیت کے دوران انھوں نے کہا: اسلام کو اگر تاریخ سے نکال دیا جائے تو انسانی تاریخ میں کیا کمی رہ جائے گی۔ میں نے کہا: وہی کمی جو اسلام سے پہلے انسانی تاریخ میں تھی۔

زمین پر انسان ہزارہا سال سے آباد ہے۔ مگر معلوم تاریخ کے مطابق اسلام سے پہلے کسی بھی دور میں انسان کی رسائی اس شعبۂ فن تک نہ ہو سکی جس کو آج سائنس کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ بہت سادہ ہے۔ اسلام سے پہلے ہر دور میں انسان کے اوپر شرک کا غلبہ تھا۔ یہی شرک عالم فطرت پر تحقیق کرنے میں مانع تھا۔ کیونکہ شرک کے عقیدہ کے تحت فطرت کے مظاہر پوجنے کی چیز بنے ہوئے تھے، جب کہ سائنس کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب کہ ان مظاہر کو تحقیق و تسخیر کی چیز سمجھا جائے۔ مشرک انسان چاند کو دیوتا سمجھتا تھا، اس لئے اس کا ذہن اس رخ پر چل ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ چاند پر اپنے قدم رکھے۔ وہ سیلاب کو خدا کا جزء سمجھتا تھا، اس لئے اس کے لئے یہ سوچنا ممکن نہ تھا کہ سیلاب کو قابو میں لاکر اس سے بجلی پیدا کرے۔ اسلام نے معلوم تاریخ میں پہلی بار شرک کو مغلوب کر کے توحید کو غالب کیا۔ بالفاظ دیگر، اس ذہن کو فروغ دیا کہ خدا صرف ایک ہے، باقی تمام چیزیں مخلوق ہیں۔ اس طرح اسلام نے عالم فطرت کی تحقیق کا راستہ کھولا۔ اور بالآخر وہ تمام ترقیاں وجود میں آئیں جو قدرت پر فتح کے نتیجہ میں انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قدیم سائنسی پس ماندگی شرک کا بالواسطہ نتیجہ تھی اور جدید سائنسی ترقی توحید کا بالواسطہ نتیجہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام اس لئے نہیں آیا کہ وہ دنیا کو سائنس دے۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر اسلام نہ آتا تو سائنسی ترقیوں کا دروازہ انسان کے اوپر بند رہتا، جیسا کہ اس سے پہلے وہ انسان کے اوپر بند پڑا ہوا تھا۔ سائنسی تحقیق اور ترقی کے سلسلے میں توحید کی اس اہمیت کو آرنلڈ ٹائن بی (۱۸۸۹ - ۱۹۷۵) نے کھلے لفظوں میں تسلیم کیا ہے (ظہور اسلام، صفحہ ۱۳۶)

سائنس اسلامی انقلاب سے پیدا ہوئی

توحید کی بنیاد پر جو فکری انقلاب آیا اس کے بہت سے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ تھا کہ انسان عالم فطرت کو اس نظر سے دیکھنے لگا کہ وہ بے بس مخلوق ہے اور انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کو جانے اور اس کو اپنے کام میں لائے۔ اس ذہن کا آغاز اموی دور (۶۶۱ - ۷۵۰) میں دمشق میں ہوا۔ قدیم یونانی حکماء کے یہاں کیمیا چاندی سے سونا بنانے کے خبط کا نام تھا۔ خالد بن یزید بن معاویہ غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے کیمیا کو ایک طبیعی علم کی حیثیت سے ترقی دینے کی کوشش کی۔ عباسی خلافت کے زمانہ میں اس شعبہ علم نے بغداد میں مزید فروغ پایا اور اسپین اور سسلی تک پھیلتا چلا گیا۔ اس زمانہ میں مسلمان علمی اور تمدنی ترقی میں دنیا کی تمام قوموں سے آگے بڑھے

ہوئے تھے۔ تاریخ کے اس دور کو یورپ کے مورخین تاریک دور (Dark Ages) کہتے ہیں۔ مگر وہ صرف یورپ کے لئے تاریک تھا نہ کہ مسلم دنیا کے لئے۔ ورلڈ بک انسائیکلوپیڈیا کا مقالہ نگار "ڈارک ایجز" کے عنوان کے تحت لکھتا ہے:

The term 'dark ages' cannot be applied to the splendid Arab culture which spread over north Africa and into Spain. (P. 30)

تاریک دور کی اصطلاح شاندار عرب کلچر پر چسپاں نہیں ہوتی جو اس زمانہ میں شمالی افریقہ اور اسپین میں پھیلا ہوا تھا۔

شرک کس طرح سائنسی تحقیق میں رکاوٹ تھا، اس کی وضاحت کے لئے یہاں ہم ایک مثال نقل کریں گے۔

قدیم یونان میں زمین اور سورج کی گردش کے بارے میں دو نظریے پیش کئے گئے تھے۔ ایک تھا ارسٹارکس کا نظریہ جس میں زمین کو سورج کے گرد گھومتا ہوا فرض کیا گیا تھا۔ دوسرا ٹالمی کا نظریہ جس کے مطابق سورج زمین کے گرد گھوم رہا تھا۔ پہلے نظریہ کے مطابق زمین بظاہر گول تھی اور دوسرے نظریہ میں چپٹی۔ قسطنطین (۲۷۲ - ۳۳۷) کے مسیحیت قبول کرنے کے بعد جب مسیحیوں کو یورپ میں غلبہ ہوا تو انھوں نے ٹالمی کے نظریہ کی سرپرستی کی اور دوسرے نظریہ کو بزور دبا دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسیحیت نے حضرت مسیح کو خدا فرض کر لیا تھا اس عقیدہ کے مطابق زمین کو یہ تقدس حاصل تھا کہ وہ خداوند کی جنم بھومی ہے۔ اور جو کرہ خداوند کی جنم بھومی ہو وہ کسی دوسرے کرہ کا تابع (Satellite) کس طرح ہو سکتا تھا۔ زمین کو اس طرح مقدس سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بارے میں تحقیقی کام آگے نہ بڑھ سکا۔ مشرکانہ مذہب اور سائنس کے درمیان ٹکراؤ کی مزید تفصیلی مثالیں ڈریپر (۱۸۱۱-۱۸۸۲) کی کتاب مذہب اور سائنس کا تصادم (Conflict between Science and Religion) میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

عباسی خلیفہ المامون (۷۸۶-۸۳۳) کے زمانہ میں بیت الحکمت قائم ہوا اور حکومت کے خصوصی تعاون کے تحت دونوں قسم کے ترجمے عربی زبان میں کئے گئے۔ مسلمانوں نے جب اعتقادی پیچیدگی سے آزاد ہو کر دونوں نظریات کو جانچا تو ان کو پہلا نظریہ حقیقت سے قریب تر نظر آیا۔ خلیفہ المامون جو خود بھی بہت بڑا عالم تھا، اس نے اس مسئلہ کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اس نے ہیئت و جغرافیہ کے عالموں کو حکم دیا کہ وہ زمین کو گول فرض کرتے ہوئے اس کا محیط (Circumference) معلوم کریں اور اس کے لئے کسی کھلے میدان میں ایک زمینی درجہ (Terrestrial Degree) کی لمبائی کی پیمائش کریں اور اس کے بعد اس سے زمین کی پوری گولائی کا اندازہ کریں۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے پاس آلات حساب کے نام سے صرف زاویہ ناپنے کا سادہ آلہ (Quadrant) اصطرلاب، دھوپ گھڑی اور معمولی گلوب تھے۔ اس قسم کی چند چیزوں کے ذریعہ انھوں نے اپنی جدوجہد شروع کر دی۔

اس مقصد کے لئے سنجار (Palmyra) کا وسیع ہموار میدان منتخب کیا گیا۔ ایک مقام پر قطب شمالی کی بلندی کے ساتھ زاویہ قائم کر کے شمال کی جانب جریب سے ناپنا شروع کیا۔ ۵۶ ⅔ میل شمال کی جانب جانے سے قطب شمالی کی بلندی کے زاویہ میں ایک درجہ کی لمبائی بڑھ گئی۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ جب ایک درجہ کی مسافت سطح زمین پر

۵۶ ⅔ میل ہے تو زمین کا کل محیط (Circumference) ۲۰ ہزار میل سے زیادہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ ہر نقطہ پر تمام زاویوں کا مجموعہ ۳۶۰ درجہ ہوتا ہے۔ اور ۳۶۰ کو ۵۶ ⅔ میں ضرب دینے سے ۲۰۴۰۱ میل کا فاصلہ برآمد ہوتا ہے۔ دوبارہ یہی تجربہ دریائے فرات کے شمال میں صحرائے کوفہ میں کیا گیا اور دوبارہ وہی نتیجہ نکلا ——— یہ پیمائش حیرت انگیز طور پر قریب بہ صحت تھی۔ کیونکہ موجودہ زمانہ میں صحیح ترین پیمائش کے مطابق زمین کا محیط خط استوار پر ۲۵ ہزار میل ہے۔ قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کی سائنسی ترقی کی تفصیلات پروفیسر فلپ ہٹی (۱۸۸۶ -) کی کتاب تاریخ عرب (History of the Arabs) میں دیکھی جا سکتی ہے (۳۷۵)

سائنس کی مسلم دنیا سے علیحدگی

علم کے مختلف میدانوں میں یہ ترقیاں جاری تھیں کہ باہمی اختلافات کے نتیجہ میں عرب خلافت کا نظام ٹوٹ گیا۔ اور اسلام کا جھنڈا عثمانی ترکوں (۱۵۱۷ - ۱۹۲۲) نے سنبھالا۔ اس طرح سولھویں صدی عیسوی میں اسلام کی سیاسی نمائندگی کا مرکز عرب سے نکل کر ترکی کی طرف منتقل ہو گیا۔ یہاں سے تاریخ میں ایک نیا انقلاب آیا جس نے واقعات کے رخ کو بالکل دوسری طرف موڑ دیا۔

تاریخ کا یہ عجیب المیہ ہے کہ ایک شخص جو کسی پہلو سے مفید خدمت انجام دیتا ہے، وہی کسی دوسرے پہلو سے بہت بڑی مصیبت کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال اموی خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کی ہے۔ اس کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے خلفاء راشدین کی فہرست میں پانچویں خلیفہ راشد (عمر بن عبدالعزیز) کا اضافہ کیا۔ مگر مورخ اسی خلیفہ کے تذکرہ میں اس ہیبت ناک غلطی کو بھی لکھتا ہے کہ اس نے اپنے زمانہ کے انتہائی اہم فوجی سرداروں کو ختم کرا دیا۔ جس کا نقصان یہ ہوا کہ ایشیا اور افریقہ میں اسلام کی بڑھتی ہوئی پیش قدمی اچانک ٹھپ ہو کر رہ گئی۔

یہی صورت عثمانی ترکوں کے ساتھ پیش آئی۔ ترکوں نے عین اس وقت اسلام کا جھنڈا سنبھال لیا جب کہ کمزور ہاتھوں میں پہنچ کر اس کے گرنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ کئی سو سال تک یورپ کی مسیحی طاقتوں کے مقابلہ میں اسلام کی دیوار بنے رہے۔ اس اعتبار سے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ یہی ترک ہیں جو اس حادثہ کا باعث بنے کہ مسلم دنیا میں ہونے والی سائنسی تحقیقات رک جائیں اور ان کا مرکز یورپ کی طرف چلا جائے۔

ترک انتہائی بہادر اور حوصلہ مند تھے۔ مگر ان کی کمزوری یہ تھی کہ وہ جاہل تھے۔ علمی تحقیق کے کام کی اہمیت نہ صرف یہ کہ وہ سمجھ نہیں سکتے تھے بلکہ وہ اس کو اپنے لئے ایک سیاسی خطرہ خیال کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ علم کے بڑھنے سے رعایا میں ان کے حق میں وفاداری کم ہو جائے گی اور ان کو قابو میں رکھنا نسبتاً زیادہ مشکل ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے علمی کام کے ساتھ سخت غیر رواداری کا ثبوت دیا۔ جب مسلم سیاست کا مرکز بدلا تو وہ لوگ جو بغداد اور دوسرے مراکز میں سائنس کی تحقیق کا کام کر رہے تھے، وہ منتقل ہو کر ترک دارالسلطنت آستانہ میں جمع ہو گئے۔ عباسی خلفاء ان لوگوں کی بے حد قدردانی کرتے تھے۔ انھوں نے ان کے اوپر درہم و دینار کی بارش کر رکھی تھی۔ مگر ترک ان کو اپنے لئے خطرہ سمجھ کر ان سے نفرت کرنے لگے۔ انھوں نے ان کی اس قدر حوصلہ شکنی کی کہ ترک حکومت میں ان کو اپنا

مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ چنانچہ یہ لوگ ترکی چھوڑ کر اٹلی اور فرانس جانا شروع ہو گئے۔ سائنسی تحقیق کا کام مسلم دنیا سے نکل کر مغربی دنیا میں منتقل ہو گیا۔ ترکوں نے علم اور اہل علم کی جس طرح حوصلہ شکنی کی اس کی دردناک تفصیل محمد کرد علی شامی کی کتاب تاریخ الحضارۃ العربیہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

مغربی دنیا میں ان سائنس دانوں کی زبردست پذیرائی ہوئی۔ صلیبی جنگوں (۱۰۹۵-۱۲۷۱) میں مسلمانوں کے مقابلہ میں یورپی قوموں کو شکست اس لئے ہوئی تھی کہ مسلمان علم وفن میں ان سے بڑھے ہوئے تھے۔ ان جنگوں میں ابتداءً رومی فوجوں نے یونانی آگ (Greek Fire) استعمال کی جس سے مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ "یونانی آگ" ایک قسم کی پچکاری تھی جس میں آتش گیر کیمیائی مرکب بھر کر دشمن کی طرف پھینکا جاتا تھا۔ مسلم سائنس دانوں نے اس کے مقابلہ میں ایک اور چیز ایجاد کی۔ اس میں روغن نفط (معدنی تیل) استعمال ہوتا تھا۔ اس کی مار زیادہ دور تک تھی اور اس کا نقصان بھی یونانی آگ سے بہت بڑھا ہوا تھا۔

یورپ کے مسیحی قدرتی طور پر مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنی علمی پس ماندگی کو دور کرنے کے لئے بیتاب تھے۔ اب جو مسلم دنیا کے اہل علم ان کے یہاں پہنچے تو انھوں نے ان کے ساتھ زبردست تعاون کیا۔ یورپ میں علمی تحقیق کا وہ کام دگنی شدت کے ساتھ ہونے لگا جو اس سے پہلے مسلم دنیا میں ہو رہا تھا۔ سولھویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی تک، تقریباً تین سو سالہ عمل کے نتیجہ میں یورپ میں وہ انقلاب آیا جس کو سائنسی اور صنعتی انقلاب کہا جاتا ہے۔ مغرب کی سائنسی ترقی میں مسلمانوں کے حصہ کے بارے میں مزید تفصیل بریفالٹ کی کتاب تعمیر انسانیت (Making of Humanity) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

سولھویں صدی تک مسلمان علم کے میدان میں استادی کے مقام پر تھے۔ مگر اس کے بعد کی صدیوں میں یورپ نے جو ترقیاں کیں اس نے مسلمانوں کو شاگردی کے مقام پر پہنچا دیا۔ مسلمان خود اپنی لائی ہوئی انقلابی دنیا میں دوسری قوموں سے پیچھے ہو گئے۔ تاہم اب بھی یہ موقع تھا کہ وہ یورپ کی تحقیقات سے فائدہ اٹھا کر آگے بڑھیں اور وہ واقعہ دوبارہ نئی شکل میں ظہور میں آئے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں یورپ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ مسلمانوں کے علوم کو بنیاد بنا کر یورپ ان سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اب مسلمان یورپ کے علوم کو لے کر مزید آگے کی ترقیاں حاصل کر سکتے تھے۔ مگر یہاں دو خاص وجہیں راستہ میں حائل ہو گئیں۔ ایک تاریخی امکان واقعہ بننے سے رہ گیا۔

سائنس کے معاملہ میں موجودہ مسلمانوں کی غفلت

۱۔ صدیوں تک سائنسی علوم سے دور رہنے کے بعد یورپ کے ذریعہ جب سائنس مسلمانوں کی طرف آئی تو وہ صرف ایک علم کے طور پر نہیں آئی۔ بلکہ وہ ملک گیری اور استعمار کے جلو میں آئی۔ مسلمانوں کے پاس یہ سائنس لے کر وہ لوگ آ رہے تھے جنھوں نے مسلمانوں سے ان کی عظمت اور ان کے اقتدار کو چھینا تھا۔ ان کی تہذیب اور ان کے مذہبی شعائر پر حملے کئے تھے۔ اس موقع پر مسلمان اس دانش مندی کا ثبوت نہ دے سکے کہ وہ مغربی سائنس کو مغربی سیاست سے الگ کر کے دیکھیں۔ انھوں نے دونوں کو ایک سمجھا۔ وہ جس طرح مغربی قوموں کے دشمن بنے، اسی طرح

وہ مغربی علوم کے بھی دشمن بن گئے۔ جب کہ دوسری قومیں مغرب سے ان کے علوم سیکھ رہی تھیں، مسلمان ان کو دشمن کی چیز سمجھ کر ان سے دور بھاگ رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان دوسری قوموں سے کم از کم سو سال علم میں پیچھے ہو گئے، قوموں کے اوپر علمی امام بننے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔

۲۔ مزید نقصان یہ ہوا کہ طویل غفلت کے بعد مسلمانوں میں جو لوگ علم کے مبلغ بن کر اٹھے وہ اس کام کے پوری طرح اہل نہ تھے۔ انھوں نے ایک صحیح کام کو غلط طریقہ سے انجام دینے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں ان کو وہ قبولیت حاصل نہ ہو سکی جو باعتبار حقیقت انھیں حاصل ہونی چاہئے تھی۔

مثال کے طور پر علم جدید کی اہمیت ثابت کرنے کے لئے انھوں نے یہ کیا کہ قرآن و حدیث میں جہاں جہاں "علم" کا لفظ آیا ہے اس کو انھوں نے ان سیکولر علوم کا مصداق بنایا جو آج یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ یہ ایک صحیح بات کے لئے غلط دلیل پیش کرنا تھا۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن و حدیث میں جس علم کی فضیلت بیان ہوئی ہے اس سے مراد علم دین ہے نہ کہ سیکولر یا سائنسی علوم۔ ان علوم کو حاصل کرنا یقیناً مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔ مگر ان علوم کی اہمیت آیتِ قوت سے ثابت ہوتی ہے نہ کہ آیتِ علم سے۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اس قوت کو حاصل کرو جس سے تمھارے حریف کے اوپر تمھاری دھاک قائم ہو۔ موجودہ زمانہ میں سائنسی علوم نے یہی مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس لئے سائنسی علوم کا حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔ سائنسی علوم میں دستگاہ حاصل کئے بغیر مسلمان آج کی دنیا میں قوت مرہبہ (انفال ۶۰) کے مالک نہیں بن سکتے، اس لئے اس قرآنی حکم کی تعمیل میں موجودہ حالات کے لحاظ سے یہ بات بھی شامل ہوگی کہ وہ ان علوم کو حاصل کریں اور ان کو اسلام اور مسلمانوں کی تقویت کا ذریعہ بنائیں۔

موجودہ زمانہ کے تعلیمی مصلحین کی اسی غلطی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کا دینی طبقہ ان کا سخت مخالف ہو گیا۔ طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم (حدیث) جیسی نصوص کا مطلب دینی طبقہ کے نزدیک متفقہ طور پر یہ تھا کہ اس سے مراد کتاب و سنت کا علم حاصل کرنا ہے۔ جب تعلیمی مصلحین نے اس طرح کی آیتوں اور حدیثوں کو موجودہ زمانہ کے "دنیاوی" علوم پر چسپاں کیا تو دینی طبقہ کو یہ بات سراسر اسلام کی تحریف نظر آئی۔ وہ اس کا دشمن بن کر کھڑا ہو گیا۔ تعلیمی مصلحین بلاشبہ غلطی پر تھے۔ مگر دینی نمائندوں سے بھی یہ غلطی ہوئی کہ وہ مقصد اور استدلال دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہ دیکھ سکے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو انھیں نظر آتا کہ تعلیمی مصلحین جن علوم کی اہمیت کو آیت علم سے غلط طور پر ثابت کر رہے ہیں وہ آیت قوت سے بالکل درست طور پر ثابت ہو رہی ہے۔ اس لئے اس معاملہ میں اصل کام استدلال کی تصحیح ہے نہ کہ خود مقصد کو باطل قرار دینا۔

اسلام میں سائنس کی اہمیت

اسلام میں سائنس کی اہمیت کے متعدد وجوہ ہیں۔ یہاں چند چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ سائنس، سادہ طور پر، عالم حقائق کے مطالعہ کا نام ہے۔ قرآن میں یہی صفت اہل ایمان کی بتائی گئی ہے

کہ وہ زمین و آسمان کی بناوٹ پر غور کرتے ہیں (یتفکرون فی خلق السماوات والارض، آل عمران ۱۹۱) اس اعتبار سے ایک سائنس داں وہی کام کرتا ہے جو ایک مومن کرتا ہے۔ تاہم دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ سائنس داں کا عمل صرف تحقیق کے لئے ہوتا ہے اور مومن کا عمل عبرت کے لئے۔ سائنس داں کے پیش نظر علم برائے علم ہوتا ہے اور مومن کے پیش نظر علم برائے مقصد۔ سائنس داں اضافۂ علم پر مطمئن ہوتا ہے اور مومن اضافۂ ایمان پر۔

ذہن کا یہ فرق دونوں کے طرز مطالعہ میں بہت بڑا فرق پیدا کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سائنسداں اشیار کی ماہیت کو چھوڑ کر صرف اشیار کے خواص کے مطالعہ تک اپنے کو محدود رکھتا ہے۔ وہ اشیار کی کارکردگی کو ان کی معنویت سے جدا کر دیتا ہے۔ سائنس داں کو ایسا اس لئے کرنا پڑتا ہے کہ وہ صرف اپنی عقل کی رہنمائی میں کائنات کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اور انسان کی عقل قطعیت کے ساتھ صرف قابل تجربہ چیزوں کو دیکھ پاتی ہے، اس لئے اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ کائنات کے قابل تجربہ پہلوؤں تک اپنے مطالعہ کو محدود رکھے۔ مگر مومن اپنی عقل کے ساتھ نبوت کی رہنمائی کو تسلیم کئے ہوئے ہوتا ہے۔ اس لئے وہ خواص اشیار سے گزر کر حقائق اشیار تک اپنے مطالعہ کو لے جاتا ہے۔ وہ "مخلوق" کو اس کے "خالق" کے ساتھ شامل کرکے دیکھتا ہے۔ یہ فرق مومن کے مشاہدۂ کائنات میں زبردست معنویت پیدا کر دیتا ہے۔ اس کو ساری کائنات صفات خداوندی کا ظہور نظر آنے لگتی ہے۔ کائنات کو پاتے ہی وہ اس خدا کو بھی پالیتا ہے جس پر وہ پیغمبر کے واسطہ سے ایمان لایا ہے۔

۲۔ قرآن میں کائناتی واقعات کو قرآنی پیغام کے حق میں بطور استدلال پیش کیا گیا ہے۔ گویا قرآن میں جو بات نظری طور پر کہی گئی ہے، کائنات اس کے حق میں واقعاتی دلیل ہے۔ اس اعتبار سے پوری سائنس قرآن کا علم کلام ہے۔ کیونکہ سائنس کسی سائنس داں کے خود ساختہ علم کا نام نہیں بلکہ وہ خدا کی کائنات میں کام کرنے والے قوانین کی تلاش کا نام ہے۔ ان قوانین کا جو حصہ بھی سائنس دریافت کرتی ہے وہ خدا کی کارفرمائیوں کی ایک جھلک ہوتی ہے، وہ خدا کی آیتوں میں سے ایک آیت (نشانی) کا انسانی علم میں آنا ہوتا ہے۔ سائنس داں کے لئے سائنس علم برائے علم ہے یا زیادہ سے زیادہ علم برائے تعمیر دنیا۔ مگر مومن کے لئے سائنس ایک علمی ہتھیار ہے جس سے وہ دعوت حق کی جدوجہد میں کام لیتا ہے، جس سے وہ اپنی بات کو مدلل کرکے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

۳۔ سائنس کا تیسرا پہلو، اسلامی نقطۂ نظر سے، وہی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔ یعنی وہ موجودہ زمانہ میں قوت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے اسلام اور مسلمانوں کو سربلند کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سائنس کی قوت کو پوری طرح فراہم کیا جائے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ مسلمان سائنس کی تحقیق و تحصیل میں آگے بڑھیں، حتی کہ وہ اس میں امامت کا درجہ حاصل کرلیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں ساری مسلم دنیا میں سیاسی آزادی کی تحریکیں اٹھیں۔ ان تحریکوں کے مسلم قائدین کا یہ خیال تھا کہ بیرونی سیاسی قبضہ سے آزاد ہونے کا نام غلبہ ہے۔ وہ سیاسی آزادی کو

اسلام کی سربلندی کے ہم معنی سمجھتے تھے۔ مگر آج جب کہ بے شمار قربانیوں کے بعد تمام مسلم ممالک آزاد ہو چکے ہیں، آج بھی وہ ان غیر مسلم قوموں کے محکوم ہیں جو سائنس اور ٹکنالوجی میں ان سے بڑھی ہوئی ہیں۔ ان کی سیاسی آزادی ان کو آج کی دنیا میں برتری کا مقام نہ دے سکی۔ کیونکہ وقت بتانے والی گھڑی سے لے کر جنگ لڑنے والے سامان تک ہر چیز کے لئے وہ انھیں قوموں کے محتاج ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہر چیز کا تعلق سائنس اور ٹکنالوجی سے ہو گیا ہے۔ اس لئے جو قوم ان چیزوں میں پیچھے ہو وہ مقابلہ کی اس دنیا میں آگے کی صف میں جگہ نہیں پا سکتی۔ سائنسی علوم میں مسلمانوں کی اس پس ماندگی ہی نے غیر اسلامی طاقتوں کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ مسلم قوموں کی ٹکنکل مدد کر کے ان کو جتھوں میں بانٹیں اور ان کو ایک دوسرے کے خلاف لڑاتی رہیں۔

نئی دہلی میں جنتر منتر روڈ سے گزرنے والا ایک عجیب وغریب طرز کی عمارت دیکھتا ہے جس کا نام "جنتر منتر" ہے۔ اسی کے اوپر سڑک کا نام جنتر منتر روڈ رکھا گیا ہے۔ جنتر منتر دراصل پرانے زمانہ کی رصد گاہ ہے جس کو اٹھارویں صدی کے نصف اول میں جے پور کے راجہ جے سنگھ نے بنوایا تھا۔ جے سنگھ کو علم فلکیات کا بہت شوق تھا۔ ہندوستان کے اس راجپوت راجہ نے اپنے اس شوق کی تکمیل کے لئے صرف جے پور میں ہی ایک بڑی رصد گاہ نہیں بنوائی بلکہ دہلی، متھرا، بنارس اور اجین میں بھی رصد گاہیں تعمیر کرائیں۔ دہلی کا جنتر منتر آج بھی راجہ کے اس شوق کی یاد دلاتا ہے۔

ان رصد گاہوں کے ذریعہ اس دور کے علمائے فلکیات چاند اور ستاروں کی رفتار معلوم کرتے تھے۔ ان رصد گاہوں کے ذریعہ موسم کا پتہ چلایا جاتا تھا۔ وہ اس کی مدد سے ستاروں اور زمین کا فاصلہ ناپتے تھے۔ رات کو چاند کی روشنی اور دن کو سورج کی روشنی کی مدد سے وقت کا اندازہ کرتے تھے۔ عمارت کی کھڑکیاں، دریچے اور دیواروں کے سوراخ خود بخود سال کا پورا کیلنڈر ترتیب دے دیتے تھے۔

قرون وسطیٰ میں ساری دنیا کا علمی اور تعمیری کام مسلمانوں کی علمی اور تعمیری ترقیوں کی نقل ہوتا تھا۔ چنانچہ مہاراجہ جے سنگھ کی یہ رصد گاہ بھی عباسی رصد گاہوں کی نقل تھی۔ وہ ٹھیک اس انداز سے بنائی گئی تھی جیسی خلیفہ مامون رشید نے ایک ہزار سال پہلے بغداد میں بنوائی تھی۔

قدیم دور میں علم کی امامت مسلمانوں کو حاصل تھی۔ چنانچہ ساری دنیا میں ان کے طریقوں کی تقلید کی جاتی تھی۔ مگر بعد کے زمانہ میں ان کی غفلت سے امامت کا یہ مقام مغربی قوموں نے حاصل کر لیا۔ تین سو سال پہلے جب ایک شخص فلکیات کے مطالعہ کے لئے "رصد گاہ" بنانا چاہتا تو وہ بغداد کے نمونہ کی نقل کرتا تھا۔ مگر آج جب کسی ملک میں "رصد گاہ" تعمیر کی جاتی ہے تو اس کا نقشہ اور سامان مغرب کے ماہرین سے حاصل کیا جاتا ہے —— یہی وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں کی عزت وسربلندی کا سفر ختم ہوا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے مسلمان دوبارہ اپنے سفر کا آغاز کر سکتے ہیں۔

جدید معقولات

جدید معقولات کا مطلب ہے جدید ذہن کی رعایت سے دین کی باتوں کو مدلل کرنا، جدید طرز استدلال میں اسلامی تعلیمات کو بیان کرنا۔ اب دیکھئے کہ جدید ذہن کیا ہے۔ جدید ذہن دراصل سائنسی ذہن کا دوسرا نام ہے۔ سائنسی ذہن کا مطلب حقائق کو اہمیت دینے والا ذہن ہے۔ سائنس کے انقلاب نے موجودہ زمانہ میں انسانی فکر میں جو تبدیلی کی ہے وہ یہ ہے کہ جو بات کہی جائے تجربہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر کہی جائے نہ کہ مفروضات اور قیاسات کی بنیاد پر۔ موجودہ زمانہ میں جو انقلاب آیا ہے وہ حقائق فطرت کے مطالعہ سے آیا ہے۔ بائیسکل سے لے کر ہوائی جہاز تک اور بجلی کے لیمپ سے لے کر بڑے بڑے صنعتی کارخانوں تک ہر چیز فطری حقائق کی بنیاد پر چل رہی ہے۔ یہی انقلاب موجودہ زمانہ کا غالب انقلاب ہے۔ اس نے زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر ڈالا ہے۔ اسی نے موجودہ زمانہ میں اسلوب کلام کو بھی بدل دیا ہے۔ انسان ہزاروں سال سے پراسرار عملیات کی بنیاد پر لوہے کو سونا بنانے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ کامیاب نہیں ہوا۔ اب حقائق فطرت کو دریافت کر کے وہ لوہے کو مشینوں میں تبدیل کر رہا ہے جو سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔ ایسی حالت میں بالکل قدرتی بات ہے کہ آج کا انسان حقائق فطرت کی بنیاد پر ثابت ہونے والی بات کو سب سے زیادہ باوزن سمجھے۔ آج کے انسان نے جو ترقیاں کی ہیں وہ حقائق کی بنیاد پر کی ہیں اس لئے آج کا انسان انھیں باتوں کو اہمیت دیتا ہے جو حقائق کے زور پر ثابت ہوتا ہو۔

قدیم اور جدید ذہن کے فرق کو ایک سادہ مثال سے سمجھئے۔ پچاس سال پہلے اطبار کے یہاں اس قسم کے الفاظ بے حد پرکشش سمجھے جاتے تھے ——— خاندانی نسخہ، پشتینی علاج، شاہی ترکیب سے بنی ہوئی دوا۔ کسی دوا یا منجن کے بارے میں یہ الفاظ بولنے کا مطلب یہ تھا کہ اس میں پراسرار خواص چھپے ہوئے ہیں۔ مگر آج ان الفاظ کے اندر کوئی قیمت نہیں۔ آج کا ڈاکٹر کسی دوا یا کسی ٹوتھ پیسٹ کی اہمیت کو بتانے کے لئے "قدیمی نسخہ" کی اصطلاح نہیں بولے گا۔ وہ کہے گا کہ یہ سائنسی طریقوں سے بنایا گیا ہے۔ سائنسی طریقہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کی افادیت کو معلوم تجربات و مشاہدات کے ذریعہ جانا جا چکا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی چاہے تو ان تجربات کو دہرا کر دوبارہ ان کے نتائج کی صحت کی تصدیق کر سکتا ہے۔ جب کہ خاندانی علاج کا مطلب یہ تھا کہ اس کے طبی خواص ہر ایک کے لئے قابل دریافت نہیں ہیں۔ دوا اور مرض کے درمیان تعلق کو متعین تجربات کے ذریعہ معلوم نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی اہمیت بس یہ ہے کہ وہ قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ آج کا انسان اسی منجن کو استعمال کرنا پسند کرتا ہے جو سائنسی، بالفاظ دیگر، فطری حقیقتوں کی پیروی کرتے ہوئے بنا ہو۔ اسی طرح وہ صرف ان افکار کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے جن کا برحق ہونا فطری حقائق کے ذریعہ معلوم ہوا ہو۔

سائنسی انقلاب سے پہلے انسانی فکر کی بنیاد فلسفیانہ قیاسات پر قائم تھی، سائنسی انقلاب کے بعد انسانی فکر کی بنیاد معلوم حقائق و واقعات پر رکھی گئی ہے۔ اسی سے قدیم علم کلام اور جدید علم کلام کا فرق سمجھا جا سکتا ہے۔ قدیم علم کلام کی بنیاد فلسفیانہ طرز استدلال پر تھی، جدید علم کلام کی بنیاد فطری طرز استدلال پر ہے۔ پہلے قیاسی منطق کے ذریعہ بات کو ثابت کیا جاتا تھا۔ اب وہ زمانہ ہے کہ بات کو حقیقی شواہد کے ذریعہ ثابت کیا جائے۔

جدید ذہن کی اس مختصر وضاحت کے بعد اب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جدید طرز استدلال دوسروں کے لئے خواہ جدید ہو مگر اسلام کے لئے وہ جدید نہیں۔ اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ قرآن کا طرز استدلال عین وہی ہے جس کو موجودہ زمانہ میں حقائق فطری سے استدلال کہا جاتا ہے تو یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ جدید علم کلام دراصل قرآنی علم کلام ہے۔ جدید معقولات اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ قرآنی معقولات کی طرف لوٹنا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب قدیم عراق کی مشرک قوم کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی تو سورج، چاند اور ستاروں کے مشاہدات سے اپنی دعوت کے اوپر دلیل قائم کی۔ آنجناب کا یہ واقعہ سورہ انعام (رکوع ۹) میں بیان ہوا ہے۔ وہاں قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: وتلک حجتنا آتیناھا ابراھیم علیٰ قومہ (یہ ہماری دلیل ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے اوپر عطا کی) یہاں حجتنا کا لفظ بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے جو انداز کلام اختیار کیا وہ خدائی انداز کلام تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حجت خداوندی یا استدلال الٰہی کا طریقہ یہ ہے کہ کائنات کے معلوم و مشہود حقائق سے استدلال کیا جائے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ خدا نے اپنی کتاب میں جو تعلیم قلمی طور پر دی ہے، ساری کائنات کو اس کے حق میں عملی دلیل بنا دیا ہے۔ پھر جو دلیل خود خدا نے مقرر کی ہو اس سے بڑھ کر دلیل اور کون سی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف قرآن میں کہا گیا ہے کہ ھذا کتابنا ینطق علیکم بالحق (جاثیہ ۲۹) اور دوسری طرف کائنات کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ ماخلقنا ھما الا بالحق (دخان ۳۹) قرآن اور کائنات دونوں ایک ہی مشیت ربانی کا اظہار ہیں، ایک جگہ یہ اظہار لفظی صورت میں ہو رہا ہے اور دوسری جگہ عملی صورت میں۔

قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہی طریقہ خدا کے تمام پیغمبروں نے اختیار کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام انتہائی قدیم زمانہ کے پیغمبر ہیں۔ مگر آنجناب کا طرز استدلال بھی ٹھیک وہی تھا جس کو آج ہم فطری یا حقیقی شواہد پر مبنی استدلال کہتے ہیں۔ سورۂ نوح کو دیکھئے۔ حضرت نوح کی زبان سے ارشاد ہوا ہے: فقلت استغفروا ربکم انہ کان غفارا۔ یرسل السماء علیکم مدرارا۔ ویمددکم باموال و بنین۔ ویجعل لکم جنات ویجعل لکم انھارا۔ مالکم لا ترجون للہ وقارا۔ وقد خلقکم اطوارا۔ الم تروا کیف خلق اللہ سبع سماوات طباقا۔ وجعل القمر فیھن نورا وجعل الشمس سراجا۔ واللہ انبتکم من الارض نباتا۔ ثم یعیدکم فیھا

ویخوجکم اخراجا۔ واللہ جعل لکم الارض بساطا لتسلکوا منہا سبلا فجاجا (نوح) اس کے بعد آپ قرآن کے دعوتی اسلوب کو دیکھئے تو اس میں بھی آپ کو ہر جگہ یہی طریقہ ملے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ سارا قرآن اسی اندازِ دعوت سے بھرا ہوا ہے جس کو ہم نے فطری انداز کہا ہے۔ مثلاً افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت۔ و الی السماء کیف رفعت۔ والی الجبال کیف نصبت والی الارض کیف سطحت (غاشیہ)

یہی اصل اسلامی استدلال ہے۔ یہی خدا کے تمام پیغمبروں نے اختیار کیا اور اسی سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے۔ مگر دوسری صدی ہجری میں عباسی خلافت کے زمانہ میں جب علوم اسلامی کی تدوین ہوئی تو بعض اتفاقی اسباب کے نتیجہ میں اسلامی علم کلام کو قدیم منطق و فلسفہ کی بنیاد پر مرتب کر دیا گیا۔ امام غزالی کے زمانہ میں یہی علم کلام اسلامی مدارس کے نصاب میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد نسل در نسل یہ سلسلہ چلتا رہا۔ حتیٰ کہ علم کلام ایک منطقی علم کے ہم معنی قرار پا گیا۔ مگر یہ قرآن سے سراسر انحراف تھا۔ یہ علم کلام اسلامی استدلال کی بنیاد قیاسی منطق پر رکھ رہا تھا جب کہ قرآن نے اسلامی استدلال کی بنیاد فطرت کے شواہد پر رکھی تھی۔ منطقی کلامیات کا لوگوں کے اوپر اتنا غلبہ ہوا کہ ایک ہزار سال تک بھی وہ اس سے باہر نہ آ سکے۔ تاہم موجودہ زمانہ میں خود خارجی حالات ہم کو مجبور کر رہے ہیں کہ ہم اس کو چھوڑیں اور دوبارہ قرآن کے فطری اسلوب کی طرف واپس جائیں۔ سائنسی انقلاب سے پہلے یہ علم کلام کم از کم علمی حیثیت سے کچھ قدر و قیمت رکھتا تھا۔ مگر آج وہ علمی قدر و قیمت بھی کھو چکا ہے اور دعوتی افادیت جو پہلے بھی اس کے اندر موجود نہ تھی وہ اب اور زیادہ اس سے دور جا چکی ہے۔

جدید علم کلام، بالفاظ دیگر، قرآنی علم کلام کیا ہے۔ اس کو قرآنی آیات کے تتبع سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ میں یہاں مختصر طور پر قرآنی کلامیات یا قرآنی معقولات کے چند پہلوؤں کو بیان کروں گا۔ یہ پہلو قرآنی علم کلام کو جاننے کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۔ قرآنی کلامیات کے پہلے اصول کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل آیت پر غور کیجئے:

یسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا (اسراء ۸۵)

لوگ تم سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہو کہ روح خدا کے حکم سے ہے۔ اور تم کو صرف تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

یہاں سوال کرنے والے نے ایک سوال کیا تھا اور وہ سوال کے جواب کا منتظر تھا۔ مگر اس کو کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ سوال کا جواب دینے کے بجائے خود سوال کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض سوالات ایسے ہوتے ہیں جن کا حقیقی جواب آدمی کے حدود فہم سے باہر ہوتا ہے۔ وہ ایسے جوابات کو اسی طرح نہیں سمجھ سکتا جس طرح ماں کے پیٹ کے اندر کا بچہ باہر کی دنیا کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے جب کوئی شخص ایسے سوالات میں الجھے تو اس کی بہترین مدد یہ ہے کہ اس کو ایسے سوالات میں الجھنے سے روکا جائے۔ اس کے برعکس اگر جواب دینے والا

اس کا جواب دینے بیٹھ جائے تو وہ خود بھی بے راہ ہوگا اور سائل کو بھی بے راہ کرے گا۔

میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک سوال میں بہت عرصہ سے الجھا ہوا ہوں، آپ اس کو حل کیجئے۔ پھر انھوں نے کہا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد ہی آدمی کے عمل کے مطابق اس کا عذاب و ثواب شروع ہو جاتا ہے۔ اب کوئی شخص ہے جو آج ساٹھ سال گزار کر مر جاتا ہے، کوئی شخص ہے جو دس ہزار سال پہلے اتنی ہی عمر گزار کر مر چکا ہے۔ یہ دونوں اگر جہنمی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یکساں برے عمل پر ایک شخص نے دوسرے کے مقابلہ میں دس ہزار سال زیادہ سزا پائی اور دونوں اگر جنتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یکساں اچھے عمل پر ایک شخص نے دوسرے کے مقابلہ میں دس ہزار سال زیادہ جنت کا لطف حاصل کیا۔ ایسی حالت میں تو خدا کو چاہئے تھا کہ وہ سب کو ایک وقت میں پیدا کرتا اور سب کو ایک وقت میں مارتا۔ تاکہ ہر ایک کو برابر جزا یا سزا ملے۔

اس قسم کے سوالات صرف ذہنی بے راہی کے سوالات ہیں۔ ہم ایک محدود دنیا میں رہتے ہیں۔ ہمارا ذہن زمان و مکان کی حدبندیوں میں رہ کر سوچتا ہے۔ ایسی حالت میں ہم اس دنیا کی حقیقتوں کو پوری طرح اپنی گرفت میں نہیں لا سکتے جو لامحدود ہے اور زمان و مکان کی حدبندیوں سے آزاد ہے۔ ایسی دنیا کے بارے میں ہم صرف اجمالی علم حاصل کر سکتے ہیں اور اس معاملہ میں ہمیں صرف اجمالی علم پر قناعت کرنا چاہئے۔ اس سے زیادہ کی خواہش کرنا صرف اپنے کو بے راہی کے خطرہ میں ڈالنا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو آیتیں اتاری ہیں وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک محکمات، دوسری متشابہات۔ محکم آیتیں وہ ہیں جو ہماری معلوم دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایسے امور میں خدا نے براہ راست زبان میں اپنا حکم ارشاد فرمایا ہے۔ ان احکام کو ہم لفظی طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ جیسے یہ حکم کہ چور کا ہاتھ کاٹو (مائدہ ۳۸)۔ متشابہ آیتوں سے مراد متماثل آیتیں ہیں۔ یہ وہ آیتیں ہیں جن کا تعلق غیب کی دنیا سے ہے۔ ایسی آیتوں میں اللہ نے بات کو تمثیلی زبان (Symbolic Language) میں بیان کیا ہے جیسے یہ کہ اللہ تخت پر متمکن ہوا (اعراف ۵۴) محکم آیتوں میں تفصیلات اور تعینات تک پہنچنے کی کوشش کرنا مفید ہے۔ لیکن اگر اسی طرح متشابہ آیتوں میں تفصیلات اور تعینات تک پہنچنے کی کوشش کی جائے تو اس کا نتیجہ بھٹکنے کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

علم کی یہ تقسیم فطرت کے عین مطابق ہے۔ جدید سائنس نے عالم فطرت کی جو تحقیق کی ہے اس نے انسانی علم کی محدودیت کو آخری طور پر ثابت کر دیا ہے۔ جدید دنیا کا یہ مسلّمہ ہے کہ انسان اپنی محدودیتوں کی وجہ سے اشیاء کا صرف جزئی علم حاصل کر سکتا ہے، وہ کلّی علم تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس اعتبار سے قرآنی کلامیات کا پہلا اصول عین علمی اصول ہے۔ یہ وہ اصول ہے جس پر جدید ذہن خود اپنی تحقیق کے نتیجہ میں پہنچ چکا ہے۔

۲۔ قرآنی کلامیات کا دوسرا اصول حقائق فطرت سے استدلال ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم

ان کو آفاق کی اور انفس کی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ قرآن کی دعوت سراسر حق ہے۔ (حم سجدہ ۵۳) اس سلسلے میں یہاں چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں:

الف۔ قرآن کی دعوت یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے، اس کو مانو۔ اس دعوت کے حق میں دلیل کیا ہے۔ قدیم متکلمین نے اپنے فلسفیانہ ذوق کے تحت اس پر قیاسی دلیلیں قائم کیں۔ مگر قرآن اس کے حق میں مشاہداتی دلیل دیتا ہے۔ قرآن کا کہنا ہے کہ جو کائنات تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے اور جس کا تم انکار نہیں کر سکتے، وہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے:

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا اَنَّ السماوات والارض كانتا رَتْقًا ففتقنا هما وجعلنا من الماء كل شيئٍ حيّ افلا يؤمنون (انبیاء ۳۰)

کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین ملے ہوئے تھے پھر ہم نے ان کو کھول دیا اور ہم نے پانی سے ہر جاندار کو بنایا۔ پھر کیا وہ ایمان نہیں لاتے

ان آیات میں واضح طور پر اس کائناتی واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کو موجودہ زمانہ میں بگ بینگ نظریہ کہا جاتا ہے۔ خدا کی نگاہ میں اول سے آخر تک تمام انسان ہیں۔ وہ غیر زمانی انداز میں خطاب کرتے ہوئے تمام منکروں سے کہہ رہا ہے کہ ایک خدا کی دلیل خود اس کائنات میں موجود ہے جس کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ پھر تم اس کا انکار کس طرح کر سکتے ہو۔

۱۹۱۲ میں امریکی عالم فلکیات وسٹو ملوین سلیفر (Vesto Melvin Slipher) نے لوول آبزرویٹری میں تحقیق کرتے ہوئے پایا کہ کچھ کہکشائیں تیزی سے بیرونی سمت میں بھاگ رہی ہیں۔ اس کے بعد ایڈوین ہبل (Edwin Hubble) اور ملٹن ہیومیسن (Milton Humason) نے ماؤنٹ ولسن کی سوانح کی دوربین پر مشاہدہ کر کے بتایا کہ تمام کی تمام کہکشائیں اپنے بیرونی سمت میں تیزی سے چلی جارہی ہیں۔ پھر ڈچ عالم فلکیات ولیم ڈی سٹر (Willem de Sitter) نے اس نظریہ کے حق میں مزید تائیدی شواہد جمع کیے۔ ۱۹۶۵ میں نیوجرسی کے آرنو پنزیاز (Arno Penzias) اور ولسن (Robert Wilson) نے ابتدائی کائناتی دھماکہ کے دوران نکلی ہوئی بعض شعاعیں (Radiation) دریافت کیں۔ اس قسم کی مختلف دریافتوں کے بعد اب یہ نظریہ ایک ثابت شدہ حقیقت سمجھا جانے لگا ہے۔

اس نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ کائنات ہمیشہ سے نہیں ہے بلکہ وہ واضح طور پر اپنا ایک متعین آغاز رکھتی ہے۔ وہ ایک وقت خاص میں شروع ہوئی۔ یہ نظریہ بتاتا ہے کہ ہم ایک پھیلتی ہوئی کائنات میں ہیں۔ ہمارے چاروں طرف کہکشائیں بے حد تیزی سے بیرونی سمت میں بھاگ رہی ہیں۔ حساب سے معلوم ہوا ہے کہ اس بیرونی رفتار کو اگر اندر کی طرف لوٹایا جائے تو تقریباً ۲۰ ہزار ملین سال میں تمام پھیلی ہوئی کائنات سمٹ کر ایک گولا بن جائے گی۔ اس نظریہ نے

خدا کے وجود کو فطرت کے قانون کے ذریعہ ثابت کر دیا ہے کیونکہ ایک جمے ہوئے مادی گولے کے اندر ایک وقت خاص میں بیرونی سمت کی طرف مسلسل حرکت کسی خارجی محرک کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اس نظریہ پر ایک امریکی سائنس داں رابرٹ جیسٹرو (Robert Jastrow) کا مضمون شائع کرتے ہوئے ریڈرز ڈائجسٹ (اکتوبر ۱۹۸۰) نے اس کا عنوان ان الفاظ میں قائم کیا ہے: کیا فلکیاتی علماء خدا کو پا گئے ہیں:

Have Astronomers Found God

وہ سائنس داں جنھوں نے یہ عقیدہ بنا لیا تھا کہ کائنات کے ہر واقعہ کی اس طرح عقلی توجیہہ کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے ماضی کے کسی طبیعی واقعہ کا نتیجہ نظر آئے۔ ایسے لوگ اس دریافت سے بے حد گھبرا اٹھے۔ کیونکہ اس سے کائنات میں طبیعی عمل اور ردعمل کے بجائے ایک زندہ خدا کی ارادی کارفرمائی نظر آتی تھی۔ حقائق کا انکار ان کے لئے ممکن نہ تھا، انھوں نے اس واقعہ کی اہمیت کو گھٹانے کے لئے اس کا نام بگ بینگ (بڑا دھماکہ) رکھ دیا۔ گویا کہ کائنات کا آغاز بس ایک بڑا پٹاخہ چھوٹنے کا معاملہ تھا اور بس۔ اسی قسم کے ایک امریکی عالم نے ایک مذہبی شخص سے مذاق کے انداز میں پوچھا کہ خدا نے جب زمین و آسمان نہیں بنائے تھے اس وقت وہ کیا کر رہا تھا۔ مذہبی شخص نے بگڑ کر جواب دیا کہ وہ ان لوگوں کے لئے جہنم تیار کرنے میں مشغول تھا جو اس قسم کے سوالات کرتے ہیں:

He was creating hell for people who asked questions like that

ب۔ قرآن کہتا ہے کہ موجودہ دنیا آخری دنیا نہیں۔ اس کے بعد ایک اور دنیا ہے۔ یہ دنیا اگرچہ آج ہم کو اپنی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتی مگر وہ ایک مکمل حقیقت کے طور پر موجود ہے۔ قرآن کے اس دعوے کے حق میں بھی قدیم متکلمین نے فلسفیانہ قیاسات کے ذریعہ دلائل قائم کرلئے تھے۔ مگر قرآن نے اس کے حق میں ایسی دلیل پیش کی جس کو انسان اپنے تجرباتی علم کے ذریعہ جان سکتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

ومن کل شیئٍ خلقنا زوجین لعلکم تذکرون (ذاریات ۴۹) اور ہر چیز کو ہم نے جوڑا جوڑا بنایا تاکہ تم دھیان کرو یعنی جب ہر چیز اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر اپنی تکمیل کرتی ہے تو اس کائناتی قانون کے مطابق موجودہ دنیا کا بھی ایک جوڑا ہونا چاہئے جو اس کی تکمیل کرے۔ دنیا کے اسی جوڑے کا نام آخرت ہے۔

آدمی میں اور جانوروں میں جوڑے کا ہونا انسان کو قدیم ترین زمانہ سے معلوم تھا۔ پھر درختوں کے اندر جوڑے ہونے کا علم ہوا۔ تاہم ۱۹۲۸ تک یہ معلوم نہ تھا کہ جامد مادہ کا بھی جوڑا ہوتا ہے۔ اسی سال ریاضیاتی طبیعیات کے ایک عالم پال ڈیراک (Paul A M. Dirac) نے مادی ذرہ کے ساتھ ایک نئے قسم کے غیر مرئی ذرہ کی موجودگی کا امکان ظاہر کیا۔ ۱۹۳۲ میں اینڈرسن (K. Anderson) نے کاسمک شعاعوں کے مطالعہ کے دوران معلوم کیا کہ الیکٹران کے ساتھ ایک اور ذرہ ہے جو اس کے مخالف برقی چارج رکھتا ہے۔ اس نئے ذرہ کا نام اینٹی

الکٹران رکھا گیا۔ یہ تحقیق آگے بڑھتی رہی۔ بالآخر معلوم ہوا کہ کائنات کے تمام ذرات جوڑوں (Pair Particles) کی شکل میں ہیں۔ پارٹکل کا اینٹی پارٹیکل، ایٹم کا اینٹی ایٹم، میٹر کا اینٹی میٹر، حتیٰ کہ ورلڈ کا اینٹی ورلڈ جیسا کہ ڈیراک نے ۱۹۳۳ میں بتایا۔

موجودہ زمانہ میں بہت سے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اینٹی ورلڈ ہم سے الگ اور ہماری دنیا کے متوازی اپنا وجود رکھتا ہے۔ موجودہ دنیا میٹر کی ترکیب سے بنی ہے، اب کائناتی قانون کے مطابق ایک اور دنیا اینٹی میٹر سے ترکیب یافتہ موجود ہونا چاہئے۔ قیاس ہے کہ ۲۰ ہزار ملین سال پہلے جب بگ بینگ کا واقعہ ہوا تو اسی وقت فوٹان میٹر اور اینٹی میٹر کی دو مختلف صورتوں میں مجتمع ہو گئے اور ورلڈ اور اینٹی ورلڈ کو بنانے میں لگ گئے۔

اس نظریہ پر پہلے سویڈش طبیعیات داں اوسکر کلین (Osker Klein) اور طبیعی فلکیات داں ہینز الفوین (Hannes Alfven) نے کام کیا تھا اور ۱۹۶۲ میں اپنے نتائج تحقیق پیش کئے۔ اس کے بعد سوویت ریاضی داں ڈاکٹر گستاف نان (Gustav Naan) نے اس کو مزید مستحکم کیا۔ ڈاکٹر گستاف نان کا کہنا ہے کہ اینٹی ورلڈ کو طبیعیات کے معلوم نظریات وقوانین کے ذریعہ پوری طرح بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا یقین ہے کہ اینٹی ورلڈ آج بھی موجود ہے مگر وہ ہم سے آزاد اور ہماری دنیا کے متوازی اپنا وجود رکھتا ہے۔ ہماری موجودہ دنیا میں تمام اینٹی پارٹیکل غیر قائم (Unstable) حالت میں ہیں۔ مگر اینٹی ورلڈ میں وہ سب قائم (Stable) حالت میں ہوں گے۔ کیونکہ تمام ایٹموں کے نیوکلیس منفی برقی چارج رکھتے ہوں گے اور تمام الکٹران مثبت برقی چارج۔

ج۔ اس سلسلہ میں ایک اور مثال لیجئے۔ قرآن میں فرعون کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

فالیوم ننجیك ببدنك لتكون لمن خلفك آیة وان كثیرا من الناس عن آیاتنا لغافلون یونس ۹۲	پس آج ہم تیرے جسم کو بچا لیں گے تاکہ تو پیچھے آنے والوں کے لئے ایک نشان رہے۔ اور بہت سے لوگ ہیں جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں۔

اس آیت کے مطابق خدا نے فرعون کی لاش کو بعد کی نسلوں کی عبرت کے لئے محفوظ کر دیا تھا۔ ۱۸۹۸ کی بات ہے کہ مغرب کے ماہرین اثریات نے فرعون کی لاش کو قدیم مصری شہر تھیبس (Thebes) سے کھدائی کر کے نکالا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰ کا سابقہ مصر کے دو فرعونوں سے ہوا تھا۔ آپ ریمسس دوم کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ مگر غرقابی کا واقعہ اس کے بعد اس کے بیٹے مرنفتاح (Merneptah) کے ساتھ پیش آیا جس کا زمانہ تیرھویں صدی قبل مسیح ہے۔ دونوں فرعونوں کی ممی کی ہوئی لاش اب قاہرہ کے عجائب خانہ میں عام زیارت کے لئے موجود ہے۔ سائنسی جانچ سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ مرنفتاح وہی فرعون ہے جو حضرت موسیٰ کے زمانہ میں پانی میں غرق ہو کر مرا تھا۔

بائبل کا بیان ہے کہ فرعون ڈوب کر ختم ہوگیا۔ وہ اس کی لاش کی موجودگی کا کوئی اشارہ نہیں کرتی۔ تاریخ اس بارے میں مکمل طور پر خاموش ہے۔ قرآن کے نزول کے وقت اور اس کے بعد ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک انسان کو فرعون کی لاش کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ مگر قرآن کے کلام اللہ ہونے کی یہ کیسی عجیب شہادت ہے کہ موجودہ زمانہ میں حیرت انگیز طور پر اس کی لاش محفوظ حالت میں دریافت ہوگئی۔ ڈاکٹر موریس نے دس صفحات میں اس کی تفصیل دیتے ہوئے آخر میں لکھا ہے:

> Those who seek among modern data for proof of the veracity of the Holy Scriptures will find a magnificent illustration of the verses of the Quran dealing with the Pharoah's body by visiting the Royal Mummies Room of the Egyptian Museum, Cairo
>
> The Bible, The Quran and Science, 1976, P. 241

یعنی جو لوگ مقدس کتابوں کی سچائی کے لئے جدید ثبوت مانگتے ہیں وہ قرآن کی ان آیات کو پڑھیں اور اس کے بعد قاہرہ کے میوزیم میں شاہی ممیوں کے کمرہ کو دیکھیں تو وہ اس کی نہایت شاندار تصدیق پالیں گے۔

اس موضوع پر جو لوگ زیادہ تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیں وہ ڈاکٹر موریس (Dr. Maurice Bucaille) کی کتاب دی بائبل دی قرآن اینڈ سائنس کا مطالعہ کریں۔ یہ اس موضوع پر ایک قابل قدر کتاب ہے۔ مصنف کو شوق تھا کہ وہ قرآن کے سائنسی بیانات کا جدید تحقیقات سے مقابلہ کریں۔ اس کے لئے انھوں نے برسوں تحقیق کی۔ صرف اسی مقصد سے عربی زبان سیکھی تاکہ قرآن کو براہ راست اس کی زبان میں سمجھ سکیں۔ اس کے بعد انھوں نے ڈھائی سو صفحات پر مشتمل مذکورہ کتاب شائع کی۔

ڈاکٹر موریس نے اپنی اس کتاب میں بہت سے سائنسی حقائق کا مقابلہ قرآن کے بیانات سے کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک قدیم کتاب کی جدید تحقیقات سے اس درجہ مطابقت اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ وہ بشری ذہن سے ماوراء کسی ذہن سے نکلی ہو۔ وہ اپنی کتاب کو ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں:

> In view of the level of knowledge in Mohammad's day, it is inconceivable that many of the statements .in the Quran which are connected with science could have been the work of a man. It is, moreover, perfectly legitimate, not only to regard the Quran as the expression of a Revelation, but also to award it a very special place, on account of the guarantee of authenticity it provides and the presence in it of scientific statements which, when studied today, appear as a challenge to explanation in human terms.

محمدؐ کے زمانہ میں علم کی جو سطح تھی اس کو دیکھتے ہوئے یہ بات بالکل ناقابل قیاس ہے کہ قرآن کے بہت سے بیانات جو سائنس سے تعلق رکھتے ہیں وہ کسی آدمی کے لکھے ہوئے ہوں۔ یہ بات پوری طرح معقول ہے کہ قرآن کو نہ صرف خدائی الہام کا ظہور سمجھا جائے بلکہ مزید اس کو ایک بہت امتیازی درجہ دیا جائے۔ قرآن اپنے مستند ہونے کی جو ضمانت

دیتا ہے اور اس کے اندر جو سائنسی بیانات ہیں، جب ان کا مطالعہ آج کیا جاتا ہے تو وہ قرآن کو انسانی کتاب قرار دینے کے خلاف ایک چیلنج معلوم ہوتے ہیں۔

۳۔ قرآنی کلامیات کا تیسرا اصول یہ ہے کہ کائنات کے اس پہلو کو نمایاں کیا جائے کہ خدا نے اس کو ہمارے لئے بطور میزان مقرر کیا ہے۔ قرآن کی دعوت یہ ہے کہ انسان خدا کی اطاعت کرے، وہ اپنے عجز کو محسوس کرتے ہوئے اپنے آپ کو اپنے خالق و مالک کے آگے ڈال دے۔ اس مطالبہ کے حق میں قرآن نے فلسفیانہ قسم کے دلائل نہیں قائم کئے بلکہ فطری انداز کے دلائل قائم کئے۔ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ایک آیت کا مطالعہ کیجئے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم النّاسُ بالقسط وانزلنا الحدید فیہ بأس شدید ومنافع للناس ولیعلم اللّٰہ من ینصرہ ورسلہ بالغیب ان اللّٰہ قوی عزیز (حدید ۲۵)

ہم نے اپنے پیغمبروں کو نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ قائم رہیں انصاف پر۔ اور ہم نے لوہا اتارا اس میں بڑی قوت ہے اور لوگوں کے لئے فائدہ ہے۔ اور تاکہ اللّٰہ جان لے کہ کون بے دیکھے اللّٰہ کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ اللّٰہ قوی اور زبردست ہے۔

میزان عربی زبان میں ترازو کو کہتے ہیں۔ یعنی وہ آلہ جس سے تول کر کسی چیز کی برابری کسی دوسری چیز سے معلوم کی جائے۔ پوری کائنات اس معنی میں خدا کی میزان ہے۔ کائنات کی ہر چیز کو خدا نے اسی حق و عدل کی بنیاد پر قائم کر رکھا ہے جس کا مطالبہ انسان سے کیا جا رہا ہے۔ کائنات کی تمام چیزیں جس عدل پر بجبر قائم ہیں اسی عدل پر انسان کو اپنے آزاد ارادہ سے قائم ہونا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللّٰہ نے کتاب میں اپنی پسند کے تمام عادلانہ طریقے بتا دئے ہیں۔ دوسری طرف کائنات کو عملاً انھیں عادلانہ طریقوں پر قائم کر دیا ہے۔ اب انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ قرآن میں اصول عدل کو پڑھ کر اس سے رہنمائی حاصل کرے۔ اور اسی کے ساتھ کائنات کے ربانی پیمانہ سے ناپ کر دیکھتا رہے کہ اس کا طریقہ خدا کے پسندیدہ معیار کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں یہاں میزان کے طور پر لوہے کا ذکر کیا گیا ہے۔ لوہے کی صورت میں اللّٰہ تعالیٰ نے مومن کے بے خطا کردار کو ممثل کیا ہے۔ موجودہ زندگی میں ہر قسم کا نفع قابل اعتماد کردار سے وابستہ ہے۔ مادہ کی دنیا میں یہی طاقت ور کردار لوہے کا ہوتا ہے۔ انسان کی دنیا میں یہی طاقت ور کردار خدا کو اپنے بندوں سے مطلوب ہے۔

اس سلسلہ میں ایک مثال شہد کی مکھی کی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کو حکم دیا کہ پہاڑوں اور درختوں میں اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں اپنے گھر بنا۔ پھر ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس۔ اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں میں چل۔ اس مکھی کے اندر سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہے جس کے مختلف رنگ ہیں۔

اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔ اس واقعہ میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو دھیان دیتے ہیں (نحل)

شہد کی مکھی کا نظام ایک انتہائی جامع اور کامل قسم کا سماجی نظام ہے۔ اس میں وہ تمام اجزاء پائے جاتے ہیں جو انسان کے بنائے ہوئے سماجی اور تمدنی نظام میں ہوتے ہیں۔ مگر شہد کی مکھیوں کا نظام ان تمام خرابیوں سے یکسر خالی ہوتا ہے جس کا شکار انسان کے سماجی اور تمدنی نظام ہمیشہ ہوا کرتے ہیں۔ شہد کی مکھی اپنی بستی بسانے کے لئے ایک جگہ کا انتخاب کرتی ہے۔ وہاں وہ ایک مکمل شہر بساتی ہے۔ وہ ایک انتہائی پیچیدہ قسم کا کارخانہ قائم کرتی ہے۔ وہ اپنے کارخانہ میں سیکڑوں میل سے ضروری سامان حاصل کر کے لاتی ہے۔ ہزاروں مکھیاں بیک وقت اپنے اپنے مقررہ کام میں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان کی اس تنظیم اور اس جدوجہد کا آخری نتیجہ ایک قیمتی پیداوار (شہد) کی صورت میں برآمد ہوتا ہے جو اعلیٰ درجہ کی تیار غذا ہے اور اسی کے ساتھ انسانی امراض میں بہترین علاج بھی۔

شہد کی مکھیاں اتنا بڑا نظام چلاتی ہیں مگر وہ اپنی آبادکاری کے لئے کسی دوسرے کا گھر نہیں اجاڑتیں۔ وہ پھولوں کا رس لینے کے لئے پھولوں کو نہیں مسلتیں۔ ان کی اجتماعی جدوجہد میں کبھی باہمی ٹکراؤ کا واقعہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی محنت سے حاصل کی ہوئی پیداوار کا ایک قطرہ بھی ضائع نہیں کرتیں اور نہ اس کو اپنی چیز سمجھ کر سب کا سب اپنے اوپر خرچ کر ڈالتی ہیں۔ وہ اس کا بڑا حصہ دوسروں کی ضرورت کے لئے وقف کر دیتی ہیں۔ شہد کی مکھیوں کی دنیا میں ہر کام ٹھیک اسی طرح انجام دیا جاتا ہے جس طرح اسے انجام دیا جانا چاہئے۔ شہد کی مکھی خدا کے حکم سے اس بات کا عملی مظاہرہ کر رہی ہے کہ انسان کو اپنی سماجی زندگی کا نظام کس طرح بنانا چاہئے۔

اسی طرح تمام خدائی احکام کی تمثیل کائنات میں قائم کر دی گئی ہے (سجدہ کی تمثیل درخت کے سایہ کی صورت میں، قابل اعتماد کردار کی تمثیل لوہے کی صورت میں، تصادم کے بغیر سفر حیات کی تمثیل ستاروں کی اپنے اپنے مدار پر گردش کرنے کی صورت میں، اتحاد کار کی تمثیل شہد کی مکھیوں کے چھتہ کی صورت میں، اپنے اور غیر کو یکساں فیض پہنچانے کی تمثیل سورج کی روشنی کی صورت میں، وغیرہ) توحید اور اطاعت الٰہی کی طرف بلانے کے لئے قرآن کا یہ انداز عین فطری ہے۔ وہ ٹھیک اسی کائناتی استدلال پر قائم ہے جس پر جدید انسان نے اپنے علم و عمل کی پوری بنیاد کھڑی کی ہے۔ اگر ہم اس کو مؤثر طور پر آج کے انسان کے سامنے رکھ سکیں تو یقیناً ان میں سے بہت سے لوگ اسلام کو اپنے دل کی آواز پائیں گے۔ انسان چاند کے گھٹنے اور بڑھنے سے اپنا مہینہ اور سال شمار کرتا ہے۔ وہ زمین اور سورج کی حرکت سے اپنی گھڑیوں کا وقت مقرر کرتا ہے۔ وہ اپنی مشینوں کو قدرت کے نمونوں پر بناتا ہے (کشتی کو مچھلی کے نمونہ پر، ہوائی جہاز کو چڑیا کے نمونہ پر، کیمرہ کو آنکھ کے نمونہ پر، وغیرہ) اسی طرح وہ کائناتی اخلاقیات کو بھی اپنے اخلاق کے لئے معیار قرار دے سکتا ہے، بشرطیکہ ہم اس کو صحیح طور پر اس کے سامنے پیش کر دیں۔ اگر وہ کائنات سے اپنا مادی معیار لے رہا ہے تو اسی کائنات سے وہ اپنا اخلاقی معیار کیوں نہیں لے سکتا۔

۴۔ جدید علم کلام کا چوتھا اصول بات کو سادہ انداز میں کہنا ہے۔ سادہ انداز سے مراد حقیقت پسندی کا انداز ہے جس میں بات کو اس کے فطری ڈھنگ سے بیان کیا گیا ہو نہ کہ ادب کے تقاضوں کی بنا پر کسی قسم کے مصنوعی انداز میں۔ سادہ اسلوب میں معنی اور قاری کے درمیان کوئی تیسری چیز رکاوٹ نہیں بنتی۔ جب کہ غیر سادہ اسلوب میں الفاظ دونوں کے درمیان غیر ضروری طور پر حائل ہو جاتے ہیں۔

انسان کو خدا نے سادہ فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اس لئے جب بات کو سادہ انداز میں کہا جائے تو گویا گول خانہ میں گول چیز رکھی گئی۔ اس کے برعکس جب بات کو کسی قسم کے بناوٹی انداز میں کہا جائے تو یہ گول خانہ میں چوکھنٹی چیز رکھنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سادہ انداز میں کہی ہوئی بات انسانی فطرت کو اپیل کرتی ہے۔ وہ اس کے اندر داخل ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ اس کی پوری ہستی میں سما جاتی ہے۔ اس کے برعکس جب بات کو مصنوعی اور پیچدار انداز میں بیان کیا جاتا ہے تو وہ انسان کی ہستی میں نہیں سماتی، وہ اس کے اندرون کا جزء نہیں بنتی۔ وہ ادھر اُدھر اٹک کر رہ جاتی ہے۔

قدیم زمانہ میں ادبی اسلوب ساری دنیا میں رائج تھا۔ کوئی اپنی بات کو شاعری کے اسلوب میں بیان کرتا تھا اور کوئی سجع کے اسلوب میں۔ کوئی تمثیل کے اسلوب میں اپنی بات پیش کرتا تھا اور کوئی کہانی کے اسلوب میں۔ موجودہ زمانہ میں ان اسالیب کی اہمیت بہت گھٹ گئی ہے۔ اب برتر اسلوب وہ سمجھا جاتا ہے جس میں بات کو واقعہ نگاری اور حقیقت بیانی کے انداز میں بیان کیا گیا ہو۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اسلوب جدید سائنسی انقلاب کی دین ہے۔ اسی لئے اس کو سائنسی اسلوب کہا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس اسلوب کا آغاز انسانی تاریخ میں پہلی بار قرآن نے کیا تھا۔

قرآن تاریخ کی پہلی معلوم کتاب ہے جس نے مصنوعی اسلوب کو چھوڑ کر فطری اسلوب میں بات کہنے کی بنیاد ڈالی۔ سائنسی اسلوب دراصل قرآنی اسلوب ہی کی ایک جدید شکل ہے۔ تاہم قرآن کے نزول کے سو برس بعد مسلمانوں کے درمیان قدیم منطق و فلسفہ کا رواج شروع ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ تقریباً تمام اسلامی علوم میں دوبارہ وہی مصنوعی انداز غالب آگیا جس کو قرآن نے ختم کیا تھا۔ لوگ اس کو کمال سمجھنے لگے کہ دین کی سادہ تعلیمات کو فنی موشگافیوں اور منطقی اصطلاحوں میں ڈھالیں اور اس کو مشجر نظم یا منظوم نثر میں سجا کر پیش کریں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم دوبارہ قرآنی اسلوب کی طرف لوٹیں۔ آج کے انسان کے سامنے اسلام کی دعوت کو پیش کرنے کے لئے سائنسی اسلوب لازمی طور پر ضروری ہے۔ تاہم یہ سائنسی اسلوب خود قرآنی اسلوب ہی کا دوسرا نام ہے۔ سائنسی اسلوب کو اختیار کر کے ہم سادہ طور پر صرف قرآنی اسلوب کی طرف لوٹیں گے نہ کہ کوئی نئی چیز اختیار کریں گے۔

احیاء اسلام

تمہید

اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ اس کا دین سربلند ہو۔ اس کو دنیا میں غالب فکر کا مقام حاصل ہو۔ مگر دین کے فکری غلبہ کے لئے عالمی حالات کی موافقت ضروری ہے۔ خدا نے ہزاروں سال کے عمل سے پیغمبر آخر الزماں کے لئے موافق حالات پیدا کئے۔ آپ نے ان حالات کو جانا اور ان کو حکیمانہ طور پر استعمال کرکے اسلام کو دنیا میں غالب فکر کا مقام عطا کیا۔

اب دوبارہ پچھلے ہزار سال کے عمل کے نتیجہ میں خدا نے وہ تمام موافق حالات جمع کر دئے ہیں جن کو استعمال کرکے از سر نو اسلام کو دنیا کا غالب فکر بنایا جا سکے۔ اسلام کو دوبارہ وہی برتری اور سربلندی حاصل ہو جو ماضی میں اسے حاصل تھی۔

مگر ان امکانات کو واقعہ بنانے کے لئے ایک ایسی سنجیدہ جدوجہد درکار ہے جو وقت کے گہرے شعور پر ابھری ہو۔ جو ردعمل کی نفسیات سے پاک ہو کر مثبت عمل کرنا جانتی ہو۔ جو ہر دوسرے احساس کو قربان کرکے صرف دین کی سربلندی کے لئے کوشش کرنے والی ہو۔ جو ربانی حکمت کی رہنمائی میں اٹھی ہو نہ کہ انسانی کج فہمیوں کی بنیاد پر۔ جس کا محرک خدا کی بڑائی قائم کرنا ہو نہ کہ قومی فخر اور مادی عظمت کا جھنڈا لہرانا۔ ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی خدا کے دین کو سربلند کیا تھا اور ایسے ہی لوگ آج بھی خدا کے دین کو سربلند کریں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ سطحی نعروں پر بھیڑ جمع کرنے کو کام سمجھیں، جو ہر پیش آمدہ مسئلہ پر دوڑنا شروع کر دیں، وہ صرف خدا کے پیدا کئے ہوئے امکانات کو برباد کریں گے۔ وہ ان امکانات کو واقعہ بنانے والے ثابت نہیں ہو سکتے۔

ایک تقابل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو اسلامی انقلاب آیا اس میں تاریخی روایات کے مطابق کل ۱۰۱۸ آدمی ہلاک ہوئے۔ اس انقلاب کی تکمیل ۲۳ سال میں ہوئی۔ ان ۲۳ سالوں میں جو غزوات پیش آئے ان کی تعداد ۸۱ بتائی جاتی ہے۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ۲۷ غزوات میں شریک تھے اور عملاً باقاعدہ جنگ صرف چند ہی غزوات میں پیش آئی۔ ان لڑائیوں میں مجموعی طور پر ہلاک ہونے والوں کی تعداد اس طرح ہے:

مسلمان مقتولین ۲۵۹

غیر مسلم مقتولین ۷۵۹ = ۱۰۱۸

صدر اول کا یہ انقلاب تاریخ کا عظیم ترین انقلاب تھا جس نے انسانی تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا۔ اتنے بڑے انقلاب میں مقتولین کی یہ تعداد اتنی کم ہے کہ اس کو غیر خونی انقلاب (Bloodless Revolution) کہا جا سکتا ہے۔

ہمارے لکھنے اور بولنے والے اکثر پرجوش انداز میں اس انقلاب کا مقابلہ موجودہ زمانہ کے غیر اسلامی انقلابات سے کرتے ہیں۔ وہ فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ اسلامی انقلاب صرف ایک ہزار آدمیوں کی جان لے کر کامیاب ہو گیا۔ جبکہ فرانس میں جمہوری انقلاب لانے کے لئے اور روس میں اشتراکی انقلاب لانے کے لئے اتنے زیادہ آدمیوں کو قربان ہونا پڑا جن کی تعداد لاکھوں میں شمار ہوتی ہے۔

یہ تقابل ہم کو بہت پسند ہے کیونکہ اس میں ہماری پر فخر نفسیات کو تسکین ملتی ہے۔ مگر یہاں تقابل کی ایک اور صورت ہے جس پر مسلمانوں نے کبھی غور نہیں کیا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ دوسرا تقابل نصیحت کا تقابل ہے اور نصیحت آدمی کے لئے ہمیشہ بہت کڑوی ہوتی ہے۔

یہ دوسرا تقابل یہ ہے کہ آپ صدر اول کی اسلامی دعوت میں مرنے والے کا مقابلہ موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکوں میں مرنے والوں سے کریں۔ بالفاظ دیگر، صدر اول کے انقلاب سے خود اپنی انقلابی کوششوں کا موازنہ کریں۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں دینی انقلاب اور اسلامی جہاد کے نام پر بڑی بڑی تحریکیں اٹھائی ہیں۔ مسلمان جس طرح زمانہ رسالت کے دینی انقلاب کا تقابل غیر مسلموں کے لادینی انقلابات سے کرتے ہیں۔ اسی طرح انھیں چاہئے کہ وہ زمانۂ رسالت کے انقلاب کو سامنے رکھ کر خود اپنی اٹھائی ہوئی تحریکوں کو تولیں اور ان کے نتائج کا جائزہ لیں۔

اگر مسلمان یہ تقابل کریں تو وہ حیرت انگیز طور پر پائیں گے کہ انھوں نے پیغمبر کی تحریک کے مقابلہ میں دوسری اقوام کی لادینی تحریکوں کو جس مقام پر کھڑا کر رکھا ہے، عین اسی مقام پر خود ان کی موجودہ زمانہ کی تحریکیں بھی کھڑی ہوئی ہیں —— الجزائر کے جہاد آزادی میں ۲۵ لاکھ مسلمان مرے۔ ہندستان کے جہاد آزادی میں ۵ لاکھ علماء اور مسلمان شہید ہوئے، اسلامی پاکستان کو وجود میں لانے کے درمیان ایک کروڑ انسان کام آگئے۔ اسی طرح شام، عراق، ایران، مصر، فلسطین اور دوسرے علاقوں میں جو لوگ اسلام کے نام پر جانیں دے رہے ہیں ان کی تعداد لاکھوں سے بھی زیادہ ہے۔ مزید یہ کہ ان تمام قربانیوں کا حاصل کچھ بھی نہیں۔ صدر اول کی اسلامی تحریک میں دس سو آدمی کام آئے، اور اس کے بعد ایسا دور رس انقلاب آیا جس کے اثرات ساری دنیا نے محسوس کر لئے۔

موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں میں مجموعی طور پر دس کروڑ آدمی ہلاک اور برباد ہو گئے۔ اس کے باوجود زمین کے اوپر کوئی ایک چھوٹا سا خطہ بھی نہیں جہاں اسلامی انقلاب حقیقی معنوں میں کامیاب اور نتیجہ خیز نظر آتا ہو۔

پھر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ سخت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہماری کوششوں کا بالکل الٹا نتیجہ برآمد ہوا ہے۔ ہمارے حق میں بائبل کے وہ الفاظ پورے ہوئے ہیں جو یہود کے بارے میں کہے گئے تھے ——— "اور تمھارا بیج بونا فضول ہوگا کیونکہ تمھارے دشمن اس کی فصل کھائیں گے۔ اور جن کو تم سے عداوت ہے وہی تم پر حکمرانی کریں گے۔ اور تمھاری قوت بے فائدہ صرف ہوگی کیونکہ تمھاری زمین سے کچھ پیدا نہ ہوگا۔ اور میدان کے درخت پھلنے ہی کے نہیں" (احبار، باب ۲۶)

ہماری جدید تاریخ ان الفاظ کے عین مصداق ثابت ہو رہی ہے۔ ہم نے خلافت اسلامی اور اتحاد عالمی کی دھواں دھار تحریکیں چلائیں اور اس کی راہ میں ان گنت قربانیاں دیں۔ مگر جب نتیجہ نکلا تو ساری مسلم دنیا بہت سی قومی حکومتوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ہم نے آزادیٔ وطن کے لئے جہاد کیا مگر جب وطن آزاد ہوا تو عملاً وہ دوسرے فرقوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ ہم نے اسلامی پاکستان وجود میں لانے کے لئے قربانیاں دیں مگر جب اسلامی پاکستان بنا تو وہاں غیر اسلامی لیڈروں کی حکومت قائم تھی۔ ہم نے مصر میں اسلامی اقتدار قائم کرنے کے لئے عظیم الشان تحریک اٹھائی مگر جب مصر کی قسمت کا فیصلہ ہوا تو وہ اسلام پسندوں کے بجائے فوجی حوصلہ مندوں کے ہاتھ میں جا چکا تھا۔ تقریباً ثلث صدی سے فلسطین کی یہودی ریاست کو مٹانے کے لئے جہاد جاری ہے اور مسلمانوں کا جان و مال بے پناہ مقدار میں تباہ ہو رہا ہے مگر عملاً صرف یہ ہوا ہے کہ یہودی ریاست کی قوت اور وسعت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں آخری دردناک خبر جو بہت جلد مسلمانوں کو سننی ہوگی وہ یہ کہ ایران میں ناقابل بیان قربانیوں کے بعد اسلامی اقتدار لایا گیا مگر یہ اسلامی اقتدار بہت جلد ملحد طاقتوں کا اقتدار قائم ہونے کا ابتدائی زینہ بن گیا۔

یہ موجودہ زمانہ کی پتھر سے بھی زیادہ سنگین حقیقتیں ہیں۔ کوئی شخص یہ کر سکتا ہے کہ اپنے ذہن میں خوش خیالیوں کی ایک دنیا بنا کر اس میں جیتا رہے مگر آئندہ آنے والا مورخ یقیناً ہماری خوش خیالیوں کی تصدیق نہیں کرے گا۔ وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوگا کہ فرانس اور روس کے انقلاب میں مرنے والوں کے حصہ میں پھر بھی یہ فائدہ آیا کہ انھوں نے عالمی فکر کا دھارا موڑ دیا۔ اس کے بعد دنیا میں شہنشاہی طرز فکر کے بجائے جمہوری طرز فکر رائج ہو گیا اور سرمایہ دارانہ طریق معیشت پر سوشلسٹ طریق معیشت کو فکری غلبہ حاصل ہو گیا۔ مگر اسلام کے نام پر برباد ہونے والے اگرچہ تعداد میں ان سے بھی زیادہ تھے مگر وہ عالمی فکر پر کسی قسم کا اثر نہ ڈال سکے۔

صدر اول کا اسلامی انقلاب بتاتا ہے کہ اگر ایک ہزار آدمی بھی یہ ثبوت دے دیں کہ وہ خدا کے دین کی خاطر قربانی کی حد تک جانے کے لئے تیار ہیں تو خدا ان کی قربانی کو قبول کر کے اسلام کو زمین پر غالب کر دیتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں کروروں آدمیوں نے قربانی کا ثبوت دیا مگر خدا کی نصرت ان کا ساتھ دینے کے لئے آسمان سے نہیں اتری۔ وہ اس کے باوجود مغلوب ہی بنے رہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہماری یہ تمام قربانیاں حقیقۃً اس صراطِ مستقیم کے مطابق نہ تھیں جس کی پیروی پر خدا نے نصرِ عزیز اور فتح مبین کا وعدہ فرمایا ہے۔ (الفتح)

کوئی کسان اگر کہے کہ میں نے گیہوں کے بیج زمین میں ڈالے مگر اس سے گیہوں اگنے کے بجائے جھاڑ جھنکاڑ اُگے تو ایسا کسان جھوٹ بولتا ہے۔ کیونکہ خدا کی اس دنیا میں یہ ممکن ہی نہیں کہ آدمی گیہوں کے بیج بوئے اور اس سے اس کے لئے جھاڑ جھنکاڑ اگے۔ یہ ناممکن ہے، یہ کرور بار ناممکن ہے۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں ہماری قربانیاں اگر فی الواقع اس راہ پر ہوتیں جس راہ پر رسول اور اصحاب رسول چلے اور اپنی جانیں دیں تو ناممکن تھا کہ اتنی غیر معمولی کوششوں کے باوجود اس کا کوئی مثبت نتیجہ نہ نکلے۔ واقعات کا یہ کھلا ہوا فیصلہ ہے۔ اگر اس کے باوجود کوئی آدمی خوش فہمی کے گنبد میں رہنا چاہے تو رہے۔ بہت جلد قیامت اس کے گنبد کو توڑ دے گی۔ اس کے بعد وہ دیکھے گا کہ وہاں اس کے لئے جھوٹی خوش فہمیوں کے کھنڈر کے سوا اور کچھ نہیں۔

نصرت خداوندی

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اے ایمان لانے والو، اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو خدا تمھاری مدد کرے گا۔ اور تمھارے قدموں کو جما دے گا (یا ایہا الذین آمنوا ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم، محمد ۷)

یہاں خدا کی نصرت کرنے سے مراد خدا کی اسکیم کے ساتھ موافقت ہے، یعنی واقعات کو ظہور میں لانے کے لئے خدا کا جو نقشہ ہے اور اس کے لئے اس نے جو موافق حالات فراہم کئے ہیں ان کے ساتھ اپنی کوششوں کو جوڑ دینا۔ جو لوگ اس طرح خدا کی نصرت کریں ان کو جماؤ حاصل ہوتا ہے اور بالآخر وہ کامیاب رہتے ہیں۔ خدا کی اس دنیا میں خدائی منصوبہ سے مطابقت کر کے ہی کوئی نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے نہ کہ بطور خود آزادانہ عمل کر کے۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ ایک پادری صاحب اپنے مکان کے سامنے ایک ہرا بھرا درخت دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر میں اس کا بیج بوؤں تو وہ دس سال میں پورا درخت بنے گا۔ انھوں نے ایسا کیا کہ کہیں سے ایک بڑا درخت کھدوایا پھر کئی آدمیوں کے ذریعہ اس کو وہاں سے اٹھوایا اور اس کو لاکر اپنے گھر کے سامنے لگا دیا۔ وہ خوش تھے کہ انھوں نے دس سال کی مدت ایک دن میں طے کر لی ہے، لیکن اگلے دن جب وہ صبح کو سو کر اٹھے تو ان کو یہ دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا کہ درخت کے پتے مرجھا چکے ہیں۔ شام تک شاخیں بھی لٹک گئیں۔ چند دن کے بعد درخت کے پتے سوکھ کر جھڑ گئے اور اس کے بعد ان کے گھر کے سامنے صرف لکڑی کا ایک ٹھنٹھ کھڑا ہوا تھا۔

انھیں دنوں پادری صاحب کا ایک دوست ان سے ملنے کے لئے آیا۔ دوست نے دیکھا کہ پادری صاحب اپنے گھر کے سامنے بے چینی کے ساتھ ٹہل رہے ہیں۔ اس نے کہا، آج میں آپ کو غیر معمولی طور پر پریشان دیکھ رہا ہوں، آخر کیا بات ہے۔ پادری صاحب نے جواب دیا —— میں جلدی میں ہوں مگر خدا جلدی نہیں چاہتا:

I am in hurry, but God doesn't

اس کے بعد پادری صاحب نے درخت کے مذکورہ قصہ کو بتاتے ہوئے کہا کہ دنیا میں جو واقعات ہوتے ہیں ان میں ایک حصہ خدا کا ہوتا ہے اور ایک حصہ انسان کا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے دو دندانہ دار پہیوں (Cog Wheels) کے ملنے سے مشین کا چلنا۔ ایک پہیہ خدا کا ہے، دوسرا پہیہ انسان کا۔ انسان جب خدا کے پہیہ کا ساتھ دیتا ہے تو وہ کامیاب رہتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ خدا کے پہیے کی رفتار کا لحاظ کئے بغیر چلنا چاہے تو وہ ٹوٹ جائے گا کیونکہ خدا کا پہیہ مضبوط ہے اور انسان کا پہیہ کمزور۔

خدا نے کروروں سال کے عمل سے زمین کے اوپر زرخیز مٹی کی تہ بچھائی جس کے اوپر کوئی درخت اگے۔ سورج کے ذریعہ اوپر سے ضروری حرارت بھیجی۔ آفاقی اہتمام کے تحت پانی مہیا فرمایا۔ موسموں کی تبدیلی کے ذریعہ اس کی پرورش کا انتظام کیا۔ کھرب با کھرب کی تعداد میں بیکٹیریا پیدا کئے جو درخت کی جڑوں کو نائٹروجن کی غذا فراہم کریں۔ یہ تمام انتظام گویا خدا کا دندانہ دار پہیہ (Cog Wheel) ہے۔ اب انسان کو اس میں اپنا دندانہ دار پہیہ ملانا ہے تاکہ مذکورہ مواقع اس کے لئے درخت کی صورت اختیار کر سکیں۔ انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ ایک بیج لے اور اس کو زمین میں دبا دے۔ اگر وہ ایسا کرے تو گویا اس نے خدا کے پہیے میں اپنے پہیے کو ملایا۔ اس کے بعد فطرت کی مشین چلنا شروع ہو جائے گی اور وقت پر اپنا نتیجہ دکھائے گی۔ اس کے برعکس اگر انسان اپنا بیج پتھر پر ڈال دے۔ یا بیج کے بجائے اس کے ہم شکل پلاسٹک کے دانے زمین میں بوئے۔ یا وہ ایسا کرے کہ بیج بونے کے بجائے پورا درخت اکھاڑ کر لائے اور اس کو اپنی زمین میں اچانک کھڑا کرنا چاہے تو گویا اس نے اپنا پہیہ خدا کے پہیے میں نہیں ملایا، اس نے اپنے آپ کو خدا کے منصوبے میں شامل نہیں کیا۔ ایسے آدمی کے لئے اس دنیا میں ہرے بھرے درخت کا مالک بننا مقدر نہیں۔

یہی معاملہ اسلامی انقلاب کا بھی ہے۔ وہ بھی خدا کے پیدا کردہ مواقع کو سمجھنے اور ان کو استعمال کرنے سے ظہور میں آتا ہے، نہ کہ خود ساختہ قسم کی اچھل کود مچانے سے۔ صدر اول میں جو انقلاب آیا وہ اس لئے آیا کہ خدا کے کچھ بندوں نے اپنا پہیہ خدا کے پہیہ میں ملا دیا۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ میں ہماری تمام قربانیاں اس لئے رائگاں چلی گئیں کہ ہم نے خدائی منصوبہ کے ساتھ موافقت نہیں کی بلکہ خود ساختہ راہوں میں غیر متعلق قسم کی

ہنگامہ آرائیاں کرتے رہے۔

دین توحید اور دین شرک

قرآن کے اشارات (البقرہ ۲۱۳) سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم کے بعد جب انسان زمین پر آباد ہوا تو سب کا دین توحید تھا۔ یہ صورت چند سو سال تک جاری رہی۔ اس کے بعد لوگوں کے اندر مظاہر پرستی کا آغاز ہوا جس کا دوسرا نام شرک ہے۔ دکھائی نہ دینے والے خدا کو اپنا مرکز توجہ بنانا انسان کے لئے مشکل تھا، چنانچہ اس نے عقیدۃً خدا کو مانتے ہوئے یہ کیا کہ دکھائی دینے والی چیزوں کو اپنا مرکز توجہ بنالیا۔ یہی وہ دور ہے جب کہ سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش شروع ہوئی۔ پہاڑوں اور سمندروں کو دیوتا سمجھ لیا گیا۔ حتی کہ انسانوں میں سے جس کے پاس عظمت واقتدار نظر آیا اس کو بھی خدا کا شریک فرض کر لیا گیا۔ اس طرح تقریباً ایک ہزار سال بعد وہ وقت آیا جب کہ توحید کا فکری غلبہ ختم ہوگیا۔ اور انسانی ذہن پر دین شرک غالب آگیا۔

ابتدائی دین توحید میں اس بگاڑ کے بعد خدا نے اپنے پیغمبر بھیجنے شروع کئے۔ مگر ان پیغمبروں کو کبھی اتنی مقبولیت حاصل نہ ہوسکی کہ دین شرک کو مٹا کر دوبارہ دین توحید کو غالب اور سربلند کرتے۔ انسانی نسل اس زمانہ میں جن جن مقامات پر پھیلی تھی، ہر مقام پر خدا کے پیغمبر لگاتار آتے رہے (المومنون ۴۴) ایک حدیث کے مطابق ان پیغمبروں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ لاکھ تھی۔ مگر تمام پیغمبروں کا یہ حال ہوا کہ ان کو استہزار کا موضوع بنالیا گیا (یس ۳۰)

جب آدمی سچائی کا انکار کرتا ہے، بلکہ اس کا مذاق اڑانے پر اتر آتا ہے تو یہ خواہ مخواہ نہیں ہوتا۔ ایسا رویہ آدمی ہمیشہ کسی چیز کے بل پر اختیار کرتا ہے۔ اس کے پاس کوئی ناز ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ حق سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ یہ کیا ہے۔ اس کا جواب قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے:

فلما جاءتهم رسلهم بالبينات فرحوا بما	جب ان کے پاس ان کے رسول دلائل لے کر آئے تو وہ
عندهم من العلم وحاق بهم ما كانوا به	اس علم پر مگن رہے جو ان کے پاس تھا اور ان کو گھیر لیا
يستهزؤن المومن ۸۳	اس چیز نے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔

یہاں "علم" سے مراد وہ بگڑا ہوا مذہب ہے جو زمانہ گزرنے کے بعد ان قوموں کے نزدیک مقدس بن گیا تھا۔ اس قسم کا آبائی مذہب ہمیشہ ایک قائم شدہ مذہب ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ مانے ہوئے بزرگوں کے نام وابستہ ہوتے ہیں۔ اس کے اوپر بڑے بڑے ادارے چل رہے ہوتے ہیں۔ اس کی بنیاد پر ان کا پورا قومی ڈھانچہ کھڑا ہوا ہوتا ہے۔ اس کو لمبی روایات کے نتیجہ میں عظمت کا سب سے اونچا مقام مل چکا ہوتا ہے۔

ان قوموں کے پاس ایک طرف ان کا مسلمہ مذہب تھا، جو شرک کی بنیاد پر قائم تھا۔ دوسری طرف پیغمبر ایک ایسی توحید کی آواز بلند کرتا جو وقت کے ماحول میں اجنبی ہوتی تھی۔ اس کا داعئ حق ہونا ایک ایسے

دعوے کی حیثیت رکھتا تھا جس کی پشت پر ابھی تاریخ کی تصدیقات جمع نہیں ہوئی ہیں۔ اس کے پاس اپنی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے لفظی دلیل کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس تقابل میں انھیں وقت کا پیغمبر واضح طور پر حقیر نظر آتا اور ان کا اپنا آبائی مذہب واضح طور پر عظیم۔ حضرت مسیح بے گھر تھے اور درخت کے نیچے سوتے تھے۔ دوسری طرف یہودیوں کا مذہبی سردار ہیکل کی عظیم عمارت میں جلوہ افروز تھا۔ پھر ہیکل کے صدر نشین کے مقابلہ میں درخت کے نیچے سونے والا لوگوں کو زیادہ برسرِ حق کیسے نظر آتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قومیں اپنے معاصر پیغمبروں کو استہزار کا موضوع بناتی رہیں۔ اس استہزار پر جو چیز انھیں آمادہ کرتی وہ ان کا یہ احساس تھا کہ ہم تو مسلّمہ اکابر کا دامن تھامے ہوئے ہیں، پھر ان کے مقابلہ میں اس معمولی آدمی کی کیا حیثیت۔ اکابر کی اس فہرست میں اگرچہ قدیم انبیار تک ہوتے تھے۔ مگر ان انبیار کی حیثیت عملاً ان کے یہاں ایک قسم کے قومی ہیرو کی تھی نہ کہ فی الواقع داعیٔ حق کی۔

اعلاء کلمۃ اللہ

آپ نے دیکھا ہوگا کہ سڑکوں کے چوراہے پر کھمبا لگا ہوتا ہے جس میں ہری اور لال روشنیاں ہوتی ہیں۔ جس رخ پر ہری روشنی ہو ادھر سواریوں کو جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ اور جس رخ پر لال روشنی ہو رہی ہو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ادھر سواریاں نہ جائیں۔ اگر کوئی سواری اس نشان دہی کی خلاف ورزی کرے تو وہ ٹریفک قوانین کے مطابق قابلِ سزا قرار پاتی ہے۔

داعیٔ حق کی حیثیت اصلاً اسی قسم کے رہنما کھمبا کی ہے۔ وہ خدا کی طرف سے مقرر کیا جاتا ہے کہ زندگی کے راستوں پر کھڑا ہو کر لوگوں کو بتائے کہ وہ کدھر جائیں اور کدھر نہ جائیں۔ کون سا راستہ جنت کی طرف جا رہا ہے اور کون سا جہنم کی طرف۔ (وکذلک جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا)

ابتدائی دورِ توحید کے بعد غلبۂ شرک کے زمانے میں خدا کی طرف سے جو رسول آئے وہ اسی خاص مقصد کے لئے آئے۔ ان کو خدا نے حقیقت کا صحیح علم دے کر کھڑا کیا کہ وہ قوموں کی رہنمائی کریں اور ان کو یہ بتائیں کہ دنیا کی زندگی میں ان کے لئے صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ ہر نبی نے اپنی اس ذمہ داری کو پوری طرح انجام دیا۔ انھوں نے ان کی قابلِ فہم زبان میں دلائل کی پوری قوت کے ساتھ لوگوں کے سامنے حق کو پیش کیا اور مسلسل اتنی وضاحت کی کہ ان کے مخاطبین کے سامنے اتمامِ حجت کی حد تک خدا کا پیغام پہنچ گیا۔ پھر جس نے رسول کا ساتھ دیا وہ خدا کے نزدیک جنتی ٹھہرا۔ جس نے رسول کو نہ مانا وہ سرکش اور باغی قرار دے کر جہنم میں ڈال دیا گیا۔

تاہم اللہ تعالیٰ کو حق کے اعلان کے ساتھ یہ بھی مطلوب تھا کہ دوبارہ حق کا اظہار ہو۔ حق کا اعلان تو یہ ہے

کہ لوگوں کو حق کے بارے میں پوری طرح بتا دیا جائے۔ خیر خواہی اور حکمت کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات کو اس طرح کھول دیا جائے کہ سننے والوں کے لئے یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ ہم اس سے بے خبر تھے۔ ہم یہ جانتے ہی نہ تھے کہ زندگی میں کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ اسی کا نام اتمام حجت ہے۔

اظہار اس سے آگے کی چیز ہے۔ اظہار کا مطلب یہ ہے کہ دینی فکر دنیا کا غالب فکر بن جائے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے افکار پست اور مغلوب ہو کر رہ جائیں۔ اس کو دوسرے لفظوں میں اعلاء کلمۃ اللہ کہا گیا ہے۔ اظہار دین یا اعلاء کلمۃ اللہ سے مراد اصلاً حدود و قوانین کا نفاذ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد فکری غلبہ ہے۔ یعنی اسی قسم کا غلبہ جیسا غلبہ موجودہ زمانہ میں جدید علوم کو قدیم روایتی علوم پر حاصل ہوا ہے۔ مثلاً سرمایہ داری پر سوشلزم کا فکری غلبہ، شہنشاہیت پر جمہوریت کا فکری غلبہ اور قیاسی فلسفہ پر تجرباتی سائنس کا فکری غلبہ۔ جدید سائنسی دنیا میں بعض علوم نے غالب علم کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اور بعض دوسرے علوم نے ان کے مقابلہ میں اپنی برتری کھو دی ہے۔ اسی قسم کا غلبہ دین حق کا بھی دین باطل کے اوپر مطلوب ہے۔

خدا قادر مطلق ہے۔ اس کے لئے بہت آسان تھا کہ وہ حق کو دوسری باتوں پر فائق و برتر کر دے جس طرح اس نے سورج کی روشنی کو دوسری تمام زمینی روشنیوں پر فائق کر رکھا ہے۔ مگر موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں خدا اپنے مطلوب واقعات کو اسباب کے روپ میں ظاہر کرتا ہے نہ کہ معجزات کے روپ میں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اسباب کے دائرہ میں اس مقصد کے لئے تمام ضروری حالات پیدا کئے جائیں اور اس کے بعد ایک ایسا پیغمبر بھیجا جائے جس کو خصوصی طور پر غلبہ کی نسبت دی گئی ہو۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے منصوبہ میں شامل کر کے نہ صرف حق کا اعلان کرے بلکہ حق کا اظہار بھی کر دے تاکہ خدا کے بندوں پر خدا کی نعمت کا اتمام ہو اور ان پر ان برکتوں کے دروازے کھلیں جو ان کی نادانی سے ان کے اوپر بند پڑے ہوئے ہیں۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن کی ان آیتوں میں کہی گئی ہے:

یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکفرون ۝ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون ۝

الصف ۸ - ۹

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا خواہ وہ منکروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو تمام دین پر غالب کر دے خواہ وہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو

ایک نئی قوم برپا کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انا دعوۃ ابراھیم (میں ابراہیم کی دعا ہوں) حضرت ابراہیمؑ

نے کعبہ کی تعمیر کے وقت یہ دعا کی تھی کہ اے خدا تو میرے لڑکے اسمٰعیل کی اولاد میں ایک نبی پیدا کر (البقرہ ۱۲۹
تاہم حضرت ابراہیم کی دعا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے درمیان تقریباً ڈھائی ہزار سال کا
فاصلہ ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ حضرت زکریا نے اپنی اولاد میں ایک پیغمبر پیدا کئے جانے کی دعا کی تو ایک
سال کے اندر ہی آپ کے یہاں حضرت یحییٰ پیدا ہو گئے (آل عمران ۳۹) اور حضرت ابراہیم نے اسی قسم کی دعا
فرمائی تو اس کی عملی قبولیت میں ڈھائی ہزار سال لگ گئے۔ اس فرق کی وجہ کیا تھی۔

اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ حضرت یحییٰ کو ایک وقتی کردار ادا کرنا تھا۔ آپ اس لئے بھیجے گئے کہ یہود کے دینی بھرم کو کھولیں اور بالآخر ان کے ہاتھوں قتل ہو کر یہ ثابت کریں کہ یہود اب اتنا بگڑ چکے ہیں کہ انھیں معزول کر دیا جائے اور ان کی جگہ دوسری قوم کو کتاب الٰہی کا حامل بنایا جائے۔ اس کے مقابلہ میں پیغمبر اسلام کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ شرک کو مغلوب کر کے توحید کو غالب فکر کی حیثیت دے دیں۔ اس کام کو اسباب کے ڈھانچہ میں انجام دینے کے لئے ایک نئی صالح قوم اور موافق حالات درکار تھے۔ یہی وہ قوم اور یہی وہ حالات ہیں جن کو وجود میں لانے کے لئے ڈھائی ہزار سال لگ گئے۔

اس منصوبہ کے تحت حضرت ابراہیمؑ کو حکم ہوا کہ وہ عراق کے متمدن علاقہ سے نکلیں اور حجاز کے خشک اور غیر آباد مقام پر اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو لاکر بسا دیں (ابراہیم ۳۷) یہ مقام اس وقت وادیٔ غیر ذی زرع ہونے کی وجہ سے دنیا سے الگ تھلگ تھا۔ یہاں تمدنی آلائشوں سے دور رہ کر خالص فطرت کی آغوش میں ایک ایسی قوم کی تعمیر کی جاسکتی تھی جس کے اندر خدا کی پیدا کی ہوئی فطری صلاحیتیں محفوظ ہوں۔ (ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک، البقرہ ۱۲۸) قبولیت دعا میں ڈھائی ہزار سالہ تاخیر کا واضح مطلب یہ تھا کہ مخصوص ماحول میں توالد و تناسل کے ذریعہ وہ جاندار قوم وجود میں آئے جو خدا کے دین کی سچی حامل بن سکے۔ جو پورے معنوں میں ایک جان دار قوم ہو اور ان تمام مصنوعی کمیوں سے پاک ہو جن کی وجہ سے دور اول میں خدا کے دین کے اظہار کے لئے کار آمد آدمی نہ مل سکے۔ جب منصوبہ کے مطابق مکمل اسٹیج تیار ہو گیا اس وقت بنو ہاشم کے یہاں آمنہ بنت وہب کے پیٹ سے وہ پیغمبر علیہ پیدا کر دیا گیا جس کی دعا حضرت ابراہیم کی زبان پر جاری ہوئی تھی۔

حضرت ابراہیم نے خدا کے حکم سے ہاجرہ اور اسمٰعیل کو موجودہ مکہ کے مقام پر لاکر بسا دیا جہاں اس وقت سوکھی زمین اور خشک پتھروں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جب مشک کا پانی ختم ہو گیا اور اسماعیل پیاس کی شدت سے ہاتھ پاؤں مارنے لگے تو خشک بیابان میں زمزم کا چشمہ نکل آیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ خدا نے اگرچہ تم کو بڑے سخت محاذ پر کھڑا کیا ہے مگر وہ ایسا نہیں کرے گا کہ تم کو بے سہارا چھوڑ دے۔ تمہارا معاملہ خدا

کا معاملہ ہے اور خدا ہر نازک موڑ پر تمھاری مدد کے لئے موجود رہے گا۔ اسماعیل جب نوجوانی کی عمر کو پہنچے تو حضرت ابراہیمؑ نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ اس خواب کو انھوں نے حکم خداوندی سمجھا اور بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گئے مگر عین اس وقت جب کہ ان کی چھری اسماعیل کے گلے پر پہنچ چکی تھی خدا نے آواز دے کر انھیں روک دیا اور اس کے بدلے انھیں ایک مینڈھا دیا جس کو وہ خدا کے نام پر ذبح کریں۔ یہ اس بات کا مظاہرہ تھا کہ تم سے اگرچہ ہم نے بہت بڑی قربانی مانگی ہے مگر یہ صرف جذبہ کا امتحان ہے۔ قربانی پیش تو کرنا ہو گا مگر ابھی قربان ہونے کی نوبت نہیں آئے گی کہ خدا تمھیں بچالے گا۔ کیونکہ اصل مقصد تم کو ایک بڑے کام کے لئے استعمال کرنا ہے نہ کہ خواہ مخواہ ہلاک کر دینا۔

حضرت اسماعیل بڑے ہوئے تو انھوں نے قبیلۂ جرہم کی ایک لڑکی سے شادی کر لی جو زمزم نکلنے کے بعد آکر مکہ میں آباد ہو گیا تھا۔ حضرت ابراہیم جو اس وقت شام میں تھے، ایک روز گھوڑے پر سوار ہو کر آئے اس وقت گھر پر اسماعیل نہ تھے، صرف ان کی بیوی موجود تھیں جو اپنے خسر کو پہچانتی نہ تھیں، حضرت ابراہیم نے پوچھا کہ اسماعیل کہاں گئے ہیں، بیوی نے کہا کہ شکار کرنے کے لئے۔ پھر پوچھا کہ تم لوگوں کی گزر کیسی ہوتی ہے۔ بیوی نے معاشی تنگی اور گھر کی ویرانی کی شکایت کی، اس کے بعد حضرت ابراہیم واپس چلے گئے اور خاتون سے کہا کہ جب اسماعیل آئیں تو ان سے میرا سلام کہنا اور یہ پیغام پہنچا دینا کہ اپنی چوکھٹ کو بدل دو (غیر عتبة بابك) حضرت اسماعیل نے واپسی کے بعد جب پورا واقعہ سنا تو انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ میرے باپ تھے جو ہمارا حال دیکھنے آئے تھے اور "چوکھٹ بدل دو" کا مطلب استعارے کی زبان میں یہ ہے کہ اس بیوی کو چھوڑ کر دوسری بیوی کر لو، کیونکہ وہ اس نسل کو پیدا کرنے کے لئے موزوں نہیں جس کا منصوبہ خدا نے بنایا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس بیوی کو طلاق دے دی اور دوسری عورت سے شادی کر لی۔ اس کے کچھ دن بعد حضرت ابراہیم دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے، اب بھی اسماعیل گھر پر موجود نہ ملے۔ حضرت ابراہیم نے دوسری بیوی سے بھی وہی سوال کیا جو انھوں نے پہلی بیوی سے کیا تھا۔ اس بیوی نے اسماعیل کی تعریف کی اور کہا کہ جو کچھ ہے بہت اچھا ہے، سب خدا کا شکر ہے، اس کے بعد حضرت ابراہیم یہ کہہ کر واپس چلے گئے کہ اسماعیل آئیں تو ان کو میرا سلام کہنا اور یہ پیغام پہنچا دینا کہ چوکھٹ کو قائم رکھو (ثبت عتبة بابك) یعنی تمھاری یہ بیوی پیش نظر منصوبہ کے لئے بالکل ٹھیک ہے، اس کے ساتھ اپنا تعلق باقی رکھو (تفسیر ابن کثیر)

اس طرح عرب کے الگ تھلگ علاقے میں اسماعیل کے ابتدائی خاندان سے ایک نئی نسل بننا شروع ہوئی جس نے بالآخر اس جاندار قوم (بنو اسماعیل) کی صورت اختیار کی جو نبی آخر الزماں کا گہوارہ بن سکے اور تاریخ کی اس عظیم ترین ذمہ داری کو سنبھالے جو خدا اس کے سپرد کرنا چاہتا تھا۔

یہ قوم جو عرب کے صحراؤں اور چٹیل بیابانوں میں تیار ہوئی، اس کی خصوصیات کو ایک لفظ میں المروۃ کہا جاسکتا ہے۔ المروۃ کے لفظی معنی ہیں مردانگی۔ یہ عربوں کے یہاں کسی کے جوہر انسانیت کو بتانے کے لئے سب سے اونچا لفظ سمجھا جاتا تھا۔ قدیم عربی شاعر کہتا ہے:

اذا المرء اعیتہ المروۃ ناشئا فمطلبہا کہلا علیہ شدید

(آدمی اگر اٹھتی جوانی میں مردانگی کا مقام حاصل کرنے سے عاجز رہ جائے تو بڑھاپے میں اس کو حاصل کرنا بہت مشکل ہے)

پروفیسر فلپ ہٹی نے عرب تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عرب کے بیابانوں میں صدیوں کے عمل سے جو قوم تیار ہوئی وہ دنیا کی ایک نرالی قوم تھی جو مندرجہ ذیل اخلاقی صفات میں کمال درجہ رکھتی تھی:

> Courage, endurance in time of trouble (sabr) observance of the rights and obligations of neighbourliness (jiwar) manliness (muruah) generosity and hospitality, regard for women and fulfilment of solemn promises. (P. 253)

ہمت، مشکل کے وقت برداشت، پڑوسی کے حقوق اور ذمہ داریوں کی ادائگی، مردانگی، فیاضی اور مہمان نوازی، عورتوں کی عزت اور وعدہ کرلینے کے بعد اسے پورا کرنا۔

خیر امت

اس طرح ڈھائی ہزار سالہ عمل کے ذریعہ ایک ایسی قوم نکالی گئی جو اپنے انسانی اوصاف کے اعتبار سے تمام قوموں میں سب سے بہتر تھی (کنتم خیر امۃ اخرجت للناس، آل عمران ۱۱۰) حضرت عبداللہ بن عباس نے خیر امت سے مہاجرین کا گروہ مراد لیا ہے (ھم الذین ھاجروا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من مکۃ الی المدینۃ، تفسیر ابن کثیر) مہاجرین دراصل اس گروہ کی علامت تھے۔ باعتبار حقیقت اس سے وہ پورا عرب گروہ مراد ہے جس کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔

پیغمبروں کو ہر زمانہ میں ایک ہی سب سے بڑی رکاوٹ پیش آئی ہے۔ ان کی مخاطب قوموں کے پاس جو آبائی دین ہوتا تھا اس کے ساتھ مادی رونقیں اور درودیوار کی عظمتیں شامل ہوتی تھیں۔ دوسری طرف وقت کا پیغمبر دلیل مجرد کی سطح پر کھڑا ہوتا تھا۔ عرب میں جو قوم تیار ہوئی اس کے اندر یہ انوکھی صفت تھی کہ وہ حق کو دلیل مجرد کی سطح پر پاسکے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسے حق کے حوالے کردے جس نے ابھی ظواہر کا روپ اختیار نہیں کیا ہے۔ کھلے آسمان اور وسیع صحراؤں کے درمیان جو قوم تیار ہوئی وہ حیرت انگیز طور پر اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتی تھی کہ حقیقت کو اس کے بے آمیز روپ میں دیکھ سکے، وہ ایک ایسے حق کے لئے اپنا سب کچھ سونپ دے جس سے بظاہر دنیا میں کچھ بھی ملنے والا نہیں۔ اصحاب رسول کی اس خصوصیت کو حضرت عبداللہ بن مسعود نے تین

لفظوں میں اس طرح ادا کیا ہے: وہ اس امت کے سب سے افضل لوگ تھے۔ وہ سب سے زیادہ نیک دل، سب سے زیادہ گہرا علم رکھنے والے اور سب سے کم تکلف والے تھے۔ اللہ نے ان کو اپنے نبی کی صحبت اور دین کے قیام کے لئے چن لیا تھا (کانوا افضل ھٰذہ الامۃ ابرّھا قلوبا واعمقھا علما واقلھا تکلفا اختارھم اللہ لصحبۃ نبیہ ولاقامۃ دینہ)

دورِ شرک میں انسان سے سب سے اہم صفت جو کھوئی گئی تھی، وہ تھی ——— حقیقت کو مجرد سطح پر دیکھنے کی صلاحیت۔ اب انسان حقیقت کو محسوسات اور مظاہر کی سطح پر دیکھتا تھا، وہ حقیقت کو مجرد سطح پر دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا۔ یہی اصل رکاوٹ تھی جس کی وجہ سے پچھلے زمانے میں نبیوں کا مذاق اڑایا جاتا رہا۔

وہ خدا کے منکر نہ تھے مگر انھوں نے خدا کو محسوسات کے پیکر میں ڈھال لیا تھا۔ وہ غیب میں چھپے ہوئے خدا کو سمجھ نہیں پاتے تھے۔ اس لئے انھوں نے نظر آنے والی چیزوں کو خدائی کا پیکر فرض کرکے ان کو اپنا مرکزِ توجہ بنا لیا تھا، خواہ یہ مادی بڑائیاں ہوں یا انسانی بڑائیاں۔ ان کی یہی کمزوری پیغمبر کی پیغمبری پر یقین کرنے میں مانع تھی۔ ہر پیغمبر جب آتا ہے تو اپنے زمانہ کے لوگوں کے لئے وہ محض ایک انسان ہوتا ہے۔ ابھی اس کے نام کے ساتھ وہ تاریخی بڑائیاں شامل نہیں ہوتیں جو بعد کے دور میں اس کے ساتھ شامل ہو جاتی ہیں۔

حضرت ابراہیم نے اپنی دعا میں فرمایا تھا: اے میرے رب، اس شہر (مکہ) کو تو امن والا شہر بنا دے اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس سے دور رکھ کہ ہم بتوں کو پوجیں۔ اے میرے رب، ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا۔ بس جس نے میری پیروی کی وہ میرا ہے اور جس نے میرا کہنا نہ مانا تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔ اے میرے رب، میں نے اپنی اولاد کو ایک ایسے میدان میں بسایا ہے جہاں کھیتی نہیں، تیرے محترم گھر کے پاس، اے ہمارے رب تاکہ وہ نماز قائم کریں (ابراہیم ۳۷-۳۵)

حضرت ابراہیم کے زمانہ میں شرک کا غلبہ اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ عالی شان بت خانے ہر طرف قائم تھے۔ انسان کے لئے بظاہر ناممکن ہو گیا تھا کہ وہ اس سے ہٹ کر سوچ سکے۔ اس وقت اللہ کے حکم سے حضرت ابراہیم نے ایک چٹیل زمین میں ایک نئی نسل پیدا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ ایک محفوظ علاقہ میں ایسے افراد تیار کرنے کا منصوبہ تھا جو ظواہر سے اوپر اٹھ کر حقائق کا پرستار بن سکے۔ چنانچہ اسی انسانی مادہ سے وہ قوم بنی جس کے متعلق قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں:

ولکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم وکرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان

مگر اللہ نے ایمان کو تمھارے لئے محبوب بنا دیا اور اس کو تمھارے دلوں میں مزین کر دیا اور تمھارے لئے کفر

اولٰئک ھم الراشدون (الحجرات ۷) اور فسق اور نافرمانی کو قابل نفرت بنادیا۔ یہی لوگ راہ راست والے ہیں۔

اس آیت کو ہم اس وقت سمجھ سکتے ہیں جب کہ اس کو ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے حالات میں رکھ کر دیکھیں جب کہ اصحاب رسول کے ایمان کا واقعہ پیش آیا۔ انھوں نے دکھائی دینے والے خداؤں کے ہجوم میں دکھائی نہ دینے والے خدا کو پایا اور اس کو اپنا سب کچھ بنالیا۔ عظمت کے مناروں کے درمیان انھوں نے عظمتوں سے خالی پیغمبر کو پہچانا اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کردیا۔ ایک دین غریب (اجنبی دین) اپنی ساری بے سر و سامانی کے باوجود ان کی نظر میں اتنا محبوب ہوگیا کہ اس کی خاطر کوئی بھی قربانی کرنا ان کے لیے مشکل نہ رہا۔ خلاصہ یہ کہ انھوں نے ایک ایسی سچائی کو دیکھ لیا جو ابھی مجرد روپ میں تھی۔ جس کی پشت پر تاریخ کی تصدیقات ابھی جمع نہیں ہوئی تھیں۔ جو ابھی قومی فخر کا نشان نہیں بنا تھا۔ جس میں اپنا سب کچھ دے دینا تھا۔ مگر دنیا میں اس کے بدلے کچھ بھی پانا نہ تھا۔

اس معاملہ کی ایک نمائندہ مثال وہ ہے جو ہجرت سے پہلے بیعت عقبہ ثانیہ کے وقت پیش آئی۔ عین اس زمانہ میں جب کہ مکہ میں اسلام کے حالات بے حد تنگ ہو چکے تھے، مدینہ میں کچھ مسلمانوں کی تبلیغ سے اسلام پھیلنے لگا۔ حتیٰ کہ ہر گھر میں داخل ہوگیا۔ اس وقت مدینہ کے کچھ لوگوں نے طے کیا کہ وہ مکہ جاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر نصرت کی بیعت کریں اور آپ کو مکہ چھوڑ کر مدینہ آنے کی دعوت دیں۔ حضرت جابر انصاری کہتے ہیں کہ جب مدینہ کے گھر گھر میں اسلام پہنچ گیا تو ہم نے مشورہ کیا کہ آخر کب تک ہم اللہ کے رسول کو اس حال میں چھوڑے رکھیں کہ آپ مکہ کے پہاڑوں میں پریشان اور ڈرے سہمے پھرتے رہیں (ثم ائتمروا جمیعا فقلنا حتی متی نترک رسول اللہ یطوف ویطرد فی جبال مکۃ ویخاف) رسول اللہ کا بے یار و مددگار ہونا ظاہر بینوں کے لئے اس بات کا ثبوت تھا کہ آپ اللہ کے رسول ہی نہیں۔ اگر اللہ کے رسول ہوتے تو آپ کی یہ حالت کیوں ہوتی۔ مگر اہل مدینہ نے آپ کے معاملہ کو حقیقت کی نظر سے دیکھا۔ انھوں نے یہ راز پالیا کہ آپ کا معاملہ ایک خدائی معاملہ ہے اور آپ کی مدد کرکے وہ خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے مستحق بن سکتے ہیں۔

بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر مدینہ کے ستر سے کچھ اوپر نمائندوں نے مکہ آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بیعت کیسے نازک حالات میں ہوئی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس وفد کے ایک رکن کعب بن مالک انصاری کہتے ہیں کہ ہم مدینہ سے مکہ کے لئے اس طرح روانہ ہوئے کہ ہمارا قبیلہ جو حسب معمول زیارت کعبہ کے لئے جارہا تھا اس کے ساتھ خاموشی سے حج کے نام پر شریک ہو گئے۔ مکہ کے قریب قبیلہ والوں نے پڑاؤ ڈالا۔ رات کے وقت ہم دوسروں کی طرح ان کے ساتھ سو گئے۔ یہاں تک کہ جب رات کا تہائی

حصہ گزر گیا تو ہم رسول اللہ کی قرار داد کے مطابق اپنے بستروں سے خاموشی کے ساتھ اٹھے، اور مقام موعود کی طرف اس طرح چلے جیسے چڑیا جھاڑیوں میں آہستہ آہستہ چھپتی ہوئی چلتی ہے (نتسلل تسلل القطا مستخفین، سیرۃ ابن ہشام، جزء ثانی، صفحہ ۹۴)

وہ لمحہ بھی کیسا عجیب تھا جب کہ ایک دنیا پیغمبر کو رد کر چکی تھی، اس وقت کچھ لوگ اس کو قبول کرنے کے لئے سبقت کر رہے تھے، یہ وہ وقت تھا کہ پیغمبر سے ان کا وطن چھینا جا چکا تھا۔ طائف سے انھیں پتھر مار کر بھگا دیا گیا تھا۔ تمام قبائل نے آپ کو پناہ میں لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ایسے نازک وقت میں مدینہ کے لوگوں نے آپ کی صداقت کو پہچانا اور آپ کی پکار پر لبیک کہا۔ اس وقت جب کہ انصار مدینہ بیعت کے لئے بڑھے، ایک شخص نے اٹھ کر کہا، کیا تم جانتے ہو کہ تم کس چیز پر بیعت کر رہے ہو۔ یہ اپنے اموال اور اپنی اولاد کو ہلاک کرنے پر بیعت کرنا ہے۔ انھوں نے کہا ہاں۔ ہم علی نہکۃ الاموال والاولاد بیعت کر رہے ہیں پھر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر ہم نے اس عہد بیعت کو آخر تک پورا کر دیا تو ہمارے لئے کیا ہے۔ آپ نے فرمایا جنت۔ انھوں نے کہا، اپنا ہاتھ لایئے، ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں ——

اپنے آپ کو اس طرح ایک متنازعہ صداقت کے حوالے کرنا، اپنا سب کچھ اس طرح ایک غیر قائم شدہ حق کو سونپ دینا اتنا انوکھا واقعہ ہے کہ وہ اجتماعی سطح پر تاریخ میں صرف ایک ہی بار پیش آیا ہے، نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔

غیر متعلق مسائل سے تعرض نہ کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تو عرب میں وہ تمام مسائل پوری طرح موجود تھے جن کو موجودہ زمانہ میں قومی مسائل کہا جاتا ہے اور جن مسائل کے نام پر عام طور پر دنیا میں تحریکیں اٹھتی ہیں۔ یہ مسائل ذہین افراد کو متاثر کرتے ہیں اور وہ ان کا نعرہ لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ تمام مسائل موجود تھے لیکن آپ نے ان سے مطلق تعرض نہیں کیا۔ اگر آپ ان مسائل میں الجھتے تو یہ خدا کے منصوبہ میں اپنے کو شامل کرنا نہ ہوتا۔ وہ سارے مواقع جو ڈھائی ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں پیدا کئے گئے تھے برباد ہو کر رہ جاتے۔

۱۔ حبش نے ۵۲۵ء میں عرب کے سرحدی علاقہ یمن پر قبضہ کر لیا تھا۔ ابرہہ اس زمانہ میں شاہ حبش کی طرف سے یمن کا گورنر تھا۔ ابرہہ کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے سال (۵۷۰ء) میں اس نے ہاتھیوں کی فوج سے مکہ پر حملہ کیا تاکہ کعبہ کو ڈھا دے اور مکہ کی مرکزی حیثیت کو ختم کر دے۔ ۵۰ سالہ قبضہ کے بعد یمن پر حبش کی حکومت ختم ہوئی اور اس پر شاہ فارس کی حکومت

قائم ہوگئی جس کی طرف سے باذان یمن کا گورنر مقرر رہوا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، اور اس کی خبر کسریٰ (شاہ فارس) کو پہنچی تو اس نے باذان کو لکھا کہ اس آدمی کے پاس جاؤ جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور اس سے کہو کہ وہ اس دعوی سے باز آئے۔ اگر وہ باز نہ آئے تو اس کا سر کاٹ کر میرے پاس بھیجو (والا فابعث الی برأسه، سیرة ابن ہشام)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عرب میں ظاہر ہوئے تو اس وقت عرب کی سرحدوں پر غیر ملکی قبضہ نے کیسے سنگین مسائل پیدا کر رکھے تھے۔ ان حالات میں ایک صورت یہ تھی کہ آپ اپنے ہم قوموں کو غیر ملکی قبضہ کے خلاف اکساتے اور اس کے خلاف جنگ چھیڑ دیتے۔ اگر آپ ایسا کرتے تو یہ خدا کے منصوبے سے انحراف کے ہم معنی ہوتا۔ کیونکہ خدا کا منصوبہ تو یہ تھا کہ لوگوں سے غیر متعلق امور پر ٹکراؤ نہ کیا جائے بلکہ خاموشی سے دعوت الی اللہ کا کام جاری رکھا جائے۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور تاریخ نے دیکھا کہ بالآخر خود باذان نے اسلام قبول کر لیا اور یمن کے عیسائی باشندوں کی اکثریت نے بھی ——— جو مقصد ایک قومی لیڈر ناکام طور پر سیاسی کارروائیوں کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا وہ آپ نے کامیاب طور پر دعوتی کارروائی کے ذریعہ حاصل کر لیا۔

۲۔ ابوطالب کی وفات کے بعد قبائلی رسم کے مطابق بنو ہاشم کا سردار ابولہب مقرر ہوا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی حمایت میں لینے سے انکار کر دیا۔ اب آپ کو کسی دوسرے حمایتی قبیلہ کی ضرورت پیش آئی۔ آپ حمایتی کی تلاش میں مختلف قبائل کے پاس گئے۔ عرب کا ایک سرحدی قبیلہ بنو شیبان بن ثعلبہ تھا۔ آپ اس سے ملے تو قبیلہ کے سردار مثنیٰ بن حارثہ نے کہا کہ ہم کسریٰ (شاہ فارس) کی مملکت کے قریب رہتے ہیں۔ وہاں ہم ایک معاہدہ کے تحت مقیم ہیں جو کسریٰ نے ہم سے لیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم کوئی نئی بات نہ کریں گے اور نہ کسی نئی بات کرنے والے کو پناہ دیں گے۔ اور شاید بادشاہوں کو وہ بات ناپسند ہو جس کی طرف آپ بلاتے ہیں (ان لا نحدث حدثا ولا نؤوی محدثا۔ ولعل هذا الامر الذی تدعوا الیه تکرهه الملوك، سیرة ابن کثیر)

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اطراف عرب میں بیرونی سلطنتوں کے نفوذ نے جو مسائل پیدا کئے تھے وہ صرف سیاسی یا ملکی ہی نہ تھے بلکہ دعوت و تبلیغ کے معاملہ تک بھی پہنچ گئے تھے۔ اس کے باوجود آپ نے ایسا نہیں کیا کہ یہ کہہ کر پہلے مرحلہ ہی میں ان سے لڑائی چھیڑ دیں کہ جب تک یہ خارجی رکاوٹیں دور نہ ہوں کوئی دعوتی کام نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ اول مرحلہ میں ان خارجی طاقتوں سے لڑ جاتے تو یہ خدائی منصوبہ کے خلاف ہوتا۔ کیونکہ خدائی منصوبہ تو یہ تھا کہ روم و فارس کو آپس میں بیس سال تک لڑا کر بالکل کمزور کر دیا

جائے اور پھر خود انھیں پر جارحیت کا الزام ڈال کر مسلمانوں کے لئے ان کو فتح کرنا آسان بنا دیا جائے۔ اگر مسلمان ابتدائی مرحلہ میں روم وفارس سے لڑ جاتے تو وہ نتیجہ بالکل برعکس صورت میں نکلتا جو بعد کے تصادم کے ذریعہ حیرت انگیز غیر ملکی فتوحات کی صورت میں برآمد ہوا۔

خدائی منصوبہ سے مطابقت

کسان کا معاملہ قدرت کے کاگ (دندانہ) میں اپنا کاگ دینے کا معاملہ ہے۔ خدا نے ہماری زمین پر فصل اگانے کے بہترین امکانات پیدا کئے ہیں۔ مگر ان امکانات کو اپنے حق میں واقعہ بنانے کے لئے کسان کو ایک حصہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر زمین کی سطح پر زرخیز مٹی (Soil) کی تہ رکھی گئی ہے جو معلوم کائنات میں کسی بھی دوسرے مقام پر نہیں۔ مگر تمام زرخیزی کے باوجود اس مٹی سے فصل اسی وقت اگتی ہے جب کہ اس میں نمی بھی ہو۔ اس نمی کے نہ ہونے کی وجہ سے خشک علاقوں کے صحرا چٹیل بیابان بن کر رہ گئے ہیں، اس حقیقت کو قدرت لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کر کے نہیں بتاتی بلکہ خاموش اشارہ کی زبان میں بتاتی ہے۔ کسان کو اسے خاموش اشارہ کی زبان میں جاننا پڑتا ہے۔ چنانچہ کسان یہ کرتا ہے کہ وہ یا تو بارش سے نم ہونے والی زمین میں اپنی فصل بوتا ہے یا آب پاشی کے ذریعہ پہلے اس میں نمی پہنچاتا ہے، پھر اپنا دانہ اس میں ڈالتا ہے۔

یہی معاملہ داعی کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عرب میں اگرچہ بہترین حالات پیدا کر دئے گئے تھے اس کے باوجود ضروری تھا کہ آپ ربانی حکمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے کام کو آگے بڑھائیں۔ اگر آپ کا منصوبہ خدائی منصوبہ کی رعایت کے بغیر چلتا تو آپ کو کبھی وہ کامیابی حاصل نہ ہوتی جو عملاً آپ کو حاصل ہوئی۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا بنیادی اصول یہ تھا کہ دعوتی عمل میں ساری اہمیت مسئلۂ آخرت کو دی جائے۔ مسئلہ دنیا کو کسی بھی حال میں دعوت کا اشو نہ بنایا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی مسئلہ انسان کا ابدی اور حقیقی مسئلہ ہے۔ دوسرے تمام مسائل وقتی اور اضافی مسئلے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آخرت کے بغیر انسان کی کامیابی بھی اتنی ہی بے معنی ہے جتنی کہ اس کی ناکامی بے معنی۔

دوسری بات یہ کہ انسانی زندگی میں ہر قسم کی کامیابی کا تعلق افراد کے کردار سے ہے۔ اور انسان کے اندر حقیقی اور مستقل کردار صرف آخرت پر گہرے یقین ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ عقیدۂ آخرت کا مطلب یہ ہے کہ انسان آزاد اور خود مختار نہیں ہے، بلکہ وہ ہر آن خدا کی پکڑ میں ہے۔ یہ عقیدہ آدمی سے بے راہ روی کا مزاج چھین لیتا ہے اور اس کو پابند اور ذمہ دار انسان بنا دیتا ہے —— قرآن و حدیث کو اگر خالی الذہن ہو کر پڑھا جائے تو اس میں آخرت کا مسئلہ سب سے زیادہ ابھرا ہوا مسئلہ نظر آئے گا۔ دوسرے مسئلوں کا ذکر بھی اگرچہ آتا ہے مگر وہ ضمناً ہے نہ کہ اصلاً۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ داعی اور مدعو کے درمیان کسی بھی حال میں کوئی مادی جھگڑا نہ کھڑا کیا جائے۔ مدعو کو کسی بھی حال میں فریق نہ بننے دیا جائے، خواہ اس کی جو بھی قیمت دینی پڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس حکمت کی ایک نمایاں مثال حدیبیہ کا معاہدہ ہے۔ قریش نے مسلمانوں کے خلاف جنگ چھیڑ کر یہ صورت حال پیدا کر دی تھی کہ مسلم گروہ اور غیر مسلم گروہ دونوں ایک دوسرے کے جنگی فریق بن گئے تھے۔ تمام وقت جنگ کی باتوں اور جنگ کی تیاریوں میں گزرنے لگا تھا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ہر مطالبہ کو مانتے ہوئے ان سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ کر لیا۔ یہ معاہدہ اس قدر یک طرفہ تھا کہ بہت سے مسلمانوں نے اس کو ذلت کا معاہدہ سمجھا، مگر خدا کے نزدیک وہ فتح مبین (الفتح ۱) کا دروازہ تھا۔ کیونکہ اس کے ذریعہ جنگی مقابلہ آرائی کی فضا ختم ہوتی تھی اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ بحال ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس معاہدہ کے بعد جیسے ہی اہل عرب جنگی فریق کے بجائے مدعو کے مقام پر آئے، ان کے درمیان دعوت حق کی آواز پھیلنے لگی۔ یہاں تک کہ صرف دو سال میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً دس گنا بڑھ گئی۔ جو مکہ جنگ سے فتح ہوتا نظر نہ آتا تھا وہ دعوتی عمل کے ذریعہ مسخر ہو گیا۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق عمل کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ مدعو پر قابو پانے کے باوجود اس کے ساتھ فراخی کا سلوک کیا جائے۔ اس معاملہ کی مثالیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی میں پھیلی ہوئی ہیں۔ فتح مکہ کے بعد قریش کے تمام وہ لوگ پوری طرح آپ کے قابو میں تھے جنھوں نے آپ کے ساتھ اور مسلمانوں کے ساتھ بدترین ظلم کئے تھے۔ مگر آپ نے ماضی کے جرائم کی بنیاد پر کسی کو سزا نہ دی۔ سب کو یک طرفہ طور پر معاف کر دیا۔ قریش کے لوگ جب بندھے ہوئے آپ کے سامنے حاضر کئے گئے تو آپ نے فرمایا: اذهبوا فانتم الطلقاء (جاؤ تم سب آزاد ہو) کچھ لوگوں کے بارے میں آپ نے وقتی طور پر قتل کئے جانے کا حکم دے دیا۔ مگر اس کے بعد ان میں سے بھی ہر اس شخص کو معاف کر دیا گیا جب کہ اس نے یا اس کی طرف سے کسی نے آکر آپ سے جان بخشی کی درخواست کی۔ اس قسم کے سترہ نامزد آدمیوں میں سے صرف پانچ کو قتل کیا گیا جنھوں نے معافی نہیں مانگی تھی۔ احد کی جنگ میں وحشی بن حرب نے حضرت حمزہ کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد ہند بنت عتبہ نے آپ کی لاش کو لے کر اس کا مثلہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو وقتی طور پر آپ کی زبان سے نکل گیا کہ اگر اللہ نے مجھے ان کے اوپر فتح دی تو میں ان کے تین آدمیوں کا مثلہ کروں گا (لئن اظهرنی الله عليهم لأمثلن بثلاثين رجلا منهم، تفسیر ابن کثیر، جلد ثانی، صفحہ ۳۵۲) فتح مکہ کے بعد آپ نے جن سترہ آدمیوں کے قتل کا حکم دیا تھا ان میں وحشی اور ہند دونوں شامل تھے۔ مگر دونوں نے جب آپ کی خدمت میں آکر معافی مانگی تو دونوں کو معاف کر دیا گیا۔ کیونکہ یہی طریقہ منصوبۂ الٰہی کے مطابق تھا۔

یہ اصول بے حد اہم حکمت پر مبنی ہے۔ انسان پتھر نہیں ہے کہ ایک پتھر کو توڑ دیا جائے تو اس کے دوسرے قریبی پتھر توڑنے والے کے بارے میں کوئی ردعمل ظاہر نہ کریں۔ انسان زندہ معاشرہ کا ایک زندہ جزء ہے۔ جب بھی ایک انسان پر جارحانہ کارروائی کی جاتی ہے تو اس کے قریبی لوگوں میں انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ اس طرح سماج میں تخریبی کارروائیاں جنم لیتی ہیں۔ فتح کے بعد جو وقت نئی تعمیر میں لگتا وہ تخریب کاروں کا مقابلہ کرنے میں صرف ہونے لگتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد پچھلے مخالفین کو عمومی معافی دے کر آئندہ کے لئے ہر قسم کی تخریبی سرگرمیوں کا دروازہ بند کر دیا۔ مزید یہ کہ ان کی اکثریت اسلام قبول کر کے اسلام کی طاقت کا ذریعہ بن گئی، جیسے کہ عکرمہ ابن ابی جہل۔

۴۔ فتح و غلبہ حاصل کرنے کے بعد اجتماعی معاملات کی اصلاح کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جلد بازی کا طریقہ اختیار نہیں فرمایا بلکہ صبر و تدریج کے ذریعہ اصلاحات کا نفاذ کیا۔

مکہ کے قریش دین ابراہیمی کے وارث تھے۔ مگر انھوں نے اصل دین ابراہیمی کو بگاڑ دیا اور اس میں بہت سی بدعتیں جاری کر دیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم نے حج کو قمری مہینوں کی بنیاد پر ذی الحجہ میں قائم کیا تھا۔ قمری سال شمسی سال سے گیارہ دن کم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے قمری مہینوں کی مطابقت موسموں کے ساتھ باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ حج کبھی ایک موسم میں آتا اور کبھی دوسرے موسم میں۔ یہ صورت قریش کے تجارتی مفاد کے خلاف تھی۔ انھوں نے حج کو ہمیشہ گرمی کے موسم میں رکھنے کے لئے نسئ (کبیسہ) کا طریقہ اختیار کر لیا۔ وہ قمری مہینوں میں ہر سال گیارہ دن بڑھا دیتے۔ اس طرح نام اگرچہ قمری مہینوں کا ہوتا مگر عملاً اس کا سال شمسی سال کے ساتھ چلتا۔ اس کی وجہ سے تاریخیں ۳۳ سال تک کے لئے بدل جاتیں، ایک بار مہینوں کو اپنی جگہ سے ہٹانے کے بعد دوبارہ ۳۳ سال پر ایسا ہوتا کہ حج ابراہیمی طریقہ کے مطابق اصل ذی الحجہ میں پڑتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر مامور تھے کہ وہ قریش کی بدعتوں کو ختم کر کے حج کو دوبارہ ابراہیمی طریقہ پر قائم کریں۔ فتح مکہ (رمضان ۸ھ) کے بعد آپ عرب کے حکمراں بن گئے۔ آپ ایسا کر سکتے تھے کہ نسئ کی بدعت کو فوری طور پر ختم کرنے کا اعلان کر دیں۔ مگر آپ نے صبر سے کام لیا۔ اس وقت نسئ کے ۳۳ سالہ دور کو پورا ہونے میں صرف دو سال باقی تھے۔ آپ نے دو سال انتظار فرمایا۔ مکہ کے فاتح ہونے کے باوجود دو سال آپ حج کے لئے نہیں گئے۔ آپ نے صرف تیسرے سال (۱۰ھ) حج کی عبادت میں شرکت کی جو کہ ۳۳ سالہ دور کو پورا کر کے ٹھیک ابراہیمی تاریخ پر ذی الحجہ میں ہو رہا تھا۔ اس وقت مشہور حجۃ الوداع میں آپ نے اعلان فرما دیا کہ اس سال حج جس طرح ہو رہا ہے اسی طرح اب ہر سال ہوگا۔ اب نسئ کا اصول ہمیشہ کے لئے ختم کیا جاتا ہے۔ یہی بات ہے جو حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپ نے ان الفاظ میں ادا فرمائی:

ایھا الناس ان الزمان قد استدار کھیئته یوم خلق اللہ السموٰت والارض ، وان عدۃ الشھور عند اللہ اثنا عشر شھراً	اے لوگو زمانہ گھوم گیا۔ پس آج کے دن وہ اپنی اس ہیئت پر ہے جس دن کہ اللہ نے زمین وآسمان کو پیدا کیا تھا۔ اور مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک
(ابن جریر وابن مردویہ)	۱۲ مہینے ہیں۔

اس تاخیر میں بہت گہری مصلحت تھی۔ کیونکہ مذہب میں جب کوئی طریقہ عرصہ تک رائج رہے تو وہ مقدس بن جاتا ہے۔ لوگوں کے لئے اس کے خلاف سوچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چونکہ دو سال بعد خود ہی حج ان تاریخوں پر آرہا تھا جو آپ چاہتے تھے۔ اس لئے آپ نے قبل از وقت اقدام کر کے غیر ضروری مسئلہ کھڑا کرنے سے پرہیز کیا۔ جب فطری رفتار سے حج اپنی اصل تاریخ پر آگیا تو آپ نے اعلان فرمادیا کہ یہی حج کی اصل تاریخ ہے اور آئندہ اب انھیں تاریخوں میں حج ہوتا رہے گا۔

یہ چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح اپنی پوری تحریک میں ربانی حکمت کو ملحوظ رکھا۔ آپ نے خدا کے کاگ میں اپنا کاگ ملایا، آپ نے خدائی منصوبہ سے موافقت کرتے ہوئے تمام کارروائیاں کیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی کوششوں کے عظیم الشان نتائج برآمد ہوئے۔

دور جدید میں اسلامی دعوت

دین کی دعوت کو دو بڑے دوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک، پیغمبر آخر الزماں کے ظہور سے پہلے۔ دوسرا، پیغمبر آخر الزماں کے ظہور کے بعد۔ آپ سے پہلے خدا کی جو کتابیں آئیں ان کی حفاظت کی ذمہ داری خود ان لوگوں پر ڈالی گئی تھی جن کی طرف وہ کتابیں بھیجی گئی تھیں۔ اس لئے ان کے بارے میں استحفاظ (حفاظت طلب کرنا) کا لفظ آیا ہے (بما استحفظوا من کتاب اللہ وکانوا علیہ شھداء، مائدہ ۴۴) مگر قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ہاتھ میں لے لی (انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون، الحجر ۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر مامور تھے کہ شرک کو مغلوب کریں اور توحید کو غالب فکر کی حیثیت سے دنیا میں رائج کر دیں (الانفال ۳۹) یہ کام صرف خدا کی نصرت سے ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ڈھائی ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں وہ حالات پیدا کئے جن کو استعمال کر کے آپ نے شرک کو مغلوب کیا اور توحید کو فکری غلبہ کے مقام پر پہنچایا۔

رسول اور اصحاب رسول کی کوششوں کے نتیجہ میں شرک ہمیشہ کے لئے مغلوب ہو گیا۔ اب

اس کی کوئی امید نہیں کہ شرک دوبارہ ایک غالب فکر کی حیثیت سے دنیا میں ابھر سکے۔ تاہم موجودہ زمانہ میں دوبارہ یہ واقعہ ہوا کہ توحید نے غالب فکر کی حیثیت سے اپنا مقام کھو دیا۔ آج ساری دنیا میں الحاد کو غالب فکر کی حیثیت حاصل ہے۔ بے خدا ذہن یا سکولر طرز فکر آج دنیا کا غالب فکر ہے۔ اس کے مقابلہ میں توحید کا فکر عملاً دوسرے درجہ پر چلا گیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں کرنے کا اصل کام یہی ہے کہ ملحدانہ طرز فکر کو مغلوب کیا جائے تاکہ توحید اپنا غلبہ کا مقام دوبارہ حاصل کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کو یقیناً معلوم تھا کہ آئندہ دور الحاد آنے والا ہے۔ اس لئے اس کی نصرت دوبارہ متحرک ہوئی۔ پچھلے ہزار سالہ عمل کے دوران اس نے دوبارہ ایسے حالات پیدا کرنے شروع کئے جو بالآخر دعوت توحید کے لیے معاون بن سکیں۔ یہ عمل اب اپنی تکمیل کے مرحلہ میں پہنچ گیا ہے۔ آج اگرچہ بظاہر الحاد کا فکری غلبہ ہے۔ مگر وہ حالات پوری طرح پیدا ہو چکے ہیں جن کو استعمال کر کے دوبارہ توحید کو فکری غلبہ کا مقام دیا جا سکے۔

پہلے مرحلہ میں غلبۂ توحید کا کام دعوت کے بعد طاقت کے ذریعہ انجام پایا (قاتلوهم حتى لا تكون فتنة، البقرہ ۱۹۳، بل نقذف بالحق على الباطل فيدمغه فاذا هو زاهق۔ الانبیاء ۱۸) مگر دوسرے مرحلہ میں یہ کام تبیین و تبلیغ کے ذریعہ انجام پانا ہے، جیسا کہ قرآن کے اشارہ سے معلوم ہوتا ہے:

سنريهم آياتنا في الآفاق وفي انفسهم حتى يتبين لهم انه الحق اولم يكف بربك انه على كل شيء شهيد (حم سجدہ ۵۳)

ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے دنیا میں بھی اور ان کے اندر بھی، یہاں تک کہ ان پر کھل جائے کہ یہ (قرآن) بالکل حق ہے۔ کیا تیرے رب کا ہر بات پر شاہد ہونا کافی نہیں

ذہنی انقلاب

موجودہ زمانہ میں ایک زبردست ذہنی انقلاب آیا ہے۔ یہ انقلاب کیا ہے؟ اس کے لئے کوئی دوسرا موزوں لفظ نہ ہونے کی وجہ سے میں اس کو سائنسی انقلاب کہتا ہوں۔ جدید سائنسی انقلاب نے انسانی تاریخ میں پہلی بار ایسی فکری تبدیلیاں پیدا کی ہیں جو دعوت توحید کے عین موافق ہیں۔ ان کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو صرف قلمی و لسانی تبلیغ کے ذریعہ غلبہ توحید کا وہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے جس کے لئے اس سے پہلے تلوار اٹھانی پڑی تھی۔

جدید سائنسی انقلاب دراصل صدر اول کے اسلامی انقلاب کا ایک ضمنی حاصل (By-product) ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلامی انقلاب کے ذریعہ ایسے اسباب پیدا کئے، جنھوں نے تاریخ کے اندر اپنا عمل شروع کیا۔

یہاں تک کہ وہ اس انقلاب تک پہنچا جس کو جدید سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔ گویا خدا نے صدر اول میں شرک کے اوپر توحید کو غلبہ دیا تو اسی کے اندر وہ اسباب بھی پیدا کر دئے جو بعد کے زمانہ میں الحاد پر توحید کو غالب کرنے میں مددگار بن سکیں۔

اسلام کے ذریعہ آنے والے توحیدی انقلاب سے پہلے ساری دنیا میں شرک کا غلبہ تھا۔ شرک دراصل مظاہر پرستی کا دوسرا نام ہے۔ دنیا کی ہر چیز جو نمایاں نظر آئی اسی کو انسان نے پوجنا شروع کر دیا، خواہ وہ آسمان کا سورج ہو یا زمین کا بادشاہ۔ اس کی وجہ سے دور شرک میں سائنسی تحقیق کا کام ممکن نہ ہو سکا۔ آرنلڈ ٹوائن بی کے الفاظ میں، فطرت کے مظاہر اس وقت پرستش کا موضوع (Object of Worship) بنے ہوئے تھے، پھر وہ تحقیق کا موضوع (Object of Investigation) کیسے بنتے۔ اسلام نے شرک کو مغلوب کر کے توحید کو غالب کیا تو ایک خدا کے سوا ہر چیز مخلوق نظر آنے لگی، اس انقلاب نے یہ ممکن بنا دیا کہ چیزوں پر تحقیق کا عمل جاری کیا جا سکے۔ یہ عمل ابتدائی صورت میں دور اول ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ ایک بار چاند گرہن کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورج گرہن اور چاند گرہن اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ وہ کسی بڑے آدمی کی پیدائش یا موت کی بنا پر نہیں ہوتے۔ اس طرح آپ نے مادی بڑائی کی بھی نفی کر دی اور انسانی بڑائی کی بھی۔ یہ فکری لہر عقیدہ سے الگ ہو کر یورپ پہنچی اور بالآخر جدید انقلاب کا سبب بنی۔

۱۔ اس انقلاب کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ توہماتی دور کا خاتمہ ہو گیا۔ توہم پرستی کیا ہے۔ توہم پرستی نام ہے حقائق کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کے بجائے مفروضات وقیاسات کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کا۔ (مثلاً یہ فرض کر لینا کہ جب کسی بڑے آدمی کی موت ہوتی ہے تو سورج یا چاند گہنا جاتے ہیں) یہ ذہن اسلام کی طرف بڑھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ایسا آدمی حقائق واقعی کی بنیاد پر اسلام اور غیر اسلام کا جائزہ نہیں لیتا بلکہ پیشگی مفروضات کی بنیاد پر بلا دلیل ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط مان لیتا ہے۔ مثلاً اسلام تاریخی طور پر ایک مستند دین ہے اور دیگر تمام مذاہب تاریخی استناد سے محروم ہیں۔ مگر توہمات کے دور میں انسان اس کو اہمیت نہیں دے پاتا تھا۔ جدید دور نے اس کو پوری اہمیت کے ساتھ لیا۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں تنقید عالیہ (Higher Criticism) کے نام سے ایک مستقل فن وجود میں آ گیا ہے۔ اس فن کے تحت یہ حقیقت پوری طرح مسلّم ہو گئی ہے کہ تاریخی طور پر معتبر دین صرف اسلام ہے۔ دوسرے ادیان کو تاریخی اعتباریت کا درجہ حاصل نہیں۔

۲۔ سائنسی ذہن نے کائنات کو تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں جاننے کی کوشش کی۔ اس کے

نتیجہ میں کائنات میں چھپے ہوئے ایسے فطری حقائق انسان کے علم میں آئے جو اسلام کی تعلیمات کی تصدیق اعلیٰ سطح پر کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر انسان کی تحقیق نے بتایا کہ کائنات میں ہر جگہ ایک ہی قانون فطرت کار فرما ہے۔ جو قانون زمین کے احوال پر حکمراں ہے وہی قانون کائنات کے دور دراز مقامات پر بھی حکمراں ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کائنات کا خدا صرف ایک ہے۔ دو خدا یا بہت سے خداؤں کی اس کائنات میں گنجائش نہیں۔

۳۔ دین توحید کو قدیم زمانہ میں اختیار کرنے کے لئے، ایک علمی رکاوٹ، قدیم فلسفہ بھی تھا۔ قدیم زمانہ میں فلسفہ کو غالب علم کا مقام حاصل تھا۔ تعلیم یافتہ طبقہ کے سوچنے کی ذہنی زمین اس زمانہ میں فلسفہ ہوتا تھا۔ اس کے نتیجہ میں دین توحید کی راہ میں ایک بہت بڑی مصنوعی رکاوٹ حائل ہو گئی تھی۔

قدیم فلسفہ کا آخری نشانہ ہمیشہ سے آخری سچائی کی تلاش رہا ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ تقریباً پانچ ہزار سال کی شان دار تاریخ کے باوجود فلسفہ اپنے نشانہ تک پہنچنے میں مکمل طور پر ناکام رہا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فلسفہ انسان کی محدودیتوں (Limitations) کا ادراک نہ کر سکا۔ وہ آخری سچائی تک پہنچنے کے لئے ساری کوششیں صرف کرتا رہا۔ جب کہ انسان اپنی محدود صلاحیتوں کی وجہ سے بطور خود آخری سچائی تک پہنچ ہی نہ سکتا تھا۔

اس فلسفیانہ طرز فکر کی وجہ سے ہزاروں برس تک انسان یہ چاہتا رہا کہ دین توحید کی بنیاد جن اساسی عقائد پر قائم ہے اس کو انسان کے لئے مکمل طور پر معلوم اور مشاہد بنا دیا جائے۔ مگر یہ تمام غیبی حقیقتیں تھیں اور انسان اپنی موجودہ صلاحیتوں کے ساتھ ان غیبی حقیقتوں کا کامل ادراک نہیں کر سکتا۔

جدید سائنس کا، دینی نقطۂ نظر سے، سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس مفروضہ کو ڈھا دیا۔ اس نے آخری طور پر یہ ثابت کر دیا کہ انسان کی صلاحیتیں محدود ہیں۔ وہ اپنی محدودیت کی وجہ سے حقیقت کا کلی ادراک نہیں کر سکتا۔ قدیم فلسفہ کی پیدا کردہ ذہنی زمین اب ساری دنیا میں دفاعی حیثیت کے مقام پر جا چکی ہے اور اب سائنس کی دریافت کردہ ذہنی زمین کو علمی دنیا میں غالب مقام حاصل ہے۔

ذہن کی اس تبدیلی نے دین توحید کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے۔ اب اس نقطۂ نظر کو، کم از کم بالواسطہ طور پر، مکمل علمی تائید حاصل ہے کہ انسان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ حقیقت اعلیٰ کو پانے کے لئے وہ پیغمبر کی اطلاع کا اعتبار کرے۔ اب یہ مطالبہ سراسر غیر علمی مطالبہ بن چکا ہے کہ خدا اور وحی اور آخرت کو ہماری آنکھوں سے ہمیں دکھاؤ، اس کے بعد ہی ہم اس پر ایمان لائیں گے۔

معلوم تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ خود علم انسانی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان کا علم محدود ہے

اور ہمیشہ محدود رہے گا۔ انسان سائنسی ذرائع سے جب کائنات کی کھوج کرتا ہے تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ کائنات اس سے زیادہ پیچیدہ ہے کہ انسان کا محدود ذہن اس کا احاطہ کر سکے۔ سائنس کی یہ دریافت اسلامی نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہے۔ کیونکہ اس سے رسالت کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ ایک طرف انسان کا یہ حال ہے کہ وہ حقیقت کو آخری حد تک جان لینا چاہتا ہے۔ دوسری طرف انسان اپنی بناوٹ کے اعتبار سے ایسی محدودیت کا شکار ہے کہ وہ کبھی بھی حقیقت کو آخری حد تک نہیں جان سکتا۔ انسانی زندگی کا یہ خلا واضح طور پر یہ بتاتا ہے کہ اس کو ایک برتر رہنما کی ضرورت ہے۔ اسی برتر رہنما کا دوسرا نام پیغمبر ہے۔ انسانی محدودیت کے بارے میں سائنس کے اقرار نے پیغمبر کی ضرورت کو خالص علمی سطح پر ثابت کر دیا ہے۔

۴۔ قدیم زمانہ میں انسان کو اظہار رائے کی آزادی حاصل نہ تھی۔ اس کی اصل وجہ بادشاہوں اور بڑے انسانوں کے تقدس کا عقیدہ تھا۔ جو لوگ کسی وجہ سے اونچے مقام پر پہنچ جاتے ان کو مقدس سمجھ لیا جاتا۔ ان کی رائے دوسروں سے برتر مانی جاتی۔ ان کو یہ حق مل جاتا کہ جس طرح چاہیں دوسروں کو اپنی مرضی کا پابند بنائیں۔ توحید کے انقلاب نے انسانی بڑائی کا خاتمہ کیا اور یہ اعلان کیا کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر فضیلت نہیں۔ اس کے بعد تاریخ میں ایک نئی فکری لہر چل پڑی۔ یہی وہ فکری لہر ہے جس کی سیاسی تکمیل بالآخر یورپ میں جمہوریت کی صورت میں ہوئی۔ جمہوری انقلاب نے تمام انسانوں کو برابر ٹھہرا دیا۔ ہر شخص کے لئے یہ فکری حق تسلیم کر لیا گیا کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق جو چاہے لکھے اور جو چاہے بولے۔ اس انقلاب نے تاریخ میں پہلی بار اس بات کو ممکن بنا دیا کہ خدا کے دین کی تبلیغ اس طرح کی جائے کہ تبلیغ کرنے والے کے لئے کسی طرح کی پکڑ دھکڑ کا اندیشہ نہ ہو۔

۵۔ سائنس نے آج کے انسان کے لئے خدا کی بہت سی وہ مادی نعمتیں کھولی ہیں۔ جو ہزاروں برس سے کائنات کے اندر چھپی ہوئی تھیں۔ ان میں اسلامی دعوت کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم جدید ذرائع مواصلات ہیں۔ پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اسی طرح مختلف قسم کی تیز رفتار سواریاں۔ یہ چیزیں اسلام کے حق میں عظیم نعمتیں ہیں۔ ان کو استعمال کر کے اسلامی دعوت کو عالمی سطح پر پھیلایا جا سکتا ہے۔

یہ مواقع جو عین اسلامی دعوت کے حق میں ہیں، پچھلے ہزار سالہ عمل کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں۔ پچھلے زمانہ میں جس طرح اللہ تعالیٰ نے ڈھائی ہزار سالہ عمل کے ذریعہ اسلام کے غلبۂ اول کے حالات فراہم کئے، اسی طرح اس نے دوبارہ ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں اسلام کے غلبۂ ثانی کے حالات فراہم کر دئے ہیں۔ تاہم یہ حالات و مواقع خود اپنے زور پر واقعہ نہیں بن جائیں گے۔ اس امکان کو واقعہ بنانے کے لئے زندہ

انسانوں کی ایک جماعت درکار ہے۔ ایسی ایک جماعت اگر کھڑی ہو جائے تو قریبی مستقبل میں اسی طرح دوبارہ اسلام کو فکری غلبہ مل سکتا ہے جس طرح قرن اول میں اس کو شرک کے مقابلہ میں فکری غلبہ حاصل ہوا تھا۔

اوپر جن امکانات کا ذکر ہوا وہ تقریباً ایک سو سال سے ایسی کسی جماعت کا انتظار کر رہے ہیں مگر بدقسمتی سے ایسی کوئی جماعت ابھی تک کھڑی نہ ہو سکی۔ اس میں شک نہیں کہ پچھلے سو سال کے اندر ہمارے یہاں بے شمار جماعتیں اور تحریکیں اٹھی ہیں، مگر یہ تحریکیں وقتی حالات، خصوصاً سیاسی حالات کے رد عمل کے طور پر اٹھیں نہ کہ اس ربانی شعور کے تحت جو پچھلے ہزار سال سے تاریخ کے اندر کام کر رہا ہے اور چودھویں صدی ہجری میں اپنی تکمیل کو پہنچا ہے۔

سیرت کی کتابوں میں آتا ہے کہ بدر کے میدان میں جب طاقت ور اہل کفر بظاہر کمزور اہل ایمان کے اوپر ٹوٹ پڑے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدت احساس کے تحت سجدے میں گر گئے اور اللہ تعالیٰ سے نصرت کی دعائیں مانگنے لگے۔ اس نازک لمحہ میں آپ کی زبان سے جو کلمات نکلے ان میں سے ایک جملہ یہ تھا:

اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ لا تعبد بعدھا فی الارض (خدایا اگر یہ گروہ ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد زمین پر تیری عبادت نہ ہو گی)۔ یہ کوئی مبالغہ نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تین سو تیرہ روحیں جو بے سرو سامانی کے باوجود بدر کے معرکہ میں کھڑی ہوئی تھیں یہ محض عام قسم کے تین سو تیرہ لوگ نہ تھے۔ یہ عصابہ دراصل وہ گروہ تھا جس پر ڈھائی ہزار سالہ تاریخ منتہی ہوئی تھی۔ اسی طرح آج دوبارہ ایک نیا عصابہ (گروہ) درکار ہے جس پر پچھلی ہزار سالہ تاریخ منتہی ہوئی ہو۔ جو اپنے شعور کے اعتبار سے پچھلی ہزار سالہ تاریخ کا وارث ہو۔ جو اپنے کردار کے اعتبار سے ان امکانات کو واقعہ بنانے کا اہل ارادہ اپنے اندر لئے ہوئے ہو، جو سنجیدہ فیصلے کی اس حد پر پہنچا ہوا ہو جہاں پہنچ کر آدمی اس قابل ہو جاتا کہ وہ اپنے مقصد سے پوری طرح وابستہ رہے۔ کوئی بھی خارجی واقعہ اس کو اس کے نشانہ سے ہٹانے والا ثابت نہ ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کے کاگ میں اپنا کاگ ملائیں گے۔ اور بالآخر یقینی کامیابی کی منزل تک پہنچیں گے

اصحاب رسول

قرآن میں لوگوں کو ایمان کی دعوت دیتے ہوئے کہا گیا ہے:

فان آمنوا بمثل ما آمنتم بہ فقد اھتدوا وان تولوا فانما ھم فی شقاق (البقرہ ۱۳۷)

اگر وہ اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو بے شک وہ ہدایت یاب ہوئے اور اگر وہ منھ موڑیں تو وہ اختلاف میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اصحاب رسول نہ صرف اول الایمان ہیں بلکہ وہی ہمیشہ کے لئے حق کا نمونہ بھی ہیں۔ خدا کے یہاں جو ایمان معتبر ہے وہ وہی ایمان ہے جو صحابہ کرام جیسا ایمان ہو۔ دین و ایمان کی کوئی ایسی قسم جو صحابۂ کرام کے دین و ایمان سے مختلف ہو، اللہ تعالیٰ کو مطلوب نہیں۔

یہاں صحابۂ کرام کی چند خصوصیات مختصراً درج کی جاتی ہیں

دین ان کے لئے محبوب چیز بن گیا تھا

اصحاب رسول کی خصوصیت قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ ایمان ان کے لئے ایک محبوب شئے بن گیا تھا (الحجرات ۷) محبت کسی چیز سے تعلق کا آخری درجہ ہے۔ اور جب کسی چیز سے محبت کے درجہ کا تعلق پیدا ہو جائے تو وہ آدمی کے لئے ہر چیز کا بدل بن جاتا ہے۔ اس کے بعد آدمی کا ذہن اس چیز کے بارے میں اس طرح متحرک ہو جاتا ہے کہ آدمی بغیر بتائے ہوئے اس سے متعلق ہر بات کو جان لیتا ہے۔ اس کو خواہ معروف معنوں میں کوئی نقشۂ کار نہ دیا گیا ہو مگر اس کا ذہن خود بتا دیتا ہے کہ اس کو اپنی محبوب شے کے لئے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے (التوبہ ۴۶)

محبت کی سطح کے تعلق کا مطلب ہے دل چسپی کی سطح کا تعلق۔ یعنی یہ کہ آدمی اسلام کے نفع نقصان کو خود اپنا نفع نقصان سمجھنے لگے۔ اصحاب رسول کو اسلام سے اسی قسم کا تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اسلام کے فائدے سے اسی طرح خوش ہوتے تھے جس طرح کوئی شخص اپنے بیٹے کی کامیابی سے خوش ہوتا ہے۔ اسلام کو کوئی نقصان پہنچے تو وہ اسی طرح بے چین ہو جاتے تھے جیسے کوئی شخص اپنے بیٹے کے متعلق ناخوش گوار خبر سن کر تڑپ اٹھتا ہے اور اس وقت تک اسے چین نہیں آتا جب تک وہ اس کی تلافی نہ کرلے۔

کسی چیز سے محبت کے درجے کا تعلق پیدا ہو جائے تو آدمی کا ذہن اس کے بارے میں پوری طرح

جاگ اٹھتا ہے۔ وہ اس کی خاطر ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔ اس کی ضرورت اور تقاضوں کو وہ بتلائے بغیر جان لیتا ہے۔ اس کی بات کو پانے کے لئے کوئی نفسیاتی گرہ اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ اس کے راستے میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے وہ کسی چیز کو عذر نہیں بناتا۔

جب آدمی کسی معاملہ کو اپنا معاملہ سمجھ لے تو اس کے بعد اس کو نہ زیادہ بتانے کی ضرورت ہوتی اور نہ زیادہ سمجھانے کی۔ اس کا قلبی تعلق اس کے لئے ہر دوسری چیز کا بدل بن جاتا ہے۔ وہ کسی معاوضہ کی امید کے بغیر یک طرفہ طور پر اپنا سب کچھ اس کے لئے لٹا دیتا ہے۔ اس کی خاطر کھونا بھی اس کو پانا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی خاطر بے قیمت ہوجانا اس کی نظر میں سب سے زیادہ قیمتی ہوجاتا ہے۔ اس کے لئے وہ ہر دوسری مصلحت کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ اس کے لئے وہ ہر تکلیف کو اس طرح سہہ لیتا ہے جیسے کہ وہ کوئی تکلیف ہی نہ ہو۔

اصحاب رسول کوئی غیر معمولی انسان نہ تھے۔ وہ کوئی ماورائے بشر مخلوق نہیں تھے۔ ان کی خصوصیت صرف یہ تھی کہ "محبت" کے درجہ کا تعلق جو عام انسانوں کو صرف اپنے آپ سے ہوتا ہے وہی تعلق ان کو دین و ایمان سے ہوگیا تھا۔ عام آدمی اپنے مستقبل کی تعمیر کو جو اہمیت دیتا ہے وہی اہمیت وہ اسلام کے مستقبل کی تعمیر کو دینے لگے تھے۔ وہ دین کے لئے اپنا حصہ ادا کرنے کو اتنا ہی ضروری سمجھنے لگے تھے جتنا کوئی شخص اپنی ذاتی دل چسپی کے معاملہ میں اپنے آپ کو اور اپنے اثاثہ کو استعمال کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ ان کی یہی خصوصیت تھی کہ وہ تاریخ کے وہ گروہ بنے جس نے اسلام کو عظیم ترین کامیابی کے مقام تک پہنچایا۔

پیغمبر کو آغاز تاریخ میں پہچاننا

صحابہ کی یہ انوکھی صفت تھی کہ انھوں نے اپنے ایک معاصر رسول کو پہچانا اور اس کا ساتھ دیا۔ یہ کام اتنا مشکل ہے کہ معلوم تاریخ میں جماعت کی سطح پر صرف ایک بار پیش آیا ہے۔ قدیم تاریخ کے ہر دور میں یہ قصہ پیش آیا کہ رسولوں کے مخاطبین نے ان کا انکار کیا اور ان کا مذاق اڑایا۔ بائبل میں ہے کہ "تم نے میرے نبیوں کو ناچیز جانا" یہ نبیوں کو ناچیز جاننے والے کون لوگ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو وحی و رسالت کو مانتے تھے۔ نبیوں کے نام پر ان کے یہاں ادارے قائم تھے اور بڑے بڑے جشن ہوتے تھے۔ مگر یہ سب کچھ قدیم نبیوں کے نام پر ہوتا تھا۔ جہاں تک وقت کے نبی کا سوال تھا، اس کے لئے ان کے پاس استہزاء و تمسخر کے سوا کچھ نہ تھا۔

یہود نے حضرت مسیح کا انکار کیا، حالانکہ وہ موسیٰ کو مانتے تھے۔ نصاریٰ نے حضرت محمد کا انکار کیا، حالانکہ وہ حضرت مسیح کی پرستش کی حد تک عزت کرتے تھے۔ اسی طرح قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر مارے اور آپ کو گھر سے نکالا، حالانکہ وہ حضرت ابراہیم کے وارث ہونے پر فخر کرتے تھے۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم نبی کی نبوت تاریخی روایات کے نتیجہ میں ثابت شدہ نبوت بن جاتی ہے۔ وہ کسی قوم کے قومی اثاثہ کا ایک لازمی جزء ہوتی ہے۔ کسی قوم میں آنے والا نبی اس کی بعد کی نسلوں کے لئے ایک طرح کا مقدس ہیرو بن جاتا ہے۔ اس کو ماننا اپنے قومی تشخص کو قائم کرنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے نبی کو کون نہیں مانے گا۔ مگر وقت کے نبی کی نبوت ایک متنازعہ نبوت ہوتی ہے۔ وہ التباس کے پردہ میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس کو ماننے کے لئے ظواہر کا پردہ پھاڑ کر حقیقت کو دیکھنا پڑتا ہے۔ اس کا ساتھ دینے کے لئے اپنی انا کو دفن کرنا ہوتا ہے۔ اس کے مشن کی راہ میں اپنا سرمایہ خرچ کرنا ایک ایسے مشن کی راہ میں اپنا سرمایہ خرچ کرنا ہوتا ہے جس کا برسرِحق ہونا ابھی اختلافی ہو، جس کے بارے میں تاریخ کی تصدیقات ابھی جمع نہ ہوئی ہوں۔ صحابہ کرام وہ لوگ تھے جنھوں نے معاصر رسول کو اس طرح مانا جس طرح کوئی شخص تاریخی رسول کو مانتا ہے۔

غزوۂ خندق میں جب محاصرہ شدید ہوا اور معمولی ضروریات کی فراہمی ناممکن ہو گئی تو ایک مسلمان کی زبان سے یہ جملہ نکل گیا کہ محمد ہم سے وعدہ کرتے تھے کہ ہم کسریٰ اور قیصر کے خزانے حاصل کریں گے اور اب یہ حال ہے کہ ہمارا ایک شخص بیت الخلا جانے کے لئے بھی محفوظ نہیں (کان محمد یعدنا ان ناکل کنوز کسریٰ وقیصر واحدنا لایامن ان یذهب الی الغائط، سیرۃ ابن ہشام جزء ثانی صفحہ ۲۲۲) غزوۂ خندق کے وقت رسول اللہ کا وعدہ محض ایک لفظی وعدہ تھا، آج یہ ایک تاریخی واقعہ بن چکا ہے۔ صحابہ نے اس وعدہ کے تاریخی واقعہ بننے سے پہلے رسول کی عظمت کو مانا۔ ہم آج اس وعدہ کے تاریخی واقعہ بننے کے بعد رسول کی عظمت کو مان رہے ہیں۔ دونوں ماننے میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ ایک کو دوسرے سے کوئی نسبت نہیں۔ آج ایک غیر مسلم محقق بھی پیغمبر اسلام کو تاریخ کا سب سے بڑا انسان کہنے پر مجبور ہے مگر آپ کی زندگی میں آپ کی عظمت کو پہچاننا اتنا مشکل تھا کہ صرف وہی لوگ اس کو پہچان سکتے تھے جن کو خدا کی طرف سے خصوصی توفیق ملی ہو۔

قرآن کو دورِ نزاع میں اپنانا

سیرت کی کتابوں میں صحابہ کا دعوتی طریقہ یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ قرآن کے نازل شدہ حصہ کو لے لیتے اور اس کو لوگوں کے سامنے پڑھ کر سناتے تھے (فعرض علیهم الاسلام وتلا علیهم القرآن) چنانچہ مدینہ میں جو صحابہ تبلیغ کے لئے گئے ان کو وہاں مقری (قرآن پڑھنے والا) کہا جاتا تھا۔ یہ بات آج کے ماحول میں بظاہر انوکھی معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن اگر چودہ سو سال کی تاریخ کو حذف کر کے آپ اسلام کے ابتدائی دور میں پہنچ جائیں اور اس وقت کے حالات میں اسے دیکھیں تو یہ اتنا انوکھا واقعہ معلوم ہوگا کہ نہ اس سے پہلے وہ کبھی جماعتی سطح پر پیش آیا اور نہ اس کے بعد۔

آج جب ہم لفظ "قرآن" بولتے ہیں تو یہ ہمارے لئے ایک ایسی عظیم کتاب کا نام ہوتا ہے جس نے چودہ صدیوں میں اپنی عظمت کو اس طرح مسلّم کیا ہے کہ آج کروروں انسان اس کو خدا کی کتاب ماننے پر مجبور ہیں۔ آج اپنے آپ کو قرآن سے منسوب کرنا کسی آدمی کے لئے فخر و اعزاز کی بات بن چکی ہے۔ مگر زمانۂ نزول میں لوگوں کے نزدیک اس کی یہ حیثیت نہ تھی۔ عرب میں بہت سے لوگ تھے جو یہ کہتے تھے کہ محمد نے پرانے زمانہ کے قصے کہانیوں کو جوڑ کر ایک کتاب بنالی ہے۔ ہم چاہیں تو ہم بھی ایسی ایک کتاب بنالیں (لو نشاء لقلنا مثل هذا ان هذا الا اساطیر الاولین، الانفال ۳۱) کوئی قرآن میں تکرار کو دیکھ کر کہتا کہ یہ کوئی خاص کتاب نہیں۔ محمد کے پاس بس چند باتیں ہیں، انھیں کو وہ صبح شام دہراتے رہتے ہیں (وقالوا اساطیر الاولین اکتتبها فهی تملی علیه بکرۃ واصیلا، الفرقان ۵)

ایسی حالت میں قرآن کو پہچاننا گویا مستقبل میں ظاہر ہونے والے واقعہ کو حال میں دیکھنا تھا۔ یہ ایک چھپی ہوئی حقیقت کو اس کے ثابت شدہ بننے سے پہلے پالینا تھا۔ پھر ایسے وقت میں قرآن کو کتاب دعوت بنالینا اور بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ کیونکہ اس کے لئے اپنی عظمت کو کھوکر دوسرے کی عظمت میں گم ہونا پڑتا ہے۔ یہ اپنے مقابلہ میں دوسری شخصیت کا اعتراف کرنا ہے، اور وہ بھی ایسی شخصیت کا جس کی حیثیت ابھی مسلّم نہ ہوئی ہو۔ عرب کے مشہور شاعر لبید نے اسلام قبول کیا اور شاعری چھوڑ دی۔ کسی نے پوچھا کہ تم نے شاعری کیوں چھوڑ دی۔ لبید نے کہا: ابعد القرآن (کیا قرآن کے بعد بھی) آج کوئی آدمی شاعری چھوڑ کر یہ جملہ کہے تو اس کو زبردست عظمت اور مقبولیت حاصل ہوگی۔ مگر لبید کے قول میں اور آج کے شاعر کے قول میں کوئی نسبت نہیں۔ کیونکہ آج کا شاعر تاریخ کے اختتام پر یہ جملہ کہہ رہا ہے جب کہ لبید نے تاریخ کے آغاز پر یہ جملہ کہا تھا۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے۔

لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولئک اعظم درجة من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا الحدید ۱۰

تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنھوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا۔ ان کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بہت زیادہ ہے۔

غیر قائم شدہ صداقت کے لئے مال لٹانا

ابن ابی حاتم نے ایک صحابی کا واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

عن عبد الله بن مسعود قال لما نزلت هذه الآية من ذا الذی یقرض الله قرضا حسنا فیضاعفه

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب قرآن میں یہ آیت اتری کہ کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے

له ،الحدید ۱۱) قال ابوالدحداح الانصاری یارسول الله وان الله لیرید منا القرض قال نعم یا ابا الدحداح ۔قال ارنی یدك یارسول الله ۔ قال فناوله یده ۔قال فانی قد اقرضت ربی حائطی ۔وله حائط فیه ستمائة نخلة وام الدحداح فیه وعیالها ۔قال فجاء ابوالدحداح فناداها یاام الدحداح قالت لبیك ۔ قال اخرجی فقد اقرضته ربی عزوجل فقالت له ربح بیعك یاابا الدحداح و نقلت منه متاعها وصبیانها ۔ وان رسول الله صلی الله علیه قال کم من عذق رداح فی الجنة لابی الدحداح

(تفسیر ابن کثیر)

تو حضرت ابودحداح انصاری نے رسول اللہ صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اے خدا کے رسول، کیا اللہ واقعی ہم سے قرض چاہتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں اے ابودحداح۔ انھوں نے کہا اے خدا کے رسول، اپنا ہاتھ لائیے۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیا۔ ابودحداح نے کہا کہ میں نے اپنا باغ اپنے رب کو قرض میں دے دیا۔ ان کا ایک کھجوروں کا باغ تھا جس میں چھ سو درخت تھے۔ اس وقت ان کی بیوی ام دحداح اپنے بچوں کے ساتھ باغ میں تھیں۔ وہ باغ میں واپس آئے اور آواز دی کہ اے ام دحداح۔ انھوں نے کہا ہاں۔ ابودحداح نے کہا باغ سے نکلو، کیونکہ اس کو میں نے اپنے رب کو قرض میں دے دیا۔ بیوی نے کہا: اے ابودحداح آپ کی تجارت کامیاب رہی۔ اور اس کے بعد اپنے سامان اور اپنے بچوں کو لے کر باغ سے نکل آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابودحداح کے لئے جنت میں کتنے ہی شاداب اور پھل دار درخت ہیں۔

یہ ایک نمائندہ واقعہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام جس دین پر ایمان لائے تھے اس دین کی خاطر قربانی پیش کرنے کے لئے وہ کس قدر بے چین رہتے تھے۔ یہاں دوبارہ ذہن میں رکھ لیجئے کہ یہ واقعہ چودہ سو سال پہلے کا ہے۔ آج کوئی شخص دین کے نام پر اس قسم کا انفاق کرے تو عین ممکن ہے کہ لاکھوں مسلمانوں کے درمیان مقبولیت کی صورت میں اس کو بہت جلد اپنے انفاق سے زیادہ بڑی چیز مل جائے۔ مگر اصحاب رسول کے زمانے میں صورت حال بالکل مختلف تھی۔ اس وقت دین کی راہ میں اپنا مال لٹانا ماحول میں دیوانگی کا خطاب پانے کا ذریعہ تھا، وہ اونچے میناروں پر نمایاں ہونے کے بجائے بنیاد کی زمین میں دفن ہونے کے ہم معنی تھا۔ اس وقت ایسا اقدام ایک ایسی تحریک کے خانہ میں لکھا جانے والا تھا جس کی صداقت ابھی مشتبہ تھی جس کی پشت پر تاریخ کی تصدیقات ابھی جمع نہیں ہوئی تھیں۔ یہ ایک غیر مسلمہ مد میں اپنا اثاثہ پیش کرنا تھا، جب کہ آج کا آدمی ایک مسلمہ مد میں اپنا اثاثہ پیش کرتا ہے۔

اپنا تاج دوسرے کے سر پر رکھنا

مدینہ میں عبداللہ بن ابی بہت عاقل اور صاحب شخصیت آدمی تھا، وہ مدینہ کا سب سے زیادہ ممتاز سردار سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ مدینہ کے باشندوں کو اپنا اختلاف و انتشار ختم کرنے کا احساس ہوا تو انھوں نے عبداللہ بن ابی کو منتخب کیا کہ اس کو اپنا بادشاہ بنائیں اور اس کی علامت کے طور پر اس کو ایک تاج پہنائیں (فاما عبد اللہ بن ابی فکان قومہ قد نظموا لہ الخرز لیتوجوہ ثم یملکوہ علیھم، سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۲۱۶)

عبداللہ بن ابی کی تاج پوشی کا انتظام مکمل ہو چکا تھا کہ عین اس وقت اسلام مدینہ میں پہنچ گیا۔ مدینہ کے باشندوں کی فطرت نے اس کی صداقت کی گواہی دی اور اسلام گھر گھر میں پھیلنے لگا۔ اس کے بعد مدینہ کے باشندوں کا ایک نمائندہ وفد مکہ آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور آپ کی زبان سے آپ کا پیغام سنا۔ انھیں نظر آیا کہ مدینہ کی اجتماعی تنظیم کے لئے انھیں جو شخصیت درکار ہے وہ زیادہ بہتر طور پر محمد بن عبداللہ کی صورت میں موجود ہے۔ انھوں نے مدینہ کے لوگوں کی طرف سے آپ کو پیش کش کی کہ آپ مدینہ آئیں اور وہاں ہمارے سردار بن کر رہیں۔ اسلامی تاریخ کا یہی وہ واقعہ ہے جو بیعت عقبہ ثانیہ کے نام سے مشہور ہے۔

یہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ یہ اپنا تاج دوسرے آدمی کے سر پر رکھ دینے کے ہم معنی تھا۔ قدیم قبائلی دور میں ایسا کوئی واقعہ بے حد نادر واقعہ تھا۔ اپنی قوم یا قبیلہ سے باہر کسی آدمی کو اپنا غیر مشروط سردار بنا لینا ہمیشہ انسان کے لئے مشکل ترین کام رہا ہے اور قدیم زمانہ میں تو یہ اور بھی زیادہ مشکل تھا۔ مزید یہ کہ جب یہ واقعہ پیش آیا اس وقت "محمد" اس پر عظمت ہستی کا نام نہ تھا جس سے ہم آج واقف ہیں۔ اس وقت محمد ایک ایسے انسان تھے جن کو ان کے اہل وطن نے نکال دیا تھا۔ جن کے ساتھ قومی عصبیت اور تاریخی عظمت شامل نہ ہوئی تھی۔ جو نہ صرف متنازعہ شخصیت تھے بلکہ ایک لٹے ہوئے بے گھر انسان تھے۔ جن کو اپنا سب کچھ دے دینا تھا اور ان سے پانا کچھ بھی نہ تھا —— بیسویں صدی میں کسی برنارڈ شا کے لئے بہت آسان ہے کہ وہ پیغمبر اسلام کے لئے یورپ کی سرداری کی پیش کش کرے۔ مگر چھٹی صدی عیسوی میں کسی کے لئے اس کا تصور بھی ناممکن تھا کہ وہ آپ کو پیغمبر مان کر آپ کو اپنا اجتماعی امام بنالے۔

اپنی محدودیت کو جاننا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ جب بھی کوئی معاملہ پیش آتا تو آپ اس کے بارے میں لوگوں سے مشورہ کرتے۔ آپ اپنے اصحاب کو جمع کرتے اور معاملہ کو بیان کر کے فرماتے کہ اشیروا علی ایھا الناس

(اے لوگو مجھے مشورہ دو) آپ بظاہر سب سے مشورہ طلب کرتے۔ مگر عملاً یہ ہوتا کہ کچھ دیر خاموشی رہتی اور اس کے بعد حضرت ابوبکر کھڑے ہو کر مختصراً اپنی رائے ظاہر کر کے بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد حضرت عمر کھڑے ہوتے اور مختصراً کچھ بول کر بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد معمولی طور پر کچھ لوگ بولتے اور اتفاق رائے سے فیصلہ ہو جاتا۔ آپ کی وفات کے بعد جب حضرت ابوبکر کی خلافت کا زمانہ آیا تو آپ بھی اسی طرح لوگوں کو جمع کر کے مشورہ طلب کرتے، اب یہ ہوتا کہ کچھ دیر خاموشی کے بعد حضرت عمر کھڑے ہوتے اور مختصر طور پر اپنی رائے ظاہر کر کے بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد چند لوگ بولتے اور اتفاق رائے سے فیصلہ ہو جاتا۔ حضرت عمر کے بعد غیر اصحاب کی تعداد بڑھ گئی اور مذکورہ صورت باقی نہ رہی۔

یہ بظاہر ایک سادہ سی بات ہے مگر یہ اتنی اہم بات ہے کہ تاریخ میں کوئی دوسرا معاشرہ نہیں پایا جاتا جس نے اس کا ثبوت دیا ہو۔ یہ طرز عمل صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی اتنا خود شناس ہو جائے کہ وہ اپنی کمیوں اور محدودیتوں کو جاننے لگے۔ وہ دوسرے کے "ہے" کے مقابلہ میں اپنے "نہیں" سے واقف ہو جائے۔ وہ اپنے کو اس حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھنے لگے جس نظر سے دوسرا شخص اسے دیکھ رہا ہے۔

اس میں اتنا اور اضافہ کر لیجئے کہ یہ واقعہ جس ابوبکر و عمر کے ساتھ پیش آیا وہ ابوبکر و عمر وہ نہ تھے جن کو آج ہم جانتے ہیں، آج ہم تکمیل تاریخ والے ابوبکر و عمر کو جانتے ہیں۔ مگر وہ آغاز تاریخ والے ابوبکر و عمر کو جانتے تھے۔ اس وقت وہ اپنے معاصرین کے لئے صرف ان میں سے ایک تھے۔ جب کہ آج وہ ہمارے لئے گزری ہوئی تاریخ کے ستون ہیں جن کو ہم اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کوئی ثابت شدہ واقعہ کو دیکھتا ہے۔ "ابوبکر و عمر" کو تاریخ بننے کے بعد جاننا انتہائی آسان ہے۔ لیکن "ابوبکر و عمر" کو تاریخ بننے سے پہلے جاننا اتنا ہی مشکل ہے۔ اصحاب رسول وہ لوگ تھے جو اس مشکل ترین معیار پر پورے اترے۔

ذمہ داری کو اپنے اوپر لے لینا

غزوۂ ذات السلاسل کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً ایک دستہ حضرت عمرو بن العاص کی سرداری میں بھیجا۔ یہ جگہ شام کے اطراف میں تھی۔ حضرت عمرو بن العاص نے وہاں پہنچ کر دشمن کی تیاریوں کا حال معلوم کیا تو اپنا دستہ انھیں اس کے لئے ناکافی معلوم ہوا۔ انھوں نے ایک مقام پر ٹھہر کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ موجودہ فوج ناکافی ہے، مزید کمک روانہ کی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین میں سے دو سو آدمیوں کا دستہ تیار کیا اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کی سرکردگی میں اس کو روانہ فرمایا۔

حضرت ابوعبیدہ جب اپنے دستہ کو لے کر منزل پر پہنچے اور دونوں دستے ساتھ ہو گئے تو یہ سوال پیدا

ہوا کہ دونوں دستوں کا امیر کون ہو۔ حضرت عمرو بن العاص نے کہا کہ دوسرا دستہ میری مدد کے لئے بھیجا گیا ہے اس لئے اصلاً میں ہی دونوں کا امیر ہوں۔ حضرت ابو عبیدہ کے ساتھی اس سے متفق نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یا تو ابو عبیدہ دونوں دستوں کے مشترک امیر ہوں یا دونوں دستوں کا امیر الگ الگ رہے۔ جب اختلاف بڑھا تو ابو عبیدہ بن الجراح نے کہا: اے عمرو، جان لو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے جو آخری عہد لیا وہ یہ تھا کہ آپ نے کہا کہ جب تم اپنے ساتھی سے ملو تو ایک دوسرے کی بات ماننا اور اختلاف نہ کرنا۔ اس لئے خدا کی قسم اگر تم میری نافرمانی کروگے تب بھی میں تمھاری اطاعت کروں گا (تعلم یا عمرو ان آخر ما عھد الیّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان قال: اذا قدمت علی صاحبك فتطاوعا ولا تختلفا۔ وانك واللہ ان عصیتنی لاطعتك، رواہ البیہقی وابن عساکر)

حضرت ابو عبیدہ کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ ذمہ داری کو عمرو بن العاص پر ڈال کر ان سے لامتناہی بحث کرتے رہیں۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو وہ بہت سے ایسے الفاظ پا سکتے تھے جن میں ان کا اپنا وجود بالکل درست اور دوسرے کا وجود بالکل باطل دکھائی دے۔ مگر اس کے بجائے انھوں نے یہ کیا کہ ساری ذمہ داری خود اپنے اوپر لے لی۔ انھوں نے مسئلہ کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیا۔ اجتماعی زندگی میں یہ چیز بے حد ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی اجتماعی زندگی چلتی ہی اس وقت ہے جب کہ اس کے افراد میں اتنی بلندی ہو کہ وہ حقوق کی بحث میں پڑے بغیر اپنے اوپر ذمہ داری لینے کی جرأت رکھتے ہوں۔ جہاں یہ مزاج نہ ہو وہاں صرف آپس کا اختلاف جنم لیتا ہے نہ کہ آپس کا اتحاد۔

شکایات سے اوپر اٹھ کر سوچنا

خالد بن الولید بے حد بہادر تھے۔ ان کے اندر غیر معمولی فوجی قابلیت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر حضرت ابوبکر کی خلافت تک وہ مسلسل اسلامی فوج کے سردار رہے۔ تاہم حضرت عمر کو ان کی بعض عادتیں پسند نہ تھیں۔ چنانچہ انھوں نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ ان کو سرداری کے عہدہ سے ہٹا دیا جائے۔ مگر حضرت ابوبکر نے ان کے مشورہ کو نہیں مانا۔ مگر حضرت عمر کو اپنی رائے پر اتنا اصرار تھا کہ جب وہ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے حضرت خالد کو سرداری سے معزول کر کے ایک معمولی سپاہی کی حیثیت دے دی۔

اس وقت حضرت خالد شام کے علاقہ میں فتوحات کے کارنامے دکھا رہے تھے۔ عین اس وقت خلیفہ ثانی نے انھیں معزول کر کے ابو عبیدہ بن الجراح کو ان کے اوپر سردار لشکر بنا دیا۔ اس کے بعد فوجیوں کی ایک تعداد خالد بن ولید کے خیمہ میں جمع ہوئی اور ان سے کہا کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں، آپ خلیفہ کا حکم نہ مانئے۔ مگر حضرت خالد نے سب کو رخصت کر دیا اور کہا کہ میں عمر کے لئے نہیں لڑتا بلکہ عمر کے رب کے لئے لڑتا ہوں (انی لا اقاتل

فی سبیل عمر ولکن اقاتل فی سبیل رب عمر) وہ پہلے سردار لشکر کی حیثیت سے لڑتے تھے اور اب ایک ماتحت فوجی کی حیثیت سے لڑنے لگے۔

اس قسم کا کردار اسی وقت ممکن ہے جب کہ آدمی اتنا اونچا ہو جائے کہ وہ شکایتوں اور تلخیوں سے اوپر اٹھ کر سوچے اس کا رویہ ردعمل کے طور پر نہ بنے بلکہ مثبت فکر کے تحت بنے۔ وہ اللہ میں جینے والا ہو نہ کہ انسانی باتوں میں جینے والا۔

قانونی حد سے آگے بڑھ کر ساتھ دینا

شعبان ۲ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی کہ قریش کے تمام سرداروں کی رہنمائی میں ایک ہزار کا لشکر مدینہ کی طرف حملہ کرنے کے لئے بڑھ رہا ہے۔ اس میں چھ سو زرہ پوش تھے اور اسی کے ساتھ ایک سو سواروں کا خصوصی دستہ بھی شامل تھا۔ یہ ایک بہت نازک وقت تھا۔ آپ نے مدینہ کے انصار اور مہاجرین کو جمع کیا اور ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے یہ سوال رکھا کہ ایسی حالت میں کیا کرنا چاہئے، حسب معمول اولاً مہاجرین کے ممتاز افراد اٹھے اور انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، آپ کا رب جس بات کا حکم دے رہا ہے اس کی طرف بڑھئے، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم یہود کی طرح یہ کہنے والے نہیں ہیں کہ تم اور تمہارا خدا جا کر لڑیں، ہم یہاں بیٹھے ہیں بلکہ ہمارا کہنا یہ ہے کہ آپ اور آپ کا خدا چل کر لڑیں، ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ جب تک ہم میں سے ایک آنکھ بھی گردش کر رہی ہے ہم آپ کا ساتھ چھوڑنے والے نہیں۔

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین کی اس قسم کی تقریروں کے باوجود بار بار یہ فرما رہے تھے کہ لوگو مجھے مشورہ دو (اشیروا علیّ ایھا الناس) چنانچہ سعد بن معاذ کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، شاید آپ کا رخ ہماری طرف ہے۔ آپ نے کہا، ہاں، اس پر سعد بن معاذ نے انصار کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا: ہم آپ پر ایمان لائے، آپ کی تصدیق کی، اور اس بات کی گواہی دی کہ جو کچھ آپ لائے ہیں، وہ حق ہے، اور اس پر آپ سے سمع وطاعت کا پختہ عہد باندھ چکے ہیں، بس اے خدا کے رسول، آپ جو کچھ چاہتے ہیں اس کو کر گزریے، ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر آپ ہمیں لے کر سمندر کے سامنے جائیں اور اس میں گھس جائیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ سمندر میں گھس جائیں گے۔ ہم میں سے ایک آدمی بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہم کو ہرگز یہ ناگوار نہیں ہے کہ آپ ہمیں لے کر کل کے دن دشمن سے ٹکرا جائیں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہنے والے ہیں۔ مقابلہ کے وقت سچے اترنے والے ہیں۔ شاید اللہ تعالیٰ آپ کو ہم سے وہ کچھ دکھائے جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ پس اللہ کی برکت کے بھروسے پر آپ ہم کو لے کر چلیں۔ (سیرت ابن ہشام) انصار کے قائد کی اس تقریر کے بعد اقدام کا فیصلہ کر لیا گیا۔

بدر کی جنگ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بار بار انصار کی طرف رخ کرنا بے سبب نہ تھا۔ اس کا ایک خاص پس منظر تھا۔ ابن ہشام اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وذلك انهم حين بايعوه بالعقبة قالوا: يارسول الله، إنا بُرَاءُ من ذِمامِكَ حتى تصلَ إلى ديارنا، فاذا وصلت إلينا فأنت في ذمّتنا نمنعك مما نمنع منه أبناءنا ونساءنا، فكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يتخوف الا تكون الانصار ترى عليها نصره الا ممن دهمه بالمدينة من عدوه، وأن ليس عليهم ان يسير بهم الى عدو من بلادهم، (سیرۃ ابن ہشام، جزء ثانی، صفحہ ۲۵۳)

اور ایسا اس لئے ہوا کہ انصار نے جب عقبہ میں بیعت کی تھی تو انھوں نے کہا تھا کہ اے خدا کے رسول، ہم آپ کی ذمہ داری سے بری ہیں یہاں تک کہ آپ ہمارے دیس میں پہنچ جائیں۔ جب آپ ہمارے پاس آجائیں گے تو آپ ہماری ذمہ داری میں ہوں گے اور ہم آپ کا دفاع کریں گے جس طرح ہم اپنے لڑکوں اور عورتوں کا دفاع کرتے ہیں۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اندیشہ تھا کہ انصار کہیں یہ سمجھتے ہوں کہ ان پر آپ کی مدد کرنا اس وقت ہے جب کہ آپ کا دشمن مدینہ پہنچ کر حملہ کرے۔ ان پر یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اپنی بستی سے دور جاکر مقابلہ کریں۔

انصار کی بیعت قدیم عربی اصطلاح کے مطابق بیعت نسار (دفاعی بیعت) تھی۔ اس کے مطابق مدینہ سے ۸۰ میل دور بدر کے مقام پر جاکر لڑنا ان کے لئے ضروری نہ تھا۔ مگر انصار نے اس کو اپنے لئے عذر نہیں بنایا۔ وہ قانونی حد کو توڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے اور بدر کے میدان میں جاکر قربانی پیش کی۔

اختلاف سے بچ کر اصل نشانہ پر لگے رہنا

اخرج الطبراني عن المسور بن مخرمة قال: خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم على اصحابه فقال ان الله بعثني رحمة للناس كافة فادوا عني رحمكم الله، ولا تختلفوا كما اختلف الحواريون على عيسى بن مريم فانه دعاهم الى مثل ما ادعوكم اليه فاما من بَعُدَ مكانه فكرهه فشكا عيسى بن مريم ذلك الى الله عزوجل ---- فقال اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم نحن يا رسول الله نؤدي اليك فابعثنا حيث شئت

مسور بن مخرمہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے سامنے تقریر کی اور فرمایا کہ اللہ نے مجھ کو تمام انسانوں کے لئے رحمت بناکر بھیجا ہے۔ پس تم میری طرف سے اس ذمہ داری کو ادا کرو۔ خدا تم پر رحم کرے اور تم لوگ اختلاف نہ کرنا جس طرح عیسیٰ بن مریم کے حواریوں نے اختلاف کیا۔ انھوں نے اپنے حواریوں کو اسی چیز کے لئے پکارا جس کی طرف میں تم کو پکار رہا ہوں۔ پس جس کا مقام دور تھا اس کو وہاں جانا ناگوار ہوا۔ تو عیسیٰ بن مریم نے اللہ تعالیٰ سے اس کی شکایت کی۔ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے کہا کہ اے خدا کے رسول ہم آپ کی ذمہ داری کو ادا کریں گے۔ آپ ہم کو بھیجئے جہاں آپ چاہیں۔

اجتماعی کام میں رکاوٹ ڈالنے والی سب سے بڑی چیز اختلاف ہے۔ مگر صحابہ کرام کو اللہ کے خوف نے اتنا بے نفس بنا دیا تھا کہ وہ اختلافات سے بلند ہو کر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں لگے رہتے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ کے زمانے میں انھوں نے عرب میں اور اطراف عرب میں آپ کی منشا کے مطابق اسلام کی دعوت پوری طرح پہنچائی۔ آپ کی وفات کے بعد وہ مال وجاہ کے حصول میں نہیں پڑے بلکہ اطراف کے ملکوں میں پھیل گئے۔ ہر صحابی کا گھر اس زمانہ میں ایک چھوٹا مدرسہ بنا ہوا تھا جہاں وہ صرف اللہ کی رضا کے لئے لوگوں کو عربی سکھاتے اور قرآن وسنت کی تعلیم دیتے۔ اس زمانہ میں ایک طرف مسلمانوں کا ایک طبقہ فتوحات اور سیاسی انتظامات میں لگا ہوا تھا۔ عام طریقہ کے مطابق اصحاب رسول کو اپنا سیاسی حصہ لینے میں سرگرم ہونا چاہئے تھا۔ مگر وہ اس سے بے پروا ہو گئے۔ انھوں نے اسلامی فتوحات کے ذریعہ پیدا ہونے والی فضا کو تبلیغ دین کے لئے استعمال کیا، اس طرح ان کے اور ان کے شاگردوں کے خاموش پچاس سالہ عمل کے نتیجہ میں وہ جغرافی خطہ وجود میں آیا جس کو عرب دنیا کہا جاتا ہے، جہاں لوگوں نے نہ صرف اپنے دین کو بدلا بلکہ ان کی زبان اور ان کی تہذیب بھی بدل گئی۔

۔ پچھلی نشست پر بیٹھنے کے لئے راضی ہو جانا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو سب سے پہلا مسئلہ خلیفہ کا انتخاب تھا۔ انصار بنو ساعدہ کی چوپال (سقیفہ) میں جمع ہو گئے۔ اس وقت سعد بن عبادہ انصار کے سب سے زیادہ ابھرے ہوئے سردار تھے۔ چنانچہ انصار میں بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ سعد بن عبادہ کو خلیفہ مقرر کیا جانا چاہئے۔ مہاجرین کو یہ خبر ملی تو ان کے ممتاز افراد تیزی سے چل کر مذکورہ مقام پر پہنچے۔ حضرت ابو بکر نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

أما ما ذكرتم فيكم من خير فأنتم له اهل، ولن تعرف العرب هذا الامر الا لهذا الحي من قريش: هم اوسط العرب نسباً وداراً، وقد رضيت لكم احد هذين الرجلين فبايعوا ايهما شئتم

(سیرۃ ابن ہشام، جزء رابع صفحہ ۳۳۹)

(اے انصار) تم نے اپنی جس فضیلت کا ذکر کیا ہے اس کے تم اہل ہو۔ مگر عرب اس معاملہ (امارت) کو قریش کے سوا کسی اور قبیلہ کے بارے میں نہیں جانتے۔ وہ عربوں میں نسب اور مقام کے اعتبار سے سب سے بہتر ہیں۔ میں تمہارے لئے ان دو آدمیوں (عمر اور ابو عبیدہ بن الجراح) میں سے کسی ایک پر راضی ہوں۔ تم دونوں میں سے جس سے چاہو بیعت کر لو

اس کے بعد حضرت عمر اٹھے اور انھوں نے فوراً حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کر لی اور پھر تمام مہاجرین نے بیعت کی۔ اس کے بعد انصار نے بھی حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ تاہم انصار کے ایک طبقہ کے لئے یہ واقعہ اتنا سخت تھا کہ ایک شخص نے مہاجرین سے کہا کہ تم لوگوں نے سعد ابن عبادہ کو قتل کر دیا (قتلتم سعد ابن عبادہ)

انصار نے اسلام کے لئے بے پناہ قربانیاں دی تھیں۔ انھوں نے اسلام کے بے یار و مددگار قافلہ کو اس وقت پناہ دی جب کہ انھیں اپنے وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود انصار اس فیصلہ پر راضی ہو گئے کہ اقتدار میں ان کا حصہ نہ ہو اور خلیفہ صرف مہاجرین (قریش) میں سے منتخب کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے پیچھے بہت گہری مصلحت تھی۔ قریش سیکڑوں سال سے عرب کے قائد بنے ہوئے تھے۔ ایسی حالت میں اگر کسی غیر قریش کو خلیفہ مقرر کیا جاتا تو اس کے لئے اجتماعی نظم کو سنبھالنا ناممکن ہو جاتا۔ یہ انصار کی حقیقت پسندی تھی کہ انھوں نے اپنی اس کمی کو جانا اور یک طرفہ فیصلہ پر راضی ہو گئے۔ تاہم یہ حقیقت پسندی کی اتنی نایاب قسم ہے کہ اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

غیر جذباتی فیصلہ کرنے کی طاقت

احد کی لڑائی اسلام کی تمام جنگوں میں سب سے زیادہ سخت لڑائی تھی۔ قریش کے تمام جنگی جوان غصہ میں بھرے ہوئے مسلمانوں کے اوپر ٹوٹ پڑے تھے۔ عین اس وقت جب کہ قتل و خون کا معرکہ گرم تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار ہاتھ میں لی اور کہا کون اس تلوار کو اس کے حق کے ساتھ لے گا۔ کچھ لوگ آپ کی طرف بڑھے۔ مگر آپ نے انھیں تلوار نہ دی۔ پھر ابودجانہ سامنے آئے اور پوچھا کہ اے خدا کے رسول اس تلوار کا حق کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم اس سے دشمن کو مارو یہاں تک کہ اس کو ٹیڑھا کر دو (ان تضرب به العدو حتى ينحني) ۔ ابودجانہ نے کہا کہ میں اس کو اس کے حق کے ساتھ لیتا ہوں۔ چنانچہ آپ نے انھیں تلوار دے دی۔

حضرت ابودجانہ تلوار لے کر چلے۔ اس وقت ان پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ وہ اکڑ کر چلنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ اس قسم کی چال خدا کو پسند نہیں سوا ایسے موقع کے (انها المشية يبغضها الله الا في مثل هذا الموطن)

ابودجانہ نے اپنے سر پر لال کپڑا باندھ لیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ موت سے نڈر ہو کر جنگ کے لئے نکل پڑے ہیں۔ وہ انتہائی بہادری کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ جو بھی ان کے سامنے آتا وہ ان کی تلوار کا نشانہ بن جاتا۔ اس کے بعد ایک حیرت انگیز واقعہ ہوا جس کو خود ابودجانہ ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

رایت انسانا یخمش الناس خمشا شدیدا   میں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ بری طرح لوگوں کو جنگ

فصمدت لہ فلما حملت علیہ السیف ولول فاذا امرأۃ فاکرمت سیف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اضرب بہ امرأۃ

(سیرت ابن ہشام جزء ۳۔ صفحہ ۱۴)

پر ابھار رہا تھا۔ میں اس کی طرف لپکا۔ جب میں نے اس پر تلوار اٹھائی تو اس نے کہا یا ویلاہ (ہائے تباہی) اب میں نے جانا کہ یہ ایک عورت ہے۔ تو میں نے خدا کے رسول کی تلوار کو اس سے پاک رکھا کہ اس سے میں کسی عورت کو قتل کروں

اس واقعہ کو ایک صحابی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: پھر میں نے دیکھا کہ ان کی تلوار ہند بنت عتبہ کے سر پر اٹھ گئی ہے مگر اس کے بعد انھوں نے اپنی تلوار اس سے ہٹالی (ثم رایتہ قد حمل السیف علی مفرق راس ھند بنت عتبۃ، ثم عدل السیف عنھا) جنگ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات میں سے ایک ہدایت یہ تھی کہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو نہ مارا جائے۔ حضرت ابو دجانہ نے عین قتل وخون کے ہنگامہ میں اس کو یاد رکھا اور اپنی چلی ہوئی تلوار کو درمیان سے روک لیا۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصحاب رسول کو اپنے جذبات پر کتنا زیادہ قابو تھا۔ ان کے افعال ان کے شعور کے ماتحت تھے نہ کہ ان کے جذبات کے ماتحت۔ وہ انتہائی اشتعال انگیز موقع پر انتہائی ٹھنڈا فیصلہ کر سکتے تھے۔ وہ غصہ اور انتقام کی آخری حد پر پہنچ کر بھی اچانک اپنا ذہن تبدیل کر سکتے تھے۔ وہ ایک رخ پر پوری رفتار سے چل پڑنے کے بعد معاً اپنا رخ دوسری طرف پھیر سکتے تھے۔ یہ بظاہر ایک سادہ سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر عملاً وہ اتنی زیادہ مشکل ہے کہ اس پر کوئی ایسا شخص ہی قادر ہو سکتا ہے جو خدا سے اس طرح ڈرنے والا ہو گویا خدا اپنے تمام جلال وجبروت کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا ہوا ہے اور وہ اس کو اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

درخت کی طرح آگے بڑھنا

قرآن میں انجیل اور تورات کے دو حوالوں کا ذکر ہے۔ تورات کا حوالہ صحابۂ کرام کے انفرادی اوصاف سے متعلق ہے۔ اس کے بعد انجیل کے حوالے سے ان کی اجتماعی صفت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

ومثلھم فی الانجیل کزرع اخرج شطأہ فآزرہ فاستغلظ فاستوی علی سوقہ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار وعد اللہ الذین آمنوا و عملوا الصالحات منھم مغفرۃ واجرا عظیما

(الفتح۔ آخر)

اور انجیل میں ان کی مثال یوں ہے کہ جیسے ایک کھیتی ہو۔ اس نے نکالا اپنا انکھوا۔ پھر اس کو مضبوط کیا۔ پھر وہ موٹا ہوا۔ پھر اپنے تنہ پر کھڑا ہو گیا۔ اچھا لگتا ہے کسانوں کو تاکہ منکروں کا دل ان سے جلائے۔ اللہ نے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کیے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

موجودہ انجیل میں یہ تمثیل ان لفظوں میں ہے —— اور اس نے کہا، خدا کی بادشاہی ایسی ہے جیسے کوئی

آدمی زمین میں بیج ڈالے اور رات کو سوئے اور دن کو جاگے۔ اور وہ بیج اس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے۔ زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے۔ پتی، پھر بالیں، پھر بالوں میں تیار دانے۔ پھر جب اناج پک چکا تو وہ فی الفور درانتی لگاتا ہے۔ کیونکہ کاٹنے کا وقت آپہنچا (مرقس ۴: ۳۲-۲۶)

انجیل اور قرآن کی اس تمثیل میں یہ بتایا گیا ہے کہ پیغمبر آخرالزماں کے اصحاب کا اجتماعی ارتقاء درخت کی مانند ہوگا۔ اس کا آغاز بیج سے ہوگا، پھر وہ دھیرے دھیرے بڑھے گا اور اپنا تنہ مضبوط کرتے ہوئے اوپر اٹھے گا۔ یہاں تک کہ فطری رفتار سے تدریجی ترقی کرتے ہوئے اپنے کمال کو پہنچ جائے گا۔ اس کی ترقی اتنی شاندار ہوگی کہ ایک طرف اہل ایمان اس کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوں گے اور دوسری طرف دشمن دانت پیس رہے ہوں گے کہ اس کا معاملہ اتنا مضبوط ہے کہ اس کے خلاف ہمارا کچھ بس نہیں چلتا۔

اسلام کو درخت کی طرح ترقی دینے کے لئے خدا کا یہ منصوبہ تھا جو صحابہ کرام کے ذریعہ انجام پایا۔ تاہم یہ کوئی آسان معاملہ نہ تھا۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ وہ جلد بازی کے بجائے صبر کو اپنا طریقہ بنائیں۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ فوری محرکات کے تحت وہ کوئی اقدام نہ کریں۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ وہ اپنے ذوق پر چلنے کے بجائے قوانین فطرت کی پیروی کریں۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ وہ اس سے بے پرواہ ہو کر کام کریں کہ نتیجہ ان کی زندگی میں سامنے آتا ہے یا ان کے بعد۔ "درخت اسلام" کو اگانے کے لئے ضرورت تھی کہ وہ اپنے جذبات کو کچلیں اور اپنی امنگوں کو دفن کر دیں۔ صحابہ کرام نے یہ سب کچھ کیا۔ انھوں نے کسی تحفظ کے بغیر اپنے آپ کو خدائی اسکیم کے حوالہ کر دیا۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ زمین میں خدا کا دین ایک ایسے ابدی باغ کی صورت میں کھڑا ہو گیا جس کو ساری دنیا مل کر بھی مٹانا چاہے تو نہ مٹا سکے۔

مردانِ کار کی ضرورت

اکثر لوگ احیاء اسلام کی مہم کو اس کے "پروگرام" میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کو اسی وقت سمجھ پاتے ہیں جب کہ انھیں ایک متعین پروگرام بتا دیا جائے۔ مگر پروگرام کو تحریک کا بدل سمجھنا تحریک کی وسعتوں کی تصغیر (Underestimation) ہے۔ پروگرام ایک محدود نقشۂ کار کا نام ہے اور انسانی زندگی اس سے زیادہ وسیع ہے کہ وہ کسی محدود نقشہ کار کے دائرہ میں سما سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ سب سے بڑا پروگرام خود افراد کو پروگرام ساز بنانا ہے نہ کہ افراد کے ہاتھوں میں کوئی لگا بندھا پروگرام دینا۔

اسلامی دعوت یہی کام کرتی ہے۔ حقیقی اسلامی دعوت افراد کے ذہن کو اس طرح جگا دیتی ہے کہ وہ خود پروگرام ساز بن جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں صرف توحید کی دعوت پیش کی تھی۔ آپ نے اس قسم کی کوئی چیز لوگوں کو نہیں دی جس کو موجودہ زمانہ میں "پروگرام" کہا جاتا ہے۔ اس کے باوجود ہر وہ شخص جو آپ کی دعوت سے متاثر ہوتا اس کو اپنے لئے مکمل پروگرام مل جاتا تھا۔ وہ آپ سے توحید کا شعور لینے کے بعد خود ہی سارا کام کرنے لگتا تھا۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ مکہ چھوڑ کر حبش گئے ان کو آپ نے معروف معنوں میں کوئی پروگرام نہیں بتایا تھا۔ مگر انھوں نے حبش میں اسلام کی اتنی کامیاب نمائندگی کی کہ اسلام بین اقوامی دعوت کے مرحلہ میں داخل ہو گیا۔ آپ کی ہجرت سے پہلے جو مسلمان مدینہ گئے ان کو آپ نے قرآن کی سورتوں کے سوا اور کچھ نہیں دیا تھا۔ مگر انھوں نے مدینہ میں اسلامی دعوت کی مہم اس طرح چلائی کہ صرف چند سالوں میں مدینہ اس قابل ہو گیا کہ وہ دار الہجرت (اسلام کا مرکز) بن سکے۔

تقلیدی مذہب سے ہٹا کر شعوری مذہب پر لانے کی مہم سب سے بڑی انقلابی مہم ہے۔ وہ ایسے افراد وجود میں لاتی ہے جو اپنی ذات میں مکمل پروگرام ہوتے ہیں۔ ایسی مہم کی زد انسان کے پورے وجود پر پڑتی ہے۔ وہ انسانی فطرت کو اس طرح جگاتی ہے کہ اس کے اندر ربانی حکمت کا چشمہ ابل پڑے۔ اب ایسے انسان وجود میں آتے ہیں جو خدا کے پاؤں سے چلیں، جو خدا کے ہاتھ سے پکڑیں، جو خدا کی آنکھ سے دیکھیں اور خدا کے کان سے سنیں۔ وہ حدیث کے الفاظ میں، وہ بے پناہ انسان بن جائیں جس کی ہوش مندی ہر دوسری چیز سے بلند تر ثابت ہوتی ہے (اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله) ایسا آدمی خود ہر چیز کا بدل بن جاتا ہے۔ اس کے پاس ہر سوال کا صحیح ترین جواب ہوتا ہے۔ وہ ہر موقع پر اپنے لئے کامیاب ترین راہ عمل تلاش کر لیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب میں یہی حکمت ربانی جگا دی تھی، اس کے بعد انھیں کسی اور چیز کی ضرورت نہ رہی۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا نے انسان کی فطرت میں وہ سب کچھ بھر دیا ہے جس کی اسے اپنی زندگی میں ضرورت ہے۔ عام حالات میں یہ فطرت ڈھکی ہوئی رہتی ہے۔ اسی انسانی فطرت سے جمود اور تعصب اور بے شعوری کے پردوں کو ہٹانا اسلامی دعوت کا اصل کام ہے۔ ان پردوں کے ہٹتے ہی انسانی فطرت اس آفاقی روشنی میں آجاتی ہے جس سے تمام زمین و آسمان جگمگا رہے ہیں۔ اس کے بعد ہر چیز اس کو اپنے واقعی روپ میں دکھائی دینے لگتی ہے۔ اور جو آدمی چیزوں کو ان کے واقعی روپ میں دیکھ لے اس کے لئے پروگرام کا مسئلہ اتنا ہی آسان ہو جاتا ہے جتنا آنکھ والے ایک شخص کے لئے سیڑھی کے زینوں پر قدم رکھتے ہوئے کسی عمارت کے اوپر چڑھنا۔

یہاں میں ایک واقعہ نقل کروں گا جو اس مسئلہ کو بہت خوبی کے ساتھ واضح کرتا ہے۔

ایک ہندستانی خاتون اپنے شوہر کے ساتھ طرابلس میں رہتی تھیں۔ وہ عربی نہیں جانتی تھیں۔ وہاں ان کی زندگی بالکل گھریلو زندگی تھی۔ باہر کی دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ایک روز رات کو اچانک ان کے شوہر کے پیٹ میں سخت درد اٹھا۔ گھر میں بیوی کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا جو ڈاکٹر کو بلائے۔ طرابلس میں گھریلو ٹیلی فون بھی نہیں ہوتے کہ ٹیلی فون پر ڈاکٹر یا اسپتال سے رابطہ قائم کیا جائے۔ مگر بستر پر تڑپتا ہوا شوہر اور اس سے قلبی تعلق خاتون کے لئے اپنی ہر کمی کا بدل بن گیا۔ وہ رات کے سناٹے میں اپنے گھر سے نکلی۔ راستہ سے ناواقفیت، مقامی زبان سے اجنبیت، کسی ڈاکٹر کا نام یا پتہ معلوم نہ ہونا کوئی بھی چیز اس کے لئے رکاوٹ نہ بنی۔ وہ اپنی بیتابی کی رہنمائی میں چلتی رہی۔ یہاں تک کہ بے شمار مرحلوں سے گزرنے کے بعد بالآخر وہ ایک پاکستانی ڈاکٹر کے گھر پہنچ گئی۔ پاکستانی ڈاکٹر اس کی زبان (اردو) جانتا تھا۔ وہ فوراً اس کے ساتھ آیا۔ دیکھنے کے بعد اس نے سمجھ لیا کہ یہ اپنڈکس کا کیس ہے اور اس کا فوراً آپریشن ہونا چاہئے، چنانچہ اسی وقت وہ اس کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر اسپتال لے گیا۔ وہاں اس کا آپریشن ہوا اور چند دن کے بعد وہ اچھا ہو کر اپنے گھر واپس آگیا۔

اس قسم کا واقعہ ہر آدمی کی زندگی میں پیش آتا ہے۔ ہر آدمی ایسی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے جس کے بارے میں پہلے سے اس کے پاس کوئی نقشۂ عمل نہیں ہوتا۔ مگر وہ پوری طرح اس کا مقابلہ کرتا ہے اور بالآخر کامیاب ہو جاتا ہے۔ تاہم اس قسم کے قصے کسی کے ساتھ ہمیشہ اپنے بیوی بچوں اور اپنے ذاتی معاملات میں پیش آتے ہیں۔ اگر تعلق اور دلچسپی کا یہی درجہ دین کے ساتھ پیدا ہو جائے تو دین کے معاملات بھی اسی طرح حل ہونے لگیں جس طرح لوگ اپنے ذاتی معاملات روزانہ حل کر رہے ہیں۔ پھر لوگوں کے لئے نہ دینی تقاضوں کو جاننا مشکل رہے اور نہ دین کے لئے قربانی دینا۔ وہ اپنے پروگرام کو اسی طرح پالیں جس طرح مذکورہ خاتون نے اپنے ڈاکٹر کو پالیا۔

ہم سے اکثر کہا جاتا ہے کہ آپ کے پاس نقشۂ کار کیا ہے۔ آہ، لوگوں کو کس طرح بتایا جائے کہ نقشۂ کار کی نہیں بلکہ مردانِ کار کی ضرورت ہے۔ کوئی واقعہ خواہ وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، اس کو برپا کرنے والے ہمیشہ انسان ہوتے ہیں۔ نہ کہ کوئی پروگرام یا نقشۂ کار۔ اجتماعی زندگی میں انقلاب ہمیشہ وہ لوگ لاتے ہیں جو اپنی ذات میں پروگرام ہوں نہ کہ وہ لوگ جنھیں کوئی لگا بندھا ڈھرا دے دیا جائے اور اس پر وہ دوڑتے رہیں۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کا واقعہ ہے۔ ایک بار انھوں نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد انھوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ وہ ہاتھ اٹھائے خاموش دعا کرتے رہے۔ اس وقت اورنگ زیب کے پیچھے ان کے وزیر سعد اللہ خاں کھڑے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب جب دعا سے فارغ ہوئے تو سعد اللہ خاں نے کہا: عالی جاہ، آپ کی سلطنت کا پرچم کشمیر سے لے کر راس کماری تک لہرا رہا ہے، کیا اس کے بعد بھی کوئی ارمان ہے جو آپ کے دل میں باقی رہ گیا ہے۔ اورنگ زیب یہ سوال سن کر کچھ دیر خاموش رہے اور اس کے بعد تاثر کے ساتھ کہا: سعد اللہ، مردے خواہم (سعد اللہ، میں ایک مرد چاہتا ہوں)

اورنگ زیب کے پاس وہ چیز مکمل طور پر موجود تھی جس کو نقشۂ کار کہا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کے پاس حکومت اور وسائل بھی پوری طرح موجود تھے۔ اس کے باوجود وہ مغل سلطنت کو مستحکم بنانے میں اس لئے ناکام ہو گیا کہ اس کے پاس مردانِ کار نہ تھے۔ اگر اورنگ زیب کے پاس سچے مردانِ کار کی ٹیم موجود ہوتی تو اورنگ زیب کے بعد آنے والی تاریخ اس سے مختلف ہوتی جیسا کہ اب ہمیں نظر آتی ہے۔

اسلام کے مشن کو آج انسانوں کی بھیڑ میں انسان کی تلاش ہے۔ خدا کے نام پر بولنے والوں کے درمیان اس کو اس انسان کی تلاش ہے جس کو خدا کے خوف نے چپ کر رکھا ہو، دنیا کے پیچھے دوڑنے والوں کے درمیان وہ اس انسان کی راہ دیکھ رہا ہے جو آخرت کی خاطر کھڑا ہو گیا ہو۔ خدا کے نام پر خوشیاں منانے والوں کے درمیان وہ اس انسان کو ڈھونڈھ رہا ہے جس کو خدا کی یاد نے رونے پر مجبور کر دیا ہو۔ اپنی انا کا جھنڈا اٹھانے والوں کے درمیان اس کو اس انسان کی تلاش ہے جس نے خدا کو اس طرح پایا ہو کہ اس کے پاس ایک بے انا روح کے سوا اور کچھ باقی نہ رہ گیا ہو۔ دین کے نام پر لڑنے والوں کے درمیان وہ اس انسان کو تلاش کر رہا ہے جس نے دین کی خاطر لڑائی بھڑائی چھوڑ دی ہو۔ حاسبوا اغیارکم کا جھنڈا اٹھانے والی فوج کے درمیان وہ ان لوگوں کا انتظار کر رہا ہے جو حاسبوا انفسکم کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو آج اسلام کو مطلوب ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے ذریعہ اسلام دوبارہ فکری غلبہ کا مقام حاصل کرے گا۔

آج اسلام کو ایسے انسان درکار ہیں جو اپنے کو اس حد تک خالص کریں کہ وہ ظواہر سے گزر کر حقیقت کو دیکھنے لگیں۔ جو اس صبر کے حامل ہوں کہ غیر متعلق مسائل سے اپنا دامن بچا کر اصل نشانہ پر اپنی ساری توجہ مرکوز

رکھیں۔ جو آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو اتنا ہیچ سمجھیں کہ دنیا کی ہر قربانی دینا ان کے لئے آسان ہو جائے۔ جو اتنے زیادہ حقیقت پسند ہوں کہ اپنے مقابلہ میں دوسروں کی خوبی دیکھ سکیں اور اپنی سیٹ پر دوسرے کو بٹھا سکیں۔ جو حقائق کو اس طرح دیکھنے لگیں کہ کوئی لفظی شوشہ انھیں اس سے بدکانے والا ثابت نہ ہو۔ جو منفی جذبات سے اس قدر خالی ہوں کہ کوئی ذاتی رنجش انھیں منحرف نہ کر سکے اور کسی کی ترقی انھیں حسد میں مبتلا نہ کرے۔ جو دوسرے کو اپنے مقام پر رکھ کر دیکھیں اور اپنے کو دوسرے کے مقام پر۔ جو ظواہر سے زیادہ حقیقت کے دلدادہ ہوں۔ اور حال سے زیادہ مستقبل پر نظر رکھتے ہوں۔ خلاصہ یہ کہ وہ دنیا کے بجائے آخرت میں جیتے ہوں اور اپنی بڑائی کے بجائے خدا کی بڑائی میں گم ہو چکے ہوں۔ ایسے ہی لوگوں نے دور اول میں اسلام کو غالب فکر کا مقام عطا کیا تھا اور ایسے ہی لوگ دور ثانی میں بھی اسلام کو غالب فکر کا مقام عطا کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ پروگرام کا سوال اصلاً افراد تیار کرنے کا سوال ہے۔ افراد کسی تربیتی نظام میں نہیں ڈھلتے اور نہ کسی قسم کے خارجی ہنگاموں کے درمیان بنتے ہیں۔ افراد تیار کرنے کی صورت تو صرف یہ ہے کہ دین قیم کی بنیاد پر ایک ایسی بے آمیز تحریک اٹھے جو فطرت انسانی کو مس کرنے والی ہو۔ جو آدمی کے باطن میں ضرب لگا کر اس کے اندر سوئے ہوئے ربانی انسان کو جگا دے، جو انسان کے فکر میں خدا کا رنگ اس طرح گھولے کہ اس کی پوری ہستی خدا کے رنگ میں رنگ جائے۔

ایسی تحریک حالات کے ردعمل کے طور پر نہیں اٹھتی۔ وہ فطرت کے ساز پر خدا کا ابدی نغمہ چھیڑنے کے ہم معنی ہوتی ہے۔ وہ کتاب الٰہی کی حکمت کو لسان عصر میں کھولتی ہے۔ وہ پیغمبرانہ دعوت کا زمانی اظہار ہوتی ہے۔ وہ خدا اور انسان کے درمیان ربط بن کر سامنے آتی ہے۔ وہ سورج کی روشنی اور پھولوں کی مہک کی طرح خدا کے تخلیقی حسن کا نمونہ ہوتی ہے۔ کسی معاشرہ میں ایسی تحریک کا اٹھنا اس بات کی سب سے بڑی ضمانت ہے کہ وہاں وہ ربانی انسان بن کر اٹھیں جو اپنی ذات میں پروگرام ہوں۔ تاہم پیغمبروں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایسی دعوت اٹھنے کے بعد بھی عملاً صرف وہی لوگ اس سے فیض یاب ہوتے ہیں جو پہلے سے اپنے اندر زرخیزی کا مادہ رکھتے ہوں۔ بنجر زمین بارش سے پہلے بھی بنجر رہتی ہے اور بارش کے بعد بھی۔ بنجر (والبلد الطیب یخرج نباتہ باذن ربہ والذی خبث لا یخرج الا نکدا، الاعراف ۵۸)

اسلام کی نئی تاریخ شروع کرنے کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ انسانوں کی ایسی جماعت ہے جس کی فطری صلاحیتیں زندہ ہوں۔ تاکہ اس کو جب اسلام کی دعوتِ فطرت کا مخاطب بنایا جائے تو وہ اس کو صحیح طور پر قبول کر سکے۔ جب اس کے اندر اسلام کا بیج ڈالا جائے تو اس کی کھیتی اس طرح لہلہا اٹھے جس طرح زرخیز زمین میں دانہ ڈالنے کے بعد اس کی فصل لہلہا اٹھتی ہے۔ اسلام کی دعوت اپنی قبولیت کے لئے آج ایسے کسی گروہ کا

انتظار کر رہی ہے۔ اس قسم کے زندہ افراد اگر مسلمانوں میں سے نکل آئیں تو یہ مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے اور اگر ایسے جاندار لوگ مسلمانوں میں سے نہ نکلیں تو خدا کسی دوسری قوم کو یہ توفیق دے گا اور اس کے اندر سے ایسے زندہ افراد اٹھائے گا جو اسلام کی بارش سے نہائیں اور دنیا کو اس میں نہلانے کے لئے اپنا سب کچھ لگا دیں (وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لایکونوا امثالکم)

اوپر ہم نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ جنگ بدر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے متعلق دعا کی کہ خدایا یہ گروہ (العصابہ) اگر ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد زمین پر تیری عبادت نہ ہوگی۔ یہ اصحاب بدر کل ۳۱۳ تھے۔ مگر یہی ۳۱۳ کی تعداد رسول کی نظر میں فیصلہ کن بن گئی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے غلبہ کے لئے اصل میں جو چیز درکار ہے وہ کسی قسم کی بھیڑ نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ بھیڑ کے اندر دعوتی عمل کر کے اس کے زندہ افراد کو اس سے نکال لیا جائے۔ یہ زندہ افراد خواہ ۳۱۳ ہوں مگر ان کو انسانیت کا خلاصہ ہونا چاہئے۔ شعور کے اعتبار سے وہ شعور ربانی کے ہم سطح ہوں اور عمل کے اعتبار سے وہ اخلاق خداوندی کا پیکر بن چکے ہوں۔ ان کا سوچنا اور کرنا دونوں خدا کی میزان عدل میں پورا اتر رہا ہو۔ ایسے گروہ کو چھانٹ کر نکالنا ہی دعوت اسلامی کا اصل مقصود ہے۔ جس دن ایسا گروہ وجود میں آجائے گا تو خواہ وہ ۳۱۳ جیسی اقلیت میں کیوں نہ ہو وہ خدا کی مدد سے خدا کے دین کو غلبہ کے مقام پر پہنچا کر رہے گا۔ ایسا ایک گروہ ہمیشہ خدا کی فرقان ہوتا ہے۔ اور جو گروہ خدا کی فرقان بن جائے اس کے لئے اس دنیا میں غلبہ کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔

اسلام دور جدید میں

اسلام چونکہ آخری دین ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے وجود کے اعتبار سے قیامت تک باقی رہے۔ اسی لئے دین کا تحفظ بھی ایک ضروری اور مطلوب کام ہے۔ موجودہ زمانہ کی بعض تحریکوں نے اس اعتبار سے یقیناً مفید خدمات انجام دی ہیں۔ وہ اسلام کے فکری اور عملی نقشہ کی محافظ ثابت ہوئی ہیں۔ بعض ادارے قرآن اور حدیث اور اسلامی مسائل کے علم کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ بعض جماعتیں اسلامی عبادات کے ڈھانچہ کو ایک نسل سے دوسری تک پہنچانے کا کام کر رہی ہیں۔ کچھ اور ادارے قرآن و حدیث کا متن صحت و صفائی کے ساتھ چھاپ کر ہر جگہ پھیلا رہے ہیں۔ یہ تمام کام بجائے خود مفید ہیں مگر بہر حال وہ تحفظ دین کے کام ہیں نہ کہ دعوت دین کے۔ جہاں تک اسلام کو دعوتی قوت کی حیثیت سے زندہ کرنے کا سوال ہے وہ موجودہ زمانہ میں ابھی تک واقعہ نہ بن سکا۔ حتیٰ کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو شاید اس کا شعور بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر ایسے کاموں کو اسلامی دعوت کا عنوان دے دیتے ہیں جن کا اسلامی دعوت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

موجودہ زمانہ میں کسی حقیقی اسلامی کام کے آغاز کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم اس صورت حال کو ختم کریں جس نے ساری دنیا میں اسلامی تحریک کو سیاسی تحریک کے ہم معنی بنا رکھا ہے۔ مسلمان ہر ملک میں وقت کے حکمرانوں کے خلاف شور و شر برپا کرنے میں مشغول ہیں۔ کہیں ان کی یہ تحریک غیر مسلم اقتدار کے خلاف برپا ہے اور کہیں مسلم اقتدار کے خلاف۔ کہیں وہ مسلح جدوجہد کے روپ میں ہے اور کہیں زبانی اور قلمی احتجاج کے روپ میں۔ کہیں وہ ایک اسلامی سیاسی فلسفہ کے زیر سایہ کام کر رہی ہے اور کہیں فلسفہ اور نظریہ کے بغیر متحرک ہے۔ کہیں اس نے ملی عنوان اختیار کر رکھا ہے اور کہیں نظامی عنوان۔ تاہم سارے فرق و اختلاف کے باوجود نتیجہ سب کا ایک ہے — جدید امکانات کو دعوت توحید اور انذار آخرت کے لئے استعمال نہ کرنا اور اپنی قوتوں کو بے فائدہ طور پر مفروضہ حریفوں کے خلاف محاذ آرائی میں ضائع کرتے رہنا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں بالکل الٹی کارکردگی کا ثبوت دیا ہے۔ خدا نے دعوتِ حق کی راہ سے سیاسی رکاوٹ کو دور کر کے انھیں موقع دیا تھا کہ وہ آزادانہ حالات میں خدا کے تمام بندوں تک خدا کا پیغام پہنچا دیں۔ وہ خدا کے بندوں کو خدا کی اس اسکیم سے باخبر کر دیں جس کے تحت اس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جس کے مطابق وہ ایک ایک شخص کا حساب لینے والا ہے۔ مگر انھوں نے دوبارہ نئے نئے عنوان سے اپنے خلاف سیاسی رکاوٹیں کھڑی کر لیں۔ خود ساختہ سیاسی جہاد میں ہر ایک مشغول ہے۔ مگر دعوتی جہاد میں اپنا حصہ ادا کرنے کی فرصت کسی کو نہیں۔

قرآن میں ہے کہ اللہ اس کی مدد کرتا ہے جو اللہ کی مدد کرے (حج ۴۰) ہر دور میں خدا اپنے دین کے حق میں کچھ امکانات کھولتا ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ کچھ لوگ ہوں جو خدا کے اشارہ کو سمجھیں اور خدا کے منصوبہ میں اپنے آپ کو شامل کر دیں۔ صحابہ کرام وہ خوش نصیب لوگ ہیں جنھوں نے اپنے زمانہ میں خدائی منصوبہ کو سمجھا اور اپنے آپ کو پوری طرح اس کے حوالہ کر دیا۔ اس کا نتیجہ وہ عظیم انقلاب تھا جس نے انسانی تاریخ کے رخ کو موڑ دیا۔

بارش کا آنا خدا کے ایک منصوبہ کا خاموش اعلان ہے۔ یہ کہ آدمی اپنا بیج زمین میں ڈالے تاکہ خدا اپنے کائناتی انتظام کو اس کے موافق کر کے اس کے بیج کو ایک پوری فصل کی صورت میں اس کی طرف لوٹائے۔ کسان اس خدائی اشارہ کو فوراً سمجھ لیتا ہے اور اپنے آپ کو اس خدائی منصوبہ میں پوری طرح شامل کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ ایک لہلہاتی ہوئی فصل کی صورت میں اس کو واپس ملتا ہے۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں، ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں، اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے حق میں کچھ نئے مواقع کھولے تھے۔ یہ مواقع کہ اقتدار کا حریف بنے بغیر توحید اور آخرت کی دعوت کو عام کیا جائے۔ جو کام پہلے معجزاتی سطح پر انجام دینا پڑتا تھا، اس کو عام طبیعیاتی استدلال کی سطح پر انجام دیا جائے۔ جو کام پہلے تعصب کے ماحول میں کرنا پڑتا تھا اس کو مذہبی رواداری

کے ماحول میں کیا جائے۔ جو کام پہلے "حیوانی رفتار" سے کیا جاتا تھا اس کو "مشینی رفتار" کے ساتھ انجام دیا جائے۔

یہ موجودہ زمانہ میں خدا کا منصوبہ تھا۔ خدا نے سارے بہترین امکانات کھول دئے تھے اور اب صرف اس کی ضرورت تھی کہ خدا کے کچھ بندے ان کو استعمال کر کے ان امکانات کو واقعہ بننے کا موقع دیں۔ مگر مسلم قیادت خدا کے اس منصوبہ میں شامل ہونے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ اس نے نئے نئے عنوانات کے تحت وہی سیاسی جھگڑے دوبارہ چھیڑ دئے جن کو خدا نے ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں ختم کیا تھا۔ انھوں نے اسلامی دعوت کو سیاسی اور قومی دعوت بنا کر دوبارہ اسلام کو اقتدار کا حریف بنا دیا اور کہا کہ یہی عین خدا کا پسندیدہ دین ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدعو قوموں کے ساتھ ہر جگہ بالکل بے فائدہ قسم کی مقابلہ آرائی شروع ہو گئی اور سارے نئے امکانات غیر استعمال شدہ حالت میں پڑے رہ گئے۔ مسلمانوں اور دیگر قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم نہ ہو سکا۔

کام کی ایک سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت مسلمانوں نے کھو دی۔ یہاں تک کہ شیطان نے بیدار ہو کر قدیم شرک کی جگہ جدید شرک (کمیونزم) کی صورت میں کھڑا کر دیا۔ اب کم از کم کمیونزم کے زیر تسلط علاقوں میں دوبارہ کام کرنے کی وہی مشکلات پیدا ہو گئی ہیں جو اس سے پہلے شرک کے زیر تسلط علاقوں میں پائی جاتی تھیں۔ تاہم غیر کمیونسٹ دنیا میں اب بھی کام کے مواقع کھلے ہوئے ہیں اور یہاں پندرھویں صدی ہجری میں اس صالح جدوجہد کا آغاز کیا جا سکتا ہے جو چودھویں صدی ہجری میں نہ کیا جا سکا۔

اسلام دین فطرت

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کوئی آدمی دولت کے لئے جیتا ہے، کوئی عزت کے لئے، کوئی اقتدار کے لئے۔ ہر آدمی، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، کسی نہ کسی چیز میں جی رہا ہے۔ ہر آدمی کی زندگی میں کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جس کے سہارے وہ زندہ ہو۔ جس کو وہ سب سے زیادہ قابل لحاظ سمجھے۔ جس کو حاصل کرنے کا خواب دیکھے۔ جس کے لئے دوڑ دھوپ کرے۔ اس کی امیدیں اور اس کے اندیشے، اس کی تمنائیں اور اس کی حسرتیں سب سے زیادہ اس سے وابستہ ہوں۔ اس کو پاکر وہ سب سے زیادہ خوش ہو اور اس کے چھننے کا ڈر ہو تو وہ سب سے زیادہ غمگین ہو جائے۔

یہی دین ہے۔ اس معنی میں ہر شخص کا ایک دین ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص اس قسم کے ایک دین سے خالی نہیں۔ آدمی جس چیز کو اپنا "دین" بنائے اسی کے مطابق اس کی پوری زندگی بنتی ہے۔ اس کی سوچ اور جذبات، اس کا لین دین، اس کے انسانی تعلقات، اس کی سرگرمیاں اور کارروائیاں سب اسی کے گرد گھومتی ہیں۔ وہ اس کام کو کرتا ہے جس سے اس کا مقصود ملنے والا ہو، اس کام سے دور بھاگتا ہے جس سے اپنے مقصود کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہو۔ یہی دین اس کا حاکم ہوتا ہے۔ سوتے جاگتے ہر حال میں وہ اسی دین کو پکڑے رہتا ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی گوشہ اس کے اثر سے خالی نہیں ہوتا۔

یہ دین خدا کا بھی ہو سکتا ہے اور غیر خدا کا بھی۔ موجودہ دنیا میں یہی امتحان ہے کہ آدمی کون سا دین اختیار کرتا ہے۔ خدا کا یا غیر خدا کا۔ یہاں ہر شخص کو آزادی ہے۔ یہاں غیر خدا کے دین کو پکڑ کر بھی آدمی عزت اور کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ مگر یہ کامیابی بالکل وقتی ہوگی۔ وہ زیادہ سے زیادہ موت تک آدمی کا ساتھ دے گی اس کے بعد اگلی مستقل دنیا میں وہ اس حال میں اٹھے گا کہ وہ بالکل خالی ہاتھ ہوگا۔ اگلی دنیا میں خدا اپنے قدرت اور جلال کے ساتھ ظاہر ہو چکا ہوگا۔ اس لئے وہاں عزت و کامیابی صرف اس شخص کے لئے ہوگی جس نے موجودہ دنیا میں خدا کے دین کو اپنا دین بنایا ہوگا۔ جو کسی دوسرے دین کو اختیار کرے گا، اس کے لئے موت کے بعد آنے والی دنیا میں ناکامی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

خدا کا دین ہی انسان کے لئے فطری اور حقیقی دین ہے۔ یہ حقیقت ڈر کے لمحات میں کھل جاتی ہے۔ آدمی خواہ کوئی بھی دین اختیار کرے۔ خواہ وہ کوئی بھی سہارا پکڑے۔ مگر جب انسان کی زندگی کا جہاز کسی بھنور میں پھنستا ہے جب اس پر کوئی نازک لمحہ آجاتا ہے، اس وقت اس کو تمام چیزیں بھول جاتی ہیں۔ اس وقت وہ بے اختیار ہو کر ایک خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ یہ تجربہ جو کبھی نہ کبھی ہر شخص کی زندگی میں گزرتا ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حقیقی دین صرف خدا کا دین ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ اسی کو اپنی زندگی کا دین بنائے۔ اس کے سوا وہ جس دین کو بھی پکڑے گا وہ وقت آنے پر اسی طرح بے حقیقت ثابت ہوگا جیسے آج نازک لمحات میں تمام چیزیں بے حقیقت ثابت ہو جاتی ہیں۔ آج کے حالات میں فطرت کی پکار آئندہ آنے والی مستقل دنیا کا ایک اشارہ ہے۔ وہی شخص کامیاب ہے جو اس اشارہ پر کان لگائے اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق بنالے۔

آدمی کا امتحان

پہلا انسان جو خدا نے پیدا کیا وہ آدم تھے۔ اس وقت خدا کی پیدا کی ہوئی دو مخلوقات اور تھیں۔ ایک فرشتے دوسرے جن۔ خدا نے فرشتوں اور جنوں کو حکم دیا کہ تم سب آدم کے آگے سجدہ کرو۔ فرشتے خدا کا حکم سنتے ہی سجدہ میں گر پڑے۔ مگر ابلیس، جو جنوں کا سردار تھا، اس نے سجدہ نہیں کیا۔ خدا نے کہا: تم نے سجدہ کیوں نہیں کیا جب کہ میں نے اس کا حکم دیا تھا۔ ابلیس بولا: میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے آدم کو مٹی سے بنایا ہے اور مجھ کو آگ سے (اعراف ۱۲) ابلیس خدا کو سجدہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ مگر وہ آدم کو سجدہ کرنے پر راضی نہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ملعون اور جہنمی قرار دے دیا گیا۔

یہی معرکہ آدم کی اولاد میں آج بھی جاری ہے۔ ایک طرف فرشتے ہیں جو آدمی کو تسلیم اور اعتراف کا سبق دے رہے ہیں۔ دوسری طرف ابلیس ہے جو انسان کی رگوں میں تیرتا ہے اور آدمی کو اکساتا ہے کہ وہ خود پسندی (انا خیر منہ) کا طریقہ اختیار کرے اور اس کا ہم مسلک بن جائے۔ اس طرح ہماری زندگی میں دوبارہ بہت بڑے پیمانہ پر وہی کہانی دہرائی جارہی ہے جو پہلے انسان کی پیدائش کے وقت ابتداءً پیش آئی تھی۔ دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے ہم کبھی نہ کبھی ایک "آدم" سے دوچار ہوتے ہیں۔ ہمارا سابقہ کسی نہ کسی انسان سے پڑتا ہے اور اس کا کوئی نہ کوئی حق ہمارے اوپر عائد ہوتا ہے، خواہ وہ ایک اچھے بول کی صورت میں کیوں نہ ہو۔ ایسے ہر موقع پر خدا اپنی خاموش زبان میں کہہ رہا ہوتا ہے کہ میرے حکم کی تعمیل میں اس آدم کے سامنے جھک جاؤ۔ اب جو لوگ فرشتوں کی روش کو اختیار کریں اور اپنے بارے میں خدا کے حکم کو پہچان کر اپنے آپ کو اس کے آگے ڈال دیں، وہ خدا کے وفادار بندے ہیں۔ وہ ابدی جنتوں میں جگہ پائیں گے۔ اور جو لوگ ابلیس کے طریقے کو اختیار کریں اور اپنی بڑائی کی خاطر دوسرے کے آگے جھکنے کے لئے تیار نہ ہوں، وہ خدا کے باغی لوگ ہیں۔ وہ ابلیس کے ساتھ جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے تاکہ وہاں ابدی طور پر جلتے رہیں:

> شیطان بولا: جیسا تو نے مجھے بدراہ کیا ہے، میں تیری سیدھی راہ پر انسانوں کی تاک میں بیٹھوں گا۔ میں ان پر آؤں گا آگے سے اور پیچھے سے، دائیں سے اور بائیں سے۔ اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔ اللہ نے کہا: نکل یہاں سے ذلیل و خوار ہو کر۔ ان میں سے جو کوئی تیری راہ چلا تو میں تم سب سے دوزخ کو بھر دوں گا (اعراف ۱۸-۱۶)

انسان خدا کا بندہ ہے۔ اس کو اصل سجدہ خدا ہی کو کرنا ہے۔ مگر دنیا کی زندگی میں وہ جن لوگوں کے درمیان رہتا ہے، ان کے مقابلہ میں بار بار اس پر کسی نہ کسی کا حق آتا ہے اور بار بار خدا کا حکم ہوتا ہے کہ یہاں تم اس "آدم" کے سامنے جھک جاؤ۔ یہی آدمی کا اصل امتحان ہے۔ خدا کو سجدہ کرنے کے لئے آدمی آسانی سے تیار ہو جاتا ہے۔ مگر جہاں اس کو کسی انسان کا اعتراف کرنا ہو، جہاں کسی انسان کے سامنے جھکنے کا سوال ہو وہاں فوراً

اس کے اندر ابلیس والی نفسیات جاگ اٹھتی ہیں۔ "میں اس سے بہتر ہوں، میں کیوں اس کے سامنے جھکوں" یہ احساس، شعوری یا غیر شعوری طور پر، اس کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے۔ وہ جس خدا کو سجدہ کر رہا ہوتا ہے، اس خدا کے حکم کے باوجود "آدم" کے آگے جھکنے سے انکار کر دیتا ہے۔

دو آدمیوں کے درمیان ایک معاملہ پڑتا ہے۔ اس معاملہ میں ایک حق پر ہوتا ہے اور دوسرا ناحق پر۔ جو شخص حق پر ہے وہ گویا دوسرے شخص کے لئے وقت کا "آدم" ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان اس صورت حال کا پیدا ہونا ہی خدا کا یہ حکم آجاتا ہے کہ میرے بنائے ہوئے اس آدم کے سامنے میری خاطر جھک جاؤ۔ اب جو شخص اپنے حریف کے حق کو مانتے ہوئے اس کے سامنے اپنے آپ کو جھکا دے، اس نے فرشتوں کی پیروی کی۔ اور جس شخص کے لئے اس کی "میں" حق کے اعتراف میں مانع ہو جائے، جو اس ذہن کے تحت حق دار کے سامنے جھکنے سے انکار کر دے کہ میری پوزیشن مضبوط ہے، یہ شخص میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا، اس نے ابلیس کی پیروی کی۔ خدا کے سامنے سجدہ کرنا اس کی نجات کا سبب نہیں بن سکتا۔ خدا کے آگے سجدہ صرف اس شخص کا معتبر ہے جو خدا کے حکم کی تعمیل میں اس کے بنائے ہوئے "آدم" کے سامنے بھی جھکنے پر راضی ہو جائے۔ جو یہ کہے کہ میں خدا کے لئے سجدہ کروں گا مگر آدم کے سامنے نہیں جھکوں گا، وہ ابلیس کا بھائی ہے۔ اس کے سجدہ کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ اس نے "آدم" کے سامنے جھکنے سے انکار کر کے کبر کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور جو اپنے اندر کبر کی نفسیات کی پرورش کرے اس کا کوئی عمل خدا کبھی قبول نہیں کرتا۔

پہلے انسان (آدم) کا قصہ خدا کے سامنے براہ راست پیش آیا تھا۔ اب دنیا کی زندگی میں ہر آن یہی قصہ خدا کے غیب میں پیش آرہا ہے۔ آج خدا ہمارے سامنے عیاناً موجود نہیں ہے۔ آج جو چیز خدا کی جگہ پر ہے وہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کا طریقہ ہے اور اسی کے ساتھ آدمی کا اپنا ضمیر ہے جو اندر سے اس کو آواز دیتا ہے ہر روز جب کسی انسان سے ہمارا سابقہ پیش آتا ہے اور یہ تقاضہ ہوتا ہے کہ ہم اس کے حق کا اعتراف کریں، خواہ یہ تقاضہ لفظی اعتراف کا ہو یا کسی عمل کا، اس وقت گویا خاموش زبان میں خدا کا حکم ہمارے پاس آجاتا ہے۔ خدا کہتا ہے کہ اس "آدم" کا جو حق تمھارے اوپر آتا ہے اس کو ادا کرو۔ بالفاظ دیگر، اس کے سامنے جھک جاؤ۔ اگر لفظی اعتراف کا معاملہ ہے تو لفظوں میں اس کی صداقت کا اعتراف کرو۔ اگر عملی حق کا معاملہ ہے تو عملی طور پر اس کا حق ادا کرو۔ ایسے موقع پر جو لوگ خدا کی خاموش آواز پر کان لگائیں اور فوراً اپنے آپ کو اس کی تعمیل کے لئے پیش کر دیں، وہ امتحان میں سچے اترے۔ اور جو لوگ "میرا درجہ بڑا ہے"، "میں اس سے بہتر ہوں"، "میں زیادہ طاقتور ہوں" جیسی نفسیات میں مبتلا ہو جائیں اور اپنے "آدم" کے آگے جھکنے سے انکار کر دیں، وہ امتحان میں پورے نہیں اترے۔ پہلی قسم کے لوگوں کے لئے فرشتوں والا انجام ہے اور دوسری قسم کے لوگوں کے لئے ابلیس والا انجام۔ انسان سے اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ یہی ہے کہ وہ خدا کے سامنے سجدہ کرے۔ مگر کوئی شخص حقیقۃً خدا کا ساجد بنا یا نہیں، اس کا امتحان اس کو "آدم" کے سامنے جھک کر دینا ہے۔ خدا کا ساجد اور عابد وہی ہے جو خدا کے

حکم کو مان کر اپنے حق دار انسان کے سامنے جھک جائے۔ جو شخص خدا کے سامنے سجدہ کرے اور جب انسان سے معاملہ پڑے تو اس کا حق نہ پہچانے اور گھمنڈ اور بے انصافی کا طریقہ اختیار کرے، وہ خدا کا ساجد بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ جہاں اس کا خدا اس کے ساجد ہونے کا امتحان لے رہا تھا وہاں وہ اپنے آپ کو ساجد ثابت نہ کر سکا۔

خدا کو سجدہ کرنے کے لئے آدمی آسانی سے تیار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ خدا کے مقابلہ میں کسی کے اندر "میں اس سے بڑا ہوں" کی نفسیات نہیں ہوتی۔ جب کہ انسان کے مقابلہ میں طرح طرح کی نفسیاتی گرہیں پڑی ہوئی ہوتی ہیں جو ایک انسان کے لئے دوسرے انسان کے اعتراف میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ خدا کسی انسان کا حریف نہیں۔ جب کہ ایک انسان بہت جلد دوسرے انسان کو اپنا حریف سمجھ لیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں جھکنے کو اپنے لئے عزت کا سوال بنا لیتا ہے۔ خدا کے مقابلہ میں آدمی کی نفسیات احتیاج کی نفسیات ہوتی ہے۔ خدا صرف دینے والا ہے۔ اس کو کسی سے لینے کی ضرورت نہیں۔ مگر انسان کا معاملہ مختلف ہے۔ یہاں جب ایک شخص دوسرے شخص کے سامنے جھکتا ہے تو وہ اس کو کچھ نہ کچھ دیتا ہے۔ کبھی اچھے الفاظ، کبھی دوسرے کی حقانیت کا اعتراف، کبھی اس کا مالی یا مادی حق ادا کرنا، کبھی کسی کو افضل پاکر خود پیچھے ہٹ جانا اور اس کو آگے بڑھانا، کبھی کسی کی کمزوری پر قابو پالینے کے باوجود اس کی عزت کی خاطر اس سے درگزر کرنا۔ کبھی ایک شخص کی اتفاقی غلطی سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہوتے ہوئے انصاف کی خاطر چپ رہ جانا۔ کبھی سامنے کے ملتے ہوئے نفع کو چھوڑ کر صرف اصول کی خاطر بے نفع والے آدمی کا ساتھ دینا، غرض ہر بار جب کسی کے لئے دوسرے آدمی کے سامنے جھکنے کا سوال ہو تو یہ اس کو کچھ دینے کا سوال ہوتا ہے۔ ایک آدمی کو دوسرے آدمی کے مقابلہ میں حق و انصاف کا رویہ اختیار کرنے کے لئے اس کو اپنی نفسیاتی گرہوں کو توڑنا پڑتا ہے۔ جب وہ کسی حریف کی عزت کرتا ہے تو یہ اپنی عزت کو خطرہ میں ڈالنے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ یہ چیزیں خدا کے سجدہ کے مقابلہ میں "آدم" کے آگے جھکنے کو کسی انسان کے لئے بے حد مشکل بنا دیتی ہیں۔ مگر انسان کا اصلی امتحان جہاں ہو رہا ہے، وہ یہی مقام ہے۔ یہی وہ اصل قربانی ہے جو ہر ایک کو اپنے خدا کی رضا کے لئے دینی ہے۔ جو اس قربانی کے لئے تیار نہ ہو وہ کبھی خدا کا محبوب بندہ نہیں بن سکتا۔ خواہ وہ بظاہر خدا کو سجدہ کرنے والا ہو یا سجدہ نہ کرنے والا۔

سب سے بڑی حقیقت اللہ رب العالمین ہے۔ اس ذات کو پالینا ہی آدمی کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی جہاں اپنے رب کو پاتا ہے وہ "سجدہ" ہے، مگر سجدہ اسی وقت حقیقی سجدہ بنتا ہے جب کہ سجدہ سے باہر کی دنیا میں آدمی تواضع اور جھکاؤ کی زندگی اختیار کر چکا ہو۔ ایسا شخص اپنی نفسی حالت کے اعتبار سے اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ خدا کی تجلیات کا آخذ (Recipient) بن سکے۔ اس کے لئے سجدہ حقیقی معنوں میں رب العالمین سے ملاقات کا مقام بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص سجدہ سے باہر کی زندگی میں خود پسند اور متکبر بنا رہے، اس کی روح کے اندر شیطان اپنے گھونسلے بنا لیتا ہے۔ اس کا سجدہ غفلت اور بے کیفی کا سجدہ ہوتا ہے۔ اس کا سجدہ اس کو خدا سے نہیں ملاتا، اس کا سجدہ اس کو خدا سے قریب نہیں کرتا۔

توحید کا تصور اسلام میں

کائنات کا ایک خالق ہے۔ اس نے اپنے منصوبہ کے مطابق اس کو بنایا ہے اور وہی اس کو چلا رہا ہے۔ جس طرح ساری کائنات خدا کی اطاعت کر رہی ہے اسی طرح انسان کے لئے بھی صحیح رویہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کا فرماں بردار بن کر زندگی گزارے۔ تمام انبیاء یہی بتانے کے لئے آئے اور کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ ہر آن آدمی کو یہی سبق دے رہی ہے ——— یہ ہے اسلامی توحید اور اس مقالہ میں مجھ کو اسی نظریۂ توحید کی وضاحت کرنی ہے۔

"کیا تمھیں شک ہے اللہ کے بارے میں جس نے زمین و آسمان کو پھاڑا (ابراہیم ۱۰) قرآن کا یہ ارشاد بظاہر ایک سوال ہے مگر حقیقۃً وہ سوال کا جواب ہے۔ اس آیت میں فاطر (پھاڑنے والا) کا لفظ وجود خداوندی کے حق میں ایک قطعی دلیل ہے جس کو دوسرے مقام پر ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے "کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا کہ زمین و آسمان باہم ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے ان کو جدا کر دیا (انبیاء ۳۰) اندازہ کیا گیا ہے کہ کائنات کا موجودہ دائرہ (Radius) کم از کم دس ہزار ملین سال نور ہے۔ فلکیاتی مطالعہ نے بتایا ہے کہ کائنات ایک حالت پر ٹھہری ہوئی نہیں ہے بلکہ یکساں رفتار سے اپنے چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ یہ عمل مسلسل جاری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ماضی میں کسی وقت کائنات سمٹی ہوئی حالت میں تھی۔ فلکیات دانوں کے خیال کے مطابق ابتداءً پوری کائنات ایک بڑے ایٹم (Super Atom) کی صورت میں تھی۔ اس کے تمام اجزاء بے حد قوت کے ساتھ اندر کی طرف کھنچے ہوئے تھے۔ تقریباً پندرہ بلین سال پہلے اس ابتدائی مادہ میں ایک دھماکہ یا اخراج طاقت (Energy Release) کا واقعہ ہوا جس کے نتیجہ میں سپر ایٹم کے اجزا اپنے مرکز سے ٹوٹ کر اپنے چاروں طرف پھیلنے لگے تاکہ موجودہ کائنات کو وجود دے سکیں۔ سپر ایٹم کے اندر اس وقت جو اسباب کام کر رہے تھے وہ تمام تر صرف اندر کی طرف کھنچنے اور سمٹنے کے تھے۔ اپنے ذاتی قانون کے برخلاف اس کے اجزاء کا باہر کی طرف سفر شروع کرنا لازماً کسی خارجی طاقت کی مداخلت ہی سے ہو سکتا تھا۔ یہ واقعہ ہم کو مجبور کرتا ہے کہ ہم کائنات کے ماسوا ایک آزاد ہستی کا وجود تسلیم کریں جو تمام طاقتوں کی مالک ہے اور جس نے اپنے شعوری عمل سے ابتدائی مادہ کے اندر یہ غیر معمولی حرکت پیدا کی۔

"زمین و آسمان میں اگر ایک خدا کے سوا کوئی اور خدا ہوتا تو ضرور ان میں بگاڑ پیدا ہو جاتا (انبیاء ۲۲) قرآن کے یہ الفاظ اس کائناتی واقعہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ یہ مافوق طاقت صرف ایک ہے، کئی نہیں۔ تمام طبیعی علوم حیرت انگیز طور پر اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ پوری کائنات ایک ہی قانون کے تحت چل رہی ہے۔ جو قوانین زمین پر کام کر رہے ہیں، وہی نہایت صحت کے ساتھ اجرام سماوی میں بھی کارفرما ہیں۔ یہی یقین تھا جس نے انسان کو آمادہ کیا کہ وہ کھربوں ڈالر خرچ کر کے خلائی مشینیں بنائے اور ان کو چاند اور مریخ پر عین اپنے اندازہ کے مطابق اتار سکے۔ اگر ساری کائنات ایک قانون کے تحت مکمل صحت کے ساتھ عمل نہ کر رہی ہوتو زمین پر

لگی ہوئی ہماری دوربینیں وسیع کائنات میں آٹھ ہزار ملین سال نور تک نہ "دیکھ" سکیں۔ ہمارے طبیعی علوم اچانک اپنی تمام اہمیت کھودیں۔ کائنات کا اس قدر درست طور پر وحدانی حالت میں ہونا بتاتا ہے کہ وہ صرف ایک خدا کے کنٹرول میں ہے۔ اگر وہ کئی خداؤں کے کنٹرول میں ہوتی تو یقیناً اس میں انتشار برپا ہو جاتا۔ مختلف خداؤں کی کش مکش میں وہ درہم برہم ہو کر رہ جاتی۔ زمین پر ایک قانون کی حکمرانی ہوتی اور سیاروں پر دوسرے قانون کی۔

"اللہ نے پیدا کی ہر چیز اور پھر ہر ایک کا ایک اندازہ مقرر کر دیا (فرقان ۲) طبیعیاتی مشاہدہ بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کا ایک قانون ہے اور وہ انتہائی لزوم کے ساتھ اس پر قائم ہے۔ آئن رکسبرگ (پروفیسر تطبیقی ریاضیات کوئن میری کالج لندن) کے الفاظ میں "کائنات تعجب خیز حد تک یکساں (Uniform) ہے۔ ہم خواہ کسی طور پر بھی اس کو دیکھیں، کائنات کے اجزاء میں وہی ترکیب اسی تناسب سے پائی جاتی ہے۔ زمین پر جو طبیعیاتی قوانین دریافت کئے گئے ہیں، وہ تحکمی اعداد (Arbitrary Numbers) پر مشتمل ہیں۔ جیسے الکٹران کی مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادہ (Mass) سے، جو کہ تقریباً 1840 کے مقابلہ میں ایک ہوتا ہے۔ یہی تناسب ہر جگہ اور ہر وقت پایا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ کیا ایک خالق نے تحکمی طور پر (Arbitrarily) انھیں اعداد کا انتخاب کر رکھا ہے" (سنڈے ٹائمس لندن ۴ دسمبر ۱۹۷۷) یہ واقعہ صاف طور پر بتاتا ہے کہ کائنات ہر آن ایک زبردست ہستی کے کنٹرول میں ہے۔ جو خدا کائنات کا خالق ہے، وہی اس کا حکمراں بھی ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ — "خدا اگر ہے تو ہم کو نظر کیوں نہیں آتا" ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں ہمارے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ چیزوں کو دیکھے بغیر مانیں۔ یہ صرف خدا کے عقیدہ کا سوال نہیں ہے۔ ہم جس کائنات میں ہیں اور جس کو ہم بہر حال مانتے ہیں، اس میں بے شمار چیزیں ہیں جن کو ہم نہیں دیکھتے اور نہیں دیکھ سکتے۔ مگر اس کے باوجود ہم ان کو ماننے پر مجبور ہیں۔ خدا کے سوا موجودہ کائنات کو بھی ہم ایمان بالغیب کا طریقہ اختیار کئے بغیر نہیں سمجھ سکتے۔ مثال کے طور پر ایٹم میں کئی قسم کے ذرات (Particles) تسلیم کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک نیوٹرینو (Neutrino) ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس ذرہ میں کوئی برقی چارج نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اس میں کوئی مادہ (Mass) بھی نہیں ہوتا۔ گویا وہ ایک لاشئے وجود ہے۔ ایک سائنس داں کے الفاظ میں:

Neutrino is a tiny bundle of nothing (3.1.1979)

نیوٹرینو لاشئے کا ایک چھوٹا سا پلندہ ہے۔ اس لاشئے کا وجود کیوں تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایٹم میں بعض ایسے خواص ظاہر ہوتے ہیں جن کی توجیہہ اس کے بغیر نہیں ملتی کہ ایٹم کے ڈھانچہ میں ایک غیر ذرہ (Non-Particle) کا وجود تسلیم کیا جائے۔ اس مفروضہ نیوٹرینو کے عجیب وغریب اوصاف میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ کسی بھی مادی جسم سے بغیر روک ٹوک گزر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے سفر میں پورے کرہ ارض کو اس کے اندر سے پار کر سکتا ہے۔ نیوٹرینو کی اس خصوصیت کو انسانی استعمال میں لانے کے لئے امریکہ میں تجربات ہو رہے ہیں۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اگر نیوٹرینو کی اس خصوصیت کو قابل استعمال بنایا جا سکا تو پیغام رسانی کی دنیا میں انقلاب آجائے گا——

کائنات میں کسی چیز کو "دیکھنا" خالص علمی طور پر اس قدر ناممکن ہے کہ سائنسی فلاسفہ کے درمیان خود اس امر میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے کہ وہ کائنات کو ایک خارجی (Objective) واقعہ قرار دیں یا محض ایک ذہنی یا داخلی (Subjective) طور پر محسوس کی جانے والی چیز۔

خدا کو ماننا کبھی انسان کے لئے اتنا مشکل نہیں رہا ہے جتنا خدا کا صحیح تصور قائم کرنا۔ تمام معلوم زمانوں سے انسان خدا کو مانتا رہا ہے اور آج بھی کرۂ ارض کی آبادی کی بہت بڑی اکثریت خدا کے وجود کا اقرار کرتی ہے۔ مگر اصل کمی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ خدا کو ماننے کے باوجود لوگ اس کے ساتھ ایسے عقیدے جمع کر لیتے ہیں جس سے ماننا اور نہ ماننا دونوں یکساں ہو جاتا ہے۔ کسی نے خدا کو مانتے ہوئے اس کی ایسی تعبیر کی کہ خدا کا کوئی علیحدہ اور مستقل وجود ہی مشتبہ ہو گیا۔ کسی نے خدا کو مانا مگر اسی کے ساتھ اس کے ایسے شرکا ر یا مقربین بارگاہ فرض کر لئے جس کے بعد خدا کی خدائی بے معنی ہو کر رہ گئی۔

خدا کے معاملہ میں انسان کے بے راہ ہونے کی وجہ ہمیشہ صرف ایک رہی ہے۔ کائنات کے معلوم واقعات پر خدا کو قیاس کرنا —— انسان کے یہاں بیٹے بیٹیاں ہوتی ہیں، اس لئے فرض کر لیا گیا کہ خدا کے بھی کچھ بیٹے بیٹیاں ہوں گی۔ اور اس طرح ایک مقدس خدائی خاندان تیار ہو گیا۔ دنیا کے بادشاہوں کے یہاں کچھ سرکار رس لوگ ہوتے ہیں، اس لئے فرض کر لیا گیا کہ خدا کے یہاں بھی کچھ مقرب لوگ ہیں جن کو اس نے اختیار دے رکھا ہے اور جن کی باتوں کو وہ سنتا ہے۔ اس طرح خاصان کائنات کا ایک قبیلہ تیار ہو گیا۔ دنیا میں بہت سی طاقتیں کام کرتی ہوئی نظر آئیں۔ مثلاً سورج، ستارے، دریا وغیرہ۔ فرض کر لیا گیا کہ یہ سب خدائی میں شریک ہستیاں ہیں اور بڑے خدا کے ساتھ مل کر خدائی کو چلا رہی ہیں۔ اس طرح خدا کا معاملہ ایک قسم کا "مشترک کاروبار" کا معاملہ بن گیا، وغیرہ

مظاہر پرستی کی یہی قسم تھی جس نے فلسفیانہ ذہنوں میں پہنچ کر وحدت وجود کی صورت اختیار کی۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک کائنات ہے جو انسان سے لے کر ستاروں تک بے شمار چیزوں سے بھری ہوئی ہے۔ وہ اس تنوع میں وحدت تلاش کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ایک مطلق خدا ہے جو اپنے آپ کو مختلف شکلوں میں ظاہر کر رہا ہے۔ اس طرح خدا کا تصور، ایک ایسے مجرد خیال کی صورت میں ڈھل گیا جس کی اپنی علیحدہ کوئی ہستی نہ ہو۔ ہر چیز اسی سے نکلتی ہو اور ختم ہو کر دوبارہ اس میں مل جاتی ہو۔ اسی تصور نے "انسانی خداؤں" کا عقیدہ پیدا کیا۔ یہ فرض کر لیا گیا کہ کچھ لوگ اپنی ریاضتوں سے اپنی دنیوی حیثیت کی اس طرح نفی کر لیتے ہیں کہ وہ جیتے جی خدا سے مل جاتے ہیں اور اس طرح اپنی زندگی ہی میں اس خدا کا جزء بن جاتے ہیں جس کا جزء دوسرے لوگ مرنے کے بعد، ان کے عقیدہ کے مطابق، بننے والے ہیں

اسلام نے خدا کے تصور سے ان تمام الحاقات کو جدا کیا۔ اس نے بتایا کہ اس طرح کا ہر اضافہ در اصل خدا کے عقیدہ کی نفی ہے۔ خدا وہی خدا ہے جو ہر لحاظ سے یکتائی کی صفت رکھتا ہو۔ جو اپنی ذات و صفات میں اشتراک

کی تمام قسموں سے پوری طرح پاک ہو۔ "کہہ دو کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے احتیاج ہے۔ اس کے اولاد نہیں۔ نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اور نہیں ہے اس کے برابر کوئی (اخلاص)

توحید کی عملی اہمیت

اسلام میں توحید کا عقیدہ ہیگل کے فلسفہ کی طرح محض ایک مجرد تصور (Abstract Idea) کی حیثیت نہیں رکھتا۔ انسان کی زندگی سے اس کا نہایت گہرا عملی تعلق ہے۔ اسلام کے نزدیک وہی شخص موحد ہے جو وحدت فکر کے ساتھ وحدت کردار کا بھی حامل بن جائے۔ اسلامی توحید کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کائنات کا خالق ایک ہے اسی طرح اس کا مالک بھی ایک ہے۔ اور ٹھیک اسی طرح وہ ہستی بھی وہی ایک ہے جس کے آگے انسان جواب دہ ہے اور اپنے عمل کے مطابق جس کے یہاں سزا یا جزا پانے والا ہے۔ اس طرح آخرت کا عقیدہ بھی، بالواسطہ طور پر، عقیدۂ توحید ہی کا ایک جزء بن جاتا ہے۔ خدا کے تخلیقی ظہور کو مانے بغیر جس طرح خدا کا عقیدہ بے معنی ہے، اسی طرح خدا کے محاسب اور مجازی ہونے کی حیثیت کو جب تک تسلیم نہ کیا جائے، خدا کی یکتائی کا عقیدہ مکمل نہیں ہوتا۔ موجودہ کائنات اپنی اتھاہ حکمتوں کے ساتھ خدائے وحدہٗ لاشریک کی قدرت کاملہ کا ایک ظہور ہے۔ آخرت کا عالم اسی ظہور خداوندی کی تکمیل ہے۔ موجودہ دنیا وحدتِ الٰہی کا غیبی ظہور ہے، آخرت کی دنیا وحدتِ الٰہی کا شاہداتی ظہور۔ موجودہ عالم میں توحید ایک غور و فکر کا موضوع نظر آتی ہے، آخرت کی دنیا وہ دنیا ہوگی جہاں توحید ایک ایسا قائم شدہ واقعہ بن جائے گا جس کو ماننا اسی طرح ہر ایک کے لئے ضروری ہوگا جس طرح آج سورج کو ماننا۔ اگر کوئی شخص خدا کو ایک مانے مگر خدا کی یکتائی کے اس ظہور کو تسلیم نہ کرے جو آخرت کی صورت میں سامنے آنے والا ہے تو اس کا عقیدۂ توحید ناقص ہے۔ وہ ایک فلسفی موحد ہو سکتا ہے مگر اس کو اسلامی موحد کہنا کسی طرح درست نہ ہوگا۔

"خدا ایک ہے" یہ صرف ایک گنتی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ تمام معلوم اور نامعلوم حقائق کی تشریح کا معاملہ ہے۔ مادی دنیا ہو یا روحانی دنیا، حال کا معاملہ ہو یا مستقبل کا معاملہ، دنیا کے مسائل ہوں یا آخرت کے مسائل، تمام چیزیں اس وقت تک ناقابل فہم ہیں جب تک ان کو ایک فکری وحدت کی حیثیت نہ دے دی جائے، جب تک وحدتِ خداوندی کے ساتھ ان کی نسبت کو معلوم نہ کر لیا جائے۔ خدا کی یکتائی کی دریافت تمام حقائق کی مرکزی وحدت کی دریافت ہے۔ وہی توحید توحید ہے جو ہمارے اوپر حقائق کی ابدی معنویت کو واضح کر دے۔ جو نظریہ حقائق کی معنویت کو بحیثیت ایک کل کے واضح نہ کرے وہ خواہ اور جو کچھ ہو مگر اسلامی نقطۂ نظر سے اس کو توحید نہیں کہا جا سکتا۔ خدا کی وحدت کو پانا اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب کہ وہ اسی کے ساتھ انسان اور کائنات کی وحدت کو پانے کے ہم معنی بن جائے، وہ ایک ایسے فکر کا درجہ حاصل کرے جہاں تمام تضادات ختم ہو جائیں اور صرف وحدت ہی آخری حقیقت کے طور پر باقی رہ جائے۔ ڈارون نے خالق (Creator) کا وجود تسلیم کیا ہے۔ مگر وہ یہ دریافت نہ کر سکا کہ خالق ہے تو اس کے اور انسان کے درمیان نسبت کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈارون کے نظریہ کے بطن سے تاریخ کا سب سے زیادہ شدید

الحاد بر آمد ہوا۔ توحید کے عقیدہ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ ضروری ہے کہ توحید کا مطالعہ اس طرح کیا جائے کہ وہ ہم کو توحید اور انسان کے درمیان نسبت کی دریافت تک پہنچا سکے۔ اس کے بغیر نہ صرف یہ کہ یہ مطالعہ ادھورا ہیگا بلکہ یہ بھی اندیشہ ہے کہ وہ سچائی کے مسافر کو الٹی سمت میں کسی مقام پر پہنچانے والا بن جائے۔

توحید کا عقیدہ اور انسان

کائنات جس طرح مکمل طور پر اپنے خالق اور مالک کے تابع ہے، وہی انسان سے بھی مطلوب ہے جو کائنات کا صرف ایک حقیر حصہ ہے۔ انسان کے لئے درست طرز عمل صرف یہ ہے کہ وہ اس حقیقت واقعہ کو تسلیم کرے اور خدا کی اطاعت کو قبول کر کے بقیہ کائنات کا ہم سفر بن جائے۔ خدا جس طرح ساری کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اسی طرح انسان کے معاملات بھی اسی وقت سدھر سکتے ہیں جب کہ وہ اپنے آپ کو خدائی کنٹرول میں دے چکا ہو۔ کائنات کی صحت کارکردگی کا سبب یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو خدائی اخلاقیات کے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ انسانی زندگی کی درستگی کا راز بھی یہی ہے کہ وہ خدائی اخلاقیات میں اپنے آپ کو رنگنے کی کوشش کرے۔

توحید تمام بھلائیوں کا سرچشمہ ہے۔ اور ہر قسم کی خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ توحید دنیا میں قائم نہ ہو۔ توحید کیا ہے۔ اس حقیقتِ واقعہ کا تحقق کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا، اس کو سنبھالنے والا اور ہر قسم کی قوتوں کا تنہا مالک صرف ایک اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی کو اس کائنات میں کسی قسم کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔ ذرہ سے لے کر کہکشانی نظاموں تک سارا عالم اس حقیقتِ توحید کی براہ راست گرفت میں ہے۔ وہ مکمل طور پر ایک مالک الملک کے زیر انتظام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پورا عالم اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ ٹھیک ویسا ہی ہے جیسا کہ فی الواقع اس کو ہونا چاہئے۔ اس کی کارگزاری میں آج تک کسی ادنیٰ نقص کا مشاہدہ نہ کیا جا سکا۔ وہ اتنی کامل صحت کے ساتھ چل رہا ہے کہ کھرب ہا کھرب سال کے اندر بھی اس کی رفتار میں ایک سکنڈ کا فرق نہیں پڑتا۔

موجودہ زمانہ میں خدا کے وجود کے خلاف جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں، ان میں سب سے اہم وہ ہے جس کو نقص کا مسئلہ (Problem of Evil) کہا جاتا ہے۔ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ کائنات میں ایسے نقائص ہیں جن کی موجودگی میں یقین نہیں کیا جا سکتا کہ اس کو کسی حکمت والے خدا نے بنایا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک شخص نے یہ مثال دی ہے کہ زمین کی قوت کشش (Force of Gravity) اس سے بہت زیادہ ہے جتنا کہ اس کو ہونا چاہئے۔ چنانچہ چند میٹر کی بلندی سے گرنے میں آدمی کا پاؤں ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر قوت کشش کم ہوتی تو ایسا نہ ہوتا۔ مگر اس قسم کی بات صرف کمتر غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ کہنے والا یہ بھول گیا کہ گرنا تو ایک حادثہ ہے جو معمول کے خلاف کبھی پیش آتا ہے۔ لیکن اگر زمین کی قوت کشش کم ہوتی تو اس پر معمول کی زندگی ہی درہم برہم ہو جاتی ——— انسان مضبوطی کے ساتھ زمین پر قائم نہ رہ سکتا، ہماری ریلیں پٹریوں پر نہ دوڑ سکتیں، ہمارے مکانات اور کارخانے اکھڑ جاتے، پانی زمین پر نہ ٹھہر سکتا، وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ چیز جس کو بعض لوگوں نے نظام فطرت کا نقص سمجھا ہے وہ نظام فطرت میں اعتدال و توازن کا ثبوت ہے۔ قرآن کے یہ الفاظ ناقابل چیلنج حد تک صحیح ہیں "اللہ نے بنائے سات آسمان

اوپر تلے۔ تم اللہ کے اس بنانے میں کوئی فرق نہ دیکھو گے۔ تم پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لو۔ کیا تم کو کوئی خلل دکھائی دیتا ہے۔ بار بار نگاہ ڈال کر دیکھو۔ تمھاری نگاہ عاجز ہو کر اور تھکی ہوئی تمھاری طرف لوٹ آئے گی (ملک)

کائنات کا اس طرح بے عیب اور خالی از نقص ہونا اس لیے ہے کہ وہ براہ راست خدا کے کنٹرول میں ہے۔ وہ خدا کی صفات کا مادی ظہور ہے۔ مگر انسانی دنیا کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اینٹن چیخوف نے صحیح کہا ہے کہ "یہ دنیا بے حد حسین ہے۔ اس میں صرف ایک ہی چیز ہے جو حسین نہیں، اور وہ انسان ہے" انسان ساری معلوم کائنات میں واحد مخلوق ہے جو اپنے ہم جنسوں کے ساتھ عداوت کرتا ہے (بقرہ ۳۶) وہ زمین پر اصلاح کے بجائے فساد برپا کرتا ہے (اعراف ۵۶) وہ ایسی کارروائیاں کرتا ہے جس کے نتیجہ میں کھیتیاں اور نسلیں برباد ہوں (بقرہ ۲۰۵)۔ دو دنیاؤں میں یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بقیہ کائنات براہ راست اللہ کے حکم کے تحت چل رہی ہے۔ وہ ویسی ہی رہنے کے لئے مجبور ہے جیسی کہ خدا چاہتا ہے کہ وہ رہے۔ مگر انسان کو اللہ طرف سے آزادی ملی ہوئی ہے۔ وہ اپنے ارادہ کے تحت صحیح یا غلط راستہ پر چلنے کا اختیار رکھتا ہے۔ انسانی دنیا میں بگاڑ کی وجہ تمام تر یہی ہے۔ بقیہ دنیا خدا کی مرضی کی پابند ہے، اس لئے وہ مکمل طور پر درست ہے۔ اس کے برعکس انسان اپنی خواہشوں کی پیروی کرتا ہے، اس لئے اس کے سارے معاملات میں فساد اور بگاڑ برپا رہتا ہے۔ ہر برائی جو زمین پر پائی جاتی ہے وہ انسانی آزادی کا غلط استعمال ہے۔ انسان نے فرشتوں کے اس اندیشہ کو ساری تاریخ میں درست ثابت کیا ہے جو انھوں نے اس کی پیدائش کے وقت خدا کے سامنے ظاہر کیا تھا: "کیا تو ایسے لوگوں کو زمین میں اختیار دے رہا ہے جو وہاں فساد کرے اور خون بہائے (بقرہ ۳۰)

یہ آزادی جو انسان کو حاصل ہے، یہ مطلق آزادی نہیں ہے۔ یہ صرف وقتی آزادی ہے اور خاص منصوبہ کے تحت دی گئی ہے۔ یہ دراصل امتحان کی آزادی ہے (ملک ۲) کائنات کا مالک یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ان میں سے کون ہے جو آزادی پاکر بھی آزادی کا غلط استعمال نہیں کرتا۔ تاکہ وہ ایسے لوگوں کو اپنے انعامات سے نوازے۔ اور ان لوگوں کو تباہی کے گڑھے میں ڈال دے جو آزادی پاکر بگڑ گئے (انفال ۳۷) دنیا کا موجودہ نظام صرف اس وقت تک ہے جب تک جانچ کا یہ عمل پورا نہیں ہو جاتا۔ اس مدت کے پورا ہونے کے بعد زمین کا مالک زمین کا انتظام بھی براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لے گا جس طرح وہ بقیہ کائنات کا انتظام اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔ (مریم ۴۰) اس وقت اچھے اور برے ایک دوسرے سے الگ کر دیئے جائیں گے (آل عمران ۱۷۹) اچھے لوگوں کو ابدی طور پر جنتی زندگی حاصل ہوگی اور برے لوگ ابدی طور پر جہنمی حالات میں دھکیل دیئے جائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ موجودہ دنیا وہ مقام ہے جہاں آنے والی خدائی دنیا کے شہری چنے جا رہے ہیں۔ جو لوگ آزاد ہونے کے بعد بھی اپنے آپ کو اللہ کا حکم بردار بنائیں گے، جو مجبور نہ ہوتے ہوئے بھی اللہ کی مرضی کو اپنے اوپر طاری کریں گے، وہی اللہ کے نزدیک اس قابل ٹھیریں گے کہ وہ اللہ کی دنیا کے شہری بن سکیں۔ آج امتحان کے وقفہ میں ہر طرح کے لوگ زمین پر بسے ہوئے ہیں۔ مگر امتحان کی مدت ختم ہونے کے بعد صرف صالح لوگ خدا کی اس ہری بھری دنیا کے وارث

قرار پائیں گے (انبیاء ۱۰۵) اور بقیہ لوگوں کو اس سے بے دخل کر کے دور پھینک دیا جائے گا۔

قرآن اور کائنات

آنے والی جنتی دنیا کا شہری بننے کے لئے کس قسم کی صلاحیتیں درکار ہیں، اس کے جواب کو خدا نے مبہم نہیں رکھا بلکہ اس کو انتہائی واضح طور پر بتا دیا ہے۔ بولنے والی زبان میں یہ جواب قرآن میں موجود ہے اور خاموش زبان میں وہ کائنات میں ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ توحید کو انسانی زندگی میں قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان بھی اسی آفاقی دین کو اپنائے جس کو ہمارے گرد و پیش کی ساری کائنات اپنائے ہوئے ہے۔ "کیا وہ خدا کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں۔ حالاں کہ اسی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے، خوشی سے یا ناخوشی سے۔ اور سب اللہ ہی کی طرف پھیرے جائیں گے" (آل عمران ۸۳) قرآن کے اس بیان کے مطابق کائنات بالفعل اس دین توحید کو اپنائے ہوئے ہے جس کو اپنانے کا مطالبہ انسان سے کیا جا رہا ہے۔ کائنات دین توحید کا عملی نمونہ ہے۔ کائنات میں ہم اس دین کو "دیکھ" سکتے ہیں جس کو ہم خدا کی کتاب میں "پڑھ" رہے ہیں۔ توحید کے دین کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں کائنات کا جو نقشہ بنا ہے اس کے بعض پہلوؤں کو ہم یہاں مختصراً بیان کریں گے۔

کامل سپردگی ـــــ کائنات کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی مکمل اطاعت کر رہی ہے (فصلت ۱۲) زمین، سورج اور تمام ستارے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ وسیع خلا میں گھوم رہے ہیں۔ مگر کھرب ہا کھرب سال کے اندر بھی ان کی گردش میں ایک سکنڈ کا فرق نہیں آتا۔ ہر چیز کا جو وظیفہ مقرر ہے، انتہائی صحت کے ساتھ وہ اس کی ادائگی میں مصروف ہے۔ انسان کو بھی اپنی زندگی میں اسی کامل سپردگی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ اس سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے ذاتی ارادہ کو مکمل طور پر خدا کے تابع کر دے۔ وہ وہی کرے جو اس کا مالک اس سے چاہتا ہے ــــ اس کے ہاتھ اور پاؤں، اس کی آنکھ اور زبان، اس کا دل اور دماغ سب اللہ کے آگے اس طرح جھکے ہوئے ہوں کہ خدا کی مرضی کے خلاف کوئی فعل ان سے سرزد نہ ہو۔

عبادت الٰہی ـــــ قرآن بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز خدا کی عبادت اور تسبیح کر رہی ہے (نور ۴۱) چڑیاں جب درخت کی ہری بھری شاخوں پر بیٹھ کر چہچہاتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے خالق اور رب کی تعریف کے نغمے گا رہی ہیں۔ کھڑا ہوا درخت جب اپنا سایہ زمین پر ڈالتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے سجدہ میں گر گیا ہے۔ رات کی تاریکی کے بعد صبح کو جب سورج اپنی حسین کرنیں زمین پر پھیلاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ زبان حال سے کہہ رہا ہو: "پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں تمام روشنیوں کا مین سوئچ ہے۔ اگر وہ اس مین سوئچ کو بند کر دے تو ساری کائنات میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہے"۔ اسی عبادت کا مطالبہ انسان سے بھی ہے۔ اس کو بھی یہی کرنا ہے کہ اپنے رب کی حمد و تسبیح کرے، اس کی خوبیوں اور کمالات کے احساس سے اس کا دل سرشار رہے، اس کی یاد اس کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ بن جائے، اس کی عبادت گزاری کو وہ اپنی زندگی کا مستقل مشغلہ بنا لے۔

قابل پیشین گوئی کردار ـــــ کائنات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اتنی صحت کے ساتھ حرکت کرتی ہے کہ مستقبل کے واقعات کا پیشگی اندازہ کیا جا سکتا ہے (یونس ۵) وہ مکمل طور پر قابل پیشین گوئی (Predictable) ہے۔ یہی چیز انسان سے بھی اس کی زندگی میں مطلوب ہے۔ انسان کو اتنا پابند اور اتنا ذمہ دار ہونا چاہئے کہ پیشگی طور پر یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ کس موقع پر اس کی طرف سے کس قسم کا ردعمل ظاہر ہوگا۔ کوئی معاملہ کرتے وقت پہلے سے یقین کیا جا سکے کہ کون سا رویہ اس کی طرف سے سامنے آئے گا۔ اس کے قول پر اسی طرح بھروسہ کیا جا سکے جس طرح اپنی گھڑیوں کو درست کرنے کے لئے ہم سورج کی رفتار پر بھروسہ کرتے ہیں۔

توافق ـــــ کائنات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تمام اجزار، حد درجہ توافق Harmony کے ساتھ عمل کرتے ہیں (یٰس ۴۰) سورج اور چاند کبھی ایک دوسرے کے حریف نہیں بنتے۔ ستاروں اور ستاروں میں کبھی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ ہوا اور پانی اور دھوپ اور مٹی سب آپس میں کامل ہم آہنگ ہو کر کام کرتے ہیں۔ تقریباً ایک سو عناصر اور ان سے بنے ہوئے بے شمار مادی مجموعے اس قدر متوافق طور پر اپنے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں کہ ان میں کبھی باہمی آویزش کا مشاہدہ نہیں کیا گیا۔ اب انسان کو بھی یہی کرنا ہے کہ وہ باہمی کش مکش سے مکمل طور پر بچتے ہوئے اپنے اپنے حصہ کا کام انجام دے۔ ہر انسان دوسرے انسان سے ٹکرائے بغیر اپنا فریضۂ حیات پورا کرے۔

نتیجہ پسندی ـــــ کائنات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی سرگرمیاں ہمیشہ ایک مفید انجام کی طرف جاتی ہیں (رعد ۱۷) زمین کی گردش، رات دن کا آنا جانا، بارش کا برسنا اور موسموں کا بدلنا، اور دوسری تمام سرگرمیاں نتیجہ پسند، (Result Oriented) ہیں۔ سب کی سب نتیجہ خیز رخ پر سفر کرتی ہیں۔ فطرت کو آزادانہ طور پر کام کرنے کا موقع دیا جائے تو وہ کبھی کسی غیر مفید انجام پر ختم نہیں ہوتی۔ یہی اصول انسان کو بھی اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔ اس کی سرگرمیوں کو ہمیشہ نتیجہ رخی، بالفاظ دیگر مفید انجام کا حامل ہونا چاہئے۔ ہر ایسی سرگرمی سے اس کو مکمل طور پر دور رہنا چاہئے جو عملاً بے نتیجہ ہو کر رہ جائے یا کوئی ناپسندیدہ نتیجہ برآمد کرنے والی ہو۔

ارتقائی طریقہ ـــــ کائنات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ چھلانگوں میں سفر نہیں کرتی بلکہ ارتقائی انداز میں واقعات کو ظہور میں لاتی ہے (ابراہیم ۲۷) درخت اچانک طلسماتی طور پر زمین کے اوپر کھڑا نہیں ہو جاتا بلکہ طویل مدت کے اندر تدریجی طور پر وجود میں آتا ہے۔ یہی تمام چیزوں کا حال ہے۔ انسان کو بھی اسی طریقہ کی پیروی کرنی ہے۔ اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ تدریجی اور ارتقائی طور پر نتائج حاصل کرنے کا منصوبہ بنائے نہ کہ چھلانگ لگا کر منزل تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

یکسانیت ـــــ کائناتی چیزوں میں ظاہر و باطن کا کوئی فرق نہیں۔ وہ اندر اور باہر یکساں ہیں۔ سورج اپنی ذات میں جیسا ہے، ٹھیک اسی شکل میں وہ دوسروں کے سامنے بھی طلوع ہوتا ہے۔ یہی بات انسان سے قول و عمل کی یکسانی کی صورت میں مطلوب ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ جو اس کے دل میں ہے وہی وہ زبان پر لائے۔ جیسا کچھ وہ عمل میں ہے ویسا ہی لفظوں میں بھی اپنے کو ظاہر کرے۔ اس سے کسی کو منافقت یا دو عملی کا تجربہ ہرگز نہ ہو۔

خدائی اخلاقیات کا ظہور کائنات میں

حقیقت یہ ہے کہ حکمت و معنویت کا جو واقعہ وسیع تر کائنات میں خدا اپنے براہ راست کنٹرول کے تحت ظہور میں لا رہا ہے وہی واقعہ انسان کو اپنی زندگی میں ذاتی کنٹرول کے تحت وجود میں لانا ہے۔ جو واقعہ خدا نے اپنی کائنات میں مادی سطح پر قائم کر رکھا ہے وہی انسان کو اپنی زندگی میں اخلاقی اعتبار سے بروئے کار لانا ہے —— کائناتی سطح پر جو چیز حدید (لوہا) کی شکل میں پائی جاتی ہے، وہ انسانی سطح پر پختہ کرداری کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر جو چیز پتھریلی زمین سے چشمہ کی صورت میں بہہ نکلتی ہے، وہ انسان سے نرم مزاجی کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر جو چیز اٹل قوانین کی صورت میں پائی جاتی ہے، وہ انسانی سطح پر ایفائے عہد کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر جو چیز مہک اور لذت اور رنگ کی صورت میں پائی جاتی ہے وہ انسانی سطح پر خوش معاملگی کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر کھربوں ستاروں کی ایک کہکشاں مسلسل حرکت کرتی ہے۔ مگر اس کے ستاروں میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ حتی کہ ایک کہکشانی جھرمٹ حرکت کرتا دوسرے کہکشانی جھرمٹ میں داخل ہوتا ہے اور نہایت تیز سفر کرتا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔ مگر دونوں جھرمٹوں میں کوئی تصادم نہیں ہوتا۔ یہی واقعہ انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ انسانی مجموعے اپنی اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہوں۔ مگر ان میں کبھی ایک دوسرے سے نزاع اور ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے۔

درخت خراب ہوا (کاربن) کو لے لیتا ہے اور اس کے بدلے اچھی ہوا (آکسیجن) ہماری طرف لوٹا دیتا ہے۔ یہی بات انسانی سطح پر اس اصول کی صورت میں مطلوب ہے کہ "جو تمہارے ساتھ برا سلوک کرے تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔" کائنات میں کوئی چیز کسی کی کاٹ میں لگی ہوئی نہیں ہے۔ ہر ایک پوری یکسوئی کے ساتھ صرف اپنا اپنا حصہ ادا کرنے میں مصروف ہے۔ یہی چیز انسانی سطح پر اس شکل میں مطلوب ہے کہ وہ ہمیشہ مثبت جدوجہد کرے، منفی کارروائیاں کرنے سے مکمل طور پر پرہیز کرے۔ کائنات میں دوبارہ گردش (Recycle) کا اصول کارفرما ہے۔ پتی درخت سے گر کر ضائع نہیں ہوتی بلکہ کھاد بن جاتی ہے۔ فضلات دوبارہ استعمال ہونے کے لئے گیس میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پانی بھاپ بن کر اڑتا ہے اور اس کے بعد پھر سمندر میں واپس آجاتا ہے۔ یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ انسان کا خرچ کیا ہوا پیسہ دوبارہ انسان کے لئے مفید بنے۔ ایک انسان کی چھیڑی ہوئی جدوجہد دوسرے انسانوں کو اچھے ثمرات کا تحفہ دے۔ میدانی علاقوں میں پانی زمین کے نیچے ملتا ہے اس لئے میدانی درخت نیچے گہرائی میں اپنی جڑیں لے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس پہاڑی ڈھلوانوں پر پانی صرف اوپری سطح پر ملتا ہے، اس لئے پہاڑی درخت اپنی جڑیں اوپر اوپر پھیلاتے ہیں۔ یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ وہ اپنی جدوجہد میں حالات سے مطابقت (Adjustment) کا طریقہ اختیار کرے نہ کہ حالات سے لڑنے کا ——

کائنات ذرہ سے لے کر ستاروں تک بے حد تیز سفر میں مصروف ہے۔ وہ ہر آن ایک بہت بڑے کارخانہ کی طرح کام کر رہی ہے۔ مگر اس میں کہیں بھی شور سنائی نہیں دیتا۔ یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ وہ خاموش جدوجہد کا طریقہ اپنائے، شور وغل کی سیاست چلانے سے مکمل پرہیز کرے۔ کائنات میں عظیم الشان سطح پر بے شمار

کام ہو رہے ہیں ۔ ہر جز انتہائی صحت اور پابندی کے ساتھ اپنی ڈیوٹی کی انجام دہی میں لگا ہوا ہے ۔ مگر کسی کو یہاں کوئی ظاہری بدلہ نہیں ملتا ۔ یہی چیز انسان سے بھی مطلوب ہے کہ وہ مکمل طور پر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں لگا رہے ، بغیر اس کے کہ اس دنیا میں اس کو اس کے عمل کا کوئی معاوضہ ملنے والا ہو ۔ اونچا پہاڑ اور تمام کھڑی ہوئی چیزیں اپنا سایہ زمین پر ڈال دیتی ہیں ۔ یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ ہر آدمی تواضع اختیار کرے ، کوئی کسی کے اوپر فخر نہ کرے ۔ کوئی دوسرے کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا نہ سمجھے ——— نماز اسی قسم کی زندگی کی ایک علامتی تصویر ہے جو روزانہ پانچ وقت خدا کے وفادار بندوں پر فرض کی گئی ہے ۔

کائنات میں ہر آن جو سرگرمیاں جاری ہیں وہ خاموش زبان میں پکار رہی ہیں کہ خدا کی دنیا میں کون قیمت والا ہے اور کون بے قیمت ہے ۔ وہ لوگ جن کو صرف ظاہری مفاد متحرک کر سکتا ہو (خواہ وہ روپیہ پیسہ کا مفاد ہو یا عزت و شہرت کا مفاد) وہ اس غیر معاوضہ طلب دنیا میں بالکل بے قیمت ہیں ۔ ۔ کائنات میں ظاہر کی ہوئی خدائی اخلاقیات کے معیار پر وہ پورے نہیں اترتے ۔ خدا کی دنیا میں وہی لوگ قیمت رکھتے ہیں جو خالص صداقت کی خاطر متحرک ہوئے ہوں ۔ جو تسکین ذات سے اوپر اٹھ کر عمل کا ثبوت دینے والے ہوں ۔ جو ہر قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہو کر کام کریں ۔ آئندہ آنے والے جنتی دور میں وہ تمام لوگ خدا کی دنیا سے باہر دھکیل دیئے جائیں گے جنھوں نے قریبی مفاد (عاجلہ) کے لئے سرگرمیاں دکھائی تھیں ۔ اور خدا کی یہ حسین اور خوشیوں سے بھری ہوئی دنیا ہمیشہ کے لئے صرف ان لوگوں کی وراثت میں دے دی جائے گی جو دیر میں آنے والے فائدہ (آخرت) کے لئے سرگرم عمل رہے تھے ۔ جو سامنے کی چیزوں سے اوپر اٹھ کر "غیب" کی طرف اپنی توجہ لگائے ہوئے تھے :

" اور انھوں نے قدر نہ پہچانی اللہ کی جیسی کہ قدر ہے اس کی ۔ حالاں کہ قیامت کے دن ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور تمام آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوں گے ۔ وہ پاک ہے اور بہت اوپر ہے ان کے شرک سے ۔ اور اس روز پھونک ماری جائے گی صور میں ۔ پھر تمام آسمان اور زمین والے بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے ۔ صرف وہی بچے گا جس کو خدا چاہے ۔ پھر دوبارہ پھونکا جائے گا تو اچانک وہ کھڑے ہو جائیں گے اور دیکھنے لگیں گے ۔ اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی اور سب کے اعمال نامے سامنے رکھ دیئے جائیں گے اور پیغمبر اور گواہ حاضر کئے جائیں گے اور ٹھیک ٹھیک سب کا فیصلہ کر دیا جائے گا ۔ کسی کے اوپر کوئی ظلم نہ ہوگا ۔ ہر شخص کو پورا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کیا تھا ۔ اور اللہ کو خوب خبر ہے جو وہ کرتے ہیں ۔ اور انکار کرنے والے گروہ در گروہ جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے ۔ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے تو جہنم کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور اس کے چوکیدار ان سے کہیں گے : کیا تمھارے پاس تم ہی لوگوں میں سے پیغام پہنچانے والے نہ آئے تھے جو تم کو خدا کی باتیں سناتے تھے اور تم کو اس دن کے پیش آنے سے ڈراتے تھے ۔ وہ جواب دیں گے ہاں ۔ مگر عذاب کا وعدہ منکروں کے اوپر پورا ہو کر رہا ۔ پھر ان سے کہا جائے گا کہ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ اور ہمیشہ اس میں پڑے رہو ۔ کیسا برا ٹھکانا ہے تکبر کرنے والوں کا ۔ اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے وہ گروہ در گروہ جنت کی طرف روانہ

کئے جائیں گے۔ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور جنت کے دروازے کھولے جائیں گے تو جنت کے فرشتے کہیں گے، سلامتی ہو تم پر۔ خوش رہو۔ جنت میں ہمیشہ رہنے کے لئے داخل ہو جاؤ۔ اہل جنت کہیں گے۔ شکر ہے اللہ کا جس نے ہم سے اپنے وعدہ کو سچا کر دیا اور ہم کو اس زمین کا وارث بنا دیا کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں مقام کریں۔ کیا خوب بدلہ ہے عمل کرنے والوں کا۔ اور تو دیکھے گا فرشتوں کو کہ گھیر رہے ہوں گے عرش کے گرد پاکی بولتے ہوئے اپنے رب کی خوبیوں کی۔ اور تمام بندوں کے درمیان ٹھیک فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اور یہی بات ہوئی کہ سب خوبی اللہ کے لئے ہے جو مالک ہے سارے جہان کا" (زمر۔ آخر)

کائنات میں انتہائی وسیع پیمانہ پر ہر آن یہ دکھایا جا رہا ہے کہ آئندہ بننے والی معیاری دنیا (جنت) میں بسانے کے لئے خدا کو کس قسم کے شہری درکار ہیں۔ اس کو وہ انسان درکار ہیں جو کائناتی اخلاقیات کے معیار پر پورے اتریں۔ وہ اس دین کو اختیار کریں جو اس نے لفظی طور پر اپنی کتاب میں اور عملی طور پر اپنی کائنات میں ظاہر کیا ہے۔ اس کے باوجود جو لوگ اس سے سبق نہ لیں اور خود اپنے گھڑے ہوئے راستوں پر چلتے رہیں، وہ خدا کی نظر میں بدترین مجرم ہیں۔ خدا کے بتائے ہوئے "دین" کے سوا جو دین بھی وہ اختیار کریں گے وہ آخرت میں بالکل بے قیمت ہوگا۔ کیوں کہ انھوں نے خدا کی نشانیوں کا انکار کیا (کہف ۱۰۵) جو لوگ آنکھ رکھتے ہوئے خدا کی نشانیوں کو نہ دیکھیں اور کان رکھتے ہوئے خدا کی آوازوں کو نہ سنیں، وہ خدا کے نزدیک جانوروں سے بھی زیادہ بدتر ہیں (انفال ۲۲) آئندہ بننے والی دنیا میں ان کا جو انجام ہوگا اس کا اعلان خدا کی کتاب میں ان لفظوں میں کر دیا گیا ہے:

ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا ونحشرہ یوم القیامۃ اعمی۔ قال رب لم حشرتنی اعمی وقد کنت بصیرا۔ قال کذلک اتتک آیتنا فنسیتہا وکذلک الیوم تنسی۔ وکذلک نجزی من اسرف ولم یومن بآیات ربہ ولعذاب الاخرۃ اشد وابقی (طہ ۱۲۴ - ۱۲۷)

اور جس نے منھ پھیرا میری نصیحت سے تو اس کے لئے (آخرت میں) تنگی کا جینا ہوگا۔ اور قیامت کے روز ہم اس کو اندھا کر کے اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا میرے رب! تو نے مجھ کو اندھا کیوں اٹھایا۔ میں تو دنیا میں آنکھوں والا تھا۔ ارشاد ہوگا کہ اسی طرح آئی تھیں تیرے پاس ہماری نشانیاں۔ پس تو نے ان کو بھلا دیا تو اسی طرح آج تم کو بھلا دیا جائے گا۔ اس طرح ہم بدلہ دیں گے ہر اس شخص کو جو حد سے نکل گیا اور یقین نہ لایا اپنے رب کی نشانیوں پر۔ اور یقیناً آخرت کا عذاب بڑا سخت ہے۔

نوٹ: یہ مقالہ سیمینار منعقدہ تغلق آباد نئی دہلی (۸ جنوری ۱۹۷۹) میں پڑھا گیا۔ سیمینار کا عنوان تھا:
خدا کی وحدانیت کے تصورات (Concepts of the Unity of God)

اسلام دین فطرت

عن ابی عبد الرحمٰن عبد اللہ بن عمر بن الخطاب قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: بنی الاسلام علی خمس شھادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً عبدہ ورسولہ، واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ وحج البیت، وصوم رمضان (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کہتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا۔ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور نماز قائم کرنا۔ اور زکوٰۃ ادا کرنا اور بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

بعض روایتوں میں یہ الفاظ ہیں کہ اسلام کی تعمیر پانچ ستونوں (خمس دعائم) پر کی گئی ہے (کتاب الصلوٰۃ محمد بن نصر المروزی) ایک عمارت اپنی تفصیلی صورت میں بہت سے اجزاء کا مجموعہ ہوتی ہے۔ مگر ساری عمارت جس چیز کے اوپر کھڑی ہوتی ہے وہ چند کھمبے (Pillars) ہوتے ہیں۔ اسی طرح اسلام کے لئے بھی یہ پانچ چیزیں کھمبے کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کے مضبوط ہونے سے اسلام مضبوط ہوتا ہے اور ان کے کمزور ہونے سے اسلام کمزور ہو جاتا ہے۔ ہر آدمی کی ہستی ایک زمین کی مانند ہے۔ اگر وہ اپنی اس "زمین" پر خدا کی پسند والی عمارت کھڑی کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے وہ ان پانچ کھمبوں کو پوری مضبوطی کے ساتھ قائم کرے۔ ان کھمبوں کو گاڑے بغیر نہ فردی سطح پر اسلام کا ظہور ہو سکتا ہے اور نہ سماج کی سطح پر۔

اسلام آدمی کے اندر جو زندگی پیدا کرنا چاہتا ہے وہ ایک لفظ میں عبادت یا خدا پرستی کی زندگی ہے۔ تاہم اپنی تفصیلی صورت میں وہ پانچ چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے: ایمان، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ یہ پانچ چیزیں پانچ رسمیات نہیں ہیں بلکہ پانچ اوصاف ہیں۔ یہ ان مطلوب چیزوں کا خلاصہ ہے جو ہمارا مالک ہماری زندگیوں میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر یہ پانچ اوصاف آدمی کے اندر حقیقی طور پر پیدا ہو جائیں تو گویا اس کے اندر وہ بنیادی صلاحیت پیدا ہو گئی جس کے بعد یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اس کی زندگی میں اس ربانی کردار کا ظہور ہو جس کو اسلام ایک ایک شخص کی زندگی میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ایمان کا مطلب خدائی حقیقتوں پر یقین ہے۔ نماز کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اللہ کی بڑائی کے آگے اس طرح جھکے کہ اپنی بڑائی کا احساس اس کے اندر سے ختم ہو جائے۔ روزہ اللہ کے بھروسے پر صبر کرنے کا نام ہے۔ زکوٰۃ یہ ہے کہ آدمی دوسرے کا حق پہچانے تاکہ خدا اس کو اس کے حصہ سے محروم نہ کرے۔ حج سے یہ مراد ہے کہ خدا کے بندے خدا کے گرد متحد ہو جائیں۔ یہ سب اپنی اپنی حقیقت کے اعتبار سے اوصاف ہیں نہ کہ محض خارجی مراسم۔ گویا کہ یقین، بے نفسی، صبر، حق شناسی اور اتحاد وہ پانچ صفاتی کھمبے ہیں جن کے اوپر اسلامی زندگی کا گھر بنتا ہے۔

۱۔ اللہ کو اپنا الٰہ بنانے کا اقرار اس کو اپنا سب کچھ بنانے کا معاہدہ ہے۔ یہ اللہ کو اپنے احساسات اور

جذبات کا مرکز بنانا ہے۔ یہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ کے حوالے کرنا ہے۔ یہ اس بات کا فیصلہ کرنا ہے کہ آدمی اپنی امیدوں اور تمناؤں، اپنے اندیشوں اور التجاؤں کا مرکز اللہ کو بنائے گا۔ وہ کہیں اور جینے کے بجائے اپنے رب میں جئے گا۔ آدمی کی امیدیں اور اس کے احساسات جہاں اٹکے ہوئے ہوں، وہیں وہ آدمی جی رہا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ہر آدمی، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، کہیں نہ کہیں جی رہا ہوتا ہے۔ کوئی اپنے گھر بار اور اپنے بال بچوں میں جیتا ہے۔ کوئی اپنے معاش اور کاروبار میں جیتا ہے۔ کوئی اپنے سیاسی مشاغل اور قیادتی مصروفیات میں جیتا ہے، کوئی اپنی عزت اور اقتدار کے خوابوں میں جیتا ہے۔ غرض ہر آدمی کہیں نہ کہیں جی رہا ہے۔ مگر یہ تمام جینا جاہلیت کا جینا ہے۔ یہ اپنا آشیانہ ایسی شاخوں پر بنانا ہے جن کا حقیقۃً کوئی وجود نہیں۔ حقیقی جینا یہ ہے کہ آدمی اپنے رب میں جینے لگے۔ وہ اس سہارے کو پکڑے جس کے سوا اس کائنات میں کسی کے لئے کوئی سہارا نہیں۔ وہ اللہ کی یاد کو لے کر سوئے اور اللہ کی یاد کے ساتھ صبح کرے۔ وہ اسی کے بھروسہ پر رُکے اور اسی کے بھروسہ پر چلے۔ وہ اسی کے لئے بولے اور اسی کے لئے خاموشی اختیار کرے۔

ایمان کی مثال بجلی کی کرنٹ کی سی ہے۔ پاور ہاؤس سے بجلی کی کرنٹ جب کارخانہ میں پہنچتی ہے تو سارا کارخانہ جگمگا اٹھتا ہے۔ اس کی تمام کلیں حرکت میں آجاتی ہیں۔ اسی طرح جب کسی بندے کا اپنے رب سے ایمانی تعلق قائم ہوتا ہے تو اس کے اندر اچانک ایک نئی روشنی آجاتی ہے، اس کی فطرت جاگ اٹھتی ہے۔ ایمان اس کے قلب کو گرمانے والا اور اس کی روح کو تڑپانے والا بن جاتا ہے۔ وہ اس کے اندر ایک نئی آگ لگا دیتا ہے۔ وہ انسان جو پہلی بار اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا، وہ دوبارہ ایمان کے کوکھ سے ایک نیا جنم لیتا ہے۔ وہ اب خدا سے الگ نہیں رہتا بلکہ خدا میں شامل ہو جاتا ہے۔ ایک شخص کو کسی سے محبت ہو تو جسمانی طور پر وہ اس سے جدا رہتے ہوئے بھی حسیاتی طور پر وہ اس سے مل جاتا ہے۔ وہ ہر چیز میں اسی کا جلوہ دیکھنے لگتا ہے۔ یہی حال اللہ پر ایمان لانے والے کا ہوتا ہے۔ وہ آسمان کی وسعتوں میں خدا کی عظمت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ طوفانوں کی قہر مانی میں اس کو خدا کا جلال دکھائی دیتا ہے۔ چڑیوں کے چہچہے میں اس کو خدا کے نغمے سنائی دیتے ہیں۔ سورج نکلتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ خدا نے اپنا نورانی ہاتھ اس کی طرف بڑھایا ہے۔ وہ درختوں کو دیکھتا ہے تو اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا خدا کی تخلیقی کہانی سرسبز صفحات کی صورت میں زمین کے اوپر پھیلا دی گئی ہے۔ ہوا کا جھونکا جب اس کو چھوتا ہے تو وہ اس کے لئے خدا سے اتصال کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ غرض جو شخص خدا کا مومن بن جائے وہ ہر آن خدا کے اتھاہ سمندر میں غوطہ لگاتا رہتا ہے۔ ہر تجربہ جو اس کے ساتھ گزرتا ہے وہ اس کو خدا سے ملانے والا بن جاتا ہے۔ وہ خدا کا ہو جاتا ہے اور خدا اس کا۔

اللہ پر ایمان ایک ایسے خدا پر ایمان ہے جو ساری کائنات کا خالق، مالک اور پروردگار ہے۔ اسی نے سب کچھ بنایا ہے، اسی کے سہارے ہر چیز قائم ہے، اس کے بغیر کسی چیز کا کوئی وجود نہیں۔ ایمان آدمی کے اندر اس شعور کو زندہ کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس حیثیت سے دیکھنے لگتا ہے کہ وہ ایک خدا کا بندہ ہے، ہر چیز میں

اس کو خدا کا کرشمہ نظر آتا ہے اور ہر عطیہ اس کو خدا کے ہاتھ سے ملی ہوئی چیز دکھائی دیتا ہے۔ خدا کا ذکر اور اس کی حمد ہر آن اس کے اندر سے ابلتی رہتی ہے۔ ایسے آدمی کے لمحات غفلت کے لمحات نہیں ہوتے بلکہ ہوش مندی کے لمحات ہوتے ہیں۔ ہر موقع اس کے لئے خدا کی یاد دلانے والا بن جاتا ہے۔ دن بھر کا تھکا ہوا شام کو وہ اپنے بستر پر لیٹتا ہے اس کو گہری نیند آجاتی ہے۔ صبح کو وہ تازہ دم ہو کر اٹھتا ہے تو بے حساب احسان مندی کے جذبہ کے تحت اس کی زبان سے نکلتا ہے: خدایا تیرا یہ احسان بھی کیسا عجیب ہے۔ اگر آدمی پر نیند نہ آئے تو وہ پاگل ہو جائے اور چند دن کی زندگی بھی اس کے لئے محال ہو جائے۔ رات کی تاریکی کے بعد جب سورج نکلتا ہے اور دنیا کو روشن کر دیتا ہے تو اس کا دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے: کیسی بابرکت ہے وہ ذات جس نے روشنی پیدا کی۔ اگر روشنی نہ ہو تو سارا عالم تاریکی کا مہیب سمندر بن جائے۔ جب اس کو بھوک لگتی ہے، وہ پانی پیتا ہے اور کھانا کھاتا ہے تو اس کی پوری ہستی شکر کی کیفیت سے بھر جاتی ہے۔ وہ حیران ہو کر سوچنے لگتا ہے کہ خدا اگر آدمی کے لئے کھانا اور پانی نہ اتارتا تو آدمی کا کیا حال ہوتا۔ اس کو چوٹ لگتی ہے تو وہ خدا کو مدد کے لئے پکارتا ہے۔ اس کو حاجتیں پیش آتی ہیں تو وہ خدا ہی سے امید کرتا ہے کہ وہ اس کی حاجتوں کو پورا فرمائے گا۔ اس کو نفع ملتا ہے تو اس کو انسان کے اوپر خدا کی نوازشیں یاد آتی ہیں۔ اور اس کا دل شکر کے جذبات سے بھر جاتا ہے۔ اس کو نقصان پہنچتا ہے تو اس کو وہ خدا کی قدرت کا ایک کرشمہ سمجھتا ہے۔ نعمتوں کا ملنا اس کو مغرور نہیں بناتا اور نقصان اس کے اندر بے صبری پیدا نہیں کرتا۔ کوئی عقیدت اس کے لئے خدا کی حریف نہیں بنتی۔ کوئی مصلحت اس کو خدا سے بے پروا نہیں کرتی۔

ایک شخص زمین اور دوسرے اجرام کی قوت کشش کو دریافت کرے یا کائناتی شعاعوں کو اپنے آلات کی مدد سے پالے تو یہ اس کے لئے محض ایک علمی یافت ہوگی۔ یہ پانے والے سے کسی ذمہ داری کا تقاضا نہیں کرے گی۔ مگر خدا کو پانے کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ خدا کو پانا ایک ایسی ہستی کو پانا ہے جو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ جو حکمت اور طاقت کا خزانہ ہے۔ ایسے خدا کو جب ایک شخص پاتا ہے تو ٹھیک اسی وقت وہ اس حقیقت کو بھی پالیتا ہے کہ خدا نے اس کو اور اس کائنات کو عبث نہیں بنایا ہے۔ ایک عظیم الشان کائنات یوں ہی خاموش کھڑی رہے اور اس کی معنویت کبھی ظاہر نہ ہو، یہ ایک ایسی کائنات میں بالکل ناممکن ہے جس کا بنانے اور چلانے والا ایک علیم اور عزیز خدا ہو۔ اس طرح اس کی ایمانی یافت اس کو اس یقین تک پہنچاتی ہے کہ ضرور ہے کہ ایک دن ایسا آئے جب کہ وہ خدا لوگوں کے سامنے ظاہر ہو جائے جو کائنات کے تمام واقعات کے پیچھے کام کر رہا ہے۔ جب آدمی ان حقائق کو دیکھ کر جان لے جن کی بابت آج وہ نظر نہ آنے کی وجہ سے جھگڑ رہا ہے۔ پھر یہی یقین اس کو یہ بھی بتاتا ہے کہ کائنات کے خالق و مالک کا ظہور اس قسم کا غیر متعلق ظہور نہیں ہوگا جیسے تاریک رات کے بعد روشن سورج نکلتا ہے۔ یہ ایک بادشاہ اور محاسب و مجازی طاقت کا ظہور ہوگا۔ خداوند کائنات کا ظہور کائنات کے لئے قیامت کے ہم معنی بن جائے گا۔ خدا کے ظاہر ہوتے ہی اس کے تمام سرکش اور خود پرست بندے خدا کی اس دنیا میں بے قیمت ہو جائیں گے۔ وہ اس دن مکھی مچھر سے بھی زیادہ حقیر نظر آئیں گے۔ دوسری طرف اس کے خدا پرست اور وفادار بندے اچانک سرفرازی کا مقام

حاصل کریں گے۔ خدا کا غیب میں ہونا خدا کے غیر وفادار بندوں کو اچھل کود کے مواقع دئے ہوئے ہے۔ خدا کا ظاہر ہونا خدا کے وفادار بندوں کے لئے سرفرازی کا دن بن جائے گا۔ اس کے بعد، ایک نئی، زیادہ بہتر اور مکمل دنیا شروع ہوگی جہاں سرکش لوگ ابدی طور پر جہنم میں ڈال دیے جائیں گے اور وفادار لوگ ابدی طور پر جنت میں خوشیوں اور لذتوں کی زندگی گزاریں گے۔

جب آدمی اس یقین تک پہنچتا ہے تو وہ خدا کی ہیبت سے کانپ اٹھتا ہے۔ وہ پکار اٹھتا ہے: "خدایا مجھے اس دن رسوا ہونے سے بچا جب تو اپنی طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ جب انصاف کا ترازو قائم کیا جائے گا۔ جب آدمی بالکل بے بس حالت میں تیرے سامنے کھڑا ہوگا۔ جب تیرے سوا کسی کے پاس کوئی اختیار نہ ہوگا۔"

خدا کو الٰہ بنانے ہی کا ایک پہلو رسول کی رسالت کو ماننا ہے۔ جب آدمی خدا کو ایک زندہ اور باشعور ہستی کی حیثیت سے پاتا ہے تو فوراً یہ سوال اس کے سامنے آجاتا ہے کہ میرا خدا مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کو اندرونی فطرت سے اشارے ملتے ہیں۔ کائنات اپنی خاموش زبان میں کچھ پیغامات نشر کرتی ہوئی نظر آتی ہے مگر وہ چاہتا ہے کہ اپنے رب کے پیغام کو یقینی زبان میں پالے، وہ آنے والے دن سے پہلے اس دن کے معاملات سے باخبر ہو جائے۔ عین اس وقت اس کو پیغمبر کی آواز سنائی دیتی ہے: "میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں، اللہ نے مجھ کو انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے۔ میری طرف آؤ اور مجھ سے اپنے رب کے پیغامات معلوم کرو۔" جو انسان حقیقۃً طالب ہو، جو فی الواقع سچائی کی تلاش میں ہو۔ اس کے لئے اس آواز کو پہچاننا مشکل نہیں ہوتا۔ وہ تعصب اور غفلت کے ان تمام پردوں کو پہلے ہی پھاڑ چکا ہوتا ہے جو آدمی کو گھیرے رہتے ہیں اور سچائی کی آواز کو اس کے اندر داخل نہیں ہونے دیتے۔ ایک بچہ جس طرح اپنی ماں کی آواز کو پہچان لیتا ہے، اسی طرح وہ اس پیغام کو پہچان لیتا ہے جو پیغمبر کی معرفت اس کے رب کی طرف سے اس کو پہنچ رہی ہے۔ پیغمبر کی آواز اس کے لئے ایسی ہی ثابت ہوتی ہے جیسے پٹرول کی آگ یا سوکھی زمین میں بارش۔ اس کا پورا اندرونی وجود ربانی روشنی سے بھڑک اٹھتا ہے۔ اس کی تلاش کی سوکھی زمین حق کی بارش کے ایک ایک قطرہ کو جذب کرتی چلی جاتی ہے۔ وہ خدا کو پانے کے ساتھ اس کے پیغمبر کو پالیتا ہے اور پیغمبر کو پانے کے ساتھ اپنے خدا کو۔

رسول کوئی فرشتہ یا کوئی غیر انسانی وجود نہیں۔ وہ بھی ایک انسان ہے اور سارے انسانوں کی طرح ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کی خصوصیت صرف یہ ہے کہ خدا نے اس کو اپنی پیغام رسانی کے لئے چن لیا۔ خدا نے دیکھا کہ وہ ایک ایسا انسان ہے جس کی فطرت پوری طرح زندہ ہے۔ جس کے قول و عمل میں تضاد نہیں۔ جس نے نبوت سے پہلے چالیس سال کی عمر تک کبھی ایک بار بھی امانت کی ادائگی میں کوتاہی نہیں کی۔ وہ سچا ہے، وعدہ پورا کرنے والا ہے، وہ اپنے سینہ میں انسانیت کا درد رکھتا ہے، وہ حق کے لئے اس سے زیادہ بے چین ہوتا ہے جتنا کوئی شخص اپنے ذاتی منافع کے لئے بے چین ہوتا ہے۔ خدا نے محمد بن عبد اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں وہ خالص روح پائی جو حق کی امانت کا امین بن سکے۔ اس نے اس کے اندر وہ غیر مصلحت پرستانہ کردار پایا جو کسی ادنیٰ لچک کے بغیر ربانی ذمہ داری

کو ادا کر سکے۔ اس نے اس عربی انسان میں وہ طلب دیکھی جو اس بات کی ضمانت تھی کہ وہ خدا کی الہامی امانت کی پوری قدر دانی کرے گا اور اس کو اسی طرح لے گا جس طرح اس کو لینا چاہئے۔ ان پہلوؤں میں یہ عربی انسان چالیس برس کی زندگی تک انتہائی مکمل ثابت ہوا۔ اس لئے خدا نے اس کو اپنے آخری اور عالمی پیغمبر کی حیثیت سے چن لیا اور اس انسان کامل نے اپنی نبوت کی ۲۳ سال کی زندگی سے ثابت کر دیا کہ خدا کا یہ انتخاب انتہائی درست تھا۔ اس انسان کامل نے پیغمبری کی ذمہ داری کو اتنی معیاری صورت میں انجام دیا کہ اس سے زیادہ معیاری صورت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

پیغمبر کے ذریعہ ہم کو خدا کی وہ محفوظ کتاب ملی ہے جو اس کے اوپر فرشتہ کے ذریعہ اتاری گئی۔ اس کتاب میں وہ تمام چیزیں لکھی ہوئی صورت میں موجود ہیں جو اللہ کو ہم سے مطلوب ہیں۔ قرآن میں اللہ ہم سے انسانی زبان میں ہم کلام ہوتا ہے۔ پیغمبر نے اور آپ کے ساتھیوں نے ہر قسم کا بہترین اہتمام کر کے اس کو اس کی اصلی شکل میں محفوظ رکھا اور ہم کو پوری طرح پہنچا دیا۔ پیغمبر نہ صرف خدائی الہام کو وصول کرنے والا تھا بلکہ اس نے کامل اور مکمل صورت میں اس کو اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ اس طرح پیغمبر کی زندگی اس ربانی ہدایت کا عملی نمونہ بن گئی جو قرآن میں لفظوں کی صورت میں ظاہر کی گئی تھی۔ پیغمبر نے گھریلو زندگی بنائی۔ وہ بستی اور بازار میں لوگوں کے درمیان رہا۔ اس نے دوستوں اور دشمنوں سے معاملہ کیا۔ اس کو فتح و شکست کے مواقع پیش آئے۔ اس نے دعوت دی اور دعوتی مراحل سے گزرا۔ اس کو بھوک لگی اور اس نے چوٹ کھائی۔ اس نے مفلسی اور دولت مندی کے دن دیکھے۔ غرض ایک عام آدمی سے لے کر ایک جج اور بادشاہ تک انسانی زندگی کے جتنے مختلف تجربات ہیں، سب اس پر گزرے۔ ہر جگہ اس نے ایک ربانی انسان کا رویہ اختیار کیا۔ اس طرح اس کی زندگی قیامت تک تمام انسانوں کے لئے مکمل نمونہ بن گئی۔ ہر وہ آدمی جو اپنے رب کے یہاں اس حال میں پہنچنا چاہتا ہے کہ اس کا رب اس سے راضی ہو اور اس کو ابدی باغوں والے گھر میں داخل کرے، اس کے لئے ایک ہی راہ ہے۔ وہ قرآن سے اللہ کا حکم معلوم کرے اور پیغمبر کی زندگی میں اس حکم کا عملی نمونہ دیکھے اور ان دونوں چیزوں کی روشنی میں اپنی زندگی گزارنے لگے۔ اس کے سوا جتنی صورتیں ہیں سب بھٹکنے کی صورتیں ہیں، نجات کی صورت اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ پیغمبر کی زندگی ایک ایسی مکمل زندگی ہے جس میں چھوٹے لوگوں کے لئے بھی نمونہ ہے اور بڑے لوگوں کے لئے بھی۔

۲۔ اسلام کا دوسرا رکن نماز ہے۔ نماز اپنی متعین شکل کے اعتبار سے یہ ہے کہ روزانہ دن رات کے درمیان پانچ وقت مقررہ انداز میں اللہ کی عبادت کی جائے۔ یہ انداز جو رسول کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سکھایا ہے، اتنا جامع ہے کہ اس سے زیادہ بہتر عبادتی انداز کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ جب وقت آتا ہے تو اذان کے ذریعہ اللہ کی بڑائی کا اعلان کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ نماز کا وقت آگیا۔ اپنی فلاح کے لئے جمع ہو جاؤ۔ لوگ وضو کر کے اپنے پاکی کے احساس کو تازہ کرتے ہیں۔ پھر اللہ کو یاد کرتے ہوئے مسجد پہنچتے ہیں۔ وہاں سب مل کر نماز ادا کرتے ہیں۔ نماز کا ایک امام ہوتا ہے جس کی رہنمائی میں اجتماعی نماز ادا کی جاتی ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے

کہ اسی طرح سارے مسلمان خدا کے رسول کو اپنا مرکز اجتماع قرار دے کر اس کے گرد متحدہ زندگی گزاریں گے۔
رکوع وسجود اور قیام وقعود کی مختلف حالتوں کے ذریعہ خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اقرار کیا جاتا ہے۔ کبھی دست بستہ کھڑے ہو کر، کبھی جھک کر، کبھی نیاز مندانہ بیٹھ کر، کبھی اپنے سر کو زمین پر رکھ کر خدا کے ساتھ اپنے عہد بندگی کو تازہ کرتے ہیں۔ نماز میں قرآن کے حصے پڑھے جاتے ہیں۔ قرآن کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ اس کو جہاں کہیں سے اور جتنا بھی پڑھیے، قرآن کی دعوت کا تعارف مل جاتا ہے۔ قرآن کا ہر صفحہ گویا قرآن کا خلاصہ ہے۔ اس طرح نماز میں اگرچہ بیک وقت قرآن کا مختصر حصہ پڑھا جاتا ہے مگر وہ اللہ کی پسند وناپسند کو جاننے کے لئے ہمیشہ کافی ہوتا ہے۔
اسی کے ساتھ نماز میں خدا کی حمد اور ذکر کے کلمات بولے جاتے ہیں، اس سے دعا کی جاتی ہے، رسول کے لئے اور تمام اہل ایمان کے لئے نیک جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا خاتمہ تمام انسانوں کو سلامتی بھیج کر کیا جاتا ہے۔ اس طرح اپنے مختلف اجزاء کے ذریعہ نماز ایک ایسا عمل بن جاتی ہے جو بیک وقت اللہ کی عبادت بھی ہے اور اللہ کے حکموں کی یاد دہانی بھی۔ وہ اہل ایمان کے لئے دینی غذا بھی ہے اور ان کے درمیان اتحاد واجتماعیت کا ذریعہ بھی۔ وہ اسلامی زندگی کا نشان بھی ہے اور نظم وضبط کی تربیت بھی۔ وہ اللہ سے روحانی اتصال کا مقام بھی ہے اور روزمرہ کی زندگی میں حرکت وعمل کا سبق بھی۔
نماز اپنی شکل کے اعتبار سے مخصوص عبادت کا نام ہے اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے تواضع اور توجہ الی اللہ کا۔ اپنے مقابلہ میں کسی کی عظمت تسلیم کرنے کے لئے آدمی زبان سے جو آخری کلمہ بول سکتا ہے وہ یہ کہ وہ کہے "وہ سب سے بڑا ہے"۔ نماز میں بار بار یہ کلمہ (اللہ اکبر) خدا کے لئے بولا جاتا ہے اور اس طرح اپنے مقابلہ میں خدا کی مطلق کبریائی کا لسانی اقرار کیا جاتا ہے۔ جسمانی طور پر کسی کی بڑائی کے اعتراف کی آخری صورت سجدہ ہے۔ سجدہ سے بڑھ کر کوئی صورت نہیں ہو سکتی جس سے آدمی دوسرے کی عظمت کا جسمانی اعتراف کرے۔ نماز میں بار بار خدا کے آگے سجدہ کرکے خدا کی بے مثال عظمتوں کا عملی اعتراف کیا جاتا ہے۔ کسی کو اپنی زندگی کا مرکز ومحور بنانے کی سب سے زیادہ کامیاب ہیئت جو تصور کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے چہرے کا رخ پوری طرح اس کی طرف کر دے۔ نماز میں بیت اللہ کی طرف رخ کا اہتمام کرکے ظاہر کیا جاتا ہے کہ بندے نے اپنی زندگی کو خدا کی طرف موڑ دیا، اس نے اپنی زندگی کو اندر سے لے کر باہر تک خدا رخی (God-Oriented) بنانے کا فیصلہ کر لیا۔
اللہ کے آگے بندے کے اس جھکاؤ سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ صرف خدا کے سامنے جھکاؤ تک نہیں رہتی، وہ اس کی مستقل کیفیت بن جاتی ہے۔ جو آدمی اللہ سے ڈرنے لگے۔ جو اللہ کے آگے جھک جائے۔ جو اللہ کے مقابلہ میں اپنے کو بے حقیقت بنائے وہ بندوں کے سامنے آئے گا تو ناممکن ہے کہ یہاں اس کے رویہ میں اس کے عبادتی اثرات ظاہر نہ ہوں۔ وہ انسان کے آگے سجدہ میں نہیں گرے گا مگر وہ انسان کے مقابلہ میں گھمنڈ بھی نہیں دکھائے گا۔ وہ انسان کو "تو بڑا ہے" نہیں کہے گا مگر اپنی بڑائی کا سکہ اس پر قائم کرنے کی کوشش بھی نہیں کرے گا۔ نماز میں اس کا ساجد بننا بندوں کے مقابلہ میں تواضع کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ نماز میں اس کا خدا کی تابعداری کا اقرار کرنا

بندوں کے معاملات میں حقوق کی ادائگی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ نماز میں اس کی رخ بندی بندوں کے معاملات میں اصولی پابندی کی صورت میں ظاہر ہوگی۔ وہ انسان جو خدا کے سامنے کامل بندگی کا اقرار کرکے مسجد سے نکلا تھا، وہ بندوں کے درمیان کامل اخلاق کا نمونہ بنا ہوا دکھائی دے گا۔ نماز کسی بندہ کے معاملات کو خدا کے ساتھ عجز کی بنیاد پر قائم کرتی ہے اور بندوں کے ساتھ اس کے معاملات کو تواضع کی بنیاد پر۔

روزانہ پانچ وقت کی نمازوں کے علاوہ نماز کی اور بھی کئی صورتیں ہیں۔ رات کو تہجد کی نماز، کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے کے وقت کی نماز، حاجت اور استخارہ کی نماز، اسی طرح جمعہ اور عیدین کی جماعت، جنازہ کی نماز جماعت، وغیرہ۔ یہ نمازیں اسی کیفیت کو مزید اضافہ کے ساتھ حاصل کرنے کی کوششیں ہیں جو پنج وقتہ نمازوں سے ہر روز مطلوب ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز اگر پوری طرح کسی کو مل جائے تو وہ اس کی پوری زندگی میں شامل ہو جاتی ہے۔ وہ ایک نیا کام شروع کرے تو دو رکعت نماز پڑھ کر خدا سے مدد کی درخواست کرتا ہے، وہ کسی مقام پر پہلی بار جائے تو وہاں وہ نماز پڑھ کر اپنے رب کی یاد کرتا ہے۔ کوئی مسئلہ اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو تو نماز پڑھ کر اپنے دل کی گرہ کو کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی حال بندوں سے تعلقات کے معاملہ میں بھی ہوتا ہے۔ بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا نماز اس کے ساتھ ایک خدائی نگراں کی طرح لگی ہوئی ہے۔ دنیا کی پھیلی ہوئی زندگی میں اپنا حصہ ادا کرتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ساری زمین خدا کی مسجد ہے اور ہر جگہ اس کو اپنی عبادت گزاری کے تقاضے پورے کرنے ہیں

۳۔ اسلام کا تیسرا رکن روزہ ہے۔ روزہ میں آدمی صبح کو فجر سے لے کر شام کو سورج ڈوبنے تک نہ کوئی کھانے کی چیز کھاتا اور نہ پینے کی چیز پیتا۔ اس طرح اپنی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت کو چھوڑ کر وہ صبر ارکنے اور برداشت کرنے کی تربیت حاصل کرتا ہے۔ کھانا پینا چھوڑنے کی وجہ سے اس کو دن میں بھوک لگتی ہے۔ پیاس ستاتی ہے، اس کا جسم کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کے معمولات درہم برہم ہو جاتے ہیں۔ اس کی پوری زندگی کا نظام تلپٹ ہو جاتا ہے۔ مگر وہ ان تمام چیزوں کو برداشت کرتا ہے۔ وہ ناخوش گواریوں کو جھیلتا ہے۔ وہ اپنی جسمانی تکلیفوں پر قابو رکھتے ہوئے اپنے ہوش و حواس کو برقرار رکھتا ہے۔ وہ مشکلات کے باوجود اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں لگا رہتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پانی ہوتا ہے مگر پیاس کے باوجود وہ اس کو نہیں پیتا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کھانا ہوتا ہے مگر بھوک کے باوجود وہ اس کو نہیں کھاتا، اس طرح وہ اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کرتا ہے کہ وہ ایک پابند اور ذمہ دار زندگی گزارے۔ وہ وہی کرے جو اس کو کرنا چاہئے۔ اور وہ نہ کرے جو اس کو نہیں کرنا چاہئے۔ خواہ کسی بھی قسم کی شکل پیش آئے، ہر حال میں اصل مقصد حیات کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھے۔

خدا نے دنیا کی زندگی میں بے حساب نعمتیں انسان کو دے رکھی ہیں۔ مگر یہ نعمتیں خود بخود ملتی رہتی ہیں اس لئے آدمی کو ان کا احساس نہیں ہوتا۔ آدمی کو ایک بے حساب قسم کا پیچیدہ جسمانی نظام دیا گیا ہے۔ ایک رگ میں

فرق آجائے تو سارے جسم کا توازن بگڑ جائے۔ دنیا میں دھوپ، ہوا، پانی اور لاتعداد دوسری چیزیں حیرت انگیز طور پر اس کے لئے کارآمد بنا دی گئی ہیں۔ اگر ایک چیز بھی ان میں سے نہ رہے تو زندگی عذاب بن جائے۔ یہ تمام چیزیں بغیر کسی اکتسابی کوشش کے آدمی کو ملتی رہتی ہیں اس لئے آدمی ان کی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتا۔ روزہ میں انسان کو اس کی انتہائی بنیادی ضرورت سے عارضی طور پر کچھ دیر کے لئے روکا جاتا ہے۔ اور اس طرح اس کے اندر خدائی نعمتوں کا شعور جگایا جاتا ہے۔ دن بھر کی بھوک، پیاس، تھکن اور بے آرامی کے بعد شام کو جب آدمی کھانا کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے تو اس کو اپنی محتاجی اور خدا کی بے پناہ بخششوں کا احساس ہوتا ہے، وہ اللہ کے شکر کے جذبہ سے بھر جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ جس خدا نے ایسی نعمتیں دی ہیں، اس کے لئے اگر میں اپنی پوری زندگی بھی قربان کر دوں تو حق ادا نہیں ہو سکتا۔

دنیا میں مومن کو جو زندگی گزارنی ہے وہ سرتاپا صبر کی زندگی ہے۔ اس کو اللہ کی جائز کی ہوئی چیزوں تک اپنے کو محدود رکھنا ہے، اس کی ناجائز کی ہوئی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگانا ہے۔ حق پرستانہ زندگی کی راہ میں آنے والی مشکلات کو برداشت کرنا ہے۔ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی تکلیفوں کا جواب دینے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا ہے بلکہ ان کو سہتے ہوئے اپنے فریضۂ حیات کو پورا کرنے میں لگے رہنا ہے۔ اس کو دنیا کے نقصانات کی پروا نہ کرتے ہوئے آخرت کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھنا ہے۔ ایسے تمام مواقع پر جب کہ اس کے نفس کو چوٹ لگے، جب اس کے اندر کوئی ناپسندیدہ بات پیش آنے کی وجہ سے اشتعال پیدا ہو، تو اس کو منفی ردعمل سے اپنے آپ کو بچانا ہے اور ہر حال میں اپنے آپ کو مثبت مقاصد کے لئے وقف رکھنا ہے۔ یہ تمام چیزیں بے پناہ صبر و برداشت چاہتی ہیں۔ صبر کے بغیر کوئی شخص اسلام کے راستہ کا مسافر نہیں بن سکتا۔ روزہ ہر سال اسی صبر کا سبق دیتا ہے۔ وہ ایک مہینہ تک صابرانہ زندگی کی مشق کرا کر آدمی کو تیار کرتا ہے کہ وہ سال کے بقیہ مہینوں کو صبر کے ساتھ گزار سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن کی پوری زندگی ایک قسم کی روزہ دار زندگی ہے۔ اس کو تمام عمر برائی سے، منفی تدبیروں سے، بے صبری کے اقدامات سے، دوسروں کو ستانے سے، اللہ کے حرام کو حلال کرنے سے روزہ رکھ لینا ہے۔ سال کے ایک مہینہ میں ضروریات زندگی پر پابندی لگا کر اسی قسم کی "روزہ دار" زندگی کی مشق کرائی جاتی ہے۔ روزہ اپنی شکل کے اعتبار سے مقررہ اوقات کے لئے کھانا پانی چھوڑنا ہے اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے صابرانہ زندگی کی تربیت۔

۴۔ اسلام کا چوتھا رکن زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ اپنی کمائی اور اپنی دولت سے ہر سال ایک مقررہ رقم (عام طور پر ڈھائی فی صد) اللہ کے نام پر نکالی جائے۔ اور اس کو دین کی ضرورتوں اور حاجت مندوں کے اوپر خرچ کیا جائے۔ یہ زکوٰۃ ایک قسم کی سالانہ یاد دہانی ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ خدا کا ہے، اس کو چاہئے کہ اپنی کسی چیز کو خدا سے بچا کر نہ رکھے۔ دنیا میں آدمی جو کچھ حاصل کرتا ہے، اس کا اپنا حصہ اس میں بہت تھوڑا ہوتا ہے زمین و آسمان کے اندر جو بے شمار اعلیٰ ترین انتظامات ہیں اگر وہ ساتھ نہ دیں تو آدمی نہ کوئی دانہ اگا سکے، نہ مویشیوں کی پرورش کر سکے۔ نہ صنعتیں قائم ہو سکیں، نہ اور کوئی کام کرنا ممکن ہو۔ انسان کے اپنے وجود سے

لے کر باہر کے عالم تک جو خدائی انتظامات ہیں، ان میں سے کوئی ایک چیز بھی اگر خدا واپس لے لے تو آدمی کی ساری کوششیں اور منصوبے اکارت چلے جائیں اور کوئی نتیجہ پیدا نہ کریں۔

زکوٰۃ اسی حقیقت واقعہ کا مالی اعتراف ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ آدمی اپنے مال کو خدا کا مال سمجھے۔ اپنی کمائی میں خدا کا حق تسلیم کرے۔ اس معاملہ میں زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے۔ تاہم کم سے کم کی حد مقرر کر دی گئی ہے۔ قانونی زکوٰۃ کی صورت میں آدمی ہر سال کم سے کم خدا کا حق نکالتا ہے اور اس کو جمع کرکے خدا کی مقرر کی ہوئی مدوں میں خرچ کیا جاتا ہے۔ اس نکالنے میں آدمی کو نہ تو یہ اجازت ہے کہ وہ اس کو دوسروں کے اوپر احسان سمجھے اور نہ اس کو ایسا کرنا چاہئے کہ پانے والوں کو ذلیل کرے۔ اس کو اس جذبہ کے تحت دینا چاہئے کہ یہ خدا کی طرف سے آیا ہوا دوسروں کا حصہ ہے اور وہ اس کو حق داروں کی طرف لوٹا رہا ہے۔ وہ اس لئے دوسروں کو کھلائے تاکہ خدا آخرت کے دن اس کو کھلائے، وہ اس لئے دے تاکہ خدا آخرت کے دن اس کو محروم نہ کرے۔

زکوٰۃ ان ذمہ داریوں کی ایک علامت ہے جو ایک آدمی کو دوسرے انسانوں کے درمیان ادا کرنا ہے۔ وہ ذمہ داری یہ ہے کہ ہر آدمی دوسرے آدمی کا حق پہچانے، ہر آدمی دوسرے آدمی کے لئے دردمند ہو۔ یہ جذبات یہاں تک ترقی کریں کہ آدمی خود اپنی چیزوں تک میں دوسرے کا حصہ سمجھنے لگے۔ دوسرے سے کوئی معاوضہ نہ ملتے ہوئے بھی وہ اس کے کام آئے۔ دوسرے سے نفع کی امید نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس کی عزت کا نگہبان ہو۔ دوسرے سے رشتہ اور دوستی کا تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس کا خیر خواہ ہو۔ زکوٰۃ ایک طرف آدمی کو یہ سبق دیتی ہے کہ اس کی ہر چیز خدا کا عطیہ ہے۔ دوسری طرف اس کو یہ احساس دلاتی ہے کہ تم اگر خدا کے بندے ہو تو تم کو معاشرہ کے اندر بے درد اور خود غرض بن کر نہیں رہنا چاہئے۔ بلکہ تمھاری زندگی میں دوسروں کا بھی حصہ ہونا چاہئے۔

سماجی تنظیم کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی دوسرے کے کام صرف اس وقت آئے جب کہ اس کو دوسرے سے نفع کی امید ہو۔ وہ کسی کو قرض دے تو اس اعتماد پر دے کہ وہ سود کے ساتھ اس کی طرف اضافہ شدہ حالت میں لوٹے گا۔ ایسے معاشرہ میں استحصال کا مزاج فروغ پاتا ہے۔ ہر آدمی دوسرے آدمی کو دبانا اور لوٹنا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورا سماج بدنظمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے سماج میں کسی کو بھی سکون حاصل نہیں رہتا۔ خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔ سماجی تنظیم کی دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی خدا سے بدلہ پانے کی امید پر دوسرے انسان کے کام آئے۔ وہ اس خدائی یقین دہانی کی بنیاد پر دوسرے کو دے کہ خدا اس کو آخرت میں بہت زیادہ بڑھا کر لوٹائے گا۔ ایسے معاشرہ میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور بے تعلقی کے جذبات فروغ نہیں پاتے۔ لوگ ایک دوسرے کو استحصال کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ سماج میں باہمی ناراضی اور انتشار کی فضا پیدا نہیں ہوتی۔ ہر ایک دوسرے کی طرف سے امن میں رہتا ہے اور پورا سماج سکون اور خوش حالی کا سماج بن جاتا ہے۔ زکوٰۃ قانونی اعتبار سے ایک قسم کا سالانہ "ٹیکس" ہے اور حقیقت کے اعتبار سے اپنی ملکیت میں خدا اور بندے کے حق کا اعتراف۔

۵۔ اسلام کا پانچواں رکن حج ہے۔ سال میں ایک بار ساری دنیا کے مسلمان مرکز اسلام میں جمع ہوتے ہیں

اور وہاں مخصوص اجتماعی عبادات انجام دیتے ہیں۔ حج کی عبادات کیا ہیں — یہ دراصل ان اسلامی تعلیمات کو علامتی طور پر دہراتا ہے جو اسلام میں معنوی طور پر مطلوب ہیں۔ یہ اسلام کے احکام کو مخصوص صورتوں میں متشکل کر کے اللہ سے یہ عملی عہد کرنا ہے کہ آدمی انھیں بنیادوں پر اپنی زندگی کو قائم کرے گا۔ اسلام کی دوسری عبادات میں بھی اگرچہ یہ پہلو موجود ہے۔ تاہم حج میں زیادہ بڑے پیمانہ پر اور مجموعی شکل میں یہ تمام چیزیں اکٹھا کر دی گئی ہیں۔

اسلام چاہتا ہے کہ انسانوں کے درمیان ہر قسم کے مصنوعی امتیازات ختم ہو جائیں اور تمام انسان ایک خدا کے بندے بن کر دنیا میں زندگی گزاریں، احرام باندھنا اسی کی ایک عملی صورت ہے جس میں مختلف قوموں اور مختلف ملکوں کے لوگ یکساں طور پر ایک ہی سادہ لباس پہنے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اسلام چاہتا ہے کہ آدمی کی زندگی خدا کے گرد گھومنے لگے، کعبہ کے گرد طواف کرنا اسی کا ایک علامتی مظاہرہ ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ خدا کے بندے خدا کی راہ میں دوڑ دھوپ کرنے والے بنیں، صفا و مروہ کے درمیان دوڑ (سعی) اسی کی ایک مشق ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ جب خدا کی پکار بلند ہو تو اس کے بندے اس کی پکار پر دوڑ پڑیں، حج کے دوران بار بار لبیک اللھم لبیک (حاضر ہوں خدایا میں حاضر ہوں) کہنا اسی کا ایک عملی اقرار ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ آدمی اس دن کو یاد کرے جب کہ سارے انسان خدا کے یہاں جمع کئے جائیں گے، عرفات کے وسیع کھلے ہوئے میدان میں تمام حاجیوں کا قیام اسی کی ایک ظاہری یاددہانی ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ آدمی شیطان سے بیزار ہو اور ہمیشہ اس کو اپنے سے دور بھگاتا رہے، رمی جمار کے موقع پر شیطان کی پتھر کی علامتوں پر کنکریاں مارنا اسی کا ایک عملی سبق ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان ہر حال میں خدا کے عہد پر قائم رہے خواہ ایسا کرنا اس کے لئے جان و مال کی قربانی کی قیمت پر کیوں نہ ہو، منیٰ میں جانور کو قربان کرنا اسی کی ایک خارجی علامت ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں لوگ ایک دوسرے کی طرف سے پیش آنے والی ناگواریوں کو برداشت کریں، حج کے زمانہ میں اس کی خصوصی تربیت ہوتی ہے۔ مختلف قسم کے لاکھوں لوگ بیک وقت ایک مقام پر جمع ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بار بار ایسے مواقع آتے ہیں جب کہ ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچے۔ حج کے دنوں میں خصوصی طور پر لازم کر دیا گیا کہ غصہ، بد کلامی، مارپیٹ، کسی جان کو تکلیف پہنچانا، بے حیائی اور بد دیانتی کے کام سے مکمل پرہیز کیا جائے۔ اللہ سے بہتر سلوک پانے کے شوق میں بندوں کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے۔

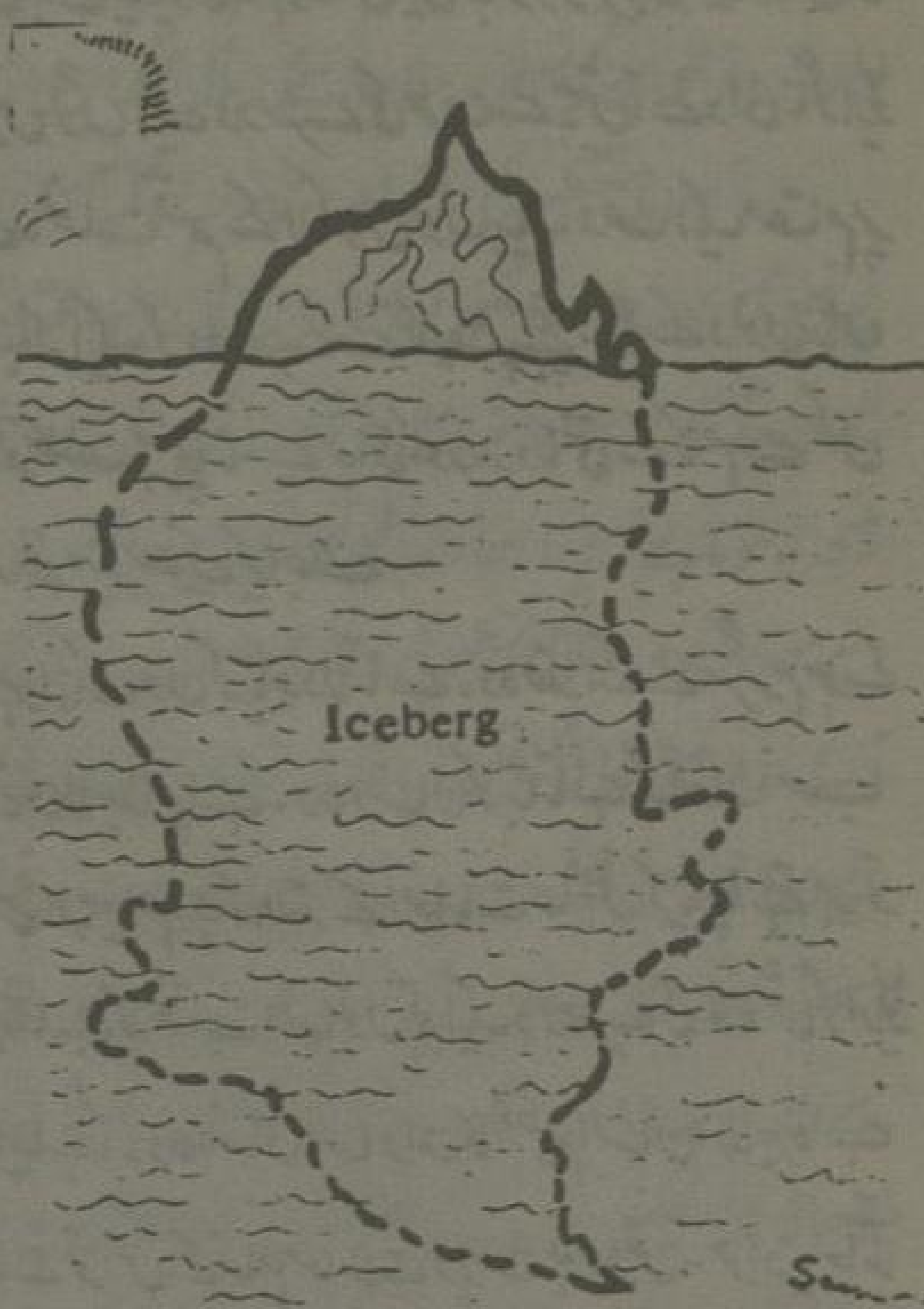
حج خدارخی زندگی گزارنے کا سبق ہے۔ وہ آخرت کے ہولناک دن کو یاد دلاتا ہے۔ وہ خدا کے لئے سرگرم ہونے کا ریہرسل ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ آدمی کو خدا کے راستہ میں جدوجہد کرنے والا بننا چاہیے۔ وہ انسان کو بتاتا ہے کہ تمھارا سب سے بڑا دشمن شیطان ہے اس کو کبھی اپنے قریب آنے کا موقع نہ دو۔ اس کا پیغام ہے کہ اللہ کے انعامات حاصل کرنا چاہتے ہو تو اللہ کے لئے اپنے جان و مال کو قربان کرو۔ وہ عملی حالات پیدا کر کے بتاتا ہے کہ مختلف انسانوں کو ایک دوسرے کی ناخوش گواریوں کو برداشت کرتے ہوئے انصاف اور خیر خواہی کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہیے۔ وہ انسانی مساوات کا عظیم الشان مظاہرہ ہے غرض حج ایک ایسی مکمل عبادت ہے کہ آدمی اگر اس کو صحیح طور پر انجام دے تو اس کے تمام معاملات درست ہو جائیں۔ خواہ یہ معاملات خدا سے متعلق ہوں یا انسانوں سے متعلق۔

آخرت کی دنیا

قطب جنوبی کے سمندروں میں برف کے بہت بڑے بڑے تودے ہوتے ہیں جن کو آئس برگ (Iceberg) کہا جاتا ہے۔ یہ برفانی پہاڑ سطح سمندر پر تیرتے رہتے ہیں۔ ان کے حجم کا دس میں تقریباً نو حصہ پانی کے اندر ڈوبا رہتا ہے اور صرف ایک حصہ پانی کے اوپر دکھائی دیتا ہے۔ ایسی ہی کچھ مثال ہماری زندگی کی ہے۔ خدا نے انسان کو ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ پھر اس کی عمر کا لگ بھگ۔ سو سال موجودہ دنیا میں رکھ کر بقیہ تمام عمر کو موت کے بعد آنے والی دوسری دنیا میں ڈال دیا۔ ہم ماں کے پیٹ میں پرورش پا کر اس دنیا میں آنکھ کھولتے ہیں۔ اور پھر بچپن، جوانی اور بڑھاپا کے مرحلوں سے گزر کر مر جاتے ہیں۔ تاہم موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں۔ موت ہم کو دوبارہ ایک نئے پیٹ، کائنات کے پیٹ میں ڈال دیتی ہے۔ اس کے بعد انسان ایک اور عالم میں آنکھ کھولتا ہے۔ یہ آخرت کا عالم ہے۔ موجودہ دنیا عارضی ہے، آخرت کی دنیا ابدی ہے۔ موجودہ دنیا کی تکلیفیں بھی معمولی ہیں اور لذتیں بھی معمولی — مگر اگلی دنیا میں دونوں چیزیں اپنی آخری انتہا پر ہوں گی۔ وہاں جس کے حصہ میں تکلیف آئے گی، وہ بدترین عذاب میں ہمیشہ کے لئے تڑپتا رہے گا۔ جس کے حصے میں راحتیں آئیں گی، وہ کمال درجہ کی راحتوں میں ابدی طور پر خوشیوں اور لذتوں کا لطف اٹھاتا رہے گا۔

امتحان کی مصلحت کی بنا پر آخرت کی دنیا کو ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا گیا ہے۔ مگر ہمارے گرد و پیش

آدمی اگر یہ جان لے کہ موت کے دوسری طرف بھی ایک دنیا ہے جو زیادہ مکمل ہے تو موجودہ زندگی اس کے لئے بے حد بامعنی ہو جائے گی۔ وہ اپنی جد و جہد کی منزل کو پالے گا۔ اس کی زندگی —— آخرت رخی زندگی (Akhirat Oriented Life) ہو جائے گی جو بالآخر ایک شاندار کامیابی پر ختم ہو گی۔ اس کے برعکس جو شخص موت کے بعد آنے والی دنیا کو نہ دیکھ رہا ہو اس کی زندگی دنیا رخی زندگی ہو گی۔ اس کی کوششیں اسی دنیا میں بھٹکتی رہیں گی۔ مرنے کے بعد جب وہ اگلی وسیع تر دنیا میں داخل ہوگا تو اچانک اس کو معلوم ہوگا کہ یہاں کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (بقرہ ۲۰۰)



ایسی نشانیاں ہیں جن کے ذریعہ سے ہم آخرت کی دنیا کو سمجھ سکتے ہیں۔

ایک کمرہ ہے۔ اس میں کچھ آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ دیوار، فرنیچر، آدمی وغیرہ کی صورت میں جو چیزیں کمرہ کے اندر نظر آرہی ہیں، بظاہر وہی کمرہ کی کل دنیا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور دنیا وہاں موجود نہیں۔ لیکن جب کمرہ میں رکھا ہوا ٹیلی وژن سٹ کھولا جاتا ہے تو اچانک معلوم ہوتا ہے کہ ہماری اس دنیا کے اندر ایک اور دنیا اپنے تمام اجزار کے ساتھ موجود تھی۔ اس میں حرکت تھی، آوازیں تھیں۔ اس میں انسان جیسی ہستیاں تھیں۔ اس میں واقعات ہو رہے تھے۔ یہ سب مکمل طور پر موجود تھا مگر وہ دیکھنے والوں کے لئے غیر موجود بنا ہوا تھا۔ جب ٹیلی وژن کھولا گیا تو معلوم ہوا کہ ہماری محسوس دنیا کے اندر ایک اور مکمل دنیا موجود تھی۔ اگرچہ اس سے پہلے وہ ہم کو دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

یہ ایک معلوم مثال ہے جس سے آخرت کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ہماری دنیا ایک دہرا وجود کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں ہماری محسوس دنیا کے اندر ایک اور دنیا چھپی ہوئی ہے۔ یہ آخرت کی دنیا ہے۔ ہم اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ نظر آنے والی دنیا میں گزارتے ہیں۔ اس کے بعد موجودہ دنیا میں ہماری آنکھ بند ہو جاتی ہے اور ہم کو ایک اور دنیا میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ وہ آئندہ آنے والی دنیا میں کامیابی حاصل کرے۔ کیوں کہ وہ دنیا ابدی بھی ہے اور حقیقی بھی۔ اُس دنیا کی تکلیفوں اور راحتوں کے مقابلہ میں موجودہ دنیا کی تکلیفوں اور راحتوں کی کوئی حقیقت نہیں۔

موجودہ دنیا میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان آزاد ہے کہ جو چاہے کرے۔ مگر یہ آزادی صرف اس لئے ہے کہ انسان حالت امتحان میں ہے۔ یہاں آدمی کو جانچ کر دیکھا جا رہا ہے کہ کون اچھا ہے، کون برا۔ اس جانچ کے لئے آزادانہ فضا ضروری تھی۔ ضروری تھا کہ آدمی کو اس بات کا کھلا موقع دیا جائے کہ وہ جس طرح چاہے رہے اور جس قسم کی چاہے زندگی گزارے۔ موجودہ ابتدائی دنیا اسی خاص ضرورت کے تحت خاص ڈھنگ سے بنائی گئی ہے۔ وہ تمام حالات یہاں جمع کئے گئے ہیں جو کسی آدمی کو عمل کا موقع دینے اور اس کے بعد اس پر حجت قائم کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ اس طرح لوگوں کو کسوٹی پر رکھ کر دیکھا جا رہا ہے کہ کون اگلی دنیا میں عزت کی جگہ دئے جانے کے قابل ہے اور کون اپنے ظلم اور نالائقی کی بنا پر اس کا مستحق ہے کہ اس کو ذلت کے گڑھے میں ڈال دیا جائے۔ موجودہ دنیا میں دونوں قسم کے آدمی ملے جلے ہیں۔ آخرت کی دنیا میں دونوں کو ان کے آج کے ریکارڈ کے مطابق چھانٹ دیا جائے گا۔ ایک طرف تکلیفوں اور مصیبتوں کا جہنم ہوگا اور برے لوگوں کو اس میں پُر عذاب زندگی گزارنے کے لئے ڈال دیا جائے گا۔ دوسری طرف ہر قسم کی راحتوں اور خوشیوں کی جنت ہوگی اور نیک لوگوں کو اس کا دائمی وارث بنا دیا جائے گا کہ وہ اس میں اپنا ٹھکانا بنائیں اور خوشیوں بھری زندگی گزاریں۔

اب آخرت کے مسئلہ کو ایک اور پہلو سے دیکھئے۔

ایک مرتبہ میں ایک بڑے سرکاری افسر سے ملا۔ شام کا وقت تھا۔ ہم لوگ ان کے شان دار بنگلہ کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ "مولانا صاحب" اچانک انھوں نے کہا "ہم لوگوں کی زندگی بھی کیسی بری زندگی ہے۔ اب دیکھئے۔ کل صبح کو سورج نکلنے سے پہلے مجھے ہوائی اڈہ پر جانا ہے۔ فلاں ملک کی اعلیٰ سیاسی شخصیت کا ہوائی جہاز ہماری زمین پر اترے گا۔ مجھ کو نہ صرف اپنی نیند کو چھوڑ کر ہوائی اڈہ پر پہنچنا ہے بلکہ دل میں نفرت کے باوجود مسکرا کر ان کا استقبال بھی کرنا ہے۔"

یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑے لوگوں کی زندگیاں کس طرح دورخی ہوتی ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک پہلو کار اور کوٹھی اور عزت اور اقتدار ہے۔ مگر اس کا ایک اور پہلو ہے جو اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ چیزیں انھیں کن باتوں کے نتیجہ میں ملتی ہیں۔ اگر آپ کسی بڑے آدمی کے اندر جھانک کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس چمک دمک کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو سطحیت پر راضی کیا ہے، خوشامد، موقع پرستی، مصلحت پسندی، زمانہ سازی، بے ضمیری، ظاہرداری، دوعملی، یہی وہ چیزیں ہیں جن کی قیمت ان کو ایک شان دار زندگی کی صورت میں ملتی ہے۔ ہر بڑے آدمی کی زندگی کے دو رخ ہیں۔ ایک شان دار، دوسرا تاریک اور بے روح۔ وہ اپنے "انسانی وجود" کو قتل کرنے پر راضی ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ "حیوانی وجود" کی سطح پر اس کو جاہ وحشم کی ایک زندگی حاصل ہو سکے۔

عام انسان کی زندگی کے بھی اسی طرح دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک مزدور مئی جون کی گرمی میں کھلی دھوپ میں کام کر رہا ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک پسینہ میں شرابور ہے۔ مگر اپنا کام کئے جا رہا ہے۔ وہ کیوں اپنے آپ کو مشقت کی آگ میں جلاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ اس "دھوپ" کا ایک "سایہ" بھی ہے۔ اس کی مزدوری کا ایک پہلو گرمی اور لو میں جھلسنا ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ شام کو چند روپے حاصل کرے گا جس سے اس کے بیوی بچوں کی ضرورتیں پوری ہوں گی اور وہ رات کو اطمینان کی نیند سوئے گا۔

کسی عمل کے دورخ ہونے کا یہ وہ پہلو ہے جو صرف دنیوی اعتبار سے پایا جاتا ہے۔ اسی طرح دنیا اور آخرت کے اعتبار سے بھی عمل کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ہر عمل جو آدمی اس دنیا میں کرتا ہے، اس کا ایک رخ وہ ہے جو دنیا میں نظر آتا ہے۔ دوسرا وہ ہے جو آخرت میں مترتب ہو رہا ہے۔ آج ہم اپنے عمل کے دنیوی پہلو کو بھگتتے ہیں۔ کل ہم اپنے عمل کے اخروی پہلو کو پائیں گے۔ آج ہم زندگی کے ایک سمت میں کھڑے ہیں۔ اس لئے ہم کو اعمال کا ایک ہی رخ دکھائی دیتا ہے۔ قیامت ہم کو ایک ایسے مقام پر کھڑا کر دے گی جہاں دونوں رخ ہمارے سامنے آجائیں گے۔ جس طرح دیوار کے اوپر کھڑا ہوا آدمی دیوار کے دونوں طرف دیکھتا ہے اسی طرح قیامت کے عالم میں پہنچ کر آدمی حقیقت کے دونوں رخ کو دیکھنے لگے گا۔ ایک طرف پچھلی زندگی کی پوری تاریخ بچپن سے موت تک لمبی فلم کی طرح اس کے سامنے کھلی ہوئی ہوگی۔ دوسری طرف اس کی اس بنائی ہوئی تاریخ کے اخروی نتائج بالکل برہنہ ہو کر آنکھوں کے سامنے کھڑے ہوں گے:

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ (انفطار) — اس دن آدمی جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور جو اس نے پیچھے چھوڑا۔

دنیا کا کام دنیا میں رہ جائے گا اور آخرت کی زندگی کے لئے وہی چیز کار آمد بنے گی جو آخرت کے لئے کی گئی تھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں ایک مقدمہ پیش ہوا۔ ایک شخص نے ناجائز طور پر دوسرے کی زمین پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر اس کی "قانونی خانہ پری" اتنی مکمل تھی کہ ظاہری طور پر اس کے خلاف فیصلہ دینا بھی مشکل تھا۔ آپ نے فرمایا "تمھاری ہوشیاری کی بنا پر اگر عدالت نے تمھاری موافقت میں فیصلہ دے دیا تو سمجھو کہ اس نے تم کو آگ کا ایک ٹکڑا دیا"۔ گویا اس آدمی کے عمل کا نتیجہ دنیوی اعتبار سے تو زمین کا ایک محبوب ٹکڑا تھا۔ مگر آخرت کے اعتبار سے وہ بھڑکتی ہوئی آگ کا ایک شعلہ تھا۔ وہ اپنے عمل سے پیچھے کی دنیا میں زمین چھوڑ رہا تھا اور آگے آخرت کی دنیا میں آگ بھیج رہا تھا۔

اسی طرح نیک اعمال کا معاملہ بھی ہے۔ امام احمد نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قول غصہ کے بارے میں نقل کیا ہے:

ماتجرع عبد جرعة من لبن او عسل خیر من جرعة غیظ	کسی بندہ نے غصہ کے گھونٹ سے بہتر دودھ یا شہد کا گھونٹ نہیں پیا۔

غصہ کو پی جانا دنیا کے اعتبار سے انتہائی کڑوا گھونٹ ہے۔ مگر اس عمل کا جو اخروی مثنیٰ ہے، وہ دودھ اور شہد سے بھی زیادہ میٹھا اور لذیذ ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ گرمی کی شدت جہنم کی سانس کی وجہ سے ہوتی ہے (ان شدة الحر من فیح جهنم) اسی طرح حدیث معراج میں ہے کہ آپ سدرة المنتہیٰ پر پہنچے تو وہاں آپ نے چار نہریں دیکھیں۔ دو نہریں اندر بہتی تھیں اور دو باہر۔ جبریل نے بتایا کہ اندر اندر بہنے والی نہریں تو بہشت کے دریا ہیں اور اوپر اوپر بہنے والے نیل اور فرات۔ گویا موجودہ دنیا اور آخرت کی دنیا ایک ہی واقعہ کے دو پہلو ہیں۔ دنیوی پہلو حقیر اور عارضی ہے۔ اخروی پہلو بہتر اور مستقل۔ آج ہم دنیوی پہلو سے دوچار ہیں۔ موت کے بعد ہم اخروی پہلو سے دوچار ہوں گے۔

انسانی عمل کے اس دوگونہ پہلو کو حدیث معراج میں مختلف تمثیلات کے ذریعہ بتایا گیا ہے۔

بستی میں ایک شخص ہے۔ اس نے اپنی محنت اور جد وجہد سے اپنے لئے ہر قسم کی عزت اور خوش حالی جمع کر لی ہے۔ وہ جب کسی مجلس میں داخل ہوتا ہے تو اچانک ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مجلس کا سردار آگیا ہے۔ اسی بستی میں دوسرا شخص ہے۔ وہ بالکل ناکام ہے، اپنی عمر کا بڑا حصہ گزار لینے کے باوجود وہ اپنی مفلوک الحالی کو ختم نہ کر سکا۔ اگر وہ مجلس میں آجائے تو کوئی اس کو اہمیت نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی آدمی مجلس میں آیا ہی نہیں۔

دونوں بظاہر ایک ہی قسم کے انسان ہیں۔ دونوں یکساں قسم کے ہاتھ پاؤں کے ساتھ آتے ہیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی اپنی عزت یا اپنی مفلسی کا اشتہارہ لے کر نہیں آتا۔ اس کے باوجود دونوں میں اتنا زیادہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ آدمی کا وہ دہرا وجود ہے جس کو "حیثیت" کہا جاتا ہے۔ ہر آدمی اپنے دکھائی دینے والے وجود کے ساتھ اپنی نہ دکھائی دینے والی حیثیت کو بھی لئے ہوئے ہوتا ہے۔ ظاہری جسم آدمی کو پیدائشی طور پر ملتا ہے اور غیر محسوس حیثیت کو آدمی اپنی کوششوں سے بناتا ہے۔ اسی طرح آدمی کا ایک دنیوی وجود ہے اور ایک اخروی وجود۔ دنیوی وجود پیسے اور اقتدار سے بنتا ہے اور اخروی وجود خدا ترسی اور نیک عمل سے۔ آج کی دنیا میں آدمی اپنے دنیوی وجود کے ساتھ جی رہا ہے اور آخرت میں وہ اپنے اخروی وجود کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

کسی درخت پر کوئی پتھر اٹکا ہوا ہے، آپ اس کے نیچے سے گزرے، یکایک پتھر آپ کے اوپر گرا اور آپ کا سر ٹوٹ گیا، کیا آپ اس درخت پر خفا ہوں گے اور اس سے لڑائی کریں گے۔ نہیں، بلکہ خاموشی سے اپنا سر پکڑے ہوئے گھر چلے جائیں گے یا اسپتال جا کر اپنا علاج کرائیں گے۔ اس کے برعکس اگر کوئی آدمی جان بوجھ کر آپ کے اوپر ایک پتھر کھینچ مارے اور آپ کا چہرہ زخمی ہو جائے تو آپ اس کے اوپر برس پڑتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کا بھی سر توڑ ڈالیں جس طرح اس نے آپ کا سر توڑا ہے اور اگر خود اس کا سر توڑ نہیں سکتے تو معاملہ کو عدالت میں لے جاتے ہیں اور وہاں اس کو قانون کے مطابق سزا دی جاتی ہے۔

اسی طرح ایک اور مثال لیجئے۔ آم کا ایک بڑا درخت ہے جس پر فصل کے موقع پر ہزاروں کی تعداد میں پھل آتے ہیں۔ یہ پھل پکتے ہیں اور ایک ایک کرکے گر جاتے ہیں یا توڑ لئے جاتے ہیں۔ خود آم اپنے ایک پھل کو بھی نہیں کھاتا۔ مگر کوئی شخص کبھی یہ کہتا ہوا نہیں سنا گیا کہ "افسوس کہ آم نے اتنے پھل پیدا کئے مگر وہ خود اپنے پھل کو نہ کھا سکا۔" اس کے برعکس ایک آدمی زندگی بھر کی کمائی سے اپنے لئے ایک شاندار مکان بنائے اور مکان کی تعمیر مکمل ہوتے ہی مر جائے تو ہر دیکھنے والا شخص کہے گا کہ کیسا افسوسناک ہے یہ واقعہ کہ آدمی نے محنت کرکے ایک گھر بنایا اور اس کے اندر رہنا اس کو نصیب نہ ہوا۔

معلوم ہوا کہ درخت اور انسان میں بہت بڑا فرق ہے۔ درخت کوئی "برائی" کرتا ہے تو اس کو اس برائی کی سزا نہیں دی جاتی۔ اسی طرح درخت کوئی "نیکی" کرتا ہے تو یہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اس کو اس کی نیکی کا انعام دیا جائے، جب کہ انسان کے لئے ہم دونوں چیزیں چاہتے ہیں۔ ہمارا ذہن پکارتا ہے کہ انسان کوئی برا عمل کرے تو اس کو ضرور اس کی سزا دی جائے اور انسان کوئی اچھا عمل کرے تو ضرور اس کو اس کا انعام ملے۔

سارے انسانوں کی فطرت یہی مانگ رہی ہے اور تمام علوم متفقہ طور پر اس کی اہمیت کی تصدیق کرتے ہیں۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ یہی چیز اس دنیا میں حاصل کرنا ممکن نہیں۔ ہٹلر نے ایک ایسی جنگ چھیڑی جس میں پانچ کروڑ آدمی ہلاک ہو گئے۔ کیا کوئی بھی حکومت ہٹلر کو اس کے اس جرم کی سزا دے سکتی ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ ہٹلر کو گولی مار کر ختم کر دیں حالانکہ یہ جرم اتنا بڑا ہے کہ ہٹلر اگر ۵ کروڑ بار زندہ ہو اور ۵ کروڑ بار گولی مار کر ہلاک کیا جائے تب بھی اس کی سزا مکمل نہیں ہوگی۔ پھر یہ معاملہ ہٹلر اور اسٹالن جیسے ظالموں کا ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک معمولی آدمی بھی جب کوئی جرم کرتا ہے تو اس کے جرم کے اثرات اتنے وسیع ہوتے ہیں کہ نہ کوئی دنیوی عدالت اس کے سارے پہلوؤں کی تحقیق کر سکتی اور نہ کوئی جیل خانہ اس کو اس کے جرم کی پوری پوری سزا دے سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص جو اس دنیا میں کوئی جرم کرتا ہے، وہ اپنے جرم کی حقیقی سزا پائے بغیر مر جاتا ہے۔ حالانکہ ساری انسانیت پکار رہی ہے کہ اس کو اس کے جرم کی پوری پوری سزا دی جائے۔

یہی معاملہ انعام کا بھی ہے۔ ایک شخص کو اقتدار ملے مگر اقتدار پا کر وہ فرعون نہ بنے بلکہ عام

انسانوں کی طرح اپنے کو ایک انسان سمجھے اور اقتدار کو لوگوں کی حقیقی خدمت میں لگائے، کیا اس دنیا میں اس کو اس عمل کا بدلہ دیا جا سکتا ہے۔ ایک شخص اپنی محنت سے دولت کمائے اور اس دولت کو غریبوں اور محتاجوں کی ضرورتیں پوری کرنے میں صرف کر دے کیا اس کو اس عمل کا انعام دینا ممکن ہے۔ ایک شخص علم میں کمال پیدا کرتا ہے اور اس علم کو انسانیت کی تعمیر میں لگا دیتا ہے، کیا اس کو اس خدمت کا معاوضہ دیا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک شخص کے ایک چھوٹے سے نیک عمل کا انعام دینا بھی اس دنیا کے محدود حالات میں ممکن نہیں۔ جس طرح ایک بُرا عمل بے شمار طریقوں سے انسان کے لئے مصیبت بنتا ہے۔ اسی طرح ایک نیک عمل بے شمار طریقوں سے انسانیت کے لئے خیر و فلاح کا باعث ہوتا ہے۔ کون ہے جو اس کے اعداد و شمار جمع کر سکے اور اس کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دے۔

اسی کے ساتھ ایک بات اور بھی ہے۔ اس دنیا میں آدمی بیماری، بڑھاپا، موت اور اس طرح کے دوسرے ناموافق قوانین سے بندھا ہوا ہے۔ بالفرض کسی کے حسن عمل کا اندازہ کر کے اس کے لئے اس کے کارناموں کے مطابق ایک "جنت" بنا دی جائے، جب بھی وہ اس سے حقیقی طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ بے شمار انسانوں کا تجربہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں بالفرض کسی کو مسرت مل جائے، جب بھی وہ چند لمحات سے زیادہ اس کا لطف نہیں اٹھا سکتا۔ ہر انسان اپنے لئے ایک جنت چاہتا ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں جنت نہیں بن سکتی۔ جنت بنانے کے لئے کوئی اور دنیا درکار ہے جو محدودیتوں اور نقائص سے پاک ہو۔

یہ صورت حال پکار رہی ہے کہ موجودہ دنیا نامکمل ہے اور اس دنیا کی تکمیل کے لئے ایک اور دنیا وجود میں آنی چاہئے۔

جب ہم کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ بے پناہ حد تک وسیع معلوم ہوتی ہے۔ اس کے امکانات لامحدود ہیں۔ یہ زمین، جس پر انسان اپنی زندگی بناتا ہے، وہ عظیم کائنات کے اتھاہ امکانات کا ایک بے حد حقیر حصہ ہے۔ ہماری زمین، کائنات کا اس سے بھی زیادہ چھوٹا حصہ ہے جتنا سارے سمندروں کے کنارے پائی جانے والی ریت کے مقابلہ میں ایک ذرہ۔

کائنات نے اپنے اتھاہ امکانات میں سے صرف ایک حقیر جزو ہی کو زمین پر کیوں ظاہر کیا۔ آخرت کا عقیدہ اسی سوال کا جواب ہے۔ انسان کے لئے یہاں جو امکانات ہیں، ان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ موجودہ دنیا میں ہم کو مل رہا ہے اور اس کا آخری اور کامل حصہ آخرت کی دنیا میں دیا جائیگا۔ آخرت کا نظریہ ان تمام بہترین آرزوؤں اور تمناؤں کو بامعنی بناتا ہے جن کو ایک آدمی اپنے سینہ میں لئے ہوئے ہوتا ہے۔ مگر ساری کوشش کے باوجود ان کو واقعہ بنانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اگر وہ ہر قسم کے ناموافق حالات کا مقابلہ کرتا ہوا بالفرض اپنے لئے ایک پسندیدہ زندگی بنائے تب بھی بڑھاپا اور موت اس کی ہر کامیابی کو بہت جلد بے معنی بنا دیتے ہیں۔ آخرت کا عقیدہ بتاتا ہے کہ اس کے خوابوں کی دنیا کہاں ہے اور اس کی مطلوبہ "جنت" کس سمت میں ہے جدھر اس کو دوڑ دھوپ کرنی چاہئے۔ آخرت آدمی کی منزل کو بھی بتاتی ہے اور اس کی جدوجہد کے صحیح رخ کو بھی۔

ہدایت کا انتظام

خدا نے انسان کی ہدایت کے لئے غیر معمولی انتظامات کیے ہیں۔ پیغمبر کے ذریعہ اپنی کتاب اتاری ہے۔ کائنات میں بے حساب پیمانہ پر اپنی نشانیاں پھیلا دی ہیں۔ اسی کے ساتھ خدا کے فرشتے ہر قدم پر کھڑے ہوئے خاموش زبان میں اس کو بتاتے رہتے ہیں کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔

ایک بزرگ کو ان کے پڑوسی نے تکلیف پہنچائی۔ وہ اس سے سخت ناراض ہو گئے "اب میں نہ اس سے بات کروں گا اور نہ اس سے تعلقات رکھوں گا" انھوں نے اپنے دل میں سوچا۔ اس کے اگلے دن اتفاق سے ان کے لڑکے سے بھی ان کو ایک تکلیف پہنچی۔ وہ اس سے سخت ناراض ہوئے اور غصہ میں گھر سے باہر نکل آئے۔ رات تک ان کا غصہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ وہ سو گئے۔ اگلی صبح کو سو کر اٹھے تو انھیں محسوس ہوا کہ ان کے دل میں اپنے بچے کے لئے دوبارہ وہی محبت ہے جو پہلے تھی۔ انھوں نے اپنے لڑکے کو بلایا اور لطف و محبت کے ساتھ اس سے بات کر کے کل کے غصہ کی تلافی کی۔

"اگر میں اپنے لڑکے کا قصور معاف کر سکتا ہوں تو کیا اسی طرح میں اپنے پڑوسی کا قصور معاف نہیں کر سکتا" ان کے دل میں خیال آیا۔ اور اچانک انھیں محسوس ہوا کہ لڑکے کی غلطی کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انھیں سبق دیا ہے۔ "اولاد جن مصلحتوں کے تحت دی جاتی ہے ان میں سے ایک مصلحت شاید یہ بھی ہے کہ انسان کو بتایا جائے کہ وہ کس طرح ایسا کر سکتا ہے کہ ایک قصوروار کا قصور معاف کر دے۔ اگر آدمی کو اولاد نہ دی جاتی تو اس اخلاقِ محبت کا عملی سبق کسی اور طرح اس کو نہیں دیا جا سکتا تھا"۔ اس کے بعد انھوں نے اللہ سے معافی مانگی اور اپنے پڑوسی سے مل کر اس کو خوش کیا۔

اگر آدمی کے سینہ میں ضمیر زندہ ہو اور وہ خدا کے سامنے پیش ہونے سے ڈرتا ہو تو اسی طرح ہر دن وہ اپنے گردوپیش خدا کی آواز سنتا ہے۔ وہ ہر موڑ پر دیکھ سکتا ہے کہ خدا کے فرشتے کھڑے ہوئے بتا رہے ہیں کہ اس کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ یہ آواز صرف ان لوگوں کو سنائی نہیں دیتی جن کے کان خدا کی آواز سننے کے لئے بہرے ہو چکے ہیں۔ وہ خدا کی آواز صرف اس وقت سنیں گے جب اسرافیل کی چنگھاڑ ان کے کان کے پردے پھاڑ دے۔

ایک بزرگ ایک شخص کے یہاں مہمان ہوئے۔ اس آدمی کے گھر سے ملی ہوئی مسجد تھی جس میں نمازی بہت کم آتے تھے۔ بزرگ نے اپنے سکون کی خاطر مسجد میں قیام کو پسند کیا۔ مسجد میں داخل ہونے کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ عرصہ سے اس کی صفائی نہیں ہوئی ہے۔ یہ برسات کا زمانہ تھا۔ اس لئے ٹپکنے سے اور بوچھار سے مسجد کی صفیں جگہ جگہ سے بھیگ گئی تھیں اور ان میں بو بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اگلے دن سورج نکلا تو بزرگ نے ساری صفیں نکال کر باہر دھوپ میں پھیلا دیں۔ مسجد میں خوب صفائی کی۔ اس کے بعد صفوں کو سکھا کر اور جھاڑ کر اپنی جگہ دوبارہ بچھا دیا۔

بزرگ جب پہلی بار مسجد میں داخل ہوئے تھے تو اس کی حالت دیکھ کر انھیں سخت انقباض ہوا تھا۔ اب جو وہ

اس کی صاف ستھری فضا میں بیٹھے تو ان کے دل کو ایک خاص طرح کی خوشی محسوس ہوئی۔ انھوں نے دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے انھیں اس خدمت کی توفیق عطا فرمائی۔

عین اس وقت ان کے میزبان آ گئے۔ "اس شخص سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ مسجد کی صفائی کرے"، اس کو دیکھتے ہی ان کے اندر یہ احساس ابھرا "یہ دین کے اوپر لمبی لمبی تقریریں کرتا ہے۔ مگر عمل کا یہ حال ہے کہ اپنے پڑوس کے خانہ خدا کو درست نہیں کر سکتا"۔ اس احساس نے بہت جلد ان کے لاشعور میں یہ جذبہ ڈال دیا کہ میں دین میں اس سے زیادہ ہوں۔ میری دین داری کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں"۔

دن گزر گیا۔ شام کو وہ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک اجنبی شخص اندر داخل ہوا۔ اس کا دبلا پتلا چہرہ اور اس کے پھٹے کپڑے بتا رہے تھے کہ وہ کوئی غریب مسافر ہے۔ بزرگ نے اس کے سلام کے جواب میں وعلیکم السلام تو کہا مگر دل میں سوچا "یہ شخص بھی کتنا بے وقت آیا ہے، اب اس کے لئے رات کے کھانے کا انتظام کرنا ہوگا۔ رات بھی شاید وہ اسی مسجد میں گزارے اور میری تنہائی میں خلل ڈالے"۔ ابھی وہ اسی انقباض میں تھے کہ ان کے میزبان مسجد میں داخل ہوئے۔ مسافر کو دیکھ کر انھوں نے فوراً آگے بڑھ کر اس کو سلام کیا، اور مسکراتے ہوئے پوچھا "کہاں سے آنا ہوا"۔ پھر اس کے حالات معلوم ہونے کے بعد خود ہی بولے "آج آپ یہیں قیام کریں اور ہمارے ساتھ کھانا کھائیں"۔ میزبان نے یہ ساری باتیں اس طرح کیں گویا یہ نووارد ایک غریب مسافر نہیں، ایک نعمت ہے جو خدا نے اس وقت خصوصی طور پر ان کے لئے بھیج دی ہے۔

اس واقعہ کے بعد بزرگ نے محسوس کیا کہ ان کے دل میں نئی ہلچل پیدا ہو رہی ہے "مسجد کی صفائی کے معاملہ میں میں نے اپنے میزبان پر سبقت کی تھی۔ مگر مسافر کی خدمت کے معاملہ میں وہ مجھ سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے" انھوں نے اپنے دل میں کہا "اگر میرے اندر ایک خصوصیت ہے تو میزبان کے اندر دوسری خصوصیت ہے، اور کیا معلوم مسجد کی صفائی کے مقابلے میں غریب مسافر کی خدمت اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہو"۔ اس خیال کا آنا تھا کہ انھوں نے توبہ کی اور سجدہ میں گر کر اللہ سے دعا کی کہ وہ ان کو اور ان کے میزبان کو ہدایت دے اور اپنی رحمتوں میں حصہ دار بنائے۔

ہماری دنیا فتنوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں ہر وقت اندیشہ ہے کہ آدمی کسی گڑھے میں جا گرے۔ مگر اوپر کے واقعات بتاتے ہیں کہ اللہ نے یہاں بچاؤ اور اصلاح کے بھی بے شمار مواقع رکھ دیئے ہیں۔ اگر آدمی کے اندر ایمانی جذبہ زندہ ہو تو ہر فتنہ کے وقت اس کو اپنے قریب ہی ایک روشنی مل جائے گی جس سے فائدہ اٹھا کر وہ دوبارہ اپنے نجات کے راستہ کو پا سکتا ہے۔ مگر جب ایمان کی چنگاری بجھ جائے تو وہ بچاؤ کے الٰہی انتظام سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا پاتا۔ وہ برابر پھسلن پر گرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس آخری گڑھے میں پہنچ جاتا ہے جس سے پھر آدمی کو نکلنا نہیں ہے:

جو خدا سے ڈرنے والے ہیں جب ان پر شیطان کا گزر ہوتا ہے، وہ چونک جاتے ہیں۔ پھر انھیں سوجھ آجاتی ہے اور جو شیطان کے بھائی ہیں، وہ ان کو کھینچے چلے جاتے ہیں پھر وہ کسی طرح نہیں تھمتے۔ (اعراف ۲۰۲)

انسان کی تلاش

انسان ایک ایسی دنیا چاہتا ہے جہاں وہ اپنے خوابوں کی تعبیر پا سکے، جو عیب اور محدودیت سے خالی ہو۔ مگر موجودہ دنیا میں اس کو یہ چیز حاصل نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر سی وی۔ رمن ہندستان کے مشہور ترین سائنس داں ہیں۔ انھوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں ایم اے پاس کیا۔ ان کو سائنس کا نوبل انعام ملا۔ ان کی ایک سائنسی تحقیق (۱۹۲۸) نے رمن ایفیکٹ کے نام سے عالمی شہرت حاصل کی۔ بنگلور میں ان کے نام پر رمن انسٹی ٹیوٹ قائم ہے۔ ان کو اپنے سائنسی مطالعہ میں اتنا انہماک رہتا تھا کہ وہ ملاقاتیوں کی آمد کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے ایک آنے والے کے پرچۂ ملاقات کو دیکھ کر کہا: "یہ ملنے کے لئے آنے والے اس ابتدائی آداب کو بھی نہیں جانتے کہ مجھے تنہا رہنے دیں"۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی تو اکثر وہ "ایس" یا "نو" کہہ کر ریسیور رکھ دیتے۔ ان کے یہاں کثرت سے خطوط آتے تھے جن کو بس ایک نظر دیکھنے کے بعد وہ پھاڑ کر پھینک دیتے تھے۔ سیاست دانوں کی بابت ایک بار انھوں نے کہا: "انڈیا میں کامیاب ہونے کے لئے آج کل جو چیز درکار ہے وہ صرف یہ کہ آپ کے سر پر ایک گاندھی ٹوپی ہو اور اس کے نیچے کچھ نہ ہو"۔ ڈاکٹر رمن کی خود اعتمادی اتنی بڑھی کہ انھوں نے مذہب کا بھی انکار کر دیا۔ انھوں نے ایک بار ایک اخباری نمائندہ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا: "نہ کوئی جنت ہے اور نہ کوئی دوزخ۔ اور نہ موت کے بعد آدمی کا کوئی وجود ہے"

مگر آخر عمر میں ڈاکٹر رمن سخت مایوسی کا شکار ہو گئے۔ نومبر ۱۹۷۰ میں اپنے انتقال سے کچھ پہلے انھوں نے کہا تھا "میری زندگی مکمل طور پر ایک ناکام زندگی رہی":

My life has been an utter failure (T.O.I. 21-1-1979)

ڈاکٹر رمن کو اتنا بڑا مقام حاصل ہونے کے باوجود یہ احساس کیوں ہوا کہ وہ مکمل طور پر ناکام ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے خوابوں کی دنیا کو نہ پا سکے۔ ان کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ ملک میں سچی سائنس (True Science) قائم کریں۔ مگر جن ملکی سائنس دانوں سے انھوں نے کام لینا چاہا، ان کے متعلق ان کا تجربہ یہ رہا کہ وہ مغرب کی تقلید اور اس کی خیمہ برداری کے سوا اور کوئی مزاج نہیں رکھتے۔ وہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس (بنگلور) کے ڈائرکٹر تھے۔ انھوں نے چاہا کہ نازی حکومت کے نکالے ہوئے جرمن سائنس دانوں کو بلائیں۔ مگر حکومت نے اپنے سیاسی مصالح کے تحت اس کی اجازت نہ دی۔ پھر انھوں نے طے کیا کہ خود اپنا جمع کیا ہوا تمام سرمایہ لگا کر ذاتی طور پر ایک سائنسی ادارہ قائم کریں۔ مگر یہاں بھی ایک رکاوٹ حائل ہو گئی۔ ان کی رقم ایک پرائیویٹ بنک میں تھی جو دیوالیہ ہو گیا اور ان کی ساری رقم ڈوب گئی۔ وہ شخص جو اعلیٰ حوصلوں اور اونچی تمناؤں کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوا تھا وہ ایک انتہائی مایوس انسان کی حیثیت سے اس دنیا سے رخصت ہوا۔

یہ ایک "کامیاب مرد" کا قصہ تھا۔ اب ایک "کامیاب عورت" کا حال دیکھئے۔

"ہماری دنیا مکمل کیوں نہیں"

آدمی اس سوال کا جواب نہیں پا سکتا

جب تک وہ آخرت کی دنیا کو نہ جان لے

۱۶ سالہ نندنی اپنے وجے نگر کے مکان میں آئینہ کے سامنے کھڑی تھی۔ اسے نظر آیا کہ اس کی نازک گردن پر ایک گومڑا ابھر رہا ہے۔ "زندگی زیادہ مکمل اور بے عیب کیوں نہیں"

Why life could not have been more perfect.

اس نے اپنے دل میں کہا۔ وہ ایک کامیاب رقاصہ تھی اور اپنی دو ہم پیشہ بہنوں (پدما اور جے شری) کے ساتھ ابھی ابھی کشمیر کے ایک رنگا رنگ سفر سے یہ حوصلہ لے کر واپس آئی تھی کہ وہ اپنے پیشہ میں اور زیادہ توجہ دے کر اعلیٰ ترین رقاصہ بنے گی۔ اپنی بہنوں کے ساتھ اس نے ملک کے مختلف شہروں میں رقص کے ۱۵۰ مظاہرے کئے تھے۔ تینوں بہنیں "وجے نگر سسٹرس" کے نام سے مشہور ہو گئی تھیں۔ تاہم کل کی تقریب میں شرکت سے اس نے معذوری ظاہر کر دی۔ بدنما گردن کے ساتھ وہ آرٹ کی محفل میں کیسے شریک ہو سکتی تھی۔

مگر خلاف امید اس کا گومڑ بڑھتا گیا۔ گھر والوں کو پریشانی ہوئی۔ ڈاکٹروں اور اسپتالوں کی دوڑ شروع ہو گئی۔ بالآخر صرف یہ جاننے کے لئے کہ ان کی نندنی کینسر کے ناقابل علاج مرض میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اسپتال میں داخلہ کے نویں دن اس کی موت کا پیغام آ گیا۔ بستر پر ایک بے حس وحرکت جسم پڑا ہوا تھا اور دوست اور رشتہ دار چاروں طرف اس کو گھیرے ہوئے یہ سوچ رہے تھے "وہ ہنستی ہوئی روح آخر کہاں چلی گئی"

یہ جولائی ۱۹۶۹ کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد نندنی کی بقیہ دو بہنوں نے "نرتیہ نندنی" کے نام سے ایک ڈانس اسکول کھولا۔ زندہ رہنے کے لئے کوئی مشغولیت ضروری تھی۔ دونوں باصلاحیت بہنوں کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا۔ ان کو موقع ملا کہ وہ یورپ کے شہروں لندن، جنیوا، فرینکفرٹ، برلن، ایمسٹرڈم، پیرس وغیرہ میں اپنے کمال فن کی داد دے سکیں۔ ان کو اپنے پیشہ میں اتنی کامیابی ہوئی کہ ایک اخبار نے لکھا:

The gods of India can smile when the bells on the Vijayanagar sisters tinkle.

ہندوستان کے دیوتا مسکرا اٹھتے ہیں جب وجے نگر بہنوں کے گھونگرو بجتے ہیں۔

فروری ۱۹۷۳ میں دونوں "رقص رانیوں" کی شادی روایتی جشن کے ساتھ ہو گئی۔

شادی کے صرف دو دن بعد جے شری کے آئینہ نے بتایا کہ اس کی ٹھوڑی کے پاس ایک گومڑا ابھر رہا ہے۔ دواؤں اور آپریشن کے بعد گھر والوں نے سمجھا کہ ان کی جے شری اچھی ہو چکی ہے۔ مگر مقررہ جگہ پر درد کا باقی رہنا جے شری کو پریشان کئے ہوئے تھا۔ "بے وقوف نہ بنو جے شری"، ڈاکٹر نے کہا "تمہارے جیسی جوان اور تندرست عورت کو کینسر کس طرح ہو سکتا ہے"۔ اس کے بعد گومڑ کا ایک ٹکڑا ٹاٹا میموریل اسپتال (بمبئی) کو جانچ کے لئے بھیجا گیا۔ رپورٹ نے بتایا کہ نندنی کے بعد اب اس کی بہن کو بھی کینسر ہو چکا ہے۔ مرض ٹھوڑی اور سینہ سے گزر کر پیروں تک پہنچ گیا۔ ہر قسم کے بہترین علاج کے باوجود تکلیف بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۸ مارچ ۱۹۷۳ کو جے شری کی روح بھی ایک بھیانک جسم کو بستر پر چھوڑ

کر اس سے جدا ہوگئی۔

"وجے نگر سسٹرس" کا جگمگاتا ہوا مکان اب تاریک ہو چکا ہے۔ دو جوان لڑکیوں کے کھونے کے بعد ماں باپ کو زندگی بے معنی نظر آتی ہے۔ ہر طرف مایوسی پھیلی ہوئی ہے۔ "نرتیہ نندنی" اسکول اگرچہ نومبر ۱۹۷۵ سے "وجے شری آرٹس انٹرنیشنل" میں تبدیل ہو چکا ہے۔ مگر تیسری بہن پدما اپنی ظاہری کامیابیوں کے باوجود ہر آن اپنے کو اسی راستہ پر پاتی ہے جدھر اس سے پہلے اس کی دو محبوب بہنیں جا چکی ہیں۔ وہی سوال اس کو بھی بے چین کئے ہوئے ہے جس کو لے کر اس کی دونوں بہنیں اس دنیا سے چلی گئیں — "زندگی زیادہ مکمل اور بے عیب کیوں نہیں" اس کی نفسیاتی حالت کو رپورٹر (مسٹر ایس۔ گنگولی) نے ایک جملہ میں اس طرح ادا کیا ہے:

A psychological amputation is not less real than a physical one.
Eve's Weekly (Bombay) 2 6.1978

نفسیاتی قتل کسی بھی حال میں جسمانی قتل سے کم نہیں ہوتا۔

یہ کوئی اتفاقی مثال نہیں۔ ہمارا پورا سماج اسی قسم کی مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہ لوگ جن کو آپ ہنستے ہوئے دیکھتے ہیں۔ جو بظاہر کامیابیوں کی جگمگاہٹ میں زندگی گزارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کو بھی اندر سے جھانک کر دیکھئے تو خوش نما جسموں کے اندر ایک غمناک اور اداس روح بسی ہوئی نظر آئے گی۔ موجودہ دنیا میں زندگی کے مسائل اتنے پیچیدہ ہیں، آدمی کو اتنے مختلف قسم کے ناموافق حالات میں رہنا ہوتا ہے اور دوسرے انسانوں کے چھیڑے ہوئے فتنے اس طرح سکون کو درہم برہم کرتے رہتے ہیں کہ کسی شخص کے لئے، ظاہری رونقیں اور ساز و سامان جمع کر لینے کے باوجود، حقیقی خوشیوں کی زندگی حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

ایک شخص ضروریات زندگی کا محتاج ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ آدمی کی ضرورتیں اس کو حاصل ہو جائیں۔ جب وہ کوشش کر کے ضرورت کی چیزیں پا لیتا ہے تو اب اس کو عیش و آرام کی طلب ہوتی ہے۔ اب ضرورت کی چیزوں میں اس کے لئے کوئی لذت نہیں ہوتی۔ اب وہ رات دن یہ خواب دیکھتا رہتا ہے کہ عیش کے سامان اس کے گرد جمع ہو جائیں۔ اگر حالات اس کا ساتھ دیں اور وہ عیش کی چیزیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تب بھی اس کی طلب ختم نہیں ہوتی۔ جن چیزوں کو پہلے وہ حرص کی نظروں سے دیکھا کرتا تھا، اب ان میں اس کے لئے کوئی لذت باقی نہیں رہتی۔ اس کے بعد اس کے اندر ایک اور چیز کی طلب جاگ اٹھتی ہے۔ یہ ہے عزت اور مرتبہ۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کا مقام سب سے اونچا ہو جائے۔ مگر یہ چیز اس کو کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے حصہ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں آتا کہ جو لوگ اس کو اپنے سے کمتر دکھائی دیں ان پر اپنی بڑائی کا مظاہرہ کر کے اپنی ہوس کی تسکین حاصل کرے۔ اور جو لوگ اس کو اپنے سے اوپر دکھائی دیں ان کے خلاف حسد اور بغض کی آگ میں جلتا رہے۔ وہ انھیں تاریکیوں میں بھٹکتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اچانک اس کی موت آجاتی ہے اور وہ آخرت کی ابدی دنیا میں پہنچا دیا جاتا ہے تاکہ دوبارہ اپنے لئے ایک زیادہ تلخ اور زیادہ تاریک زندگی کا آغاز کرے۔ دنیا کی کامیابیاں بھی اتنی ہی بے قیمت ہیں جتنی دنیا کی ناکامیاں۔ مگر انسان اپنی خوش خیالیوں میں گم رہتا ہے۔ موت کے سوا کوئی چیز نہیں جو اس کو اس کی خوش خیالیوں کی دنیا سے باہر نکالنے والی ثابت ہو۔

دنیا میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو زندگی بھر ناکامی ونامرادی کے احساس سے دوچار رہتے ہیں۔ تاہم وہ لوگ جن کو دنیا میں بہترین مواقع ملے۔ جنھوں نے سمجھا کہ وہ اپنی خوشیوں کی بہاریں اسی دنیا میں دیکھ سکتے ہیں۔ ان کا خاتمہ بھی اکثر بدترین مایوسی کے ساتھ ہوتا ہے۔ حادثہ، بیماری، منصوبوں کا ناکام ہوجانا۔ اور اگر بالفرض کوئی ان ناخوش گواریوں سے بچ جائے تو آخر میں موت۔ کتنے لوگ ہیں جو "کامیابی کے ساتھ" اپنا سفر طے کر رہے ہوتے ہیں۔ مگر موت عین اس وقت ان کی تمناؤں کے محل کو ڈھا دیتی ہے جب کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس کے دروازے کے قریب پہنچ چکے ہیں۔

کیا انسان کے لئے یہی مقدر ہے کہ وہ انتہائی قیمتی صلاحیتیں لے کر آئے اور بالآخر ایک بدترین ناکامی کے ساتھ اس کا خاتمہ ہوجائے۔ اگر آخرت کو حذف کرکے زندگی کو دیکھا جائے تو زندگی ایک المناک ڈرامے کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتی۔ ہم خواہ کچھ بھی کریں، موجودہ دنیا میں ہم اپنی آرزوؤں کی جنت تعمیر نہیں کرسکتے۔ ہماری محدودیتیں فیصلہ کن طور پر ہماری راہ میں حائل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف آخرت کا عقیدہ ہے جو انسانی زندگی کو بامعنی بناتا ہے۔ آخرت کے عقیدہ میں ہم اپنی اس منزل کو پالیتے ہیں جس کی طرف ہم یقین کے ساتھ سفر کرسکیں، جہاں ہم اپنی کوششوں کا انجام پانے کی قطعی امید کرسکیں۔ آخرت کو نہ ماننے والے کو اپنے سامنے مایوسی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ جب کہ آخرت کو ماننے والا اپنے سامنے امیدوں کا اتھاہ مستقبل دیکھتا ہے۔ زندگی آخرت کے بغیر انتہائی بے معنی ہے مگر زندگی آخرت کے ساتھ اتنی بامعنی ہوجاتی ہے کہ انسانی زبان میں وہ الفاظ ہی نہیں جو اس کو بیان کرسکیں

ہالی وڈ (امریکہ) عیش پسندوں کے لئے دنیا کی سب سے بڑی جنت ہے۔ ساری دنیا کے "محروم" لوگ ان "پائے ہوئے" لوگوں پر رشک کرتے ہیں جن کو اس جنت ارضی میں کوئی حصہ ملا ہو۔ مگر ہالی وڈ کے ایک جائزہ میں بتایا گیا ہے کہ یہ بظاہر قابل رشک لوگ بے حد قابل رحم حالت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اس جنت ارضی کے انتہائی خوش قسمت لوگ، سب کچھ پالینے کے بعد بالآخر اکتاہٹ Boredom کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ان کے پاس اتنی کاریں ہوتی ہیں کہ بسا اوقات ان کو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ آج اپنی مختلف کاروں میں سے کس کار میں بیٹھ کر جائیں۔ تاہم ان کی بے اطمینانی یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ وہ آپس میں اپنے مکان حتیٰ کہ بیویوں کا تبادلہ کرتے ہیں تاکہ تنوع کے ذریعہ اپنی اکتاہٹ کو کم کرسکیں۔ اصل یہ ہے کہ انسان لامحدود اطمینان چاہتا ہے۔ دنیا کی چیزیں اس کو صرف محدود اطمینان دیتی ہیں اس لئے وہ اس کی تسکین نہیں بنتیں۔ یہ صرف خدا ہے جو انسان کی طلب کا حقیقی اور ابدی جواب ہے۔

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب — سن لو، اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔

اللہ کی یاد کا مطلب یہ ہے کہ اس ہستی میں اپنا دل لگایا جائے جو حقیقی اور ابدی ہے۔ اپنی امیدوں اور حوصلوں کو اس عالم سے وابستہ کیا جائے جو ان تمام کمیوں سے پاک ہوگی جن کی وجہ سے موجودہ دنیا ہمارے خوابوں کی تعبیر نہیں بننے پاتی۔ جو آدمی اللہ کو پالیتا ہے وہ گویا اپنا سب کچھ پالیتا ہے۔ دنیا میں اگر اس کو تکلیف پہنچے تب بھی وہ مطمئن رہتا ہے کیونکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ وہ جس راستہ پر چل رہا ہے وہ بالآخر اس کو منزل تک پہنچانے والا ہے۔

خدا — انسانی فطرت کی آواز ہے

مسٹر الطاف گوہر پاکستان کے چوٹی کے صحافی ہیں۔ وہ پاکستان کے اخبار ڈان کے ایڈیٹر تھے بھٹو حکومت (۱۹۷۱ - ۷۷) نے اپنے اقتدار کے ابتدائی زمانہ میں الطاف گوہر کو جیل خانہ میں ڈال دیا۔ جیل کا مطلب، سیاسی قیدیوں کے لئے، اپنے میدان عمل سے محرومی کے ہم معنی ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں عام طور پر سب سے بہتر مشغلہ یہ رہ جاتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں مصروف کرلے۔ الطاف گوہر نے قرآن کو ترجمہ کی مدد سے پڑھنا شروع کردیا۔

یہ مطالعہ، حیرت انگیز طور پر، ان کے لئے ایک نیا تجربہ ثابت ہوا۔ وہ زندگی کی نئی وسعتوں سے آشنا ہوئے جس سے اب تک وہ، اپنے صحافتی مشاغل کی ہماہمی میں بے خبر رہے تھے۔ وہ شخص جس کا قلم چند دن پہلے تک عالمی سیاست کا جائزہ لیا کرتا تھا، جو اپنی خداداد ذہانت کے ساتھ قلم کا شہسوار بنا ہوا تھا، جیل خانہ میں اس نے اپنے آپ کو اچانک بالکل بے بس پایا۔ اس کی دنیا ایک محدود کوٹھری تھی جہاں اس کی اپنی ذات کے سوا کوئی اور نہ تھا۔

تنہائی کی زندگی، ہر معاملہ میں دوسروں پر انحصار، تمام ظاہری سہاروں کا رخصت ہوجانا، ان واقعات نے جیل کے ماحول کو الطاف گوہر کے لئے ایک عظیم حقیقت کے ادراک کی تربیت گاہ بنادیا۔ ان کی فطرت، غیرارادی طور پر، ایک ایسی ہستی کو تلاش کرنے لگی جو ہر طاقت سے بڑھ کر طاقت ور ہو۔ جس کو آدمی ہر آن پاسکتا ہو۔ جو ہر حال میں آدمی کی چٹان بن سکے۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ حالات اس کو دھکیل کر ایسے مقام پر پہنچادیں جہاں اس کے اپنے کمزور وجود کے سوا کوئی اس کے پاس نہ ہو۔ جہاں اس کے تمام سہارے اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہوں۔

اس نازک لمحہ میں جب مسٹر الطاف گوہر نے قرآن کی سورہ فاتحہ کھولی اور اس کو پڑھتے ہوئے اس فقرہ تک پہنچے: اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ، تو اچانک ان پر کھلا کہ وہ ہستی فی الواقع کائنات میں موجود ہے جس کی تلاش ان کی فطرت کا سب سے بڑا سوال بنی ہوئی تھی۔ سورہ کی آیت نمبر ۴ میں ان کو انسان کی حقیقی عظمت اور آزادی کا راز مل گیا۔ یہاں بندہ اپنے خدا کے ساتھ ایک ایسے ابدی عہد میں وابستہ نظر آیا جو مکمل طور پر اس کے عجز کا بدل بن جاتا ہے۔ جو اس کو ایک اتھاہ طاقت کی دائمی سرپرستی میں دے دیتا ہے۔ الطاف گوہر اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

I remember vividly the moment when I first realized the significance of this verse. 'We worship you alone, and to you alone we turn for help. It was a dramatic moment of freedom, a moment in which fear disappeared, and within me I felt a resurgence of confidence and faith.

مجھے وہ لمحہ خوب یاد ہے جب کہ میں نے پہلی بار اس قرآنی فقرہ کی معنویت کو سمجھا "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور ہم صرف تجھی سے مدد چاہتے ہیں"۔ یہ آزادی کا ایک ڈرامائی لمحہ تھا، ایک ایسا لمحہ جس کے بعد خوف مٹ گیا، اور میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر ایک نیا اعتماد و یقین ابھر آیا ہے۔

خدا انسانی فطرت کی آواز ہے۔ عام حالات میں یہ آواز چھپی رہتی ہے۔ مگر جب زندگی میں کوئی نازک لمحہ آتا ہے تو یہ آواز جاگ اٹھتی ہے۔ تاریخ میں بے شمار مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی بھی انسان اس فطرت سے خالی نہیں۔

فرانس کی ایک فلم ایکٹرس گائنا لولو برایگیڈا (Gina Lollobrigida) جنوری ۱۹۷۵ میں ہندستان آئی تھی۔ ایک پریس کانفرنس میں ایک اخباری رپورٹر سے اس کا سوال و جواب یہ تھا:

To a question whether she believed in God, Gina said: I believe in God. I believe in God. more when I am on an aeroplane.
Times of India, 3.1.1975

ایک سوال کے جواب میں کہ کیا وہ خدا کو مانتی ہے، گائنا نے کہا: میں خدا کو مانتی ہوں، میں خدا کو مانتی ہوں، اس وقت اور بھی زیادہ جب میں ہوائی جہاز میں ہوتی ہوں۔

آدمی جب ہوائی جہاز میں اڑ رہا ہو تو اس وقت وہ مکمل طور پر ایسے خارجی اسباب کے رحم و کرم پر ہوتا ہے جن کے توازن میں معمولی فرق بھی اس کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے۔ انسان کی یہی بے چارگی سمندری سفروں میں بھی ہوتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: "کیا تم دیکھتے نہیں کہ کشتی سمندر میں اللہ کے فضل سے چلتی ہے، تاکہ وہ تمھیں اپنی قدرتیں دکھائے۔ درحقیقت اس میں نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لئے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔ اور جب سمندر میں ان لوگوں کو موجیں بدلیوں کی طرح گھیر لیتی ہیں تو یہ اللہ کو پکارتے ہیں، اپنے دین کو اسی کے لئے خالص کرکے۔ پھر جب وہ بچا کر انھیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کوئی اعتدال پر رہتا ہے۔ اور ہماری نشانیوں کا انکار وہی کرتا ہے جو بدعہد اور ناشکرا ہے۔ (لقمان ۳۱-۳۲)

کوئی شخص خواہ کتنا ہی سرکش اور منکر کیوں نہ ہو، جب مشکل حالات پڑتے ہیں تو وہ بے اختیار خدا کو پکار اٹھتا ہے۔ یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا انسانی فطرت کی آواز ہے۔

۲۔ روسی ڈکٹیٹر مارشل اسٹالن (۱۸۷۹-۱۹۵۳) خدا کا منکر تھا۔ مگر اس کی زندگی میں ایسے واقعات ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ مشکل اوقات میں وہ بے اختیار خدا کو یاد کرنے لگتا تھا۔ ونسٹن چرچل (۱۸۷۴-۱۹۶۵) نے دوسری جنگ عظیم کے موقع پر اگست ۱۹۴۲ء میں ماسکو کا سفر کیا تاکہ ہٹلر کے خلاف دوسرا محاذ (سکنڈ فرنٹ) قائم کرنے کے لیے روسی لیڈروں سے گفتگو کرے۔ چرچل نے اس سلسلہ میں اتحادیوں کا فوجی منصوبہ اسٹالن کے سامنے رکھا جس کا خفیہ نام ٹارچ (TORCH) رکھا گیا تھا۔ اسٹالن چونکہ خود بھی ہٹلر کی بڑھتی ہوئی یلغار سے خائف تھا، اس نے اس فوجی منصوبہ میں گہری دلچسپی لی۔ چرچل کا بیان ہے کہ منصوبہ کی تشریح کے ایک خاص مرحلہ پر جب کہ اسٹالن کی دلچسپیاں اس سے نہایت بڑھ چکی تھیں اس کی زبان سے نکلا:

May God prosper this undertaking

خدا اس منصوبہ کو کامیاب کرے۔

Winston S. Churchill,
The Second World War (Abridgement)
Cassell & Company
London, 1965, P. 603

۳۔ سابق صدر امریکہ مسٹر رچرڈ نکسن کے افراد خاندان جب آخری فوٹوگراف کے لئے وائٹ ہاؤس میں جمع ہوئے تو سرکاری فوٹوگرافر کو ان کا فوٹو لینے میں کافی دیر لگی کیونکہ صدر نکسن سمیت سب لوگ رو رہے

تھے اور فوٹوگرافر اس انتظار میں تھا کہ بغیر آنسوؤں کا کوئی لمحہ ملے تو شاٹ لے سکے۔

واٹر گیٹ سکینڈل کے متعلق ٹیپ ریکارڈنگ جس نے نکسن کی صدارت کو ختم کیا، اگر نکسن چاہتے تو اس کو ضائع کر سکتے تھے۔ ایسی صورت میں ان کی صدارت خطرہ میں نہ پڑتی۔ مگر صدر نکسن کو یہ لالچ تھا کہ صدارت کے بعد اس ٹیپ کو فروخت کر کے وہ معقول رقم حاصل کر سکتے ہیں، مگر ان کی یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ ٹیپ ریکارڈنگ لوگوں کے علم میں آگئی اور نکسن کی صدارت ایسے بھونچال کا شکار ہوئی کہ علیحدگی کے سوا ان کے لئے کوئی چارہ نہ رہا۔

واٹر گیٹ اسکینڈل کے انکشاف سے پہلے رچرڈ نکسن اتنا زیادہ پریشان تھے کہ نیم پاگل ہو گئے تھے۔ وہ وائٹ ہاؤس میں روتے رہتے۔ انھوں نے خودکشی کا ارادہ کر لیا تھا۔ اگرچہ سخت نگرانی کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

آخری ایام (The Final Days) نامی کتاب میں انکشاف کیا گیا ہے کہ:

As the end neared, Nixon asked secretary of state Henry Kissinger to kneel and pray with him, saying :

"You are not a very orthodox Jew and I am not an orthodox Quacker, but we need to pray."
Daily American (Rome) 27.3 1976

جب صدارت کا خاتمہ قریب آگیا، نکسن نے سابق سکریٹری آف اسٹیٹ ہنری کسنجر سے کہا کہ وہ ان کے ساتھ خدا کے آگے جھکیں اور دونوں مل کر دعا کریں۔ "نہ تم زیادہ پکے یہودی ہو نہ میں زیادہ پکا عیسائی۔ مگر اس وقت ہم کو ضرورت ہے کہ ہم دعا کریں،" نکسن نے کہا اور عیسائی طریق عبادت کے مطابق جھک کر دعا کرنے لگے۔

۴۔ روس میں اشتراکی انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ میں آیا۔ اس طرح اس انقلاب پر اب پورے ساٹھ سال گزر چکے ہیں۔ تازہ اعداد و شمار کے مطابق ۲۵ کروڑ سوویت شہریوں میں ۲۲ کروڑ ایسے لوگ ہیں جو اکتوبر انقلاب کے بعد پیدا ہوئے ہیں، دوسرے لفظوں میں ایسے سماج میں جس میں، حکومت روس کے دعوے کے مطابق، قدیم مذہبی نظام مکمل طور پر ختم کر دیا گیا ہے۔

اشتراکی نظریہ کے مطابق مذہب، سرمایہ داری نظام کا ضمیمہ تھا۔ سرمایہ داری نظام کے خاتمہ کے بعد قدرتی طور پر اس کے ضمیمہ کو بھی ختم ہو جانا چاہئے۔ روسی حکومت کا دعویٰ ہے کہ اس نے سرمایہ داری نظام کو روس سے ختم کر دیا ہے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ مذہب اب بھی وہاں زندہ ہے۔ حتیٰ کہ روس کی جدید نسل میں دوبارہ مذہب پروان چڑھ رہا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ وہ ہے جو ۱۹۷۳ میں ہندستان میں پیش آیا۔ ایک روسی جہاز (Iyushin Jet) ہندستان میں مغربی بنگال کی فضا پر اڑ رہا تھا کہ اس کا انجن خراب ہو گیا ہوا باز کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں اور جہاز زمین پر گر پڑا۔ ہوا باز سمیت سارے مسافر جل کر ختم ہو گئے۔

چونکہ یہ حادثہ ہندستان کی سرزمین پر ہوا تھا اس لئے بین اقوامی قانون کے مطابق ہندستان کو اس کی تفتیش کرنی تھی۔ ہوائی جہازوں کا قاعدہ ہے کہ اس میں آواز ریکارڈ کرنے والی ایک خودکار مشین رکھی جاتی ہے جس کو عام طور پر (Black Box) کہتے ہیں۔ یہ

بلیک باکس ہوا باز اور کنٹرول ٹاور کے درمیان گفتگو
کو ریکارڈ کرتا رہتا ہے۔ اس کو ہوائی جہاز کی دُم میں
رکھا جاتا ہے تاکہ ہوائی جہاز کے جلنے کے بعد بھی وہ
بچ سکے۔

ہندستانی افسروں نے ہوائی جہاز کے ملبہ سے
اس بلیک باکس کو حاصل کیا۔ جب اس بکس کا ٹیپ
بجایا گیا تاکہ اس سے تفتیش میں مدد لی جا سکے تو معلوم
ہوا کہ بالکل آخری لمحات میں روسی ہوا باز کی زبان
سے جو لفظ نکلا وہ یہ تھا:

Peter Save Us

(سینٹ پیٹر ہم کو بچا) واضح ہو کہ پیٹر یا پطرس
حضرت عیسیٰ ؑ کے بارہ حواریوں میں سے ایک تھے اور
عیسائیوں کے یہاں بڑے بزرگ مانے جاتے ہیں۔

۵۔ کون جانتا تھا کہ سٹالن کی اپنی لڑکی سویتلانہ
(Svetlana Alliluyena) اس کے بعد عیسائی
مذہب قبول کر لے گی۔ سویتلانہ اشتراکی دنیا سے
مایوس ہو کر ہندستان آئی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ
کسی ہندستانی مذہب میں پناہ لے۔ مگر ہمارے حکمرانوں
کے لئے اس کا یہاں رہنا ہند۔روس دوستی کے خلاف
معلوم ہوا۔ چنانچہ مجبور ہو کر وہ یورپ چلی گئی، اور وہاں
عیسائیت کو اختیار کر لیا۔

سویتلانہ اپنی کتاب Only One Year
(صرف ایک سال) میں لکھتی ہے کہ میں ماسکو ہی میں
غیر مطمئن تھی اور اپنے قلب کی تسکین کے لئے کوئی چیز
ڈھونڈ رہی تھی — وہ چیز مجھے بائبل کے ان
جملوں میں مل گئی:

خداوند میری روشنی اور میری نجات ہے مجھے
کس کی دہشت۔
خداوند میری زندگی کا پشتہ ہے، مجھے کس
کی ہیبت۔
خواہ میرے خلاف لشکر خیمہ زن ہو۔
میرا دل نہیں ڈرے گا۔
خواہ میرے مقابلہ پر جنگ برپا ہو۔
تو بھی میں خاطر جمع رہوں گا۔

زبور: ۲۷

۶۔ آج کے روس میں اس کیفیت کے ابھرنے کے
شواہد کثرت سے مل رہے ہیں۔ سولژنتسین اور سخاروف
اسی روحانی کشمکش کی ایک علامت ہیں۔ سولژنتسین
کو اگر نوبل انعام حاصل کرنے کی اجازت مل ہوتی تو وہ یہ
رقم کو روسی عوام کے لئے ایک گرجا تعمیر کرنے میں صرف
کرتا۔ سولژنتسین کے ایک قریبی دوست دیلتری
پینی سے پوچھا گیا کہ روسی سلطنت کا سب سے کمزور
پہلو کیا ہے۔ اس نے بلا تردد جواب دیا:

The hunger of ordinary people for moral ond spritual truth.

"عام انسان کی یہ بھوک کہ وہ اخلاقی اور روحانی
سچائی کو پا سکے"۔

جو شخص گھمنڈ اور عصبیت جیسی نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا ہو وہ کبھی سچائی کو دیکھ نہیں سکتا، خواہ وہ کتنی
ہی کھلی شکل میں اس کے سامنے رکھ دی گئی ہو۔ سچائی کو پانے کے لئے سچائی کا طالب ہونا ضروری ہے۔

نماز سے آغاز

مولانا محمد علی ایم اے (کینٹب) اپنی تفسیری کتاب میں لکھتے ہیں: "ایک دفعہ راقم الحروف کے یہاں بہت سے احباب جمع تھے۔ ان میں لالہ لاجپت رائے بھی تھے۔ وہ باتوں باتوں میں کہنے لگے۔ مولوی صاحب! میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی کہ جس قوم کے پاس نماز اور زکوٰۃ جیسے دو بے مثال ادارے (Institutions) ہوں وہ قوم کیوں ذلیل و خوار ہو" قرآنی دعوت انقلاب، ۱۹۵۱، مکتبہ شعر و ادب لاہور، صفحہ ۳۱۶

نماز اللہ کے آگے اپنے کو جھکا دینے کا نام ہے اور زکوٰۃ کا مطلب ہے اللہ کی راہ میں اپنے مال کو قربان کرنا۔ جو ان دونوں عبادتوں کو حقیقی طور پر اپنی زندگی میں شامل کرے، اللہ اس سے راضی ہو جاتا ہے اور اس کو ابدی جنت میں جگہ دیتا ہے۔

یہ نماز اور زکوٰۃ کا اخروی پہلو ہے اور یہی ان کا اصل مقصود ہے۔ تاہم ان عبادتوں کے زبردست دنیوی فائدے بھی ہیں۔ نماز اگر صحیح شعور کے ساتھ قائم کی جائے تو وہ سارے مسلمانوں کو ایک مرکز پر متحد کر دیتی ہے اور اتحاد بلاشبہ کسی قوم کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ زکوٰۃ وسیع ترین قسم کا سوشل انشورنس ہے۔ کسی مسلم گروہ میں زکوٰۃ کا نظام اگر پوری طرح قائم ہو جائے تو اس کے اندر سے یہ مسئلہ سرے سے ختم ہو جاتا ہے کہ اس کے کچھ افراد مالیاتی کمی کے سبب سے اپنے لئے قابل اعتماد معاشی بنیاد نہ پا سکیں۔ زکوٰۃ کا نظام اس بات کی ضمانت ہے کہ قوم کا صرف ایک حصہ خوش حال نہ ہو بلکہ پوری قوم مجموعی حیثیت سے ترقی کرے۔

نماز اور زکوٰۃ، دنیوی اعتبار سے، اتحاد اور فارغ البالی کی علامتیں ہیں۔ اور یہ دونوں چیزیں جس قوم میں پیدا ہو جائیں، وہ بلاشبہ عزت و سربلندی حاصل کرے گی۔ کوئی اس کی کامیابی کو روک نہیں سکتا۔

نماز آدمی کے اوپر خدا کے حقوق کو بتاتی ہے اور زکوٰۃ آدمی کے اوپر آدمی کے حقوق کو۔ خدا کا حق آدمی کے اوپر یہ ہے کہ وہ اس کے آگے جھک جائے۔ آدمی کا حق آدمی کے اوپر یہ ہے کہ وہ اس کا خیر خواہ ہو۔ یہ دونوں چیزیں اتنی بنیادی ہیں کہ اگر وہ کسی قوم کے افراد میں پیدا ہو جائیں تو اس کے سارے معاملات کو درست کر دیتی ہیں۔ خدا کے آگے جھکنا نہ صرف اس کو خدا کی نظر میں محبوب بناتا ہے اور خدا اس پر اپنے انعامات کے دروازے کھول دیتا ہے۔ بلکہ اسی کے ساتھ اس کے اندر وہ اوصاف پیدا ہوتے ہیں جو ہر قسم کی دنیوی ترقی کے ضامن ہیں۔ خدا کے آگے جھکنا اپنے رب کے سامنے اپنی عبدیت کا اقرار ہے اور عبدیت کا شعور جن لوگوں میں زندہ ہو جائے ان کا معاملہ جب دوسرے انسانوں سے پڑتا ہے تو یہ شعور وہاں تواضع، بے غرضی، انصاف پسندی اور حق کے لئے سپر اندازی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ نہ صرف بندے کے اوپر بندے کے حق کو یاد دلاتی ہے بلکہ یہ سبق دیتی ہے کہ تمہاری انسانیت اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک تمہارا یہ حال نہ ہو جائے کہ اپنی ذاتی چیزوں میں بھی دوسرے کا حق سمجھنے لگو۔

نماز کے اندر ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت کا عملی ظہور ہے۔اس کی اس خصوصیت نے حیرت انگیز طور پر نماز کے اندر ایک دعوتی قدر پیدا کر دی ہے۔

چار برس پہلے کی بات ہے، میں اپنی کتاب "الاسلام" کی ترتیب کے دوران ایک سوال سے دوچار تھا۔" موجودہ زمانہ تجربوں اور مشاہدوں کا زمانہ ہے۔آج کا انسان اگر مجھ سے پوچھے کہ کیا اسلام کی صداقت کو ہم تجرباتی طور پر جان سکتے ہیں، تو میرا جواب کیا ہوگا" اسی اثنا میں ۱۳ر اور ۱۴ر جولائی ۱۹۷۴ء کی درمیانی شب کو میں نے دہلی میں خواب دیکھا کہ میں کچھ غیر مسلموں کے ساتھ ہوں اور ان کو اسلام کی باتیں بتا رہا ہوں۔یہ غالباً یورپ کے کچھ لوگ تھے اور مجھ سے ٹھیک یہی سوال کر رہے تھے۔عجیب بات ہے کہ وہ سوال جس کو میں حالت بیداری میں حل نہ کر سکا تھا، اللہ تعالے نے حالت خواب میں اس کو کھول دیا۔میں نے دیکھا کہ میں اس سوال کے جواب میں ان سے پورے اعتماد کے ساتھ کہہ رہا ہوں: "ہاں اسلام کی تجرباتی آزمائش ممکن ہے اور اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ نماز کا تجربہ کریں" مخاطب کی رعایت سے خواب کی یہ گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔میری نیند کھلی تو اپنا ایک جملہ مجھے لفظ بہ لفظ یاد تھا۔میں نے ان سے کہا تھا:

Without being a Muslim, you can experience Namaz

(مسلمان نہ ہوتے ہوئے آپ نماز کا تجربہ کر سکتے ہیں) جہاں تک یاد آتا ہے، اس کے بعد ان لوگوں نے وضو کیا اور میرے ساتھ نماز پڑھی۔نماز کا یہ تجربہ "ان کے لئے اتنا مؤثر ہوا کہ اس کے بعد انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔

تاریخ میں کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں کہ لوگ صرف نماز کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ ہند جگر خوار کے اسلام سے متاثر ہونے کا ابتدائی سبب نماز ہی تھی۔مسلمان جب مکہ میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوئے تو انھوں نے وہاں ظلم اور گھمنڈ کا مظاہرہ نہیں کیا۔بلکہ مسجد میں جا کر اللہ کے سامنے اپنے عجز اور بندگی کا اقرار کیا۔ابن مندہ نے روایت کیا ہے کہ ہند نے اپنے شوہر ابوسفیان سے کہا کہ میں اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں۔ابوسفیان نے کہا، تم تو ابھی کل تک اسلام کی سخت مخالف تھیں۔انھوں نے جواب دیا ہاں، مگر رات جو منظر میں نے دیکھا اس نے میرے ذہن کو بالکل بدل دیا ہے:

واللہ ما رأیت اللہ تعالیٰ عبد حق عبادتہ فی ہذا المسجد قبل اللیلۃ، واللہ ان باتوا الا مصلین قیاما ورکوعا وسجودا	خدا کی قسم آج کی رات سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ اس مسجد میں خدا کی عبادت اس طرح کی گئی ہو جیسا کہ اس کی عبادت کرنے کا حق ہے۔خدا کی قسم یہ لوگ ساری رات نماز پڑھتے رہے۔انھوں نے قیام اور رکوع اور سجود میں رات گزار دی۔

افریقہ کی تاریخ کا ایک مبصر لکھتا ہے:

"وسط افریقہ میں اسلام کی اشاعت بہت بڑی حد تک سیاحوں اور عرب تاجروں کے ذریعہ ہوئی۔ان کا سب سے بڑا معجزہ جس سے افریقہ میں اسلام کی اشاعت ہوئی، نماز تھا۔جہاں یہ لوگ ایک امام کے پیچھے ایک صف میں کھڑے ہوئے اور ان کے چہروں سے خدا کا خوف ظاہر ہوا دیکھنے والے ہکا بکا رہ گئے۔لوگ ایک طرف اپنی ذلیل بت پرستی پر نادم ہوئے، دوسری طرف اسلامی عبادت نے ان کو اپنی طرف کھینچا۔نتیجہ یہ ہوا کہ صرف نماز نے وسط افریقہ کی اکثر آبادی کو اسلام میں داخل کر دیا۔"

Winwood Reade, Martyrdom of Man, P.32

شاہجہاں کے زمانے میں منگولوں سے مغل سلطنت کا مقابلہ پیش آیا۔ اورنگ زیب اس وقت شہزادہ تھا۔ اس کو مقابلے کے لئے بھیجا گیا۔ اس نے منگولوں کو سنکیانگ تک دھکیل دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جس وقت اورنگ زیب اور جے سنگھ کی فوجیں سنکیانگ کے صحرا میں منگولوں کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ ظہر کی نماز کا وقت آگیا۔ اورنگ زیب گھوڑے سے اتر گیا اور میدان جنگ میں رومال بچھا کر نماز ادا کرنے لگا۔ منگولوں نے دیکھا کہ بادشاہ "ڈنڈ بیٹھک" کی طرح کوئی عمل کر رہا ہے۔ انھیں اس عمل پر سخت حیرت ہوئی۔ نماز کے آداب کو قریب سے دیکھنے کے لئے انھوں نے جنگ روک دی اور اورنگ زیب کا محاصرہ کر لیا۔ وہ سکون کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا۔ اور منگول چاروں طرف اس کو گھیرے ہوئے حیرت کے ساتھ اس کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہے تھے جب بادشاہ نے سلام پھیرا تو منگولوں نے پوچھا کہ یہ آپ کیا کر رہے تھے۔ اورنگ زیب نے جواب دیا: "میں اس خدا کی عبادت کر رہا تھا جو سب سے بڑا اور سب سے زیادہ مہربان ہے۔"

بادشاہ کا یہ جواب سن کر منگول کانپ اٹھے۔ ان کا حوصلہ پست ہو گیا۔ انھوں نے یہ سوچ کر ہتھیار ڈال دیئے کہ ایسے بہادر انسان کو زیر کرنا ممکن نہیں۔ یہ ۱۶۴۷ء کا واقعہ ہے۔

محمد حسنین ہیکل (سابق ایڈیٹر الاہرام) نے لکھا ہے کہ جمال عبدالناصر جب پہلی بار روس گئے تو اس وقت کے روسی وزیر اعظم نکیتا خروشچوف نے گفتگو کے دوران نماز سے بڑی دل چسپی کا اظہار کیا۔ یہ ۲۹ اپریل ۱۹۵۸ کا واقعہ ہے:

"خروشچوف کو مسلمانوں کے نماز پڑھنے کا منظر دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جب خروشچوف کے گھر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد صدر ناصر ظہر کی نماز کے لئے ماسکو کی مسجد جانے لگے تو خروشچوف نے سوالوں کی بھرمار کر دی۔ ناصر جتنی دیر وضو کرتے رہے، خروشچوف بذات خود تولیہ لئے کھڑا رہا۔ اس نے بڑی عقیدت و احترام کا مظاہرہ کیا۔"

علم الانسان پر جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ معبود کی پرستش کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے جو ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر موجود رہتا ہے۔ کوئی بھی چیز اسے ختم نہیں کر سکتی۔ نماز اسی فطری جذبے کے اظہار کا فطری طریقہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے آداب اور طریقوں میں یہ فطری تقاضا اس طرح سمیٹ دیا گیا ہے کہ نماز میں اور انسان میں خاص مناسبت پیدا ہو گئی ہے۔ نماز انسانی فطرت کی عکاس بن گئی ہے۔ جون ۱۹۷۶ء میں ایک بار مجھے ایک غیر مسلم کے مکان پر نماز ادا کرنے کا موقع ملا۔ ہم دو آدمی تھے۔ جب تک ہم لوگ نماز پڑھتے رہے، چھ افراد کا پورا خاندان دم بخود ہو کر ہم کو دیکھتا رہا۔ نماز سے فراغت کے بعد صاحب خانہ نے کہا: "آپ کی نماز کو دیکھ کر میرے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ جی چاہتا تھا کہ میں بھی اس میں شریک ہو جاؤں۔" اس قسم کا تجربہ مجھے اپنی زندگی میں کئی بار پیش آیا ہے۔

ہماری یہ لازمی ذمہ داری ہے کہ ہم اللہ کے دین کو اس کے تمام بندوں تک پہنچائیں۔ اس سلسلے میں ایک سوال یہ ہے کہ اس کے آغاز کی عملی شکل کیا ہو۔ دین کو ان کے لئے بحث کا موضوع کس طرح بنایا جائے۔ موجودہ حالات میں اس کی ایک قابل عمل شکل نماز نظر آتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نماز کی "اٹھ بیٹھ" بعض لوگوں کو عجیب سی چیز معلوم ہوگی۔ جیسا کہ مکہ میں ابوطالب کے ساتھ پیش آیا تھا۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ان کے صاحب زادے علی بن ابی طالب ابتداءً نمازی کو دیکھ کر اسلام سے متاثر ہوئے تھے۔ اور پھر اسلام کے سب سے بڑے جاں باز ثابت ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسری اقوام تک دین کو پہنچانے کے لئے نماز نہایت کامیاب ذریعہ بن سکتی ہے۔ فطری کشش تو اس کے اندر ہمیشہ سے تھی۔ مگر موجودہ زمانہ کے تجرباتی اور مشاہداتی مزاج نے اس کے اندر ایک "سائنسی" اہمیت پیدا کر دی ہے۔ آج کا انسان چاہتا ہے کہ کسی بات کو ماننے سے پہلے اس کو عملی شکل میں جان لے، وہ اس کا ذاتی تجربہ کر سکے۔ نماز اس ضرورت کو کمال درجہ

میں پورا کرتی ہے۔ جب ایک شخص نماز میں مشغول ہو تو وہ حیرت انگیز طور پر محسوس کرتا ہے کہ یہ خود اس کی اندرونی مانگ کا جواب ہے۔ نماز کے مختلف اعمال میں خود اس کے اپنے روحانی تقاضے پورے ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کی پوری ہستی نماز میں اس طرح شامل ہو جاتی ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اور حقیقت اعلیٰ دونوں ایک دوسرے میں جذب ہو گئے ہیں۔ حتیٰ کہ جو شخص دور سے صرف نماز کا مشاہدہ کر رہا ہو، وہ بھی اس کی سادگی، اس کی عظمت اور انسانی وجود کے ساتھ اس کی مطابقت پر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ کھلم کھلا محسوس کرنے لگتا ہے کہ معبود کی پرستش کا اس سے بہتر کوئی طریقہ ممکن نہیں۔

جہاں تک نجات آخرت کا سوال ہے آدمی کے لئے با ایمان نمازی ہونا ضروری ہے۔ مگر اس کی کیفیات کو پانے کے لئے رسمی ایمان کی ضرورت نہیں۔ ایک شخص اگر وہ سنجیدہ ہو، ایمان لائے بغیر بھی نماز کے مقررہ طریقے میں اپنے آپ کو مشغول کر کے نماز کی کیفیتوں اور لذتوں کا ایک حصہ پا سکتا ہے۔ نماز کا یہ پہلو اس کے اندر ایک دعوتی قدر پیدا کر دیتا ہے۔ مکہ کی تاریخ اس کی عملی تصدیق بھی کر رہی ہے۔ کیونکہ مکہ میں، اسلام کے ابتدائی دور میں، قرآن کے بعد نماز ہی سب سے زیادہ لوگوں کو دین سے قریب کرنے کا ذریعہ بنی تھی۔

دوسری قوموں میں دین کی اشاعت کے لئے موجودہ زمانے میں ہمیں جو کام کرنے ہیں ان میں سے ایک کام یہ ہے کہ عالمی سطح پر مسلم نوجوانوں کا ایک حلقہ قائم کیا جائے۔ اس حلقہ کا خاص مقصد خاموش اسلامی دعوت ہو۔ اس کے افراد تمام شہروں میں ہوں اور وہ ہر دن کسی نہ کسی ایسے پارک میں جائیں جہاں غیر مسلم مرد اور عورتیں تفریح کے لئے آتے ہوں۔ وہاں وہ ایک دو گھنٹہ اس طرح گزاریں کہ ان کی گفتگو اور اٹھنے بیٹھنے میں مکمل طور پر سنجیدگی کا اظہار ہو۔ ان کے پاس قرآن کا ترجمہ ہو یا ایسی کوئی کتاب ہو جس میں پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کے اخلاقی اور ایمانی واقعات درج ہوں۔ وہ آپس میں بیٹھ کر اس کو پڑھیں۔ بالقصد اپنی طرف سے کسی کے اوپر تبلیغ کی کوشش نہ کریں۔ البتہ اگر کوئی شخص خود سے ان کے حلقہ درس میں بیٹھنا چاہے تو اس کو عزت کے ساتھ بٹھائیں۔ کوئی سوال کرے تو انتہائی نرمی اور سنجیدگی کے ساتھ اس کا جواب دیں۔ جواب معلوم نہ ہو تو صفائی کے ساتھ کہیں کہ ہمیں اس کا جواب معلوم نہیں۔ ہم تحقیق کر کے اگلے دن آپ کو بتائیں گے۔ ان کے پاس نماز اور دوسری اسلامی تعلیمات کے بارے میں چھوٹے چھوٹے کتابچے مختلف زبانوں میں ہوں جو وہ شائقین کو مفت دے سکیں۔ پارک کے اس پروگرام کا سب سے اہم جزو نماز ہو۔ اس مقصد کے لئے غالباً عصر کی نماز زیادہ موزوں ہوگی۔ سب نوجوان مل کر نماز ادا کریں۔ نماز خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں۔ ایسا ہرگز نہ کریں کہ جلدی جلدی پڑھ کر سلام پھیر دیں۔ چار رکعت نماز میں لگ بھگ ۲۰ منٹ صرف کئے جائیں۔ نماز اس طرح پڑھی جائے گویا ہم فی الواقع اللہ کے سامنے کھڑے ہیں اور اس کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار کر رہے ہیں۔

یہ کام اگر کچھ برسوں تک مسلسل نہایت خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ کیا جائے تو اس کے غیر معمولی نتائج برآمد ہوں گے۔ مسجدوں میں نماز کی تحریک مسلمانوں کی اصلاح کے لئے کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے۔ اسی طرح پارکوں میں نماز کی تحریک غیر مسلموں تک دین کا پیغام پہنچانے کے لئے چل پڑے تو ہماری ذمے داری کے دونوں تقاضے پورے ہو جائیں گے۔ اور دنیا میں اگر خدانخواستہ اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو آخرت میں انشاء اللہ ہمارا شمار ان لوگوں میں ہوگا جنھوں نے خلق اللہ کے سامنے حق کی گواہی دی تھی اور ایک مومن کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ یہ کام نظم کے ساتھ ہو۔ جو لوگ اس پروگرام میں شریک ہوں وہ باہم مشورہ سے ایک شخص کو منتظم مقرر کر لیں۔ وہی شخص کتاب پڑھے اور وہی شخص بوقت ضرورت بولے۔ بقیہ لوگ بالکل خاموش رہیں اور منتظم کے حق میں دل ہی دل میں دعا کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرمائے اور اس کی زبان سے وہی کلمات نکالے جس میں حق اور خیر ہو۔

اسلامی دعوت

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک پتھر دوسرے پتھر سے ٹکراتا ہے تو وقتی طور پر کچھ روشنی نکلتی ہے اور جلد ہی بجھ جاتی ہے۔ مگر سورج کی روشنی کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ کسی دوسری چیز کے ٹکرانے سے نہیں چمکتا بلکہ خود اپنی ذات میں روشن ہے۔ وہ نور اور حرارت کے ابدی بھنڈار سے روشنی لے کر اتھاہ خلا میں جگمگا رہا ہے۔ یہی حال اسلامی تحریکوں کا ہے۔ ایک تحریک وہ ہے جو وقتی حالات کے ردعمل سے پیدا ہوئی ہو۔ دوسری تحریک وہ ہے جو خدا کے ازلی نور کے پرتو سے چمک اٹھی ہو، جو آخرت کے ابدی محاسن کا دنیوی ظہور ہو۔ بظاہر دونوں تحریکیں اسلامی تحریکیں ہیں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا سورج میں اور پتھر کی رگڑ سے پیدا ہونے والی چنگاری میں۔ ایک انسانی ردعمل کا نتیجہ ہے، دوسری خدا سے قربت و تعلق کا ظہور۔ ایک قریبی حالات کے اثر سے پیدا ہوئی ہے، دوسری آخرت کی برتر دنیا کا انعکاس ہے۔ ایک کی رونق وقتی اور ہنگامی رونق ہے، دوسری کا حاصل ازلی اور ابدی بہشت کا دروازہ کھل جانا۔

ایجابی اسلامی تحریک براہ راست خدا اور رسول کے فیضان سے ابلتی ہے اور ردعمل کی تحریک وقتی حالات کے اثر سے۔ دوسرے لفظوں میں، ایجابی اسلامی تحریک زمانۂ نبوت سے اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے اور ردعمل کی تحریک اپنے قریبی زمانہ کے سیاسی یا غیر سیاسی حالات سے۔ یہ فرق دونوں قسم کی تحریکوں میں زبردست فرق پیدا کر دیتا ہے۔ بظاہر دونوں ایک ہی قسم کے دینی الفاظ بولتے ہیں۔ مگر دونوں کے ذہن میں اسلامی اصطلاحات کا مفہوم اسی طرح بدل جاتا ہے جس طرح "پاپی" کا تلفظ ایک ہندی داں کے لئے گنہ گار کا مفہوم رکھتا ہے مگر ایک انگریزی داں کے لئے وہ خشخاش (Poppy) کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

مثلاً ایک تحریک جس نے وقتی سیاسیات سے متاثر ہو کر دین کی تعبیر کی ہو، وہ اپنی سیاسی نفسیات کی بنا پر دین کو اسٹیٹ (ریاست) کے ہم معنی سمجھے گی اور بندے اور خدا کے تعلق کو ایک ایسا تعلق بنا دے گی جس میں دین کے نام پر آدمی کے حصہ میں صرف سیاسی بحثیں آتی ہیں۔ وہ عبدیت کے لطیف تر مقامات کا تجربہ ہی نہیں کر پاتا۔ اس کے برعکس نبوت کے فیضان سے دین کا تصور لینے والا آدمی اس کو اللہ سے اس برتر تعلق کے معنی میں لے گا جہاں آدمی کی اپنی انا ختم ہو جاتی ہے اور وہ اپنی پوری ہستی کو اپنے رب کے سامنے ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح ایسی تحریک جس نے عملیاتی مذاہب کے اثر سے اپنا دینی تصور بنایا ہو وہ ذکر کو "جاپ" کے معنی میں لے گی۔ جب کہ پیغمبر کے صبح و شام سے ذکر کا مفہوم اخذ کرنے والا آدمی اس کو ایک عظیم نفسیاتی تجربہ کے ہم معنی سمجھے گا۔ اس کے نزدیک ذکر اس یاد الٰہی کا نام ہو گا جو خدائے برتر کی تجلیات میں ہمہ تن غرق ہونے سے کسی بندۂ خدا کے دل میں پیدا ہوتی ہے نہ کہ کسی قسم کی الفاظ شماری کا۔ حقیقی دین سے احتساب خویش کا ذہن ابھرے گا اور سیاسی دین سے احتساب اغیار کا۔ حقیقی ذکر ہو تو وہ دلوں کو پگھلاتا ہے، جب کہ شماریاتی ذکر کی ساری توجہ اس پر ہوتی ہے کہ گنتی کا مقررہ نصاب پورا کرے۔

دین نہ خارجی ہنگامہ آرائی کا نام ہے اور نہ طلسماتی عملیات کا۔ یہ خدا کے باغ میں خدا کا پسندیدہ پھول اگانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اپنے شعور کو نفسانی آمیزشوں سے پاک کر کے اس کو ملکوتی شعور کی سطح پر پہنچائے۔ وہ اپنے وجود کو ان اعلیٰ اوصاف اور کیفیات کا مالک بنائے جو اس کو خدائے سبوح و قدوس کا ہم نشین بنانے والی ہوں، جو اس کو جنت کے پاکیزہ ماحول میں رہنے کا ابدی استحقاق عطا کر سکیں۔

توحید کی حقیقت

دین کی اصل توحید ہے۔ توحید کا مطلب ہے ایک اللہ پر اعتماد کرنا اور اسی کو اپنے خوف و محبت کے جذبات کا مرکز بنانا۔ انسان کو سوچنے اور محسوس کرنے کی جو صلاحیتیں دی گئی ہیں، وہ اپنا کوئی نہ کوئی توجہاتی مرکز چاہتی ہیں۔ آدمی فطری طور پر چاہتا ہے کہ کوئی ہو جس کی طرف وہ لپکے، جس سے وہ امید رکھے، جس کے اوپر وہ بھروسہ کرے، جس کی یاد کو وہ اپنا سرمایۂ حیات بنائے۔ آدمی اپنی ہستی کا ایک مرکز بنائے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ خواہ یہ مرکز دولت و اقتدار ہو یا قبریں اور دیوی دیوتا، یا کوئی دوسری چیز۔ یہ مرکز اگر اللہ کے سوا کوئی اور ہو تو یہ شرک ہے۔ اور اگر انسان صرف اللہ رب العالمین کو اپنی ہستی کا مرکز بنائے تو اسی کو توحید کہتے ہیں۔ اسلام کا تقاضا ہے کہ آدمی اپنی توجہات کو صرف اللہ کی طرف موڑ دے۔ اس کے سوا کوئی چیز اس کے لئے مرکز توجہ کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔

توحید کی حقیقت کو کسی ایک لفظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ کے ساتھ بندے کے ایک ایسے تعلق کا نام ہے جو محبت اور خوف اور توکل کے جذبات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ کوئی بندہ اس وقت اللہ کا موحد بنتا ہے جب کہ وہ اللہ کو اس طرح پائے کہ وہی اس کا محبوب بن جائے۔ اسی پر وہ سب سے زیادہ بھروسہ کرنے لگے۔ اس کو سب سے زیادہ جس بات کا اندیشہ ہو وہ یہ کہ کہیں اس سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جو اس کو خدا کی رحمتوں سے محروم کر دے۔ ان تمام انسانی جذبات کے لئے صرف اللہ کو خاص کر لینے کا نام توحید ہے۔ اس سلسلہ میں یہاں قرآن سے چند آیتیں نقل کی جاتی ہیں:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ ۗ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ ۝
بقرہ ۱۶۵

اور بعض وہ لوگ ہیں جو اللہ کے سوا اوروں کو اس کا برابر ٹھہراتے ہیں۔ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے رکھنا چاہئے اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔ اور کاش یہ بے انصاف دیکھ لیں اس وقت کو جب کہ وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ ساری طاقت صرف اللہ کے لئے ہے اور اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝
تغابن ۱۳

اللہ، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اور چاہئے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں ایمان لانے والے۔

إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا ۖ وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ ۝
انبیاء ۹۰

وہ لوگ دوڑتے تھے بھلائیوں پر اور پکارتے تھے ہم کو امید سے اور ڈر سے اور وہ ہمارے آگے عاجزی کرنے والے تھے۔

ان آیات کے مطابق توحید، اعتقادی طور پر یہ ہے کہ آدمی سب سے زیادہ اپنے رب سے محبت کرنے لگے۔ اس کے لئے سب سے زیادہ بھروسہ کی چیز اس کا خدا بن جائے۔ اس کی امیدیں اور اس کے اندیشے اللہ کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو جائیں

کہ وہ اپنے روز و شب کے لمحات میں اس کو بے تابانہ پکارنے لگے۔

توحید کے عملی تقاضے

توحید کے عملی تقاضوں کو دو حصے میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ عبادات اور اخلاقیات۔ اللہ نے جو وسیع کائنات بنائی ہے، اس کی ہر چیز اپنے رب کی عبادت اور بندگی میں لگی ہوئی ہے۔ وہ "طوعاً و کرہاً" اسی دین توحید کو اختیار کئے ہوئے ہے جسے انسان کو اپنے ارادہ سے اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ آل عمران - ۸۳	کیا وہ خدا کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں۔ حالاں کہ اسی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے، خوشی سے یا ناخوشی سے۔ اور سب اللہ ہی کی طرف پھیرے جائیں گے۔

درخت اور دوسری کھڑی ہوئی چیزیں اپنا سایہ زمین پر ڈال دیتی ہیں۔ اس طرح گویا وہ خدا کو سجدہ کر رہی ہیں (نحل ۴۸) یہی عبادت کی اصل حقیقت ہے۔ عبادت یہ ہے کہ آدمی اللہ کے قدموں میں اپنا سر رکھ دے۔ وہ اس کے آگے جھک جائے۔ وہ اپنے وجود کو خدا کے آگے اس طرح بچھا دے جس طرح درخت اپنے سایہ کے ساتھ زمین پر بچھ جاتا ہے۔

کائنات کی اخلاقیات کیا ہیں۔ اس کی اخلاقیات یہ ہیں کہ اس کا ہر جزء خدا کے مقررہ نقشہ پر ٹھیک قائم ہے (فرقان ۲) اسی کے ساتھ کائنات کا ہر جزء اس کے دوسرے اجزاء کے ساتھ پوری ہم آہنگی کے ساتھ عمل کرتا ہے (یٰس ۴۰) اپنے فرض منصبی سے بال برابر نہ ہٹنا اور دوسرے کائناتی اجزاء کے ساتھ دائمی طور پر متوافق رہتے ہوئے اپنا کام انجام دینا، یہ کائنات کا اخلاق ہے۔ یہی اخلاق آدمی کو بھی اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داریاں سونپی ہیں، ان پر اسے ہر حال میں قائم رہنا ہے اور جن بھائیوں کے درمیان رہ کر اس کو زندگی گزارنی ہے ان سے کامل اتحاد اور موافقت کرتے ہوئے اپنے حصہ کا کام انجام دینا ہے۔ اس معاملہ میں انسانی معاشرہ کی مثال، حدیث کے الفاظ میں، ایک جسم کی سی ہونی چاہئے۔ جسم کا ایک حصہ جب ایک صحیح عمل کرنا چاہتا ہے تو جسم کے بقیہ تمام حصے مکمل طور پر اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ جسم کے ایک حصہ کی آرام و تکلیف اس کے دوسرے تمام حصوں کی آرام و تکلیف ہوتی ہے۔ یہی فرض شناسی اور اجتماعیت انسان سے بھی دنیا کی زندگی میں مطلوب ہے۔

عبادت اور اخلاقیات کا یہ سبق جو کائنات کے خاموش نظام میں رکھا گیا ہے۔ یہی انسانی سطح پر پیغمبر کی زندگی میں نمایاں کیا گیا ہے۔ پیغمبر کی زندگی خدا پرستی کی عملی اور معیاری مثال ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب ۲۱)	اللہ کے رسول میں تمھارے لئے بہترین نمونہ ہے

رسول وہ کامل اور مکمل انسان ہے جس نے توحید کو اعتقادی اور عملی طور پر اس کی آخری معیاری صورت میں اپنایا — نیز اللہ تعالیٰ نے خصوصی اہتمام کے ذریعہ رسول کی زندگی کے ریکارڈ کو ہمیشہ کے لئے تاریخ میں محفوظ کر دیا۔ اب جو بندۂ خدا یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے رب کے یہاں اس حال میں پہنچے کہ اس کا رب اس سے راضی ہو، اس کو چاہئے کہ وہ خدا کے

دین کو خدا کی کتاب سے معلوم کرے اور پھر رسول کی سنت کی روشنی میں اس کو اپنی زندگی میں اختیار کرے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں جو آدمی کو خدا کی پکڑ سے بچانے والا اور اس کے انعامات کا مستحق بنانے والا ہو۔

دو قسم کی زندگیاں

قرآن کی چودھویں سورہ میں شجرۂ طیبہ اور شجرۂ خبیثہ کی مثال دے کر اس حقیقت کو سمجھایا گیا ہے کہ توحید کی بنیاد پر اٹھنے والی زندگی کیسی ہوتی ہے اور شرک کی بنیاد پر اٹھنے والی زندگی کیسی ——— "کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے۔ کلمۂ طیبہ ایسا ہی ہے جیسے شجرۂ طیبہ جس کی جڑ خوب گڑی ہوئی ہو۔ اور اس کی شاخیں بلند ہوں۔ وہ خدا کے حکم سے ہر فصل میں اپنا پھل دیتا ہے۔ اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ سمجھیں۔ اور کلمۂ خبیثہ کی مثال ایسی ہے جیسے شجرۂ خبیثہ کہ وہ زمین کے اوپر ہی اوپر سے اکھاڑ لیا جائے۔ اس کو کچھ ٹھہراؤ نہیں۔ اللہ ایمان والوں کو مضبوط کرتا ہے مضبوط بات سے دنیا میں اور آخرت میں ـــ اور اللہ بے انصاف لوگوں کو بے راہ کر دیتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے" (ابراہیم ۲۷-۲۴)

زمین میں دو قسم کے درخت پائے جاتے ہیں۔ ایک شیشم اور چنار جیسے درخت جو زمین میں چٹان کی طرح گڑے ہوتے ہیں اور فضا کی پہنائیوں میں اپنی شاخیں پھیلائے رہتے ہیں۔ دوسرے برساتی پودے، جو زمین کے اوپر اوپر اگ آتے ہیں اور جو بھی چاہتا ہے ان کو ہاتھ بڑھا کر اکھاڑ لیتا ہے۔ یہ دونوں قسم کے درخت گویا موحد اور مشرک کی زندگی کو علامتی طور پر بتا رہے ہیں۔ موحد انسان اس کائنات کا مطلوب "درخت" ہے۔ ایک شخص جب موحد بنتا ہے تو ساری کائنات اس کی رزق رسانی کے لئے مستعد ہو جاتی ہے۔ وہ ایک تناور درخت کی شکل میں اگنا شروع ہو جاتا ہے۔ زمین میں بھی اس کو جماؤ ملتا ہے اور آسمان تک بھی اس کی سرسبزیاں اور شادابیاں پہنچتی ہیں۔ خدا کی نصرتیں اس کے ساتھ ہوتی ہیں۔ وہ دونوں موسموں میں اپنی بہار دکھاتا ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اس کے برعکس مشرک کی زندگی گویا برساتی جھاڑ جھنکاڑ کی مانند ہے۔ وہ زمین میں بس اوپر اوپر اگ آتا ہے۔ خدا کی مدد اس کے ساتھ نہیں ہوتی۔ اس لئے نہ دنیا میں اس کو جماؤ حاصل ہوتا اور نہ آخرت کے موسم میں وہ کوئی پھل دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے قانون امتحان کی بنا پر موجودہ دنیا میں جو مہلت دے رکھی ہے، اس کی وجہ سے اس کو وقتی طور پر زمین کی سطح پر اگنے کا موقع مل جاتا ہے۔ مگر امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی اس کو زمین سے اکھاڑ دیا جائے گا۔ اس کے بعد اس کو آگ کی دنیا میں پھینک دیا جائے گا جہاں وہ جہنم کا ایندھن بنے۔ اور خدا کی یہ سرسبز و شاداب زمین نئے اہتمام اور سنوار کے ساتھ صرف ان لوگوں کی وراثت میں دے دی جائے گی جو موت سے پہلے کی زندگی میں سچے خدا پرست ثابت ہوئے تھے۔

موحدانہ زندگی اور مشرکانہ زندگی کا فرق اپنی کامل صورت میں اگرچہ صرف آخرت میں ظاہر ہوگا، تاہم اس کا ظہور اسی دنیا سے شروع ہو جاتا ہے۔ توحید پرست اگر تنہا ہے تو خدا کا انعام اس کو اس طرح ملتا ہے کہ باطل قوتیں، اپنی ساری کوشش کے باوجود، اس کی آواز کو مغلوب نہیں کر پاتیں، وہ نظریاتی طور پر غالب ہو کر رہتا ہے اور اگر توحید پرست قابل لحاظ تعداد میں مجتمع ہو جائیں تو ان کو زمین میں سیاسی اور سماجی غلبہ بھی دے دیا جاتا ہے۔

انسان کی منزل: جنت

اللہ نے انسان کو بہترین تخلیق پر پیدا کیا۔ پھر اس کے لیے ایک جنت بنائی کہ وہ اس میں فراغت کے ساتھ رہے۔ پھر اللہ کی حکمت مقتضی ہوئی کہ زمین کے اوپر امتحانی حالات کا پردہ ڈال دیا جائے۔ جنت کو اس نے، حدیث کے الفاظ میں، مکروہات سے ڈھانپ دیا۔ اس کے بعد اس نے انتظام کیا کہ زمین پر انسانی نسل پیدا ہو۔ وہ مختلف حالات سے گزرے تاکہ ہر ہر فرد کے بارے میں معلوم ہو کہ ان میں سے کون جنت کے ماحول میں بسانے کے قابل ہے اور کون اس قابل ہے کہ اس کو جنت کی دنیا سے باہر پھینک دیا جائے۔ اس وقت ہماری زمین اسی دور سے گزر رہی ہے۔ جب تمام لوگ اپنا اپنا تعارف پیش کر چکے ہوں گے تو امتحانی حالات ختم کر دیے جائیں گے اور جنت کی دنیا اپنی تمام تابانیوں کے ساتھ سامنے آجائے گی۔ جن لوگوں نے، موجودہ امتحانی مدت میں، اپنے آپ کو جنتی معاشرہ کا اہل ثابت کیا ہوگا وہ وہاں خدائی انتظام واہتمام کے ساتھ بسائے جائیں گے۔ اور جن لوگوں نے اپنی موجودہ زندگی سے یہ ثبوت دیا ہوگا کہ وہ جنتی معاشرہ میں بسائے جانے کی اہلیت نہیں رکھتے، ان کو اسفل سافلین میں پھینک دیا جائے گا جہاں وہ دائمی طور پر ایک پُر عذاب ماحول میں رہیں گے، دکھ بھری زندگی کے سوا کوئی اور زندگی ان کے لئے ممکن نہ ہوگی۔

آخرت کی مکمل دنیا کائنات کے کس مقام پر بنے گی اور اس کی متعین صورت کیا ہوگی، آج کا انسان اس کو سمجھ نہیں سکتا، ٹھیک ویسے ہی جیسے پیٹ کا ایک بچہ پیٹ کے باہر کی دنیا کو سمجھ نہیں سکتا۔ تاہم موجودہ دنیا میں وہ سارے اسباب موجود ہیں جن کا مطالعہ ہمارے لئے اگلی دنیا کے معاملہ کو قابل فہم بنا دیتا ہے۔ اللہ نے جس طرح موجودہ دنیا کو عدم سے بنایا، اسی طرح وہ ایک اور زیادہ بہتر دنیا کو از سر نو پیدا کر سکتا ہے۔ وہ بلاشبہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اسی طرح اللہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ اسی موجودہ دنیا میں ایسی مستقل تبدیلیاں پیدا کر دے کہ یہی دنیا اپنے بدلے ہوئے روپ میں جنت کی دنیا بن جائے۔ جنت کے معاملہ کو قابل فہم بنانے کے لئے ذیل کی سطروں میں اس کا ایک تصوراتی خاکہ، ثانی الذکر امکان کی روشنی میں، قرآن وحدیث کے اشارات کی مدد سے پیش کیا جاتا ہے۔

جنت کی دنیا

کائنات ایک بے پناہ حد تک وسیع کارخانہ ہے۔ کائنات کے اندر ان گنت دنیائیں ہیں اور ان میں سے اکثر ہماری زمین سے کھرب ہا کھرب گنا زیادہ بڑی ہیں۔ کائنات میں دنیاؤں کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے جتنی تمام سمندروں کے کنارے ریت کے ذرے۔ یہ تمام دنیائیں اپنی ساری وسعتوں کے باوجود یا تو آگ کے بہت بڑے بڑے شعلے ہیں جن کو ستارے کہا جاتا ہے یا ان میں سے کچھ خشک چٹانوں اور چٹیل ریگستانوں کی صورت میں ہیں جن کو چاند اور سیارے کہا جاتا ہے۔ اتھاہ کائنات اور اس کے اندر پھیلی ہوئی ان گنت دنیاؤں میں زمین ہی واحد کرہ ہے جو سرسبز وشاداب ہے۔ زمین ایک بے حد حسین اور مکمل دنیا ہے۔ زمین وہ واحد مقام ہے جہاں زندگی کی رونقیں ہیں، پانی اور ہوا اور سبزہ ہے۔ طرح طرح کی غذائیں ہیں۔ انسان کی تمام ضرورتوں کا سامان غیر معمولی اہتمام کے ساتھ یہاں اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ زمین

واحد کرہ ہے جہاں انسان ایک جگمگاتی ہوئی تہذیب بناتا ہے۔ وسیع کائنات میں زمین کے سوا کوئی دوسرا مقام نہیں جہاں تہذیب و تمدن کی تعمیر ممکن ہو۔ خلائی مسافروں نے بتایا ہے کہ خلا کے بقیہ کرے انسان جیسی زندگی کے لئے اس درجہ ناموافق ہیں کہ وہ بالکل جہنم معلوم ہوتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں ہماری موجودہ زمین جنت۔ زمین کے سوا بقیہ کائنات میں انسان کے لئے کہیں ایک گلاس پانی بھی موجود نہیں۔ حتیٰ کہ امریکی خلاباز جس نے چاند کا سفر کیا، اس کو اس سفر میں پانی کی جگہ اپنا پیشاب صاف کر کے پینا پڑا۔

کیا عجب کہ زمین، اپنی امکانیات کے اعتبار سے، خدا کی بنائی ہوئی جنت ہو۔ جنت کی جن نعمتوں کا ذکر قرآن و حدیث میں ہے وہ سب وہی ہیں جو بتمام و کمال موجودہ زمین پر پائی جاتی ہیں۔ قرآن میں جنت کی تصویر موجودہ زمین کے "پھلوں" کے مشابہ بنائی گئی ہے (بقرہ ۲۵) حدیث میں ہے کہ سیحون اور جیحون اور فرات اور نیل سب جنت کے دریا ہیں (مسلم) اس دنیا میں وہ سب کچھ انتہائی افراط کے ساتھ موجود ہے جو انسان کو خوشیوں اور کامیابیوں سے بھری ہوئی ایک زندگی بنانے کے لئے درکار ہے (ابراہیم ۳۴) مگر آج زمین کا حسن انسان کو نظر نہیں آتا۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے کہ اللہ کی ہستی بے حد نمایاں ہے، وہ آسمان و زمین کا نور ہے۔ مگر انسان اللہ کو نہیں دیکھتا۔ اللہ نے اس زمین کو بے حد خوب بنایا ہے (الذی احسن کل شیٔ خلقہ، سجدہ ۷) مگر انسان دنیا کے حسن کو نہیں دیکھ پاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے مصنوعی خول سے باہر نکلنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ آدمی کسی چیز کو جب دیکھتا ہے تو وہ اس کو اپنی "آنکھ" سے نہیں دیکھتا بلکہ اپنے "ذہن" سے دیکھتا ہے۔ اور آدمی کا حال یہ ہے کہ اس نے اپنے ذہن کو سطحیت، ظاہر پرستی، خود پسندی اور وقتی مفادات کے پردوں میں ڈھانپ رکھا ہے۔ ہر آدمی ایک بناوٹی خول میں بند ہے۔ اس صورت حال نے آدمی کو اس قابل نہیں رکھا کہ وہ اپنے آپ سے گزر کر چیزوں کو ان کے اصلی روپ میں دیکھ سکے۔ وہ چیزوں کو خود ان کی سطح پر دیکھنے کے بجائے ان کو اپنی ذات کی سطح پر دیکھتا ہے۔ وہ ہر آن جہنمی دھوئیں میں گھرا ہوا ہوتا ہے۔ اس بنا پر وہ دنیا کی جنتی فضاؤں کو دیکھ نہیں سکتا۔ آدمی اگر اپنی ذات کے خول سے باہر آئے اور چیزوں کو خدا کی نظر سے دیکھے تو وہ دنیا کے "پھلوں" میں جنت کی خوشبو پائے گا اور دنیا کے "دریاؤں" میں جنت کا نظارہ کرے گا۔

تاہم اگر کوئی اپنے آپ کو اتنا اوپر اٹھائے کہ دنیا کو اس کے ربانی روپ میں دیکھ سکے تب بھی وہ اس کو برتنے اور اس سے لطف اندوز ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کی دو خاص وجہیں ہیں۔ ایک اس لئے کہ انسان کو برنائے امتحان جو آزادی اور اختیار دیا گیا ہے، اس کا غلط استعمال کر کے اس نے زمین کو ظلم و فساد سے بھر دیا ہے — (روم ۴۱) دوسرے یہ کہ اللہ نے مخصوص مصالح کی بنا پر زمینی زندگی کے اوپر کبد (بلد ۴) کا پردہ ڈال دیا ہے۔ قیامت کے بعد جب زمین کو ان دونوں کمیوں سے پاک کر کے دوبارہ سنوارا جائے گا تو وہ اسی طرح نکھر اٹھے گی جس طرح گرمیوں کے سورج سے جھلسے ہوئے اور گرد و غبار سے اٹے ہوئے درخت بارش کے بعد نکھر جاتے ہیں۔ اس وقت ہماری یہ دنیا اتنی حسین اور اتنی لذیذ ہو جائے گی "جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی دل میں اس کا خیال گزرا"۔

جنت مکروہات سے ڈھکی ہوئی ہے

۱۔ ہماری دنیا کی ایک خرابی وہ ہے جو انسان کے ہاتھوں (بما کسبت ایدی الناس) پیدا ہوئی ہے۔ یہ زمین خدا کی زمین ہے۔ اس زمین کا انتظام خدا کے وہ پاک کارندے کر رہے ہیں جن کو فرشتے کہا جاتا ہے۔ تاہم انسان کو عارضی مدت کے لئے یہاں اختیار دے دیا گیا ہے۔ اس محدود اختیار کو انسان نے نہایت بری شکل میں استعمال کیا۔ انسان نے فرشتوں کے اس اندیشہ کو بدترین شکل میں درست ثابت کیا کہ انسان کو زمین میں اختیار دیا جائے گا تو وہ زمین پر فساد کرے گا اور خون بہائے گا (بقرہ ۳۰) انسانوں کے بوائق (شر و فساد) نے خدا کی دنیا کو اس قدر آلودہ کر دیا ہے کہ کسی خدا کے بندے کے لئے یہ ممکن نہیں رہا کہ دنیا کو اس کے اصلی روپ میں پا سکے۔

انسان خدا کا پرستار بننے کے بجائے اپنی پرستش کا بت کھڑا کرتا ہے۔ وہ خدا کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کے بجائے اپنی گھڑی ہوئی راہوں پر دوڑتا ہے۔ وہ کامیابی پا کر اکڑتا ہے۔ وہ اپنے بھائی کو اس کا حق دینے کے بجائے اس کو برباد کرنے کے منصوبے بناتا ہے۔ وہ خدا کے دیئے ہوئے مواقع کو حقیقی کاموں میں لگانے کے بجائے ان کو نمائشی کاموں میں برباد کرتا ہے۔ وہ کمزور کو ستاتا ہے اور جھوٹے مظاہرے کر کے حمایت حق کا کریڈٹ لیتا ہے۔ وہ کسی کی ترقی کو دیکھ کر حسد اور بغض میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کو گرانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اعتراف کے طریقہ کو چھوڑ کر ہٹ دھرمی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ انسانیت کے لئے جینے کے بجائے اپنی ذات کے لئے جیتا ہے۔ وہ امن کے حدود میں کام کرنے کے بجائے قتل اور توڑ پھوڑ کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی بڑائی قائم کرنے کی خاطر پوری قوم اور پوری انسانی نسل کو داؤ پر لگا دیتا ہے۔ انسان کی اس قسم کی بداعمالیوں نے خشکی اور تری کو فساد سے بھر دیا ہے۔ زمین کے جنتی چہرہ کے اوپر اپنا جہنمی پردہ ڈال دیا ہے۔

۲۔ دوسری چیز دنیا کے موجودہ نظام کی محدودیت ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو ہم نے رنج اور مشقت (کبد) میں پیدا کیا ہے۔ یہ اس مصلحت سے ہے کہ انسان آپے سے باہر نہ ہو۔ وہ قادر مطلق کو یاد کرتا رہے۔ دنیا میں انسان کی زندگی ایسی ہی ہے جیسے پھول کے ساتھ کانٹا۔ یہاں ہر چیز کے ساتھ ایک "کانٹا" یا کبد لگا دیا گیا ہے۔ زندگی کے ساتھ موت، جوانی کے ساتھ بڑھاپا، طاقت کے ساتھ کمزوری، صحت کے ساتھ بیماری، لذت کے ساتھ محدودیت، آرام کے ساتھ اندیشہ، خوشی کے ساتھ اکتاہٹ، عمل کے ساتھ تکان، ترقی کے ساتھ مسائل۔ دوستی کے ساتھ دشمنی، معتدل موسم کے ساتھ شدید موسم، بارش کے ساتھ طوفان، نسیم صبح کے ساتھ آندھی، تمدن کے ساتھ کثافت Pollution کامیابی کے ساتھ حادثہ وغیرہ۔ دنیا میں پھول کے ساتھ اس طرح "کانٹے" کی یکجائی نے دنیا کی ہر خوشی اور یہاں کی ہر لذت کو بے معنی بنا دیا ہے۔ آدمی یہاں پا کر بھی نہیں پاتا۔ آدمی یہاں کامیاب ہو کر بھی اپنی کامیابی کا لطف نہیں اٹھاتا۔ حتی کہ وہ اپنی اندرونی پیچیدگیوں اور خارجی مسائل کی وجہ سے اس قابل نہیں رہ جاتا کہ دنیا کو اس کے بے آمیز روپ میں دیکھ سکے۔

اپنے آپ کو حقیقت واقعہ کے مطابق بنانے والے

قیامت خدا کا وہ منصوبہ بند دھماکا ہے جو اس لئے آئے گا کہ زمین کو ان دونوں قسم کی خرابیوں سے پاک کر دے۔ اس کے بعد یہ ہوگا کہ خدا زمین کے معاملہ کو براہ راست اپنے چارج میں لے لے گا (مریم ۴۰) خدا اپنی زمین سے خبیث انسانوں

کو نکال دے گا (انفال، ۳۷) اور یہاں صرف ان طیب انسانوں کو بسائے گا جو موجودہ امتحانی مدت میں اس کا ثبوت دے چکے ہوں کہ وہ خدا کی جنتی دنیا کے شہری بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ لَهُمْ مَا يَشَاءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ

ق ۳۱-۳۵

اور جنت ڈر والوں کے لئے قریب لائی جائے گی، وہ کچھ دور نہ رہے گی۔ یہ ہے جس کا وعدہ تم سے کیا جاتا تھا۔ وہ ہر ایسے شخص کے لئے ہے جو رجوع ہونے والا یاد رکھنے والا ہو۔ جو بغیر دیکھے اللہ سے ڈرتا ہو اور ایسا دل لایا جس میں رجوع ہے۔ جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ یہ دن ہے ہمیشہ رہنے کا۔ ان کے لئے وہاں سب کچھ ہے جو وہ چاہیں اور ہمارے پاس اور زیادہ بھی ہے۔

اللہ تعالے کو اپنی جنت میں بسانے کے لئے وہ انسان مطلوب ہے جو اللہ کو نہ دیکھتے ہوئے بھی اس طرح رہے جیسے کوئی اللہ کو دیکھ کر رہتا ہے۔ اللہ کی بڑائی اور اس کے کمالات آدمی کے ذہن پر اس طرح چھا جائیں کہ وہ ہر وقت اس کو یاد آنے لگے۔ اس کا دل خدا کی باتوں سے لبریز رہے اور اس کی زندگی خدا کے گرد گھومنے لگے۔ ایک آقا اپنے اس ملازم سے بہت زیادہ خوش ہوتا ہے جو آقا کی غیر موجودگی میں بھی مکمل طور پر اس کا وفادار بنا رہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو وہ انسان سب سے زیادہ پسند ہے جو اللہ کو نہ دیکھ کر بھی اس طرح رہتا ہو جیسے وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے، جو اللہ کی جنت اور جہنم کو نہ دیکھتے ہوئے بھی اس طرح ان کی طرف دل لگائے رہے جیسے کہ جنت اور جہنم اس کے سامنے کھڑی ہوئی ہیں۔

جس آدمی کے اندر یہ صفات نہ ہوں وہ گویا خدا کی معیاری دنیا کے لئے بے جوڑ ہے۔ وہ ایک ایسی دنیا میں رہنے کے قابل نہیں جہاں کی ہر چیز فطرت کی صراط مستقیم پر چل رہی ہو۔ جنت کی حسین دنیا میں رہنے کا اہل وہی ہے جو خدا کو اس طرح اپنا معبود بنائے کہ وہی اس کی زندگی بن جائے۔ جو اپنے شعور کو اس حد تک ترقی دے کہ اپنے آپ کو اپنے سے الگ ہو کر دیکھنے لگے۔ جو خود مختار ہو کر بھی پابند زندگی گزارے۔ جو آزاد ہو کر بھی اپنی آزادی کو صحیح حدود میں استعمال کرے۔ یہ بلند نظری اور حقیقت پسندی کا وہ مقام ہے جہاں آدمی نفسیاتی پردوں سے باہر آکر سوچتا ہے۔ جہاں وہ اپنے آپ کو ذاتی نگاہ سے نہیں بلکہ حقیقتِ واقعہ کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ جہاں وہ مجبور نہ ہوتے ہوئے بھی ہمہ تن اپنے آپ کو اپنے آقا کے آگے جھکا دیتا ہے۔ جہاں مخالف ترغیبات کے باوجود وہ اپنے آپ کو اللہ کے حدود پر قائم رکھتا ہے۔ جہاں ڈھٹائی کے مواقع ہوتے ہوئے بھی وہ سراپا اپنے کو حق کے آگے ڈال دیتا ہے۔ مالک کائنات کے ظہور کے بعد آدمی کا جو حال ہو گا وہ حال اس کا اسی وقت ہو جاتا ہے جب کہ مالک کائنات ابھی غیب کے پردہ میں ہے۔ آج کی دنیا میں حق پرستی اور معقولیت کی کوئی قیمت نہیں۔ آج ساری قیمت صرف طاقت میں ہے۔ جنت کی دنیا وہ دنیا ہو گی جہاں حق پرستی اور معقولیت قیمت والی چیزیں بن جائیں گی۔ اس لئے اس کا شہری وہی بن سکتا ہے جس نے موجودہ دنیا میں اپنے اندر ایسے انسان کی پرورش کی ہو جو حق کو ماننے والا اور معقولیت کو تسلیم کرنے والا ہے۔ اللہ کی ناپسندیدہ چیزیں گویا اللہ کا "شجرۂ ممنوعہ" ہیں۔ جنت میں قیام

کا اجازت نامہ اسی کو ملے گا جو دنیا میں اپنے عمل سے ثابت کرے کہ وہ آزاد اور خود مختار ہو کر بھی ممنوعہ درخت کے قریب نہیں جاتا۔ جو شخص دنیا کے امتحانی مرحلہ میں یہ ثبوت دے کہ وہ لغو اور تاثیم سے دور رہنے والا آدمی ہے، اسی سے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ جنت کے لغو اور تاثیم سے خالی ماحول میں مناسب طور پر رہ سکے گا۔ جو شخص اس قسم کے ضبط نفس، انسانی شرافت اور بلند کرداری کا ثبوت نہ دے، اس کو جنت میں آبادی کا اہل نہیں قرار دیا جائے گا، بلکہ اس کو دور پھینک دیا جائے گا جہاں وہ محروم اور بے یار و مددگار ہو کر ابد تک عذاب سہتا رہے (انفال ۳۶)

جنت کی تعمیر

آخرت وہ دن ہے جب کہ، قرآن کے الفاظ میں، اشجار خبیثہ کو اس زمین سے اکھاڑ پھینکا جائے گا۔ اور صرف اشجار طیبہ کو یہاں باقی رہنے دیا جائے گا جو خدا کے خصوصی انتظامات کے تحت یہاں ہمیشہ کے لئے پھلیں پھولیں گے۔ زمینی جنت سے برے لوگوں کو نکالنے اور وہاں اچھے لوگوں کو بسانے کا ذکر بائبل میں ان الفاظ میں آیا ہے:

"تو بدکرداروں کے سبب سے بیزار نہ ہو۔ اور بدی کرنے والوں پر رشک نہ کر۔ کیونکہ وہ گھاس کی طرح جلد کاٹ ڈالے جائیں گے۔ خداوند میں مطمئن رہ اور صبر سے اس کی آس رکھ۔ قہر سے باز آ اور غضب کو چھوڑ دے۔ کیوں کہ بدکردار کاٹ ڈالے جائیں گے۔ لیکن جن کو خداوند کی آس ہے، ملک کے وارث ہوں گے۔ تھوڑی دیر میں شریر نابود ہو جائے گا۔ تو اس کی جگہ کو غور سے دیکھے گا، پر وہ نہ ہوگا۔ لیکن حلیم ملک کے وارث ہوں گے۔ اور سلامتی کی فراوانی سے شادماں رہیں گے۔ شریروں کے بازو توڑے جائیں گے۔ لیکن خداوند صادقوں کو سنبھالتا ہے۔ کامل لوگوں کے ایام کو خداوند جانتا ہے۔ ان کی میراث ہمیشہ کے لئے ہوگی۔ جن کو وہ برکت دیتا ہے وہ زمین کے وارث ہوں گے۔ اور جن پر وہ لعنت کرتا ہے وہ کاٹ ڈالے جائیں گے۔ بدی کو چھوڑ دے اور نیکی کر۔ اور ہمیشہ تک آباد رہ۔ کیوں کہ خداوند انصاف کو پسند کرتا ہے۔ اور اپنے مقدسوں کو ترک نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہیں۔ پر شریروں کی نسل کاٹ ڈالی جائے گی۔ صادق زمین کے وارث ہوں گے۔ اور اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے۔ خداوند کی آس رکھ اور اسی کی راہ پر چلتا رہ۔ اور وہ تجھے سرفراز کر کے زمین کا وارث بنائے گا۔

(زبور، داؤد کا مزمور ۳۷)

قیامت کے دھماکے کے بعد جو دنیا بنے گی وہ ہر قسم کی محدودیت اور ناموافق حالات سے پاک ہوگی۔ حدیث میں آیا ہے:

عن ابی سعید، انّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال ینادی مناد انّ لکم ان تصحوا فلا تسقموا ابدا وانّ لکم ان تحیوا فلا تموتوا ابدا وانّ لکم ان تشبوا فلا تھرموا ابدا وانّ لکم ان تنعموا فلا تبأسوا ابدا (مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، آخرت میں ایک پکارنے والا جنت والوں سے پکار کر یہ کہے گا کہ اب تم ہمیشہ تندرست رہو گے کبھی بیمار نہ ہوگے۔ اب تم ہمیشہ زندہ رہو گے کبھی تم کو موت نہ آئے گی۔ اب تم ہمیشہ جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہ ہو گے۔ اب تم ہمیشہ نعمتوں میں رہو گے کبھی محتاج نہ ہو گے۔

قرآن و حدیث میں کثرت سے ایسے اشارے ملتے ہیں جو بتاتے ہیں کہ کس طرح وہ تمام ناخوش گوار اور ناموافق چیزیں آخرت

کی دنیا سے حذف کردی جائیں گی جو آج "گنبد" بن کر ہم کو گھیرے ہوئے ہیں۔ موجودہ دنیا میں آدمی محنت و مشقت کے بعد کوئی چیز پاتا ہے، جنت میں صرف اشتہار (زخرف ۸۱) کسی چیز کو پانے کے لئے کافی ہوگی۔ آخرت کی دنیا ہر قسم کے دکھ اور ہر طرح کے اندیشوں سے بالکل خالی ہوگی (احقاف ۱۳) اہل جنت جب اس کو دیکھیں گے تو پکار اٹھیں گے: الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن (فاطر ۳۴) سب تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے ہم سے غم کو دور کر دیا۔ اسی کے ساتھ زمین کے امکانات کو بڑھانے کے لئے اس کو بڑا کر دیا جائے گا (وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ) اس کی ایک صورت یہ ہے کہ غالباً پہاڑوں اور سمندروں کو ختم کر کے پوری زمین کو سطح کر دیا جائے گا، جس کے اشارے قرآن میں متعدد مقامات پر ملتے ہیں۔ اسی کے ساتھ غالباً اس کے حجم میں بھی اضافہ کر دیا جائے گا۔ اس کی تصدیق موجودہ جغرافی مطالعہ سے بھی ہوتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں ایک مستقل نظریہ توسیع زمین کا نظریہ (Expanding Earth Theory) کے نام سے وجود میں آیا ہے۔ جغرافی ماہرین نے اندازہ کیا ہے کہ پچھلے دو سو ملین سال میں ہماری زمین تقریباً بیس فی صد تک غبارہ کی طرح پھول گئی ہے۔ اور اب بھی پھولتی اور بڑھتی جا رہی ہے:

New Scientist, London, February 8, 1978, p. 389.

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت ہماری موجودہ زمین ہی پر تعمیر ہوگی (زمر ۷۴) آج یہ زمین انسان کے چارج میں ہے اس وقت خدا براہ راست اس کو اپنے قبضے میں لے لے گا (مریم ۴۰) اچھے اور برے ایک دوسرے سے الگ کر دیئے جائیں گے (روم ۱۴) اور زمین کو اللہ اپنے پسندیدہ بندوں کے حوالے کر دے گا (انبیاء ۱۰۵) اس وقت زمین براہ راست خدا کے نور سے جگمگائے گی (زمر ۶۹) زمین پر جنتی ماحول پیدا کرنے کے لئے اس میں بہت سی تبدیلیاں کی جائیں گی (ابراہیم ۴۸) اس کے اوپر سے پہاڑوں کو ختم کر کے ہموار کر دیا جائے گا (طٰہٰ ۱۰۷) دریاؤں اور سمندروں کو سطح زمین کے نیچے کر دیا جائے گا (انفطار ۳) اور اس کے بعد زیر زمین آب رسانی کا نظام قائم کیا جائے گا (تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ) زمین کا آبادی کا رقبہ موجودہ رقبہ سے کئی گنا زیادہ بڑھ جائے گا (انشقاق ۳) ساری زمین ہموار کھلی ہوئی ہو جائے گی (کہف ۴۷) سخت سردی اور سخت گرمی کو ختم کر کے موسموں کو بالکل معتدل کر دیا جائے گا (دہر ۱۳) اس قسم کی اور بہت سی خوشگوار تبدیلیاں کرنے کے بعد زمین پر نہایت عمدہ مکانات، بہترین پارکوں اور باغوں میں بنائے جائیں گے (صف ۱۲) وہاں کا ماحول بے حد ستھرا ماحول ہوگا جو ہر قسم کی لغویات و خرافات سے بالکل پاک ہوگا (واقعہ ۲۵) وہاں اللہ کی بڑائی کے سوا کسی اور کی بڑائی کا چرچا نہ ہوگا (زمر ۷۵) وہاں ہر طرف امن و سلامتی کا ماحول ہوگا (واقعہ ۲۰) وہاں عالی شان کثیر منزلہ عمارتیں ہوں گی (زمر ۲۰) اہل جنت کو ہر قسم کی شاہانہ نعمتیں اور عزت و مرتبہ حاصل ہوگا (دہر ۲۰) وہاں انسان کی تمام مطلوبہ لذتیں مزید اضافہ کے ساتھ موجود ہوں گی (حم سجدہ ۳۱) وہاں کی مشغولیتیں بھی سب کی سب فرحت بخش ہوں گی (یس ۵۵) جب زمین کا یہ نیا انتظام ہوگا تو زمین سے تمام برے انسان اکھاڑ پھینکے جائیں گے (ابراہیم ۲۶) زمین پر صرف وہ لوگ باقی رہیں گے جو موجودہ زندگی میں باقیمت ثابت ہوئے ہوں (رعد ۱۷) جنھوں نے اپنی پہلی زندگی میں عبد صالح کی حیثیت سے زندگی گزاری ہو (انبیاء ۱۰۵) اصل جنت غالباً اسی زمین پر قائم ہوگی مگر اہل جنت کی پہنچ ساری کائنات

تک ہوگی (حدید ۲۱) وہ پوری کائنات میں جہاں چاہیں گے دیکھیں گے اور جس سے چاہیں گے بات کریں گے (صافات ۵۵) وہ جہاں چاہیں گے بآسانی جا سکیں گے (زمر ۷۴)۔ جس طرح آج کی دنیا میں پانی اور ہوا اور روشنی اور دوسرے بے شمار سامان خدائی انتظام کے تحت مسلسل فراہم کئے جا رہے ہیں اسی طرح جنت میں انسان کی تمام مرغوب چیزیں اس کو خدائی انتظام کے تحت فراہم ہوں گی۔

نیو انگلینڈ کے طبی جرنل (Journal of Medicine) میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ صنعتی کثافت نے امریکی باشندوں کی صحت کے لئے طرح طرح کے مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان میں سے ایک کے الفاظ میں یہ ہے:

Industrial pollution has raised the lead content in the bodies of Americans to 500 times the human body's natural level. *The Times of India*, April 29, 1979.

انسانی جسم میں فطری طور پر جست کی جو مقدار ہوتی ہے، اس کے مقابلہ میں امریکیوں کے جسم میں پانچ سو گنا زیادہ جست ہو گیا ہے۔ اور اس کی وجہ صنعتی کثافت ہے، اس قسم کے بے شمار مسئلے ہیں جو موجودہ زمانہ میں صنعتی کثافت نے پیدا کئے ہیں۔ ہماری صنعت اگر ایک طرف ہماری ضرورت کے سامان تیار کرتی ہے تو اسی کے ساتھ وہ پانی کو اور فضا کو اپنی کثافتوں سے بھر دیتی ہے۔ انسان ابھی تک ایسی ٹکنالوجی دریافت نہ کر سکا جو کثافت پیدا کئے بغیر تمدن کی گاڑی چلا سکے۔

قدرت ہماری زندگی کے تمام سامان بے حساب مقدار میں مہیا کرتی ہے اور اس کے لئے ان گنت صنعتیں چلاتی ہے۔ درخت سے لے کر زندہ اجسام تک اور ذرہ سے لے کر شمسی اور کہکشانی مجموعوں تک ہر چیز متحرک ہے، ہر چیز انتہائی پیچیدہ صنعتی نظام ہے جو ہمارے لئے زندگی کے اسباب مہیا کرتا ہے۔ مگر اتنے بڑے پیمانہ پر صنعتی سرگرمیاں جاری ہونے کے باوجود ہمارے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں حرکت ہے مگر شور نہیں۔ یہاں سامان تیار ہو رہے ہیں مگر دھواں نہیں۔ یہاں پرانی چیزیں نئی صورت اختیار کرتی رہتی ہیں مگر کہیں کوئی گندگی نہیں۔ اللہ کی اس عظیم الشان صنعت گاہ میں صرف چند تمدنی چیزیں انسان کے اوپر چھوڑ دی گئی ہیں۔ مثلاً مکان، سواری، برتن، کپڑا، فرنیچر وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی خام اشیاء بنائیں اور ان کو تیار شدہ سامان کی صورت دینے کے لئے بھی اعلیٰ درجہ کے مواقع فراہم کر دئے۔ اور اس کے بعد انسان کے ذمہ یہ کام سپرد کر دیا کہ وہ ان کو استعمال کر کے اپنے لئے تمدنی اشیاء تیار کرے۔

نظام کائنات میں انسان کی اس محدود شرکت نے خشکی اور تری کو کثافتوں سے بھر دیا ہے۔ آخرت میں جب جنتی دنیا بنے گی تو تمدن کی تعمیر کا کام بھی اللہ براہ راست اپنے انتظام میں لے لے گا۔ آج ہم اپنے "مکانات" خود بناتے ہیں۔ اس وقت بنے بنائے مکانات (زمر ۲۰) ہم کو خدا کی طرف سے مہیا کئے جائیں گے جس طرح آج بھی بے شمار قدرتی چیزیں بنی بنائی حالت میں ہم کو دی جا رہی ہیں۔ اس وقت ایسی سواریاں دی جائیں گی جو بے حد تیز رفتار ہوں گی مگر وہ زمین کی مانند ہوں گی جو ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ رہی ہے مگر کوئی شور نہیں کرتی۔ اس وقت تمدنی کارخانے قائم ہوں گے۔ مگر وہ درخت کے کارخانہ کی مانند ہوں گے جو فضا کو آلودہ کرنے کے بجائے اس کو آکسیجن سے معطر کرتا رہتا ہے۔ وہاں آدمی کھائے گا اور پئے گا۔ مگر اس کا جسمانی نظام کوئی غلاظت نہیں نکالے گا۔ بلکہ پھول کے نظام کی مانند ہوگا جو اپنے اندر کی کثافت کو خوشبو کی صورت میں خارج کرتا ہے۔ وہاں ہر قسم کی بہترین سرگرمیاں جاری ہوں گی۔ مگر وہ کسی قسم کی ناخوشگواری

پیدا نہیں کریں گی، نہ اپنے لئے اور نہ دوسروں کے لئے۔

جنت کی شہریت کس کو ملے گی

یہ حسین و لذیذ جنت جو قیامت کے بعد بننے والی ہے، اسی کے شہریوں کا نام مومن و مسلم ہے۔ موجودہ زندگی اسی اہلیت کا امتحان ہے۔ یہاں لوگوں کے اعمال کے مطابق ان کا انتخاب کیا جا رہا ہے۔ جو لوگ اس بات کا ثبوت دیں کہ وہ جنت کے لطیف ماحول میں بسائے جانے کے قابل ہیں، ان کو وہاں کی شہریت عطا کی جائے گی۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جنت میں لوگوں کے منھ سے جو بات نکلے گی وہ یہ کہ خدایا، پاک ہے تیری ذات، اور آپس میں ان کی ملاقات سلام ہوگی۔ اور ان کی آخری بات یہ ہوگی کہ سب خوبی اللہ کے لئے ہے (یونس ۱۰) اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت میں ایک طرف خدا کی بڑائی اور اس کی شکر گزاری کا ماحول ہوگا۔ لوگ اپنے رب کے لئے بہترین جذبات سے سرشار ہوں گے۔ دوسری طرف ان کے درمیان آپس میں جو فضا ہوگی وہ تمام تر سلامتی اور محبت کی فضا ہوگی نہ کہ ضد اور منافست کی۔ ایسی حالت میں جنت کی دنیا میں داخلہ کا مستحق وہی قرار پا سکتا ہے جس نے موجودہ دنیا کی امتحانی مدت میں اپنے عمل سے یہ ثبوت دیا ہو کہ وہ خدا اور اس کے بندوں کے لئے اسی قسم کے اعلیٰ جذبات و کیفیات رکھنے والا انسان ہے۔ حدیث میں ہے کہ جنت میں وہ شخص نہیں جائے گا جس کے اندر رائی کے دانہ کے برابر بھی کبر ہو۔ پوچھا گیا کہ کبر کیا ہے۔ فرمایا: حق کو نظر انداز کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت میں حقیقتوں کے اعتراف کا اور ہر بندۂ خدا کے احترام کا ماحول ہوگا، اس لئے جنت میں آبادکاری کا مستحق وہی شخص ہو سکتا ہے جس نے آج کے امتحانی مرحلہ میں اپنے رویہ سے یہ ثابت کیا ہو کہ وہ حق کو پہچاننے والا اور اس کے آگے جھک جانے والا ہے خواہ اس کے ساتھ کوئی دباؤ شامل نہ ہو۔ اسی طرح وہ انسان کا احترام کرنے والا ہے خواہ وہ اپنے پیچھے دولت اور اقتدار کا زور نہ رکھتا ہو۔ قرآن و حدیث میں جس قسم کے لوگوں کے لئے جہنم کی وعید ہے اور جن کو جنت کی خوش خبری دی گئی ہے، وہ سب گویا وہ اوصاف ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ کس قسم کے لوگ جہنم میں دھکیل دئے جائیں گے اور کون سی خصوصیات رکھنے والے لوگ ہیں جو جنت کے ماحول میں رہنے کے مستحق قرار پائیں گے ——— اسلام کی عبادات اور اعمال سب اسی لئے ہیں کہ وہ آدمی کا تزکیہ کر کے اس کو اس قابل بنائیں کہ وہ جنتی معاشرہ میں بسائے جانے کے قابل ہو سکے۔

ایک ہندستانی صحافی ٹوکیو گیا۔ وہاں ایک گفتگو کے دوران اس کے جاپانی دوست نے اس کو بتایا کہ دودھ کی پیداوار جو اس وقت جاپان میں ہے، اس کے لحاظ سے ہم اپنی آبادی کے صرف دو تہائی حصہ کو دودھ مہیا کر پاتے ہیں۔ ہندستانی نے فوراً کہا کہ آپ لوگ نہایت آسانی سے پوری آبادی کو دودھ فراہم کر سکتے ہیں۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ دودھ کی مقدار جتنی کم ہے، اتنا اس کے اندر پانی ملا دیں۔ جاپانی یہ سنتے ہی فوراً سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے اپنے ہندستانی دوست کے کان میں چپکے سے کہا: اچھا ہوا کہ یہ بات تم نے صرف مجھ سے کہی۔ اس قسم کی تدبیر یہاں عوام میں ہرگز بیان نہ کرنا۔ ورنہ لوگ تم کو قتل کر دیں گے:

"Do not pronounce such remedies here; they will murder you": *Werkend Review*, New Delhi, October 14, 1967.

گویا ایک ایسا شخص جو غذا میں ملاوٹ کا مزاج رکھتا ہو وہ جاپانی معاشرہ میں رہنے کے قابل نہیں۔ جاپانی معاشرہ ایسے کسی آدمی کو قبول نہیں کر سکتا۔ اس چھوٹی سی مثال سے جنت کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ جنت گویا قلوب سلیمہ (شعراء ۸۹) اور نفوس مطمئنہ (فجر ۲۷) کی کالونی ہے۔ وہ ایسے لوگوں کا معاشرہ ہے جو ہر قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہوں۔ اس لئے وہاں کی دنیا میں صرف انھیں لوگوں کو بسایا جائے گا جو دنیا کی امتحانی زندگی میں اس بات کا ثبوت دے چکے ہوں کہ وہ اپنے اندر پیچیدگیوں سے آزاد روح Complex-free soul رکھتے ہیں۔

جنت کا ماحول وہ ماحول ہوگا جہاں ہر طرف خدا کی حمد ہو رہی ہوگی، خدا کی کبریائی کے سوا کسی اور کی کبریائی کا وہاں وجود نہ ہوگا۔ اس لئے وہی لوگ جنت کی دنیا میں رہنے کے قابل قرار پائیں گے جو موجودہ دنیا میں خدا کی حمد اور اس کی کبریائی سے سرشار رہے ہوں۔ اپنی ذات کی کبریائی چاہنے سے جن کا سینہ خالی رہا ہو۔ جنت کی دنیا میں قول و عمل کا تضاد نہ ہوگا۔ وہاں کوئی کسی کو دھوکہ نہ دے گا۔ وہاں کوئی کسی کا استحصال کرنا نہ چاہے گا۔ وہاں کوئی کسی کو آزار نہ پہنچائے گا، اس لئے جنت کا باشندہ وہی شخص ہو سکتا ہے جس نے موجودہ زندگی میں اپنے عمل سے دکھایا ہو کہ وہ شہریت کے ان اعلیٰ معیاروں پر پورا اترتا ہے۔ جنت مکمل طور پر مثبت سرگرمیوں کی دنیا ہوگی۔ اس لئے وہاں کی بستیوں میں رہائش اختیار کرنے کا اجازت نامہ صرف انھیں لوگوں کو ملے گا جنھوں نے آج کی دنیا میں یہ ثبوت دیا ہو کہ وہ خالص مثبت مزاج رکھنے والے لوگ ہیں اور منفی اور تخریبی کارروائیوں سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے۔ جنت کی دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں آدمی دوسروں کی شرارتوں اور نالائقیوں سے محفوظ ہوگا، اس لئے جنت کی آبادیوں میں رہنے کے قابل وہی شخص ہے جس نے دنیا میں یہ ثبوت دیا ہو کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جو دوسروں کو اپنی شرارتوں اور نالائقیوں سے محفوظ رکھنے والا ہے۔ جنت کا ماحول خرافات سے، گندگیوں سے اور فضول چیزوں سے پاک ہوگا، اس لئے جنت کی کالونیوں میں بسانے کے لئے انھیں لوگوں کا انتخاب کیا جائے گا جو اس قسم کی بیہودگیوں سے دور رہنے والے ثابت ہوئے ہوں۔

اہل جنت کی مثال

درخت موجودہ دنیا میں، جنت کے شہریوں کے امثال (Doubles) ہیں۔ قرآن میں ایمان کو درخت سے تشبیہ دی گئی ہے (ابراہیم ۲۴) انسانی وجود کی مثال زمین کی سی ہے۔ توحید کا عقیدہ اس زمین کے لئے بیج کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب ایک آدمی توحید کو اپناتا ہے تو گویا وہ اپنی ہستی کی زمین پر شجرۂ طیبہ کا بیج بوتا ہے۔ اگر زمین تیار ہے تو بیج اگنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی جڑیں انسان کی ہستی میں داخل ہونا شروع ہو جاتی ہیں، اس کی شاخیں اس کے وجود کے چاروں طرف ابھرنے لگتی ہیں۔ جو لوگ کامل شجر بنیں گے وہ یہاں ابدی طور پر نشو و نما پائیں گے۔ اور جو جھاڑ جھنکاڑ ہوں گے ان کو اکھاڑ کر پھینک دیا جائے گا۔

درخت اس لئے وجود میں نہیں آتا کہ دوسروں کے خلاف تقریر و تحریر کی مہم چلائے اور خارجی دنیا میں نظام اشجار قائم کرنے کے لئے توڑ پھوڑ کا طوفان برپا کرے۔ گدھے اور بھیڑئے ممکن ہے ایسا کرتے ہوں مگر درختوں کا

یہ کام نہیں۔ درخت ایک انفرادی وحدت ہے۔ اس کی اپنی خاموش دنیا ہے۔ درخت کا سارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی فطرت میں چھپی ہوئی امکانیات کو بروئے کار لائے۔ وہ زمین اور ہوا اور سورج اور دوسرے بے شمار کائناتی انتظامات سے اپنے لئے غذا حاصل کرتا ہے اور پھر اپنے کو ایک ایسے کامل وجود کی صورت میں کھڑا کرتا ہے جس کی جڑیں زمین میں گہرائی تک جمی ہوئی ہوں اور جس کی شاخیں آسمان تک پہنچ رہی ہوں۔ وہ ایک انتہائی بامعنی وجود ہوتا ہے۔ اس کی جڑوں میں کروروں بیکٹیریا اس لئے مصروف عمل ہوتے ہیں کہ ہوا سے نائٹروجن نکال کر اس کو غذا فراہم کریں۔ مگر کوئی مزدوروں کا مسئلہ (Labour problem) نہیں پیدا ہوتا۔ وہ لکڑی اور پتی اور پھول اور پھل کی تیاری کے لئے ایک عظیم الشان انڈسٹری قائم کرتا ہے۔ مگر اس کی انڈسٹری کوئی فضائی کثافت پیدا نہیں کرتی۔ اس کے برعکس اس کی "چمنیاں" تروتازہ آکسیجن نکال کر فضا کو صحت بخش ہوا سے بھر دیتی ہیں۔ درخت زمین کا حسن ہے۔ وہ ہر موسم میں پھل دیتا ہے۔ وہ بارش کے عمل میں مدد دیتا ہے۔ وہ زمین کے کٹاؤ کو روکتا ہے۔ وہ سایہ اور لکڑی اور کھاد دیتا ہے، تاہم کسی کو اس سے فخر و غرور کا تجربہ نہیں ہوتا۔ وہ کائنات کے مجموعہ میں اس طرح ہم آہنگ ہے کہ دوسروں کو اس سے صرف نفع پہنچے، کسی کو اس سے کسی تکلیف کا تجربہ نہ ہو۔ آدمی درخت پر پتھر پھینکتا ہے اور درخت اس کے بدلے میں اس کے لئے پھل گراتا ہے۔ آدمی درخت کو کاربن دیتا ہے۔ درخت اس کے بدلے میں آکسیجن لوٹاتا ہے۔ وہ ایک کھڑا ہوا باعظمت وجود ہے۔ مگر وہ اپنا سایہ زمین پر ڈال کر اپنے خالق کی کبریائی کا اعتراف کرتا ہے۔ اس کی نفع بخشیاں اس کے دشمن کے لئے بھی اسی طرح کھلی ہوئی ہیں جس طرح اس کے دوست کے لئے۔ درخت، اپنی ابتدائی صورت میں ایک معمولی مادی مجموعہ ہے۔ مگر خدا کی کائنات سے اپنا رزق لے کر، وہ اپنے آپ کو قدرت کے ایک شاہکار کی صورت میں زمین کے اوپر کھڑا کر دیتا ہے۔

درخت دنیا کی زندگی میں مومنین جنت کا تعارف ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ وہ نفوس زکیہ کیسے ہوتے ہیں جن کو اللہ اپنی جنت کی آبادکاری کے لئے چنتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو ایسا بنائیں کہ ان کا سینہ اللہ کی حمد کے سوا ہر حمد سے خالی ہو۔ جو بڑائی کے بجائے عجز کو اپنا کمال سمجھتے ہوں۔ جن کے پاس دوسروں کے لئے نفع رسانی ہو نہ کہ ضرر رسانی۔ جو ہر قسم کے منفی جذبات سے پاک ہو کر خدائی زمین پر لہلہاتے ہوں۔ یہی لوگ جنت کی کالونیوں میں بسائے جائیں گے۔ اور جنت کی لطیف اور نفیس دنیا ایسے ہی لوگوں کے لئے بنائی گئی ہے۔

آخرت میں ایک طرف زمینی زندگی کو ہر قسم کی محدودیتوں سے پاک کر دیا جائے گا، دوسری طرف تمام اشجار خبیثہ (غیر صالح لوگوں) کو یہاں سے اکھاڑ پھینکا جائے گا اور صرف اشجار طیبہ (صالح لوگوں) کو یہاں آبادکاری کا موقع دیا جائے گا۔ اس وقت یہ دنیا، خدا کی مزید نعمتوں کے ساتھ، جنت کی دنیا بن جائے گی۔ ایک طرف خوف و حزن اور دوسری طرف اشجار خبیثہ کے حذف کے بعد جو دنیا بنے گی وہ ایک ایسا سرسبز و شاداب باغ ہوگا جس کو دیکھ کر آدمی کہے گا: کاش میں نے اپنا سب کچھ لٹا کر اس کو حاصل کیا ہوتا۔

دین کا ماخذ قرآن وسنت نہ کہ تاریخ

ایک شخص غریب خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کے لئے زندگی کی صورت صرف یہ تھی کہ اپنی کوششوں پر بھروسہ کرے اور ماحول کے اندر اپنا اعتبار اور اعتماد پیدا کرکے اپنی جگہ بنائے۔ اس نے محنت اور دیانت داری کو اپنا اصول بنایا۔ اس کا طریقہ کامیاب رہا۔ اس نے اپنے عمل سے غیر معمولی ترقی حاصل کی ——— اس نے اپنے لئے بہت بڑا مکان تعمیر کیا۔ باغ اور کھیت بنائے۔ تجارتیں قائم کیں۔ اپنے ساتھی اور مددگار پیدا کئے۔ وہ شخص جس نے زندگی کا آغاز معمولی محنت مزدوری سے کیا تھا، اپنی آخر عمر میں اس نے یہ درجہ حاصل کیا کہ وہ اپنے علاقہ کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ بااثر آدمی بن چکا تھا۔ اس نے اپنے بچوں کو وصیت کی کہ تم لوگ ہمیشہ میری راہ پر چلنا اور بچوں نے قسم کھاکر وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کریں گے۔ یہ ایک امن پسند اور تعمیری مزاج رکھنے والا آدمی تھا۔ تاہم عمر کے آخری حصہ میں کچھ مفسدین نے اس کو مقدمہ بازی میں الجھا دیا۔ دیوانی اور فوجداری دونوں قسم کے مقدمات چلنے لگے۔ یہ مقدمات ابھی جاری تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔

اب جو بچے اس شخص کے وارث بنے، ان کو اپنے سفر کا آغاز وہاں سے ملا جہاں ان کا باپ ان سے جدا ہوا تھا۔ وہ بعد کی تاریخ کے وارث تھے نہ کہ حقیقۃً باپ کے ابتدائی اصولِ حیات کے۔ باپ کے لئے زندگی محنت اور دیانت داری کا نام تھی۔ مگر بیٹوں کو نظر آیا کہ زندگی نام ہے مقدمہ لڑنے اور حریفوں سے ٹکراؤ کرنے کا۔ باپ نے مثبت تعمیر میں زندگی کا راز پایا تھا، بیٹوں کو اغیار کی تخریب میں زندگی کا راز دکھائی دینے لگا۔ باپ نے ساری عمر تعمیر و ترقی کے کاموں میں صرف کی تھی۔ بیٹوں نے اپنی ساری عمر اپنے مفروضہ دشمنوں سے لڑنے بھڑنے میں گزار دی۔ حتیٰ کہ باپ کا اثاثہ بھی اس میں ضائع کر دیا۔ پھر بھی وہ اپنے طور پر یہی سمجھتے رہے کہ وہ باپ کے اسوہ کی تعمیل میں ایسا کر رہے ہیں۔

ایسا ہی کچھ حال موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں کا ہے۔ اسلام کا آغاز ساتویں صدی عیسوی میں ہوا تو اس وقت وہ نام تھا تعلق باللہ کا، فکرِ آخرت کا۔ رسول خدا کے نمونہ کو سامنے رکھ کر زندگی گزارنے کا، اپنے آپ کو فرشتوں کا ہم نشین بنانے کا۔ جہنم سے ڈرنے اور جنت کا مشتاق ہونے کا، اللہ کی عبادت گزاری کا اور بندوں کے ساتھ انصاف اور خیر خواہی کا معاملہ کرنے کا۔ مگر اس آغاز کے بعد اسلام کی ایک دنیوی تاریخ بنی۔ یہ تاریخ چلتی رہی۔ حتیٰ کہ اسلام ساری دنیا میں سب سے زیادہ غالب قوت بن گیا۔ یہ صورت ایک ہزار سال تک قائم رہی۔ اس کے بعد پہیہ دوسرے رخ پر چلنا شروع ہوا۔ دوسری قوموں نے نئی نئی قوتوں سے مسلح ہو کر مسلمانوں کے اوپر غلبہ حاصل کر لیا اور ان کو ہر میدان میں پیچھے دھکیل دیا۔

اس صورت حال سے مسلمانوں کو جھٹکا لگا۔ اس کے ردعمل کے طور پر انیسویں صدی عیسوی میں مسلم ملکوں میں جوابی تحریکیں اٹھنا شروع ہوئیں۔ یہ تحریکیں بظاہر مختلف ناموں سے شروع ہوئیں۔ ان کے پروگرام بھی اکثر اوقات الگ الگ رہے مگر ایک بات سب میں مشترک تھی۔ تقریباً تمام تحریکیں ردعمل کی نفسیات کے تحت پیدا ہوئیں۔ ان کا مقصد کسی نہ کسی طور پر حملہ آور قوتوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ بالفاظ دیگر، وہ "باپ" کی ابتدائی زندگی کے احوال سے متاثر ہو کر نہیں اٹھیں بلکہ وہ باپ کی زندگی کے آخری احوال کے اثر سے پیدا ہوئیں۔ ان کو مثبت فکر نے پیدا نہیں کیا۔ بلکہ منفی جذبات ان کے ابھرنے کا سبب بنے۔ ابتدائی

دور کے مسلمانوں کے لئے اسلام کا مطلب یہ تھا کہ اپنی زندگی کو اللہ کی مرضی پر ڈھالیں تاکہ موت کے بعد آنے والی زندگی میں خدا ان کو جنتوں میں داخل کرے۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لئے اسلام کا مطلب یہ بن گیا کہ دوسروں سے اپنے حقوق و مطالبات کے لئے لڑتے رہیں۔ ایک کا رخ اگر آسمانی چیزوں کی طرف تھا تو دوسرے کا رخ دنیوی چیزوں اور دنیوی حریفوں کی طرف ہو گیا۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے اتنی معقولیت برتی کہ اس فرق کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے اعلان کیا کہ ان کی تحریک ملت کے تحفظ یا اس کے دفاع کی تحریک ہے نہ کہ مطلق معنوں میں پیغمبرانہ مشن کو زندہ کرنے کی۔ تاہم بعض ایسے حوصلہ مند بھی تھے جو اس کمتر حیثیت پر قانع نہ ہوئے۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ وہ جس "انقلابی" مقصد کے لئے اٹھے ہیں وہی اسلام کا اصلی اور ابدی مقصد ہے۔ تمام انبیاء اسی لئے آئے کہ باطل طاقتوں سے لڑیں اور ان سے لڑکر اسلامی قانون کی حکومت قائم کریں۔ اس طرح مذہب ان کی تشریح کے خانہ میں، مذہب جنگ بن گیا۔ ذاتی اصلاح کی تڑپ نے خارجی انقلاب کی تڑپ کی صورت اختیار کر لی۔ گویا بیٹوں کے لئے "مقدمہ بازی" باپ کا وقتی یا اضافی عمل نہ رہا، بلکہ وہی ان کا اصل مقصدِ حیات قرار پایا۔ یہی وہ اصل دین بن گیا جس پر خدا کے یہاں جنت اور جہنم کا فیصلہ ہوتا ہے۔

اسلام کی جدید تاریخ کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ لوگ اسلام کے لئے سرفروشی کر رہے ہیں حالاں کہ وہ اسلام سے بہت دور ہیں۔ وہ خدا کا نعرہ بلند کر رہے ہیں حالاں کہ وہ ابھی تک خدا سے متعارف ہی نہیں ہوئے۔ اسلام کے نام پر ایسی تحریکیں وجود میں آئی ہیں جنھوں نے کام یہ سمجھا ہے کہ وہ کسی نہ کسی مفروضہ دشمن سے ٹکراتی رہیں۔ اس ٹکراؤ کو وہ دین و ملت کا کام سمجھتی ہیں۔ کوئی بیرونی استعمار سے متصادم ہے۔ کوئی غیر مسلم اکثریت کے خلاف احتجاجی سیاست چلا رہا ہے۔ کوئی اپنے ملک کے مسلم حکمراں کو اقتدار سے ہٹانے اور اس کے ساتھیوں کو گولی مارنے میں جنت کی خوشبو پا رہا ہے۔ لڑائی والا دین ہر ایک کی سمجھ میں آرہا ہے۔ مگر سیدھا اور سچا دین جو خدا نے اپنے رسول کی معرفت بھیجا تھا وہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ مذکورہ مثال کے مطابق، اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے اپنی دینی فکر کا آغاز "مقدمہ بازی" کے مرحلہ سے کیا۔ وہ "محنت اور دیانت داری" کے مرحلہ سے اپنے فکر کا آغاز نہ کر سکے۔

اس صورت حال کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ دین اختیار کرنے کے باوجود آدمی اسی اصلی چیز سے محروم رہ گیا جو دین کا حقیقی مطلوب تھا۔ اس کے نتیجہ میں دین داری ایک خارجی عمل بن گیا۔ حالاں کہ دین داری تمام تر ایک اندرونی عمل ہے۔ اب کوئی اپنے اندر جھانکنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ البتہ دوسروں کے بارے میں گرماگرم مباحثے ہر جگہ جاری ہیں۔ اپنے قریب ایک شخص پر ظلم ہو رہا ہو گا مگر اس کی نہ اسے خبر ہو گی اور نہ اس میں اپنا حصہ ادا کرنے کی فرصت۔ البتہ دور کے مقامات پر ہونے والے واقعات سے وہ انتہائی حد تک باخبر ہو گا تاکہ ٹرنک کال کے ذریعہ اس سے رابطہ قائم کرے اور ہوائی جہاز پر اڑ کر فوراً وہاں پہنچے۔ ایسے کاموں سے کسی کو دلچسپی نہیں جن میں قلبی اہمیت ہے۔ البتہ وہ کام جن میں اخباری اہمیت (نیوز ویلو) ہے، ان کے لئے سرگرمی دکھانے میں ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ کسی کو یہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اپنے نفس کے اندر چھپی ہوئی برائیوں سے لڑے۔ البتہ باہر کی برائیوں پر بیان دینے اور تقریر کرنے میں کوئی پیچھے نہیں رہنا چاہتا۔ اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے دین کا صحیح تصور نہ ہونے کا۔

اسلامی جہاد کیا ہے

جہاد کو اسلام میں افضل ترین عبادت کہا گیا ہے۔ اس لئے ہر ایک اپنی سرگرمیوں کو افضل ترین عمل کا درجہ دینے کے لئے اس کو جہاد کا نام دے دیتا ہے۔ کوئی ملّت کے مادی حقوق کے لئے دوسری قوموں کے خلاف احتجاج اور مطالبات کی مہم جاری رکھے ہوئے ہے اور اس کو اسلامی جہاد کہہ رہا ہے اور کوئی آزادیٔ قوم اور استخلاص وطن کے لئے لڑائی لڑنے کو۔ کوئی حکومتِ اسلامی کے قیام کے نام پر مسلمانوں کے اندر باہمی قتل وخون جاری کرنے کو جہاد قرار دے رہا ہے اور کوئی بدعت اور مشرکانہ رسوم کے خلاف مناظرہ اور مجادلہ کرنے کو۔ کوئی دوروں اور تقریروں کے مظاہرے کرکے مجاہدِ اسلام کا لقب لے رہا ہے اور کوئی اسلام کو دنیوی ہنگاموں کا موضوع بنا کر۔ مگر یہ تمام صورتیں جہاد کے لفظ کو غلط استعمال کرنے کی صورتیں ہیں۔ یہ اسلامی جہاد نہیں ہے۔ بلکہ جہاد کے نام پر اسلام کو قتل کرنا ہے۔ یہ خود اللہ کی راہ کے خلاف جہاد ہے نہ کہ اللہ کی راہ میں جہاد۔

قوم و وطن کی پکار اسلام کے نزدیک جاہلیت کی پکار ہے پھر اس کو اسلامی جہاد کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کے لئے دوسری قومیں مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں اور مدعو اقوام سے دنیوی اجر کا طالب ہونا صریح طور پر سنت انبیاء کے خلاف ہے پھر اس قسم کے حقوق کے لئے مطالباتی مہم چلانا جہاد کس طرح ہو سکتا ہے۔ جدال اور مناظرہ سے اسلام میں صریح طور پر منع کیا گیا ہے اور حکمت اور نصیحت کے ساتھ تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے۔ ایسی حالت میں بحث و جدال کے اکھاڑے قائم کرنا کیوں کر خدا کا مطلوبہ جہاد ہو سکتا ہے۔ اسلام کے نام پر جلسوں اور جلوسوں کی دھوم مچانا اور دنیوی نشانوں کے لئے تحریکیں برپا کرنا رسول اور اصحاب رسول کے طریقہ کے بالکل خلاف ہے۔ پھر ایسے خلاف سنت کام کو اسلامی جہاد کا نام دینا کس طرح صحیح ہوگا۔ مسلمانوں کے درمیان باہمی لڑائی کو ہر حال میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ جمہور کا اتفاق ہے کہ مسلم حکمرانوں کے خلاف بغاوت کرنا اور ان کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے جنگ کرنا حرام ہے۔ خواہ ان کی امارت بجبر قائم ہوئی ہو اور خواہ مسلم حکمراں فاسق اور ظالم ہی کیوں نہ ہو (امام نووی، شرح مسلم) ایسی حالت میں "ظالم" حکمراں کو ہٹانے کے نام پر مسلمانوں کا دو جتھوں میں تقسیم ہونا اور باہم ایک دوسرے کے خلاف جنگ کرنا کیوں کر وہ چیز ہو سکتی ہے جس کو جہاد فی سبیل اللہ کہا جائے۔ حدیث میں بلاشبہ ظالم سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنے کو افضل الجہاد بتایا گیا ہے مگر اس سے مراد ظالم حکمراں کے سامنے حق کی ایک بات کہنا ہے نہ کہ اس کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی مہم چلانا۔

جہاد کے معنی عربی زبان میں ہیں: بھرپور کوشش کرنا، پوری طاقت صرف دینا۔ یہ لفظ، عمومی استعمال میں، ایسے موقع کے لئے بولا جاتا ہے جب کہ کسی مقصد کے حصول کے لئے اپنی ساری کوشش لگا دی جائے۔ قرآن میں ہے اقسموا باللہ جھد ایمانھم (فاطر ۴۲) یعنی بہت زور لگا کر قسم کھانا۔ وان جاھداک علیٰ ان تشرک بی (لقمان ۱۵) یعنی مشرکانہ طریقہ پر قائم رکھنے کے لئے بہت کوشش کرنا۔ جاھدوا فینا (عنکبوت ۶۹) یعنی اللہ کے لئے مشقتیں جھیلنا۔ لایجدون الا جھدھم (توبہ ۷۹) یعنی محنت کی کمائی۔ ان استعمالات سے اسلامی جہاد یا جہاد فی سبیل اللہ کا مطلب

سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے اللہ کے دین کو اختیار کرنے کے بعد اس کی راہ میں وہ ساری محنت وقوت صرف کی جائے جس کی خدا کے دین کو ضرورت ہو۔

اللہ کا دین کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی اللہ کو خالق اور مالک اور معبود تسلیم کرے۔ وہ اپنی محبت اور عقیدت میں خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔ وہ اسی سے ڈرے اور اسی پر ہر قسم کا اعتماد کرے۔ اللہ کو آدمی جب اس طرح اپنی نفسیات میں شامل کرتا ہے تو اس کے بعد اس کے اندر ایک نئی زندگی وجود میں آتی ہے۔ اب اس کے لئے سب سے زیادہ قابل اطاعت چیز وہ ہو جاتی ہے جو اللہ کے رسول کے ذریعہ اس کو ملی ہو۔ اس کے لئے سب سے زیادہ اہم بات یہ ہو جاتی ہے کہ وہ خدا کے یہاں عزت اور خوشی پانے کو اصل کامیابی سمجھے اور دنیا کی کامیابی اس کی نظر میں بے وقعت ہو جائے۔ خدا اور رسول کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کو وہ جنت کی طرف چلنا سمجھتا ہے۔ اور اس کے خلاف چلتے ہوئے اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ جہنم کے شعلوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کی توجہات کا مرکز اللہ بن جاتا ہے۔ اس کی عبادتیں اللہ کے لئے خاص ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے اخلاق اور معاملات میں اللہ کے حرام وحلال کا لحاظ کرنے لگتا ہے۔ خدا اپنے تمام جلال وجبروت کے ساتھ اس کا نگراں بن جاتا ہے جس کی نگرانی میں وہ اپنی تمام زندگی گزارتا رہتا ہے، یہاں تک کہ مرکر اس کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں آدمی ہر وقت نفسانی ترغیبات کے زیر اثر رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اس دنیا میں اکثر شیطان کا اور باطل پرستوں کا غلبہ رہتا ہے۔ یہی صورت حال اس چیز کی ضرورت پیدا کرتی ہے جس کو جہاد کہا گیا ہے۔ آدمی کو ہر قسم کی ترغیبات اور رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے دین پر قائم رہنا پڑتا ہے۔ اس کو ایک غیر خدائی دنیا میں خدا والا بن کر جینا پڑتا ہے۔ اپنے کو دیندار بنانے کے لئے اپنے کو مجاہد بنانا پڑتا ہے۔ دین پر قائم رہنے کے لئے انھیں غیر معمولی کوششوں کا نام جہاد ہے۔

قرآن میں اسلامی جہاد کا لفظ تین مواقع کے لئے استعمال کیا گیا ہے: استقامت، دعوتی جدوجہد اور قتال فی سبیل اللہ۔ جہاد اولاً اس بات کا نام ہے کہ اللہ کے دین کو اختیار کرنے میں جو مشکلات پیش آئیں ان کو جھیلتے ہوئے اپنے آپ کو دین پر قائم رکھا جائے۔ مال کا نقصان ہو تو اس کو برداشت کیا جائے۔ عزت اور حیثیت کو خطرہ ہو تو اس کو گوارا کیا جائے۔ جسمانی تکلیف پہنچے تو اس پر صبر کیا جائے۔ نفس کو روکنے اور دبانے کی ضرورت ہو تو اس سے دریغ نہ کیا جائے۔ حالات کی کوئی بھی شدت آدمی کو حق کی راہ سے ہٹانے والی ثابت نہ ہو:

مَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ اللَّهِ فَإِنَّ أَجَلَ اللَّهِ لَآتٍ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۔ وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ (عنکبوت ۵ ـ ۷)

جو شخص اللہ سے ملاقات کی امید رکھتا ہے تو اللہ کا وعدہ یقیناً آنے والا ہے اور وہ سنتا اور جانتا ہے اور جو شخص محنت اٹھائے تو وہ اپنے ہی لئے محنت اٹھاتا ہے۔ اللہ کو جہان والوں کی حاجت نہیں۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو ہم ان کی برائیاں ان سے دور کر دیں گے اور بدلہ دیں گے

ان کو بہتر سے بہتر کاموں کا۔

اس جہاد کا میدان جنگ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ زندگی کے ہر میدان میں ہر وقت جاری رہتا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا ہے:

ان الرجل لیجاهد وما ضرب یوما من الدهر بسیف (تفسیر ابن کثیر، ثالث ۲۹)

آدمی بلاشبہ مجاہد ہوتا ہے حالاں کہ وہ کبھی ایک دن کے لئے بھی تلوار نہیں چلاتا۔

جہاد کی دوسری صورت وہ ہے جو اللہ کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے کی جاتی ہے۔ یہ ایک مشکل ترین کام ہے اور سخت ترین جد و جہد کے ذریعہ اس کو انجام دینا پڑتا ہے۔ اسی لئے قرآن میں دعوتی مہم کو جہاد کہا گیا ہے:

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا فَاَبٰى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا۔ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا۔ (فرقان ۵۰–۵۲)

اور ہم نے ان کے درمیان طرح طرح سے نصیحت بیان کی تاکہ وہ دھیان کریں۔ مگر اکثر لوگوں نے انکار ہی کیا اور اگر ہم چاہتے تو ہم ہر بستی میں کوئی ڈرانے والا اٹھاتے۔ پس تو منکروں کا کہا نہ مان اور قرآن کے ذریعہ ان پر خوب کوشش کر۔

یہ دعوت و تبلیغ امت مسلمہ کا اصل مشن ہے۔ ختم نبوت کے بعد امت کی یہ لازمی ذمہ داری ہے کہ دنیا کی تمام قوموں تک خدا کے پیغام کو پہنچائے، اس کے لئے ہر قسم کی مشقتوں کو برداشت کرے اور وقت اور مال سے لے کر جسم و جان کی تمام طاقتوں کو اس کی راہ میں لگا دے:

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَى النَّاسِ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝ (حج آخر)

اور اللہ کے کام میں خوب کوشش کرو جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے۔ اس نے تم کو چن لیا ہے، اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ تمھارے باپ ابراہیم کی ملت۔ اللہ نے تمھارا نام مسلم رکھا ہے پہلے سے اور اس قرآن میں۔ تاکہ رسول تم پر بتانے والا ہو اور تم لوگوں پر بتانے والے بنو۔ پس نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ کو مضبوط پکڑو۔ وہی تمھارا کارساز ہے۔ پس کیسا اچھا کارساز ہے اور کیسا اچھا مددگار۔

جہاد کی تیسری صورت قتال ہے۔ اہل ایمان مخالفوں کی طرف سے آئی ہوئی مصیبتوں پر صبر کرتے ہیں۔ وہ ہر طرح کی مشقتیں برداشت کرتے ہوئے دعوت الی اللہ کا کام جاری رکھتے ہیں۔ تاہم کبھی ایسا ہوتا ہے کہ منکرین حق عمومی قسم کی مخالفانہ کارروائیوں سے گزر کر جنگ و قتال کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں جب ان کی طرف سے ابتدار (توبہ ۱۳) ہو جائے۔ (الجهاد ان تقاتل الكفار اذا لقيتم، ترغیب و ترہیب) نیز اہل اسلام اپنی تنظیم اور اپنے وسائل اور مواقع کے لحاظ سے اس پوزیشن میں ہوں کہ کامیاب دفاع کر سکیں تو وہ مخالفین کے جنگی چیلنج کا جواب میدان جنگ میں دیتے ہیں۔ یہ جنگ اہل ایمان کے لئے معروف قسم کی کوئی جنگ نہیں ہوتی۔ یہ دراصل ان کے صبر و استقامت کا ایک امتحان ہوتا ہے جو حالات کے اعتبار سے کبھی انھیں پیش آتا ہے۔ اہل ایمان اپنے ایمان پر قائم رہتے ہوئے اور اپنی

دعوتی ذمہ داریوں کو انجام دیتے ہوئے اول دن سے ایک "جنگ" سے دوچار رہتے ہیں۔ یہ جنگ ابتداءً اپنے نفس کے محرکات سے، شیطان کی ترغیبات سے اور گرد وپیش کے مخالفانہ حالات کے مقابلہ میں ہوتی ہے۔ عمومی الفاظ میں اس کو صبر کہا جاتا ہے۔ یہ صبر اور مصابرت جب بعض حالات میں شدید تر صورت اختیار کرے تو اسی کا نام جہاد ہے۔ یہ آدمی کے ایمان اور استقامت علی الحق کا شدید ترین امتحان ہے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دشمن سے جنگ کی تمنا نہ کرو۔ البتہ اگر جنگ پیش آجائے تو پوری پامردی کے ساتھ مقابلہ کرو (لا تتمنوا لقاء العدو واسألوا اللہ العافیۃ فاذا لقیتم فاصبروا، متفق علیہ) جہاد بالسیف کے سلسلہ میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے:

انفروا خفافا وثقالا وجاھدوا باموالکم وانفسکم فی سبیل اللہ ذٰلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون ۝

اے ایمان والو نکلو ہلکے اور بھاری اور لڑو اپنے مال سے اور اپنی جان سے اللہ کی راہ میں۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔

توبہ - ۴۱

حدیث کے الفاظ میں، جنت کو مکروہات سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ ایک آدمی جب جنت کی طرف اپنا سفر شروع کرتا ہے تو اس کو بے شمار قسم کے ناموافق حالات اور رکاوٹوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ان دشواریوں اور ناخوش گواریوں کو عبور کرکے اپنا سفر جاری رکھنے میں جو محنت صرف کرنی پڑتی ہے اسی کا نام جہاد ہے ——

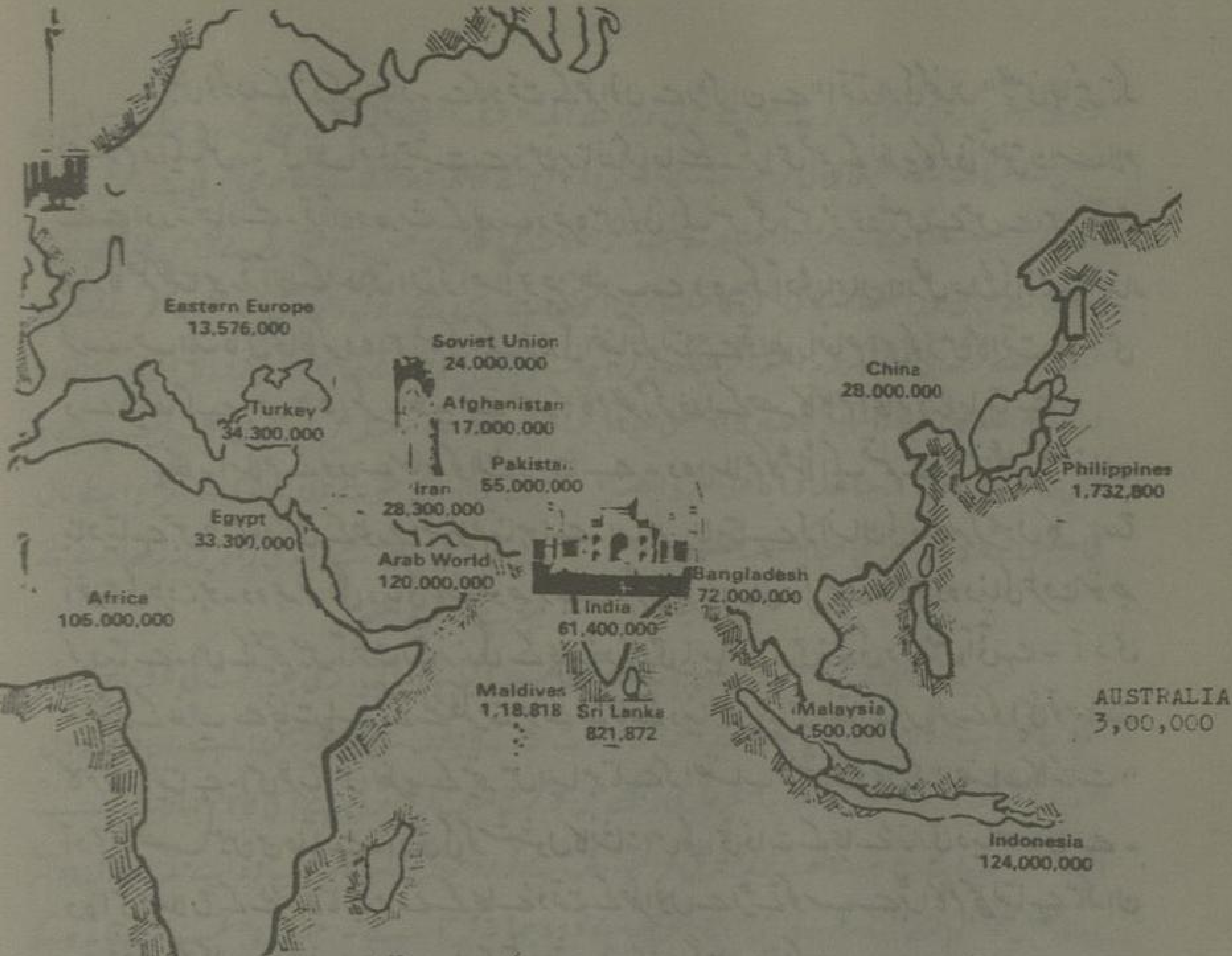
ایک شخص جب اپنے بنے ہوئے نقشہ کو توڑ کر حق کو اختیار کرتا ہے تو وہ جہاد کرتا ہے۔ جب وہ اپنے مقابلہ میں دوسرے کے فضل کا اعتراف کرنے کے لئے اپنی "انا" کو کچلتا ہے تو وہ جہاد کرتا ہے۔ جب وہ "غیب" کے فائدہ کے شوق میں ظاہری عزت اور فائدہ کو قربان کرتا ہے تو وہ جہاد کرتا ہے۔ جب وہ الفاظ کا ذخیرہ ہوتے ہوئے خدا کے خوف سے اپنی زبان کو بند کرلیتا ہے تو وہ جہاد کرتا ہے، جب وہ خدا کی خاطر شہرت کے راستوں کو چھوڑ دیتا ہے اور گمنامی کے راستوں کو اپنے لئے پسند کرلیتا ہے تو وہ جہاد کرتا ہے۔ اسی طرح پوری زندگی میں آدمی آسانی کے مقابلہ میں دشواری کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ اپنی انا کو غذا دینے کے بجائے اپنی انا کو مارتا ہے۔ وہ مشکلات کو عذر بنانے کے بجائے مشکلات کو عبور کرنے کے لئے اپنی ساری طاقت لگا دیتا ہے۔ یہی جہاد ہے جو مومن کی پوری حیات میں جاری رہتا ہے۔ اسی جدوجہد کا ایک امکانی مرحلہ جنگ ہے۔ تاہم عام جہاد اور جنگ میں یہ فرق ہے کہ عام جہاد تو ہر حال میں اور ہر مومن کی زندگی میں ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ جب کہ جنگ مخصوص حالات میں پیش آتی ہے اور مخصوص شرائط کی تکمیل کے بعد لڑی جاتی ہے۔ ان حالات اور ان شرائط کے بغیر اگر کوئی جنگی جہاد شروع کردے تو وہ جہاد نہیں ہوگا بلکہ فساد ہوگا جس سے اللہ اور اس کا رسول بری ہیں۔

جہاد غیر خدا پرست دنیا میں خدا پرست بننے کی کوشش ہے۔ یہ ایک طرف اپنے آپ کو نفس اور شیطان کی ترغیبات سے روکنا ہے اور دوسری جانب خارج سے سامنے آنے والی رکاوٹوں کی مزاحمت کرتے ہوئے اپنے رب کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھنا ہے۔ فتنوں سے بھری ہوئی دنیا میں ایک بندہ اپنے رب کے راستہ پر چلنے کے لئے جو کوشش کرتا ہے اسی کا نام جہاد ہے جو کبھی آدمی کے اپنے اندر ہوتی ہے اور کبھی اس کے باہر۔

بعض لوگوں کے نزدیک جہاد یہ ہے کہ وقت کے حکمرانوں سے لڑ کر ان سے "اقتدار کی کنجیاں" چھینی جائیں تاکہ اسلام کو ایک مکمل ریاستی نظام کی حیثیت سے زمین پر نافذ کیا جا سکے۔ مگر اس قسم کے نظریہ کا کوئی تعلق نہ اسلام سے ہے اور نہ جہاد سے۔ قرآن و حدیث کے پورے ذخیرہ میں کوئی ایک نص بھی ایسی موجود نہیں ہے جس سے اس انقلابی جہاد کا حکم نکلتا ہو۔ قرآن کے مطابق اللہ کو اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ آدمی ایمان اور عمل صالح کی زندگی اختیار کرے۔ جب ایک قابل لحاظ گروہ اس قسم کی ایک زندگی اختیار کر لیتا ہے تو بطور انعام اس کو زمین کا اقتدار بھی دے دیا جاتا ہے (نور ۵۵) مگر یہ نظریہ اپنے حصہ کا کام چھوڑ کر خدا کے حصہ کا کام انجام دینا چاہتا ہے۔

یہ نظریہ اسلام کے پورے معاملہ کو الٹ دیتا ہے۔ وہ اسلام کو عملاً ایک قسم کے سیاسی عمل کا عنوان بنا دیتا ہے جس طرح، مثال کے طور پر، کمیونزم بنا ہوا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان کی تمام سرگرمیوں کا رخ آخرت کی طرف ہو۔ وہ ہمہ تن اگلی دنیا کی طرف متوجہ ہو جائے۔ مگر یہ نظریہ انسانی سرگرمیوں کو موجودہ دنیا کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں آخرت رخی زندگی کے بجائے دنیا رخی یا سیاست رخی زندگی وجود میں آتی ہے۔ آدمی آخرت کے عذاب سے نجات پانے کے لئے فکر مند ہونے کے بجائے دنیا میں سیاسی انقلاب برپا کرنے کو اپنی توجہات کا مرکز بنا لیتا ہے۔ اسی طرح اس نظریہ کے نتیجہ میں ایسا ہوتا ہے کہ احتساب خویش کے بجائے "احتساب کائنات" آدمی کا نصب العین بن جاتا ہے۔ آدمی کی کوششوں کا نشانہ اس کی اپنی ذات کے بجائے خارجی دنیا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی اصلاح کے لئے بے تاب ہونے کے بجائے وقت کے حکمرانوں سے لڑنے کو سب سے بڑا کام سمجھ لیتا ہے تاکہ ان سے "اقتدار کی کنجیاں" چھین لے اور اسلام کو تمام شعبہ ہائے زندگی میں نافذ کر دے۔

یہ "مکمل اسلام" اس قدر ناقص اسلام ہے کہ اسلام کا کوئی ایک جز بھی اس کے اندر صحیح طور پر اپنی جگہ نہیں پاتا۔ افراد کے اندر سیاسی مزاج پیدا کر کے وہ آدمی کو اس کی سب سے بڑی نعمت (اللہ کی قربت) سے محروم کر دیتا ہے۔ ایسے آدمی کا ذہن بے معنی سیاسی بحثوں میں مشغول ہوتا ہے نہ کہ یاد الٰہی میں۔ ایسے لوگوں کا نشانہ عین اپنے مزاج کے تحت حکومت بن جاتی ہے۔ موقع پاتے ہی وہ حکمراں گروہ کے مقابلہ میں حزب مخالف کا کردار ادا کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ملت کو دو متحارب گروہوں میں بانٹ کر پورے ملک کو قتل اور فساد سے بھر دیتے ہیں۔ سب سے زیادہ برا پھل جو اس نام نہاد مکمل اسلام سے نکلتا ہے وہ دین حق کی الٹی شہادت ہے۔ اللہ کا دین اللہ کے بندوں کے لئے رحمت ہے۔ وہ اس لئے آیا ہے کہ آدمی کو جنت کی فضاؤں کا تعارف کرائے۔ مگر اس نظریہ کے نتیجہ میں دین کی جو تصویر بنتی ہے وہ یہ کہ دین نام ہے آپس کی لڑائی کا، دین کے نام پر دنیوی ہنگامے کرنے کا۔ کوڑا مار سیاست اور گولی مار حکومت کا۔ یہ تصویر اتنی قبیح ہوتی ہے کہ لوگ پکار اٹھتے ہیں ـــــــ "اگر اسی کا نام اسلام ہے تو غیر اسلام ہمارے لئے زیادہ اچھا ہے"



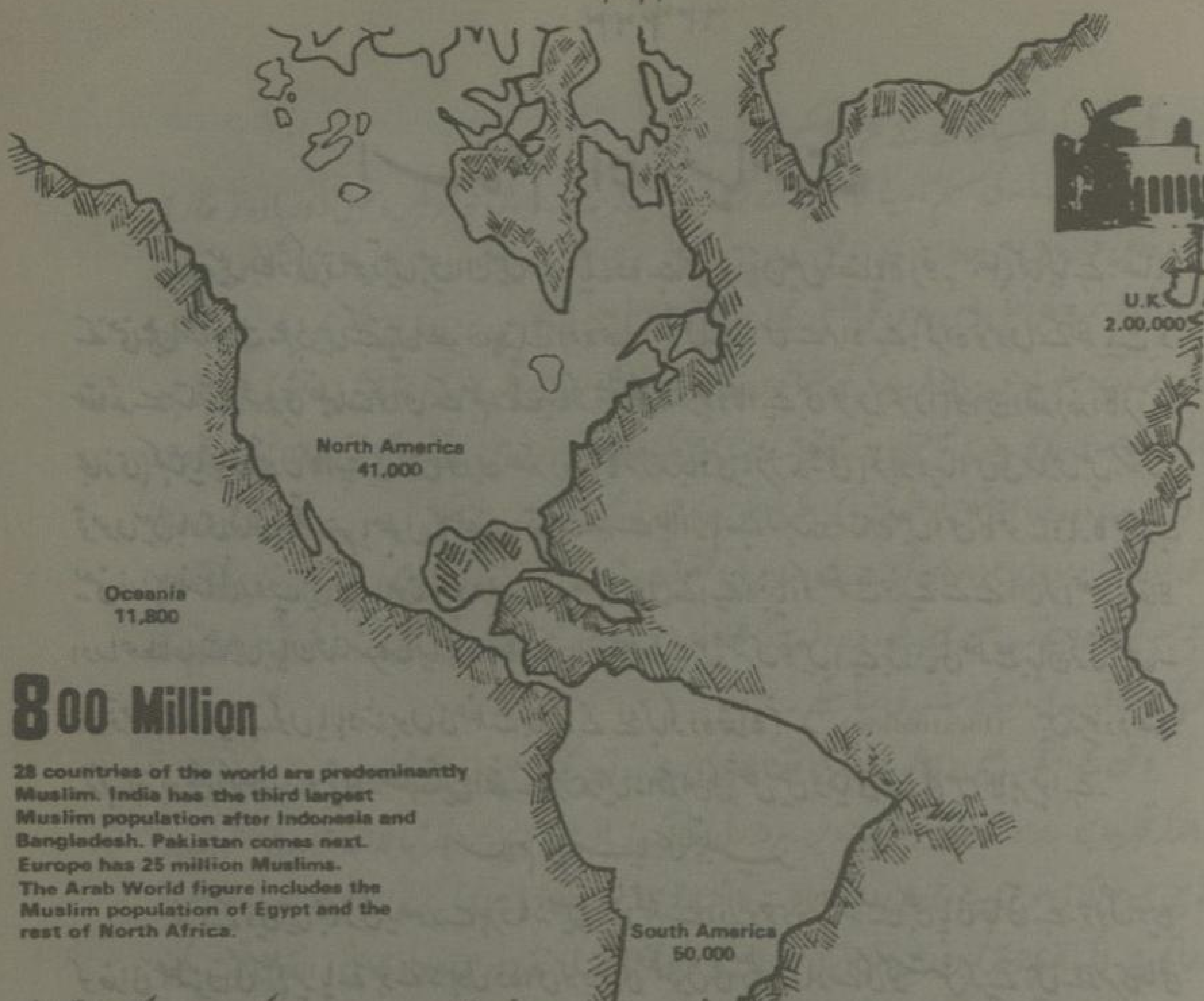
تقریباً ۳۰ سال پہلے کی بات ہے۔ راقم الحروف نے کسی مسلم اخبار میں ایک تصویر دیکھی۔ یہ تصویر بیت المقدس کی تھی۔ اس تصویر کے نیچے جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا:

"ارضِ مقدس جس پر چالیس کروڑ مسلمانوں کی جانیں قربان ہیں"

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے، پچھلے برسوں میں، بے شمار تعداد میں ارض مقدس پر اپنی جانیں قربان کر دی ہیں۔ مگر عملاً نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔ ۳۰ سال پہلے ارض قدس کی جتنی زمین یہودیوں کے قبضہ میں تھی، آج اس کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ رقبہ پر وہ اپنا اقتدار قائم کر چکے ہیں۔ مزید حیرت یہ ہے کہ اس تیس سالہ مدت میں مسلمانوں کی تعداد ساری دنیا میں ۴۰ کروڑ سے بڑھ کر ۸۰ کرور ہو چکی ہے۔ مگر اپنے "دشمنوں" کے مقابلہ میں وہ کہیں بھی کوئی حقیقی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

تعداد کی کثرت اور تحریکوں کے ہجوم کے باوجود مسلمان کیوں ناکام ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ وہ اپنے اصل فریضۂ منصبی کو ادا نہیں کر رہے ہیں۔ مسلمان کے ساتھ خدا کے تمام اجتماعی وعدے اس شرط پر ہیں کہ وہ دنیا میں اُس اجتماعی کام کو انجام دیں جس کے لئے انھیں چنا گیا ہے۔ اگر وہ اِس کام کے لئے نہ اٹھیں تو وہ خدا کی نظر میں مجرم ہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ یہ کام کیا ہے۔ یہ کہ وہ تمام انسانوں کو اللہ کا پیغام پہنچائیں۔ پیغام رسانی کا یہ کام کوئی قومی کام نہیں ہے، نہ اس کا سیاسی اور اقتصادی مفادات سے کوئی براہ راست تعلق ہے۔ یہ ایک خالص خدائی اور اخروی کام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو امتحان کے لئے پیدا کیا ہے۔ دنیا میں ایک وقت تک زندگی کا موقع دینے کے بعد وہ تمام انسانوں کو آخرت میں حاضر

ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا



کرے گا اور وہاں ان کے عمل کے مطابق ان کے لئے دائمی جنت یا دائمی جہنم کا فیصلہ کرے گا۔

خدا اگرچہ اپنے بندوں کے احوال سے خوب واقف ہے مگر اس نے اپنی اس عدالت کے لئے جو طریقہ مقرر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ہر زمانہ میں خود انسانوں میں ایسے لوگ اٹھیں جو خدا کی طرف سے لوگوں کو آنے والے یوم الحساب سے باخبر کریں۔ یہ لوگ جو دنیا میں قوموں کو خدا کا پیغام پہنچائیں گے، یہی آخرت میں ان کے اوپر خدا کے گواہ بنیں گے۔ وہ آخرت کی عدالت میں کھڑے ہو کر کہیں گے کہ کس نے پیغام خداوندی کو مانا اور کس نے اس کا انکار کیا۔ ان کی گواہی کے مطابق خدا ہر ایک کے اوپر اپنا فیصلہ صادر کرے گا۔

مسلمانوں کا اصل جرم یہ ہے کہ وہ اپنی اس حیثیت کو بھول گئے ہیں۔ وہ قوموں کے اوپر خدا کے گواہ بن کر نہیں کھڑے ہو رہے ہیں۔ خدا کو اپنی سنت کے مطابق اپنی عدالت کے لئے گواہ مطلوب ہیں (وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ آل عمران ۔ ۱۴۰) مگر سارا عالم اسلام اس ذمہ داری کو بھولا ہوا ہے۔ وہ اس خدائی منصوبہ میں اپنے کو شامل نہیں کر رہا ہے۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا ہے، بجائے کہ وہ خدا کی نصرتوں کے مستحق قرار پائیں۔

پچھلے برسوں میں پٹرول کی قدرتی طاقت نے بلاشبہ مسلم دنیا کو کافی سہارا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خداداد خزانہ اگر ظاہر نہ ہوا ہوتا تو مسلمان، حالیہ صدیوں میں اپنی بے حساب نادانیوں کی وجہ سے، آج بین اقوامی اچھوت کی سطح پر پہنچ چکے ہوتے۔ ہماری نام نہاد انقلابی تحریکیں کسی بھی درجہ میں ہم کو بچانے والی ثابت نہیں ہو سکتی تھیں۔

اسلام اور سیاست

دین میں بگاڑ کی جو صورتیں ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جس کو قرآن میں مضاہاۃ (توبہ ۳۰) کہا گیا ہے۔ مضاہاۃ کے معنی ہیں مشابہت۔ عربی میں کہتے ہیں ھو ضھیاك (وہ تمہارا ہم شکل ہے) اس سے مراد ہے: گمراہ قوموں کے نظریات و عقائد سے متاثر ہو کر دینی تعلیمات کو ان کے ہم رنگ بنا کر پیش کرنا۔ یہود کا اپنے نبی عزیر (عزرا) کو ابن اللہ (خدا کا فرزند مجازی) کہنا یا عیسائیوں کا اپنے نبی مسیح کو ابن اللہ (خدا کا فرزند مجازی یا فرزند حقیقی) قرار دینا اس کی مثالیں ہیں۔ مشرک قوموں میں باری تعالیٰ کی تجسیم یا حلول کا عقیدہ قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ ہندوستان میں اس کا نمونہ اوتار کا عقیدہ ہے یعنی خدا کا انسانی روپ میں ظاہر ہونا۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے انبیاء کو عظمت دینے کے لئے ان کو انھیں الفاظ اور اصطلاحات میں بیان کرنا شروع کیا جن الفاظ اور اصطلاحات میں مشرک قومیں اپنے بڑوں کی عظمت بیان کرتی تھیں۔ ان قوموں نے اپنے بزرگوں یا بادشاہوں کی عظمت بتانے کے لئے کہا کہ وہ خدا کا تجسد (Incarnation) ہیں۔ یہود و نصاریٰ نے کہنا شروع کیا کہ حضرت عزیر اور حضرت مسیح اللہ کے فرزند ہیں۔ اللہ ان کی شکل میں دنیا کی زندگی میں ظاہر ہوا ہے۔

اسلام کی سیاسی تعبیر

خدا کے دین میں بگاڑ کی یہ صورت ہر زمانہ میں پائی گئی ہے اور موجودہ زمانہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ جو لوگ دین کو خدائی عظمتوں کی سطح پر پائے ہوئے نہ ہوں وہ اس کو دنیوی عظمتوں کی سطح پر اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد جب اشتراکی نظریات کو بہت زیادہ فروغ ہوا تو کچھ لوگوں نے سمجھا کہ اسلام کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کو اشتراکیت کے مطابق ثابت کیا جائے۔ اسی زمانہ میں "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح وضع ہوئی۔ حتی کہ کہا گیا کہ تاریخ کے سب سے پہلے اشتراکی حضرت محمدؐ تھے۔

جو لوگ کیفیاتی سطح پر حقیقت کو پائے ہوئے نہ ہوں وہ حقیقت کو کمیاتی زبان میں بیان کر کے اس کو اپنے لئے قابل فہم بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلام کو سیاسی اصطلاحات میں بیان کرنا بھی اسی کی ایک مثال ہے۔ موجودہ زمانہ میں جب سیاسی نظریات کو فروغ ہوا تو کچھ لوگوں کو نظر آیا کہ اسلام کی شان کو نمایاں کرنے کی سب سے اعلیٰ صورت یہ ہے کہ اسلام کو ایک مکمل سیاسی نظام کے روپ میں پیش کیا جائے۔ اس آخری فکر کو موجودہ زمانہ میں اسی طرح مقبولیت حاصل ہوئی جس طرح قدیم زمانہ کے عیسائیوں میں تثلیث کے نظریہ کو ہوئی، جس کو مسیحی متکلمین نے یونانیوں کے "اقانیم ثلاثہ" کے جواب میں وضع کیا تھا۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کی سیاسی تشریح کی مقبولیت کی دو بڑی وجہیں تھیں۔ ایک یہ کہ یہ تشریح اسلام کو زمانہ کے باعظمت نظریہ کے لباس میں دکھا رہی تھی۔ دوسری وجہ ردعمل کی نفسیات تھیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو مختلف قوموں سے جو سیاسی مقابلہ پیش آیا، اس کا قدرتی نتیجہ تھا کہ ان کے اندر جوابی سیاسی مزاج پیدا ہو۔ چنانچہ مسلمانوں کے درمیان مختلف عنوانات کے تحت سیاسی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اسلام کا سیاسی نظام کا تصور ان تمام تحریکوں کے لئے فکری سہارا بن گیا۔ اسلام کا سیاسی تصور موجودہ زمانہ کے بہت سے لوگوں کے نزدیک اسلام کے حق میں وقت کا ایک قصیدہ بھی تھا

اور ان کی ردعمل کی نفسیات کے لئے فکری تسکین کا ذریعہ بھی۔

موجودہ زمانہ کی مسلم تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں جو تحریکیں اٹھیں وہ زیادہ تر خارجی حالات، خاص طور پر سیاسی حالات، کے ردعمل کے طور پر اٹھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے احیاء کی کوششیں سیاسی مقابلہ آرائی کی سمت میں چل پڑیں۔ اس عملی غلطی کے ساتھ جو فکری غلطی پیش آئی اس نے معاملہ کی سنگینی کو بہت زیادہ بڑھا دیا۔ دین کو وقت کے اسلوب میں بیان کرنے کی کوششوں نے بالآخر دین کی سیاسی تعبیر کا رخ اختیار کر لیا۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے انیسویں صدی کے یورپ میں صنعتی مزدوروں کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوششوں میں بالآخر مارکسزم کی مادی تعبیر تاریخ وجود میں آئی۔ بندے اور خدا کا تعلق جو حقیقۃً ایک ملکوتی تعلق تھا، اس نے ایک قسم کے سیاسی تعلق کی صورت اختیار کر لی۔ اسلام سیاسی ہنگامہ آرائیوں کا عنوان بن گیا۔ جب کہ اسلام فی الحقیقت یہ ہے کہ بندے اور خدا کے درمیان وہ نفسیاتی تعلق قائم ہو جب کہ بندہ اپنے رب میں جینے لگے، وہ آخرت کی فضاؤں میں سانس لینے لگے۔ اس کے اندر وہ ملکوتی انسان جنم لے جو اس کو جنت کی ابدی دنیا کا شہری بنا سکے۔

وقت کے اسلوب میں دین کو بیان کرنا جتنا ضروری ہے، وقت کے فکر میں دین کو ڈھالنا اتنا ہی غلط ہے۔ اول الذکر تجدید دین ہے اور ثانی الذکر تحریف دین۔ ہر دور کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔ ہر دور میں کچھ الفاظ اور کچھ اسلوب ہوتے ہیں جن میں آدمی سوچتا ہے، جن میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ جب زمانہ بدلتا ہے تو الفاظ سے ذہن کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک لفظ جو قدیم دور میں انسان کی نفسیات کو متحرک کرتا تھا، نئے دور میں وہ لفظ اپنی یہ انقلابی قیمت کھو دیتا ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ ذہن اور الفاظ کے درمیان دوبارہ رشتہ قائم کیا جائے۔ تاہم یہ "جدت" صرف الفاظ اور اسلوب کے اعتبار سے ہوتی ہے، نہ کہ فکر کے اعتبار سے۔

اسلامی تحریک کیا ہے

اسلامی تحریک انسانی باغبانی کی تحریک ہے۔ جس طرح باغبان ایک ایک پودے پر انفرادی توجہ دے کر اس کو پورا درخت بنانے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح اسلامی تحریک بھی فرد فرد کو نشانہ بناتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر وہ شخص جو زمین پر پیدا ہوا ہے، وہ سچے معنوں میں اللہ کا بندہ بنے اور اپنے اندر وہ خصوصیات پیدا کرے جو اس کو اگلی زندگی میں جنتی دنیا کا شہری بنا سکیں۔ اسلامی تحریک کی کامیابی یہ ہے کہ خدا کی زمین پر ایسے بندے جنم لیں جو خدا میں جینے والے اور خدا میں سانس لینے والے ہوں۔ جو نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد روح Complex-free soul کے مالک ہوں۔ یہ وہ انسان ہیں جو نئی پیدائش کا تجربہ کرتے ہیں۔ پہلی بار وہ اپنی ماؤں کے پیٹ سے نکلے تھے، اب وہ دوبارہ اسلام کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ یہ نئی پیدا شدہ روحیں وہ ہوتی ہیں کہ جب ان کے سامنے حق آتا ہے تو عزت کا سوال ان کے لئے قبول حق میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ وہ "کھانا کھانے والے اور بازار میں چلنے والے" انسان کے ظاہری حلیہ سے گزر کر اس کے اندر چھپے ہوئے اس انسان کو دیکھ لیتے ہیں جو خدا سے رزق پاکر بولتا ہے اور خدا کی دنیا میں سیر کرکے لوگوں کو اس کے احوال سناتا ہے۔ وہ ایک معمولی انسان کے اندر چھپی ہوئی غیر معمولی عظمتوں سے باخبر ہو جاتے ہیں۔ وہ بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں

کہ "خدایا ہم نے تیری آواز کو پہچان لیا۔ ہم اس پر ایمان لائے۔ ہم کو معاف فرما، ہم کو اپنی رحمتوں میں داخل کرلے" خدا کی یاد سے ان کی روحیں اس طرح تروتازہ ہوجاتی ہیں جس طرح بارش پاکر درخت نکھر اٹھتا ہے۔ جو ایمان خدا کا خوف نہ پیدا کرے وہ جھوٹا ایمان ہے۔ جنگل میں شیر دھاڑتا ہے تو درخت کے بندر اس طرح زمین پر ٹپک پڑتے ہیں جیسے خزاں کے موسم میں درخت کی پتیاں جھڑتی ہیں۔ اگر انسان پر خدا کی ہیبت اتنی بھی طاری نہ ہو جتنی بندر کو شیر کے تصور سے ہوتی ہے تو اس نے خدا کو پایا کیا۔

اسلامی دعوت کی کوششوں کا مرکز اصلاً کوئی "اسٹیٹ" نہیں بلکہ وہ افراد ہیں جن کے لئے جنت یا جہنم کا فیصلہ ہونا ہے۔ خدا کی عدالت میں "اسٹیٹ" نہیں کھڑا کیا جائے گا بلکہ افراد کھڑے کئے جائیں گے اور ہر ایک کا الگ الگ حساب ہوگا۔ اسلام کے داعی کی سرگرمیوں کا اصل محرک یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کو اس خطرے سے بچائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی دعوت کا نشانہ اصلاح نظام نہیں، اصلاح انسان ہے۔ اس اصول کی اہمیت صرف اس لئے نہیں ہے کہ افراد ہی کسی نظام کو بناتے یا بگاڑتے ہیں، افراد سے باہر کسی نظام کا وجود نہیں۔ اس سے بڑھ کر اس کی اہمیت یہ ہے کہ زندگی کا اصل مسئلہ جنت اور جہنم کا مسئلہ ہے اور یہ بات کہ کون جنتی ہے اور کون جہنمی، اس کا فیصلہ ہر فرد کے لئے الگ الگ کیا جائے گا نہ کہ مشترکہ طور پر۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی دعوت فرد کو اپنا نشانہ بناتی ہے۔ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایک ایک انسان کو اس قابل بنائے کہ مرنے کے بعد جب وہ خدا کے سامنے پہنچے تو اس کا خدا اس کو جہنم میں نہ ڈالے بلکہ اس کے لئے جنت کا فیصلہ کرے۔ اسلام ایک مستقل فکر اور ایجابی حقیقت ہے۔ وہ اس خدا کی طرف سے آیا ہے جو اپنی ذات میں ازلی و ابدی ہے۔ وہ انسان کی ناقابل تغیر فطرت کا تمثنیٰ ہے۔ وہ ایک ایسا دین ہے جو کائنات میں مسلسل طور پر اول روز سے قائم ہے۔ انسان جب اس حیثیت سے اسلام کو پاتا ہے تو وہ فرشتوں کے قافلہ میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہ خدا کی ابدی دنیا کا شہری بن جاتا ہے۔ وہ فانی کائنات سے گزر کر باقی رہنے والی کائنات میں داخل ہوجاتا ہے۔ جب کوئی شخص اس فوق الفطری تجربہ سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے اندر ایک نیا انسان جنم لیتا ہے۔ اب وہ خدا کے رزق سے کھاتا ہے۔ وہ خدا کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کرتا ہے۔ وہ خدا کے پڑوس میں اپنی صبح و شام گزارنے لگتا ہے —— اسی ربانی یافت کا نام ایمان ہے۔ موجودہ زندگی میں یہ یافت آدمی کو حسیاتی معنوں میں حاصل ہوتی ہے، موت کے بعد آنے والی دنیا میں وہ مادی اور حقیقی طور پر اس کو حاصل ہوگی جس کا دوسرا نام جنت ہے۔

اسلام کو سیاسی نعرہ کے طور پر استعمال کرنا

مگر اسلام جب سیاست بن جائے تو وہ آدمی کو اس حقیقی اسلام سے محروم کر دیتا ہے۔ اسلام کی دھوم کے درمیان وہی چیز غائب ہوجاتی ہے جو اسلام کا اصل مقصود تھی۔ اسلام اسی طرح دنیوی ہنگامہ آرائیوں کا عنوان بن جاتا ہے جس طرح مثال کے طور پر، سوشلزم اور کمیونزم بنے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں، بلکہ اس قسم کی تحریک خود اسلامی نظام کے قیام کے امکانات کو بھی ختم کر دیتی ہے۔ کیوں کہ اسلامی نظام کو اسلامی افراد قائم کرتے ہیں اور اس قسم کی تحریکیں حقیقی اسلامی افراد کی پیدائش کا دروازہ ہی بند کر دیتی ہیں۔

"غریبی ہٹاؤ" کے نعرہ پر ایک تحریک اٹھتی ہے۔ مگر اس تحریک کے لوگ جس کے گرد جمع ہوتے ہیں وہ کوئی غریب نہیں ہوتا بلکہ ایک امیر لیڈر ہوتا ہے۔ کچھ لوگ مزدور کے مسئلہ کے نام پر اٹھتے ہیں۔ مگر وہ اپنی اجتماعیت کے لئے جس مرکزی ہستی کو پاتے ہیں وہ ایک ایسا لیڈر ہوتا ہے جو خود بہت بڑا لینڈ لارڈ ہے۔ ان واقعات کی وجہ یہ ہے کہ "غریب" کا وجود لوگوں کی نظر میں اتنا حقیر ہے کہ وہ انھیں دکھائی نہیں دیتا۔ وہ لوگوں کے لیے مرکز توجہ نہیں بنتا۔ لوگ کسی بڑی شخصیت ہی کے گرد جمع ہو سکتے ہیں جو ان کو قدآور دکھائی دیتی ہو اور یہ ان کو "لیڈر" ہی کی صورت میں ملتا ہے خواہ اس کا غریبی اور مزدوری سے کوئی تعلق نہ ہو۔

یہی صورت حال مذہب میں بھی پیش آتی ہے۔ مذہب کیا ہے، اپنے لئے ایک ملجا اور مرجع کو پالینا۔ جب مذہب کے نام پر وہ لوگ جمع ہوں جو مومنین بالغیب ہوں، وہ خدا کو نہ دیکھتے ہوئے بھی اس کو دیکھنے لگے ہوں۔ جو دنیا میں رہتے ہوئے بھی آخرت میں جینے لگے ہوں تو ایسے لوگوں کا ملجا اور مرجع خدا کی ذات بن جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے سب سے بڑی حقیقت خدا ہوتی ہے۔ ان کے لئے یہ بات خارج از بحث ہوتی ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی اور کے گرد جمع ہوں، وہ خدا کے سوا کسی اور کو اپنا مرکز و مرجع بنائیں۔

مگر جب مذہب کے گرد ایسے لوگ جمع ہو جائیں جو ایمان بالغیب کے مقام پر نہ ہوں۔ جن کو خدا سے زیادہ دوسری چیزیں نظر آتی ہوں، جو چھپی ہوئی دنیا سے زیادہ اس دنیا کو دیکھتے ہوں جو ان کی آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی ہے، تو ان کا حال وہی ہوتا ہے جو غریبوں اور مزدوروں کے نام پر اٹھنے والے لوگوں کا ہوتا ہے۔ وہ خدا کے نام پر اٹھتے ہیں مگر اپنی ظاہر پرستی کی وجہ سے کسی غیر خدا پر اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ وہ اخروی نظام کا لفظ بولتے ہیں مگر عملاً وہ ایک دنیوی نظام پر ایمان لائے ہوتے ہیں۔ ان کا اسلام موت سے پہلے کی دنیا میں عزت حاصل کرنے کا ایک عنوان ہوتا ہے نہ کہ موت کے بعد کی دنیا میں عزت و کامیابی حاصل کرنے کا۔

اسلام فوجداری قانون کا نام نہیں

موجودہ زمانہ میں کچھ تحریکیں ابھری ہیں جو اسلام کے حدود و تعزیرات (سزاؤں) کے اجراء کو اسلامی نظام کے نفاذ کا نام دیتی ہیں، یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ اسلام کے اس "فوجداری" تصور نے اسلام کے اصل مدعا کو ختم کر دیا ہے۔ کسی تعلیم گاہ میں بید کی سزاؤں کا اجراء تعلیم گاہ کے اندر ڈسپلن قائم کرنے سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ اصل تعلیمی مقصد سے۔ اسی طرح اسلام میں جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں، وہ مسلم معاشرہ کی تنظیم کے لئے ہیں۔ یہی اسلام کا اصل مقصد نہیں ہے۔ دور اول میں جب مدینہ میں اسلامی ریاست قائم ہوئی تو، مذکورہ معنوں میں، وہاں اسلامی نظام قائم ہوگیا۔ مگر اسی معاشرہ میں وہ "مسلمان" بھی تھے جن کے بارہ میں قرآن میں اعلان کیا گیا کہ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (منافقین جہنم کے سب سے نچلے درجہ میں ہوں گے) حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا اصل مقصد افراد کا تزکیہ ہے جو ان کے اندر وہ باطنی اوصاف پیدا کرے جو ان کو جنت کا مستحق بنانے والے ہوں۔ اسلام کی کوششوں کا نشانہ لوگوں کو حقیقی انسان بنانا ہے نہ کہ ان کو کوڑے مارنا اور پھانسی دینا۔ ایک شخص جرم کرتا ہے۔ نظام اسلامی کے علم بردار اس کے لئے دعائیں نہیں کرتے،

تنہائیوں میں اس سے مل کر اس کو دردمندانہ نصیحت نہیں کرتے، اس کی اصلاح کے لئے وہ خیر خواہانہ کوشش نہیں کرتے جو ایک باپ اپنے بیٹے کے لئے کرتا ہے۔ وہ صرف یہ کرتے ہیں کہ اس کو کوڑا مارنے اور پھانسی دینے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ نظام اسلامی کے نام پر نظام فوجداری قائم کرنے کے علم بردار ہیں۔ نظام اسلامی قائم کرنے والے وہ ہیں جو اللہ کے بندوں کو اللہ کی جنت میں پہنچانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ وہ حکمت اور خیر خواہی کے تمام تقاضوں کے تحت لوگوں کی اصلاح میں سرگرم ہوں۔ انتقامی جذبہ سے نہیں بلکہ اصلاح کے جذبہ سے ان کے اوپر حکم الٰہی کی تعمیل کریں خواہ وہ شخص کوئی غیر ہو یا خود اپنا بیٹا ہو۔

قوانین کا مقصد معاشرہ کی تنظیم

موجودہ زمانہ میں اسلام کے نام پر اٹھنے والی تحریکیں اکثر ردعمل کی تحریکیں تھیں نہ کہ حقیقۃً ایجابی اسلامی تحریکیں۔ پچھلی صدیوں میں مغربی قومیں نئی طاقتوں سے مسلح ہو کر اٹھیں اور انھوں نے پوری مسلم دنیا کو مغلوب کر لیا۔ وہ نہ صرف ان کی سیاست پر چھا گئیں بلکہ فکری اور ذہنی شعبوں پر بھی انھوں نے قبضہ کر لیا۔ مسلمانوں میں اس کا ردعمل ہونا فطری تھا۔ بہت سے لوگ اپنے ان نئے دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ ایک دفاع کا کام تھا اور اگر دفاع کے عنوان کے تحت اس کو کیا جاتا تو اس میں کوئی ہرج نہ تھا۔ مگر جوش مقابلہ میں اسی کو دین کا اصل مدعا کہا جانے لگا۔ یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے اسی کی بنیاد پر پورے دین کی تعبیر کر ڈالی۔ انھوں نے قرآن و حدیث کی تشریح اس انداز میں کی گویا قوموں سے لڑنا اور ان کے اوپر اپنی سیاست قائم کرنا ہی امت مسلمہ کا اصل مشن ہے۔ اس ٹکراؤ کا نشانہ ابتداءً غیر مسلم قومیں تھیں۔ مگر دوسری جنگ عظیم کے بعد جب مسلم ملکوں کو غیر مسلم قوموں کے سیاسی تسلط سے آزادی مل گئی تو ان کے حربی مشن کا نشانہ خود مسلم حکمراں قرار پائے۔ کیوں کہ وہ امت مسلمہ کے اصلی نصب العین (اسلامی قانون کا نفاذ) کو عمل میں نہیں لا رہے تھے۔ اس لئے ضروری تھا کہ ان سے لڑ کر ان کو ہٹایا جائے اور حکومتی اقتدار پر قابض ہو کر اسلامی قانون کو نافذ کیا جائے۔

اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاست جو دین کا صرف ایک اضافی حصہ ہے، وہ دین کا اعتقادی حصہ بن گیا۔ اسلام کے اجتماعی قوانین حقیقۃً مسلم معاشرہ کی تنظیم کے لئے ہیں جو معاشرہ کی صلاحیت کے بقدر اس میں نافذ کئے جاتے ہیں۔ مگر اس تشریح دین نے اس کو جنت اور جہنم کا مسئلہ بنا دیا۔ اسلامی قانون کو نافذ کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگاؤ تو جنت میں جاؤ گے، ورنہ جہنم میں جلو گے۔ یہ وہی غلطی تھی جو پہلی صدی ہجری میں شیعہ حضرات نے کی۔ وہ خلافت کے عہدہ پر بنی ہاشم کے کسی فرد کو دیکھنا چاہتے تھے۔ اپنی اس سیاسی خواہش کو دینی جواز عطا کرنے کے لئے انھوں نے خاندانی خلافت کا عقیدہ وضع کیا اور اس طرح ایک سیاسی مسئلہ کو اعتقادی مسئلہ بنا دیا۔ یہی غلطی دوسری بار موجودہ زمانہ کے مصلحین نے کی ہے — قانون اسلامی کا نفاذ کسی مسلم معاشرہ کی ایک تنظیمی ضرورت تھی جس طرح مسجد نمازیوں کے کسی گروہ کی عمارتی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر اس کو انھوں نے مسلمانوں کی اعتقادی ضرورت بنا دیا۔ اس کے نتیجہ میں جدید اسلامی تاریخ کی سب سے بڑی برائی وجود میں آئی۔ ہر مسلم ملک میں مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک حکمراں اور ان کے حامیوں کا، دوسرا اسلامی سیاست کے

علم برداروں کا۔ یہ دونوں ایک کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ میں مصروف ہیں اور مسلمان کا جان و مال جو دوسرے مسلمان کے لئے حرام تھا، ہر ایک نے اپنے لئے جائز کر لیا ہے۔ وہ جنگ جو اپنے نفس سے لڑنی تھی یا خدا کے منکرین سے، وہ آپس میں بہت بڑے پیمانہ پر جاری ہے۔ مزید لطف یہ ہے کہ اس غیر اسلامی جنگ کو ہر ایک نے اسلامی جہاد کا نام دے رکھا ہے۔

فتنہ کی واپسی

اسلام کو سیاست بنانے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ وہ فتنہ (آزمائش) جس کو رسول اور اصحاب رسول نے بے پناہ قربانیوں کے بعد ختم کیا تھا، وہ اسلامی تاریخ میں دوبارہ لوٹ آیا۔ قدیم زمانہ میں سیاست اور شرک دونوں ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ شاہی خاندان لوگوں میں یہ عقیدہ بٹھا کر حکومت کیا کرتا تھا کہ وہ دیوتا کی اولاد ہے۔ وہ خدا کی خدائی میں شریک ہے، وہ آسمانی دیوتاؤں کا دنیوی ظہور ہے۔ اسی بنا پر جب توحید خالص کی دعوت اٹھتی تو مشرکانہ عقائد کی بنیاد پر حکومت کرنے والے لوگ سمجھتے کہ یہ دعوت ان کے حق حکومت کو بے اعتبار بنا رہی ہے۔ وہ اس کو مٹانے کے لئے اپنی ساری طاقت اس کے خلاف لگا دیتے۔ اس طرح توحید کی دعوت اپنے آغاز ہی میں حکمرانوں کی حریف بن کر سخت مشکلات کا شکار ہو جاتی۔ چنانچہ قرآن میں حکم دیا گیا کہ وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو جائے) یعنی اہل شرک کی یہ حیثیت ختم ہو جائے کہ وہ خدا کے بندوں کے لئے آزمائش بنے ہوئے ہیں اور ان کو دین توحید اختیار کرنے سے روکتے ہیں۔ خدا کے عقیدہ کو بزور سیاسی ادارہ سے جدا کر دو تاکہ دین کا معاملہ تمام تر البیاتی معاملہ بن جائے، وہ سیاسی معاملہ نہ رہے۔ اقتدار کے معاملہ سے اس کا اعتقادی تعلق ختم ہو جائے۔ دین کا تمام تر اللہ کے لئے ہو جانا یہ ہے کہ فتنہ (آزمائش) کی حالت ختم ہو جائے، دونوں کے درمیان کوئی اور چیز حائل نہ رہے۔

رسول اور اصحاب رسول کے ذریعہ جو تاریخ ساز انقلاب لایا گیا، اس نے شرک کو مقام اقتدار سے ہٹا دیا، اس نے مذہبی عقیدہ اور سیاسی ادارہ کے درمیان تعلق کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار یہ امکان پیدا ہوا کہ سیاسی ادارہ سے ٹکراؤ کا خطرہ مول لئے بغیر دعوت توحید کا کام کیا جا سکے۔ مگر مسلمانوں نے نئے عنوان سے دوبارہ وہی مشکلات دعوتی کام کی راہ میں پیدا کر دیں۔ پہلی صدی ہجری میں اہل بیت کی خلافت کو عقیدہ کا مسئلہ بنانا اس کی پہلی مثال تھی۔ اور موجودہ زمانہ میں "مکمل قانون کے نفاذ" کو علی الاطلاق امت مسلمہ کا فریضہ بتانا اس کی دوسری مثال ہے۔ اس تعبیر نے سیاسی جدوجہد کو عقیدہ کا مسئلہ بنا دیا۔ اب ہر ملک کے مسلمان "مکمل اسلامی قانون کے نفاذ" کے نام پر اپنے ملک کے حکمرانوں سے ٹکرا رہے ہیں اور سیاسی ادارہ دوبارہ نئے عنوان سے اسلام کا حریف بن گیا ہے جس طرح وہ ڈیڑھ ہزار سال پہلے اس کا حریف بنا ہوا تھا۔

احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد سب سے زیادہ جس چیز کا خطرہ محسوس کیا تھا وہ یہ کہ مسلمان آپس میں لڑیں گے۔ تاریخ سے اور موجودہ حالات سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان آپس کی لڑائیوں میں جتنا زیادہ مشغول رہے ہیں اور مشغول ہیں اس کی مثال کسی بھی دوسری قوم میں نہیں ملتی۔ اغیار

سے لڑنے میں دوسری قومیں ہم سے آگے نظر آئیں گی۔ مگر خود اپنے ہم قوموں کے قتل و خون میں بہر حال مسلمان سب سے زیادہ آگے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی سیاست کو عقیدہ بنانا ہے۔ قدیم زمانہ میں جو باہمی لڑائیاں جاری رہیں، ان میں عام طور پر ان لوگوں کا ہاتھ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے جنھوں نے یہ عقیدہ بنا لیا تھا کہ خلافت ایک مخصوص خاندان کا حق ہے۔ ان کے علاوہ شرعاً کسی کو مسلمانوں کے اوپر حکومت کرنا جائز نہیں۔ موجودہ زمانہ میں جمہوری اور سائنسی انقلابات نے اس ذہن کو خیال عقیدہ کی حیثیت سے ختم کر دیا تھا۔ مگر عین اس وقت قانون اسلامی کے نفاذ کو علی الاطلاق فرض بتانے والا نظریہ وجود میں آگیا اور اس نے اس باہمی لڑائی کو نئے عنوان سے مسلمانوں کے درمیان زندہ کر دیا۔

اسلامی نظام کیسے قائم ہوتا ہے

"سیاسی اسلام" کے نظریہ کا مزید نقصان یہ ہے کہ وہ مطلوبہ اسلامی سیاست قائم کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ نظریہ گویا گاڑی کو گھوڑے کے آگے باندھنا ہے۔ درخت زرخیز زمین میں اگتا ہے نہ کہ پتھر کی چٹانوں پر۔ اسی طرح اسلامی نظام ہمیشہ حقیقی اسلامی معاشرہ میں قائم ہوتا ہے۔ جہاں اسلامی معاشرہ نہ پایا جائے، وہاں سیاسی تحریک چلا کر یا پھانسی اور گولی کی سزاؤں کے ذریعہ اسلام کا سیاسی درخت اگایا نہیں جا سکتا۔

جو شخص کسی عہدہ کا امیدوار ہو، اسلام کے مطابق، وہ اس عہدہ کے لئے سب سے زیادہ غیر موزوں شخص ہے۔ شریعت کی یہ تعلیم احادیث سے واضح طور پر ثابت ہے۔ یہاں چند روایتیں نقل کی جاتی ہیں:

ان اخونکم عندنا من طلبہ (ابو داؤد)	جو شخص طالب ہو، ہمارے نزدیک وہ سب سے زیادہ اس کا نااہل ہے
انا واللہ لا نولی علی ھذا العمل احدا سألہ ولا احدا حرص علیہ (بخاری و مسلم)	خدا کی قسم حکومتی عہدہ پر ہم ایسے کسی شخص کا تقرر نہیں کرتے جو اس کو مانگے نہ ایسے کسی شخص کا جو اس کو چاہتا ہو۔
لا نستعمل علیٰ عملنا من ارادہ (بخاری و مسلم)	ہم اپنی حکومت کے کام پر ایسے شخص کو مقرر نہیں کرتے جو اس کی خواہش رکھتا ہو۔
تجدون خیر الناس اشد ھم کراھیۃ لھذا الامر حتی یقع فیہ (بخاری و مسلم)	تم سب سے بہتر اس شخص کو پاؤ گے جو حکومتی منصب کو سب سے زیادہ ناپسند کرتا ہو، یہاں تک کہ مجبوراً اس میں مبتلا ہو جائے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کون سا معاشرہ ہے جس کے اندر اسلامی نظام قائم ہوتا ہے۔ یہ وہ معاشرہ ہے جس کے افراد میں اقتدار پسندی نہ پائی جاتی ہو۔ جس کے سربرآوردہ لوگ خود شعوری کے اس مقام پر ہوں کہ وہ دوسرے کے مقابلہ میں اپنی نااہلی کو جانتے ہوں۔ جس کے افراد اتنے بلند نظر ہوں کہ عہدوں کے معاملہ میں اپنی ذات کی نفی کر کے سوچتے ہوں۔ ایسے لوگوں کے درمیان جب عہدیدار کے تقرر کا سوال آتا ہے تو سب میں جو موزوں ترین شخص ہوتا ہے وہ خود بخود ابھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ اور جب اس کا تقرر ہو جاتا ہے تو سارے لوگ فوراً اس کے تقرر کو مان لیتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر معاشرہ کا یہ حال ہو کہ اس کے افراد اپنی اپنی اہلیتوں کو جاننے کے ماہر ہوں تو ایسے معاشرہ میں صرف باہمی لڑائیاں جنم لیتی ہیں۔

اس سے اسلامی نظام برآمد نہیں ہوتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صحابہ کا جو گروہ جمع ہوا تھا، وہ وہی لوگ تھے جو اپنی نفی کرکے سوچتے تھے۔ چنانچہ آپ کے زمانہ میں کامیابی کے ساتھ نظام قائم ہوا اور چلتا رہا۔ خلیفہ اول اور خلیفہ دوم کے زمانہ میں اسی قسم کے لوگ معاشرہ پر چھائے ہوئے تھے۔ اس لئے ان کے زمانہ میں بھی اسلامی نظام کامیابی کے ساتھ قائم رہا۔ خلیفہ سوم اور چہارم کے زمانہ میں صورت حال بدل گئی۔ اب اسلامی معاشرہ میں ایسے لوگوں کی کثرت ہوگئی جو اپنی ذات کی نفی کرکے سوچنا نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ عہدہ اور خلافت کے دعوے دار کھڑے ہونا شروع ہوگئے۔ اور باہمی لڑائیوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس میں حقیقی اسلامی نظام منتشر ہوکر رہ گیا۔

جس معاشرہ کے لوگ اپنی ذات کی نفی کرکے سوچنا نہ جانتے ہوں وہاں اسلامی تحریک کا کام یہ ہے کہ ایسے افراد وجود میں لانے کی کوشش کرے جو فرائض کے معاملہ میں اپنے کو شامل کرکے سوچنے والے ہوں اور عہدوں کے معاملہ میں اپنے کو الگ کرکے سوچیں۔ اسلامی نظام قائم کرنے کا یہی واحد طریقہ ہے۔ اس کے برعکس مطالبہ اور ایجی ٹیشن کے ذریعہ اسلامی نظام نافذ کرنے کی کوشش ایک بے معنی کوشش ہے جو صرف ٹکراؤ کو جنم دیتی ہے۔ ایسے معاشرہ میں اس قسم کی تحریک عملاً مدعیان اقتدار کی تعداد میں اضافہ کے ہم معنی بن جاتی ہے۔ وہ فساد کو بڑھاتی ہے نہ یہ کہ معاشرہ میں اصلاح پیدا کرے۔

اقتدار کی طلب انسان کی سب سے بڑی طلب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اقتدار کی جنگ جاری رہی ہے۔ سماج کے اندر ہمیشہ کثیر تعداد میں ایسے لوگ موجود رہتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح اقتدار اور مرتبہ کے مقام پر پہنچنے کا خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ تاریخ اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ انسانی معاشرہ ہمیشہ اقتدار اور بڑائی چاہنے والوں کا دنگل بنا رہا ہے۔ ایسی حالت میں کسی اصلاحی تحریک کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ قلوب کی راہ سے لوگوں کے اندر داخل ہوکر ان کے جذبۂ اقتدار پسندی کو کم کرے۔ اس ابتدائی اصلاحی کام کو قابل لحاظ حد تک کئے بغیر جو لوگ "مطالبہ نظام اسلامی" کی مہم لے کر کود پڑیں وہ صرف فساد فی الارض میں اضافہ کریں گے۔ کیوں کہ اس قسم کی مطالباتی مہم طالبینِ اقتدار کی تعداد میں اضافہ کے ہم معنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اقتدار کی رسہ کشی جو پہلے صرف عام دنیا داروں کے درمیان جاری تھی، اس میں مذہبی لوگوں کی بھیڑ کا بھی اضافہ ہو جائے۔ مزید اس شناعت کے ساتھ کہ اقتدار کی جو جنگ پہلے سیاست کے نام پر ہو رہی تھی وہ مذہب کے نام پر ہونے لگے۔ خدا کا دین جاہ طلبی کے بازار میں ایک سیاسی سودا بن کر رہ جائے۔

غیر جذباتی فیصلہ کرنے کی صلاحیت

اسلامی تحریک کو سیاسی تحریک بنانا پوری قوم کو جذباتی بنا کر رکھ دیتا ہے۔ جب کہ اسلام کو قائم کرنے کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایسے انسانوں کی ایک جماعت ہے جو غیر جذباتی فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، اس قسم کی تحریک، بالفرض ایک حکومت کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائے تب بھی وہ نئی صالح حکومت بنانے میں کامیاب نہیں

ہو سکتی۔ کیوں کہ عین اپنی فطرت کے نتیجہ میں، وہ ان افراد سے محروم ہوگی جو کسی نظام کو اسلامی طریق پر چلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ایک بار مجھے ایک کارخانہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے ایک مشین دکھائی گئی۔ کارخانہ کے مالک نے ایک بٹن دبایا۔ فوراً مشین کا بڑا پہیہ (Fly wheel) تیزی سے گھومنے لگا۔ پہیہ اپنی پوری رفتار سے ایک رخ پر گھوم رہا تھا کہ انھوں نے دوسرا بٹن دبایا۔ اس کے بعد اچانک پہیہ نے رفتار بدلی اور تقریباً رُکے بغیر دوسرے رُخ پر اسی تیزی سے گھومنے لگا۔ یہ صلاحیت جو ایک مشین کو کامیاب بناتی ہے وہی اسلامی سیاست کی کامیابی کے لئے درکار ہے۔ اسلامی سیاست کو وہی لوگ کامیابی کے ساتھ چلا سکتے ہیں جو اپنے آپ پر اتنا زیادہ قابو رکھنے والے ہوں کہ نئی صورت حال پیش آنے کے بعد اچانک وہ اپنے رخ کو تبدیل کر سکیں۔

اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے ایسے افراد درکار ہیں جو مذکورہ پہیے کی طرح یک وقت اپنا رُخ تبدیل کر سکتے ہوں۔ جو جنگی جنون کی عین انتہا پر پہنچ کر صلح کا فیصلہ کر سکیں۔ جو غصہ اور انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ کے کے درمیان معاف کر دینے اور بھول جانے کا اعلان کر سکیں۔ جو لیڈری کے عالی شان مواقع کے ہوتے ہوئے اپنے آپ کو گم نامی کے گوشہ میں لے جانے پر راضی ہو جائیں۔ جو انتہائی اشتعال انگیز واقعات کے درمیان کھڑے ہو کر ایک انتہائی ٹھنڈا فیصلہ کر سکیں۔ جو فتح کے جلو میں ہوتے ہوئے غیر فاتحانہ رویہ کا مظاہرہ کر سکیں۔ یہ متضاد خصوصیات صرف انھیں لوگوں میں پیدا ہو سکتی ہیں جن کے خوف خدا نے ان کے "انا" کے خول کو چکنا چور کر دیا ہو۔ جن کے محاسبہ نفس نے ان کا یہ حال کر دیا ہو کہ وہ اپنے آپ کو اسی بے آمیز نظر سے دیکھنے لگیں جس نظر سے خدا انھیں دیکھ رہا ہے۔ جن کے ایمان نے ان کو اتنا باشعور بنا دیا ہو کہ ان کا شعور ان کے نفس کو کنٹرول کرنے لگے نہ کہ نفس ان کے شعور کا ——

انھیں اوصاف کے حاملین اسلامی نظام قائم کرتے ہیں۔ مگر اسلام کو سیاسی تحریک بنانے کے بعد جو سب سے بڑا نقصان ہوتا ہے وہ یہ کہ اس قسم کے افراد کی پیدائش کا امکان مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ اسلام کے نام پر سیاسی تحریک چلانا گویا "آشیانہ" کے نام پر اس شاخ کو کاٹنا ہے جس پر بالآخر آشیانہ قائم ہونے والا ہے۔

دعوتی کام کی ہمہ گیری

مسلمان کا مشن دعوت الی اللہ ہے۔ یہی عمل اس کی دنیا و آخرت کی فلاح کا ضامن ہے۔ اسی عمل کو انجام دینے سے وہ اس کا مستحق قرار پاتا ہے کہ خدا کے یہاں امت محمدی کی حیثیت سے اٹھایا جائے۔ اور یہی وہ عمل ہے جو دنیا میں اس کی حفاظت و کامیابی کو یقینی بناتا ہے۔ اس کام کو چھوڑنے کے بعد مسلمان اللہ کی نظر میں اسی طرح بے حقیقت ہو جائیں گے جس طرح یہود اپنی داعیانہ حیثیت کو چھوڑنے کے بعد اللہ کی نظر میں بے حقیقت ہو گئے۔ اس سلسلے میں قرآن کی حسب ذیل آیت کا مطالعہ کیجیے:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ من ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالته والله يعصمك من الناس ان الله لا يهدى القوم الكفرين (مائدہ ۶۷)

اے پیغمبر! تمھارے رب کی طرف سے جو کچھ تمھارے اوپر اتارا گیا ہے اس کو لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔ اور اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچائے گا۔ اللہ کبھی راہ نہیں دیتا منکر قوم کو۔

آیت کا خطاب اگرچہ بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ مگر آپ کی تبعیت میں آپ کی امت بھی اس میں شامل ہے۔ اس آیت سے پہلی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ تبلیغ ما انزل اللہ (اللہ کے اتارے ہوئے علم کو لوگوں تک پہنچانا) وہ اصل کام ہے جو اللہ کو مسلمانوں سے مطلوب ہے۔ "اور اس طرح ہم نے تم کو بیچ کی امت بنا دیا تاکہ تم لوگوں پر بتانے والے (گواہ) بنو اور رسول ہو تم پر بتانے والا (بقرہ ۱۴۳) مسلمان کی اس حیثیت کو حدیث میں انتم شهداء الله فی الارض (تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو) کے الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ کوئی شخص یا گروہ جس منصب پر متعین کیا جائے، اسی خاص منصب کی ادائگی یا عدم ادائگی پر اس کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے۔ اگر وہ اس متعین فریضہ کو ادا کرے تو اس کے لئے ہر قسم کے انعامات ہیں۔ اور اگر وہ اس فریضہ کو چھوڑ دے تو دوسرا کوئی کام، خواہ وہ کتنے ہی بڑے پیمانہ پر کیا جائے: اس کو اپنے آقا کی نظر میں کسی رتبہ کا مستحق نہیں بناتا۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کو اس تنبیہ سے ڈرنا چاہئے جو ان کے پیشرو حاملین کتاب (یہود) کو اس وقت دی گئی جب کہ وہ "اللہ کی طرف سے بتانے" کا کام چھوڑ بیٹھے اور اللہ کی طرف منسوب کر کے (اعراف ۲۸) دوسرے دوسرے کام کرنے لگے:

وَإِذْ اخذ الله ميثاق الذين اوتوا الكتب لتبيننه للناس ولا تكتمونه فنبذوه وراء ظهورهم واشتروا به ثمنا قليلا فبئس ما يشترون ۝ لا تحسبن الذين يفرحون بما اتوا ويحبون ان يحمدوا بما لم يفعلوا فلا تحسبنهم بمفازة من العذاب ولهم عذاب اليم (آل عمران ۸۸-۱۸۷)

اور جب اللہ نے اقرار لیا اہل کتاب سے کہ تم اس کو لوگوں کے سامنے بیان کرو گے اور اس کو نہیں چھپاؤ گے، پھر انھوں نے اس اقرار کو پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا اور اس کے بدلے میں مول لے لیا تھوڑا۔ پس کیسی بری چیز ہے جس کو وہ لے رہے ہیں۔ جو لوگ اپنے اس کردار پر خوش ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو کام نہیں کیا اس پر ان کی تعریف ہو، ایسے لوگوں کو عذاب

سے بچاؤ میں نہ سمجھو اور ان کو دردناک سزا ہوگی۔

کوئی گروہ جو آسمانی کتاب کا حامل ہو، وہ اللہ کی نظر میں اس وقت بے حقیقت ہو جاتا ہے جب کہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق اللہ کی اتاری ہوئی ہدایت کو اللہ کے بندوں تک نہ پہنچا رہا ہو۔ دعوت الی اللہ کے کام کو چھوڑ کر دوسرے کام کرنا اور اس کو مطلوبہ دینی کام کا عنوان دینا صرف آدمی کے جرم میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ اس کو دینی کریڈٹ کا مستحق نہیں بناتا۔

مسائل کا حل دعوت الی اللہ

دعوت کا حکم دیتے ہوئے یہ کہنا کہ "اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا" واضح کرتا ہے کہ دعوتی عمل ہی میں مسلمانوں کے تمام مسائل کے حل کا راز بھی چھپا ہوا ہے۔ دنیا میں مسلمان جن لوگوں کے درمیان ہیں، ان کی طرف سے بے شمار متوقع اور غیر متوقع مشکلیں پیش آتی ہیں۔ مگر مسلمانوں کو ان سب پر الگ الگ طاقت خرچ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے لئے ان کے رب نے ایک ایسا سرا دے دیا ہے جو تمام چیزوں کا جامع ہے۔ اور وہ سرا دعوت الی اللہ ہے۔ ایک شخص اپنی زندگی میں بے شمار ضرورتوں کا محتاج ہوتا ہے۔ مگر وہ ہر ضرورت پر الگ الگ دھیان نہیں دیتا بلکہ اپنی ساری طاقت اس چیز کو حاصل کرنے میں لگا دیتا ہے جس کو "پیسہ" کہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ پیسہ قاضی الحاجات اور حل المشکلات ہے۔ پیسہ بظاہر ایک چیز ہے مگر وہ ہاتھ آجائے تو بقیہ ضرورتیں خود بخود پوری ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ایسا ہی کچھ معاملہ دعوت الی اللہ کے کام کا ہے۔ وہ تمام مسائل جو دنیا کی زندگی میں مسلمانوں کو پیش آئیں، ان سب کا مشترک حل دعوت ہے۔ دعوت الی اللہ میں عصمت من الناس کا راز چھپا ہوا ہے۔ "اللہ منکروں کو راہ نہیں دیتا" کا مطلب یہ ہے کہ دعوتی کام کے بعد یہ ہوگا کہ تمھارے معاندین تمھارے خلاف اپنے عزائم کی تکمیل کے مواقع نہ پا سکیں گے، تمھارے دعوتی عمل کے نتیجہ میں ان کی راہیں مسدود ہوتی چلی جائیں گی۔ دعوت الی اللہ کا یہی تسخیری پہلو ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں ملتا ہے جو آپ نے مکہ کے منکرین کے سامنے پیش کیا تھا:

كلمة واحدة تعطونيها تملكون بها العرب وتدين لكم بها العجم (البدایہ والنہایہ جلد ۲ صفحہ ۱۲۳)

تم مجھے ایک کلمہ دے دو، اس سے تم تمام عرب کے مالک ہو جاؤ گے اور عجم تمھارا مطیع فرمان ہوگا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس قرآنی تعلیم کا مکمل نمونہ ہے۔ آپ نے مختلف پیش آمدہ مسائل کو براہ راست نشانہ بنانے کے بجائے اپنی ساری توجہ دعوت کے کام پر لگا دی۔ اسی سے اللہ نے دوسرے تمام مسائل کے حل کی راہیں نکال دیں۔ مثال کے طور پر معاہدہ حدیبیہ (۶ ھ) کے وقت منکرین نے آپ کو مسائل و مشکلات کے جنگل میں گھیر لیا تھا۔ حتیٰ کہ بیت اللہ الحرام کی زیارت کا حق دینے پر بھی وہ راضی نہ تھے۔ اس وقت آپ نے یہ کیا کہ منکرین کی خود اپنی شرائط کو مانتے ہوئے ان سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ کر لیا۔ یہ منکروں کو ان کی منھ مانگی قیمت دے کر اپنے لئے دعوتی کام کی راہ کھولنا تھا۔ مسئلہ جنگ کی سطح پر تھا مگر آپ نے اس کا حل دعوت کی سطح پر تلاش کیا۔ چنانچہ اس معاہدہ کے بعد جیسے ہی امن ہوا، آپ نے ایک طرف رؤسا و ملوک کو دعوتی وفود بھیجنے شروع کئے اور دوسری طرف عرب کے قبائل

میں دعوت کا کام پوری طاقت کے ساتھ جاری کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی تعداد بہت تیزی سے بڑھنے لگی۔ حدیبیہ کے میدان سے آپ تقریباً ڈیڑھ ہزار مسلمانوں کے ساتھ واپس ہوئے تھے۔ دو سال بعد (۸ھ) آپ نے دس ہزار مسلمانوں کے ساتھ مکہ کو خون بہائے بغیر فتح کر لیا۔ یہی طریق کار تھا جس نے ساتویں صدی ہجری میں تاتاریوں کے خلاف مسلمانوں کی مدد کی۔ تاتاری فوجوں کی یلغار اتنی زبردست تھی کہ اس زمانہ میں کہا جانے لگا تھا کہ اذا قیل لك ان التتر انهزموا فلا تصدق (اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاری ہار گئے تو اس کو مت ماننا) مگر وہ فتنہ جس کے حل سے مسلمانوں کی تلوار عاجز ہو رہی تھی۔ اس کو دعوت نے حل کر دیا۔ مسلمانوں کی دعوتی جدوجہد سے تاتاری بڑی تعداد میں مسلمان ہو گئے۔ وہ لوگ جو مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے نکلے تھے وہ خود مسلمانوں میں شامل ہو کر ملتِ اسلامی کا جزء بن گئے۔

بعد کے دور میں مسلمانوں کو جو مسائل پیش آئے، اس کی واحد سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے اندر دعوتی ذہن ختم ہو گیا۔ وہ "دینی جدوجہد" کے نام پر دوسرے دوسرے کام کرنے لگے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی اس دنیا میں اس قسم کے خود ساختہ طریقوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ آپ اگر گیہوں کے دانہ کے شکل کے پتھر تراشیں اور ان کو زمین میں بوئیں تو ان پتھروں کے ٹکڑوں سے گیہوں کا پودا نہیں اُگ سکتا، خواہ آپ نے اس کی تراش میں کتنی ہی کاریگری دکھائی ہو۔ گیہوں کی فصل گیہوں کے دانوں سے اگتی ہے نہ کہ پتھر کے ہم شکل ٹکڑوں سے۔ اس بات کو یہاں ہم چند مثالوں سے واضح کریں گے۔

دعوتی غفلت کے نتائج

۱۔ موجودہ زمانہ میں مسلم قوموں کے لئے جو مسائل پیدا ہوئے ان میں سب سے بڑا مسئلہ "استعمار" کا سمجھا جاتا ہے۔ اس نے نہ صرف مسلم قوموں کو سیاسی طور مغلوب کیا بلکہ بے شمار دوسرے مصائب میں مبتلا کر دیا۔ انگریزوں کے درمیان اگر تبلیغی کام کیا جاتا تو عین ممکن تھا کہ انگلستان زیادہ بہتر طور پر دوسرا ترکی ثابت ہوتا۔ انگریزوں کے اندر قبولیت اسلام کا مادہ ہونے کا یہ ثبوت کافی ہے کہ عین اقتدار کے زمانہ میں ان کے افراد مسلمان ہوتے رہے۔ مگر پچھلے کئی سو برس کے اندر کبھی مسلمانوں میں یہ ذہن پیدا نہیں ہوا کہ وہ انگریزوں کے اوپر خدا کے دین کی تبلیغ کریں۔ حتیٰ کہ اگر کسی نے اس قسم کی تجویز پیش کی تو کہا گیا کہ یہ انگریزوں کا ایجنٹ ہے اور چاہتا ہے کہ مسلمانوں کو جہادِ آزادی کے محاذ سے ہٹا دے۔ تاہم موجودہ زمانہ میں اس سلسلے میں جو غفلتیں کی گئی ہیں، ان کا میں یہاں ذکر نہیں کروں گا۔ میں انگلستان کی ایک تازہ مطبوعہ کتاب "تاتار خاں کا انگریز"* نامی کتاب کے مصنف گیبریل رونے کے ایک مضمون کا حوالہ دوں گا۔ یہ مضمون لندن کے اخبار سنڈے ٹائمز (۲۲ اکتوبر ۱۹۷۸) میں شائع ہوا ہے۔ انگریز مصنف نے بعض تاریخی دستاویزات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

"For a crucial moment in the thirteenth century England faced the prospect of being totally converted-lock, stock and barrel-into a Muslim country."

تیرھویں صدی عیسوی میں ایک نازک لمحہ میں انگلستان کے لئے یہ امکان پیدا ہو گیا تھا کہ وہ مکمل طور پر ایک مسلم ملک میں تبدیل ہو جائے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انگلستان کا بادشاہ جان لاک لینڈ (۱۱۶۷ـ۱۲۱۶ء) کلیسا کے رویہ کی وجہ

*Gabriel Ronay, *The Tartar Khan's Englishman*, Cassel, London, 1978.

سے عیسائیت سے بیزار ہوگیا۔ اس نے طے کرلیا کہ وہ اپنی رعایا سمیت مسلمان ہوجائے اور مسلم خلیفہ کی اطاعت قبول کرے۔ اس نے ۱۲۱۳ء میں سلطنت موحدین کے امیر ناصر لدین اللہ کے پاس ایک خفیہ وفد بھیجا جو تین افراد پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ سفر کرکے مراکش پہنچے اور امیر ناصر لدین اللہ سے ملے۔ انھوں نے امیر کو شاہ جان کا خط پیش کیا اور ترجمان کے ذریعہ اپنے بادشاہ کی خواہش سے اس کو آگاہ کیا کہ وہ امیر کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنا چاہتا ہے۔ مگر ناصر لدین اللہ دعوت و تبلیغ کا مزاج نہ رکھتا تھا۔ وہ اس پیش کش میں دل چسپی نہ لے سکا اور وفد ناکام اپنے وطن واپس لوٹ گیا۔ شاہ انگلستان کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ سخت غمگین ہوا اور بہت رویا۔ شاہ انگلستان کو اس وقت اگر اسلام میں داخل کرلیا جاتا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ پورا انگلستان مسلمان ہوجاتا اور اس کے بعد استعمار کی تاریخ اور یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ بالکل دوسری ہوتی۔ وہ لوگ جو حالیہ صدیوں میں اسلام کا جھنڈا گرانے کے درپے ہوئے، وہ اسلام کا جھنڈا بلند کرنے والے بن جاتے۔ حتی کہ اسرائیل کا مسئلہ سرے سے وجود میں نہ آتا جس نے آج سارے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

۲۔ اسرائیل کو اگرچہ انگریزوں نے پیدا کیا۔ مگر آج اس کا سب سے بڑا سہارا امریکہ ہے۔ اس مسئلہ نے مسلم دنیا کو بہت بڑے پیمانہ پر متاثر کیا ہے اور پوری مسلم دنیا اس کے خلاف متحد ہے۔ تاہم ۴۰ سال کی طویل جدوجہد کے باوجود ابھی تک مسلمانوں کو اس محاذ پر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ جہاں تک یہودیوں کے قبول اسلام کا تعلق ہے ہمیں اس معاملہ میں کوئی خوش گمانی نہیں۔ اگرچہ اتمام حجت کے لئے ہم کو یہود تک بھی اسلام کی دعوت پہنچانا چاہئے۔ مگر مخصوص وجوہ سے عملاً اس کی بہت کم امید کی جاسکتی ہے کہ یہود کی کوئی قابل لحاظ تعداد اسلام قبول کرے۔ تاہم جہاں تک تبلیغی طریق کار کا تعلق ہے، یہاں بھی اس کی افادیت مسلّم ہے۔ تبلیغی طریق کار کے براہ راست طور پر یہود پر موثر ہونے کی اگرچہ زیادہ امید نہیں کی جاسکتی۔ تاہم بالواسطہ طور پر ان پر اثر انداز ہونے کے پورے امکانات تھے۔ مگر دعوتی ذوق نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان اس کو استعمال نہ کرسکے۔

بالواسطہ طریق کار سے مراد امریکہ پر تبلیغ ہے۔ یہ ایک معلوم بات ہے کہ اسرائیل کا اصل سرپرست امریکہ ہے۔ امریکہ ہی وہ طاقت ہے جو اسرائیل کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ امریکہ، سائنٹفک معاشرہ ہونے کے بنا پر، آج اسلام کی تبلیغ کا سب سے کامیاب میدان بن سکتا ہے۔ مگر مسلمانوں کا تبلیغی کام امریکہ میں صفر کے درجہ میں ہے۔ جب کہ ہندوازم اور بدھ ازم تک نے وہاں اپنے لئے کام کے نہایت قیمتی مواقع پائے ہیں۔ یہاں ہم یاد دلائیں گے کہ ۱۸۸۴ میں جب کہ سید جمال الدین افغانی اور ان کے شاگرد مفتی محمد عبدہ پیرس میں تھے۔ سید جمال الدین افغانی نے اپنے شاگرد سے کہا:

ان اھل اوربا مستعدون لقبول الاسلام اذا احسنت الدعوۃ الیہ۔ فقد قارنوا بین الدین الاسلامی وبین غیرہ فوجدوا البون شاسعا من حیث یسر العقائد وقرب تناولہا۔ واقرب من اھل اوربا الی قبول الاسلام اھل امریکا لانہ لا یوجد بینہم وبین الامم الاسلامیۃ

یورپ کے لوگ اسلام قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اگر اس کی دعوت اچھی طرح ان کے سامنے پیش کی جائے۔ کیوں کہ انھوں نے اسلام اور دوسرے مذہبوں کا تقابلی مطالعہ کیا تو انھوں نے پایا کہ عقیدہ کی سادگی اور عمل کی آسانی کے اعتبار سے دونوں میں بہت فرق ہے۔ اور مغربی اقوام میں

عداوات موروثة ولا اضغان مدفونة مثلما . هوالحال بين المسلمين والاوربيين
جمال الدين الافغانی، تالیف محمود ابوریہ، ۵۰

قبول اسلام کے اعتبار سے سب سے زیادہ قریب امریکہ کے لوگ ہیں۔ کیونکہ ان کے اور اسلامی قوموں کے درمیان اس طرح کی قدیم عداوتیں نہیں ہیں جو مسلمان اور یورپی قوموں میں ہیں۔

اپنے استاد کی زبان سے یہ بات سن کر مفتی محمد عبدہ نے ان سے کہا: پھر کیوں نہ ہم ایسا کریں کہ سیاسی مقابلہ آرائی کو چھوڑ کر امریکہ میں تبلیغ و دعوت کا کام کریں۔ جمال الدین افغانی کے سیاسی ذوق کو تبلیغی کام ایک ہلکا کام معلوم ہوا، انھوں نے کہا: انما انت مثبط (تم تو حوصلہ پست کرنے والی باتیں کرتے ہو) سید جمال الدین افغانی انتہائی غیر معمولی صلاحیت کے آدمی تھے۔ وہ اگر اپنی پوری طاقت تبلیغ و دعوت کے کام میں لگا دیتے تو وہ امریکہ میں زبردست دعوتی کام پھیلا سکتے تھے۔ اور اگر انھوں نے سو سال پہلے یہ کام شروع کر دیا ہوتا تو عجب نہیں کہ آج امریکہ ایک مسلم ملک بن چکا ہوتا۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ امریکہ میں اسلام پھیل جانے کے بعد اسرائیل کی تاریخ اس سے بالکل مختلف ہوتی جو آج ہمیں نظر آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، وہ تاریخ دوبارہ نئی صورت میں دہرائی جاتی جب کہ قبیلہ ہوازن (۶ ہزار) کے مسلمان ہو جانے کے بعد قبیلہ ثقیف (طائف) نے ہتھیار ڈال دئے تھے (ظہور اسلام، صفحہ ۳۹)

۳۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا ایک بہت بڑا مسئلہ ان کی سائنسی اور صنعتی پس ماندگی ہے۔ اسی پس ماندگی کا یہ نتیجہ ہے کہ بے پناہ قربانیوں کے باوجود انھوں نے مغربی استعمار سے جو سیاسی آزادی حاصل کی تھی وہ صنعتی محکومی کی صورت میں دوبارہ ان کی طرف لوٹ آئی۔ حتی کہ تیل پیدا کرنے والے مسلم ممالک اپنے تیل سے جو دولت حاصل کرتے ہیں وہ دوبارہ مختلف بہانوں سے انھیں مغربی ملکوں میں واپس چلی جاتی ہے جو صنعت اور سائنس میں اپنی برتری کی وجہ سے مسلم ملکوں کی تمام سرگرمیوں پر اپنا سایہ ڈالے ہوئے ہیں۔

بظاہر اس مسئلہ کا تبلیغ و دعوت کے کام سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں نہایت گہرا تعلق ہے۔ صنعت اور سائنس کو وجود میں لانے والے بالآخر انسان ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اگر ہاتھ آجائیں تو صنعت اور سائنس خود بخود ہاتھ آ جائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود لکھنا نہیں جانتے تھے (عنکبوت ۴۸) مگر آپ کی دعوت کے ذریعہ ایسے لوگ اسلام میں داخل ہوئے جو لکھنا جانتے تھے۔ انھوں نے اپنے ہاتھ سے آپ کی وحی کو کتابی صورت میں لکھا۔ موجودہ زمانہ میں اس سلسلے میں جاپان کی مثال دی جا سکتی ہے۔ جاپان صنعت اور سائنس کے اعتبار سے آج صفِ اول کی قوموں میں شمار ہوتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں جاپان میں اسلام کی اشاعت کے غیر معمولی امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ جاپان کا بادشاہ میجی (۱۹۱۲ - ۱۸۶۸) جاپان میں مسیحیت کے داخلہ سے سخت متوحش تھا۔ کیوں کہ اس کے نزدیک مسیحیت، مذہبی لباس میں، مغرب کی استعماری طاقتوں کا ہراول دستہ تھا۔ اس نے مسیحیت کو روکنے کے لئے یہ تدبیر سوچی کہ جاپان میں اسلام کو پھیلایا جائے۔ وہ اسلام کو ایک بے ضرر چیز سمجھتا تھا۔ جب کہ مسیحیت کے داخلہ کا مطلب اس کے نزدیک استعمار کا دروازہ کھولنے کے ہم معنی تھا۔ شاہ میجی نے ۱۸۹۱ میں ترکی کے سلطان عبدالحمید ثانی

(۱۸۴۲ - ۱۹۱۸) کے پاس ایک سرکاری وفد بھیجا۔ اس وفد کے پاس شاہ جاپان کا ایک خط تھا جس میں درخواست کی گئی تھی کہ سلطان "اپنے مبلغین کو جاپان بھیجے جو جاپانیوں کو مذہب اسلام کی تعلیمات سے واقف کرائیں اور اس طرح جاپان اور عالم اسلام کے درمیان معنوی رشتہ قائم ہو" مگر نہ سلطان میں دعوت و تبلیغ کا جذبہ تھا اور نہ ان علماء میں جو اس کے گرد و پیش جمع تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ پیش کش شکریہ کے ساتھ واپس کر دی گئی اور اس سمت میں کوئی کام شروع نہ ہو سکا۔ اگر موقع سے فائدہ اٹھایا جاتا اور ۱۸۹۱ سے جاپان میں تبلیغ اسلام کا کام شروع ہو جاتا تو پورے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آج جاپان ایک مسلم ملک ہوتا اور اس کا مسلم ملک ہونا مسلمانوں کی سائنسی اور صنعتی پس ماندگی کی مکمل تلافی کر دیتا۔

۳۔ اب اس مسئلہ کو لیجئے جس کو "ہندستانی مسلمانوں کا مسئلہ" کہا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ بھی تمام تر دعوت و تبلیغ کے کام سے غفلت کی پیداوار ہے۔ ہندستان میں اسلام کی طویل تاریخ میں کبھی تبلیغ کی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ یہاں جو لوگ اسلام کے حلقہ میں داخل ہوئے وہ زیادہ تر خود اپنے جذبہ سے داخل ہوئے نہ کہ حقیقۃً مسلمانوں کی کسی دعوتی کوشش سے۔ صوفیاء کے ہاتھ پر ماضی میں کثرت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ تبدیلی مذہب کے یہ واقعات ارادی طور پر کسی قابل ذکر تبلیغی کوشش کا نتیجہ تھے۔ یہ زیادہ تر قدیم حالات کی بنا پر تھا جب کہ مذہبی تعصب نہیں تھا اور لوگ معمولی اسباب سے اپنا مذہب بدلنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ جواہر لال نہرو نے لکھا ہے: "اسلام کی آمد ہندستان کی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتی ہے۔ اس نے ان خرابیوں کو جو ہندو سماج میں پیدا ہو گئی تھیں، یعنی ذاتوں کی تفریق، چھوت چھات اور انتہا درجہ کی خلوت پسندی کو بالکل آشکارا کر دیا۔ اسلام کے اخوت کے نظریے اور مسلمانوں کی عملی مساوات نے ہندوؤں کے ذہن پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ خصوصاً وہ لوگ جو ہندو سماج میں برابری کے حق سے محروم تھے، اس سے بہت متاثر ہوئے۔ اس نئے تاثر نے ملک میں بہت سی تحریکیں پیدا کیں۔ چنانچہ بہت سے لوگ اپنا مذہب چھوڑ کر نئے مذہب میں شامل ہو گئے۔ ان شامل ہونے والوں میں اکثریت نیچ ذات کی تھی۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے سیاسی اور اقتصادی مصلحتوں کی بنا پر مذہب تبدیل کیا تھا۔ حکمراں طاقت کا مذہب قبول کرنے میں جو فائدہ تھا وہ ظاہر ہے۔ یہاں ایک چیز خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ عام طور پر پوری پوری جماعتیں ہندو سے مسلمان ہو جاتی تھیں۔ اس سے ہمیں اس اثر کا پتہ چلتا ہے جو ان دنوں جماعت حاصل تھا۔ اعلیٰ ذاتوں میں سے تو فرداً فرداً بھی لوگ تبدیل مذہب کرتے تھے۔ مگر نیچی ذاتوں میں ایک مقام کی کوئی پوری رادری یا سارے کا سارا گاؤں اسلام قبول کر لیتا تھا۔" جواہر لال نہرو مزید لکھتے ہیں "اس زمانہ میں لوگوں نے خواہ انفرادی در پر اسلام قبول کیا یا جماعتی طور پر، ہندو قوم نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ انھیں اس کی پروا نہ تھی کہ ان کے کچھ لوگ کسی دوسرے ہب کے پیرو بن جائیں۔ پرانے زمانہ میں تو یہ حال تھا۔ مگر آج کل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اب اگر کوئی شخص اسلام یا مسیحیت ل کرتا ہے تو ہر طرف غم و غصہ کے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں۔ آج کل کا یہ شور و غوغا سیاسی اسباب کے تحت ہے۔ کوئی سری جماعت کا مذہب اختیار کر لیتا ہے تو سمجھا جاتا ہے کہ اس سے اس جماعت کو تقویت پہنچی۔ سیاسی اختیارات میں اس نیابت کے حقوق بڑھے" (ڈسکوری آف انڈیا، ۱۹۴۵، صفحات ۲۷۹ - ۸۱)

ماضی کی تاریخ میں کثرت سے ایسے واقعات موجود ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس ملک میں اگر سنجیدگی کے ساتھ

اسلام کی تبلیغ کی گئی ہوتی تو یہاں اس کی اشاعت کے غیر معمولی امکانات تھے۔ مثلاً ۱۸۵۷ کے نام نہاد جہاد آزادی کے بعد جب مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو بہت سے علماء روپوش ہو گئے۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد ہمالیہ کے جنگلوں میں پھیل گئی اور "دعا تعویذ" کے انداز پر کام کرنے لگی۔ ان کے اثر سے اس علاقہ کے لوگ کثرت سے مسلمان ہو گئے۔ چنانچہ آسام سے لے کر کشمیر تک پہاڑوں میں جو چھوٹی چھوٹی بستیاں پھیلی ہوئی ہیں، ان میں مسلمان بڑی تعداد میں آباد ہیں اور یہ اسی وقت کی یادگار ہیں۔ اسی طرح علماء کی ایک تعداد مشرقی بنگال کے پس ماندہ علاقہ میں داخل ہو گئی جہاں اس زمانہ میں سڑکیں وغیرہ کم ہونے کی وجہ سے انگریزی دار و گیر کا خطرہ نہیں تھا۔ یہ لوگ خاموشی کے ساتھ وہاں خانقاہیں بنا کر رہنے لگے۔ ان کے اثر سے اس علاقہ کی اکثریت مسلمان ہو گئی۔ یہی کام اگر حقیقی شعور اور منصوبہ بندی کے تحت کیا جاتا تو آج ملک کی تاریخ دوسری ہوتی اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کی بھی۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں نے بے شمار تحریکیں اٹھائیں۔ حتیٰ کہ ان کی تحریکوں کے غلغلہ سے فضائے آسمانی گونج اٹھی۔ مگر وہی ایک کام انھوں نے نہ کیا جو ان کے خدا نے سب سے زیادہ ان پر فرض کیا تھا یعنی اللہ کے دین کو اس کے تمام بندوں تک پہنچانا۔ تاہم مسلمانوں کی کسی کوشش کے بغیر دین فطرت لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنا رہا ہے کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب کہ دنیا میں کہیں نہ کہیں یہ واقعہ پیش نہ آتا ہو کہ اللہ کے بندے اللہ کے دین کو قبول کر کے اس میں داخل نہ ہو رہے ہوں۔ مسلمانوں کو تو یہ توفیق بھی نہ ہو سکی کہ وہ کوئی ایسی ایجنسی قائم کرتے جو ان نو مسلموں کے اعداد و شمار جمع کر کے شائع کرتی۔ البتہ عالمی ادارہ مذہب World Religions Institute حال میں کچھ اعداد و شمار شائع کئے ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۷۱ سے ۱۹۷۵ء تک کے پانچ سالوں میں تقریباً پانچ لاکھ آدمیوں نے اسلام قبول کیا۔ یہ اعداد و شمار صرف یورپ اور امریکہ سے متعلق ہیں۔ افریقہ میں مسلمانوں کی پس ماندگی اور عیسائی مشنریوں کی غیر معمولی جد و جہد کے باوجود عیسائی بننے والوں کے مقابلہ میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ السٹریٹیڈ ویکلی کے سابق ایڈیٹر مسٹر خوشونت سنگھ نے اپنے افریقی دورہ کے تاثرات کے ذیل میں لکھا تھا:

"کینیا اور یوگنڈا کے اپنے آخری سفر میں میں نے عیسائیوں اور مسلمانوں کی ان تبلیغی کوششوں کا جائزہ لیا جو نیگرو قبائل کے درمیان جاری ہیں۔ عیسائیوں نے تسلیم کیا کہ مسلم عرب بردہ فروشوں کی ناخوش گوار یادوں کے باوجود افریقہ کے سیاہ فام باشندوں میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد عیسائی بننے والوں سے زیادہ ہے۔"

(السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا۔ ۷ رجولائی ۱۹۷۴ء، صفحہ ۲۷)

اگرچہ ہمارے پاس قطعی اعداد و شمار نہیں ہیں تاہم یہ اندازہ مبالغہ آمیز نہیں کہ آج بھی کسی خاص تبلیغی کوشش کے بغیر دنیا بھر میں جو لوگ مسلمان ہو رہے ہیں ان کی تعداد سالانہ دو لاکھ سے زیادہ ہے۔ اگر ان نو مسلموں سے روابط قائم کئے جائیں اور ان سے معلوم کیا جائے کہ اسلام کی کون سی خصوصیت نے انھیں متاثر کیا اور پھر ان معلومات کی روشنی میں عالمی سطح پر اسلام کی اشاعت کی منصوبہ بندی کی جائے تو صرف دس برس میں اسلام کی سربلندی کا وہ خواب پورا ہو سکتا ہے جس کو دوسری راہوں سے دو سو برس سے حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر وہ حاصل نہیں ہوتا۔

نوٹ: یہ مقالہ ایک تقریر پر مبنی ہے جو ندوۃ المجاہدین کیرلا کے اجلاس بمقام ملاپورم ۱۱ مارچ ۱۹۷۹ کی گئی۔

اسلام کی نظریاتی طاقت

۱۹۴۸ کا واقعہ ہے۔ میرے بڑے بھائی عبدالعزیز خاں (پیدائش ۱۹۲۰) کے پیٹ میں سخت درد اٹھا۔ ڈاکٹر انیس اس وقت اعظم گڑھ میں سول سرجن تھے۔ ان کو بلایا گیا۔ انھوں نے دیکھ کر بتایا کہ یہ اپنڈکس کا کیس ہے اور اس کا علاج صرف آپریشن ہے۔ اس کے بعد انھوں نے مشورہ دیا کہ کو فوراً لکھنؤ لے جایئے۔ "اپنڈکس کا آپریشن تو اس زمانہ میں معمولی آپریشن سمجھا جاتا ہے" میں نے کہا "پھر اس کے لئے آپ ہم کو لکھنؤ کیوں بھیج رہے ہیں۔ یہیں اعظم گڑھ کے اسپتال میں کیوں آپریشن نہیں کر دیتے۔"

ڈاکٹر انیس میری یہ بات سن کر سنجیدہ ہو گئے۔ "آپ صحیح کہتے ہیں" انھوں نے کہا "مگر مسئلہ یہ ہے کہ یہاں ہمارے پاس تربیت یافتہ ہیڈ (کارکن) نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ہم نے پیٹ میں شگاف ڈالنے کے بعد اپنا کام کر لیا اور چاک کو دوبارہ سینے کا وقت آیا تو ہمارے پاس ایسے ماہر آدمی ہونے چاہئیں جو خود سے یہ جان لیں کہ ہمیں کس قسم کے دھاگے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم کو پتلے دھاگے کی ضرورت ہو اور ہمارے پاس کھڑا ہوا آدمی موٹا دھاگا سوئی میں ڈال کر ہمیں دینے لگے تو سارا کام خراب ہو جائے۔ کیوں کہ یہ بے حد نازک لمحہ ہوتا ہے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ ہم اپنے ساتھی کے کام کو دیکھیں اور جب وہ غلط دھاگہ ڈالے تو ہم کہیں کہ دیکھو موٹا دھاگا مت دینا، پتلا دھاگا دینا۔ اس کو بتائے بغیر جاننا چاہئے کہ ایک کے بعد دوسرا کونسا عمل کیا جانے والا ہے اور اس میں اس کو کیا حصہ ادا کرنا ہے۔" سول سرجن نے اپنی گفتگو اس جملہ پر ختم کی —— "میرے ساتھی کو جاننا چاہئے کہ میں آئندہ کیا کرنے والا ہوں۔"

یہی بات ملت کی تعمیر کے لئے بھی صحیح ہے۔ ہر زمانہ میں ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں جو قوم کے لئے اپنی منزل کی طرف سفر کی نئی راہیں کھولتے ہیں۔ یہ حالات لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کرتے ہوئے نہیں آتے۔ وہ عالم واقعات میں خاموشی کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ ملت کے افراد کا امتحان ہوتا ہے کہ کیا وہ اتنے حساس اور باشعور ہیں کہ خود سے جان لیں کہ خدائی اسکیم میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے انھیں کیا کرنا چاہئے۔ اس وقت ملت کے افراد اگر پیشگی اپنے حصہ کا عمل جان لیں تو وہ صرف "۲۳" سال میں کامیابی کی بلندیوں پر پہنچ سکتے ہیں اور اگر وہ قدرت کے اشاروں کو نہ سمجھیں تو دوسری راہوں پر ۲۳ سو سال کا شور و غل بھی کوئی نتیجہ پیدا کرنے والا نہیں ہے۔

ایک مثال لیجئے۔ مکہ میں پیغمبرؐ کی رہنمائی میں جو دعوت اٹھی اور مختلف واقعات کے جلو میں جس طرح اس کی آواز سارے ملک میں پھیل گئی، اس کے نتیجہ میں بعثت کے پندرھویں سال یہ صورت حال تھی کہ قدیم عرب کے ہزاروں لوگ دل سے اسلام کی حقانیت کو مان چکے تھے۔ مگر اس ڈر سے وہ اسلام قبول کرنے سے رکے ہوئے تھے کہ اگر انھوں نے اپنے اسلام کا اعلان کیا تو وہ سارے قریش سے اعلان جنگ کے ہم معنی بن جائے گا۔ یہ ایک بے حد نازک لمحہ تھا۔ ایک طرف قریش کی ایذا رسانی بے حد بڑھ چکی تھی۔ قریش نے مسلمانوں کو بیت اللہ سے روکا۔ ان کو ان کے گھروں اور

جائدادوں سے نکالا، ان کی معاشیات کو تباہ کیا۔ ان کو نیست و نابود کرنے کے لئے وحشیانہ لڑائیاں لڑیں۔ ان کے لئے امن کے ساتھ رہنا ناممکن بنا دیا۔ اس کے نتیجہ میں ایسا ہونا فطری تھا کہ مسلمانوں کے دل میں قریش کے خلاف نفرت اور دشمنی کی آگ بھڑک رہی ہو۔ مگر پیغمبر کی رہنمائی میں انھوں نے قدرت کے اشارہ کو پڑھ لیا۔ انھوں نے جان لیا کہ ربانی منصوبہ میں اس وقت انھیں جو حصہ ادا کرنا ہے وہ صبر ہے نہ کہ میدان مقابلہ میں شجاعت دکھانا۔ یعنی یہ کہ وہ جنگ و جدال کی صورت حال کو ہر قیمت پر ختم کر دیں تاکہ لوگ قریش سے جنگ مول لینے کے اندیشے سے مامون ہو کر اسلام کی طرف بڑھ سکیں۔ انھوں نے اپنی تلواروں کو یک طرفہ طور پر میان میں کر لیا اور قریش کے ظالمانہ مطالبات تک کو مان کر ان سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ کر لیا۔ اس کے مطابق قریش پابند ہو گئے کہ نہ دس برس تک نہ مسلمانوں سے جنگ کریں گے اور نہ نئے اسلام میں داخل ہونے والوں سے۔ حدیبیہ کا معاہدہ (۶ ھ) اللہ کی اسکیم میں اپنے کو شامل کرنے کا ہی معاملہ تھا۔ اگرچہ یہ ناقابل برداشت کو برداشت کرنا تھا۔ مگر جب مسلمانوں نے اللہ کے بھروسہ پر ایسا کیا تو اس کے نتائج ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ جب یہ خبر پھیلی کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان یہ معاہدہ ہو گیا ہے کہ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہیں چھیڑے گا تو متاثر قبیلے قریش کی جارحیت سے بے خوف ہو کر اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ مسلمانوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ معاہدۂ حدیبیہ کے وقت مسلمانوں کی جماعت چودہ سو افراد پر مشتمل تھی اور اس کے بعد صرف دو برس میں ان کی تعداد دس ہزار ہو گئی۔ اب طاقت کا توازن مسلمانوں کی طرف تھا۔ کسی خون خرابہ کے بغیر محض رعب و دبدبہ کے ذریعہ مرکز عرب (مکہ) پر ان کا قبضہ ہو گیا۔

یہی خدائی منصوبہ موجودہ زمانہ میں ایک اور صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ پچھلے سو برس سے مسلمان دیگر قوموں سے لڑائی بھڑائی میں مشغول ہیں۔ ان قوموں سے مسلمانوں کو جو شدید تکلیفیں پہنچیں، انہی کی وجہ سے مسلمانوں کو ان سے دشمنی اور نفرت پیدا ہو گئی اور انھوں نے ان کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ نتیجۃً خود ان قوموں کے اندر بھی مسلمانوں سے اور ان کی ہر چیز سے عناد بڑھتا چلا گیا۔ مگر عین اس وقت جب کہ یہ کش مکش کسی نتیجہ تک پہنچے بغیر جاری تھی، ساری دنیا میں ایک اور انقلاب ابھر آیا۔ یہ وہ فکری انقلاب ہے جو انیسویں صدی کے الحاد کے ردعمل کے طور پر پیدا ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ میں تقابلی مطالعۂ ادیان، صنعتی تہذیب کے نتائج سے مایوسی، سائنس کی موافق مذہب دریافتیں اور دوسرے وجوہ سے ساری دنیا میں ایک نیا ذہن پیدا ہوا ہے۔ لوگ از سر نو مذہبی تعلیمات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم جدید مذہبی دل چسپیوں کی اس فہرست میں اسلام کا نام ابھی بہت پیچھے ہے۔ اس کی وجہ ہماری وہ لفظی اور غیر لفظی لڑائیاں ہیں جو ہم نے غیر مسلم قوموں سے ساری دنیا میں چھیڑ رکھی ہیں۔ نئے موافق امکانات دوبارہ قدرت کی خاموش زبان میں سو برس سے یہ اشارہ کر رہے ہیں کہ آج دوبارہ ایک "صلح حدیبیہ" کی ضرورت ہے۔ اللہ کے دین کو آج مجاہدانہ اقدام نہیں بلکہ صابرانہ پسپائی درکار ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم غیر مسلم اقوام کے خلاف اپنی تمام سیاسی اور احتجاجی سرگرمیاں یک طرفہ طور پر بند کر دیں۔ تاکہ طرفین کے درمیان تناؤ ختم ہو اور لوگ معتدل فضا میں اسلام کا مطالعہ شروع کر سکیں۔ اس طرح وہ قومیں جو آج اسلام کی حریف بنی ہوئی ہیں، اسلام کی مدعو بن جائیں گی۔ دور جدید نے اسلام کے حق میں جو

علمی تصدیقات فراہم کی ہیں وہ اپنا کام کرنا شروع کریں گی۔ ایک نسل بھی نہیں گزرے گی کہ وہ وقت سامنے آجائے گا جس کی پیشین گوئی حدیث میں ان الفاظ میں کی گئی ہے ــــــ " کوئی خیمہ یا مکان ایسا نہیں بچے گا جس میں اسلام داخل نہ ہو گیا ہو۔"

نئے امکانات

موجودہ زمانہ میں اسلام کی دعوت و اشاعت کے جو امکانات پیدا ہوئے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ یہ دریافت کہ ساری کائنات کا مادہ ایک ہے اور وہ ایک قانون کے تحت چل رہی ہے، اس سے توحید کا عقیدہ آج کے انسان کے لئے ہمیشہ سے زیادہ قابل فہم بن گیا ہے۔

۲۔ بہت سی دریافتیں ہیں جنھوں نے آخرت کو قابل فہم بنا دیا ہے۔ مثلاً ٹیلی وژن کے ذریعہ اس بات کا قابل فہم ہو جانا کہ موجودہ دنیا کے اندر ایک اور دنیا موجود ہو سکتی ہے اگرچہ وہ ظاہری آنکھوں سے دکھائی نہ دیتی ہو۔

۳۔ یہ دریافت کہ انسان اپنی محدودیتوں کی وجہ سے صرف جزئی علم تک پہنچ سکتا ہے، اس سے وحی والہام کی اہمیت ثابت ہو جاتی ہے۔

۴۔ موجودہ زمانہ میں مذاہب کے تقابلی مطالعہ نے ثابت کیا ہے کہ تمام مذاہب میں اسلام ہی واحد مذہب ہے جس کو تاریخی اعتباریت حاصل ہے۔

۵۔ سیاسی ادارہ کو مذہبی عقیدہ سے جدا کرنے کا کام جو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں شروع ہوا تھا، اس کو مغرب کے فکری انقلاب نے تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔ آج توحید کی دعوت کو ان غیر ضروری مشکلات سے آزاد رہ کر انجام دیا جا سکتا ہے جو قدیم زمانہ کی مشرکانہ بادشاہت کی وجہ سے پیش آتی تھیں۔

۶۔ جدید جمہوری انقلاب نے ساری دنیا میں آزادی اظہار خیال کو انسان کا فطری حق ثابت کیا ہے۔ اس نے تاریخ میں پہلی بار یہ امکان پیدا کیا ہے کہ توحید کی دعوت کو سیاسی ٹکراؤ کے بغیر جاری کیا جا سکے۔

۷۔ پریس کی ایجاد، مواصلاتی ذرائع کی ترقی اور ابلاغ عامہ کے جدید طریقوں کا ظہور میں آنا۔ ان چیزوں نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ جدید ذرائع کو استعمال کر کے بے حد وسیع پیمانہ پر اسلام کی اشاعت کی جا سکے۔

۸۔ جدید اقتصادی صورتوں نے مسلمانوں کو ہر خطہ زمین پر پہنچا دیا ہے۔ ان مسلمانوں کو منظم کر کے اسلام کی دعوت کو بیک وقت عالمی سطح پر شروع کیا جا سکتا ہے جو اس سے پہلے کبھی ممکن نہ ہوا تھا۔

۹۔ موجودہ زمانہ میں بے شمار نئی تحقیقات سامنے آئی ہیں جو اسلام کی مؤید ہیں۔ ان کو استعمال کر کے اسلامی علم کلام کو خالص حقائق کی بنیاد پر مرتب کیا جا سکتا ہے جو قدیم قیاسی علم کلام کے مقابلہ میں بے شمار گنا زیادہ طاقت ور ہو گا۔

۱۰۔ صحیح فلسفہ اور بہتر زندگی پانے کی بے شمار کوششوں کے بعد آج کا انسان مایوسی کے مقام پر کھڑا ہوا ہے۔ اس صورت حال نے اس بات کا امکان پیدا کر دیا ہے کہ اسلام کو نئے صحیح تر نظریہ کی حیثیت سے سامنے لایا جائے اور آج کا انسان اس کو اپنے دل کی آواز پا کر قبول کرے۔

چند مثالیں

بیسویں صدی کے آغاز میں یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ یورپ اپنی تمام مادی ترقیوں کے باوجود ایک احساس ناکامی سے دوچار ہے۔ اس کو نظر آرہا ہے کہ اس کی سائنس اور ٹکنالوجی نے اس کو مشینیں اور سواریاں تو دیں، مگر اس کو وہ فلسفۂ حیات نہ مل سکا جو اس کو یقین کی دولت عطا کرتا۔ انگریز فلسفی بریڈلے (۱۹۲۴ - ۱۸۴۶) نے موجودہ صدی کے ربع اول میں کہا تھا:

"دنیا کو ایک نئے مذہب (New religion) کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایک ایسا عقیدہ چاہئے جو تمام انسانی مفادات کا تعین کرے اور ضروری تناسب کے ساتھ اس کے جواز کی بنیاد ہو، اور اسی کے ساتھ وہ شعور عطا کرے جس سے انسان اس پر اعتماد کے ساتھ قائم ہو سکے۔"

Essays on Truth & Reality. p. 446

اس کے بعد خود مغربی ممالک میں ایسے لوگ اٹھے جنھوں نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ ان کے پاس خدا کی جو امانت ہے، وہ یورپ کی اس فکری کمی کو پورا کر سکتی ہے، وہ اس کو لے کر اٹھیں اور اہل عالم تک اس کو پہنچا کر اپنا خدائی فریضہ ادا کریں۔ لارڈ پی۔ ایچ۔ کے۔ لوتھین (۱۹۴۰-۱۸۸۲) چالیس سال پہلے ہندستان آئے تھے اور ۱۹۳۸ میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقسیم اسناد کے جلسہ کی صدارت کی تھی۔ اس موقع پر انھوں نے اپنے خطبہ میں کہا تھا:

"یورپ اپنے سیاسی، معاشی، تمدنی اور عائلی مسائل کا تسلی بخش حل دریافت کرنے میں ناکام ہو چکا ہے۔ آپ حضرات کا دعویٰ ہے کہ اسلام زندگی کا مکمل دستور العمل ہے اور اس میں اجتماعی مسائل کا بہترین حل موجود ہے۔ میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ بلاد مغرب میں جا کر وہاں کے باشندوں کو اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کریں۔" (خطبہ تقسیم اسناد)

پروفیسر منٹگومری واٹ (- ۱۹۰۹) نے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں مسلمانوں کی غیرت کو پکارا۔ پیغمبر اسلام کی سیرت پر اپنی کتاب میں انھوں نے لکھا:

"دنیا بہت تیزی سے ایک ہوتی جا رہی ہے اور اس ایک دنیا میں یہ رجحان بڑھ رہا ہے کہ اس کے اندر اتحاد اور یکسانیت ہو۔ اس رجحان کی وجہ سے یقیناً وہ دن آئے گا جب کہ یہاں اخلاقی اصولوں کا ایک ایسا نظام ہوگا جو نہ صرف عالمی جواز رکھتا ہوگا بلکہ فی الواقع وہ ساری دنیا میں تسلیم کیا جا چکا ہوگا۔ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ محمد تمام نوع انسانی کے لئے ایک عملی اور اخلاقی نمونہ ہیں۔ یہ کہہ کر وہ دنیا کو دعوت دے رہے ہیں کہ وہ ان پر رائے قائم کر سکے۔ اب تک یہ معاملہ دنیا کی بہت کم توجہ اپنی طرف مائل کر سکا ہے۔ مگر اسلام کی قوت کی وجہ سے یہ بالآخر اہمیت حاصل کرلے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا محمد کی زندگی اور تعلیمات میں سیکھنے کے قابل کچھ اصول ہیں جو مستقبل کی دنیا کو واحد اخلاقی نظام عطا کر سکیں

"دنیا کو ابھی تک اس سوال کا آخری جواب نہیں دیا گیا ہے۔ مسلمانوں نے محمد کے بارے میں اپنے دعوے کی تائید میں اب تک جو کچھ کہا ہے۔ وہ اس سلسلہ میں بس ایک ابتدائی بیان کی حیثیت رکھتا ہے اور بہت کم غیر مسلم

اس سے مطمئن ہوسکے ہیں۔ تاہم یہ موضوع ابھی کھلا ہوا ہے۔ دنیا کا ردعمل محمدؐ کے بارے میں کیا ہوتا ہے۔ یہ کسی حد تک اس پر منحصر ہے کہ آج کے مسلمان اس کے لئے کیا کرتے ہیں۔ انھیں اب بھی یہ موقع حاصل ہے کہ بقیہ دنیا کے سامنے اپنے مقدمہ کو زیادہ بہتر اور مکمل طور پر پیش کریں۔ کیا مسلمان یہ دکھا سکیں گے کہ ایک متحدہ دنیا کی اخلاقیات کے لئے محمدؐ کی زندگی ایک آئیڈیل انسان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر مسلمان اپنے مقدمہ کو بہتر طور پر پیش کر سکیں تو عیسائیوں میں وہ ایسے لوگ پائیں گے جو اس کو سننے کے لئے تیار ہیں۔" (صفحہ ۳۳۳)

Montgomery Watt, *Mohammad As Model For Universal Morality*

اس طرح کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مگر کیسی عجیب بات ہے۔ مسلمان اس پوری مدت میں مغربی قوموں سے سیاسی لڑائی تو لڑتے رہے جس میں مغرب صریح طور پر ان کے اوپر برتری رکھتا تھا۔ مگر فکری اور اعتقادی میدان، جو مغربی قوموں کا کمزور گوشہ تھا، وہاں ان پر کوئی جدوجہد نہ کی۔ نادانی کی ایسی عجیب غریب مثال شاید پوری تاریخ میں کوئی دوسری نہیں ملے گی۔

فکری اور نظریاتی طاقت کی اہمیت کیا ہے، اس کی ایک مثال یہاں ہم خود جدید مغربی تاریخ سے پیش کریں گے۔ پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴) کے دوران روس میں کمیونسٹوں کا غلبہ برطانیہ عظمیٰ کے لئے ایک سوالیہ نشان تھا۔ کیونکہ یہ برطانوی سلطنت کے "مشرقی حصہ" کے لئے خطرہ کے ہم معنی تھا۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں انگریز فوجی افسروں کا ایک وفد صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے سمرقند پہنچا، اگرچہ بظاہر یہ بتایا گیا تھا کہ یہ ایک تجارتی وفد ہے اور وسط ایشیا کی کپاس کا سودا کرنے جا رہا ہے۔ وفد کے ممبران یہ تھے:

کرنل بیلی F.M. Bailey

کرنل ایتھرٹن P.T. Etherton

میجر بلیکر L.V.S. Blacker

واپسی کے بعد کرنل ایتھرٹن نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے "وسط ایشیا کے قلب میں"

In The Heart Of Central Asia

انھوں نے اپنی اس کتاب میں جو باتیں لکھیں، ان میں سے ایک یہ تھی:

The new set of ideas of the Bolsheviks was potentially much more of a menace to English domination in the Orient than all the Czar's armies in the past.

یعنی بالشویکوں کے نظریات بالقوہ طور پر برطانیہ کے مشرقی مقبوضات کے لئے اس سے زیادہ بڑا خطرہ تھا جتنا کہ ماضی میں زار کی تمام فوجیں ہوسکتی تھیں۔ (۹۳-۹۲) اسلام جو رب العالمین کا بھیجا ہوا دین ہے، اس کی نظریاتی طاقت دوسرے تمام نظریات سے بے شمار گنا زیادہ ہے۔ اگر مسلمان اس کو لے کر اٹھیں تو ان کا تسخیری سیلاب اتنا بے پناہ ہوگا جس کے مقابلہ میں "بڑی طاقتوں" کی تمام فوجیں بھی عاجز ہو کر رہ جائیں۔

دنیا کی موجودہ آبادی تقریباً چار ارب ہے۔ ان میں سے دو آدمی ہر سکنڈ میں مرجاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ۲۴ گھنٹے میں تقریباً ایک لاکھ ۷۳ ہزار آدمی اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں تاکہ خدا کے دربار میں حاضر ہو کر یہ گواہی دیں کہ باخبر کرنے والوں نے ہم کو حقیقت سے باخبر نہیں کیا —— کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو کروروں انسانوں سے ان کی آخرت چھین رہے ہیں۔ مگر خود اپنے بارہ میں انھیں یقین ہے کہ ان کی آخرت کسی حال میں چھننے والی نہیں۔

وہ شہر کی ایک پُر رونق سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ لوگ پیدل اور سواریوں پر ادھر سے اُدھر جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

"یہ نازک چہرے، یہ خوب صورت جسم، یہ ہنستی ہوئی مورتیں مرنے کے بعد بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈال دی جائیں گی"۔ یہ سوچ کر بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اور پھر ایک آہ کے ساتھ اس کی زبان سے وہ الفاظ نکلے جن کو انسانوں کے سوا پوری کائنات نے سنا: "کیا اس سے بڑی کوئی بات ہے جس کے لئے آدمی تڑپے، کیا اس سے بڑی کوئی خبر ہے جس کو بتانے والے دوسروں کو بتائیں"۔

کیسی عجیب بات ہے۔ آدمی اُسی بات سے بے خبر ہے جس کو اسے سب سے زیادہ جاننا چاہئے۔ اُسی خبر کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے کوئی نہیں اٹھتا جس کو سب سے زیادہ دوسروں تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔

عقلیاتِ اسلام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مذہب اور لامذہبیت کی کش مکش اگرچہ اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسان کی تاریخ پرانی ہے۔ تاہم پچھلی صدی سے پہلے اس نے کبھی علمی الحاد کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ انیسویں صدی کا فکری انقلاب اور بالآخر ایک طرف ڈاردن (۱۸۸۲ — ۱۸۰۹) اور دوسری طرف مارکس (۱۸۸۳ — ۱۸۱۸) کا ظہور انسانی تاریخ کا پہلا واقعہ تھا جب کہ الحاد نے یہ کامیابی حاصل کی کہ وہ علمی منطق اور منظم فلسفہ کے زور پر ایک پوری نسل کے ذہن پر چھا جائے اور مذہب کو دفاع کے مقام پر پناہ لینے کے لئے مجبور کر دے۔

الحاد کی ان دونوں لہروں کو الگ الگ سمجھنے کے لئے ہم ایک کو سائنسی الحاد اور دوسرے کو سوشلسٹ الحاد کہیں گے۔ اولاً سائنسی الحاد کو ابھرنے کا موقع ملا اور اس نے دنیا کے تقریباً تمام حصہ کو کسی نہ کسی طرح متاثر کر ڈالا۔ انیسویں صدی کے آخر تک سائنسی الحاد تعلیم یافتہ دنیا کے ذہنوں پر اس قدر چھا چکا تھا کہ کچھ لوگوں کو یہاں تک کہنے کی جرأت ہوئی کہ "خدا مر چکا ہے"۔ اب، کم از کم علمی طور پر، اس کے دوبارہ زندہ ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

مگر سائنسی الحاد "آزاد دنیا" کا الحاد تھا اور آزادانہ غور و فکر کی فضا میں جس طرح ایک نقطۂ نظر کو غلط قرار دینے کے مواقع ہوتے ہیں اسی طرح یہ امکان بھی رہتا ہے کہ دوبارہ نئے دلائل کے ساتھ اس کو صحیح ثابت کیا جا سکے۔ مذہب کے ساتھ یہی ہوا۔ بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی گزری تھی کہ خود سائنس کی دنیا میں ایسی تحقیقات سامنے آنا شروع ہو گئیں جنھوں نے ان تمام مفروضات کو بالکل منہدم کر دیا جن کے اوپر علمی الحاد کی بنیاد کھڑی کی گئی تھی۔ جولین ہکسلے (۱۹۷۵-۱۸۸۷) کی کتاب انسان تنہا کھڑا ہوتا ہے (Man Stands Alone) کے اگلے ایڈیشن کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ امریکی سائنسداں کریسی مارین (۱۹۴۶ — ۱۸۸۴) نے اعلان کیا: انسان تنہا نہیں کھڑا ہو سکتا (Man does not Stand Alone)

وائٹ ہیڈ (۱۹۴۷ — ۱۸۶۱) اڈنگٹن (۱۹۴۴ — ۱۸۸۲) اور جیمز جینز (۱۹۴۶ — ۱۸۷۷) نے علمی الحاد کے خلاف جو کروسیڈ شروع کی تھی وہ اب اس نوبت کو پہنچ چکی ہے کہ ساری مغربی دنیا کی نئی نسل میں وہ جوابی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی ہے جس کو غلط طور پر "اینٹی سائنس" کہا جاتا ہے۔ کائنات کی ملحدانہ تعبیر بے دلیل ثابت ہو گئی۔ عقلی ذرائع سے اخلاقیات کا کوئی معیار تلاش کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ سماجی علوم کسی بہتر انسانی سماج کی تشکیل میں ناکام رہے۔ صنعتی تہذیب انسان کو حقیقی خوشی نہ دے سکی۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ساری آزاد دنیا میں مذہب کی طرف واپسی کا رجحان پیدا ہو چکا ہے۔ تقریباً ۵۰ سال کے عارضی وقفہ کے بعد دوبارہ وہ مذہبی دور واپس آنا شروع ہو گیا ہے جو اس سے پہلے دنیا میں پایا جاتا تھا۔

مگر سوشلسٹ الحاد کا معاملہ مکمل طور پر مختلف ہے۔ سائنسی الحاد اگر فکری الحاد ہے تو سوشلسٹ الحاد جبری الحاد۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو دلیل سے ختم کرنا انتہائی دشوار ہے۔

پہلی عالمی جنگ نے سوشلسٹ الحاد کو موقع دیا کہ ۱۹۱۷ میں وہ دنیا کے ایک "سرحدی ملک" پر اپنا سیاسی اقتدار قائم کرے۔ اس کے صرف ۳۰ سال بعد دوسری عالمی جنگ کے حالات نے اس کے رقبہ اور طاقت کو بہت زیادہ بڑھا دیا۔

۱۹۴۸ میں چین کا سرخ انقلاب اس کی تیسری بڑی چھلانگ تھی جس نے اس کو پوری "قدیم دنیا" میں سب سے بڑی طاقت کی حیثیت دے دی ۔ اپریل ۱۹۷۸ میں افغانستان میں کمیونسٹ پارٹی کی حکومت قائم ہونا پوری غیر اشتراکی دنیا خاص طور پر مشرقی دنیا کے لئے سرخ انتباہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ کمیونزم اپنی نظریاتی طاقت سے قوموں کو مسخر نہ کر سکا ۔ اب وہ سازشوں اور ہتھیاروں کے ذریعہ ملکوں کو فتح کرنا چاہتا ہے ۔ قدرتی طور پر سرخ منصوبہ کے اس دوسرے مرحلہ کا رخ پس ماندہ مشرق کی طرف ہے جب کہ پہلے مرحلہ میں اشتراکی مفکرین کو نظر آیا تھا کہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک کے اوپر سب سے پہلے سرخ انقلاب کا آفتاب طلوع ہوگا ۔ مسلم ملکوں (مثلاً ایران، پاکستان) میں باہمی لڑائیوں نے اندرونی طور پر جو سیاسی عدم استحکام پیدا کر رکھا ہے، اس نے جدید کمیونسٹ منصوبہ کے لئے نہایت موافق حالات پیدا کر دیئے ہیں ۔ امیر بخارا کی نادانیوں نے موجودہ صدی کے آغاز میں بخارا و سمرقند میں سرخ انقلاب کے لئے راستہ صاف کیا تھا ، اب صدی کے اختتام پر اسلام کے نام پر اٹھنے والی تحریکیں دوبارہ نہایت اخلاص کے ساتھ ایسی سرگرمیوں میں مصروف ہیں جو صرف غیر اسلامی قوتوں کے لئے راستہ ہموار کرنے والی ہیں ۔ بعض سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ افغانستان کی تاریخ مستقبل قریب میں پڑوس کے مسلم ملکوں میں بھی دہرائی جا سکتی ہے ۔ ایک مبصر نے لکھا ہے:

> He has correctly analysed the Afghan coup as a significant advance of Soviet interests in Asia. I would go further and predict that within five to ten years (if the regime is not overthrown by CIA or SAVAK) the Soviet Union will have militarily strengthened Afghanistan to the point at which it will be strong enough to provide military support to guerrila groups in Pakistan and Iran.
>
> *The Times of India,* May 31, 1978. p. 6

انھوں نے درست طور پر اندازہ کیا ہے کہ افغانستان کا انقلاب ایشیا میں روس کی دل چسپی کی طرف ایک معنی خیز پیش قدمی ہے ۔ میں اس سے آگے بڑھ کر یہ پیش گوئی کروں گا کہ اگر امریکہ یا ایران نے موجودہ افغانی حکومت کا تختہ الٹ نہ دیا تو روس پانچ سے دس سال کے اندر افغانستان کو فوجی اعتبار سے اتنا طاقت ور بنا دے گا کہ وہ اس قابل ہو جائے گا کہ ایران اور پاکستان کی گوریلا جماعتوں کی فوجی مدد کر سکے ۔"

سوشلسٹ الحاد کے اندر یہ حیرت انگیز صلاحیت ہے کہ اس کا غلبہ صرف سیاسی غلبہ نہیں ہوتا ۔ ایک بار غالب آنے کے بعد وہ انسان کے ذہن کو مکمل طور پر اپنے کنٹرول میں لے لیتا ہے ۔ اس کی منطق کے مطابق اس کے لئے نہ صرف پیداواری ذرائع کو سرکاری ملکیت میں لینا ضروری ہے بلکہ فکری اداروں کو بھی اپنے قبضہ میں لینے کا اسے پورا حق حاصل ہے ۔ اس کی عملداری میں کسی کے لئے ممکن نہیں رہتا کہ سرکاری خطوط کے علاوہ کسی دوسرے ڈھنگ سے سوچ سکے ۔ سوشلسٹ الحاد کو اگر جبری الحاد کہا جائے تو اس کے عملی مفہوم کے اعتبار سے بالکل درست ہوگا ۔ کوپرنیکس کو جس جبریت فکر کی شکایت تھی وہ سوشلسٹ الحاد کے نظام میں دوبارہ شدید تر شکل میں لوٹ آئی ہے ۔ یہاں سرکاری اعلان میں "زمین کی حرکت" مکمل طور پر رک جاتی ہے ۔ خواہ اس کے باہر وہ مکمل طور پر گھوم رہی ہو ۔

یہ جبری الحاد آج انسانیت کے تقریباً نصف حصہ کو نگل چکا ہے ۔ اب وہ بقیہ نصف حصہ کو نگلنے کی طرف

خاموشی سے بڑھ رہا ہے۔ قدیم زمانہ میں یاجوج و ماجوج کے خلاف بند تعمیر کرنے کا کام اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین یا سائرس (۵۲۹ ـ ۶۰۰ ق م) سے لیا تھا جس نے بحیرۂ کیسپین اور بحیرۂ اسود کے درمیان پہاڑی دروں کو بند کر کے اس طوفان کو متمدن دنیا کے شمال میں روک دیا۔ موجودہ زمانہ میں سرخ سیلاب پر روک لگانے کا کام اب تک امریکہ انجام دیتا رہا ہے۔ تاہم یہ "چھتری" اب مشرقی دنیا کے لئے زیادہ قابل اعتماد نہیں رہی ہے۔ کیوبا میں صدر امریکہ مسٹر جان کنیڈی کے صرف ایک الٹی میٹم (۱۹۶۲) نے کمیونسٹ دراندازوں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا جب کہ ویٹ نام میں چھ سالہ جنگ (۷۱ - ۱۹۶۵) کے بعد بھی وہ کمیونسٹ سیلاب کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ کی طاقت اٹلانٹک کے مغربی سمت میں جتنی کارآمد ہے، اٹلانٹک کے مشرقی سمت میں نہیں ہے

ان حالات میں فرض کے درجہ میں ضروری ہو چکا ہے کہ اس لاحاصل مشغلہ کو ترک کر دیا جائے جس کو ملی سیاست یا اسلامی سیاست کہا جاتا ہے۔ مسلم اکثریت کے ملکوں میں یہ کام نظام اسلام یا نظام مصطفیٰ کے نام پر حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی تحریکوں کی صورت میں ہو رہا ہے۔ اور اقلیتی ملکوں میں تحفظ حقوق کے نام پر احتجاج و مطالبات کی صورت میں جاری ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ان بے معنی ہنگامہ آرائیوں کا کوئی بھی تعلق اسلام یا مسلمانوں کے مفاد سے نہیں۔ اس قسم کے لوگ اجتماعی زندگی میں اسلام کی جڑیں مضبوط کرنے سے پہلے اسلامی انقلاب کا نعرہ لے کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ جب کہ اجتماعی استحکام سے پہلے اجتماعی انقلاب کبھی ممکن نہیں ہوتا۔ یہ قرآن کے الفاظ میں، ایک ایسے کام کا کریڈٹ لینا ہے جس کو آدمی نے کیا نہیں (یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا) اس قسم کی نعروں کی سیاست نہ صرف وقت اور قوت کے ضیاع کے ہم معنی ہے۔ بلکہ وہ تخریبی عناصر کو ابھرنے کا موقع دے کر معاملہ کو پہلے سے زیادہ مشکل اور پیچیدہ بنا دیتی ہے۔

بلاشبہ یہ مطلوب ہے کہ اجتماعی زندگی کے اوپر اسلام کا غلبہ ہو۔ مگر یہ غلبہ خاموش تعمیری عمل سے ہوگا نہ کہ محض سیاسی شور و غل سے۔ اخوانی رہنما شریف کامل نے کہا کہ مصر میں اخوان المسلمین کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ ہم قبل از وقت سیاست میں داخل ہو گئے (تدخلنا فی السیاسۃ قبل وقتها)۔ مگر بات صرف اتنی نہیں ہے۔ جب بھی کوئی گروہ فیصلہ کن حیثیت حاصل کرنے سے پہلے عملی سیاست میں داخل ہوگا۔ وہ اپنی کمی کو دوسروں کے ذریعہ پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔ مگر ایسی تدبیروں کا نتیجہ ہمیشہ الٹا نکلتا ہے۔ اخوان المسلمین نے اپنی کمی کو فوجی افسروں کے ذریعہ پورا کرنا چاہا۔ مگر جب انقلاب آیا تو فوجی افسر اخوانیوں کو دھکیل کر خود اقتدار پر قابض ہو گئے۔ پاکستان میں محمد ایوب خاں کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے وہاں کے "اسلام پسند"، شیخ مجیب الرحمٰن مسٹر بھٹو کے ساتھ مل گئے۔ مگر جب انقلاب آیا تو ملک کے ایک حصہ پر شیخ مجیب الرحمٰن کا اور دوسرے حصہ پر مسٹر بھٹو کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ یہی ڈراما اب ایران میں ہو رہا ہے۔ شاہ ایران کو بے دخل کرنے کیلئے شیعہ علماء (Black Revolutionary) اور کمیونسٹ گروہ (Red Revolutionary) دونوں ایک ہو گئے ہیں۔ اگر یہ اتحاد اپنے مقصد میں کامیاب ہو تو انقلاب آنے کے بعد ایران کی حکومت پر بالآخر جس کا قبضہ ہوگا وہ کمیونسٹ گروہ ہوگا نہ کہ مذہبی علماء ـــ اس طرح موجودہ زمانہ کی اسلامی سیاست نے ہر جگہ صرف غیر اسلامی سیاست کو غالب کرنے کا کام انجام دیا ہے۔

حالات کی نزاکت کا تقاضا ہے کہ اس قسم کی لاحاصل سرگرمیوں کو مطلق ترک کر دیا جائے اور اپنی ساری طاقت

تعمیری اور دعوتی کاموں میں لگا دی جائے۔

جہاں تک سائنسی الحاد کا تعلق ہے، اس کے مقابلہ کے لئے ہم کو صرف یہ کرنا ہے کہ سائنسی دریافتوں کے ان پہلوؤں کو جانیں جو دینی معتقدات کی تصدیق کرنے والے ہیں اور ان کو دین کے اثبات وحمایت میں استعمال کریں۔ سائنسی الحاد کو رد کرنے کے لئے سب سے بہتر ہتھیار وہی ہے جو خود سائنس نے موجودہ زمانہ میں فراہم کر دیا ہے۔

مگر اشتراکی الحاد کا معاملہ مکمل طور پر مختلف ہے۔ یہ تاریخ کا واحد نظام ہے جو انسان کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ وہ کلی جبر کی بدترین مثال ہے۔ اس لئے اس کا نظریاتی مقابلہ کرنے کے ساتھ یہ بھی کرنا ہے کہ اس کی عملی گرفت سے بچنے کی ہر ممکن تدبیر کی جائے۔ موجودہ حالات میں مسلمانوں کی باہمی سیاسی لڑائیاں اشتراکی توسیع کے لئے زرخیز زمین فراہم کرنے کا کام کر رہی ہیں۔ اس کی تازہ مثال افغانستان کا انقلاب ہے۔ یہاں مسلمانوں کا ایک طبقہ مسلمانوں کے دوسرے طبقہ (شاہی خاندان) کا سیاسی مخالف بن گیا۔ اس باہمی اختلاف نے روس کو موقع دیا کہ وہ ایک طبقہ کی حمایت کے نام پر ملک میں گھس آئے۔ اس نے اس طبقہ کا ساتھ دے کر اس کو کامیاب بنایا اور پھر اس کے ذریعہ سے بالواسطہ طور پر ملک کے اوپر قابض ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ترک سیاست موجودہ زمانہ میں احیائے اسلام کی طرف سفر کا پہلا زینہ ہے۔ روایتوں میں بعد کے دور کے جو واقعات بتائے گئے ہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جس کو امام مسلم نے ابو ہریرہ رضؓ کے واسطے سے نقل کیا ہے:

قال لا تقوم الساعة حتى يغزوها سبعون الفا من بني اسحق فاذا جاؤها نزلوا فلم يقاتلوا بسلاح ولم يرموا بسهم قالوا لا اله الا الله والله اكبر فيسقط احد جانبيها۔ ثم يقولون الثانية لا اله الا الله والله اكبر فيسقط جانبها الآخر۔ ثم يقولون الثالثة لا اله الا الله والله اكبر فيفرج لهم فيدخلوها فيغنمون

(مسلم)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ بنی اسحاق (مسلمانوں) کے ستر ہزار آدمی ایک شہر پر حملہ نہ کریں۔ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو کسی ہتھیار سے جنگ نہیں کریں گے اور نہ کوئی تیر پھینکیں گے۔ وہ صرف لا الہ الا اللہ اللہ اکبر کہیں گے اور شہر کا ایک حصہ گر جائے گا۔ پھر وہ دوسری بار لا الہ الا اللہ اللہ اکبر کہیں گے اور شہر کا دوسرا حصہ گر جائے گا۔ پھر وہ تیسری بار لا الہ الا اللہ اللہ اکبر کہیں گے اور وہ ان کے لئے کھول دیا جائے گا۔ وہ اس کے اندر داخل ہو جائیں گے اور مال غنیمت حاصل کریں گے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشین گوئی کا مصداق کیا ہے۔ اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ تاہم اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسا بھی کوئی دور امت پر آ سکتا ہے جب کہ اس کی فکری اور نظریاتی طاقت ہی قوموں کو زیر کرنے کے لئے کافی ہو۔ سیاسی تصادم اور فوجی مقابلہ کی ضرورت باقی نہ رہے۔ موجودہ حالات اگر حقیقی طور پر اس کا مصداق نہ ہوں، تب بھی اعتباری طور پر یقیناً یہ پیشین گوئی اس پر چسپاں ہوتی ہے۔ کیوں کہ موجودہ زمانہ نے پچھلے تمام زمانوں سے زیادہ اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ انکار کی طاقت سے قوموں کو مسخر کیا جا سکے (جون ۱۹۷۸)

خارجی ہدایت کی ضرورت

انسان آزاد پیدا ہوا ہے. مگر اس کو نہیں معلوم کہ وہ اپنی آزادی کو کس طرح استعمال کرے. کائنات کی غیر ذی روح اشیاء قانون فطرت کے تحت اپنا عمل کر رہی ہیں اور ذی روح اشیاء جبلّت کے تحت. ساری معلوم دنیا میں یہ صرف انسان ہے جس کو اپنی زندگی کا نقشہ خود بنانا ہوتا ہے. مگر تجربہ بتاتا ہے کہ انسان، اپنی ساری اعلیٰ صلاحیتوں کے باوجود یہ نہیں جانتا کہ اپنی زندگی کا نقشہ کس طرح بنائے۔ ایک انتہائی مکمل کائنات کے اندر انسان ایک نامکمل وجود ہے۔

کائنات میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ایسی نہیں جو بقیہ کائنات سے الگ ہو. اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی کا نظام بنانے کے لیے پوری کائنات کا علم درکار ہے. انسان اس عظیم کائنات کا محض ایک جزوی حصہ ہے مگر اس جزو کو سمجھنا بھی اسی وقت ممکن ہے جب کہ کل کے بارہ میں ہم کو پورا علم حاصل ہو چکا ہو. تاریخ بتاتی ہے کہ انسان کسی بھی زمانہ میں اس قابل نہ ہو سکا کہ وہ حقائق عالم کا احاطہ کر لے۔ اور اب تو سائنس نے ایک قدم آگے بڑھ کر ثابت کر دیا ہے کہ اپنی محدود صلاحیتوں کی بنا پر انسان کے لیے اس قسم کا احاطہ ممکن ہی نہیں۔

پانی کا راستہ زمین کے نشیب و فراز سے بن جاتا ہے۔ جانوروں کو ان کی جبلّت ایک متعین راہ پر چلاتی رہتی ہے۔ بالفرض ایسا نہ ہو، جب بھی ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ کیونکہ پانی یا جانور فطری طور پر صحیح اور غلط کے احساس سے خالی ہیں۔ ان کی دنیا میں وہی ٹھیک ہے جو بالفعل وقوع میں آجائے. اس کے برعکس انسان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ صحیح و غلط، بالفاظ دیگر اخلاقی احساس اس کی فطرت میں اس طرح پیوست ہے کہ وہ کسی بھی طرح اپنے آپ کو اس سے جدا نہیں کر سکتا. مگر آدمی جب اپنے اخلاقی احساس کو خارجی طور پر متعین کرنا چاہتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ انسان اپنے موجودہ حواس کے تحت کسی ایسی چیز کو قطعیت کے ساتھ جان سکتا ہے جو ہماری نسبت سے اپنا کوئی معروضی مقام (Objective) (Status) رکھتی ہو. جب کہ تجربہ بتاتا ہے کہ انسان ایک ایسی دنیا میں ہے جہاں معروضی اقدار (Objective Values) کا کوئی وجود نہیں۔

انسان اپنی زندگی کی تشکیل کے لیے جو بھی قدم اٹھاتا ہے، فوراً دو سوال اس کے سامنے

آکر کھڑے ہوجاتے ہیں ـــــ اس کے عمل کا نقطۂ آغاز (Starting Point) کیا ہو. اور یہ کہ اس کے عمل کی حدود (Limitations) کیا ہیں ـ ان دونوں سوالات کے جواب پر ہی اس کے عمل کی صحت موقوف ہے. مگر انسان کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں جس سے وہ ان دونوں سوالات کا ٹھیک ٹھیک جواب معلوم کر سکے.

مثال کے طور پر عورت مرد کے باہمی تعلق کے مسئلہ کو لیجیے. دور جدید کے انسان نے اس معاملہ کا نقطۂ آغاز دونوں جنسوں کے درمیان کلی مساوات کو سمجھا. مگر طویل تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں ایسی حیاتیاتی اور نفسیاتی رکاوٹیں ہیں کہ موجودہ نظام تخلیق کے باقی رہتے ہوئے دونوں کے درمیان کلی مساوات ممکن ہی نہیں. اس طرح غلط نقطۂ آغاز سے چلنے کی وجہ سے نہ صرف بےشمار انسانی وسائل ضائع ہو گئے بلکہ ایسے نئے نئے سماجی اور خاندانی مسئلے پیدا ہو گئے جن کا کوئی حل اب انسان کی سمجھ میں نہیں آتا.

اسی طرح اٹھارویں صدی میں مشینی طاقت کی دریافت کے بعد جب جدید صنعتی نظام وجود میں آیا تو لوگوں نے دیکھا کہ کارخانہ کی ملکیت اب سادہ معنوں میں صرف ملکیت نہیں رہی بلکہ اقتصادی استحصال کے ہم معنی ہو گئی ہے. اس سے روایتی افکار کے خلاف بغاوت پیدا ہوئی. جو بالآخر یہاں تک پہنچی کہ خود انفرادی ملکیت ہی کو سرے سے منسوخ کر دیا گیا. تاہم آباد دنیا کے تقریباً نصف حصہ پر آدھی صدی تک تجربہ کرنے کے بعد آخری بات جو انسان کو معلوم ہوئی وہ یہ کہ تنسیخ ملکیت محض ردعمل کے جذبات کے تحت ایک انتہا پسندانہ کارروائی تھی جس نے دوسرا شدید تر استحصالی نظام وجود میں لانے کے سوا اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کیا. اب تمام دنیا کے اہل فکر یہ سوچنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ شاید زیادہ صحیح بات یہ تھی کہ ملکیتوں کی تنسیخ کے بجائے استحصال کی تنسیخ کی جاتی.

ایک اور مسئلہ ہے جو مذکورہ بالا دونوں مسئلوں سے بھی زیادہ اہم ہے. تمام دوسرے حیوانات کے مقابلہ میں انسان کے اندر ایک حیرت انگیز داعیہ یہ ہے کہ وہ کل (Tomorrow) کا تصور رکھتا ہے وہ صرف 'آج' پر قانع نہیں. اسی کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری موجودہ زندگی انتہائی مختصر ہے اور اس کی خوشیاں اور کامیابیاں بے حد معمولی ہیں. جب ہم وہ سب کچھ حاصل کر لیتے ہیں جو ہم چاہتے ہیں تو موت کا وقت قریب آ جاتا ہے ـــ حالیہ دور میں ٹکنیکی انقلاب کے بعد جب انسان نے دیکھا کہ اس کے اوپر عیش و راحت کے ایسے دروازے کھل گئے ہیں جو پچھلے انسان نے خواب میں بھی نہ دیکھے تھے تو سمجھ لیا گیا کہ بس یہی موجودہ زندگی ہی سب کچھ ہے

اور یہاں عزت اور خوشی حاصل کرلینا ہی انسان کی اصل کامیابی ہے۔ مگر انسان ایک صدی بھی اس نئے امکان سے محظوظ نہ ہو سکا تھا کہ نئے نئے مسائل مثلاً صنعت کی پیدا کردہ کثافت (Industrial Pollution) نے اس کی زندگی کو بالکل تلخ کر دیا۔ ایک طرف اینٹی سائنس تحریک مختلف شکلوں میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوسری طرف نفسیاتی تحقیقات نے یہ ثابت کرنا شروع کیا کہ زندگی ایک ایسا مظہر ہے جو جسمانی موت کے بعد بھی کسی نہ کسی شکل میں باقی رہتا ہے حتی کہ علم الموت (Thanatalogy) کے نام سے سائنس کی ایک نئی شاخ وجود میں آگئی ہے جو اس امکان کی تحقیق میں سرگرم ہے کہ کیا موت اور زندگی دونوں ایک دوسرے کے حصے (Parts) ہیں۔ ان واقعات نے دوبارہ انسان کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے لیے کسی صحیح تر فلسفہ حیات کی تلاش کرے۔ اوپر جن پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا، اس کی صرف دو توجیہیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ انسان ایک مکمل کائنات کے اندر ایک نامکمل وجود کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایسے کائناتی تضاد کی علامت ہے جس کا کوئی حل معلوم دنیا کے اندر ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس تضاد کا بھی حل ہے یا کم از ہو سکتا ہے۔ تجرباتی علوم کے پاس دونوں توجیہات میں سے کسی کے حق میں کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں۔ تاہم عقلی قیاس یہ کہتا ہے کہ دوسری توجیہ کو صحیح ہونا چاہیے کیونکہ یہ عظیم کائنات جس طرح قانون فطرت اور جبلت کے تحت انتہائی منظم طور پر چل رہی ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ بات ناقابل قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اس سے کمتر درجہ کے ایک سوال کا جواب اس کے پاس نہ ہو۔ جو تخلیقی قوت عالم افلاک کے مہیب نظام کو گردش دے رہی ہے اور ذی روح اشیاء کی انتہائی پیچیدہ زندگی کو پوری کامیابی کے ساتھ بروئے کار لانے میں مصروف ہے، وہ اس کے مقابلہ میں ایک بہت چھوٹے مسئلہ کا حل اپنے پاس نہ رکھتی ہو، یہ کسی طرح قابل فہم نظر نہیں آتا۔ انسان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ بطور خود اپنا فلسفہ حیات دریافت کر سکے۔ مگر خارجی قرائن کہتے ہیں کہ کائنات میں اس انسانی طلب کا انتظام ہونا چاہیے، جس طرح دوسری بے شمار ضرورتوں کا مکمل انتظام اس کے اندر موجود ہے۔

مذہب یہی خارجی ہدایت ہے جو وحی کی صورت میں خدا کی طرف سے آتی ہے۔ انیسویں صدی عیسوی میں یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ مذہب محض ایک سماجی یا نفسیاتی فریب ہے۔ مگر جدید تحقیقات نے ہمیشہ سے زیادہ آج مذہب کی صداقت کو ثابت کر دیا ہے۔

موت کے اُس پار

ستارے اور سیارے کبھی اپنے مقررہ راستے سے نہیں بھٹکتے۔ درختوں اور پہاڑوں کے سامنے کبھی یہ مسئلہ نہیں آتا کہ وہ اپنی زندگی کے نظام کو کس طرح بہتر بنائیں۔ کسی جانور کو کبھی یہ سوال پریشان نہیں کرتا کہ وہ اپنی غیر حاصل شدہ تمناؤں کو کیسے پورا کرے۔ انسان کے سوا جتنی چیزیں اس کائنات میں ہیں، سب ویسی ہی ہیں جیسا کہ انھیں ہونا چاہئے۔ معلوم دنیا میں صرف انسان ہے جو اس احساس سے دوچار ہے کہ وہ جو کچھ چاہتا ہے، اس کو حاصل نہیں کر سکتا اور نہ موجودہ دنیا میں کبھی اس کا حصول ممکن ہے۔

ہمارے اور موجودہ دنیا کے درمیان اس تضاد کو ہمیشہ لوگوں نے محسوس کیا ہے۔ عام انسان صرف یہ سوچتا ہے کہ وہ بیماری، حادثہ، بڑھاپا، موت سے آزاد زندگی پانا چاہتا ہے مگر وہ اسے پا نہیں سکتا۔ علماء اور مفکرین زیادہ گہرائی تک جاتے ہیں اور زیادہ دوررس قسم کے ناموافق پہلوؤں کا انکشاف کرتے ہیں جو انسان اور موجودہ دنیا کے درمیان فیصلہ کن طور پر حائل ہیں۔

انسان خلاؤں کو ناپتا ہے اور اقتدار کے خواب دیکھتا ہے۔ مگر وہ کس قدر عاجز اور حقیر ہے، اس کو ایک مثال میں دیکھئے۔ زمین پر آج جتنے انسان پائے جاتے ہیں، اگر ان میں کا ہر آدمی چھ فٹ لمبا، ڈھائی فٹ چوڑا اور ایک فٹ موٹا ہو تو پوری آبادی کو بہ آسانی ایک ایسے صندوق میں بند کیا جاسکتا ہے جو طول و عرض اور بلندی میں ایک میل ہو۔ پھر اگر اس صندوق کو کسی سمندر کے کنارے لے جاکر ایک ہلکا سا دھکا دے دیں تو وہ پانی کی گہرائی میں پہنچ کر گم ہو جائے گا۔ صدیاں گزر جائیں گی مگر نسل انسانی دوبارہ زمین پر چلتی پھرتی دکھائی نہ دے گی۔ دنیا کے ذہن سے یہ بھی محو ہو جائے گا کہ یہاں انسان کی قسم کی کوئی مخلوق آباد تھی۔ سمندر کی سطح پر اسی طرح بدستور طوفان آتے رہیں گے، سورج اسی طرح چمکتا رہے گا۔ کرۂ ارض اپنے محور پر بدستور گھومتا رہے گا۔ کائنات کی لامحدود پہنائیوں میں پھیلی ہوئی بے شمار دنیائیں اتنے بڑے حادثہ کو ایک معمولی واقعہ سے زیادہ اہمیت نہ دیں گی۔ مدتوں کے بعد ایک اونچا سا مٹی کا ڈھیر زبان حال سے بتائے گا کہ یہ نسل انسانی کی قبر ہے جہاں وہ صدیوں پہلے ایک چھوٹے سے صندوق میں دفن کی گئی تھی۔

سر جیمز جینز (۱۸۷۷–۱۹۴۶) کائنات کی بے پناہ وسعت کے مقابلے میں انسان اور اس کے وطن (زمین) کی معمولی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ریت کے ذرہ کے ایک خوردبینی ٹکڑے پر کھڑے ہو کر ہم کائنات کی فطرت اور اس کے مقصد کو معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو کہ زمان و مکان کے اندر ہمارے وطن (زمین) کو گھیرے ہوئے ہے۔ ہمارا پہلا تاثر کچھ دہشت ناک قسم کا ہوتا ہے۔ ہم کائنات کو دہشتناک پاتے ہیں اس کے وسیع ناقابل فہم فاصلوں کی وجہ سے، دہشت ناک اس کے لامعلوم حد تک لمبے پھیلے ہوئے وقت کی وجہ سے جس کے مقابلے میں انسانی تاریخ محض پلک جھپکانے

کے بقدر معلوم ہوتی ہے، دہشت ناک ہماری انتہا درجہ کی تنہائی کی وجہ سے، اور خلا میں ہمارے وطن کے مادی طور پر بالکل بے حقیقت ہونے کی وجہ سے ـــــ ساری دنیا کے سمندروں میں پائے جانے والے ریت کے ذروں میں سے ایک ذرہ کا دس لاکھواں حصہ۔ مگران سب سے بڑھ کر کائنات کو ہم اس لئے دہشت ناک پاتے ہیں کہ وہ ہماری جیسی ایک زندگی کے معاملہ میں غیر جانب دار ہے: جذبات، حوصلے، کامیابیاں، آرٹ اور مذہب، سب اس کے منصوبے میں اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ شاید ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہماری جیسی زندگی کی دشمن ہے۔ کیوں کہ خالی خلا کا بیشتر حصہ اس قدر سرد ہے کہ تمام زندگی اس کے اندر منجمد ہو جائے گی۔ خلا کے اندر مادّہ کا بیشتر حصہ اس قدر گرم ہے کہ اس کے اوپر زندگی کا وجود ناممکن ہے۔ خلا خم دار ہے اور فلکیاتی اجسام پر مسلسل مختلف قسم کی ریڈیائی بمباری ہوتی رہتی ہے، جن میں سے اکثر اغلباً زندگی کے لئے مخالف یا تباہ کن ہیں۔ اس قسم کی ایک دنیا میں ہم ٹپک پڑے ہیں، اگر غلطی سے نہیں تو کم از کم اس چیز کے نتیجہ میں جس کو اتفاق کہا جا سکتا ہے۔ (۳)

سیاراتی نظام (جس میں ہماری زمین ہے) انتہائی نادر خلائی واقعہ ہے۔ سیاراتی نظام کا اس قدر نادر ہونا بے حد اہم ہے۔ کیونکہ زندگی کی جس قسم سے ہم زمین پر واقف ہیں، وہ زمین ہی جیسے کسی سیارہ پر وجود میں آسکتی ہے۔ اس کو اپنے ظہور کے لئے موافق طبیعی حالات درکار ہیں جن میں سب سے اہم وہ ٹمپریچر ہے جس میں اشیاء رقیق شکل میں باقی رہ سکیں۔ (۴)

ان وجوہ سے یہ ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے کہ کائنات ابتدائی طور پر ہماری جیسی زندگی کے لئے بنائی گئی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو یقینی طور پر ہم میکانزم کے حجم اور پیداوار کی مقدار میں زیادہ بہتر تناسب کی توقع کر سکتے تھے۔ کم از کم پہلی نظر میں زندگی انتہائی غیر اہم ضمنی پیداوار دکھائی دیتی ہے۔ ہم زندہ لوگ شارع عام سے کچھ ہٹے ہوئے ہیں۔

We living things are some how off the main line. p. 5

سائنس نے اب تک جو معلومات دی ہیں، ان کے مطابق ہم نہایت تعجب انگیز طور پر وجود میں آئے ہیں۔ اور ہماری حیرانی میں صرف اضافہ ہوتا ہے جب ہم اپنی ابتدا کے مسئلہ سے آگے بڑھ کر اپنے وجود کی معنویت کو سمجھنا چاہتے ہیں یا یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ قسمت نے مستقبل میں ہماری نسل کے لئے کیا چیز ذخیرہ کر رکھی ہے (۱۰)

فزکس اور فلکیات دونوں ایک ہی کہانی بتاتے ہیں۔ وہ یہ کہ کائنات کا صرف ایک ہی انجام ہو سکتا ہے۔ اور وہ ہے حرارتی موت (Heat Death)۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ اس آخری انجام تک پہنچنے کا راستہ کیا ہوگا۔ کائناتی موت کے سوا اس سفر کا دوسرا کوئی انجام نہیں ہو سکتا:

End of the journey cannot be other than universal death p. 11

پھر کیا ایسا ہے کہ زندگی محض اتفاق سے ایک ایسی کائنات میں بھٹک آئی ہے جو واضح طور پر زندگی کے لئے نہیں بنائی گئی تھی۔ اور جو تمام مظاہر کے مطابق یا تو مکمل طور پر غیر جانب دار ہے یا قطعی طور پر اس کے مخالف۔ ایک ذرّے کے محض ایک ٹکڑے پر ہمیں اس وقت تک چمٹے رہنا ہے جب کہ ہم منجمد ہو جائیں، اپنے مختصر

اسٹیج پر مختصر تر لمحات کے لئے اکڑ کر چلنا یہ جانتے ہوئے کہ ہمارے تمام حوصلے بالآخر فنا ہوجانے والے ہیں، اور یہ کہ ہماری کامیابیاں ہماری نسل کے خاتمہ کے ساتھ ختم ہوجائیں گی، کائنات کے باقی رہتے ہوئے جہاں ہم موجود نہ ہوں گے (۱۲) The Mysterious Universe, p 3-12

ان احساسات کا اظہار تاریخ کے ہر دور میں مختلف سوچنے والے لوگ مختلف انداز میں کرتے رہے ہیں۔ کریسی ماریسن (۱۹۴۶ - ۱۸۸۴) زندگی کا سائنسی مطالعہ کرتے ہوئے بے اختیار کہہ اٹھتا ہے:

Whence it came or where it goes, science answers not. p. 42

زندگی کب اس زمین پر آئی، زندگی کہاں جارہی ہے، سائنس ہمیں اس کا کوئی جواب نہیں دیتی۔

آئن سٹائن (۱۹۵۵ — ۱۸۷۹) اپنے سائنسی علم کی روشنی میں جب انسان پر غور کرتا ہے تو اس کے پاس اس اقرار کے سوا کوئی اور بات کہنے کے لئے نہیں ہوتی:

Man is out of plan. He has come where he was not wanted.

آدمی اس دنیا میں بے جگہ معلوم ہوتا ہے، وہ ایسے مقام پر آگیا ہے جہاں وہ مطلوب نہ تھا۔

انسان جو کچھ پانا چاہتا ہے، وہ موجودہ دنیا کے ڈھانچہ میں ممکن نہیں۔ انسان ابدی زندگی چاہتا ہے مگر اس کو ابدی دنیا نہیں دی گئی۔ وہ اپنے لئے ایک بہتر کل (Better Tomorrow) پیدا کرنا چاہتا ہے، مگر آنے والا کل اس کے لئے جو چیز لے کر آرہا ہے، وہ حادثہ، بڑھاپا اور موت ہے۔ وہ ایک آزاد، برائیوں سے پاک اور خوشیوں سے بھری دنیا دیکھنا چاہتا ہے، مگر ایسی دنیا اس زمین پر کسی طرح بننے نہیں پاتی۔

اب دو ہی متبادل قیاسات ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ زندگی، برٹرینڈ رسل (۱۹۷۰ — ۱۸۷۲) کے الفاظ میں، نظام شمسی کے وسیع قبرستان میں اپنی تمام کامیابیوں اور ناکامیوں کے ساتھ بالآخر ہمیشہ کے لئے دفن ہوجانے والی ہے۔ اس کے بعد مدفن (مادی دنیا) شاید کسی شکل میں باقی رہے مگر دفن ہونے والے (انسان) کا اس میں کہیں وجود نہ ہوگا۔ دوسرے یہ کہ موجودہ دنیا کے علاوہ یا اس کے بعد کوئی اور زیادہ مکمل دنیا ہے جہاں انسان اپنے خوابوں کی زندگی کو پا سکتا ہے۔ موت اگلی وسیع تر زندگی کی طرف سفر ہے نہ کہ اس کا خاتمہ۔ گویا ہمارے اور ہماری آرزوؤں کے درمیان وہی نسبت ہے جو بچہ اور انسان کے درمیان پائی جاتی ہے۔ بچہ اپنی ماں کے پیٹ میں یہ آرزو لئے ہوئے بند رہتا ہے کہ وہ ایک وسیع کائنات کے اندر ایک پورے قد کا انسان بن کر ظاہر ہو۔ پیٹ کے اندر کی محدود دنیا میں یہ محض ایک موہوم خواب معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب وہ ایک دن ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے تو اچانک وہ پاتا ہے کہ اس کا خواب ایک انتہائی حقیقی خواب تھا جو مکمل تعبیر کی صورت میں اس کے قریب ہی موجود تھا، اگرچہ پیٹ کے اندر رہتے ہوئے وہ اس کو براہ راست نہیں جان سکتا تھا یا کم از کم نہیں جان سکا تھا۔

پہلے قیاس کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ وہ چیز جس کو ہم انسان کہتے ہیں، وہ صرف ایک جسم کا نام ہے جسم کی موت کے بعد لازمی طور پر "انسان" کی موت بھی ہوجاتی ہے۔ مگر اس مفروضہ کے حق میں کوئی قطعی دلیل اب تک

قائم نہ ہو سکی۔ تمام دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ مگر یہ دلیل اصل دعوے کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں۔ کیونکہ موت کے دن جو "انسان" جسم سے الگ ہوتا ہے، وہ موت سے پہلے بھی ہمارے لئے قابل مشاہدہ نہیں ہوتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس نے سوچنے اور محسوس کرنے والے انسان کو دیکھا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم انسان کے صرف اس جسم کو دیکھتے ہیں جو نمکیات و معدنیات سے مل کر بنا ہے۔ ماورائے جسم انسان، جو موت کے دن خاموش ہو جاتا ہے، اس کو ہم مرنے سے پہلے بھی نہیں دیکھتے ــ پھر مرنے کے بعد اگر وہ دکھائی نہ دے تو اس سے اس کا عدم وجود کیسے ثابت ہو جائے گا۔ مزید یہ کہ جدید سائنس یہ ثابت کر رہی ہے کہ مادّہ جب "فنا" ہوتا ہے تو وہ فنا نہیں ہوتا۔ بلکہ زیادہ حقیقی اور ترقی یافتہ شکل اختیار کر لیتا ہے، یعنی انرجی کی شکل۔

فلاسفہ و مفکرین موت کے بعد زندگی کے عقلی و منطقی ثبوت دیتے رہے ہیں۔ بعض ثبوت ان میں بجائے خود وزنی بھی ہیں۔ مثلاً فرد جاف شوان (Frithjof Schuan) کا یہ قول کہ روح جو دراصل ذہن یا شعور ہے اس کے غیر فانی ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اس کا اختتام اپنے سے کم درجہ پر نہیں ہو سکتا، دوسرے لفظوں میں مادّہ یا مادّہ کا ذہنی انعکاس کی صورت میں۔ کوئی برتر چیز کمتر چیز کا محض فعل نہیں ہو سکتی۔ وہ اس چیز کا صرف ذریعہ نہیں ہو سکتی جس سے وہ بڑھ جاتی ہے:

> One proof of immortality of the soul — which is essentially intelligence or consciousness — is that the soul could not have an end beneath itself, in other words matter or the mental reflection of matter. The higher cannot be merely a function of the lower, it cannot be only a means in relation to what it surpasses.
>
> Frithjof Schuan, *Undersanding Islam*

تاہم، اپنی تمام تر معقولیت کے باوجود، اس قسم کے استدلات قیاسی استدلالات تھے، اس لئے جدید ذہن کے لئے ان میں زیادہ اپیل نہ تھی۔ جدید ذہن حسی استدلال کو اہمیت دیتا ہے۔ وہ اسی دلیل کو دلیل سمجھتا ہے جس کو وہ چھوئے، دیکھے اور تجربہ کرے۔ قیاسی منطق پر قائم ہونے والی دلیل اس کے نزدیک معتبر نہیں۔

مگر بیسویں صدی کے نصف آخر میں جو تحقیقات ہوئی ہیں، انھوں نے حیرت انگیز طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ قیاسی دلائل کے علاوہ خالص تجرباتی نوعیت کے شواہد بھی قدیم زمانہ سے یہاں موجود تھے۔ مگر علمی اصولوں پر ان کا منظم مطالعہ نہیں کیا گیا اور بلا تحقیق یہ فرض کیا جاتا رہا کہ موت کے بعد زندگی کے حق میں کوئی تجرباتی دلیل موجود نہیں ہے۔

قرآن کی سورہ نمبر ۳۹ میں بتایا گیا ہے: اللہ موت کے وقت جانوں کو کھینچ لیتا ہے۔ اور جن کے مرنے کا وقت نہیں آیا، ان کی نیند میں۔ پھر ان جانوں کو روک لیتا ہے جن پر مرنا ٹھیرا دیا ہے اور باقی جانوں کو ایک میعاد تک کے لئے رہا کر دیتا ہے (زمر ــ ۴۲) قدیم ترین زمانہ سے خواب اس قرآنی بیان کی تصدیق کر رہے تھے۔ مگر قدیم زمانہ میں خواب کے فلسفیانہ پہلوؤں پر زیادہ غور نہیں کیا گیا۔ موجودہ زمانہ میں جب ان کا علمی تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ واقعات، حیرت انگیز طور پر، یہ ثابت کر رہے ہیں کہ روح یا شعور جسم سے الگ ایک مستقل حقیقت ہے۔ وہ

جسم سے الگ ہو کر بھی پوری طرح باقی رہتا ہے۔ خواب، موت کے بعد زندگی کو تجرباتی سطح پر ثابت کر رہے ہیں۔

عام تجربہ ہے کہ خواب میں ایک شخص دور کے کسی واقعہ کو یا مستقبل میں پیش آنے والے کسی حادثہ کو دیکھ لیتا ہے۔ یہ تجربات جو تقریباً ہر شخص کو پیش آتے ہیں، ثابت کرتے ہیں کہ خواب کی حالت میں آدمی کا شعور موجودہ مادی دنیا سے اوپر اٹھ جاتا ہے اور ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں زمان و مکان کی حد بندیاں نہیں پائی جاتیں۔ نیند کے وقت سونے والے آدمی پر جو بے خبری طاری ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی روح جزئی طور پر، اس کے جسم کو چھوڑ دیتی ہے۔ وہ انسان کی محدود دنیا سے نکل کر خدا کی ابدی دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔

راقم الحروف کی لڑکی فریدہ خانم (پیدائش ۱۹۵۲) نے ۲۳ر جنوری ۱۹۷۱ کو دہلی میں خواب دیکھا کہ اس کے بھائی ظفر الاسلام خاں (پیدائش ۱۹۴۸) نے اس کے لئے دس روپے بھیجے ہیں۔ یہ خواب انتہائی غیر معمولی تھا، کیونکہ خواب دیکھنے والی کے بھائی ۱۹۶۶ سے قاہرہ میں تھے، اور باہر سے کوئی بھائی اپنی بہن کو "دس" روپے بھیجے، یہ کسی طرح قابل قیاس نہیں ہو سکتا۔ مگر چند ہی روز بعد ظفر الاسلام کا لفافہ قاہرہ سے ملا جس کے اندر دس روپے کا ایک ہندستانی نوٹ رکھا ہوا تھا۔ ظفر الاسلام کو یہ نوٹ قاہرہ میں اپنے بکس میں پڑا ہوا ملا۔ چونکہ عرب دنیا میں یہ نوٹ ان کے لئے بے کار تھا، انھوں نے ہندستان میں اپنی بہن کو خط بھیجتے ہوئے اس کو لفافہ میں ڈال دیا۔

اس کی توجیہہ اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی کہ نیند کی حالت میں آدمی کی روح جسمانی محدودیتوں سے آزاد ہو کر ایک بلند تر آفاقی سطح حاصل کر لیتی ہے۔ اس وقت وہ اشیاء کو ایسے مقام سے دیکھنے لگتی ہے جہاں وہ اپنی جسمانی قیام گاہ کی حد بندیوں سے نہیں دیکھ سکتی۔

اسی طرح سویا ہوا آدمی خواب میں بعض اوقات کسی مرے ہوئے شخص کو دیکھتا ہے۔ یہ مردہ شخص اپنے زندہ ساتھی کو خواب میں ایسی باتیں بتاتا ہے جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ شخص اب بھی پورے شعور کے ساتھ موجود ہے، اور خواب دیکھنے والے کی فی الواقع اس سے "ملاقات" ہوئی ہے۔ گویا سوئے ہوئے آدمی کے شعور کی سطح، ایک خاص حد تک، مرے ہوئے آدمیوں کے شعور کی سطح کے برابر ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر، نیند کی حالت میں آدمی، محدود معنوں میں، زندگی بعد موت کا تجربہ کرتا ہے۔ نیند کی حالت، جزوی طور پر موت کی حالت کے مشابہ ہے۔

ڈاکٹر کیسل نے شمالی کیرولینا کے ایک امیر شخص کے واقعہ کی تحقیق کی ہے۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ وہ کسی بات پر تین لڑکوں سے ناراض ہو گیا اور ایک وصیت نامہ کے ذریعہ اپنے ان تین لڑکوں کو جائداد میں حصہ دار بننے کے حق سے محروم کر دیا۔ جب وہ مر گیا تو اس کے جلد ہی بعد اس کے چوتھے لڑکے نے، جس کو از روئے وصیت جائداد مل رہی تھی، اپنے باپ کو خواب میں دیکھا۔ خواب میں اس کے باپ نے اپنی پسندیدہ برساتیوں میں سے ایک برساتی اوڑھ رکھی تھی۔ وہ سراپا احتجاج دکھائی دیتا تھا اور دوران گفتگو بار بار برساتی نما کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ نیند کھلی تو لڑکے نے اپنے باپ کی اس کوٹ کو، جو اس نے خواب کے درمیان پہن

رکھا تھا، نکالا اور اس کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ جیب میں باپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک وصیت نامہ موجود تھا۔ اس کے تحت پچھلی وصیت کو منسوخ کرتے ہوئے بقیہ تینوں لڑکوں کو بھی حق دیا گیا تھا کہ وہ اپنے حصہ کی جائداد وصول کر سکتے ہیں۔ باپ نے موت سے تھوڑی دیر پہلے جائداد کی وراثت کے بارے میں اپنا فیصلہ بدل لیا تھا۔ اس نے دوبارہ اپنا وصیت نامہ تیار کرایا اور اس کو مکمل کر کے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا۔ پھر اس سے پہلے کہ اپنے تمام لڑکوں کو اس تبدیلی فیصلہ سے آگاہ کرے، انتقال کر گیا ——— ظاہر ہے کہ اس واقعہ کو مردہ شخص کے سوا کوئی اور نہیں جانتا تھا۔ اس لئے یقین کرنا پڑے گا کہ وہ مرنے کے بعد بھی کسی نہ کسی شکل میں زندہ تھا اور اس نے اپنے لڑکے کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

نیند ہی سے ملتا جلتا وہ واقعہ ہے جب کہ حادثہ وغیرہ کے موقع پر ایک شخص وقتی طور پر "مر جاتا ہے" اور پھر کچھ دیر بعد جی اٹھتا ہے۔ قدیم زمانہ سے اس قسم کے واقعات ہوتے رہے ہیں کہ ایک شخص طبی اعتبار سے مکمل طور پر مر گیا۔ چند منٹ بعد پھر اس کے قلب کی حرکت جاری ہو گئی۔ وہ دوبارہ "زندہ" ہو گیا۔ اس قسم کے واقعات بظاہر اس بات کا ثبوت ہیں کہ "آدمی" نے کچھ لمحات کے لئے اپنا جسم چھوڑ دیا تھا اور پھر دوبارہ اپنے جسم میں واپس آ گیا۔ قدیم زمانہ میں ان واقعات کا ذکر صرف عجوبہ کے طور پر کیا جاتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں ان کو علمی انداز سے جانچا گیا تو معلوم ہوا کہ ان سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ انسان، جسم سے ماورا اپنی ایک مستقل ہستی رکھتا ہے جو اس وقت بھی باقی رہتی ہے جب کہ وہ اپنے دنیوی جسم سے الگ ہو گیا ہو۔

بعض ایسے واقعات ریکارڈ کئے گئے ہیں کہ ایک بیمار شخص آپریشن ٹیبل پر تھا، آپریشن کے دوران اس کے دل کی حرکت بند ہو گئی، طبی طور پر وہ مر گیا۔ کچھ دیر بعد اس کو ہوش آیا۔ اس سے پوچھا گیا کہ "موت" کے دوران تم نے کیسا محسوس کیا۔ اس نے بتایا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اپنے جسم سے الگ ہو کر فضا میں تیر رہا ہوں۔ میں فضا سے اپنے جسم کو دیکھ رہا تھا جو آپریشن ٹیبل پر پڑا ہوا تھا اور اس کے گرد ڈاکٹر جھکے ہوئے تھے۔ اس نے اس دوران میں ہونے والی ڈاکٹروں کی بعض باتوں کو اس طرح بتایا جیسے کہ وہ "موت" کے وقت بھی ان کو دیکھ اور سن رہا تھا ——— روح اگر محض ایک جسم کا عمل (Function) ہو تو وہ جسم سے الگ ہو کر کیسے اس طرح باقی رہ سکتی ہے۔ جسم سے الگ ہو کر بھی شعور ذات کا ختم نہ ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان ایک مستقل ہستی ہے جو جسم سے علیحدگی کے بعد بھی پوری طرح باقی رہتا ہے۔

ڈاکٹر گرفیلڈ بتاتے ہیں کہ میں ایک بوڑھی عورت کا معائنہ کر رہا تھا۔ یہ عورت ہڈی کے کینسر کی مریض تھی۔ اس کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ ہم نے مریضہ کے درد کو دور کرنے کی جتنی تدبیریں کیں سب بے سود ثابت ہوئیں۔ اچانک وہ بے ہوش سی ہو گئی۔ اس کے بعد جب ہوش میں آئی تو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کو بہت افاقہ ہو گیا ہو۔ میں نے عورت سے اس کی اچانک تبدیلی کا سبب پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ابھی اس کی مردہ ماں اس سے ملنے آئی تھی اور اس کو بتا گئی ہے کہ بہت جلد دونوں اکٹھا ہو جائیں گی۔ اپنی ماں سے اس گفتگو کے بعد وہ بہت پر سکون ہو گئی اور تھوڑی دیر

کے بعد مرگئی ——— یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ مریضہ کی ماں، اپنی موت کے بعد بھی پورے شعور کے ساتھ موجود تھی۔ ورنہ کس طرح وہ اپنی بیٹی کے پاس آتی۔ نیز ماں کی خبر کے مطابق ٹھیک وقت پر اس کا مرجانا ثابت کرتا ہے کہ مریضہ کا تجربہ حقیقی تھا نہ کہ محض خیالی۔

قرآن کی سورہ نمبر ۵۶ میں ارشاد ہوا ہے: جب مرنے والے کی جان حلق تک آجاتی ہے اور تم دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے۔ اس وقت تمھاری بہ نسبت ہم مرنے والے کے زیادہ نزدیک ہوتے ہیں۔ مگر تم نہیں دیکھتے (واقعہ) اس سے معلوم ہوا کہ آدمی جب مرنے کے قریب ہوتا ہے تو جان کی جسم سے علیحدگی سے پہلے موت کے اُس پار کی بعض کھڑکیاں اس پر کھول دی جاتی ہیں۔ دوسری دنیا کا پردہ ایک خاص حد تک، اس سے ہٹا لیا جاتا ہے۔ موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے وہ عالم آخرت کی بعض چیزوں کو دیکھنے لگتا ہے۔

ان میں سب سے عام اور کثیر الوقوع مشاہدہ اپنے مردہ عزیزوں کو دیکھنا ہے۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آتا ہے جب کہ آدمی نزع کے عالم میں پہنچ گیا ہو۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ نزع کے وقت آدمی اپنے مرے ہوئے رشتہ داروں کو پکارنے لگتا ہے۔ اپنے مرے ہوئے اعزہ اور دوستوں کو وہ اس طرح آواز دیتا ہے جیسے وہ اس کے قریب کھڑے ہوں۔ راقم الحروف کی بڑی بہن طاہرہ خانم کا انتقال تقریباً ۶۰ سال کی عمر میں ۲۱ اگست ۱۹۷۶ کو ہوا۔ اس وقت وہ اعظم گڑھ کے اسپتال میں تھیں۔ انتقال کے وقت میں خود بہن کے پاس موجود نہ تھا۔ تاہم میری والدہ زیب النسا خاتون نے مجھے بتایا کہ آخر وقت میں مرحومہ کی زبان سے یہ کلمات سنے گئے: "ابا اتنی دیر سے کھڑے ہیں کوئی ان کو بیٹھنے کے لئے نہیں دیتا" ہمارے والد کا انتقال ۱۹۲۹ میں ہو چکا ہے۔ اس لئے لوگوں کو یہ سن کر تعجب ہوا۔ مرحومہ کی لڑکی نے کہا: "ابا میاں کہاں ہیں؟" مرحومہ نے دوبارہ کہا: "وہ کیا سامنے کھڑے ہیں" اور پھر چند لمحہ بعد ان کا خاتمہ ہو گیا۔

ڈاکٹر الزبتھ کیوبلر روز نے بطور مہم یہ کام شروع کیا کہ وہ نزع میں گرفتار لوگوں سے ملیں اور آخر وقت میں ان کی آوازوں کا ٹیپ لیں۔ انھوں نے ایک ہزار سے زیادہ ایسے لوگوں کا قریب سے مشاہدہ اور مطالعہ کیا جو عالم نزع میں گرفتار تھے۔ اور گویا موجودہ دنیا اور اگلی دنیا کے درمیان پہنچ چکے تھے۔ ان لوگوں نے انھیں بتایا کہ نزع کی حالت میں ان کے کئی ایسے دوست اور رشتہ دار ان کے پاس آئے جو پہلے مر چکے تھے۔ "تاکہ سفر آخرت کے وقت ان کی امداد کر سکیں"۔ یہ لوگ اگر اس دنیا میں اپنے بدن کے کسی عضو سے محروم تھے تو نزع کی حالت میں انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کا بدن ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ مثلاً جو شخص لنگڑا تھا اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے دونوں پاؤں صحیح و سالم موجود ہیں۔ گویا جسم میں کسی حادثہ سے کمی واقع ہو جائے تو اس کی وجہ سے اصل انسانی ہستی میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

اس قسم کے خواب اور واقعات اگرچہ ہمیشہ سے پیش آ رہے تھے، مگر موجودہ زمانہ میں پہلی بار ان کا منظم مطالعہ کیا گیا ہے، ضروری اعداد و شمار کے ساتھ ہزاروں واقعات جمع کئے گئے ہیں خاص طور پر امریکہ میں جدید ترین ٹکنیک

اور سائنسی اہتمام کے ساتھ ان کا باقاعدہ جائزہ لیا جارہا ہے۔ ان تحقیقی نتائج پر متعدد کتابیں چھپی ہیں۔ حال میں امریکہ سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے زندگی کے بعد زندگی:

Life after Life, Dr. Raymond A Moody Jr. U.S.A. 1976

یہ کتاب آج کی انتہائی کثیر الاشاعت کتابوں میں سے ہو رہی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے اخبارات و رسائل میں، جدید دور میں پہلی بار، زندگی بعد موت سے متعلق سرخیاں نظر آنے لگی ہیں۔ اس سلسلے میں تحقیقی کتابوں کے خلاصے شائع کئے جارہے ہیں۔ مثلاً نیوز ویک ۱۲رجولائی ۱۹۷۶، السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا مارچ ۱۹۷۷، ریڈرز ڈائجسٹ اگست ۱۹۷۷۔ ایک امریکی میگزین (ٹائم، ۴رجنوری ۱۹۷۷) کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ "موت" کا موضوع اور موت کے بعد زندگی کا مسئلہ اچانک طور پر امریکہ کا بہت زیادہ مقبول عام موضوع بن گیا ہے۔ اجتماعات میں اب موت کا موضوع جنس اور سیاست جیسے سدا بہار موضوعات سے تجاوز کرنے لگا ہے۔ کتابوں کی ایک نئی قسم وجود میں آگئی ہے جس کو علم الموت (Thanatalogy) کی کتابیں کہا جاتا ہے۔

آرتھر کوئسلر (Arthur Koestler) پہلے مارکسسٹ تھے، مگر اب وہ اس حد تک بدل چکے ہیں کہ انھوں نے ایک طویل محققانہ مقالہ شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے "کیا موت کے بعد بھی زندگی ہے" (Is there life afterdeath?)

موجودہ صدی کے ربع ثانی میں آئن سٹائن، ڈی بروگلی، شروڈنگر اور ہیزن برگ نے کامیاب طور پر مادہ کا غیر مادّہ ہونا ثابت کیا ہے۔ جو چیز دیکھنے میں ٹھوس جسم نظر آتی ہے، وہ انرجی (قوت) کا صرف ایک شدید اجتماع ہے۔ اس سے ثابت ہوا ہے کہ مادّہ کے اجزاء — الکٹران، پروٹان، نیوٹران وغیرہ — معروف معنوں میں مادی ذرات نہیں ہیں بلکہ وہ لہروں کی مانند ہیں۔ ڈی بروگلی کا کہنا ہے کہ ایک الکٹران بیک وقت جسیمہ بھی ہے اور لہر بھی۔ ثنویت (Dualism) جدید طبیعیات کا لازمہ ہے اور (Principle of Complementarity) یعنی تکمیلی اصول اس کا جدید سائنسی نام ہے۔ (سنڈے (کلکتہ) ۳؍اکتوبر ۱۹۷۶)

ان دریافتوں کا حوالہ دیتے ہوئے آرتھر کوئسلر نے لکھا ہے کہ ذرہ/لہر (Particle/ Wave) کے اصول کو مان لینے کے بعد جسم/ذہن (Body/Mind) کے اصول کو ماننا آسان ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ تکمیلی اصول کو مان لینے کے بعد دوسری جگہ اس کو نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔ ہم پوچھ سکتے ہیں کہ جب مادّہ اپنے آپ کو لہروں میں تبدیل کرسکتا ہے اور اس طرح ایک خالص غیر جسمانی انرجی Disembodied Energy بن جاتا ہے تو کیا اب بھی یہ خالی از معنی ہوگا کہ بے جسم ذہن (Discarnate Mental Energy) کی موجودگی کی بات کی جائے۔ کیا ایسی گفتگو اب بھی اسی طرح بے حقیقت ہے جس طرح وہ پچاس سال پہلے معلوم ہوتی تھی جب کہ طبیعیات نے ابھی مادّہ کی حیثیت کو ختم نہیں کیا تھا اور ابھی ہم کو بتایا نہیں تھا کہ ایٹم "چیز" نہیں ہیں۔ اور کیا اب بھی یہ معقول بات ہوگی کہ کوئی شخص ذہنی مادہ (Mind-Stuff) کی اصطلاح کو غیر سائنسی کہہ کر مذاق اڑائے جس کو اڈنگٹن نے وضع کیا تھا۔ ڈاکٹر آئی۔ جے

گڈنے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مادہ اثیری ہے اور ذہن ٹھوس چٹان ہے:

Mather is athereal and mind is the solid rock

موت کے بعد زندگی کا ثبوت ہی یہ بھی ثابت کر دیتا ہے کہ موجودہ نظر آنے والی دنیا کے علاوہ ایک اور دنیا بھی ہے۔ اگر ایسی کوئی دنیا نہیں ہے تو یہ غیر مرئی انسانی ہستیاں کہاں واقع ہیں۔ لوگ اپنے جسم کو چھوڑ کر کہاں چلے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے اس طرح بندھی ہوئی ہیں کہ ایک کا ثابت ہونا اپنے آپ دوسرے کو ثابت کر دیتا ہے۔

قرآن میں کہا گیا ہے: اور ہر چیز کو ہم نے بنایا جوڑا جوڑا۔ تاکہ تم دھیان کرو (ذاریات۔ ۴۹) اس آیت میں اس بات کا اشارہ ہے کہ دنیا کا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ ہر چیز جوڑے کی صورت میں ہے۔ (نر مادہ، مثبت منفی، رات دن) ایک جزو اپنے دوسرے جزو سے مل کر اپنے کو مکمل کرتا ہے۔ یہ اس لئے تاکہ لوگ سمجھیں کہ جس طرح ہر چیز کا جوڑا ہے اسی طرح اس دنیا کے لئے بھی جوڑا ہونا ضرور ہے۔ یہ جوڑا آخرت ہے۔ آخرت کے بغیر یہ دنیا، موجودہ تخلیقی نظام کے مطابق کبھی مکمل نہیں ہو سکتی۔

آج دنیا کا یہ جوڑا انسانی علم میں آچکا ہے۔ اس جوڑے کا سائنسی نام اینٹی ورلڈ ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں ایک طرف انسان کا مطالعہ موت کے بعد انسانی ہستی کے بقا کا تجربہ کر رہا تھا، دوسری طرف عین اسی وقت طبیعی سائنس یہ ثابت کر رہی تھی کہ ہماری موجودہ دنیا کے متوازی ایک اور دنیا ہے جو مکمل شکل میں اپنا وجود رکھتی ہے۔ ہماری موجودہ دنیا ورلڈ ہے اور وہ اینٹی ورلڈ۔

۱۹۲۸ء تک طبیعیات داں یہ سمجھتے تھے کہ تمام ایٹم صرف دو قسم کے ذرات کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ مثبت برقی چارج رکھنے والے پروٹان، اور منفی برقی چارج رکھنے والے الکٹران۔ مگر اسی سال پال ڈیراک (Paul A.M. Dirac) نے ایک نئے قسم کے ذرہ کی موجودگی کا امکان ظاہر کیا۔ اس نے کہا "اس کا مقدار مادہ الکٹران جیسا ہے۔ مگر وہ اس کے مخالف برقی چارج رکھتا ہے۔ ہم اس ذرہ کو اینٹی الکٹران کہہ سکتے ہیں"۔ ۱۹۳۲ میں اینڈرسن (K. Anderson) نے اس اینٹی الکٹران کو کاسمک شعاعوں میں دریافت کر لیا۔ اب معلوم ہوا کہ ایٹم کے ہر پارٹیکل کا ایک اینٹی پارٹیکل ہے۔ پروٹان ایک اینٹی پروٹان رکھتا ہے، نیوٹران ایک اینٹی نیوٹران رکھتا ہے۔ گویا کائنات کے تمام ذرات، جوڑوں (Pair Particles) کی صورت میں ہیں۔

اب سائنسی فکر آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ معلوم ہوا کہ عالم مادی میں جوڑوں کی یہ تقسیم الکٹران کے ناقابل مشاہدہ ذرات سے شروع ہو کر خود مجموعہ عالم تک پہنچ جاتی ہے۔ الکٹران کا اینٹی الکٹران ہے، ایٹم کا اینٹی ایٹم، میٹر کا اینٹی میٹر، حتیٰ کہ ورلڈ کا اینٹی ورلڈ۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ہماری دنیا میں تمام اینٹی پارٹیکل غیر قائم (Unstable) حالت میں ہیں۔ مگر اینٹی ورلڈ میں وہ سب قائم (Stable) حالت میں ہوں گے۔ کیونکہ تمام ایٹموں کے نیوکلیس منفی برقی چارج رکھتے ہوں گے اور تمام الکٹران مثبت برقی چارج۔ اس قسم کے ایک اینٹی ورلڈ کا امکان پہلی بار ۱۹۳۳ میں ڈیراک نے اپنے لکچر میں بتایا تھا۔ اب سائنس داں عام طور پر اس کو تسلیم کرتے جا رہے ہیں۔ سوویت یونین کے ڈاکٹر

گستاف نان (Gustav Naan) نے ریاضیات کے ذریعہ اس اینٹی ورلڈ کی ایسی ٹھوس احاطہ بندی کر دی ہے کہ اب اس کے مخالفین تک اس کو انتہائی زبردست قسم کا متوازن تصور ماننے لگے ہیں۔

اپنی دنیا میں دور کی چیزوں کو ہم فوٹان کی مدد سے پہچانتے ہیں جو کہ برقی مقناطیسی شعاعوں کے ذرات ہیں۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اینٹی ورلڈ بھی اسی قسم کے فوٹان کا اخراج کرتی ہوگی جو کہ بیک وقت پارٹیکل بھی ہے اور اینٹی پارٹیکل بھی۔ اینٹی ورلڈ، وہ دور ہو یا نزدیک، اس کی روشنی فوٹان کی شکل میں ہو سکتا ہے کہ مسلسل ہم تک پہنچ رہی ہو۔ مگر ہم اس کو اپنے پازیٹو ورلڈ کی چیزوں کی روشنی سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ ورلڈ اور اینٹی ورلڈ کے درمیان کیا رشتہ ہے۔ کیا دونوں کے درمیان کوئی مواصلاتی سلسلہ ہے جس کے ذریعہ ہماری دنیا اینٹی ورلڈ سے تعلق قائم کرتی ہے۔ سائنس دانوں کا جواب اثبات میں ہے۔ ڈاکٹر نان کا خیال ہے کہ بلیک ہول اور وائٹ ہول کو ورلڈ اور اینٹی ورلڈ کے درمیان ایک مقامی واسطہ (Local Channels) سمجھنا چاہئے۔

بہت سے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اینٹی ورلڈ ہم سے الگ اور ہماری دنیا کے متوازی اپنا وجود رکھتا ہے تخلیق کے بارے میں عظیم دھماکہ (Big Bang) کا نظریہ فرض کرتا ہے کہ ۱۰ سے ۲۰ بلین سال پہلے سارا مادہ منجمد حالت میں ابتدائی ایٹم کی صورت میں تھا اور فوٹان انرجی پر مشتمل تھا۔ قیاس ہے کہ فوٹان، ایک عظیم دھماکہ کے ساتھ میٹر اور اینٹی میٹر کی صورت میں مجتمع ہو گئے اور ورلڈ اور اینٹی ورلڈ کو بنانے کے لئے الگ الگ ہو گئے۔ اسی بنیاد پر ہینز الفوین (Hannes Alfven) نے ۱۹۶۳ میں تفریقی میکانزم (Sepration Mechanism) کا امکان ظاہر کیا جس کے ذریعہ ایک ہی کہکشاں میں میٹر اور اینٹی میٹر دونوں موجود رہتے ہیں۔

سائنس یہاں پہنچ کر خاموش ہو جاتی ہے اور اسے خاموش ہو جانا چاہئے۔ کیونکہ اس کا دائرۂ تحقیق صرف وہ واقعات ہیں جو قانون طبیعی کے تحت ظہور میں آتے ہیں۔ ماورائے طبیعات چیزوں کے بارے میں وہ ہمیں کوئی قطعی بات نہیں بتا سکتی۔ تاہم اس نے یہ تسلیم کر کے ہمارے لئے مزید تحقیق کا دروازہ کھول دیا ہے کہ استنباط (Inference) بھی ایک جائز ذریعہ علم ہے بشرطیکہ وہ ثابت شدہ واقعات کی بنیاد پر کیا گیا ہو۔ اس اصول کی روشنی میں اگر ہم یہ استنباط کریں کہ دوسری دنیا، جہاں مرنے کے بعد انسان پہنچ رہا ہے، غالباً وہی ہے جس کو سائنس نے اینٹی ورلڈ کا نام دیا ہے تو خالص علمی اعتبار سے اس کو نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہوگی۔

موجودہ معلوم دنیا میں جو صورت حال ہے، وہ بھی یہی ہے۔ سائنس کی پہنچ دنیا کے کمیاتی پہلوؤں تک ہے۔ کیفیاتی پہلو اس کی دسترس سے باہر ہیں۔ سائنس ہمیں پھول کی خبر دیتی ہے، مگر وہ خوشبو کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔ وہ ہمیں اشیاء کا پتہ دیتی ہے مگر ان کے حسن سے ہمیں مطلع نہیں کرتی۔ وہ انسان سے ہمارا تعارف کراتی ہے مگر انسانی شعور کے بارے میں اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح اگر وہ ہمیں "اینٹی ورلڈ" کی خبر دے مگر اس کی "خوشبو" اس کے "حسن"۔ اس کے "شعور" کو بتانے سے عاجز ہے تو اس پر ہمیں تعجب نہ کرنا چاہئے۔ یہ خلا ہم اپنے استنباط کے ذریعہ اسی طرح پُر کر سکتے ہیں جس طرح ہم موجودہ معلوم دنیا کے بارے میں آج بھی کر رہے ہیں۔

وضعی قانون اور الٰہی قانون

راسکو پاونڈ (۱۹۶۴-۱۸۷۰) نے قانون کا مقصد سماجی انجینئرنگ (Social Engineering) بتایا ہے۔ یہ بیان یقیناً صحیح ہوتا بشرطیکہ پاونڈ (Roscoe Pound) یہ بھی ثابت کرسکتا کہ انسانی سماج کمپیوٹر ول کا ایک مجموعہ ہے۔ مگر بدقسمتی سے امریکی پروفیسر کے لئے یہ ثابت کرنا ممکن نہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں وضعی قانون کی اس کمزوری کا راز چھپا ہوا ہے جس کی بنا پر وہ ڈھائی ہزار سالہ کوششوں کی تاریخ رکھنے کے باوجود اب تک اپنا کوئی قابل قبول اصول قانون دریافت نہ کرسکا۔

ایک شخص جب اصول قانون کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے سامنے تقریباً ایک درجن بڑے بڑے اسکولوں کے نام آتے ہیں۔ مگر فنی تفصیلات سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو ان مدارس فکر کو اصولی طور پر دو قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ ایک، نظریاتی اصول قانون (Ideological Jurisprudence) جو اس تلاش میں مصروف ہے کہ "قانون کو کیسا ہونا چاہئے" (Law as it ought to be)۔ دوسرے، تحلیلی اصول قانون (Analytical Jurisprudence) جو قانون کی تعبیر ویسی ہی کرنا چاہتا ہے "جیسا کہ وہ ہے" (Law as it is)۔ اصول قانون کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ دونوں قسم کے اسکول کسی قابل قبول نتیجہ تک پہنچنے میں مکمل طور پر ناکام رہے ہیں۔ علمائے قانون جب قانون کی تشریح ثانی الذکر اصول کی روشنی میں کرتے ہیں تو انھیں اس تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ قانون کا منطقی جواز ان کے ہاتھ سے نکل گیا اور جب اول الذکر اصول کی روشنی میں قانون کو سمجھنا چاہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسی کسی چیز کی دریافت ممکن ہی نہیں۔

ایک طرف وہ علمائے قانون ہیں جو قانون کو محض اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہ انسانی سماج کا ایک خارجی ڈھانچہ ہے، اس لئے اس کو علوم قواعد و ضوابط کی روشنی میں ٹھیک اسی طرح بنایا جاسکتا ہے جیسے عجائب خانہ میں جانوروں کے لئے کٹہرا بنایا جاتا ہے۔ اسی نقطۂ نظر کی ایک وکالت جان آسٹن (۱۸۵۹ - ۱۷۹۰) کا مشہور نظریہ تھا جس میں اس نے کہا:

> Law is what is imposed by a superior on an inferior, be that superior the king or the legislature.

یعنی قانون ان احکام کا نام ہے جو سیاسی طور پر اعلیٰ ہستی کی طرف سے سیاسی طور پر ادنیٰ ہستی کے اوپر نافذ کیا گیا ہو۔ یہ اعلیٰ ہستی خواہ بادشاہ ہو یا مقننہ۔

جان آسٹن (John Austin) کا یہ نظریہ بظاہر ایک قابلِ عمل نظریہ ہونے کے باوجود منطقی صحت سے کمل

طور پر محروم ہے۔ کیونکہ یہ قانون ساز کو یہ مقام دے دیتا ہے کہ اس کا عمل انصاف کے معیاروں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ حالاں کہ انسانی عقل کبھی اس کو قبول نہیں کر سکتی کہ انصاف (Justice) کے تصور کو قانون سے الگ کر دیا جائے۔ قانون جب کسی کے اوپر ایک فیصلہ کا نفاذ کرتا ہے تو اس کا یہ فیصلہ اسی وقت جائز فیصلہ ہے جب کہ وہ انصاف پر مبنی ہو۔

تاہم آج تمام دنیا میں، عملی طور پر، جان آسٹن ہی کے نظریہ کی حکمرانی ہے۔ نام نہاد آزاد دنیا میں یہ کام بغیر کسی اصولِ قانون کے ہو رہا ہے۔ ایک فرانسیسی قانون داں نے جو بات اپنی حکومت کے بارے میں کہی ہے، وہی دوسری تمام حکومتوں پر بھی صادق آتی ہے:

Our government has the power but not the right.

ہماری حکومت کے پاس قانون کے نفاذ کے لئے طاقت ہے مگر اس کا اسے کوئی حق نہیں۔

اشتراکی دنیا میں یہ جبری منطق اس سوویت اصول قانون کے تحت نافذ ہے کہ اشتراکی یا سماجی تعلقات (Social Relationships) ہی کا دوسرا نام قانون ہے۔ اشتراکی دنیا میں چونکہ علمی تحقیق بھی سیاست ہی کا ایک حصہ ہے، اس لئے باہر کی دنیا کے مفکرین کی اس تنقید کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ قانون کی یہ سوشلسٹ تعبیر قانون کے معیاری کردار (Normative Character) کا انکار کر رہی ہے اور قانون کو گھٹا کر صرف اقتصادی قانون بنا دیتی ہے (It reduces law to economic law)

اگرچہ عملی طور پر ساری دنیا میں یہی صورت حال ہے کہ سیاسی طاقت کے زور پر قوانین بنتے ہیں اور رائج کئے جاتے ہیں۔ مگر علمائے قانون کا ایک طبقہ اس سے بے نیاز ہو کر اصول قانون کی علمی تلاش میں مصروف ہے۔ تاہم اس کی اب تک کی تلاش نے اس کو صرف اس نتیجہ تک پہنچایا ہے کہ اصول قانون کے معاملہ میں کسی متفقہ معیار تک پہنچنا ممکن نہیں۔ کیونکہ اس تلاش کا مقصد قانونی معیارات (Legal Norms) کا تعین ہے، اور قانونی معیارات کا تعین اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ بنیادی انسانی اقدار کا تعین ہو جائے۔ اور تمام علماء کا فیصلہ ہے کہ اقدار (Values) کی دریافت خالص عقلی طریقوں سے ممکن نہیں۔

اصول قانون کا مقصد قانون کی فلسفیانہ بنیاد (فلاسفیکل فاؤنڈیشن) یا اس کی قانونی قدر (لیگل ویلو) تلاش کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اصول قانون کا کام یہ ہے کہ وہ قانون کے لئے وجہ جواز (Justification) فراہم کرے۔ جب تک کوئی قانون اپنی پشت پر قابل قبول اصولِ قانون نہ رکھتا ہو، عقلاً جائز نہیں کہ وہ ان انسانوں کے اوپر نافذ کیا جائے جن کے لئے کسی چیز کی قدر و قیمت جاننے کا واحد معیار عقل ہے۔ چنانچہ معلوم تاریخ کے مطابق انسان ڈھائی ہزار سال سے اس تلاش و جستجو میں مصروف ہے، مگر بے شمار دماغوں کی جدوجہد کے باوجود اب تک وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

قانون کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب انسان لکھنا نہیں جانتا تھا، اس وقت بھی قانون کسی نہ کسی شکل میں

موجود تھا۔ تحریر کی دریافت کے بعد اس کو لکھا بھی جانے لگا۔ سب سے قدیم تحریری قانون جو مل سکا ہے، وہ سمیری بادشاہ حمورابی کا قانون ہے جو ۱۹۰۰ ق م میں وضع ہوا تھا۔ سمیری قوم دجلہ و فرات کی وادی میں رہتی تھی۔

اصولِ قانون پر غور و فکر کا کام، تاریخی ریکارڈ کے مطابق، یونانی فلاسفہ سے شروع ہوا۔ سولن جو قدیم یونان کا مشہور قانون داں تھا، اس کا زمانہ مسیح سے چھ سو سال قبل کا ہے۔ افلاطون (۴۲۷-۳۴۷ ق م) کی کتاب قانون پر قدیم زمانہ کی مشہور ترین کتاب ہے۔ قانونی پیشہ بھی سب سے پہلے روم میں مسیح سے تقریباً پانچ سو سال قبل شروع ہوا۔ پندرھویں صدی تک قانون علم الٰہیات ہی کا ایک جزء سمجھا جاتا تھا۔ سولھویں صدی میں وہ نیا ذہن پیدا ہوا جس نے بالآخر قانون کو مذہب سے الگ کر دیا۔ تاہم اب بھی وہ علم سیاست کا ایک جزو بنا رہا۔ انیسویں صدی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے فلسفۂ قانون کو فلسفۂ سیاست سے الگ کیا اور اصول قانون کو ایک مستقل علم کی حیثیت سے ترقی دے کر اس کو اختصاصی مطالعہ کا موضوع بنا دیا۔

قدیم زمانہ کے فلاسفہ کچھ مسلمات سے اپنا اصول قانون اخذ کرتے تھے جن کو وہ فطری حقوق کہتے تھے۔ سولھویں صدی کے بعد یورپ میں جو ذہنی انقلاب آیا، اس نے ثابت کیا کہ یہ مسلّمات حقیقۃً مفروضات ہیں جن کے لئے کوئی عقلی دلیل موجود نہیں۔ اس کے بعد فرد کی آزادی سب سے بڑا مسلمہ قرار پائی جس کو اصول قانون کی بنیاد بنایا جا سکتا تھا۔ مگر صنعتی انقلاب کے نتائج نے بتایا کہ فرد کی آزادی کو اگر خیر اعلیٰ (SUMMUM BONUM) مان لیا جائے تو وہ انسانیت کو استحصال اور انارکی کے سوا اور کہیں نہیں پہنچاتی۔ اب اجتماعی بھلائی (Social Good) کو سب سے بڑا خیر قرار دیا گیا جو قانون سازی کے لئے رہنما اصول کی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر جب اس نظریہ کے پیچھے ہی استعمال سے ایک ہولناک سیاسی جبر وجود میں آیا تو معلوم ہوا کہ فرد کی آزادی اگر سماج کے لئے نقصان دہ تھی تو سماجی بھلائی کا یہ نظریہ فرد کو مجبور و مقہور بنا کر رکھ دیتا ہے۔ بیسویں صدی فرد اور سماج کے درمیان مطابقت تلاش کرنے کی صدی ہے۔ موجودہ صدی کے نصف ثانی میں جن مدارسِ فکر کو قبولیت حاصل ہوئی، ان کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ کسی نہ کسی طور پر قانون کی ایسی بنیاد ڈھونڈ رہے تھے جہاں فرد اور سماج کے مختلف تقاضوں کو ہم آہنگ کیا جا سکے۔ مگر یہ تجربہ بھی ناکامی کے سوا کہیں اور پہنچتا ہوا نظر نہیں آتا۔ آج بھی ایسی کتابیں شائع ہو رہی ہیں جن کا ٹائٹل اس قسم کا ہوتا ہے:

Law in Quest of itself.

(قانون خود اپنی تلاش میں) حتیٰ کہ علمائے قانون کے ایک طبقہ نے اپنا یہ آخری فیصلہ دے دیا ہے کہ ایسی کسی کوشش کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں:

A purely logical interpratation of legal rules is impossible.

قانونی احکام کی خالص منطقی تعبیر ناممکن ہے۔ گستاو ریڈبرش (۱۸۷۸-۱۹۴۹) کا کہنا ہے کہ مطلوبہ قانون

صرف بذریعہ اقرار (Confession) اپنایا جاسکتا ہے نہ اس لئے کہ وہ علمی طور پر معلوم (Scientifically Known) ہے۔ ریڈبرش (GUSTAV RADBRUCH) کی مثال کوئی انفرادی مثال نہیں، بلکہ اسی بنیاد پر ایک مستقل مدرسۂ فکر وجود میں آیا ہے جس کو اضافی مدرسۂ فکر کہتے ہیں۔ اس فکر کے حاملین (Relativists) کا کہنا ہے:

Absolute judgements about law are not discoverable.

مطلق قانون قابلِ دریافت نہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، اصول قانون کی اصل مشکل یہ ہے کہ وہ جس چیز کی تلاش میں ہے، اس کا براہ راست تعلق مسئلہ اقدار سے ہے اور یہ مسئلہ وہ ہے جہاں انسانی عقل اپنی ساری کوشش کے باوجود کسی متفقہ جواب تک پہنچنے میں قطعاً ناکام رہی ہے۔ ایک طرف یہ صورت ہے کہ انسان، وجدانی طور پر، خیر و شر کا اتنا شدید احساس رکھتا ہے کہ اس کو نہ تو اٹھارویں صدی کے میکانکی فلسفے ختم کر سکے اور نہ سوویت روس کا کلیت پسندانہ نظام، جس کو نصف صدی سے بھی زیادہ طویل عرصہ تک یہ موقع ملا کہ وہ نسلِ انسانی کو اپنے نظریاتی کارخانہ میں ڈھال سکے۔ دوسری طرف یہ مشکل کہ بہترین دماغوں کی ساری کوشش بھی اقدار کا کوئی متفقہ معیار تلاش کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہی ہے۔ سائنس کی ترقی اس کو زیادہ سے زیادہ واضح کرتی جا رہی ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں اقدار اپنا کوئی معروضی مقام (Objective Status) نہیں رکھتیں۔

جوزف وڈکرچ (۱۸۹۳—۱۹۷۰) نے اپنی کثیر الاشاعت کتاب (THE MODERN TEMPER) میں اس کا مطالعہ کیا ہے۔ "خواہ انسان کتنی ہی کوشش کرے" پروفیسر کرچ (Joseph Woodkrutch) لکھتے ہیں "اس کی روح کے دو نصف مشکل ہی سے باہم متحد ہو سکتے ہیں۔ اور وہ نہیں جانتا کہ وہ اس طرح خیال کرے جیسے کہ اس کی عقل بتاتی ہے کہ اسے خیال کرنا چاہئے، یا وہ اس طرح محسوس کرے جیسے اس کے جذبات اس کو محسوس کراتے ہیں۔ اور اس طرح وہ اپنی برباد اور تقسیم شدہ روح کے اندر ایک مضحکہ بن کر رہ گیا ہے"

کرچ کا یہ جملہ اکثر نقل کیا گیا ہے:

Man is an ethical animal in an univese which contains no ethical element. p. 16

انسان ایک اخلاقی جانور ہے ایک ایسی کائنات میں جو اپنے اندر کوئی اخلاقی عنصر نہیں رکھتی۔

کرچ کی غلطی یہ ہے کہ اس نے اپنے دائرہ سے باہر قدم رکھ دیا ہے۔ میں جس بنیادی نکتہ پر زور دینا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ جو چیز ثابت ہوئی ہے، وہ یہ نہیں کہ اقدار کا کوئی وجود نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہ انسان ان کو دریافت نہیں کر سکتا۔ یہاں میں ڈاکٹر الکسس کیرل (۱۸۷۳—۱۹۴۴) کا حوالہ دوں گا۔ ڈاکٹر کیرل (Alexis Carrel) نے اپنی کتاب انسان نامعلوم (MAN THE UNKNOWN) میں دکھایا ہے کہ اقدار کا مسئلہ اتنے مختلف النوع علوم کی کامل واقفیت سے تعلق رکھتا ہے جن کو انسان اپنی محدود عمر میں کسی طرح حاصل

نہیں کر سکتا۔ ان کو حاصل کر کے ان کا تجزیہ کرنا اور نتیجہ نکالنا تو درکنار۔ انھوں نے مزید اس بات کو رد کر دیا ہے کہ ماہرین کی ایک کمیٹی اس مسئلہ کی تحقیق کر کے کسی آخری نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرے، کیونکہ "ایک اعلیٰ آرٹ کی تخلیق ایک ذہن کرتا ہے، اعلیٰ آرٹ کسی اکیڈمی کے ذریعہ کبھی وجود میں نہیں آتا"

سگمنڈ فرائڈ (۱۹۳۹-۱۸۵۶) کے وقت سے اب تک نفسیات کے جو مختلف اسکول وجود میں آئے ہیں، وہ باہمی اختلافات کے باوجود اس مشترکہ کوشش میں مصروف رہے ہیں کہ نفسیات کا کوئی اقدار سے آزاد علم (Value Free Science) وجود میں لائیں۔ مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ ایک صدی کی مسلسل کوششوں کے باوجود وہ اس منزل تک پہنچنے میں بالکل ناکام رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اب ان کے درمیان اس کے خلاف رد عمل شروع ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ کا ممتاز ماہر نفسیات ابرہام میسلو (۱۹۷۰-۱۹۰۸) جو خود ثبوتی کرداریت (Positivistic-Behavioristic Tradition) کے زیر سایہ تیار ہوا تھا، اپنی عمر کے آخری حصہ میں وہ انسانی فطرت کے دور تر گوشے (Farther reaches of human nature.) کی تلاش میں مصروف ہو گیا۔ میسلو Abraham Maslow کا کہنا ہے:

> Psychology had voluntarily restricted itself to only half of its rightful jurisdiction.

نفسیات نے اپنے جائز حدود کار کے نصف حصہ سے بطور خود اپنے آپ کو روک لیا۔

الٰہی قانون

وضعی قانون کی ناکامی کے بارے میں اوپر میں نے جو اشارات کئے، وہ ہر وہ شخص جانتا ہے جس نے اصول قانون کا مطالعہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قانون دانوں کا یہ مفروضہ قطعی طور پر بے بنیاد ثابت ہو چکا ہے کہ انسان خود اپنے لئے قانونی معیار دریافت کر سکتا ہے۔

اس کے بعد ہمارے سامنے دوسرا مفروضہ آتا ہے اور وہ الٰہی قانون کا مفروضہ ہے۔ الٰہی قانون، جس کا محفوظ اور مستند متن قرآن کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ قانون کا ماخذ خدا کا الہام ہے۔ یعنی یہ کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ خدا نے الہام کے ذریعہ اپنا قانون اپنے رسول پر اتارا ہے۔ یہی قانون انسان کے لئے صحیح ترین دستور العمل ہے۔ اس قانون کی بنیاد پر قیاس اور اجتہاد کر کے مزید قانون سازی ہو سکتی ہے۔ مگر اصولی طور پر اس سے انحراف جائز نہیں۔

میں پیشگی طور پر اعتراف کرتا ہوں کہ خالص علمی اعتبار سے یہ ایک پیچیدہ دعویٰ ہے۔ مگر جو نکتہ خصوصی طور پر قابل لحاظ ہے، وہ یہ کہ اس کی پیچیدگی کے اسباب خود قانون میں ہونا ضروری نہیں۔ وہ اس واقعہ میں بھی ہو سکتے ہیں کہ ہماری عقل کچھ محدودیتوں (Limitations) کا شکار ہے اور اس بنا پر وہ سارے حقائق کا براہ راست

احاطہ نہیں کر سکتی۔ خوش قسمتی سے جدید سائنس کا موقف اس معاملہ میں ہماری تائید کرتا ہے۔ جدید سائنس نے یہ اعتراف کیا ہے کہ حقائق کی مقدار صرف اتنی ہی نہیں جو براہ راست ہمارے حسیاتی تجربہ میں آتی ہیں۔ بلکہ اس سے آگے اور بھی حقائق ہیں۔ مزید یہ کہ نامعلوم حقائق نہ صرف معلوم حقائق سے مقدار میں زیادہ ہیں بلکہ وہ معلوم حقائق کے مقابلہ میں زیادہ اہم اور معنی خیز ہیں۔ امریکی پروفیسر فرڈ برتھولڈ (Fred Berthold) نے منطقی ثبوتیت (Logical Positivism) کے فلسفہ کو چند لفظوں میں اس طرح سمیٹا ہے:

The important is unknowable, and the knowable is unimportant

جو چیز اہم ہے وہ ناقابل دریافت ہے اور جو چیز قابل دریافت ہے، وہ اہم نہیں۔

۱۹ویں صدی میں یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ انسان کلی حقیقت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اگرچہ اس وقت بھی کلی حقیقت عملاً انسان کی دسترس سے اتنی ہی دور تھی جتنی اس سے پہلے یا اس کے بعد رہی ہے۔ تاہم یہ یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن انسان ضرور اسے دریافت کرے گا۔ مگر بیسویں صدی کے سائنسداں خواہ ثبوتیت Positivism یا فعلیت (Operationalism) کے جھنڈے کے نیچے ہم کو بتا رہے ہیں کہ یہ فرض کر لینا بالکل غلط تھا کہ سائنس ہم کو آخری حقیقت (Ultimate Reality) یا خیر (Good) کے بارے میں کوئی بات بتا سکتی ہے۔ وقت کا دوسرا فلسفہ جس کو وجودیت (Existentialism) کہا جاتا ہے، وہ بھی ہم کو یقین دلا رہا ہے کہ اس کی کوئی صورت نہیں کہ محدود انسان خیر کا ایسا معیار Norm دریافت کر سکے جو اس سے ماورا ہو۔

ان دریافتوں کے بعد انسانی علم اب جس مسئلہ پر پہنچا ہے، وہ یہ کہ قطعی دلائل صرف اس میدان تحقیق میں قائم کئے جا سکتے ہیں جن کو برٹرینڈ رسل (۱۹۷۰-۱۸۷۲) نے چیزوں کا علم (Knowledge of Things) کہا ہے۔ دوسرا میدان تحقیق جو اس کے الفاظ میں صداقتوں کا علم (Knowledge of Truths) سے تعلق رکھتا ہے، ان میں براہ راست دلیل قائم کرنا ممکن نہیں۔ چنانچہ مان لیا گیا ہے کہ ہم کسی معاملہ میں قطعیت (Certainty) تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہم صرف یہ کر سکتے ہیں کہ اغلب رائے Probable Judgement تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ یہ بات صرف غیر مادی حقائق تک محدود نہیں ہے بلکہ بہت سی وہ چیزیں جن کو مادی حقائق میں شمار کیا جاتا ہے، ان کا معاملہ بھی تقریباً ایسا ہی ہے، جیسے روشنی، یا مقناطیسی قوت کی تشریح۔

میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ فیصلہ کی یہ بنیاد جو جدید علم نے فراہم کی ہے، وہ عین الٰہی قانون کے حق میں ہے۔

الٰہی قانون کا یہ مفروضہ کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے، غالباً جدید انسان کے لئے اتنا زیادہ ناقابل فہم نہیں جتنا اس کا یہ جزو کہ خدا بذریعہ الہام اپنی مرضی انسان کے پاس بھیجتا ہے۔ اکثر بڑے بڑے سائنس داں کسی نہ کسی شکل میں خدا کو مانتے تھے۔ نیوٹن (۱۷۲۷-۱۶۴۲) کے نزدیک نظام شمسی کو متحرک کرنے کے لئے ایک خدائی ہاتھ (Divine Arm) کی ضرورت تھی۔ ڈارون (۱۸۸۲-۱۸۰۹) آغاز حیات کے لئے ایک خالق (Creator)

کو ضروری سمجھتا تھا۔ آئن سٹائن (۱۹۵۴ء - ۱۸۷۹) کو ایک برتر ذہن (Superior Mind) کی جھلک دکھائی دی جو کائنات کے مظاہر میں اپنے کو ظاہر کر رہا تھا۔ سر جیمس جینس (۱۹۴۶ - ۱۸۷۷) کے مطالعہ نے اسے اس نتیجہ تک پہنچایا ہے کہ کائنات "گریٹ مشین" سے زیادہ "گریٹ تھاٹ" معلوم ہوتی ہے۔ سر آرتھر ایڈنگٹن (۱۹۴۴ - ۱۸۸۲) کے نزدیک جدید سائنس ہمیں اس حقیقت تک پہنچا رہی ہے کہ:

The stuff of the world is mind-stuff.

(کائنات کا مادہ ایک شے ذہنی ہے)۔ الفرڈ نارتھ وائٹ ہڈ (۱۹۴۷ - ۱۸۶۱) کے نزدیک جدید سائنسی معلومات یہ ثابت کر رہی ہیں کہ فطرت ایک زندہ حقیقت ہے نہ کہ بے روح مادہ (Nature is Alive)

تاہم جہاں تک الہام کا تعلق ہے، مجھے اعتراف ہے کہ خالص علمی اعتبار سے یہ ایک نہایت پیچیدہ عقیدہ ہے۔ یہ ان چیزوں میں سے نہیں جس کا عمومی مشاہدہ کرایا جا سکتا ہو۔ مگر یہ کہنا مبالغہ آمیز نہیں کہ ہمارے تجربہ میں ایسے بہت سے حقائق آتے ہیں جن سے استنباط کیا جا سکتا ہے کہ یہاں ایسی کوئی حقیقت پائی جاتی ہے جس کو الہام سے تعبیر کیا جا سکے۔ جدید میتھڈالوجی اس کو تسلیم کرتی ہے کہ مستنبط حقائق (Infered Facts) بھی اتنے ہی یقینی ہو سکتے ہیں جتنے کہ مشہود حقائق (Obsereved Facts) اس لئے ہمارے استدلال کی اہمیت اس سے کم نہیں ہوتی کہ وہ مشاہداتی نہیں ہیں بلکہ استنباطی نوعیت کے ہیں۔

۱۹ ویں صدی میں قانون تعلیل (Principle of Causation) کو خالق کا بدل سمجھ لیا گیا تھا۔ مگر موجودہ صدی میں ایسے بہت سے واقعات سائنس کے علم میں آئے ہیں جن کی توجیہہ اسباب مادی کے عام اصول کے تحت نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر ریڈیم کے الکٹران کا ٹوٹنا، جن کو معلوم قوانین کے تحت بیان کرنے کی ساری کوشش ناکام ہو چکی ہے۔ حتیٰ کہ ایک سائنس داں کو کہنا پڑا کہ ریڈیم کے کسی ٹکڑے میں کون سا الکٹران کس وقت ٹوٹے گا، اس کا فیصلہ کرنا خداؤں کے اختیار میں ہے، خواہ وہ جو بھی ہوں:

It may rest on the knees of whatever goods there be

حیوانات کا مطالعہ بھی یہی بتاتا ہے۔ حیوانات کے بارے میں ثابت ہو چکا ہے کہ ان کے اندر جو جبلت (Instinct) ہوتی ہے، وہ اکتسابی نہیں۔ مثلاً شہد کی مکھی اپنے چھتہ کو ہشت پہل بناتی ہے۔ کسی تربیت نے اس کو نہیں بتایا کہ ہشت پہل خانہ اس کے مقصد کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے، حتیٰ کہ وہ اس کی معنویت کا بھی کوئی ذاتی شعور نہیں رکھتی۔ اس کے باوجود وہ اس ریاضیاتی طریق تعمیر میں اس طرح مصروف رہتی ہے جیسے اس سے کسی نے کہہ دیا ہو کہ تم ایسا ہی کرو۔ (وَاَوحیٰ رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ، نحل - ۶۸)

اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں جو ہمیں اس اغلبیت کی طرف لے جاتے ہیں کہ اشیاء سے باہر کوئی شعور ہے جو اشیاء کو ان کے وظیفۂ حیات کے بارے میں ہدایات دے رہا ہے۔ حتیٰ کہ سر آرتھر اڈنگٹن نے جدید کوانٹم نظریہ کو الہام کی سائنسی تصدیق قرار دیا ہے۔ قرآن کا یہ بیان بیسویں صدی کے انسان کے لئے شاید اس سے زیادہ

قابلِ فہم ہے جتنا وہ ساتویں صدی کے انسان کے لئے ہو سکتا تھا:

وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا (حٰم سجدہ ۔ ۱۲)   اور خدا نے ہر آسمان میں اس کا حکم اتارا

اس کے بعد جب ہم انسان کے مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی کے دو حصے ہیں۔ ایک وہ جس کو حیاتیاتی حصہ کہہ سکتے ہیں۔ دوسرا وہ جس کو نفسیاتی حصہ کہا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کا حیاتیاتی حصہ ٹھیک اسی طرح مکمل طور پر خارجی قوانین کا پابند ہے جس طرح کائنات کی دوسری چیزیں اس کی پیروی کر رہی ہیں۔ وہ چیز جس کو میڈیکل سائنس کہا جاتا ہے، اس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ان مخفی قوانین فطرت کا پتہ لگائے جس کے تحت انسانی زندگی کا حیاتیاتی حصہ کام کرتا ہے اور اس کو اس حصہ انسانی پر استعمال کرے۔ اب اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ قانون فطرت جو ستاروں اور سیاروں سے لے کر انسان کے حیاتیاتی حصہ تک کارفرما ہے، اس کا ماخذ وہ الہام ہے جو کائناتی شعور کی طرف سے ہر ایک کو پہنچ رہا ہے تو اس کے بعد، اسی پر قیاس کرتے ہوئے، یہ ماننا خود بخود آسان ہو جاتا ہے کہ انسان کے نفسیاتی حصہ کے لئے قانون کا تعین بھی اسی شعور کی طرف سے ہو سکتا ہے اور اسی کی طرف سے ہونا چاہئے۔

خالص عقلی نقطۂ نظر سے کہا جا سکتا ہے کہ اس استدلال کی بنیاد ایک "قیاس" پر قائم ہے۔ مگر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ انسان کی ساخت کچھ اس ڈھنگ پر ہوئی ہے کہ قیاسی استدلال سے مفر اس کے لئے ممکن نہیں۔ اگر وہ قیاسی استدلال کو تسلیم کرنے سے انکار کرے تو لازماً اس کو تشکیک کی پناہ گاہ میں جانا پڑیگا، جو عملی طور پر ناممکن ہے۔

قرآن نے بھی اس معاملہ میں جواب کا یہی انداز اختیار کیا ہے:

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ، قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ   تم سے وحی کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ وحی
وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا   خدا کے حکم سے ہے اور تم کو صرف تھوڑا علم دیا گیا ہے

یہاں وحی سے متعلق سوال کے جواب میں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ امرِ رب ہے۔ دوسرے یہ کہ تم کو علم قلیل دیا گیا ہے۔ پہلے جزء کا مطلب یہ ہے کہ وحی اسی طرح انسان کے لئے امرِ رب ہے جس طرح سارا نظامِ عالم امر رب (قانون فطرت) کے ماتحت ہے۔ یہ کوئی منفرد چیز نہیں بلکہ انسانی دائرہ میں وہی چیز ہے جس کا مشاہدہ تم کائنات کے دائرہ میں کر رہے ہو۔ دوسرے جزء کا مطلب یہ ہے کہ وحی کو عقلی طور پر سمجھنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ تم اس حقیقتِ واقعہ کو تسلیم کرو کہ انسان کو علم قلیل دیا گیا ہے۔ اس کو علم کثیر نہیں دیا گیا۔ اس واقعہ کو مان کر چلو گے تو وحی کی حقیقت سمجھ جاؤ گے اور اگر اس واقعہ کا انکار کر کے سمجھنا چاہو تو تم اس کو نہیں سمجھ سکتے۔

حیرت انگیز بات ہے کہ تیرہ سو برس پہلے کا اعلان آج سائنس کے جدید ترین مرحلہ میں اپنی صداقت کو مزید شدت کے ساتھ ثابت کر رہا ہے۔ پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴) کے ساتھ جس نئے دور سائنس کا آغاز ہوا ہے،

اس نے قطعیت کے ساتھ تسلیم کر لیا ہے کہ انسان بعض حیاتیاتی اور نفسیاتی محدودیتوں کا شکار ہے، اس لئے وہ سارے حقائق کو اپنے محسوسات کی گرفت میں نہیں لاسکتا۔ ضروری ہے کہ اپنے قلتِ علم کی اس کمی کو پورا کرنے کے لئے وہ مروجہ سائنسی طریقوں پر بعض ایسے طریقوں کا اضافہ کرے جو انیسویں صدی تک غیر سائنسی سمجھے جاتے تھے۔

آئن سٹائن نے کائنات کے بارے میں جو انقلاب انگیز سائنسی نظریات وضع کئے، اس کے سلسلے میں اس نے اعتراف کیا کہ یہ کام اس طریقہ کی پابندی کر کے نہیں ہو سکتا جو مثال کے طور پر، حرکیات گیس کا نظریہ (Kinetic Theory of Gases) میں کارآمد ہے۔ یہاں اس نے ترکیبی طریقہ (Synthetic Method) کے بجائے تحلیلی طریقہ (Analytical Method) سے کام لیا۔ اس نے سائنسی نظریات کی دو تقسیمیں کیں۔ ایک عمارتی نظریات (Constructive Theories) دوسرے اصولی نظریات (Principle Theories) اس نے کہا کہ نظریہ اضافیت (Relativity) کو سمجھنے کے لئے صرف دوسرے قسم کا نظریہ ہی کام دے سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس نے کائنات کے گہرے حقائق کو سمجھنے کے لئے سائنسی مشاہدہ کے بجائے ایک قسم کے سائنسی تصور (Scientific Contemplation) کی وکالت کی۔ چنانچہ ایک پروفیسر نے آئن سٹائن کے نظریہ کا خلاصہ ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

In dealings with the eternal verities, the area of experiment is reduced and that of contemplation enhanced.

ابدی حقیقتوں کی بحث میں تجربہ کا دائرہ گھٹ جاتا ہے اور تصور کا دائرہ بڑھ جاتا ہے۔

قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک الہامی قانون ہے جو انسان کی رہنمائی کے لئے اتارا گیا ہے۔ یہ بات کہ وہ فی الواقع ایک الہامی قانون ہے، اس کے لئے خود قرآن نے بڑی عجیب دلیل دی ہے۔ اس نے اعلان کیا ہے کہ انسان کبھی بھی اس کے جیسی کتاب نہ بنا سکے گا، خواہ وہ اس کے لئے کتنی ہی کوشش کر ڈالے:

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ — بقرہ ـ ۲۳

اور اگر تم اس کتاب کے بارے میں شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندہ پر اتاری ہے تو اس جیسی ایک سورت بنا کر لے آؤ

قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا — بنی اسرائیل ـ ۸۸

کہہ دو اگر آدمی اور جن اس لئے جمع ہوں کہ ایسا قرآن بنا لائیں تو وہ ہرگز نہ لاسکیں گے خواہ وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہوں

انسائیکلوپیڈیا آف فلاسفی کے مقالہ نگار کے الفاظ میں، فلسفیانہ اعتبار سے جو بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ وہ کیا معیار ہے جس پر الہام کے دعوے کو جانچا جا سکے:

The main philosophical question that arises concerns the criteria by which revelation claims may be judged.

قرآن کے سلسلے میں اگر ہم ایسا کر سکیں کہ اس کے مذکورہ بالا دعوے کو اس جانچ کا معیار مان لیں تو یہ معیار حیرت انگیز طور پر یہ ثابت کر رہا ہے کہ وہ خدائی الہام ہے۔ پچھلی ۱۴ سو برس کی تاریخ میں قرآن اور اسلام کے بے شمار دشمن پیدا ہوئے۔ وہ اس چیلنج کے جواب میں قرآن جیسی ایک کتاب عربی زبان میں تیار کر کے نہایت آسانی سے اس کو شکست دے سکتے تھے۔ اور یقیناً بہت سے لوگوں نے اس کی کوششیں بھی کیں۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ مسیلمہ (۶۳۳-) اور ابن مقفع (۷۲۴-۷۶۱) سے لے کر صلیبی جنگوں (۱۰۹۵-۱۲۷۱) کے بعد پیدا ہونے والے مسیحی مستشرقین تک کوئی بھی اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

اب تک کے مطالعہ نے ہمیں جہاں پہنچایا ہے، اس میں اگر ایک اور قرینہ کو ملا لیا جائے تو شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ زیر بحث مسئلہ بڑی حد تک قابل فہم ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ الٰہی قانون نے جو قانونی اصول اب سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے متعین کئے تھے، وہ حیرت انگیز طور پر اب بھی اپنی صحت کو باقی رکھے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس درمیان میں وضعی قانون نے اس کو رد کر کے جو متبادل اصول مقرر کئے تھے وہ دو سو سالہ تجربہ میں ناکام ثابت ہو گئے اور اب علم کا دریا دوبارہ اس سمت میں جا رہا ہے جہاں اس نے الٰہی قانون کو چھوڑا تھا۔ وضعی قانون کے مقابلہ میں الٰہی قانون کی یہ ابدیت اسی وقت قابل فہم ہو سکتی ہے جب کہ یہ مانا جائے کہ اس کا سرچشمہ انسانی ذہن کے باہر کسی ابدی ذہن میں پایا جاتا ہے۔

میں یہاں چند مثالیں دوں گا۔

۱۔ الٰہی قانون میں فرد کی آزادی کو خدائی حکم کے پابند کیا گیا ہے:

يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ — کہتے ہیں کیا امر کچھ ہمارے ہاتھ میں بھی ہے۔
قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ (آل عمران-۱۵۴) — کہہ دو امر سب کا سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے بعد عالمی ذہن میں جو انقلاب آیا، اس نے اس اصول کو غلامی سے تعبیر کیا۔ اس نے اعلان کیا کہ آزادی سب سے بڑی انسانی قدر ہے۔ فرانس کے انقلاب (۱۷۸۹) سے لے کر اب تک اس اصول کو دو سو برس تجربہ کرنے کا موقع ملا۔ مگر اس تجربہ کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ اب ایسے محققین پیدا ہو رہے ہیں جو فرد کی آزادی کو بے معنی قرار دے رہے ہیں۔ پروفیسر اسکنر (-۱۹۰۴) کا کہنا ہے کہ:

We can't afford freedom

(ہم آزادی کا تحمل نہیں کر سکتے)۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مفکرین کے برعکس اسکنر (B.F. Skinner) کا کہنا ہے کہ آزادی کوئی خیر اعلیٰ (SUMMUM BONUM) نہیں۔ انسان کو لامحدود آزادی نہیں بلکہ پابند نظام (Disciplined Culture) چاہئے۔ انسانی فکر کی یہ واپسی الٰہی قانون کی ابدیت کا بالواسطہ اعتراف ہے۔

۲۔ الٰہی قانون کی رو سے مرد اور عورت کا دائرہ کار الگ الگ ہے اور عملی زندگی میں مرد کو عورت پر فوقیت دی گئی ہے:

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ (نساء-۳۴) مرد قوام ہیں عورتوں کے اوپر

وضعی قوانین نے اس اصول کو مکمل طور پر غلط قرار دیا۔ مگر سو برس کے تجربہ نے بتایا کہ الٰہی قانون ہی اس معاملہ میں حقیقت سے قریب تر ہے۔ آزادی نسواں کی تحریک کی تمام تر کامیابیوں کے باوجود آج بھی "مہذب" دنیا میں مرد ہی جنس برتر (Dominant Sex) کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزادی نسواں کے علم بردار یہ کہتے تھے کہ عورت اور مرد کا فرق محض سماجی حالات کی پیداوار ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں، مختلف متعلقہ شعبوں میں، اس مسئلہ کا جو گہرا مطالعہ کیا گیا ہے، اس سے ثابت ہوا ہے کہ صنفی فرق کے پیچھے حیاتیاتی عوامل (Biological Factors) کارفرما ہیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی میں نفسیات کے پروفیسر جیروم کاگن (- ۱۹۲۹) کے مطالعہ نے اسے بتایا ہے:

> Some of the psychological differences between men and women may not be the product of experience alone but of subtle biological differences. P. 33

مرد اور عورتوں میں بعض نفسیاتی فرق محض معاشرتی تجربات کی وجہ سے نہیں ہو سکتے بلکہ وہ لطیف قسم کے حیاتیاتی فرق کی پیداوار ہیں۔

ایک امریکی سرجن Edgar Berman کا فیصلہ ہے کہ "عورتیں اپنی ہارمون کیمسٹری کی وجہ سے اقتدار کے منصب کے لئے جذباتی ثابت ہو سکتی ہیں":

> Because of their hormonal chemistry women might be too emotional for positions of power.
>
> *Time Magazine*, March 20, 1972, p. 28

امریکہ میں آزادی نسواں کی تحریک کافی طاقت ور ہے۔ مگر اب اس کے حامی محسوس کرنے لگے ہیں کہ ان کی راہ کی اصل رکاوٹ سماج یا قانون نہیں بلکہ خود فطرت ہے۔ فطری طور پر ہی ایسا ہے کہ عورت بعض حیاتیاتی محدودیت (Limitations of Biology) کا شکار ہے۔ میل ہارمون اور فیمیل ہارمون کا فرق دونوں میں زندگی کے آغاز ہی سے موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ تحریک نسواں کے پرجوش حامی کہنے لگے ہیں کہ فطرت ظالم ہے۔ ہمیں چاہئے کہ پیدائشی سائنس (Science of Eugenics) کے ذریعہ جنیٹک کوڈ کو بدل دیں اور نئے قسم کے مرد اور نئی قسم کی عورتیں پیدا کریں۔ یہ ہے وہ آخری انجام جو امریکی عورت کے نعرہ پالیسی بناؤ کافی نہ بناؤ (Make policy not coffee) کا دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک میں ہوا ہے۔

یہ واقعہ اس بات کا ایک تجرباتی قرینہ ہے کہ وضعی قانون کے مقابلہ میں الٰہی قانون میں فطرت کی رعایت زیادہ پائی جاتی ہے۔

۳۔ الٰہی قانون میں سزا کا خاص مقصد نکال (دوسروں کے لئے عبرت) بتایا گیا ہے۔ اسی لئے الٰہی قانون نے بعض بڑے جرائم کی نہایت سخت سزائیں مقرر کی ہیں تاکہ ایک کا انجام دیکھ کر دوسرے اس سے

رک جائیں۔ مگر جدید دور میں اس کو رد کر دیا گیا۔ پہلا نمایاں شخص جس نے مجرمین کی سزا میں تخفیف کی وکالت کی وہ اٹلی کا ماہر جرمیات کیساری بیکریا (۱۷۹۴ – ۱۷۳۸) تھا۔ اس کے بعد سے اب تک جرمیات (Criminalogy) کے موضوع پر بہت کام ہوا ہے، ماہرین کا عام طور پر یہ خیال ہو گیا تھا کہ جرم کوئی "ارادی واقعہ" نہیں، اس کے اسباب حیاتیاتی ساخت، ذہنی بیماری، معاشی تنگی، سماجی حالات وغیرہ میں ہوتے ہیں۔ اس لئے مجرم کو سزا دینے کے بجائے اس کا "علاج" کرنا چاہئے۔ حتیٰ کہ تین درجن سے زیادہ ایسے ملک ہیں جنھوں نے موت کی سزا کو اپنے یہاں ختم کر دیا ہے۔ اگرچہ یہ خاتمہ بھی صرف اخلاقی جرائم کی حد تک ہوا ہے۔ سیاسی اور فوجی جرائم کے سلسلے میں اب بھی ہر ملک ضروری سمجھتا ہے کہ مجرم کو سخت ترین سزا دی جائے۔

مگر جنگ عظیم ثانی کے بعد جرائم میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کو روکنے کی تمام معالجاتی تدبیریں ناکام ہو چکی ہیں۔ چنانچہ کئی ملکوں مثلاً ڈیلاویر (Delaware) اور سری لنکا میں پہلے سزائے موت ختم کی گئی تھی اور اب اس کو دوبارہ بحال کر دیا گیا ہے۔ ماہرین قانون میں دوبارہ ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو اس کی اہمیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ایک بیرسٹر نے کہا ہے "لوگوں میں یہ عام تاثر ہونا کہ کسی بھی شخص کو قتل کرنا، مجرم کو موت کی سزا کا مستحق بناتا ہے، اپنے اندر بہت بڑی مانع قدر (Deterrent Value) رکھتا ہے"

یہ تجربہ اس مفروضہ کی تصدیق کرتا ہے کہ جرم کی سزا کا مسئلہ جن پیچیدہ سوالات سے گہری واقفیت چاہتا ہے، الٰہی قانون میں اس کی رعایت وضعی قانون سے زیادہ پائی جاتی ہے۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا، اس کا خلاصہ مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ وضعی قانون کوئی قابل قبول اصول قانون دریافت کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہا ہے۔ مزید یہ کہ وہ آئندہ بھی ناکام ہی رہے گا۔ کیونکہ انسان کی محدودیت یہاں راہ میں حائل ہو رہی ہے۔

۲۔ وہ واقعہ جس نے انسان کے لئے اصول قانون کی دریافت کو ناممکن بنا دیا ہے، اسی میں الٰہی قانون کی صداقت کا قرینہ چھپا ہوا ہے۔ کیونکہ ایک طرف ذہن انسانی کی محدودیت اور دوسری طرف حقائق کی وسعت ظاہر کر رہی ہے کہ کوئی ایسا ذہن ہو جو انسانی ذہن سے برتر ہو اور جس کے اندر سارے حقائق موجود ہوں۔

۳۔ کائنات میں ایسے واقعات ہیں جو فطرت اور جبلت کی سطح پر الہام کا امکان ثابت کر رہے ہیں۔ الٰہی قانون اس میں صرف یہ اضافہ کرتا ہے کہ اس الہام کو انسان تک وسیع کر دیتا ہے۔ یہ واقعہ اس مفروضہ کو مزید مؤید کرتا ہے کہ موجودہ الٰہی قانون میں کچھ ایسی برتر امتیازی خصوصیات ہیں جو اسی وقت قابل فہم ہو سکتی ہیں جب کہ یہ مانا جائے کہ وہ ایسے ذہن سے نکلا ہے جو انسان کے مقابلہ میں زیادہ وسیع طور پر حقائق کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

چند سوالات

اگر یہ مان لیا جائے کہ الٰہی قانون ہی اصول قانون کی تلاش کا جواب ہے جب بھی چند سوالات باقی رہتے ہیں۔

۱۔ مختلف مذاہب "الٰہی قانون" کا حامل ہونے کے دعوے دار ہیں اور ان میں کافی اختلافات بھی ہیں۔ پھر وہ کون سا معیار ہوگا جس کی بنیاد پر کسی ایک مذہب کے قانون کو الٰہی قانون قرار دیا جائے گا۔

۲۔ کسی ایک مذہب کو معیار ماننے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ان کے اندرونی اختلافات کو طے کرنے کی صورت کیا ہوگی۔

۳۔ یہ الٰہی قانون ہزار برس سے بھی زیادہ قدیم زمانہ میں آیا۔ اس دوران میں زندگی میں بے شمار تبدیلیاں ہوگئیں۔ پھر اس کو نئے حالات کے مطابق کس طرح بنایا جائے گا۔

یہ تین بڑے سوالات ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے بارے میں مختصراً عرض کروں گا۔

مذاہب کی کثرت سے یہ بات یقیناً ثابت ہوتی ہے کہ ہر زمانہ میں اور ہر قوم میں خدا کی طرف سے اس کا قانون بھیجا گیا۔ مگر ان کا باہمی اختلاف یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک ہی ہوگا جس کو الٰہی قانون کا صحیح نمائندہ قرار دیا جا سکے۔ تعدد (Pluralism) عقلی طور پر ناقابل فہم عقیدہ ہے۔ اب یہ سوال ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو مستند نمائندہ کی حیثیت سے منتخب کرنے کی صورت کیا ہو۔ اس کا بالکل سیدھا سادا علمی طریقہ یہ ہے کہ ان کو تاریخ کے معیار پر جانچا جائے اور جس مذہب کا تاریخی طور پر محفوظ اور معلوم ہونا ثابت ہو جائے اس کو لے لیا جائے۔

اگر میں یہ کہوں تو یقیناً میں کسی صاحب علم کی معلومات میں اضافہ نہیں کروں گا کہ تاریخی جانچ کی کسوٹی پر صرف ایک ہی مذہب پورا اترتا ہے اور وہ اسلام ہے۔ آپ کوئی بیاگریفیکل ڈکشنری کھولیں تو تمام پیغمبروں میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اکیلے ہوں گے جن کے نام کے آگے عام قاعدہ کے مطابق قوسین میں (۶۳۲ - ۵۷۰) لکھا ہوا ہوگا جس طرح دوسری تاریخی شخصیتوں کے نام کے آگے ہوتا ہے۔ حضرت محمدؐ واحد پیغمبر ہیں جن کی زندگی تاریخ کے تحریری ریکارڈ میں شامل ہے۔ آپ کے متعلق ہر بات معلوم ہے اور آپ کے تبرکات اور مکتوبات تک اصلی حالت میں موجود ہیں۔ حتیٰ کہ معاصر مورخین کے یہاں بھی آپ کا نام ثبت ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر عین آپ کے زمانہ حیات میں ساتویں صدی عیسوی میں آرمینی زبان میں ایک کتاب (Chronicle of Sebeos) لکھی گئی۔ اس کتاب کا آرمینی متن پٹروگریڈ سے ۱۸۷۹ میں ۱۱۸ صفحات پر شائع ہوا اور اس کے بعد روسی اور دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس کے مقالہ نگار پروفیسر مارگولیتھ (D.S. Margoliouth) (۱۸۵۸ - ۱۹۴۰) نے حضرت محمد کے بارے میں اس کے اندراجات کا خلاصہ حسب ذیل الفاظ میں نقل کیا ہے:

> He was an Ismaelite who taught his countrymen to return to the religion of Abraham and claim the promises made to the descendents of Ismael.
>
> Vol. 8 p. 872

(وہ ایک اسمٰعیلی تھے جنھوں نے اپنے اہل ملک کو یہ تعلیم دی کہ وہ ابراہیم کے مذہب کو اپنائیں اور یہ دعویٰ کیا کہ خدا ان

وعدوں کو ان پر پورا کرے گا جو اس نے اسمٰعیل کی اولاد کے ساتھ کئے ہیں۔) یہ صرف حضرت محمد کی خصوصیت ہے کہ جب کوئی محقق آپ پر قلم اٹھاتا ہے تو وہ لکھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ وہ تاریخ کی کامل روشنی میں پیدا ہوئے:

born within the full light of history. *Encyclopedia Americana*

اسی طرح وہ قرآن جس کو حضرت محمد نے یہ کہہ کر پیش کیا کہ یہ میرے پاس خدا کی طرف سے آیا ہے، وہ تمام و کمال محفوظ ہے۔ تمام محققین نے اس کو بطور واقعہ تسلیم کیا ہے۔ یہ صرف قرآن ہی کی خصوصیت ہے کہ اس کے بارے میں جب آپ کسی محقق کو پڑھتے ہیں تو اس کے یہاں لکھا ہوا ملتا ہے:

> The Qur'an appears to be the most part authentic. The very words that he uttered as a revelation and that were collected in his lifetime.
>
> *Encyclopedia Britanica*

یعنی قرآن بالکل مستند شکل میں محفوظ ہے۔ حضرت محمد نے جو الفاظ بطور الہام اپنی زبان سے نکالے تھے۔ قرآن عین انھیں الفاظ پر مشتمل ہے جو آپ کی زندگی ہی میں مرتب کر دیا گیا تھا۔ مقدس کتابوں کی تاریخ میں یہ بات انتہائی عجیب ہے کہ ہرن کی کھال پر لکھا ہوا وہ قرآن آج بھی تاشقند کی لائبریری میں محفوظ ہے جو پیغمبر اسلام کے داماد اور خلیفہ ثالث عثمان غنی (۶۵۶ - ۶۲۴) کے زیر مطالعہ رہتا تھا۔ قرآن کے ابتدائی نسخہ اور موجودہ متداول نسخوں میں ایک لفظ کا بھی فرق نہیں۔

سر ولیم میور ( ) نے لکھا ہے:

"یہی ایک نکتہ کہ مسلمانوں کے فرقے ہر زمانہ میں قرآن کے ایک ہی نسخے کے پیرو رہے ہیں، قطعی طور پر ثابت کر دیتا ہے کہ جو قرآن آج ہمارے ہاتھوں میں ہے، وہی قرآن ہے جسے عثمان کے حکم سے جمع کیا گیا۔ میرا گمان ہے کہ قرآن کے سوا تمام دنیا میں کوئی کتاب نہیں جس کا متن بارہ صدیوں تک اتنا محفوظ اور آلائش سے پاک رہا ہو"

> Except the Qur'an, there is no other book under the sun, which for the last twelve centuries has remained with so pure a text.
>
> *Life of Mohammed*, Introduction by Sir W. Muir, London 1858

میں شاید یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ الٰہی قانون کی بنیادی صداقت کو تسلیم کرنے کے بعد ان میں سے کسی کو اختیار کرنے کا سب سے زیادہ غیر مشتبہ علمی معیار تاریخ ہی ہو سکتا ہے اور وہ بلا شبہ قرآن کے حق میں فراہم ہو گیا ہے۔

اب یہ سوال ہے کہ خود اسلام کے اندرونی اختلافات کو کس طرح طے کیا جائے۔

یہ مسئلہ جو بظاہر بھیانک معلوم ہوتا ہے اس وقت بالکل معمولی نظر آنے لگتا ہے جب ہم اس حقیقت کو سامنے رکھیں کہ انسانی طبائع میں اختلاف کی وجہ سے تعبیرات و تشریحات میں اختلاف ناگزیر ہے۔ یہ زندگی کی ایک حقیقت ہے نہ کہ زندگی کا ایک مسئلہ۔ اس کا نہایت سادہ حل قرآن نے یہ تجویز کیا ہے کہ جب کوئی اختلافی سوال کھڑا ہو تو ہر شخص اس پر طبع آزمائی نہ کرے بلکہ اس کو ان لوگوں کے پاس لے جایا جائے جو علم اور تحقیق کے مالک ہیں:

وَاِذَا جَاءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ، وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ نساء - ۸۳

اور جب ان کے پاس کوئی خبر پہنچتی ہے، امن کی یا خوف کی تو اس کو پھیلا دیتے ہیں۔ اگر یہ اس کو رسول تک اور اپنے اصحاب امر تک پہنچاتے تو اس کو وہ لوگ جان لیتے جو تحقیق کرنے والے ہیں

یہ اختلاف پیدا ہونے کی شکل میں پہلا قدم ہے۔ لیکن اگر اصحاب علم کی مجلس بھی کسی ایک رائے پر نہ پہنچ سکے تو آخری تدبیر یہ بتائی گئی کہ رائے شماری کے ذریعہ کسی ایک فیصلہ پر پہنچ کر اس کے مطابق عمل کرو:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (شوریٰ — ۳۸) اور ان کا کام باہم مشورہ سے ہوتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ الٰہی قانون کا اندرونی اختلاف صرف ایک علمی مسئلہ ہے، وہ کوئی عملی مسئلہ نہیں۔ الٰہی قانون میں چونکہ بنیادی اصول طے شدہ ہیں، اس لئے علمی بحثیں اسی کے دائرہ میں ہوں گی۔ ان بحثوں سے نہ صرف یہ کہ کوئی حقیقی خرابی نہیں پیدا ہوتی بلکہ وہ کئی پہلوؤں سے فکری ارتقا میں مددگار ہیں۔ جہاں تک عملی ضرورت کے لئے کسی ایک تعبیر کی تعیین کا سوال ہے، وہ اجتماعی ادارہ یا پارلیمنٹ کے ذریعہ پوری ہو جاتی ہے۔

نئے پیدا شدہ حالات کے سلسلے میں الٰہی قانون کی رہنمائی کس طرح حاصل ہوگی، اس کا جواب اجتہاد ہے۔ اجتہاد کا مطلب سادہ طور پر یہ ہے کہ خدا نے جو بنیادی قانون (قرآن کی صورت میں) دیا ہے اور خدا کے رسول نے اس کی جو لسانی یا عملی تشریح کی ہے، اس کا گہرا علم حاصل کرنا اور اس کو سامنے رکھ کر پیش آمدہ مسائل میں الٰہی قانون کا انطباق تلاش کرنا۔ اس انطباق کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ قرآن و حدیث سے قانونی دفعات اخذ کر کے اس کو ہر زمانہ میں نافذ کیا جاتا رہے۔ بلکہ اس میں خود خارجی دنیا کے غیر متصادم قوانین کو الٰہی قانون کے ڈھانچہ میں قبول کرنا بھی شامل ہے۔ مثال کے طور پر خلیفہ ثانی عمر فاروق کے زمانہ میں عراق، مصر، شام فتح ہوئے تو آپ نے ان ملکوں میں سابقہ رومی، یونانی اور ایرانی قانونِ مال گزاری کو باقی رکھا۔ البتہ جو چیزیں ظلم نظر آئیں، ان میں اصلاح و ترمیم کر دی۔ اسی طرح درآمد و برآمد اور کسٹم کے لئے یہ قانون مقرر کیا کہ بیرونی ممالک میں مسلمان تاجروں کے ساتھ جو معاملہ کیا جاتا ہے وہی معاملہ وہاں کے تاجروں کے ساتھ اسلامی سلطنت میں کیا جائے۔

اجتہاد کا عمل اسلام کی ہزار سالہ تاریخ میں مسلسل جاری رہا ہے۔ مدینہ کی ابتدائی ریاست (۶۳۲ - ۶۲۲) ایک ایک سادہ عرب ریاست تھی جس میں پیغمبر اسلام نے الٰہی قانون کو نافذ کیا۔ ان کے بعد خلافت راشدہ کے زمانہ میں جب اطراف کے متمدن ممالک اسلامی ریاست میں شامل ہوئے تو بہت سے نئے نئے مسائل پیدا ہو گئے۔ اس وقت عمر فاروق (۶۴۴ - ۶۳۶) نے اجتہاد سے کام لے کر نئے حالات کے مطابق الٰہی نظام کو قائم کیا جس کی تفصیل مولانا شبلی نعمانی (۱۹۱۴ - ۱۸۵۷) کی کتاب الفاروق میں دیکھی جا سکتی ہے۔ پھر خلافت عباسیہ کے زمانے میں جب اسلامی سلطنت کو مزید وسعت ہوئی اور نظام زیادہ وسیع اور پیچیدہ ہو گیا تو امام ابو یوسف (۷۹۸ - ۷۸۲) سامنے آئے جو نہ صرف وقت کی سب سے بڑی سلطنت کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) تھے بلکہ موجودہ زمانہ کی اصطلاح میں وزارت قانون کا عہدہ بھی انھیں حاصل تھا۔ انھوں نے الٰہی قانون کو نئے وسیع تر حالات سے ہم آہنگ کر دیا جس کا ریکارڈ خود ان کی

لکھی ہوئی "کتاب الخراج" میں موجود ہے۔ اس کے بعد انیسویں صدی میں جب دنیا کے حالات میں دوبارہ انقلابی تبدیلیاں ہوئیں تو ترکی سلطان عبدالعزیز عثمانی (١٨٧٦ – ١٨٦٠) کے حکم سے ماہرین قانون، فقہاء اور عدلیہ کے اعلیٰ عہدہ داروں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے وہ مجموعہ قانون مرتب کیا جو مجلۃ الاحکام الشرعیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس مجلہ میں فقہ اسلامی کے اس حصہ کو، جس کو سول لا یا دیوانی قانون کہا جاتا ہے، دفعہ وار قوانین کی شکل میں مرتب کیا گیا ہے۔ یہ قانون ١٩١٨ تک خلافت عثمانیہ میں رائج رہا اور مصر، سوڈان، شام، حجاز، عراق اور شرق اردن کی عدالتیں اسی کے بموجب فیصلے کرتی رہیں۔ آج بھی اردن اور سعودی عرب میں یہی قانون کسی قدر ترمیم کے ساتھ رائج ہے۔ مجلۃ الاحکام الشرعیہ ابتداءً عربی اور ترکی زبانوں میں تیار کیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس کے ترجمے انگریزی اور دوسری زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

اجتہاد کا یہی طریقہ اختیار کر کے آج بھی الٰہی قانون کو وقت کی ضرورتوں کے مطابق بنایا جا سکتا ہے اور آئندہ بھی بنایا جاتا رہے گا۔

نوٹ: یہ مقالہ مذہب۔ اخلاق۔ قانون پر ہونے والے بین اقوامی سیمینار (نئی دہلی ١١ – ١٦ دسمبر ١٩٧٣)

International Seminar on Religion-Morality-Law.

کے موقع پر پڑھا گیا۔

مذہب انسانی تخلیق نہیں

مذہب کو بے اعتبار ثابت کرنے کے لئے موجودہ زمانہ میں جو کوششیں کی گئی ہیں، ان میں سے ایک کوشش وہ ہے جس کا تعلق علم الانسان (Anthropology) سے ہے۔ علم الانسان، انسانی معاشرہ کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس فن کے ماہرین نے یہ دعویٰ کیا کہ قدیم انسانی معاشروں کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب سماجی حالات کی پیداوار ہے۔ قدیم انسانی معاشروں میں جو مختلف حالات تھے، انھیں کے تحت مختلف مذہبی معتقدات وجود میں آتے رہے، بالفاظ دیگر، مذہب آسمان سے نازل شدہ کوئی ابدی صداقت نہیں، وہ انسان کے خود اپنے حالات کی پیداوار ہے جو کہ زمانہ کے ساتھ بنتے اور بدلتے رہتے ہیں۔ مگر بعد کو خود علم الانسان کی تحقیقات نے اس مفروضہ کو باطل ثابت کر دیا۔ یہاں اس سلسلے میں جدید تحقیقات کا ایک خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

یونانی مصنف ایومیرس Euhemerus نے کہا تھا کہ دیوتا ابتداءً زمین کے بڑے بڑے بادشاہ تھے پھر دھیرے دھیرے وہ خدا بن گئے اور ان کی پرستش کی جانے لگی۔ بعد کو اس عقیدہ کو بتانے کے لئے ایک اصطلاح اس کے نام پر وضع ہوئی جس کو ایومیرزم (Euhemerism) کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دیوتا کسی زمانہ میں انسانی ہیرو تھے۔ یونانی مصنف کا یہ نظریہ محض قیاس پر مبنی تھا۔ اس نے اس واقعہ پر زیادہ دھیان نہیں دیا کہ چین اور افریقہ اور دوسرے بعض مقامات پر جہاں آباء و اجداد کی پرستش کی مثالیں ملتی ہیں وہاں ان کی پرستش خدا کی پرستش سے الگ دوسرے طریقے سے کی جاتی ہے۔

قدیم زمانہ میں اس قسم کی باتیں محض تفنن پسند لوگ کیا کرتے تھے۔ تاہم ایک سو سال پہلے بہت بڑے پیمانہ پر اس سوال کے جواب کی تلاش شروع ہوئی کہ مذہب کی ابتدائی شکل کیا تھی۔ مگر تحقیق و تلاش کے لمبے سفر کے بعد آدمی دوبارہ وہیں پہنچ گیا جہاں وہ پہلے تھا۔ اب یہ ثابت ہوا کہ مذہبی معتقدات اتنے ہی پرانے ہیں جتنی کہ انسانی تاریخ پرانی ہے۔ ایک لاکھ برس پہلے نینڈرتھل انسان (Neanderthal Man) کو جب مرنے کے بعد دفن کیا گیا تو اس کے ساتھ قبر میں کھانا بھی رکھ دیا گیا تاکہ دوسری دنیا کے سفر میں اس کے لئے زاد راہ کا کام دے سکے۔ اس سے ثابت ہوا کہ انتہائی "ابتدائی انسان" بھی مرنے کے بعد زندگی کے تسلسل کا عقیدہ رکھتا تھا۔

"مذہب کیسے شروع ہوا" یہ سوال باقاعدہ طور پر صرف ایک سو سال پہلے وجود میں آیا۔ اس سے پہلے بائبل کی کتاب پیدائش اور قرآن کے زیر اثر عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ پہلا انسان (آدم) جب پیدا کیا گیا تو اسی وقت خدا کا الہام بھی اس کو مل گیا جس میں اس کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ سچا مذہب خدا کے نزدیک کیا ہے۔ مذاہب کے علماء عام طور پر یقین کرتے تھے کہ اس ابتدائی مذہب میں بعد کی نسلوں نے پہلی بار بگاڑ پیدا کیا اور اس طرح مذہب کی مختلف شکلیں بنتی چلی گئیں۔ ۱۹ویں صدی میں خاص طور پر نظریۂ ارتقاء نے، تعلیم یافتہ طبقہ کے اندر یہ ذہن پیدا کیا کہ مذہب کا ارتقائی مطالعہ کرے اور اس کی ابتدائی شکلیں دریافت کرے۔ یہ فرض کر لیا گیا کہ

ارتقا کا اصول ہر معاملہ میں اسی طرح جاری ہے جیسا کہ ڈارون نے حیاتیات میں دکھایا ہے۔

ابتدائی مذہب (Primitive Religion) اور ترقی یافتہ مذہب (Higher Religion) کی اصطلاحیں پیدا ہوئیں۔ اس تلاش نے بہت جلد انسان کو اس دریافت تک پہنچا دیا کہ مذہب کی ابتدا محض کچھ ذہنی خیالات (Illusions) سے شروع ہوئی۔ دھیرے دھیرے اصلاح ہوتے ہوتے وہ مذہب کی موجودہ ترقی یافتہ شکلوں تک پہنچی۔ اس طرح گویا علمی تجزیہ نے ثابت کر دیا کہ مذہب اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک نفسیاتی یا سماجی وہم کے سوا اور کچھ نہیں۔ مگر مذہب کے محققین کا یہ یقین دیر تک باقی نہ رہ سکا۔ تحقیق کے بعد کے نتائج نے اس کے ابتدائی نتائج کی تردید کر دی۔

ایڈورڈ بی۔ ٹیلر نے ۱۸۷۱ میں مذہب کے بارہ میں اپنے نظریہ کی وضاحت کے لئے روحیت مظاہر (Animism) کی اصطلاح وضع کی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ابتدائی انسان نے خواب، ہذیان اور موت کے واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کے اندر کوئی غیر فانی روح ہے۔ جب کوئی مرا ہوا شخص خواب میں نظر آیا تو سمجھ لیا گیا کہ انسان کی روح مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ انھیں میں سے کچھ روحیں دھیرے دھیرے دیوتا بھی بن گئیں۔ اسی زمانہ میں ہربرٹ اسپنسر نے یہ خیال پیش کیا کہ مرے ہوئے لوگ جو بھوتوں کی شکل میں دکھائی دیتے تھے، ان کو دیوتا سمجھ لیا گیا اور ان کی پوجا ہونے لگی۔ مگر ٹیلر اور اسپنسر وغیرہ کے نظریات کا جب بعد کے محققین نے تجزیہ کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ لوگ یہ ثابت کرنے میں ناکام رہے ہیں کہ دور تاریخ سے قبل کا انسان اسی ڈھنگ پر سوچتا تھا اور روحوں اور بھوتوں سے خدا تک پہنچنا محض قیاس پر مبنی تھا۔ اس نظریہ کے حامی اس سوال کا جواب بھی نہ دے سکے کہ اگر مردہ انسانوں کی روح سے خدا کا تصور نکلا تو یہ عالمی کیسے بن گیا جب کہ قدیم زمانہ میں کرہ ارض پر پھیلے ہوئے مختلف قبائل کے درمیان قطعاً کوئی مواصلاتی سلسلہ موجود نہ تھا۔ چنانچہ روحیت مظاہر (اینمزم) کا یہ نظریہ مذہب کی علمی توجیہہ کی حیثیت سے آج عملاً رد کر دیا گیا ہے۔

روحیت مظاہر کا ایک اور نظریہ آر۔ آر۔ میرٹ نے ۱۸۹۹ میں پیش کیا۔ اس نے کہا کہ انسان اولاً شخصی روح (Personal Soul) کو نہیں مانتا تھا بلکہ غیر شخصی طاقت (Impersonal Force) کا عقیدہ رکھتا تھا جس نے دنیا کو زندگی عطا کی ہے۔ اس نے اپنے اس نظریہ کو اینمیٹزم (Animatism) کا نام دیا۔ مگر بعد کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ محض ایک لفظی مغالطہ سے اس نے یہ نظریہ قائم کر لیا تھا۔ بحرالکاہل کے کنارے رہنے والے بعض قبائل جن کو میلانیسین (Melanesian) کہا جاتا ہے، ان کی زبان میں ایک لفظ منا (Mana) ہے۔ میرٹ نے سمجھا کہ قبیلہ کے لوگ اس کو روحانی طاقت کے معنی میں بولتے ہیں اور غیر شخصی طاقت کا یہی عقیدہ مذہب کی بنیاد ہے۔ اس نے مزید کہا کہ قدیم انسان "تھنکر" نہ تھا بلکہ ایکٹر تھا۔ اس طرح اس کا مذہب جادو سے بہت کم مختلف تھا۔ مگر بعد کی تحقیقات نے بتایا کہ یہ قبائل "منا" کا لفظ غیر شخصی طاقت کے معنی میں نہیں بولتے تھے جس نے کائنات کو زندگی عطا کی ہو۔ جیسا کہ میرٹ اور دوسرے لوگوں نے سمجھ لیا تھا، بلکہ امتیازی روحانی صفت کے معنی میں بولتے تھے۔

۱۸۹۰ میں جیمز فریزر نے کتابوں کا ایک سلسلہ

شائع کرنا شروع کیا جن میں سب سے زیادہ خاص سنہری شاخ The Golden Bough تھی۔ اس نے اپنی کتاب کا آغاز ایک "مقدس درخت" کی کہانی سے کیا جو قدیم اٹلی کے ایک مقام اربسیا پر ایک شخص نے لگا رکھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس درخت میں کوئی روحانی طاقت ہے اور اس کی مدد سے جادو کے کرشمے دکھائے جا سکتے ہیں۔ اس طرح کے واقعات کو لے کر فریزر نے ایک نظریہ وضع کیا، یہ تھا ــــ جادو پھر مذہب پھر سائنس:

(Magic to Religion to Science)

اس نے کہا کہ جادو کے طریقے میں جب پہلی بار ناکامی ہوئی تو انسان نے سمجھا کہ کوئی مافوق ہستی ہے جو اس کی مدد کر کے کامیابی کو یقینی بنا سکتی ہے۔ اس طرح جادو نے مذہب کی صورت اختیار کر لی۔ پھر انسان منطقی اور تجرباتی طریقہ تک پہنچا جس کو سائنس کہا جاتا ہے اپنی ارتقائی کشش کی وجہ سے یہ نظریہ شروع میں بہت مقبول ہوا۔ مگر بہت جلد معلوم ہوا کہ اس مفروضہ کے لئے کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے کہ جادو پہلے تھا اور مذہب اس کے بعد وجود میں آیا۔ کلچر کے ہر مرحلہ میں، تاریخی دستاویزوں کے مطابق، مذہب اور جادو دونوں ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ اس لئے یہ نظریہ کہ "جادو پھر مذہب پھر سائنس" غیر تاریخی (Unhistorical) ہے۔

۱۹۲۲ میں لوسین لیوی برو ہل نے ابتدائی ذہنی (Primitive Mentality) کا نظریہ پیش کیا۔ اس نے کہا کہ دور قدیم کے وحشی انسان ایک ابتدائی منطقی فکر (Pre-Logical Thinking) استعمال کرتے تھے جو کہ ہماری موجودہ فکر سے مختلف تھا۔ اس نے اس نظریہ پر تنقید کی کہ تمام انسان یکساں صلاحیت کے تھے۔ اس نے مثال دی کہ تمام "غیر ترقی یافتہ" قومیں موت کی توجیہہ فطری اسباب کے سوا دوسرے اسباب سے کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک آدمی سادہ طور پر محض بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے نہیں مرتا بلکہ کوئی پُراسرار طاقت ہے جو اس کو مارتی ہے۔ مگر پچھلے سو برس کے دوسرے شارحین مذہب کی طرح لیوی برو ہل بھی محض کرسی نشین مفکر تھا جس کو موجودہ زمانہ کے "ابتدائی انسان" کی خبر نہ تھی۔ حتی کہ وہ اس بات سے بھی بے خبر تھا کہ قدیم انسان کس طرح سوچتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی دور کا انسان بخوبی جانتا تھا کہ موت کس طرح طبیعی اسباب کے تحت ہوتی ہے، اگرچہ اس کے ساتھ وہ ایک روحانی توجیہہ کو بھی اس میں شامل کرتا تھا۔

ایک اور فرانسیسی مصنف امائیل درخیم نے ۱۹۱۲ میں مذہب پر اپنی کتاب شائع کی۔ اس نے زور دیا کہ مذہب ایک سماجی واقعہ (Social Fact) ہے نہ کہ انسان کی نفسیات کی پیداوار۔ مذہب وہم نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ہر دور میں ہر جگہ پایا گیا ہے۔ اس نے اخلاق اور قانون کے بڑے بڑے نظام قائم کئے ہیں۔ تاہم درخیم کے نزدیک مذہب خود سماج کی پرستش کا نام تھا، اگرچہ وہ پُراسرار علامتوں کے بھیس میں ظاہر ہوتا ہے۔ درخیم نے اپنا تصور آسٹریلیا کے بعض قدیم قبائل سے لیا۔ مگر اس انتخاب میں درخیم کی غلطی چھپی ہوئی تھی، کیونکہ وہ کبھی آسٹریلیا نہیں گیا۔ اس نے دوسروں کی فراہم کردہ ناقص معلومات پر اپنے نظریہ کی بنیاد رکھ دی اور پھر اس سے مستنبط کر لیا کہ تمام دنیا کے لوگ آسٹریلیا کے انھیں قدیم قبائل کے مطابق عمل کرتے تھے۔ یہ قدیم قبائل بعض پودوں اور جانوروں کو مقدس مانتے تھے اور ان کو کھانا حرام سمجھتے تھے۔ بعض مشابہتوں کی وجہ

سے ڈرخیم نے اس کو شمالی امریکہ کے انڈین قبائل کے ٹوٹم (Totem) کے مماثل سمجھا اور کہا کہ یہ پودے اور جانور قبیلہ کے سماجی آدرشوں کا نشان تھے جو بالآخر مذہب کی صورت اختیار کر گئے۔ مگر نہ صرف ٹوٹم کا یہ تصور بطور واقعہ ثابت نہیں ہوا، یہ بھی تاریخی طور پر ثابت نہ ہو سکا کہ ٹوٹم کا عقیدہ مذہب کے عقیدہ سے پہلے پایا جاتا تھا۔

اس سے بھی زیادہ کمزور توجیہہ وہ تھی جو آسٹریا کے نفسیات داں سگمنڈ فرائڈ نے ۱۹۱۳ میں پیش کی۔ اس نے اپنی کتاب Totem and Taboo میں بحرالکاہل کے علاقہ کے بعض قبائل کی کہانی لکھی کہ قدیم زمانہ میں ایک طاقتور باپ خاندان کی تمام عورتوں کو اپنی ذات کے لئے مخصوص کئے ہوئے تھا۔ بعد کو جب لڑکے جوان اور طاقتور ہوئے اور باپ بوڑھا ہو گیا تو "ایک دن" انھوں نے مل کر باپ کو قتل کر ڈالا اور عورتوں کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ مزید یہ کہ یہ قاتلین اپنے مقتول (باپ) کو کھا گئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ باپ کی روح ان کے اندر آ گئی، جس سے وہ ڈرتے تھے، جس کو برتر سمجھتے تھے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے کچھ جانور مقرر کئے جو باپ کی طاقت کا نشان تھے۔ اس کے بعد انھوں نے جشن منانے شروع کئے جس میں وہ طرح طرح سے اپنے ان عقائد کا اظہار کرتے۔ یہی چیز دھیرے دھیرے مذہب بن گئی۔

مگر اس عجیب وغریب نظریہ کے لئے بعد کے محققین کو کوئی تاریخی ثبوت نہ مل سکا۔ "باپ" کو مذکورہ بالا شکل میں کھا جانے کی مثال امکانی طور پر ساری تاریخ میں صرف آسٹریلیا میں اور وہ بھی ایک بار ملتی ہے اور وہاں بھی شہادتیں بہت غیر واضح ہیں۔ اس کی کوئی تاریخی، اثریاتی یا ادبی کوئی شہادت نہیں ہے کہ مذہب اسی طرح بیٹوں کی طرف سے باپ کو قتل کرنے کے واقعات سے شروع ہوا۔ یا یہ کہ مذہب ساری دنیا میں ایک ہی جگہ سے پھیلا ہے یا ہر ملک میں اسی خاص ڈھنگ سے شروع ہوا۔

مذہب کے آغاز کے نفسیاتی یا سماجی نظریات کے بالکل برعکس کچھ مصنفین نے دعویٰ کیا ہے کہ قدیم ترین مذہبی عقیدہ ایک برتر ہستی کا عقیدہ تھا۔ اینڈریو لینگ (Andrew Lang) نے ۱۸۹۸ میں مذہب کی تشکیل (The making of religion) اور ولہلم اشمٹ (Wilhelm Schmidt) نے خدا کے تصور کی ابتدا (*The Origin of the Idea of God*) شائع کی جس میں شدت سے یہ نظریہ پیش کیا گیا۔ لینگ نے طویل سفر کئے اور برس ہا برس تک تمام دنیا سے شہادتیں جمع کرتا رہا۔ اور بتایا کہ ایک خدا کا عقیدہ انتہائی ابتدائی انسانوں میں پایا جاتا رہا ہے اور اس کو پہلی مذہبی صورت کہا جا سکتا ہے۔ بعد کے مصنفین نے یہ اعتراف کرتے ہوئے کہ بہت سے ابتدائی قبائل میں ایک خدا کا تصور پایا جاتا ہے، یہ کہا کہ تاہم اسی کے ساتھ دوسرے دیوتاؤں کا تصور بھی ہے۔ اس طرح "ایک خدا" کا تصور گویا کئی خداؤں کو ماننے ہی کا ایک جزء ہے۔

مذہب کے آغاز کے بارے میں پچھلے مفروضوں کے غلط ثابت ہونے کی وجہ سے اب اس میدان میں کام کرنے والے علماء بہت زیادہ محتاط ہو گئے ہیں۔ اگر مذہب اتنا ہی پرانا ہے جتنا انسانی غور وفکر کی تاریخ پرانی ہے تو وہ اتنے بعید ماضی سے تعلق رکھتا ہے کہ بظاہر نا ممکن ہے کہ اس کے آغاز کی بابت کوئی مسلمہ شہادت مل سکے۔ رومانوی محقق (Mircea Eliada) کے الفاظ میں "موجودہ زمانہ کے مورخین مذہب جانتے ہیں کہ یہ ناممکن

ہے کہ مذہب کی ابتدائی شکل کو معلوم کیا جا سکے؟"

ماضی میں مذہب کے محققین کا یہ گمان تھا کہ اگر یہ ثابت کیا جا سکے کہ مذہب کا آغاز کچھ وہمی تصورات سے ہوا تو بعد کی ترقی یافتہ مذہبی شکلوں کو بھی بے بنیاد ثابت کیا جا سکتا ہے۔ مگر اب علمی طور پر اس کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ مذہب کو نفسیاتی فریب (Psychological Illusion) یا سماجی فریب (Sociological Illusion) ثابت کرنے کا خواب بے تعبیر ہو چکا ہے۔ اب یہ ذہن پیدا ہو رہا ہے کہ مذہب، جیسا کچھ آج ہے اس کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے نہ کہ اس کی ابتدائی صورتوں کو دریافت کرنے کی لاحاصل کوشش میں وقت ضائع کیا جائے۔

مذہبی ارتقاء کی ابتدائی شکل دریافت کرنے کا ذہن ڈارونزم کے بعد پیدا ہوا تھا۔ یہ فرض کر لیا گیا کہ وحشی قبائل جو آج بھی جنگلوں میں پائے جاتے ہیں، "وہ ابتدائی دور" کے انسان کی باقیات ہیں۔ اور مہذب سماج میں رہنے والے لوگ ترقی یافتہ دور کے انسان۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وحشی قبائل میں مذہب کا جو تصور پایا جائے وہ ابتدائی مذہب کو بتاتا ہے۔ اور مہذب سماج میں جو مذہب ہے وہ مذہب کی ترقی یافتہ شکل کو بتاتا ہے۔ مگر یہ مفروضہ بہت جلدی میں قائم کر لیا گیا جب کہ حقائق اس کی تردید کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر ایسے ابتدائی قبائل ہیں جن میں ایک برتر خدا کا عقیدہ موجود ہے، جب کہ بدھزم کو ماننے والے بہت سے ترقی یافتہ لوگ خدا کو نہیں مانتے۔

Geoffrey Parrinder
Essay in 'Man and his Gods'
(*Encyclopedia of the World's Religions*)
London 1974

ایک طرف علم الانسان نے اس مفروضہ کو مکمل طور پر غلط ثابت کر دیا ہے کہ مذہب انسانی نفسیات یا انسانی سماج کی پیداوار ہے۔ دوسری طرف سائنس، بالفاظ دیگر، علوم قطعیہ کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ ایسی معلومات سامنے آ رہی ہیں جو، اگرچہ براہ راست نہیں تاہم بالواسطہ طور پر، یہ ثابت کر رہی ہیں کہ انسان اور کائنات کی حقیقت کے بارے میں وہی نقطۂ نظر صحیح ہے جو مذہب ہمیں دیتا ہے۔

سائنس مذہب کے راستہ پر

اگرچہ ہر زمانہ میں خدا اور مذہب کو ماننے والوں کی اکثریت رہی ہے، خاص طور پر قدیم زمانہ میں تو اسی نقطۂ نظر کو عمومی غلبہ حاصل تھا۔ تاہم تقریباً ہر زمانہ میں یہ بحث جاری رہی ہے کہ اس عالم کا کوئی خدا ہے یا یہ یونہی اپنے آپ بن کر کھڑی ہوگئی ہے۔ فلسفہ میں اس بحث کو جو عنوان ملا وہ ایک کے لئے عینیت (Idealism) اور دوسرے کے لئے مادیت (Materialism) تھا۔

عینیت یا آئیڈیلزم، خالص فنی تفصیلات کو چھوڑ کر، اس نقطۂ نظر کی حامی رہی ہے کہ کائنات کی آخری حقیقت روحانی (Spiritual) ہے۔ یعنی جو حسی مناظر ہم دنیا میں دیکھتے ہیں، ان کا کوئی حقیقی وجود ہمارے دماغ کے باہر نہیں ہے۔ آئیڈیلزم، ایک معنی میں، اگرچہ افلاطون (۳۴۷ - ۴۲۷ ق م) کے زمانہ سے موجود رہی ہے۔ مگر موجودہ مفہوم میں وہ اٹھارویں صدی میں جارج برکلے (۱۷۵۳ - ۱۶۸۵) سے شروع ہوئی۔ اس سلسلے میں یہ سوال تھا کہ اگر اشیاء کا وجود صرف ذہنی ہے تو کیا وجہ ہے کہ یہ مادی چیزیں اس وقت بھی موجود رہتی ہیں جب کہ کوئی شخص ان کو دیکھ نہ رہا ہو۔ برکلے نے جواب دیا کہ ان اشیاء کا وجود خدا کے ذہن میں ہے۔ اس طرح اس نے آئیڈیلزم کو خدا کے وجود پر ایک نئی دلیل کی حیثیت دے دی۔

کانٹ (۱۸۰۴ - ۱۷۲۴) کے زمانہ میں اس فکر نے نئی وسعت اختیار کی اور ایک مستقل اسکول کی حیثیت سے قائم ہو گیا۔ جرمنی، انگلینڈ، فرانس، امریکہ، ہر جگہ اس کے بڑے بڑے وکیل پیدا ہوئے۔ تاہم پہلی جنگ عظیم (۱۸ - ۱۹۱۴) کے بعد اس فکر کو زوال کا سامنا کرنا پڑا۔

اس کے برعکس مادیت یا مٹیریلزم، اپنے مختلف مدارس فکر کے ساتھ، اس نقطۂ نظر کی حامی رہی ہے کہ اس عالم میں جو کچھ ہے، وہ سب کا سب مادی ہے اور مادہ کے باہر اس کا کوئی وجود نہیں۔ اس نظریہ کا دعویٰ ہے کہ یہاں صرف ایک حقیقت ہے اور وہ مادہ ہے۔ حتیٰ کہ خود انسان بھی، معروف عقیدہ کے مطابق دو چیزوں ــ جسم اور روح ــ کا مجموعہ نہیں۔ بلکہ بنیادی طور پر وہ صرف ایک ہی حقیقت رکھتا ہے اور وہ اس کا مادی جسم ہے۔

اس نقطۂ نظر کا پہلا سراغ ایپی کیورس (۲۷۰ - ۳۴۲ ق م) کے یہاں ملتا ہے جس کا خیال تھا کہ تمام چیزیں، اپنے آخری تجزیہ میں، چھوٹے چھوٹے ناقابل مشاہدہ اجزاء سے مل کر بنی ہیں۔ اس مادی نظریہ نے سترھویں صدی میں نئی قوت پکڑی جب ہولباخ کی کتاب سسٹم آف نیچر (۱۷۷۰) شائع ہوئی۔ اس کے وکیلوں کی فہرست، باہمی اختلاف کے باوجود، بہت لمبی ہے۔ بیسویں صدی میں مٹیریلزم کی دو بڑی شاخیں بن گئیں۔ ایک جدلیاتی مادیت (Dialectical Materialism) جو کہ کمیونسٹ دنیا کا سرکاری فلسفہ ہے۔ دوسرے وہ جس

کو طبیعیت (Physicalism) کہا جاتا ہے۔ میٹریلسٹ، ذہن کو بھی مانتے ہیں۔ مگر ان کے نزدیک ذہن محض مادی جسم کا ایک عمل (Function) ہے۔ مادی جسم سے الگ اس کا کوئی مستقل وجود نہیں۔

آئیڈیلزم اور میٹیریلزم کی یہ کش مکش اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسانی افکار کی تاریخ پرانی ہے۔ آئیڈیلزم، حقیقۃً مذہب کی دلیل نہ ہونے کے باوجود اس اعتبار سے مذہب کا فلسفیانہ سہارا رہی ہے کہ وہ آخری حقیقت کو غیر مادی ثابت کرتی ہے، جیسا کہ خود مذہب کا دعویٰ ہے۔ اس کے برعکس میٹریلزم نے انکار خدا کے لئے فکری زمین مہیا کرنے کا کام انجام دیا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک حسی دنیا سے باہر کسی چیز کا کوئی حقیقی وجود نہیں۔

پچھلی صدی میں جدید طبیعی سائنسوں کے وجود میں آنے کے بعد اس نقطۂ نظر نے مزید وسعت اختیار کی۔ اب سائنس کے تشریحی علم کے طور پر سائنٹفک میٹریلزم پیدا ہوا۔ علم طبقات الارض اور حیاتیاتی ارتقار کے نظریہ میں لوگوں نے اس کی زبردست تصدیق پائی۔ —— عام طور پر تسلیم کرلیا گیا کہ زندگی اور دماغ بے جان مادہ ہی کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ فزیالوجی کی ترقیات نے اس کو مزید مستحکم کیا۔ کیونکہ اس کے مطالعہ سے ثابت ہوا کہ ذہنی زندگی اور اس کی وسعت کا انحصار دماغ (Brain) کی جسامت پر ہے۔ اگرچہ اس کے بڑے بڑے وکیل مثلاً کارل واٹ (۱۸۹۵) اور لڈوگ بشنر (۱۸۹۹ — ۱۸۲۴) واضح طور پر ثابت نہ کرسکے کہ دماغ کی واقعی حقیقت کیا ہے، تاہم جدید طبیعی دریافتوں کے بعد عام طور پر سمجھ لیا گیا کہ سائنس نے میٹریلزم کے حق میں اپنا فیصلہ دے دیا ہے۔ سترھویں صدی سے شروع ہوکر انیسویں صدی کے آخر تک یہ سمجھا جاتا رہا کہ میٹریلزم جدید علمی دنیا کی فاتح ہے اور اب علمی اور منطقی طور پر مذہب کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

فکری طور پر اس میٹیریلزم کے دو رخ تھے۔ ایک یہ کہ کائنات سرتاسر ایک مادی وجود ہے، اس لئے یہاں کسی غیر مادی ہستی (مثلاً خدا) کو ماننے کا کوئی سوال نہیں۔ دوسرے یہ کہ یہاں جو واقعات ہو رہے ہیں، ان کے پیچھے معلوم مادی اسباب ہیں، اس لئے کسی رب اور قیوم کو ماننے کی کیا ضرورت۔ میٹریلزم کا پہلا پہلو خدا کے وجود کا انکار کر رہا ہے۔ دوسرا پہلو خدا کے وجود کو ناممکن تو نہیں بتاتا، البتہ اس کے مطابق ابتدائی پیدائش کے بعد اس نظام کائنات کو خدا کی کوئی ضرورت نہیں۔ والٹیر (۱۷۷۸ — ۱۶۹۴) کے الفاظ میں، اگر خدا ہے تو ہماری دنیا سے اس کو وہی تعلق ہے جو ایک گھڑی سے اس کے ابتدائی بنانے والے کو۔ تاہم ہیوم (۱۷۷۶ — ۱۷۱۱) نے اس "بے جان اور بے کار" خدا کو بھی ماننے سے انکار کردیا۔ کیوں کہ اس نے "گھڑیاں بنتے ہوئے دیکھی تھیں مگر دنیائیں بنتی ہوئی نہیں دیکھیں۔"

مگر انیسویں صدی کا خاتمہ درحقیقت ان تمام نظریات کا بھی خاتمہ تھا۔ موجودہ صدی میں خود سائنس نے جو حقائق دریافت کئے ہیں، انھوں نے ان سارے خیالات کی آخری طور پر تردید کردی ہے

نیوٹن کی میکانکس کا ایک مسئلہ یہ تھا کہ اگر کسی شے کی موجودہ حالت معلوم ہو تو اس کی سابقہ یا آئندہ حالت

قطعی طور پر متعین ہو جائے گی اور محض قوانین حرکت کی بنا پر علم ریاضی کی مدد سے ازل سے ابد تک اس کی تمام حالتوں کی پیش بندی کی جا سکے گی۔ میکانکس کا یہی مسئلہ تھا جو مادہ پرستوں کے لئے حکم فیصل کا کام دیتا تھا اور جس کی بنا پر وہ کسی خالق کے تصور کو غیر ضروری قرار دیتے تھے، کیوں کہ ان کے نزدیک کائنات کی ہر حالت، ہر لمحہ متعین ہے اور وہ اس کے مطابق خود بخود تشکیل پاتی چلی جا رہی ہے۔

فطرت کے باقاعدہ قانون کی حیثیت سے یہ اصول تعلیل (Law of Causation) مسلمہ طور پر سترھویں صدی میں مان لیا گیا، وہ عظیم صدی جو گلیلیو (۱۶۴۲-۱۵۶۴) اور نیوٹن (۱۷۲۷-۱۶۴۲) کی صدی کہی جاتی ہے اس سے پہلے دمدار ستارے (Comets) کے ظہور کو بادشاہت کا خاتمہ یا کسی بڑے آدمی کی موت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ مگر اس صدی میں تجاذب کے آفاقی قانون کے تحت اس کی توجیہہ معلوم کر لی گئی۔" اور" نیوٹن نے لکھا:

"اسی طرح قدرت کے دوسرے واقعات بھی میکانکی اصولوں (Mechanical Principles) کے تحت معلوم کر لئے جائیں گے۔"

اس طرح ایک زبردست تحریک اٹھ کھڑی ہوئی جس کا مقصد عالم مادی کو ایک مشین ثابت کرنا تھا۔ یہ تحریک انیسویں صدی کے نصف آخر میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ یہی وقت تھا جب ہیلم ہولٹز (۱۸۹۴-۱۸۲۱) نے کہا "تمام فطری علوم کا آخری مقصد بالآخر اپنے آپ کو میکانکس میں منتقل کر لینا ہے۔" لارڈ کلوین (۱۹۰۷-۱۸۲۴) نے اعتراف کیا کہ "جب تک میں کسی چیز کا میکانیکل ماڈل نہیں بنا لیتا، میں اس کو سمجھ نہیں سکتا۔" واٹرسٹن میکسویل (۱۸۷۹-۱۸۳۱) اور دوسروں نے نہایت کامیابی کے ساتھ گیس کی مشینی تشریح پیش کی۔ ان کے نزدیک گیس نہایت چھوٹے چھوٹے سخت ترین ذرات کا مجموعہ تھی جو اِدھر اُدھر تتلیوں کی طرح اڑتے پھرتے تھے۔ اسی طرح رقیق اشیاء، روشنی اور تجاذب وغیرہ کی تشریحات کی گئیں۔ اگرچہ انھیں اس کوشش میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ مگر ان کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن ساری کائنات مشینی توجیہہ (Mechanical Interpretation) کو قبول کرلے گی۔

"جب ساری کائنات اصول تعلیل میں بندھی ہوئی ہے تو انسان اس سے مستثنیٰ کیوں کر ہو سکتا ہے۔"

اس سوال نے انسان کو یہاں تک پہنچایا کہ خود انسان بھی ایک مشین بن گیا۔ اس سے سترھویں اور اٹھارویں صدی کے مشینی فلسفے (Mechanistic Philosophies) پیدا ہوئے۔ جب معلوم ہوا کہ زندہ اشیاء بھی ٹھیک اسی کیمیکل ایٹم سے بنی ہیں جس سے غیر جان دار اشیاء، تو اس یقین میں کوئی شبہ نہ رہا کہ دونوں کی نوعیت بالکل ایک ہے۔ زور شور کے ساتھ دعویٰ کر دیا گیا کہ زندگی خود بھی اپنے آخری تجزیہ میں محض ایک مشینی چیز ہے۔ نیوٹن یا باخ یا مائیکل انجلو کے دماغ کسی چھاپہ خانہ سے صرف پیچیدگی میں مختلف تھے، ورنہ دونوں میں کوئی حقیقی فرق نہ تھا۔

مگر انیسویں صدی کے آخر میں جب کہ فلاسفہ اس بحث میں مشغول تھے کہ کیا ایسی مشین بنائی جا سکتی ہے

جو نیوٹن یا باخ (۱۷۵۰-۱۶۸۵) کے خیالات کا اعادہ کر سکے، مظاہر فطرت خصوصاً روشنی (Radiation) اور تجاذب (Gravitation) کی خالص میکانکی توجیہہ کی ساری کوششیں ناکام ثابت ہو رہی تھیں، سائنسدان تیزی سے اس یقین تک پہنچ رہے تھے کہ کوئی مشین بلب کی روشنی یا سیب کے گرنے کا اعادہ نہیں کر سکتی۔ حتیٰ کہ انیسویں صدی کے آخر میں پروفیسر میکس پلانک (۱۹۴۷-۱۸۵۸) نے روشنی کے متعلق ایسے نظریات پیش کئے جو کسی بھی طرح میکانکی تشریح کو قبول کرنے والے نہ تھے۔ چنانچہ ابتداءً اس بنا پر اس پر تنقید کی گئی بلکہ اس کا مذاق اڑایا گیا۔ مگر بالآخر اس کے نظریات کو انٹم نظریہ Quantum Theory کی شکل میں جدید طبیعیات کے مسلمات میں شامل ہو گئے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے میکانیکل دور کا خاتمہ اور نئے عہد کا آغاز کیا۔

پلانک کا نظریہ ابتداءً صرف یہ معنی رکھتا تھا کہ قدرت جھٹکوں اور چھلانگوں (Jumps and Jerks) کی صورت میں سفر کرتی ہے، جیسے کہ گھڑی کی سوئی۔ مگر آئن سٹائن نے ۱۹۱۷ میں دکھایا کہ پلانک کا نظریہ محض عدم تعین (Discontinuity) سے زیادہ انقلابی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ اصول تعلیل کا خاتمہ کر رہا ہے جس کو نظام قدرت کا طبیعی رہنما سمجھ لیا گیا تھا۔ قدیم سائنس نے دعویٰ کیا تھا کہ قدرت صرف ایک ہی راستہ اختیار کر سکتی تھی جو علت و معلول کے تحت اول روز سے مقدر ہو گیا تھا۔ مگر اب اس پر یقین کرنا ناممکن ہو گیا۔

ایک مثال سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔ جیسا کہ معلوم ہے، ریڈیم اور دوسرے ریڈیائی عناصر (Radio-Active Elements) کے ایٹم ٹوٹتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح وقت گزرنے کے ساتھ یہ عناصر سیسہ اور ہیلیم میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ ایٹم کیوں ٹوٹتے ہیں، اس کے متعلق تعلیل کے سارے ممکن قیاسات غلط ثابت ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ قیاس کہ ممکن ہے یہ ایٹم الکٹران کی حرکت سے پیدا ہونے والی گرمی سے ٹوٹتے ہوں، صحیح نہیں۔ کسی مخصوص ایٹم پر خارج سے گرمی پہنچا کر اس کا تجربہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہ تجربہ کیا گیا اور ناکام رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ردر فورڈ (۱۹۳۷-۱۸۷۱) اور ساڈی (- ۱۸۷۷) نے ۱۹۰۳ میں خود بخود انتشار (Spontaneous Disintegration) کا مفروضہ قائم کیا جو خالص طبیعی نقطۂ نظر سے، توجیہہ نہیں بلکہ توجیہہ کی نفی ہے۔ موجودہ صدی کے آغاز میں جب میک لینان اور ردر فورڈ اور دوسروں نے کائناتی شعاعوں کی دریافت کی تو سمجھا گیا کہ یہی شعاعیں ہیں جو کہ ریڈیائی عناصر میں انتشار کا سبب ہیں۔ مگر تجربے سے یہ بھی غلط ثابت ہوا۔

عام روشنی کسی مادہ میں ایک انچ سے بھی کم داخل ہوتی ہے۔ اکسرے کی شعاعیں اس سے کہیں زیادہ نفوذ کی طاقت رکھتی ہیں۔ وہ ہمارے پورے جسم کو پار کر جاتی ہیں۔ تاہم ایک سکہ کے برابر دھات کا ٹکڑا ان کے نفوذ کو روک دیتا ہے۔ مگر کائناتی شعاعیں سیسہ اور دیگر سخت دھاتوں میں کئی گز تک اتر جاتی ہیں۔ اس لئے یہ قیاس بہت آسان تھا کہ ریڈیائی انتشار کا سبب یہی شعاعیں ہیں۔ مگر یہ قیاس نہایت سادہ تجربے سے غلط ثابت ہو گیا۔ ریڈیائی عنصر کے ایک ٹکڑے کو کوئلہ کی کان کے نیچے لے جایا گیا۔ اب وہ کائناتی شعاعوں

کے حملہ سے بالکل محفوظ تھا۔ مگر اس کے اندر جوہری انتشار اب بھی اسی طرح جاری تھا۔
کائنات کے ان ناقابل توجیہہ مظاہر کا ذکر کرتے ہوئے ایک سائنس داں لکھتا ہے:

The future may not be as unalterably determined by the past as we used to think, in part at least it may rest on the knees of whatever gods there be.
Sir James Jeans, *The Mysterious Universe*, Cambridge, The University Press, 1948, p. 22

کائنات کا مستقبل اس طرح غیر متغیر طور پر ماضی سے بندھا ہوا نہیں ہے جیسا کہ ہم نے سمجھ لیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ بہرحال خداؤں سے متعلق ہے، خواہ وہ خدا جو بھی ہوں۔

دوسری تحقیقات بھی اسی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ مثلاً پروفیسر ہیزن برگ نے ۱۹۲۷ میں بتایا کہ کوانٹم نظریہ ایک اور نتیجہ تک پہنچا رہا ہے جس کو انھوں نے نظریہ عدم تعین (Principle of Indeterminacy) سے تعبیر کیا۔ روایتی طور پر یہ سمجھا جا رہا تھا کہ قدرت ایک ہی متعین رخ پر نہایت صحت کے ساتھ سفر کرتی ہے۔ مگر ہیزن برگ نے دکھایا کہ قدرت سب سے زیادہ اسی مفروضہ کی تردید کر رہی ہے۔ چنانچہ آج طبیعی سائنس کا مسلمہ قانون ہے کہ نہ صرف کائنات بلکہ اس کے کسی حصہ یہاں تک کہ کسی ایک ذرہ کا مستقبل بھی قطعی طور پر متعین نہیں ہے۔ وہ کئی ممکن حالتوں میں سے کسی ایک حالت کو اختیار کر سکتا ہے۔ اس طرح قوانین قدرت تعینی (Deterministic) نہیں بلکہ اوسطی (Statistical) ہو جاتے ہیں۔

انیسویں صدی کی طبیعیات میں مادہ اور توانائی ایک دوسرے کے متضاد تصورات تھے۔ مادہ کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایک جسمانی شے ہے جو ایک محدود فضا کو بلاشرکت غیر گھیرتی ہے اور جس کا ایک مستقل وزن ہوتا ہے، جس کو کم و بیش یا معدوم نہیں کیا جا سکتا۔ جب کوئی مادی شے حرکت کرتی ہے تو وہ ایک ہی خط میں ایک ذرہ کی طرح حرکت کرتی ہے۔ آواز یا روشنی کی موجوں کی طرح پوری فضا میں نہیں پھیل جاتی۔ اس کے برخلاف روشنی اور توانائی کے متعلق یہ خیال تھا کہ نہ تو وہ کوئی جسمانی شے ہے اور نہ کسی محدود فضا کو بلاشرکت غیر گھیرتی ہے۔ اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ اور وہ ذرہ کی طرح حرکت نہیں کرتی بلکہ موجوں کی شکل میں آگے بڑھتی ہے۔ اس "دوئی" نے لوگوں کو موقع دیا کہ وہ یہ دعویٰ کر سکیں کہ کائنات کی اصل مادہ ہے۔ توانائی اس مادہ کا ایک اضافی مظہر ہے۔ اس کا علیحدہ کوئی وجود نہیں۔

جدید طبیعیات میں مادّہ اور توانائی کا یہ اختلاف ختم ہو گیا ہے اور تجربوں سے ثابت ہو گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی مختلف شکلیں ہیں۔ کبھی مادہ توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور کبھی توانائی مادہ میں۔ کسی مادی شے کی کمیت مستقل نہیں بلکہ وہ اس کی حرکت پر منحصر ہوتی ہے اور رفتار کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ ایک مادی شے کبھی ذرے کی طرح ایک خط میں حرکت کرتی ہے اور کبھی موجوں کی طرح پھیلتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ مادہ کے توانائی میں منتقل ہونے کا یہی اصل اصول ہے جس کی بنا پر ایٹم بم بنایا گیا ہے۔

۱۹۰۰ء میں پلانک نے کوانٹم کا انکشاف کیا اور بتایا کہ توانائی اور مادی نظام کی حالتوں میں تبدیلی مسلسل نہیں بلکہ ایک خاص قلیل ترین مقدار یعنی کوانٹم کے اضعاف (Multiples) کے متناسب ہوتی ہے۔ اس انکشاف کے بعد قدیم ترین زمانہ سے طبیعی کائنات میں تغیر و تبدل کے مسلسل اور تدریجی ہونے کا جو تصور چلا آرہا تھا، وہ ختم ہوگیا اور اس کی وجہ سے نیوٹن کی میکانکس میں ایک غیر معمولی انقلاب رونما ہوا۔

ایٹم کے متعلق ۱۸۹۵ء تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ مادہ کا سب سے چھوٹا ذرہ ہے جس کی مزید تقسیم نہیں کی جاسکتی۔ مگر اس کے بعد پتہ چلا کہ ہر ایٹم کے اندر بہت سے اور چھوٹے ذرے ہوتے ہیں جن کو الکٹرون، پروٹون نیوٹرون وغیرہ کہتے ہیں۔ کسی ایٹم کا مادہ مسلسل پھیلا ہوا نہیں ہوتا بلکہ یہ ذرے اس کے اندر نظام شمسی کی طرح ترتیب دیئے ہوئے ہوتے ہیں اور چند معینہ مداروں پر حرکت کرتے رہتے ہیں۔ ایٹم کے مختلف ذروں کے درمیان اسی طرح وسیع خلا ہوتا ہے جیسے سورج اور اس کے تابع سیاروں کے درمیان۔ ایٹم کے مرکزی حصہ میں، جس کو نیوکلیس کہا جاتا ہے۔ اس کا تقریباً تمام مادہ مرتکز ہوتا ہے اور اس کی شکست و ریخت سے ایٹم کی ماہیت بھی بدل جاتی ہے اور ایٹمی توانائی بھی حاصل ہوتی ہے۔ اب تو ایسے ذروں کی کثیر تعداد دریافت ہوئی ہے جو دو مادی ذروں یا ایک مادہ ذرہ اور اشعاع (Radiation) کے باہمی تعامل کے دوران ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

اس طرح جدید طبیعیات نے قدیم مادہ کی بنیاد ہی سرے سے منہدم کردی۔ علمی دنیا کا یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ جب نیوٹن کے نظریوں پر مبنی طبیعیات انیسویں صدی میں اپنے عروج پر پہنچ رہی تھی، عین اسی زمانہ میں پے در پے ایسے تجربات اور مشاہدے ہوئے کہ خود اس علم کی بنیادیں ہل گئیں اور علم طبیعیات میں ایک ہمہ گیر انقلاب رونما ہوا۔ مادہ اور توانائی، ذرہ اور موج، جوہر اور عنصر، زمان و مکان اور علت و معلول جیسے بنیادی تصورات ہی سرے سے بدل گئے اور خود قوانین قدرت کا بھی نیا مفہوم لیا جانے لگا۔ یہی وہ تغیرات ہیں جنھوں نے نیوٹن اور میکسویل کی طبیعیات کے بجائے اس جدید طبیعیات کی تشکیل کی جس کی بنیاد کوانٹم اور اضافیت کے نظریوں پر قائم ہے۔

برٹرینڈ رسل (۱۸۷۲ - ۱۹۷۰) کے الفاظ میں آج "ماہرین طبیعیات ہم کو یقین دلا رہے ہیں کہ مادہ جیسی کوئی شے سرے سے کوئی وجود نہیں رکھتی۔ دوسری طرف ماہرین نفسیات باور کرا رہے ہیں کہ ذہن جیسی کوئی چیز موجود نہیں" وہ مزید لکھتا ہے "آج کا جدید مادہ پرست بننے کی کوشش کرنے والا اپنے آپ کو عجیب کش مکش میں مبتلا پاتا ہے، کیونکہ جہاں ایک طرف ایک خاص حد تک ذہن کے افعال کو وہ کامیابی کے ساتھ جسم کے افعال کے ماتحت ثابت کرسکتا ہے، وہیں دوسری طرف اس واقعہ سے بھی مفر نہیں پاتا کہ جسم بجائے خود محض ذہن کا ایجاد کیا ہوا ایک سہولت پیدا کرنے والا تصور ہے"

"سیدھا سادا عام آدمی مادی چیزوں کے وجود کو یقینی ہی پاتا ہے۔ کیونکہ وہ حواس کے لئے بالکل عیاں اور بدیہی ہوتی ہیں۔ اور جو کچھ بھی مشکوک ہو، اتنا یقینی ہے کہ جس چیز کو تم ٹھوکر مارتے ہو، دھکیلتے ہو، دھکا دیتے

ہو یا جس سے ٹکراتے ہو، اس کو حقیقی اور واقعی ہی ہونا چاہیئے"۔ مگر حقیقت کیا ہے ؟

"عالمِ طبیعیات (Physicist) ثابت کرتا ہے کہ تم کبھی کسی چیز سے ہرگز نہیں ٹکراتے۔ حتیٰ کہ جب تمھارا سر کسی پتھر کی دیوار سے ٹکراتا ہے تو حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے تم اس کو مس تک نہیں کرتے۔ ہوتا صرف یہ ہے کہ کچھ الکٹران اور پروٹان جو تمھارے جسم کا حصہ ہوتے ہیں، ان میں اور اس چیز کے الکٹران اور پروٹان کے مابین جس کو تم سمجھتے ہو کہ چھو رہے ہو، صرف جذب ودفع کا عمل ہوتا ہے۔ لیکن اس عمل میں فی نفسہ دو جسموں میں کوئی لمس واتصال نہیں پایا جاتا۔ محض اتنا ہوتا ہے کہ تمھارے جسم کے الکٹران اور پروٹان سے جب دوسرے جسم کے الکٹران اور پروٹان قریب ہوتے ہیں تو ان میں ایک ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ یہی ہیجان واختلال تمھارے اعصاب کے واسطہ سے دماغ تک پہنچتا ہے۔ بس یہی دماغی تاثر لمس یا اتصال کا احساس پیدا کر دینے کے لئے ضروری ہوتا ہے"۔ Bertrand Russell, *The Will to Doubt.*

جدید سائنس کی رو سے یہ ثابت کرنا انتہائی مشکل ہو گیا ہے کہ ہمارے ذہن کے باہر کسی مادی شے کا کوئی وجود ہے۔ رسل کے الفاظ میں یہاں صرف "الکٹرانوں کا مجنونانہ رقص (Mad Dance) پایا جاتا ہے اور اس میں اور ہمارے لمس وغیرہ کے براہ راست محسوسات یا اشیاء میں کوئی مماثلت یا مشابہت بس برائے نام ہے"۔ بقول سر آرتھر اڈنگٹن موجودہ علمائے طبیعیات کا "یہ اعلان واعتراف کہ طبیعیات خارجی صداقت یا اس کے کسی جزوی حصہ کا کوئی علم عطا نہیں کر سکتی، اس نظریہ کی توثیق ہے کہ طبیعیاتی طریقوں سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ تمام تر ذہنی (Subjective) ہوتا ہے"۔

Arthur Eddington, *Philosophy of Physical Science.*

"جس طرح الفاظ، اشیاء کے نمائندہ نہیں ہوتے، محض ان کی علامات ہوتے ہیں، جیسے روٹی کا لفظ روٹی کی واقعی کسی شکل وصورت، رنگ وبو وغیرہ کی تصویر یا عکس ونقشہ نہیں ہوتا، اسی طرح ہم اشیائے خارجی کے متعلق جو تصورات رکھتے ہیں، وہ ان کی واقعی حقیقت ونوعیت کو نمایاں کرنے والی کوئی تصویر یا مثنیٰ مطلق نہیں ہوتے۔ بلکہ محض علامات (Symbols) ہوتے ہیں، جیسے ریاضی وہندسہ میں اے۔ بی۔ سی۔ وغیرہ حروف محض علامات ہوتے ہیں، ویسے ہی الکٹران، پروٹان وغیرہ علم طبیعیات کی اے۔ بی۔ سی۔ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ طبیعیات کا حاصل اب کچھ ریاضیاتی علامات (Symbols) اور ان کی مساواتیں (Equations) ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ علامات کس شے، یا حقیقت کی ہیں، اس کا پُراسرار جواب یہ ہے کہ طبیعیات کو اس سے مطلب نہیں اور نہ اس کے پاس ان علامات کی تہ میں جانے کا کوئی ذریعہ ہے"۔ "ان علامات کے پس پردہ جو چیز کام کر رہی ہے، اس کی حقیقت کے متعلق کوئی قطعی حکم لگانا تو درکنار، طبیعیات کو تو اس کے برعکس انتہائی قطعیت کے ساتھ اصرار ہے کہ اس کے طریقے (Methods) علامیت (Symbolism) کے پس پردہ کسی طرح جا ہی نہیں سکتے۔ Eddington, *Science and the Unseen World.*

اس طرح اڈنگٹن کے الفاظ میں طبیعیات کی خارجی دنیا (External World) محض سایوں کی دنیا (World of Shadows) بن کر رہ گئی ہے۔

پچھلی صدی تک مادہ سب سے بڑی حقیقت تھا۔ پروفیسر ٹائٹ (Tiet) نے "طبیعیاتی سائنس کی بعض ترقیوں پر لکچر دیتے ہوئے ۱۸۷۶ میں کہا تھا" مادہ کے حقیقی ہونے یا اس کے خارجی (Objective) وجود کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انسان کے پاس کوئی طاقت ایسی نہیں جو اس کو پیدا یا فنا کر سکے"

Quoted by James B. Conant.
The Modern Science and Modern Man, 1952, p. 55-57

مگر اب یہ مادہ ٹوٹ چکا ہے "ہیروشیما کی بربادی مادہ ہی کے فنا کا نتیجہ تھی" جدید ایٹمی سائنس کی بنیاد تمام تر اسی عقیدہ پر قائم ہے کہ مادہ کی آخری اکائی (ایٹم) کو توڑا جاسکتا ہے۔

سائنس کی دنیا میں اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بقول برٹرینڈ رسل "حقیقت یہ ہے کہ آج مشکل ہی سے تم کوئی ایسا رسالہ یا کتاب کھولو گے جس میں ہمارے عام سائنسی خیالات سے بحث ہو اور اس کو اس طرح کے بیانات سے دوچار نہ ہونا پڑے ——— "گلیلیو کے عہد کا خاتمہ"، "سائنس کی روح سے دشمنی کا خاتمہ" "میکانکی طبیعیات کی ناکامی"، "مذہب و سائنس میں مصالحت" وغیرہ

Bertrand Russell, *Modern Science and Philosophy*.

حتی کہ برنہارڈ باونک (Bernhard Bawink) نے جدید طبیعیات پر اپنی کتاب کا نام ہی رکھ دیا ہے "سائنس مذہب کے راستہ پر" *Modern Science on the Path of Religion*

اڈنگٹن کے الفاظ ہیں "کائنات کا وہ نظریہ جو کشش جیسے ان دیکھے قانون کی کارفرمائی کو مانتا ہے، کیا اس سے کچھ بھی زیادہ سائنسی ہو سکتا ہے جو وحشی انسان ہر اس چیز کو جس کو وہ کچھ پُر اسرار پاتے ہیں، ان دیکھے دیوی دیوتاؤں (Demons) کی طرف منسوب کر دیتے ہیں"

The Nature of Physical World, p. 39

سائنس کی ترقی کے بعد جب مشاہدہ کے جدید ذرائع انسان کے ہاتھ میں آئے تو انسان اس غلط فہمی میں پڑ گیا کہ وہ ہر چیز کو دیکھ سکتا ہے۔ حتی کہ اس نے دعوی کر دیا کہ وہ چیز جو ہمارے "خوردبینی" یا "دوربینی" مشاہدات میں نہ آئے، وہ سرے سے کوئی وجود ہی نہیں رکھتی۔

نیوٹن (۱۷۲۷-۱۶۴۲) اور آئن سٹائن (۱۹۵۴-۱۸۷۹) کے درمیان ایک پورا دور گزرا ہے جبکہ یہ تصور یقین کی آخری حد تک پہنچ چکا تھا۔ مگر آئن اسٹائن کے بعد جو دور شروع ہوا ہے، اس کے بعد سائنس نے اپنا یہ یقین کھو دیا ہے۔ اب یہ امر بجائے خود مشتبہ ہو گیا ہے کہ یہ عالم معروضی (Objective) ہے یا داخلی (Subjective)۔ یعنی کائنات کا کوئی خارجی وجود ہے جس کو دیکھا جاسکتا ہے یا وہ صرف ہمارے اندرونی احساسات کا کرشمہ ہے۔ جب کہ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ ذہن و احساس کا کوئی حقیقی وجود نہیں۔ اصل موجود چیز مادہ ہے اور ذہن و احساس صرف اس مادہ کی ضمنی پیداوار ہیں۔

۱۹ویں صدی کے آخر تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہر چیز کی آخری حقیقت ایٹم ہے اور ایٹم چھوٹے چھوٹے "ذرات" ہیں جن کو دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر ایٹم کے ٹوٹنے کے بعد ایٹم ناقابل مشاہدہ دنیا میں تحلیل ہو گیا ہے۔ اب سائنس میں عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ آخری حقیقت ایک ایسی لطیف شے ہے جو دیکھی نہیں جا سکتی۔ چنانچہ اب کائنات کی تشریح، کوئی ان الفاظ میں کرتا ہے کہ یہ امکانی لہریں (Waves of Probabilities) ہیں۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ یہ معروف معنوں میں کوئی شے نہیں بلکہ وقوعات (Events) کا ایک سلسلہ ہے۔ کوئی اس کو عالم خیال (Universe of Thought) کہتا ہے۔ کوئی اس کو بھوت (GHOST) سے تشبیہ دیتا ہے کوئی اس کو محض ایک تشکیل (Construction) بتاتا ہے۔ کوئی اس کو سایوں کی دنیا (World of Shadws) کہتا ہے۔

برٹرینڈرسل نے ان سارے افکار کو ایک طنزیہ جملہ میں اس طرح سمیٹا ہے:

Thus matter has become altogether too ghostly to be used as an adequate stick with which to beat the mind.

مادہ اس طرح ایسا بھوت بن گیا ہے جو ذہن کو ہانکنے کے لئے ایک ڈنڈا نہیں بن سکتا۔ وہ مزید لکھتا ہے:

"وہ چیز جس کو اب تک ہم اپنا جسم کہتے رہے ہیں، وہ درحقیقت بڑی دیدہ ریزی سے بنائی ہوئی ایک سائنسی تشکیل (Construction) ہے جس کی کوئی طبیعیاتی حقیقت نہیں پائی جاتی۔

خلاصہ

بر بنائے ڈیاونک کا یہ کہنا کہ "سائنس مذہب کے راستہ پر" جا رہی ہے، اوپر کی تفصیلات سے واضح ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم کا دریا دوبارہ وہیں پہنچ گیا جہاں سے اس نے مذہب کو چھوڑا تھا۔ یعنی یہ کہ کائنات اپنی آخری حقیقت کے اعتبار سے ایک غیر مادی واقعہ ہے، نہ کہ صرف بے جان اور بے شعور مادہ کا بے معنی رقص۔

مزید یہ کہ ہماری دنیا میں جو اسباب کام کر رہے ہیں وہ امکانی طور پر بہت سے مختلف اور متضاد نتائج تک پہنچ سکتے ہیں۔ مگر کائناتی نظام حیرت انگیز طور پر یہ کرتا ہے کہ واقعات کے رخ کو غیر موزوں نتائج کی طرف جانے سے روکتا ہے اور اس کو صرف موزوں نتائج کی طرف لے جاتا ہے۔ کائنات کی یہ غایاتی طبیعت (Teleological Nature) صریح طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ عالم واقعات کے پیچھے ایک باشعور ارادہ کام کر رہا ہے۔ اس صورت حال کی کوئی دوسری توجیہہ نہیں کی جا سکتی۔

کائناتی نظام میں عدم تعین، بالفاظ دیگر انتخابیت کا ہونا اور اس کا مسلسل برقرار رہنا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کو ہر آن خارج سے "رہنمائی" دی جا رہی ہے۔ سر آرتھر اڈنگٹن نے بجا طور پر نشان دہی کی ہے کہ جدید کوانٹم نظریہ کا یہ پہلو بے حد حیرت انگیز ہے۔ کیوں کہ یہ الہام کے مذہبی عقیدہ کی سائنسی تصدیق کر رہا ہے۔

(وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَاءٍ اَمْرَھَا)

دینی تعلیم

فہرست

دیباچہ

زیر نظر رسالہ دین کے ابتدائی تعارف کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ جلی قلم، سادہ انداز اور مختصر مضامین کے ساتھ یہ عمومی مطالعہ کے لئے بھی کارآمد ہے اور اسی کے ساتھ مدرسوں اور اسکولوں کے دینی نصاب میں بھی بخوبی طور پر شامل کیا جا سکتا ہے۔

عمومی تعارف یا ابتدائی نصاب میں استعمال کے لئے جو دینی رسالے اب تک ہمارے یہاں تیار کئے گئے ہیں وہ زیادہ تر عملی آداب (مینول) کے طرز پر لکھے گئے ہیں۔ ان کتابوں کو پڑھنے والا اسلام کے مسائل یا اس کے مقررہ طریقے تو جان لیتا ہے مگر وہ دین کی روح اور اسلام کی حقیقت سے آشنا نہیں ہوتا۔ ان کے علاوہ کچھ رسالے جو رسمی طریقے سے ہٹ کر لکھے گئے ہیں وہ بھی زیادہ تر اسلوب بیان کی حد تک اول الذکر سے مختلف ہیں۔ ایک اگر فقہی زبان میں ہے تو دوسرا ادبی زبان میں۔

اس میں شک نہیں کہ ان رسالوں کی اپنی افادیت ہے اور وہ بجائے خود ضروری بھی ہیں۔ تاہم ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس میں اسلام کی تعلیمات کو نفسیاتی انداز میں بیان کیا گیا ہو جو کہ قرآن کا عام انداز ہے۔ تاکہ آدمی جب اسلامی تعلیمات کو پڑھے تو اسی کے ساتھ وہ اس سے متاثر بھی ہوتا چلا جائے۔ اسلام کا تعارف حاصل کرنے کے ساتھ وہ اس کو اپنے قلب میں بھی اتار رہا ہو۔

اسلام کا تعارف صرف ایک قانون کا تعارف نہیں، وہ خالق کائنات کا تعارف ہے۔ اس لئے اسلام کو پڑھتے ہوئے آدمی کے اندر وہ ہلچل پیدا ہونی چاہئے جو کائنات کے خالق و مالک کی قربت سے ایک شخص کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ اسلام کے تعارف کے لئے ایک ایسی کتاب درکار ہے جس میں صرف عقیدۂ خدا کی تشریح نہ ہو بلکہ خدا کے ساتھ تعلق کی خوراک بھی اس کے اندر موجود ہو۔ اس میں صرف آخرت کا بیان نہ ہو بلکہ اسی کے ساتھ آخرت کا خوف بھی اس میں رچا بسا ہوا ہو۔ اس میں صرف عبادت کے احکام نہ ہوں بلکہ عبادت کی روح بھی اس کے اندر سموئی ہوئی ہو۔ اس میں بندوں کے حقوق کا صرف تذکرہ نہ ہو بلکہ ظلم کی کراہت اور انصاف کی چاشنی بھی اس کے ساتھ لپٹی ہوئی ہو۔

زیر نظر رسالہ اسی ضرورت کو پورا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے۔

وحید الدین ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۰

بسم اللہ

توحید

کہو وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ سورۂ اخلاص

اللہ کی پاکی بیان کرتی ہے ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ غالب اور حکیم ہے۔ اسی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین میں۔ وہ زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی اول ہے اور وہی آخر بھی۔ وہی ظاہر ہے اور وہی مخفی بھی۔ اور وہی ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ حدید

اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ ہے، سب کا تھامنے والا ہے۔ وہ نہ سوتا ہے اور نہ اس کو اونگھ لگتی ہے۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جو وہ چاہے۔ اس کی حکومت آسمانوں اور زمین سب پر چھائی ہوئی ہے۔ اور ان کی نگرانی اس پر ذرا بھی گراں نہیں۔ بس وہی ایک ذات سب سے برتر اور عظیم ہے۔

دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔ اب جو کوئی شیطان کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے تو اس نے مضبوط رسی پکڑ لی جو ٹوٹنے والی نہیں۔ اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا، وہ ان کو اندھیرے سے اجالے کی طرف لاتا ہے۔ اور جن لوگوں نے انکار کیا ان کے ساتھی شیطان ہیں، وہ ان کو اجالے سے اندھیرے کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہی لوگ آگ میں جانے والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ بقرہ

ساری تعریف اللہ کے لئے

ایک درخت ایک بے حد بامعنی واقعہ ہے مگر اس کو اپنی معنویت کا شعور نہیں۔ ایک پھول نفاست اور لطافت کا شاہکار ہے مگر کوئی پھول اپنی اس خصوصیت کو نہیں جانتا، ایک چڑیا بے حد حسین وجود ہے مگر کسی چڑیا کو اپنے حسن کا احساس نہیں۔ یہی حال دنیا کی تمام چیزوں کا ہے۔ دنیا کی ہر چیز حسین ترین آرٹ کا انتہائی کامل نمونہ ہے۔ مگر کسی چیز کو بھی اپنی اس حیثیت کا کوئی علم نہیں۔

پھر حسن ولطافت کی یہ نمائش گاہ کس کے لئے سجائی گئی ہے۔ یہ انسان کے لئے ہے۔ تمام معلوم کائنات میں انسان ہی واحد مخلوق ہے جو کسی چیز کے حسن کو دیکھتا ہے اور اس کی خوبیوں کو محسوس کر کے اس کی داد دے سکتا ہے۔ خدا نے دنیا کی صورت میں ایک حسین آرٹ بنایا اور انسان کو اس کی پرکھ دے کر اس کو زبان عطا کی تاکہ وہ خدا کی حسین تخلیق کو دیکھ کر جھوم اٹھے اور اپنی زبان سے اس کے خالق کو خراج تحسین پیش کرے۔ اسی کا نام حمد یا خدا کی تعریف ہے۔ حمد انسان کے اعلیٰ ترین جذبات کا وہ نذرانہ ہے جو خدا کے سامنے پیش ہونے کے لئے انسانی الفاظ میں ڈھل جاتے ہیں۔

حمد یہ ہے کہ ایک شخص دنیا میں خدا کی کاریگری کو دیکھے، وہ اس کے کمالات کو محسوس کر کے تڑپ اٹھے۔ اور پھر اس کی زبان سے بے تابانہ نکل پڑے کہ خدایا، ساری تعریف تیرے لئے ہے۔ تو پاک اور برتر ہے، خدایا تو مجھے اقرار کرنے والوں میں لکھ لے اور مجھ کو ان لوگوں میں نہ بنا جن کو تو اندھی حالت میں اٹھائے گا، کیونکہ انھوں نے تیرے حسن کو نہیں دیکھا، کیونکہ انھوں نے تیرے کمالات کا اعتراف نہیں کیا —— اللہ کو چلتے پھرتے اور اٹھتے بیٹھتے اس طرح یاد کرنے کا نام حمد ہے، خواہ کہنے والا اپنے کلمات کو عربی زبان میں کہے یا کسی دوسری زبان میں۔

خدا کے فرشتے

خدا نے اپنی قدرت خاص سے جو مخلوقات پیدا کی ہیں انھیں میں سے اس کی وہ نورانی مخلوق ہے جس کو فرشتہ کہا جاتا ہے۔ یہ فرشتے بے شمار تعداد میں ہیں۔ وہ کائنات کے ہر گوشے میں خدا کے احکام پہنچاتے رہتے ہیں اور خدا کے حکم کے تحت اس کی وسیع سلطنت کا انتظام کر رہے ہیں۔

فرشتے خدا کے حد درجہ وفادار کارندے ہیں جو اس کے حکم کے تحت موجودات کے پورے کارخانے کو چلاتے ہیں۔ زمین، سورج اور ستارے مسلسل حرکت کرتے ہیں مگر ان کی رفتار میں کروروں سال کے اندر بھی کوئی فرق نہیں آتا۔ پانی اور بارش کا ایک زبردست نظام ہے جو زمین کے اوپر اربوں سال سے جاری ہے۔ زمین کی سطح پر ہر آن طرح طرح کے درخت اور پودے نکل رہے ہیں۔ انسان اور دوسرے زندہ اجسام روزانہ پیدا ہوتے ہیں اور زمین پر اپنا رزق حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح کے ان گنت واقعات جو دنیا میں بہت بڑے پیمانہ پر ہو رہے ہیں وہ کیوں کر ہو رہے ہیں۔ خدا کے رسولوں نے بتایا کہ یہ سب کا سب ایک خدائی نظام ہے جس کو وہ اپنے غیبی فرشتوں کے ذریعہ چلا رہا ہے۔ خدا اور اس کی دوسری مخلوقات کے بیچ میں فرشتے ایک قسم کا درمیانی وسیلہ ہیں جن کے ذریعہ خدا اپنی تمام مخلوقات پر اپنے حکموں کا نفاذ کرتا ہے۔ اسی طرح یہ فرشتے خدا کے پیغمبروں تک خدا کا کلام پہنچاتے ہیں۔ وہ انسانوں کے اعمال کا ریکارڈ تیار کر رہے ہیں۔ ان کے ذریعہ خدا افراد اور قوموں پر اچھا انعام اتارتا ہے اور ان کو سزائیں دیتا ہے۔ فرشتے انسان کی روح قبض کرتے ہیں۔ انھیں فرشتوں کے ذریعہ وہ صور پھونکا جائے گا جو تمام عالم کو درہم برہم کر دے گا اور پھر کچھ لوگ جنت میں جگہ پائیں گے اور کچھ لوگ جہنم میں۔

اللہ کا رسول

کارخانہ سے ایک مشین بن کر نکلتی ہے تو اس کے ترکیب استعمال کا کاغذ بھی ساتھ رکھ دیا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ایک انجینئر آتا ہے جو عملاً کر کے دکھا دے کہ مشین کو کس طرح چلانا چاہئے۔ انسان بھی ایک زیادہ پیچیدہ قسم کی زندہ مشین ہے۔ وہ پیدا ہو کر اچانک اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے جہاں کسی پہاڑ کے اوپر یہ لکھا ہوا نہیں کہ یہ دنیا کیا ہے اور یہاں اس کو کس طرح رہنا چاہئے۔ دنیا کی تعلیم گاہوں میں ایسے انجینئر بھی تیار نہیں ہوتے جو زندگی کے راز کو جانیں اور انسان کے لئے عملی رہنما کا کام دے سکیں۔

اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے خدا نے اپنے رسول بھیجے۔ ہر رسول اپنے ساتھ اللہ کا کلام لایا۔ اس کلام کے ذریعہ خدا نے انسان کو بتایا کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے اور آدمی کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ اسی کے ساتھ رسول تمام انسانوں کے لئے خدا پرستانہ زندگی کا نمونہ تھے۔ آدمی کن جذبات و خیالات کے ساتھ جئے۔ وہ اپنے رب کو کس طرح یاد کرے۔ انسانوں کے درمیان رہتے ہوئے وہ لوگوں کے ساتھ کس طرح معاملہ کرے۔ اس کی دوستی اور دشمنی کی بنیاد کیا ہو۔ غرض ہر آدمی صبح سے شام تک جو زندگی گزارتا ہے اس کا عملی نمونہ اس کو رسول کی زندگی میں مل جاتا ہے۔

خدا نے اگرچہ ہر آدمی کی فطرت میں حق اور ناحق کی تمیز رکھ دی ہے۔ زمین و آسمان میں بے شمار نشانیاں پھیلا دی ہیں جن سے آدمی سبق حاصل کر سکے۔ تاہم اسی کے ساتھ خدا نے انسانوں کی زبان میں اپنی کتاب بھی اتاری اور انسانوں میں سے اپنے کچھ بندوں کو منتخب کر کے اپنا رسول مقرر کیا تاکہ ہدایت اور گمراہی کو سمجھنے میں آدمی کے لئے کوئی شبہ باقی نہ رہے۔

ختم نبوت

پیغمبر عربی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول تھے۔ آپ کے بعد اب کوئی رسول نہیں آئے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

اللہ کی طرف سے جتنے رسول آئے سب ایک ہی دین لے کر آئے۔ ان کے بولنے کی زبانیں الگ الگ تھیں مگر دین سب کا ایک تھا۔ مگر پچھلے نبیوں کی تعلیمات کو ان کے ماننے والے ان کی اصلی حالت میں محفوظ نہ رکھ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ بار بار پیغمبر آتے رہے تاکہ خدا کے دین کو از سر نو تازہ اور زندہ کر دیں۔ مگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسا انقلاب آیا جس نے دین کو اس کی اصلی حالت میں محفوظ کر دیا۔ اس لئے اب نیا پیغمبر آنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خدا کا دین اس طرح قائم ہوگیا جو آپ کے بعد ہر دور میں پیغمبر کا بدل بن سکے۔ خدا کی کتاب ویسی ہی کی ویسی محفوظ ہے جیسی کہ وہ آسمان سے اتری تھی۔ حتیٰ کہ اب پریس کے دور میں چھپ کر وہ دنیا بھر میں ہر آدمی تک پہنچ گئی۔ رسول کی زندگی ایک کامل نمونہ کی حیثیت سے مستند کتابی مجموعوں میں مرتب ہوگئی۔ رسول کے بعد ایک ایسی مستقل امت وجود میں آگئی جو نسل در نسل قرآن وسنت کے علم کو لوگوں تک پہنچاتی رہے اور اسی کے ساتھ دین کے طریقوں (مثلاً نماز کیسے پڑھی جائے) کو اس طرح عملی طور پر بتاتی رہے کہ کسی کو اس کی تعمیل میں دشواری نہ رہے۔ ہر دور کا انسان دین کو ٹھیک اسی طرح پاتا رہے جس طرح رسول کے زمانہ کے انسانوں کو وہ رسول کے ذریعہ ملا تھا۔

جب دین محفوظ ہوگیا اور لوگوں کے درمیان ہمیشہ کے لئے اس کا تسلسل قائم ہوگیا تو اب نیا نبی آنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اب خدا کی کتاب اور رسول کی سنت کے ذریعہ وہ کام ہوتا رہے گا جو پہلے رسول کے ذریعہ انجام پاتا تھا۔ پہلے یہ کام براہ راست رسولوں کے ذریعہ ہوتا تھا، اب وہ رسول کی امت کے ذریعہ ہوگا۔

قیامت

ہر روز رات کے بعد دن آتا ہے۔ جو چیزیں رات کے وقت اندھیرے میں چھپی ہوئی تھیں وہ دن کے اجالے میں ایک ایک کر کے سامنے آجاتی ہیں۔ اسی طرح موجودہ دنیا کے بعد آخرت کی دنیا آئے گی۔ اس وقت تمام حقیقتیں دن کی روشنی کی طرح کھل جائیں گی۔ آج آدمی اپنی برائی کو مصنوعی اعمال میں چھپا لیتا ہے۔ کسی کو خوبصورت الفاظ مل گئے ہیں جو اس کی باطل پرستی کو حق پرستی کے روپ میں پیش کر رہے ہیں۔ کسی کے لئے اس کی ظاہری رونقیں اس کی باطنی گندگی کا پردہ بن گئی ہے۔ ہر آدمی کی حقیقت "رات" کی تاریکی میں ڈھکی ہوئی ہے۔ مگر قیامت اس طرح کے تمام پردوں کو پھاڑ دے گی، وہ دن کی روشنی کی طرح ہر چیز کو اس کی اصلی حالت میں دکھا دے گی۔

وہ وقت بھی کیسا عجیب ہوگا جب حقیقتوں سے پردہ اٹھایا جائے گا۔ اس دن ہر آدمی وہاں کھڑا ہوا دکھائی دے گا جہاں وہ حقیقۃً تھا نہ کہ اس مصنوعی مقام پر جہاں وہ آج اپنے کو کھڑا کئے ہوئے ہے۔

کتنے لوگ جو آج اقتدار کے مالک بنے ہوئے ہیں اس دن ان کے پاس عجز اور بے چارگی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ کتنے لوگ جو آج انصاف کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں اس دن وہ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے نظر آئیں گے۔ کتنے لوگ جو آج اہم شخصیت کا درجہ پائے ہوئے ہیں اس دن وہ کیڑے مکوڑوں سے زیادہ حقیر دکھائی دیں گے۔ کتنے لوگ جن کے پاس آج ہر بات کا شاندار جواب ہے اس دن وہ ایسے بے جواب ہو چکے ہوں گے جیسے کہ ان کے پاس الفاظ ہی نہیں۔

جب موت آئے گی

اگر آپ اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں تو ساری دنیا آپ کے لئے تاریک ہو جائے گی۔ سورج کی روشنی اور آسمان کی بلندی سے لے کر درختوں کی سرسبزیاں اور شہروں کی رونقیں تک سب اندھیرے میں چھپ جائیں گی۔ ساری چیزیں موجود ہوتے ہوئے بھی آپ کے لئے غیر موجود بن جائیں گی۔

ایسی ہی کچھ مثال آخرت کی ہے۔ آخرت ایک مکمل حقیقت ہے۔ بلکہ آخرت سب سے بڑی حقیقت ہے۔ مگر وہ ہم کو نظر نہیں آتی۔ کیونکہ وہ ہمارے لئے غیب میں ہے۔ اس کی طرف سے ہماری آنکھیں بند ہیں۔ موت کا دن وہ دن ہے جب کہ غیب کا پردہ ہماری آنکھوں سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ موت کے فوراً بعد آدمی آخرت کی دنیا کو اسی طرح دیکھنے لگتا ہے جس طرح آج ایک بند آنکھ والا آنکھ کھولنے کے بعد موجودہ دنیا کو دیکھتا ہے۔

ایک شخص کی آنکھ پر پٹی باندھ کر اس کو زندہ شیر کے سامنے کھڑا کر دیا جائے۔ وہ بالکل بے خبر ہو کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ اسی حالت میں اچانک اس کی آنکھ کھول دی جائے۔ اس وقت زندہ اور کھلے ہوئے شیر کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کا جو حال ہوگا اس سے کہیں زیادہ بدحواسی آدمی کے اوپر اس وقت طاری ہوگی جب کہ وہ موت کے بعد اچانک آخرت کو دیکھے گا۔

وہ شخص جو دنیا میں اپنے آپ کو بہت سے سہاروں کے درمیان پاتا تھا، اچانک دیکھے گا کہ وہ بالکل بے سہارا ہو چکا ہے۔ اس کے وہ دوست اس سے چھوٹ چکے ہوں گے جن کے درمیان وہ تفریح کرتا تھا۔ اس کے وہ بیوی بچے اس کے لئے غیر بن چکے ہوں گے جن کو وہ اپنا سمجھ کر اپنا سب کچھ ان کے اوپر قربان کر رہا تھا۔ اس کے وہ مادی اسباب جن پر وہ اعتماد کئے ہوئے تھا، مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ بے حقیقت ثابت ہوں گے۔ وہ باتیں جن کو وہ بے وزن سمجھ کر نظر انداز کر دیتا تھا وہ لوہے اور پتھر سے بھی زیادہ سخت بن کر اس کے سامنے کھڑی ہوں گی۔

دوسری دنیا

خدا کی موجودہ دنیا حد درجہ مکمل دنیا ہے مگر اس کا نظام امتحان کے مقصد کے تحت بنایا گیا ہے، خدا کے منصوبہ کے تحت مستقل اور معیاری دنیا وہ ہے جو جزا و سزا کے تقاضوں کو پورا کرے۔ موجودہ دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس لئے امتحان کی مدت پوری ہونے کے بعد خدا موجودہ دنیا کو توڑ دے گا اور دوسری زیادہ کامل دنیا بنائے گا جہاں برے لوگ اور اچھے لوگ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں اور ہر ایک اپنے عمل کا ٹھیک ٹھیک بدلہ پا سکے۔

موجودہ دنیا میں ایک عجیب و غریب تضاد نظر آتا ہے۔ یہاں چڑیاں خدا کی حمد کے نغمے گاتی ہیں مگر انسان انسان کا قصیدہ پڑھتا ہے۔ یہاں ستارے اور سیارے ایک دوسرے سے ٹکرائے بغیر اپنا سفر کرتے ہیں، مگر انسان جان بوجھ کر ایسا راستہ اختیار کرتا ہے جس میں اس کا دوسروں سے ٹکراؤ ہو۔ یہاں کوئی درخت دوسرے درخت کی کاٹ نہیں کرتا۔ مگر اسی دنیا میں ایک انسان دوسرے انسان کی تخریب کے منصوبے بناتا ہے یہاں لمبا کھڑا ہوا درخت اپنا سایہ زمین پر بچھا کر اپنے عجز کا اقرار کرتا ہے مگر انسان کو اگر کوئی بلندی حاصل ہو جائے تو وہ فوراً اکڑنے لگتا ہے۔

انسان کا یہ رویہ خدا کی اس پسند کے سراسر خلاف ہے جو اس نے اپنی پوری کائنات میں نافذ کر رکھا ہے۔ قیامت اسی لئے آئے گی کہ وہ اس تضاد کو ختم کر دے۔ وہ خدا کے سوا ہر بڑائی کی نفی کر دے، وہ خدا کی مرضی کے سوا ہر مرضی کو باطل ثابت کر دے۔

امتحان کی مدت پوری ہونے کے بعد خدا موجودہ دنیا کو توڑ کر ایک اور دنیا بنائے گا۔ وہاں اچھے اور برے ایک دوسرے سے الگ کر دئے جائیں گے۔ اس کے بعد اچھے لوگ جنت میں ہوں گے اور برے لوگ جہنم میں۔

جیسا بونا ویسا کاٹنا

کاٹنے کے دن وہی آدمی کھیتی کاٹتا ہے جس نے کاٹنے کا دن آنے سے پہلے کھیتی کی ہو اور وہی چیز کاٹتا ہے جو اس نے اپنے کھیت میں بوئی تھی۔ یہی معاملہ آخرت کا بھی ہے۔ آخرت میں ہر شخص کو وہی فصل ملے گی جو اس نے موت سے پہلے دنیا میں بوئی تھی۔ جو شخص حسد و عداوت اور ظلم و خود پرستی کے طریقوں پر چلتا رہا وہ گویا اپنی زمین میں کانٹے دار درخت کا بیج بو رہا ہے ایسا شخص آخرت میں کانٹے دار پھل پائے گا۔ اس کے برعکس جو شخص انصاف اور خیر خواہی اور اعترافِ حق کا طریقہ اختیار کرے وہ گویا پھل دار درخت کا بیج بو رہا ہے۔ ایسا شخص آخرت میں خوشبودار پھلوں کا وارث بنے گا۔

آدمی دنیا میں سرکشی دکھاتا ہے پھر بھی یہ خیال کرتا ہے کہ آخرت میں وہ خدا کے فرماں بردار بندوں کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ وہ دنیا میں تخریبی سرگرمیوں میں مشغول رہتا ہے پھر بھی یہ سمجھتا ہے کہ وہ آخرت کے تعمیری نتائج میں اپنا حصہ پائے گا۔ وہ دنیا میں الفاظ کے اوپر اپنی زندگی کھڑی کرتا ہے پھر بھی یہ یقین رکھتا ہے کہ آخرت میں حقائق کی صورت میں اس کا انجام اس کی طرف لوٹے گا۔ اس کے پاس خدا کا پیغام آتا ہے مگر وہ اس کو نہیں مانتا پھر بھی وہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا کے مقبول بندوں میں شامل کیا جائے گا۔

خدا انسان کو جنت کی طرف بلا رہا ہے جو ابدی آرام اور خوشیوں کی جگہ ہے۔ مگر وہ چند دن کی جھوٹی لذتوں میں کھویا ہوا ہے، وہ خدا کی پکار کی طرف نہیں دوڑتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں حاصل کر رہا ہوں حالانکہ وہ صرف کھو رہا ہے۔ دنیا میں مکان بنا کر وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی زندگی کی تعمیر کر رہا ہوں حالاں کہ وہ صرف ریت کی دیواریں کھڑی کر رہا ہے جو صرف اس لئے بنتی ہیں کہ بننے کے بعد ہمیشہ کے لئے گر پڑیں۔

جنت کس کے لئے

جنت کا داخلہ صرف اس کے لئے لکھا گیا ہے جس نے ہر دوسری عظمت کی نفی کر کے ایک خدا کی عظمت کو پایا ہو، جس نے اپنے سینہ کو ہر دوسری محبت سے خالی کر کے اس میں صرف خدا کی محبت کو جگہ دی ہو۔ جب کسی سے کوئی اختلافی معاملہ پڑتا ہے اور آدمی انصاف کو چھوڑ کر بے انصافی کا رویہ اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے لئے جنت میں بسائے جانے کا استحقاق کھو دیتا ہے۔ کیونکہ جنت انصاف پسندوں کی بستی ہے نہ کہ بے انصافوں کی سرائے۔ جب کسی سے شکایت پیدا ہونے کے موقع پر آدمی کبر اور سرکشی کا مظاہرہ کرتا ہے تو وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ جنت کی دنیا میں بسائے جانے کے قابل نہیں۔ کیونکہ جنت متواضعین کے لئے ہے نہ کہ متکبرین کے لئے۔ جب کسی سے ان بن ہونے پر آدمی اس کی بربادی کے منصوبے بناتا ہے تو وہ اپنے آپ کو جنت کا نااہل ثابت کر دیتا ہے۔ کیونکہ جنت ان اونچے انسانوں کی بستی ہے جو ایک دوسرے کی عزت کرنے والے ہوں نہ کہ ایک دوسرے کی کاٹ کرنے والے۔ کسی غیر خدا پر تنقید سن کر جب آدمی کے عقیدت و محبت کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں تو وہ ثابت کرتا ہے کہ وہ جنت کی دنیا میں بسائے جانے کے قابل نہیں۔ کیونکہ جنت تو ان پاکیزہ روحوں کی کالونی ہے جو خدا کی محبت و عقیدت میں جیتے ہوں نہ کہ انسانوں میں سے کسی انسان کی عقیدت و محبت میں۔ جب آدمی اپنی تعریف سن کر لذت لیتا ہے اور اپنی عزت و شہرت کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے تو وہ جنت کی شہریت کو کھو دیتا ہے کیونکہ جنت ان بےنفس لوگوں کے لئے ہے جو صرف اللہ کی تعریف پر خوش ہوں اور اللہ کی کبریائی کو دیکھ کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہوں۔ جب آدمی کے سامنے سچائی آئے اور وہ اس کے ساتھ اندھے پن کا معاملہ کرے تو وہ جنت میں بسائے جانے کا استحقاق کھو دیتا ہے۔ کیونکہ جنت تو ان لوگوں کا مقام ہے جو اپنے آپ کو حق کے ساتھ اس طرح شامل کر لیں کہ حق کو ہمیشہ حق کی صورت میں دیکھیں اور باطل کو ہمیشہ باطل کی صورت میں۔

صراط مستقیم

انسان کے لئے کامیابی کی منزل تک پہنچنے کا سیدھا راستہ صرف ایک ہے اور وہ خدا کی طرف رخ کرنا ہے۔ یعنی اپنی تمام توجہات اور سرگرمیوں کو خدا کی طرف موڑ دینا۔ خدا کو اپنا سب کچھ بنا کر اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا، یہی صراط مستقیم ہے۔ اس کے برعکس ہر وہ راستہ منزل سے بھٹکا ہوا راستہ ہے جس میں خدا کی طرف رخ نہ پایا جاتا ہو۔

اپنے نفس کی مانگیں پوری کرنے میں لگا رہنا۔ کسی زندہ یا مردہ شخص کی بڑائی میں گم رہنا، مثبت مقصد کے بجائے منفی چیزوں کی طرف دوڑنا۔ حسد اور بغض اور انتقام اور انانیت کے جذبات کے تحت عمل کرنا۔ قوم یا وطن یا جماعت کو سب سے اونچا مقام دے کر اس کے لئے اپنے کو وقف کر دینا۔ یہ سب ٹیڑھی راہیں ہیں جو اصل راستہ کے دائیں بائیں سے نکلتی ہیں۔ وہ اصل منزل کے ادھر اُدھر سے گزر جاتی ہیں اور اپنے مسافر کو منزل تک نہیں پہنچاتیں۔

جب بھی ایسا ہو کہ آدمی کے دل میں خدا کے سوا کسی اور کی یاد سما جائے، وہ خدا کے سوا کسی اور کو پکارے اور خدا کے سوا کسی اور کو اپنے جذبات کا مرکز بنائے، اس کی سرگرمیوں کا رخ خدا کے سوا کسی اور چیز کی طرف ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صراط مستقیم سے بھٹک گیا، اس نے اپنے "نقطہ" سے خدا کے "نقطہ" کی طرف سفر نہیں کیا۔

ریل گاڑی کی ایک پٹری ہوتی ہے۔ گاڑی اگر پٹری پر چلے تو وہ کامیابی کے ساتھ اپنی منزل تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اگر اس کے پہیے پٹری کے دائیں بائیں اتر جائیں تو اس کا راستہ کھوٹا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی منزل پر پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ ایسا ہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان اگر سیدھا اپنے خدا کی طرف سفر کرے تو اس کا سفر صحیح طور پر جاری رہتا ہے اور بالآخر اس کو منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ اگر اس کے سفر کا رخ خدا کی طرف نہ رہے تو وہ بھٹک جاتا ہے اور بربادی کے سوا کسی انجام تک نہیں پہنچتا۔

اسلام زندگی کا ضمیمہ نہیں

پانی کے گلاس میں پتھر کا ایک ٹکڑا ڈالیں تو وہ اس کے اندر اتر کر ایک کنارے بیٹھ جائے گا۔ وہ پانی میں ہوگا مگر پانی سے الگ ہوگا۔ پتھر پتھر رہے گا اور پانی پانی۔ مگر اسی گلاس میں جب آپ رنگ ڈالتے ہیں تو رنگ اور پانی دونوں مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اب پانی رنگ سے الگ نہیں ہوتا بلکہ دونوں اس طرح مل جاتے ہیں کہ باہر سے دیکھنے والا ان میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتا۔

اسلام کا معاملہ اور آدمی کا معاملہ پتھر اور پانی جیسا معاملہ نہیں ہے بلکہ وہ رنگ اور پانی جیسا معاملہ ہے۔ مسلمان کی زندگی میں اسلام ایک علیحدہ ضمیمہ کی طرح نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کی پوری ہستی میں سما جاتا ہے۔ وہ اس کے جذبات میں شامل ہو کر اس کے دل کی دھڑکن بن جاتا ہے۔ وہ اس کی سوچ میں اس طرح داخل ہوتا ہے کہ اس کا ذہن اسی کے مطابق ڈھل جاتا ہے۔ اسلام اس کی آنکھ بن جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے۔ وہ اس کی زبان بن جاتا ہے جس سے وہ بولتا ہے۔ وہ اس کا ہاتھ پاؤں بن جاتا ہے جس کے تحت وہ دنیا میں اپنی تمام کارروائیاں کرتا ہے۔ اسلام وہی ہے جو آدمی کے اوپر اس طرح چھا جائے کہ اس کی کوئی چیز اس سے باہر نہ رہے۔ اس کے ہر بول میں اسلام کی جھلک ہو۔ اس کا ہر عمل اسلام کے رنگ میں رنگا ہوا ہو۔

جو اسلام پانی میں پتھر کی طرح رہے وہ اسلام نہیں ہے۔ اسلام وہی ہے جو پانی کے اندر رنگ کی طرح گھل جائے۔ آدمی کو کسی سے محبت ہو تو اس کا پورا وجود اس سے محبت کرتا ہے۔ اس کو کسی سے نفرت ہو تو اس کا پورا وجود اس سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص اسلام کو حقیقی معنوں میں اپناتا ہے تو وہ اس کے پورے وجود کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ وہ کہیں بھی اسلام سے الگ نہیں ہوتا اور نہ اسلام اس سے۔

اللہ کی عبادت

عبادت اپنے ظاہر کے اعتبار سے کچھ خاص آداب بجالانے کا نام ہے اور حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ کسی چیز کو اپنے جذباتِ شوق اور جذباتِ احتیاج کا مرکز بنالیا جائے۔ اس اعتبار سے ہر آدمی کسی نہ کسی کی عبادت کر رہا ہے۔ ہر آدمی کی کوئی سب سے بڑی چاہت ہوتی ہے جس کو پانے کے لئے وہ اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے۔ ہر آدمی کہیں اپنے کو محتاج محسوس کرتا ہے اور اس محتاجی کی تلافی کے لئے وہ کسی نہ کسی کی مدد پر بھروسہ کئے ہوئے ہوتا ہے۔ جب آدمی صرف اللہ کی طرف لپکے اور صرف اللہ پر بھروسہ کرے تو یہی اللہ کی عبادت کرنا ہے اور جو شخص اللہ کے سوا کسی اور کو اپنے ان جذبات کا مرکز بنالے تو وہ اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت کر رہا ہے۔

جو شخص اللہ کی عبادت کرے وہ صرف اللہ کو پکارنے لگتا ہے۔ اسی پکار کے ایک روزمرہ طریقہ کا نام نماز ہے۔ وہ اپنے رب میں اتنا مشغول ہوتا ہے کہ اس کی اپنی ضرورتیں بھی اس سے کم ہو جاتی ہیں، اسی کی ایک متعین صورت کا نام روزہ ہے۔ اس کا شوق اس کو اکساتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف دوڑے، اسی کے ایک تاریخی عمل کا نام حج ہے۔ اس کا سابقہ جب انسانوں سے پڑتا ہے تو لوگوں کے ساتھ بھی وہ اسی عنایت کا سلوک کرنے لگتا ہے جس عنایت کو وہ اپنے لئے اپنے رب سے مانگ رہا ہے، اسی کے ایک مقررہ نظام کا نام زکوٰۃ ہے۔

جو شخص اللہ کا عابد ہو، اس کی پوری زندگی اندر سے باہر تک عبادت بن جاتی ہے۔ وہ اللہ کا ہو جاتا ہے اور اللہ اس کا۔ وہ جھکتا ہے تو اللہ کے لئے جھکتا ہے۔ اس کو اندیشہ ہوتا ہے تو صرف اللہ کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس کے دل میں محبت کے جذبات امنڈتے ہیں تو صرف اللہ کے لئے امنڈتے ہیں۔ وہ زندگی کے معاملات میں لحاظ کرتا ہے تو صرف اللہ کا لحاظ کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کے حوالے کر دیتا ہے۔

پرستش کی قسمیں

پرستش کسی صورت کا نام نہیں بلکہ پرستش ایک حقیقت کا نام ہے۔ کسی چیز سے سب سے زیادہ لگاؤ، کسی چیز کی برتری کا اتنا غلبہ کہ اس کے مقابلہ میں دوسری تمام چیزیں غیر اہم بن جائیں، یہی پرستش ہے اور اس اعتبار سے آدمی جس چیز کو اپنی زندگی میں شامل کرے وہ اس کی پرستش کر رہا ہے۔ خواہ وہ زبان سے کسی دوسری چیز کے پرستار ہونے کا اقرار کرتا ہو۔

جب آدمی ایک شخص کو یہ مقام دیتا ہے کہ اس کے آگے اس کی گردن جھک جائے تو وہ اس کی پرستش کرتا ہے۔ جب آدمی اپنے ایک فائدہ کو یہ اہمیت دیتا ہے کہ اس کی خاطر وہ دوسری تمام چیزوں کو نظر انداز کر دے تو وہ اس کی پرستش کرتا ہے۔ جب آدمی مال کو اس قابل سمجھتا ہے کہ وہ اس سے اپنی امیدیں اور تمنائیں وابستہ کرے تو وہ اس کی پرستش کرتا ہے۔

اسی طرح جب آدمی ایک رواج کو یہ حیثیت دیتا ہے کہ ہر دوسرے تقاضے سے بے پروا ہو کر وہ اس کو پورا کرے تو وہ رواج کی پرستش کرتا ہے۔ جب آدمی کسی کے خلاف ابھرنے والے نفسانی جذبات سے اتنا مغلوب ہوتا ہے کہ ہر دوسری چیز کو نظر انداز کر کے اس کو اپنے انتقامی جذبات کا نشانہ بناتا ہے تو وہ اپنے نفس کی پرستش کرتا ہے۔ جب آدمی معیار زندگی کے مسئلہ سے اتنا مرعوب ہوتا ہے کہ اپنے وقت اور کمائی کو تمام تر اپنے دنیوی معیار کو بڑھانے میں لگا دیتا ہے تو وہ معیار زندگی کی پرستش کرتا ہے۔ جب آدمی جاہ و مرتبہ کا اتنا حریص ہوتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ دے کر اپنے کو اونچا اٹھانا چاہتا ہے تو وہ جاہ کی پرستش کرتا ہے —— دنیا میں آدمی کا امتحان یہ ہے کہ ہر اعتبار سے وہ صرف ایک خدا کی پرستش کرے، پرستش میں اس کے ساتھ کسی بھی دوسری چیز کو شریک نہ کرے۔ اس کا لگاؤ، اس کا احترام، اس کی وابستگی، اس کا جھکنا، سب کچھ سب سے زیادہ صرف اللہ کے لئے ہو جائے۔

مومن کے صبح و شام

مسلمان سویرے بستر سے اٹھتا ہے تو اس کی زبان پر یہ دعا ہوتی ہے کہ خدایا تیرا شکر ہے، تو نے مجھے سلایا اور تو نے مجھے بیدار کیا۔ وہ پاک صاف ہو کر فجر کی نماز کے لئے مسجد پہنچتا ہے تاکہ اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ مل کر خدا کی خدائی اور اس کے مقابلہ میں اپنی بندگی کا اعتراف کرے۔ وہ قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر معلوم کرتا ہے کہ اس کا رب اس سے کیا چاہتا ہے۔ اس کے بعد وہ زندگی کی سرگرمیوں میں لگ جاتا ہے۔ دن کے دوران میں اس پر تین نمازوں کے اوقات آتے ہیں۔ ظہر، عصر اور مغرب۔ ہر نماز کے وقت وہ اپنا کام چھوڑ کر اپنے اللہ کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں پہلی حیثیت خدا کو دیتا ہے نہ کہ کسی اور کو۔

جب اس کو بھوک لگتی ہے اور وہ کھانا کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے تو اس کا بال بال خدا کے شکر میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدایا تو نے کیسا عجیب پانی بنایا جس سے میں اپنی پیاس بجھاؤں اور کیسا عجیب رزق اتارا جس سے میں اپنی بھوک مٹاؤں۔ جب اس کو کوئی کامیابی ہوتی ہے تو وہ اس کو خدا کی طرف سے سمجھ کر شکر ادا کرتا ہے۔ کوئی ناکامی ہوتی ہے تو اپنی غلطی کا نتیجہ سمجھ کر اللہ سے تلافی کی دعا کرتا ہے۔ جب کسی سے اس کا سابقہ پیش آتا ہے تو وہ اس سے یہ سمجھ کر معاملہ کرتا ہے کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے اور ایک روز اس سے پوری زندگی کا حساب لے گا۔ اس طرح رات آجاتی ہے۔ اب وہ اپنی ضروریات سے فارغ ہو کر دوبارہ اپنے کو پاک صاف کرتا ہے اور رات کی آخری نماز پڑھ کر سو جاتا ہے۔ سوتے ہوئے اس کی زبان پر یہ دعا ہوتی ہے: خدایا تیرے ہاتھ میں میری زندگی ہے اور تیرے ہاتھ میں میری موت ہے۔ مجھ کو معاف فرما اور مجھ کو اپنی رحمتوں کے سایہ میں داخل فرما۔

مسلمان اپنی زندگی کا نظام خدا کو سامنے رکھ کر بناتا ہے نہ کہ خدا سے آزاد ہو کر۔

اللہ کی راہ میں خرچ

آدمی کے پاس جو کچھ ہے خدا کا دیا ہوا ہے۔ آدمی کی زندگی اور اس کا اثاثہ سب کچھ خدا کی بخشش ہے۔ اس بخشش کا شکریہ ہے کہ اللہ نے جو کچھ آدمی کو دیا ہے وہ اس کو اللہ کے قدموں میں ڈال دے۔ اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنا اللہ کے لئے اسی حوالگی کی ایک علامت ہے۔

آدمی دنیا میں جو کچھ کماتا ہے اسی لئے کماتا ہے کہ خدا نے اس کو ہاتھ اور پاؤں دئے ہیں جن سے وہ عمل کرے۔ اس کو آنکھ اور زبان دی ہے جس سے وہ دیکھے اور بولے۔ اس کو دماغ دیا ہے جس سے وہ سوچے اور منصوبہ بنائے۔ اسی کے ساتھ خدا نے آدمی کو ایک ایسی دنیا میں رکھا جو پوری طرح اس کے تابع ہے۔ دنیا کی ہر چیز اس طرح بنائی گئی ہے کہ انسان اس کو جس طرح چاہے اپنے کام میں لائے۔ اگر ایسا نہ ہو تو آدمی جسم و دماغ کی تمام طاقتیں رکھتے ہوئے بھی دنیا سے کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکے گا۔ اگر گیہوں کا دانہ فصل کی صورت میں نہ اگے بلکہ پتھر کے ٹکڑے کی طرح زمین میں پڑا رہے تو انسان کے لئے زمین سے غلہ حاصل کرنا ناممکن ہو جائے۔ فطرت کی طاقتیں اگر اپنا مقررہ عمل ظاہر نہ کریں تو نہ بجلی پیدا ہو اور نہ کوئی سواری حرکت کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان جو کمائی کرتا ہے وہ براہ راست خدا کا احسان ہوتی ہے۔ اس احسان کا بدلہ یہ ہے کہ آدمی اپنی کمائی کو اللہ کے دین کی راہ میں خرچ کرے۔ وہ اس سے اللہ کے کمزور بندوں کی مدد کرے۔ خدا کی دی ہوئی دولت کو وہ خدا کے بتائے ہوئے طریقوں میں لگائے۔

اللہ کی راہ کا خرچ وہ ہے جو صرف اللہ کے لئے ہو نہ کہ شہرت یا عزت یا بدلہ پانے کے لئے۔ مال کے ذریعہ آدمی اپنے آپ کو دنیا کی مصیبتوں سے بچاتا ہے۔ اللہ کی راہ میں دیا ہوا مال وہ ہے جس کو آخرت کی مصیبتوں سے نجات پانے کے لئے دیا جائے۔

اسلامی اخلاق

اسلامی اخلاق دوسرے لفظوں میں خدائی اخلاق ہے۔ یعنی بندوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں اسی فیاضی اور وسعت کا معاملہ کرنا جو معاملہ ان کا خدا ان کے ساتھ کر رہا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور اگر تم معاف کردو اور درگزر کرو اور بخش دو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے (تغابن ۱۴) یعنی جب کسی سے تلخی یا ان بن ہو جائے تو تم وہ انداز اختیار کرو جو خدا کا انداز ہے۔ خدا آدمی کی غلطی کو معاف کرتا ہے اور کسی کی غلطی کی وجہ سے اپنی مہربانیاں اس سے اٹھا نہیں لیتا۔ یہی حال تمھارا ہونا چاہئے۔ تمھارے بارے میں کوئی شخص ایسی بات کہہ دے جس سے تم کو تکلیف پہنچ جائے، کوئی ایسا سلوک کرے جو تمھارے لئے شکایت کا باعث ہو تو محض اس وجہ سے تم اس کی طرف سے اپنے دل کو برا نہ کرلو بلکہ غلطی کو نظر انداز کر کے اور شکایت کو بھلا کر اس سے معاملہ کرو۔

اسلامی اخلاقیات ایک لفظ میں وسعت ظرف کی اخلاقیات کا نام ہے۔ عام طور پر لوگوں کا اخلاق اس کے تابع ہوتا ہے کہ کسی نے ان کے بارے میں کیا کہا ہے اور کیا کیا ہے۔ مسلمان وہ ہے جو کسی نے کیا کہا اور کسی نے کیا کیا جیسی باتوں سے اوپر اٹھ کر لوگوں سے معاملہ کرے۔ اس کا اخلاق خدا کے حکم کے تحت بنا ہو نہ کہ ردعمل کی نفسیات کے تحت۔

اسلامی اخلاق کا اعلیٰ معیار یہ ہے کہ آدمی دوسرے کو نفع پہنچانے والا بنے، وہ دوسروں کے کام آئے۔ اور اگر کوئی شخص یہ طاقت نہیں رکھتا کہ وہ دوسرے کو نفع پہنچائے تو آخری درجہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو اپنی برائی سے بچائے۔ اس کی زبان اور اس کے ہاتھ پاؤں سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں۔ اس کے بعد اسلامی اخلاق کا کوئی درجہ نہیں۔

اتحاد کی جڑ تواضع

حاجی امداد اللہ صاحب (۱۸۹۹ - ۱۸۱۷) نے فرمایا: اتفاق کی جڑ تواضع ہے۔ اگر ہر شخص کا حال یہ ہو جائے کہ وہ اپنے مقابلہ میں دوسرے کو بہتر سمجھنے لگے تو نااتفاقی کی نوبت ہی نہ آئے۔ کیوں کہ نااتفاقی اسی سبب سے پیدا ہوتی ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو دوسرے سے بہتر سمجھتا ہے اور اپنی ذات کو اور اپنی بات کو ہر حال میں اوپر رکھنا چاہتا ہے جب کوئی اپنے کو بہتر نہ سمجھے تو اس کے بعد اختلاف کس بات پر ہوگا۔

بہت سے لوگ ایک ساتھ رہتے ہوں تو بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے رائے یا مفاد کا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر ہر آدمی کے اندر اپنی بہتری کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ میری رائے سب سے اچھی ہے، میرا حق سب سے زیادہ ہے میرے مفاد کا تحفظ سب سے پہلے ضروری ہے۔ یہ احساسات ہر آدمی کو دوسرے آدمی کا حریف بنا دیتے ہیں اور آپس کا اختلاف شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر اگر دونوں فریق اکڑ جائیں تو باہمی اختلاف جنم لیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ایک آدمی تواضع کا انداز اختیار کرے، وہ اپنی رائے یا اپنے مفاد کو اوپر رکھنے کے بجائے نیچے رکھنے پر راضی ہو جائے تو اس کے بعد اختلاف خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اور معاشرہ میں اتحاد کے سوا کوئی چیز باقی نہ رہے گی ـــــ اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا نام اتحاد ہے نہ کہ اختلاف کے بغیر متحد ہونے کا۔

یہ ممکن نہیں کہ لوگوں کے درمیان اختلاف اور شکایت پیدا نہ ہو۔ اختلاف اور شکایت کا پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ اس لئے باہمی اتحاد کی صورت صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ لوگ اختلاف سے دل میلا نہ کریں۔ اختلاف کے باوجود باہم متحد ہو کر رہیں۔

وعظ کون کرے

ایک بزرگ نے فرمایا: وعظ وہ شخص کرے جس کو وعظ کا کم سے کم اتنا تقاضا ہو جتنا ایک شخص کو رفع حاجت کا ہوتا ہے۔ وعظ کا مطلب ریکارڈ بجانا نہیں ہے اور نہ یہ مقصد ہے کہ ایک شاندار تقریر کر کے لوگوں سے یہ داد لی جائے کہ خوب بولے۔ وعظ کا مطلب اپنے اندرون کو انڈیلنا ہے، ایک پائی ہوئی حقیقت کو دوسروں تک پہنچانا ہے۔ ایک چھپی ہوئی بات کو لوگوں پر کھولنے کے لئے زندہ گواہ بن کر کھڑا ہونا ہے۔ اس قسم کا وعظ محض کچھ الفاظ بولنا نہیں بلکہ ایک مشکل ترین عمل کرنا ہے۔ کوئی شخص حقیقی معنوں میں یہ عمل اسی وقت کر سکتا ہے جب کہ وہ اپنی بات کو کہنے کے لئے اتنا مضطرب ہو چکا ہو کہ وہ محسوس کرے کہ اس کو ہر قیمت پر اپنی بات لوگوں تک پہنچانی ہے، خواہ اس کے لئے لوگ اس سے ناراض ہو جائیں اور خواہ اس کی راہ میں اس کو اپنا سب کچھ کھو دینا پڑے۔

یہی معاملہ تحریر کا بھی ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ اتنا زیادہ مطالعہ کرے کہ معلومات اس کے ذہن سے ابلنے لگیں۔ متعلقہ موضوع پر جو ذخیرہ تیار ہو چکا ہے اس کو چھاننے کے بعد وہ محسوس کرے کہ اب بھی کچھ لکھنے کے لئے باقی ہے۔ اس کا حال یہ ہو جائے کہ اس کی معلومات تھامے نہ تھمیں اور اس کی بے تابی روکے نہ رکے۔ جب یہ نوبت آجائے اس وقت آدمی کو لکھنے کے لئے اٹھنا چاہئے۔ اس کے بغیر جو لوگ لکھیں وہ صرف سفید کاغذ کو سیاہ کرنے کا کام کریں گے اور اس کے بغیر جو لوگ بولیں وہ صرف فضائی شور وغل میں اضافہ کا باعث ہونگے اس طرح کا لکھنا اور بولنا نہ سننے والوں کو کوئی فائدہ دیتا ہے اور نہ سنانے والوں کو۔

واعظ کا وعظ کوئی کھیل تماشا نہیں، وہ بندوں کے سامنے خدا کی نمائندگی ہے۔ اس کام کو کرنے کا حق صرف اس شخص کو ہے جو اپنی ہستی کو خدا میں گم کر دے۔ جو لوگ اس کے بغیر واعظ بنیں وہ حقیقۃً مجرم ہیں نہ کہ واعظ۔

سچائی کا اعتراف

سچائی دنیا میں خدا کی نمائندہ ہے۔ سچائی کو نہ ماننا خدا کو نہ ماننا ہے۔ خدا کی زمین پر سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ آدمی کے سامنے ایک سچائی آئے اور وہ اس کا اعتراف نہ کرے۔ ہر سچائی خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس لئے جس نے سچائی کو نہیں مانا اس نے خدا کو نہیں مانا۔

سچائی کوئی اجنبی چیز نہیں۔ وہ آدمی کی فطرت میں گندھی ہوئی ہے۔ وہ آدمی کے لئے ایک جانی پہچانی چیز ہے۔ پھر آدمی اس کا اعتراف کیوں نہیں کرتا۔ اس کی وجہ نفسیاتی رکاوٹیں ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سچائی کو ماننے میں دنیوی مصلحتوں کا نظام ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ کبھی اعتراف کرنا آدمی سے یہ قیمت مانگتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اونچے مقام سے اتارنے پر راضی ہو جائے۔ کبھی سچائی کو ماننے میں یہ وجہ مانع ہو جاتی ہے کہ جو شخص سچائی کو پیش کر رہا ہے وہ ایک معمولی آدمی ہے یا اس سے کوئی ذاتی کدورت پیدا ہو گئی ہے۔ اس قسم کی نفسیاتی رکاوٹیں آدمی کے ذہن پر غلبہ پا لیتی ہیں۔ وہ ایک ایسی چیز کا انکار کر دیتا ہے جس کے بارے میں اگر وہ سنجیدہ ہو کر سوچے تو اس کا دل گواہی دے کہ بلا شبہ وہ حقیقت ہے۔

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں خدا خود سامنے نہیں آتا۔ یہاں وہ سچائی کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ دنیا میں آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ خدا کو سچائی کے لباس میں دیکھ لے اور اس کے آگے گر پڑے۔ ہر بار جب کوئی سچائی ظاہر ہو تو گویا خدا نے اپنا جلوہ دکھایا۔ اس وقت جو شخص عناد اور گھمنڈ اور مصلحت پرستی میں پڑ کر سچائی کو نظر انداز کر دے اس نے خدا کو نظر انداز کیا۔ اس نے خدا کو نہ پہچانا۔ اس نے اپنے آپ کو خدا سے بڑا سمجھا۔ اس نے اپنے تقاضوں کو خدا کے تقاضے پر ترجیح دی۔ ایسا شخص آخرت میں سب سے زیادہ بے سہارا ہو گا۔ کیونکہ اس دن خدا اس کو نظر انداز کر دے گا۔ اور جس کو خدا نظر انداز کر دے اس کے لئے زمین و آسمان میں کوئی ٹھکانا نہیں۔

انسانوں کی تین قسمیں

ایمان و اسلام کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی اللہ سے ڈرتا ہو۔ وہ اپنے معاملات میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ وہ اس طرح زندگی گزارے گویا وہ اپنے آپ پر خدا کی نگرانی قائم کئے ہوئے ہے۔ وہ خدا کو نہ دیکھتے ہوئے بھی تمام دکھائی دینے والی طاقتوں سے زیادہ اس کا اندیشہ رکھتا ہو۔ وہ خدا کے پاس ایسا دل لے کر پہنچے جو دنیا کی زندگی میں ہمیشہ خدا کی طرف متوجہ رہا ہو۔ یہی اللہ کے مطلوب اور محبوب بندے ہیں۔ جب اللہ کی خاطر وہ دنیا کا دکھ اٹھا کر آخرت میں پہنچیں گے تو ان کا رب ان کو نہال کر دے گا۔ وہ ان سے کہے گا کہ ہرے بھرے باغوں والے جنتی مکانات میں داخل ہو جاؤ اور ہمیشہ وہاں رہو۔ یہاں تمھارے لئے وہ سب کچھ ہے جو تم چاہو۔ اور ہمارے انتھاہ انعامات اس کے علاوہ ہیں۔ (ق ۳۵-۳۱)

دوسرے لوگ وہ ہیں جو اللہ پر ایمان لائے اور عمل صالح کیا۔ تاہم ان سے کوتاہیاں بھی ہوئیں۔ ان کے ٹھیک کام میں غلط کام بھی شامل ہوتا رہا۔ مگر اس کمزوری کے باوجود وہ ڈھیٹ نہیں بنے۔ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اللہ سے معافی مانگتے رہے اور بار بار اس کی طرف پلٹنے کی کوشش کرتے رہے۔ امید ہے کہ اللہ ان کو بھی اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے گا۔ وہ جب خدا کی طرف لوٹے تو خدا بھی ان کی طرف لوٹے گا۔ کیوں کہ وہ بخشنے والا مہربان ہے (توبہ ۱۰۲)

اس کے بعد تیسرا گروہ وہ ہے جس نے نفس پرستی، دنیا طلبی اور گھمنڈ کو اپنا دین بنایا۔ انھوں نے اپنی زبان اللہ کے لئے بند نہیں کی۔ ان کے قدم اللہ کے لئے نہیں رکے۔ ایسے لوگوں کے لئے آخرت میں جہنم کی آگ کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے لئے نہیں جئے بلکہ اپنے لئے جئے۔ انھوں نے آخرت کی فکر نہیں کی بلکہ دنیا کی فکر کی۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ وہ خدا کی ابدی دنیا میں عزت کا مقام حاصل کر سکیں (ہود ۱۶-۱۵)

خدا کا انعام

آدمی کو چاہئے کہ خدا سے اتنا قریب ہو جائے کہ ہر وقت اس کو خدا کی یاد آتی رہے ۔ اللہ کی بڑائی کا احساس اس کے اوپر اتنا چھا جائے کہ اپنا وجود اس کو بے حقیقت نظر آنے لگے ۔ جنت اور جہنم کا اس کو اتنا یقین ہو جائے کہ دنیا کے آرام و تکلیف سے زیادہ اس کو آخرت کے آرام و تکلیف کی فکر رہنے لگے ۔ وہ اپنے آپ کو اتنا اوپر اٹھائے کہ اپنی غلطیاں اس کو اس طرح دکھائی دینے لگیں جس طرح کسی کو اپنے دشمن کی غلطیاں دکھائی دیتی ہیں ۔ وہ اپنے آپ کو نفسیاتی گرہوں سے اتنا آزاد کرلے کہ اختلاف اور شکایت کے باوجود دوسرے کے لئے اس کے دل سے دعائیں نکلنے لگیں ۔ حق کا اعتراف نہ کرنا اس کو ایسا معلوم ہو گویا وہ اپنے آپ کو قتل کر رہا ہے ۔ دوسرے کا آشیانہ اجاڑنا اس کو ایسا لگے جیسے وہ خود اپنے آشیانہ میں آگ لگا رہا ہے ۔ یہی خدا پرستی کی زندگی ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جن کو خدا اپنی جنت میں جگہ دے گا ۔

جو لوگ اللہ کے سچے بندے بن جائیں، ان کے لئے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ دنیا میں انھیں غالب کرے گا ۔ یہ غلبہ ان کی خدا پرستی کا اصل انعام نہیں بلکہ اصل انعام کی ابتدائی علامت ہے ۔ خدا پرستوں کے لئے اللہ نے جو انعام مقدر کر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ قیامت کے بعد آنے والی دنیا میں وہ ان کو غلبہ و سربلندی عطا کرے ۔ ان کو ہر قسم کے خوف اور حزن سے پاک کر کے اپنی رحمتیں اور نعمتیں دائمی طور پر ان کی وراثت میں دے دے ۔ اسی کا نام جنت والی زندگی ہے جو آخرت میں مومنین صالحین کو حاصل ہوگی ۔ مگر جب اہل ایمان کا کوئی قابل لحاظ گروہ بن جاتا ہے تو اللہ اس دنیا میں بھی اس کو علامتی طور پر غالب کر دیتا ہے ۔ اس کے مقابلہ میں سرکش اور غافل انسانوں کو مغلوب کر کے دکھایا جاتا ہے کہ آخرت کی ابدی دنیا میں کون عزت اور برتری کے مقام پر ہوگا اور کون ذلت اور پستی کے گڑھے میں ڈال دیا جائے گا ۔

اسلامی زندگی

اسلام کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے ——— اللہ کا ڈر اور بندوں کی خیر خواہی۔
مسلمان وہ ہے جو اس حقیقت کو پالے کہ ساری طاقتیں صرف اللہ کے پاس ہیں اور انسان اس کے مقابلہ میں صرف ایک عاجز مخلوق ہے۔ دنیا میں بظاہر آدمی کو جو اختیار ملا ہوا ہے وہ صرف امتحان کے لئے ہے۔ امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی خدا غیب کے پردے کو ہٹا دے گا۔ اس وقت خدا کی خدائی اور اس کے مقابلہ میں انسان کی بے بسی اس طرح کھل جائے گی کہ آدمی بالکل ڈھ پڑے گا۔ اس دن وہ حقیقتوں کو اس طرح دیکھے گا کہ ان کو مانے بغیر اس کے لئے چارہ نہ ہوگا۔

مسلمان وہ ہے جو اس آنے والے دن کو اس کے آنے سے پہلے دیکھ لے۔ ایسا شخص دنیا میں اس طرح رہنے لگتا ہے جیسے وہ خدا کو اپنے اوپر نگرانی کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ وہ جب زبان کھولتا ہے تو اس کا ایمان اس کی زبان پکڑ لیتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ بولو تو حق بات بولو ورنہ چپ رہو۔ وہ جب چلنا چاہتا ہے تو خدا کا خوف اس کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ چلو تو صحیح سمت میں چلو ورنہ اپنے قدموں کو چلنے سے روک لو۔ اس کا یہ احساس کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے اس کے اوپر نگراں بن کر چھا جاتا ہے۔ وہ وہی کرتا ہے جس سے خدا راضی ہو۔ اور جس چیز سے خدا راضی نہ ہو اس کے کرنے کی اسے ہمت نہیں ہوتی۔

ایسے آدمی کے دل میں بندوں کے لئے خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ بندوں کو اسی مہربانی کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے جس نظر سے ان کا خدا انھیں دیکھ رہا ہے وہ بندوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں اپنے آپ کو اسی بے لاگ انصاف کے ترازو پر کھڑا کر دیتا ہے جس بے لاگ انصاف کے ترازو پر کائنات کا خالق و مالک آخر کار سب کو کھڑا کرنے والا ہے۔

حقیقت کے مطابق

اسلام کیا ہے، فطرت کے مطابق زندگی گزارنا۔ دنیا میں اس طرح رہنا جیسا کہ حقیقت کے اعتبار سے آدمی کو رہنا چاہئے۔ آدمی خود سے نہیں بن گیا۔ اس کو خدا نے بنایا ہے۔ اب حقیقت کے مطابق زندگی یہ ہے کہ آدمی خدا کی بڑائی کو مانے اور اس کا احسان مند ہو۔ آدمی کے اندر ڈر اور محبت کے جذبات ہیں۔ وہ کسی چیز پر اعتماد کرنا چاہتا ہے اور کسی چیز کو اپنی دوڑ دھوپ کا مرکز بناتا ہے۔ اب حقیقت کے مطابق زندگی یہ ہے کہ آدمی ان حیثیتوں سے خدا کو اپنا مرکز بنائے۔ کیوں کہ دوسری تمام چیزیں مخلوق ہیں، خدا کے سوا کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔

دنیا میں جتنے آدمی پیدا ہوئے یا پیدا ہوں گے سب کے باپ آدم ہیں، سب بالآخر ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ اس لئے حقیقت کے مطابق زندگی یہ ہے کہ ہر آدمی دوسرے کا خیر خواہ ہو، ہر ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں کا سا برتاؤ کرے۔ ہر آدمی کے اندر ضمیر ہے۔ یہ ضمیر انصاف کو پسند کرتا ہے اور ظلم اور بے انصافی کو ناپسند کرتا ہے۔ اب حقیقت کے مطابق زندگی یہ ہے کہ آدمی دوسروں کے درمیان اس طرح رہے کہ ہر آدمی دوسرے کا خیر خواہ ہو، ہر ایک دوسرے کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرے۔ آدمی پر ایک روز موت آنی ہے۔ موت ہر آدمی سے وہ چیز چھین لیتی ہے جو دنیا میں اس کو حاصل تھی۔ اس لئے حقیقت کے مطابق زندگی یہ ہے کہ دنیا کی اونچ نیچ کو وقتی اور مصنوعی خیال کیا جائے۔ ہر آدمی کو یکساں طور پر خدا کا بندہ سمجھا جائے خواہ بظاہر وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ اسی طرح آدمی کے سامنے ایک حق آتا ہے وہ اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ اس کا انکار کردے۔ مگر وہ سوچتا ہے کہ ایک دن بالآخر ایسا آنے والا ہے جب کہ میں حق کو حق اور باطل کو باطل ماننے پر مجبور ہوں گا۔ یہ سوچ کر وہ اس حق کو آج ہی مان لیتا ہے جس کو وہ کل ماننے پر مجبور ہوگا۔

خدا کی عینک سے

اگر آپ صاف شیشہ کی عینک لگائیں تو ہر چیز آپ کو اپنے اصلی رنگ میں دکھائی دے گی۔ لیکن اگر آپ کی آنکھ پر رنگین شیشہ والی عینک ہو تو ہر چیز کا رنگ مصنوعی ہو جائے گا۔ اب ہر چیز آپ کو اس رنگ میں رنگی ہوئی دکھائی دے گی جو کہ آپ کی عینک کا رنگ ہے۔

یہی حال انسانی ذہن کا ہے۔ ہر آدمی جب دوسرے کو دیکھتا ہے تو وہ اس کو اپنے ذہن کی "عینک" سے دیکھتا ہے۔ اگر اس کی عینک کا شیشہ صاف ہے تو ہر چیز اپنے اصلی رنگ میں دکھائی دے گی۔ اور اگر اس کی عینک کا شیشہ رنگین ہو تو کوئی چیز خواہ حقیقت میں کیسی ہی ہو، اس کے اپنے دیکھنے میں ویسی ہی دکھائی دے گی جیسا کہ اس کی اپنی عینک کا رنگ ہے۔

آدمی کا ذہن یا تو خدائی ذہن ہوتا ہے یا ذاتی ذہن۔ وہ دوسروں کو یا تو خدا کی عینک سے دیکھتا ہے، یا اپنی ذاتی پسند کی عینک سے۔ یہ دونوں طریقے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ خدا کی عینک سے دیکھنے والا دوسروں کو حقیقت واقعہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے نہ کہ اپنی متاثر نگاہ سے۔ وہ ہر آدمی کو ویسا ہی دیکھتا ہے جیسا کہ وہ فی الواقع ہے۔ کیونکہ خدا کے دیکھنے کا طریقہ یہی ہے۔ مگر دوسرے آدمی کا طریقہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ ہر آدمی کو اپنے مفاد اور اپنی عصبیت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جس آدمی سے اس کی دوستی ہے وہ اس کو اچھی صورت میں دکھائی دیتا ہے اور جس سے اس کا بگاڑ ہے وہ بری صورت میں۔ جو آدمی اس کے اپنے حلقہ کا ہے وہ اگر اس کو "سفید" نظر آئے تو دوسرے حلقہ کا آدمی اس کو "کالا" نظر آتا ہے۔

مومن وہ ہے جو ہر آدمی کو خدا کی نگاہ سے دیکھے نہ کہ اپنی ذاتی نگاہ سے۔

جو شخص چیزوں کو خدا کی نظر سے دیکھنے لگے وہ ایک بے پناہ انسان بن جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ہر ایک سے وہی معاملہ کرتا ہے جو باعتبار واقعہ اسے کرنا چاہئے۔ وہ دنیا کے لحاظ سے ایک حقیقت پسند انسان بن جاتا ہے اور آخرت کے لحاظ سے ایک صالح انسان۔

ہر معاملہ میں احتیاط

غیر مومن ایک بے حس انسان ہوتا ہے اور مومن ایک حساس انسان۔ مومن کی حساسیت صرف خدا یا اس کی مقدس چیزوں ہی میں ظاہر نہیں ہوتی بلکہ خدا کی تمام مخلوقات کے معاملہ میں ظاہر ہوتی ہے۔

مومن کا سابقہ جب کسی انسان سے پیش آتا ہے، خواہ وہ کمزور ہو یا طاقت ور، تو وہ ایک محتاط قلب کے ساتھ اس کے وہ تمام حقوق ادا کرتا ہے جو خدا نے ایک انسان کے لئے دوسرے انسان کے اوپر مقرر کئے ہیں۔ وہ جب کسی جانور کو اپنے استعمال میں لاتا ہے تو اس وقت بھی وہ مہربانی کے تمام آداب کا لحاظ رکھتا ہے، حتی کہ موذی جانوروں کو مارنا پڑے تو اس وقت بھی وہ ان کو بے رحمی کے ساتھ تکلیف دے دے کر مارنا اپنے لئے جائز نہیں سمجھتا۔ اس کی حساسیت اس میں بھی رکاوٹ بن جاتی ہے کہ وہ کسی درخت کو خواہ مخواہ کاٹے اور کسی پھول کو بے ضرورت مسلے۔ پانی سے کام لیتے ہوئے بھی وہ اس کا خیال رکھتا ہے کہ بے فائدہ پانی نہ بہائے اور غیر ضروری طور پر خدا کی نعمت کو خرچ نہ کرے۔

ایمان آدمی کے اندر جو احتیاط اور حساسیت پیدا کرتا ہے وہ اس کا عمومی مزاج بن جاتی ہے اور اس کی تمام کارروائیوں میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ اس کا بولنا، اس کا چلنا پھرنا، اس کا معاملہ کرنا، حتی کہ بے جان اور بے زبان چیزوں کو کام میں لانا، سب کچھ اس کے اس عام مزاج کے ماتحت ہو جاتے ہیں۔ جذباتی مواقع پر بھی وہ احتیاط کے پہلو کو نہیں بھولتا، قابو یافتہ ہونے کے باوجود کسی کو اس سے بے رحمی اور بے حسی کا تجربہ نہیں ہوتا۔

مومن آدمی وہ ہے جس کو یہ کھٹکا لگا ہوا ہو کہ اس کا خدا اس کو دیکھ رہا ہے اور وہ اس سے اس کے تمام کھلے اور چھپے کا حساب لے گا۔ ایسا آدمی عین اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک محتاط آدمی بن جاتا ہے۔

خدا کی خاطر بے اختیار ہونے والے

اس دنیا میں سارا اختیار صرف خدا کا ہے، اس کے سوا کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ مگر امتحان کی غرض سے خدا نے انسان کو آزادی دے دی ہے۔ ایک مکمل طور پر بے اختیار دنیا میں انسان کو مکمل طور پر اختیار دیا گیا ہے اور اب خدا یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ اختیار کو پاکر کیا کرتا ہے۔ وہ حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کر کے اللہ کے آگے جھک جاتا ہے یا ظاہری اختیار کی وجہ سے دھوکے میں پڑ کر سرکشی کرتا ہے۔

جنت ان لوگوں کے لئے ہے جو اختیار رکھتے ہوئے اللہ کی خاطر اپنے کو بے اختیار کر لیں۔ جو بے خوفی کا موقع ہوتے ہوئے اللہ سے ڈریں۔ بظاہر خود سب کچھ ہوتے ہوئے اللہ کو اپنا سب کچھ بنالیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اسباب کے پردہ میں رزق دیا گیا مگر اس کو انھوں نے براہ راست اللہ کی طرف سے آیا ہوا رزق سمجھا۔ ان کو اللہ نے ظلم کی قدرت دی مگر انھوں نے اللہ کے خوف سے اپنے ہاتھوں کو ظلم کرنے سے روک لیا۔ اللہ نے ان کو غصہ، نفرت، انتقام کے مواقع دئے مگر اللہ کی خاطر انھوں نے غصہ کے موقع پر صبر کیا اور نفرت اور انتقام کے موقع پر درگزر کرنے کا طریقہ اپنایا۔ اللہ نے ان کی تعریف میں لوگوں کی زبانیں کھلوائیں مگر ان کو عجز و تواضع میں لذت ملی۔ اللہ نے ان کو دولت دی مگر دولت کو اپنے ذاتی عیش میں خرچ کرنے کے بجائے انھیں اس میں تسکین ملی کہ وہ اپنی دولت کو اللہ کی راہ میں لٹائیں۔ وہ اپنی مرضی پر چلنے کے بجائے اللہ کی مرضی پر چلے۔ وہ اپنے لئے جینے کے بجائے صرف اللہ کے لئے جئے۔

جنت کی نفیس دنیا ان لوگوں کے لئے ہے جنھوں نے اپنے آزاد ارادہ سے اپنے کو خدا کا محکوم بنایا۔ جنھوں نے پابند نہ ہو کر بھی خدائی پابندی کے رویہ کو اپنے لئے پسند کر لیا۔ جو پوری طرح آزاد ہونے کے باوجود پوری طرح خدا کے تابعدار بن گئے۔

آدمی کا امتحان

زندگی کا سارا معاملہ امتحان کا معاملہ ہے۔ کوئی شخص بظاہر اچھے حالات میں ہے اور کوئی بظاہر برے حالات میں۔ مگر اس اعتبار سے دونوں یکساں ہیں کہ دونوں امتحان کے ترازو میں کھڑے ہوئے ہیں۔ یہاں ہر آدمی کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ کسی کا امتحان ایک قسم کے حالات میں ہے اور کسی کا دوسرے قسم کے حالات میں۔

اللہ ہر آدمی کو مختلف قسم کے حالات میں ڈال کر یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون اپنے حالات میں کس قسم کا ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ اسی ردعمل پر آدمی کے آخرت کے انجام کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اللہ ایسے حالات پیدا کرتا ہے جس میں ایک شخص حق پر ہوتے ہوئے کمزور پڑ جائے اور دوسرا شخص ناحق پر ہوتے ہوئے مضبوط حیثیت حاصل کر لے۔ اب جس شخص نے دوسرے سے معاملہ کرنے میں حق کا لحاظ کیا وہ جنتی ٹھہرا اور جس شخص نے دوسرے سے معاملہ کرنے میں موقع پرستی کا طریقہ اختیار کیا وہ جہنم کا سزاوار ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ایسے مواقع پیدا کرتا ہے جس میں ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچے۔ اب جس شخص نے ایسے موقع پر تواضع کا طریقہ اختیار کیا وہ جنتی قرار پایا اور جس نے گھمنڈ کا مظاہرہ کیا وہ جہنمی بن گیا۔ اللہ تعالیٰ کسی کو کمزور بناتا ہے اور کسی کو طاقت ور۔ اب جس شخص نے انصاف کے پہلو کو اہمیت دیتے ہوئے اس کے مطابق لوگوں کے ساتھ معاملہ کیا وہ جنت کا مستحق ٹھہرا اور جو شخص طاقت ور کے آگے جھکے اور کمزور کو ذلیل کرے وہ جہنم کا مستحق ہو گیا۔

اسی طرح آدمی کی زندگی میں روزانہ جو معاملات پیش آتے ہیں وہ اس کے لئے خدا کی طرف سے امتحان کے پرچے ہیں۔ ہر روز آدمی اپنے رویہ سے یا تو اپنے کو جنت کی طرف لے جاتا ہے یا جہنم کی طرف۔ آدمی کی زندگی میں ہر روز دو راستے کھلتے ہیں۔ آدمی ایک رخ پر جا کر اپنے کو جنت میں داخل کر دیتا ہے اور دوسرے رخ پر جا کر اپنے کو جہنم میں گرا لیتا ہے۔

جانچا جارہا ہے

موجودہ دنیا میں ارادہ کی حد تک انسان کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ مگر واقعات برپا کرنے کا اختیار کسی کو نہیں۔ دنیا میں جتنے واقعات ہوتے ہیں سب خدا کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اور ان کی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ مختلف حالات میں ڈال کر افراد کا امتحان لیا جائے۔

کوئی واقعہ اس لئے ہوتا ہے کہ ایک شخص کو صبر، انصاف اور حق پرستی کا کریڈٹ دیا جائے اور دوسرے شخص کو بے صبری، ظلم اور حق سے بے پروائی کا مجرم ٹھہرایا جائے۔ کوئی واقعہ اس لئے پیش آتا ہے کہ ایک شخص کو کسی بندۂ خدا کے خلاف سازش، بدمعاملگی اور زیادتی کا موقع دے کر اس کے جھوٹے دعوٰی اسلام کو باطل ثابت کیا جائے۔ دوسری طرف اس بندۂ خدا کی خصوصی تائید کر کے لوگوں کو بتایا جائے کہ وہ سچائی پر ہے اور اس کی مدد پر خدا کھڑا ہوا ہے۔ ایک شخص حق پر ہوتا ہے، اس کے باوجود اس کو بے بسی اور بے کسی کی حالت میں ڈال دیا جاتا ہے۔ دوسرا شخص ناحق پر ہوتا ہے اس کے باوجود اس کے گرد دنیا کی رونقیں جمع کر دی جاتی ہیں۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کون ہے جو ظاہر سے گزر کر حق کو پالیتا ہے اور حق کا ساتھ دینے والا قرار پاتا ہے اور کون ہے جو ظاہری چیزوں میں اٹک جاتا ہے اور اس کا مستحق ٹھہرتا ہے کہ خدا کے یہاں اس کو حق کو نظر انداز کرنے والوں میں اٹھایا جائے۔

موجودہ دنیا میں ہر چیز امتحان کے لئے ہے۔ یہاں طاقت ور ہونا بھی امتحان کے لئے ہے اور کمزور ہونا بھی امتحان کے لئے۔ یہاں کسی کو امیر بنا کر جانچا جارہا ہے اور کسی کو غریب بنا کر۔ موجودہ دنیا میں نہ کسی کامیاب شخص کے لئے خوش ہونے کا موقع ہے اور نہ کسی ناکام شخص کے لئے غمگین ہونے کا۔ کیوں کہ دونوں یکساں طور پر امتحان کے میدان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ خدا مختلف قسم کے واقعات برپا کر کے یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون اپنے حالات میں کس قسم کے ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ اسی ردعمل پر کسی کے لئے جنت کا فیصلہ ہوتا ہے اور کسی کے لئے جہنم کا۔

کوئی دنیا کمارہا ہے کوئی آخرت

ایک آدمی وہ ہے جس کا مقصود پیسہ ہے۔ اس نے کوئی ایسا کام پکڑ لیا ہے جس سے پیسہ ملتا ہے اور اپنے پورے وقت اور اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس میں مصروف ہے۔ جب اس کی سرگرمیوں کا نتیجہ پیسہ کی صورت میں اس کی طرف لوٹتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے اور جب پیسہ نہ ملے تو وہ تردد میں پڑ جاتا ہے۔ دوسرا آدمی وہ ہے جو عزت و شہرت کا طالب ہے۔ وہ ہر اس کام کی طرف دوڑ پڑتا ہے جس میں اس کا نام اونچا ہو اور جس میں شرکت کی وجہ سے ہر طرف اس کا چرچا ہونے لگے۔ اعزاز اور مقبولیت کے مقام پر کھڑا ہو کر اس کے نفس کو لذت ملتی ہے اور اگر اس کو اعزاز اور مقبولیت کے مقام پر کھڑا ہونے کا موقع نہ ملے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی دنیا کھو گئی ہے۔ تیسرا آدمی وہ ہے جو اقتدار کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے ہے۔ اس کی بہترین تمنا یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کے اوپر اس کا حکم چلے۔ لوگوں کی گردنیں اس کی مٹھی میں ہوں۔ لوگوں کے درمیان اس کو سب سے اوپر جگہ ملے۔ اس کے مقابلہ میں لوگ بے اختیار ہوں اور اس کو لوگوں کی قسمتوں پر اختیار حاصل ہو —— یہ تینوں آدمی وہ ہیں جنھوں نے اپنے عمل کا نتیجہ اسی دنیا میں چاہا۔ ایسے لوگ دنیا میں خواہ جتنا بھی حاصل کر لیں، آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔

اس کے بعد وہ اللہ کا بندہ ہے جو آخرت کو چاہنے والا ہے اور آخرت کی راہ میں اپنی سرگرمیوں کو لگائے ہوئے ہے۔ لوگوں کا عمل بازار میں ہوتا ہے اور اس کا عمل فطرت کی خاموش کائنات میں۔ لوگ مجمع عام میں اپنی سرگرمیاں دکھاتے ہیں اور وہ اپنی تنہائیوں میں مصروف عمل ہوتا ہے۔ لوگ دنیا کی عزت و کامیابی پا کر خوش ہوتے ہیں اور وہ اس امید میں جی رہا ہوتا ہے کہ اس کا مالک اس کو اپنی رحمتوں کے سائے میں لے لے۔ بظاہر وہ اسی دنیا میں دکھائی دیتا ہے مگر اپنی سوچ اور جذبات کے اعتبار سے وہ آخرت میں جیتا ہے۔ لوگ سامنے کی دنیا میں گم ہوتے ہیں اور وہ خدا کی چھپی ہوئی کائنات میں۔

واقعات کے درمیان

آدمی کی زندگی میں روزانہ جو واقعات پیش آتے ہیں انھیں کے درمیان یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی آدمی کیا ہے۔ ہر واقعہ ہمارے اندر کسی نہ کسی قسم کی ہلچل پیدا کرتا ہے اور ہماری نفسیات کسی نہ کسی صورت میں اس کا جواب پیش کرتی ہے، جو آدمی خدا کو بھولا ہوا ہے، اس پر جب کوئی واقعہ گزرتا ہے تو اس کا جواب اس کی خواہشات اور اس کے مفادات کے تابع ہوتا ہے۔ مومن وہ ہے کہ جب اس کی زندگی میں کوئی واقعہ پیش آئے تو وہ خدا کو یاد کرے، وہ اس کے اندر نفسانیت کے جذبات کو نہ ابھارے بلکہ خدا پرستی کے جذبات کو ابھارے۔

زندگی میں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔ کبھی آرام ملتا ہے اور کبھی تکلیف۔ کبھی تعریف سننی ہوتی ہے اور کبھی تنقید۔ کبھی کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آتا ہے اور کبھی خوش گوار — یہ اتار چڑھاؤ سب امتحان کے پرچے ہیں۔ کامیابی یہ ہے کہ ان واقعات سے آدمی کے اندر نفسانیت نہ جاگے بلکہ خدا پرستی جاگے۔ خوشی اور آرام ہو تو اس کے اندر شکر کا جذبہ ابھرے۔ کسی سے کوئی تکلیف پہنچے تو اس کے اندر عجز اور عبدیت کی روح پیدا ہو۔

دنیا میں آدمی کا اصل امتحان یہی ہے کہ مختلف حالات کے درمیان وہ کس قسم کا جواب پیش کرتا ہے۔ دولت واقتدار کے ملنے پر آدمی کے اندر اگر بڑائی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو وہ ناکام ہو گیا اور اگر تواضع کا جذبہ پیدا ہو تو وہ کامیاب ہوا۔ کسی سے اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں ضد اور نفرت ابھر آئے تو وہ ناکام رہا اور اگر ہمدردی اور معافی کے احساسات ابھریں تو وہ کامیاب رہا۔ کسی سے معاملہ پیش آنے کی صورت میں اگر آدمی بے انصافی کرنے لگے تو وہ ناکام رہا اور اگر انصاف کے مطابق پورا پورا حق ادا کرے تو وہ کامیاب ہو گیا

انتخاب ہو رہا ہے

ہماری قریبی کہکشاں میں تقریباً دو سو ارب بہت بڑے بڑے ستارے ہیں اس قسم کی بے شمار کہکشائیں خلا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ کائنات ناقابل قیاس حد تک وسیع ہے۔ تاہم ساری معلوم کائنات میں نظام شمسی صرف ایک ہے۔ اسی نظام شمسی میں زمین ہے۔ زمین جیسا کرہ ساری کائنات میں کوئی دوسرا نہیں۔ پھر زمین کے اوپر انسان جیسی انوکھی مخلوق ہے انسان کے اندر زندگی ہے۔ وہ چلتا ہے اور بولتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے۔ وہ سوچتا ہے اور جانتا ہے۔ وہ ذاتی ارادہ کے تحت عمل کرتا ہے۔ یہ انسان ایسی انوکھی چیز ہے جس کے انوکھے پن کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اتنا انوکھا انسان اللہ نے کیوں بنایا۔ جواب یہ ہے کہ — ایک اور زیادہ انوکھی اور معیاری دنیا کے باسیوں کا انتخاب کرنے کے لئے جس کا نام جنت ہے۔

موجودہ دنیا ان مخلوقات کی دنیا ہے جو مجبورانہ اطاعت کر رہی ہیں، جو پابند ہو کر اللہ کی تابع ہیں۔ اب اللہ کو ایک ایسی مخلوق درکار ہے جو ارادی اطاعت کرنے والی ہو، جو پابند نہ ہو کر اس کی تابع ہو جائے۔ یہاں ایسے ہی افراد کا چناؤ ہو رہا ہے۔ اللہ کو ایسے لوگ مطلوب ہیں جو اختیار رکھتے ہوئے بے اختیار ہو جائیں۔ جو اللہ کو نہ دیکھتے ہوئے اس کو دیکھنے لگیں۔ جو دنیا میں گھرے رہ کر آخرت والے بن جائیں۔ جو انکار اور سرکشی کا موقع رکھتے ہوئے اعتراف اور اطاعت کا طریقہ اختیار کر لیں یہاں جو افراد اس صلاحیت کا ثبوت دیں گے وہ اگلی زندگی میں جنتی دنیا میں بسائے جائیں گے۔ جنت انتہائی معیاری انسانوں کی انتہائی معیاری بستی ہوگی۔ وہ اتنی حسین اور لذیذ ہوگی کہ آدمی کبھی اس سے نہ اکتائے گا، وہاں نہ کوئی دکھ ہوگا اور نہ کوئی اندیشہ۔ وہاں انسان کے لئے وہ سب کچھ موجود ہوگا جو وہ چاہے۔

اللہ والے

ہر آدمی کسی نہ کسی چیز کے لئے جیتا ہے۔ کوئی اپنے بیوی بچوں کے لئے جیتا ہے۔ کوئی مال و دولت کے لئے اور کوئی عزت و اقتدار کے لئے۔ مگر اس قسم کی زندگی مومنانہ زندگی نہیں۔ مومنانہ زندگی وہ ہے جب کہ آدمی اللہ کے لئے جینے لگے۔ اس کی سرگرمیاں خدا کے گرد گھومنے لگیں۔ اس کی سوچ اور خواہش پر خدا کا غلبہ ہو جائے۔ وہ زبان کھولے تو یہ سوچ کر کھولے کہ خدا کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند۔ وہ اپنے ہاتھ اور پاؤں کو حرکت دے تو انھیں حدود میں حرکت دے جو خدا کی طرف سے اس کے لئے مقرر ہیں۔

آدمی کے سامنے کسی کی طرف سے ایک بات آتی ہے۔ اس کا نفس اس کے جواب کے لئے فوراً کچھ الفاظ سجھاتا ہے۔ مگر جو اللہ میں جینے والے ہیں وہ نفس کے دئے ہوئے الفاظ کو نہیں دہراتے بلکہ خدا سے الفاظ لے کر بولتے ہیں۔ وہ سوچنے لگتے ہیں کہ کل جب میں خدا کے سامنے کھڑا ہوں گا تو وہاں کون سے الفاظ مانے جائیں گے اور کون سے الفاظ رد کر دئے جائیں گے۔ جن الفاظ کے متعلق اس کا ضمیر کہتا ہے کہ وہ خدا کے یہاں رد ہو جائیں گے ان کو وہ اسی دنیا میں رد کر دیتا ہے اور صرف ان الفاظ کو اپنی زبان پر لاتا ہے جو خدا کے یہاں قبول کئے جانے والے ہوں۔

اسی طرح آدمی کے سامنے ایک معاملہ آتا ہے۔ اس کا نفس فوراً اس کو ایک طریقہ کی ترغیب دیتا ہے۔ مگر اللہ میں جینے والا آدمی نفس کے بتائے ہوئے طریقہ پر نہیں دوڑ پڑتا بلکہ یہ سوچتا ہے کہ کون سا طریقہ خدا کی ترازو میں انصاف کا طریقہ ثابت ہوگا اور کون سا بے انصافی کا۔ وہ بے انصافی کے طریقے کو چھوڑ دیتا ہے خواہ اس میں اس کو عزت اور دولت ملتی ہو اور انصاف والے طریقے کو پکڑ لیتا ہے خواہ بظاہر اس میں سبکی ہوتی ہو اور دنیا کا نقصان ہوتا ہوا نظر آتا ہو۔

وہ ہر بات کو خدا کے لحاظ سے دیکھتا ہے نہ کہ کسی اور لحاظ سے۔

کمینہ پن نہیں

مومن غلطی کر سکتا ہے مگر وہ کمینہ پن نہیں کر سکتا۔ غلطی وہ ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر وقتی طور پر ہو جائے۔ پھر جب جذبہ ٹھنڈا پڑے تو آدمی کو اپنی غلطی کا احساس ہو۔ وہ شرمندہ ہو کہ مجھ سے ایسا کیوں ہو گیا۔ جس کے ساتھ غلطی ہو گئی ہے اس سے مل کر معافی مانگے۔ وہ اپنی غلطی کی تلافی کرے اور اگر عملی تلافی کی صورت نہ ہو تو وہ اس کے لئے دعا کرے۔ وہ اللہ سے کہے کہ خدایا تو میری غلطی کو معاف فرما اور میری طرف سے اس کے حق میں دعائے خیر لکھ دے۔ اس کو اپنی غلطی کا اتنا شدید احساس ہو کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں۔

کمینہ پن اس سے الگ چیز ہے۔ کمینہ پن محض وقتی جذبہ کے تحت نہیں ہوتا۔ وہ مستقل ذہن کے تحت ہوتا ہے۔ کمینہ آدمی کو اپنے کئے پر شرمندگی نہیں ہوتی، اس کے ذہن میں یہ نہیں آتا کہ وہ اپنی غلطی کی تلافی کرے بلکہ وہ مقابل کے آدمی کو اور زیادہ تکلیف پہنچا کر خوش ہونا چاہتا ہے۔ کمینہ آدمی کو جب کسی سے شکایت ہو جاتی ہے تو وہ صرف اس سے بے تعلق ہو جانے کو کافی نہیں سمجھتا۔ بلکہ اس پر جھوٹے الزام لگاتا ہے۔ وہ اس کے خلاف سازشیں کرتا ہے۔ اس کے اوپر جھوٹے مقدمے چلاتا ہے۔ اس کو اکھاڑنے اور اس کو برباد کرنے کے منصوبے بناتا ہے۔ وہ صرف اس کی غلطیوں کو غلطی کہنے پر قانع نہیں ہوتا بلکہ اس کی ہر چیز کو غلط ثابت کرنے میں لگ جاتا ہے۔ وہ لوگوں کو اس کی طرف سے بدگمان کرتا ہے۔ وہ اس کے بنتے ہوئے کام کو بگاڑنا چاہتا ہے اور اس کے ملتے ہوئے فائدہ کو بھنگ کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کرتا ہے —— یہ سب کمینہ پن کی صورتیں ہیں اور کمینہ پن اور خدا کا دین دونوں ایک ساتھ کسی شخص کے اندر جمع نہیں ہو سکتے۔

کمینہ پن یہ ہے کہ آدمی اعتراف نہ کرے۔ ایک ہی قسم کی صورت میں وہ اپنے لوگوں سے کچھ معاملہ کرے اور دوسرے لوگوں سے کچھ۔ وہ حسد اور انتقام سے اوپر اٹھ کر نہ سوچ سکے ایسا آدمی خدا سے دور ہوتا ہے اور شیطان سے قریب۔

مومن اللہ میں جیتا ہے

ایک چھوٹے بچے کے لئے سب کچھ اس کے ماں باپ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے والدین میں جیتا ہے۔ مومن وہ ہے جو اللہ میں جینے لگے۔ اس کی یادوں میں اللہ بسا ہوا ہو۔ اس کو ڈر لگتا ہو تو اللہ کا ڈر لگتا ہو، اس کے اندر محبت کے جذبات امنڈتے ہوں تو اللہ کے لئے امنڈتے ہوں۔ وہ جو کچھ کرتا ہو اللہ کے لئے کرتا ہو۔ وہ اللہ کو اپنے اوپر نگراں بنائے ہوئے ہو۔

لوگ عام طور پر دوسری دوسری چیزوں میں جیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو کبھی چین حاصل نہیں ہوتا۔ کوئی کسی انسانی شخصیت میں جی رہا ہے۔ کوئی دنیا کی رونقوں میں جی رہا ہے۔ کوئی اپنے بیوی بچوں میں جی رہا ہے۔ کوئی دولت اور عزت کی طلب میں جی رہا ہے۔ اسی طرح کوئی ہے جو کسی کی دشمنی میں جی رہا ہے۔ کوئی کسی کو اکھاڑنے اور برباد کرنے کی سازشوں میں جی رہا ہے۔ کوئی کسی کو بے عزت کرنے کے منصوبوں میں جی رہا ہے۔ یہ سب جینے کے باطل طریقے ہیں۔ یہ بے حقیقت چیزوں میں جینا ہے۔ یہ ایسی چیزوں میں جینا ہے جو فانی بھی ہیں اور خدا کی کائنات میں بے جوڑ بھی۔ اس لئے ایسی چیزیں آدمی کو نہ سچا سکون دے سکتی ہیں اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ آدمی کو اس خدائی راستہ پر چلا سکیں جو کسی کے لئے منزل تک پہنچنے کا واحد راستہ ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں تمام چیزیں خدا میں جی رہی ہوں، کوئی شخص اپنے لئے جینے کا دوسرا سہارا تلاش کرے تو وہ ایسا جھوٹا سہارا ہوگا جو اس کے کسی کام آنے والا نہیں۔

جب آدمی خدا میں جینے لگے تو اس کے اندر ایک نیا انسان ابھرتا ہے۔ اب اس کو بولنے سے زیادہ چپ رہنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اس کو سرکشی کے بجائے اعتراف میں لذت ملتی ہے۔ اس کو شکایت کے موقع پر معاف کر دینے میں سکون ملتا ہے۔ اس کو اپنے بھائی کی پردہ پوشی کر کے راحت حاصل ہوتی ہے۔ امتیاز کے مقام پر بیٹھنے سے زیادہ خوشی اس کو اس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ اپنے کو عجز کے مقام پر بیٹھا ہوا دیکھے۔

غلطی کر کے پلٹنا

ایک مسافر کو کلکتہ جانا ہے، وہ ایک ٹرین میں سوار ہوتا ہے۔ مگر روانگی کے بعد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس گاڑی میں بیٹھا ہوا ہے وہ امرت سر جانے والی گاڑی ہے۔ ایسے مسافر کا حال کیا ہوگا۔ وہ اپنی غلطی پر تڑپ اٹھے گا۔ جس سیٹ پر وہ اطمینان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا وہ اس کو کاٹنے لگے گی۔ اگلے اسٹیشن پر جیسے ہی گاڑی رکے گی وہ فوراً اتر پڑے گا تاکہ واپس جاکر اپنی مطلوبہ گاڑی پکڑ سکے۔

ٹرین کا ایک مسافر جس طرح فوراً اپنی غلطی کو مان کر پلٹ پڑتا ہے وہی حال مومن کا آخرت کے معاملہ میں ہوتا ہے۔ اس سے جب کوئی ایسی غلطی ہو جاتی ہے جو آخرت کے رخ سے بے رخ کرنے والی ہو، جو اس کو اگلی زندگی میں نقصان پہنچانے والی ہو تو وہ بے حد شرمندہ ہوتا ہے اس کو اپنی غلطی ماننے میں دیر نہیں لگتی۔ وہ غلط سمت سے لوٹ کر فوراً صحیح سمت میں چلنے لگتا ہے۔

مومن وہی ہے جو غلطی کر کے پلٹ آئے۔ جو غصہ ہونے کے بعد معاف کر دے۔ عزت کا سوال جس کو اعتراف سے روکنے والا ثابت نہ ہو۔ اس کے برعکس جس کا حال یہ ہو کہ وہ غلطیوں میں لپٹا رہے۔ کسی سے ایک بار رنجش ہو جائے تو اس کو معاف کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ جو کسی حال میں اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اقرار نہ کرے۔ ایسا شخص اللہ کی نظر میں مومن نہیں ہے، خواہ وہ اپنے کو کتنا ہی بڑا مسلمان سمجھتا ہو، خواہ اس نے ایمان و اسلام کے کتنے ہی تمغے اپنے اوپر لگا رکھے ہوں۔

موجودہ دنیا میں آدمی اپنی غلطی کو ماننا نہ چاہے تو اس کو اپنی غلطی کی تاویل کے لئے بہت سے الفاظ مل جاتے ہیں۔ کسی کے لئے اس کی دنیوی شان و شوکت اس کی برائیوں کا پردہ بن جاتی ہے۔ مگر آخرت میں کوئی چیز کسی کے کام نہ آئے گی۔ وہاں حقیقتیں اس طرح کھل جائیں گی کہ اندھے بھی ان کو دیکھنے لگیں۔

اوپر اٹھ کر سوچنا

جب تیز ہواؤں کا طوفان آتا ہے تو کم زور بازوؤں والی چھوٹی چڑیاں اس کے اندر گھر کر رہ جاتی ہیں۔ مگر جو بڑی چڑیاں ہوتی ہیں وہ اپنے مضبوط بازوؤں کے ساتھ اڑ کر اوپر چلی جاتی ہیں اور اس طرح وہ طوفان کی زد سے باہر نکل جاتی ہیں۔ اسی واقعہ کی روشنی میں انگریزی مثل ہے دی بگ برڈ آف دی اسٹارم (طوفان کی بڑی چڑیا) یہ مثل اس وقت بولی جاتی ہے جب کہ کوئی شخص حالات کے گھراؤ کو توڑ کر باہر نکل جانے میں کامیاب ہو گیا ہو۔

اسی طرح سوچنے کی بھی دو سطحیں ہوتی ہیں۔ کچھ لوگوں کی سوچ ان کے قریبی حالات کے زیر اثر بنتی ہے۔ جن معاملات میں وہ گھرے ہوئے ہیں ان سے الگ ہو کر وہ سوچ نہیں پاتے۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جو "طوفان کی بڑی چڑیا" کی طرح اپنے قریب کے حالات سے اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ وہ حالات سے متاثر ہو کر نہیں سوچتے بلکہ حالات سے بلند ہو کر اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔

مومن کی سوچ بڑی چڑیا کے انداز کی سوچ (بگ برڈ تھنکنگ) ہوتی ہے۔ وہ حالات سے اوپر اٹھ کر جیتا ہے۔ وہ تکلیفوں میں بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ وہ مشکل حالات میں بھی دین پر جمنے والا ہوتا ہے۔ وہ شکایتوں کے باوجود لوگوں سے خیر خواہی اور انصاف کا معاملہ کرتا ہے۔ وہ حالات کی پیداوار نہیں ہوتا بلکہ حالات سے الگ اپنی شخصیت بناتا ہے۔ وہ طوفانوں سے باہر زندگی گزارتا ہے نہ کہ ان کے اندر۔

غیر مومن ردعمل کی نفسیات میں جیتا ہے اور مومن مثبت نفسیات میں۔ غیر مومن دوسروں کی تخریب میں اپنی تعمیر کا راز سمجھتا ہے اور مومن خود اپنے امکانات کو بروئے کار لانے میں۔ غیر مومن دنیا کا غم لئے ہوئے ہوتا ہے اور مومن آخرت کا غم۔ غیر مومن کا دل انسانوں میں اٹکا ہوا ہوتا ہے اور مومن کا دل صرف اللہ میں۔

اپنی غلطی کو جانئے

"کچھ لوگ گویا کہ عجیب ہوتے ہیں" ایک شخص نے کہا "گویا کہ ان کا ایک تکیۂ کلام بن جاتا ہے۔ گویا کہ وہ اس کو گویا کہ بار بار دہراتے رہتے ہیں۔ گویا کہ ۔۔۔" مذکورہ بزرگ اسی طرح اپنی گفتگو میں "گویا کہ" کا لفظ بار بار دہراتے رہے جو ان کا اپنا تکیہ کلام تھا۔ وہ نہایت اطمینان کے ساتھ دوسروں پر یہ تنقید کر رہے تھے کہ وہ اپنا ایک تکیہ کلام بنا لیتے ہیں اور اس کو بے موقع دہراتے رہتے ہیں۔ مگر خود اپنے بارہ میں ان کو ذرا بھی یہ احساس نہ تھا کہ انھوں نے بھی اپنا ایک تکیہ کلام بنا رکھا ہے جس کو وہ اپنی گفتگو میں بلا ضرورت بار بار دہراتے رہتے ہیں۔ ان کو دوسروں کی غلطی کی خبر تھی مگر اپنی غلطی سے وہ بالکل ناواقف تھے۔

یہ انسان کی عام کمزوری ہے۔ وہ دوسروں کی غلطیوں کو انتہائی باریک بینی کے ساتھ جانتا ہے۔ دوسروں کا معاملہ ہو تو وہ ان کی کوتاہیوں کے چھپے ہوئے گوشوں تک کو پالیتا ہے۔ مگر جب معاملہ اپنا اور اپنے متعلقین کا ہو تو وہ ایسا بے خبر ہو جاتا ہے جیسے وہ کچھ جانتا ہی نہیں۔ مگر خدا کے یہاں جو چیز کام آئے گی وہ اپنی غلطیوں کو جاننا ہے نہ کہ دوسروں کی غلطیوں کا ماہر بننا۔ جو شخص دوسروں کی غلطیوں کو جانے مگر اپنی غلطیوں کو نہ جانے وہ صرف اللہ کے سامنے یہ حجت قائم کر رہا ہے کہ اس کو اتنی سمجھ تھی کہ وہ اپنی غلطیوں کو جان لے مگر اس کی سرکشی نے اس کو اندھا بہرا بنا دیا۔ آنکھ رکھتے ہوئے اس نے نہ دیکھا اور کان رکھتے ہوئے اس نے نہ سنا۔ ایسے آدمی کے لئے خدا کے یہاں سخت سزا کے سوا اور کچھ نہیں۔

انسان کے اندر اللہ نے برائی اور بھلائی کی پہچان رکھی ہے تاکہ وہ جہنم کے راستہ سے بچے اور جنت کے راستہ کا مسافر بنے۔ مگر جس آدمی کا یہ حال ہو کہ وہ خود خلاف حق باتوں میں مبتلا ہو اور دوسروں کو حق کی تلقین کرے، اس نے اپنی پہچان کو صرف اپنے جہنمی سفر کو تیز تر کرنے میں استعمال کیا۔ کیونکہ اس قسم کی تلقین صرف ایک جرم ہے نہ کہ کوئی حقیقی عمل۔

مومن کی دولت

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو خوش خبری دے دو کہ ایک دن آئے گا کہ اس مال پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی۔ پھر اس سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا (توبہ ۳۵) یہ آیت اتری تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے کہا اب ہم کون سا مال جمع کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کی بابت سوال کیا۔ آپ نے فرمایا:

لیتخذ احدکم قلبا شاکراً ولسانا ذاکراً وزوجة مومنة تعین احدکم علیٰ امر الآخرة (ابن ماجہ)

تم میں سے ہر شخص شکر کرنے والا دل اور یاد کرنے والی زبان کو اپنائے اور مومن بیوی کو جو آخرت کے معاملہ میں اس کی مدد کرے۔

دولت وہی ہے جو زندگی کے مسائل میں کام آئے۔ مومن کے لئے سب سے بڑا مسئلہ آخرت کا مسئلہ ہوتا ہے، اس لئے وہ اسی چیز کو دولت سمجھتا ہے جو آخرت میں کام آنے والی ہو۔ آخرت میں جو چیز آدمی کے کام آئے گی وہ یہ کہ دنیا میں وہ اس طرح رہے کہ ہر حال میں وہ اللہ کا شکر کرنے والا ہو۔ اس کا دل اس طرح اللہ میں اٹکا ہوا ہو کہ ہر وقت اس کو اللہ کی یاد آتی رہے۔ جو شخص اپنے لئے آخرت والی زندگی پسند کرے وہ اپنی زندگی کا ساتھی بھی کسی آخرت پسند کو بنائے گا۔ ایسے آدمی کے لئے ایسی ایک بیوی بہت بڑی دولت ہے جو دنیا کے بجائے آخرت کو چاہتی ہو۔ جو اس کو دنیا کی وقتی چیزوں کی طرف کھینچ کر نہ لے جائے بلکہ اس کو آخرت کی طرف چلنے میں مدد دے۔

لوگ سونا چاندی کو دولت سمجھتے ہیں۔ مگر مومن کی دولت خدا ہے۔ وہ ان چیزوں کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے جو اس کو خدا سے قریب کرنے والی ہوں۔ جو بعد کو آنے والی دنیا میں اس کو خدا کی رحمتوں کا مستحق بنائیں۔

معاش کا مسئلہ

معاش مومن کی زندگی کا مقصد نہیں، اس کی زندگی کی ضرورت ہے۔ مقصد کے درجہ میں مومن کے سامنے آخرت ہوتی ہے اور ضرورت کے درجہ میں دنیا۔ معاش کے سلسلے میں غیر مومن کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ "زیادہ سے زیادہ حاصل کرو" اس کے برعکس مومن کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ "جو کچھ حاصل کرو جائز طریقہ سے حاصل کرو" غیر مومن کے لئے معاش اس کے حوصلوں اور تمناؤں کی تکمیل کے لئے ہوتی ہے اور مومن کے لئے خود کفیل زندگی کے لئے۔ غیر مومن دنیا میں جیتا ہے اور دنیا ہی میں اپنی پوری قیمت حاصل کر لینا چاہتا ہے۔ مگر مومن آخرت میں جیتا ہے اور آخرت میں لینا چاہتا ہے جو کچھ لینا چاہتا ہے۔ دنیا اس کے لئے عمر کی مدت پوری کرنے کی جگہ ہوتی ہے اور آخرت اس کے لئے اپنی تمناؤں کو پانے کی جگہ۔

معاش ہر آدمی کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ کوئی شخص معاش کی جد و جہد سے خالی نہیں ہو سکتا۔ مگر اسلام اس کو ضرورت کے درجہ میں رکھتا ہے نہ کہ مقصد کے درجہ میں۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ معاش کا حصول بذات خود آدمی کا مطلوب و مقصود نہ بن جائے۔ معاشی سرگرمیوں کے درمیان بھی اس کا دل اللہ میں اٹکا ہوا ہو، اس وقت بھی اللہ ہی اس کی یادوں کا سرمایہ بنا ہوا ہو۔

غیر مومن کے پاس دولت آتی ہے تو وہ اس سے اپنے معیار زندگی کو بڑھاتا ہے۔ مومن کے پاس دولت آتی ہے تو وہ ضرورت کے بقدر اس میں سے لے کر بقیہ کو خدا کے کام میں دے دیتا ہے۔ غیر مومن کے پاس دولت کا مصرف یہ ہے کہ وہ اپنی دنیا کے مستقبل کو بنائے اور مومن کے پاس دولت کا مصرف یہ ہے کہ وہ اس کو اپنی آخرت کی تعمیر میں خرچ کرے۔ معاش کا حصول ہر ایک کے لئے ضروری ہے۔ مگر مومن جائز طریقہ سے حاصل کرتا ہے اور جو کچھ ملتا ہے اس پر قناعت کرتا ہے۔ مگر غیر مومن بے قید طور پر حاصل کرتا ہے اور کبھی حرص سے خالی نہیں ہوتا۔

تعلیم

علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک علم وہ ہے جو قرآن وحدیث کی صورت میں مرتب ہو کر ہمارے پاس موجود ہے۔ دوسرا علم وہ ہے جس کو انسان اپنی تلاش اور محنت سے بناتا ہے۔ پہلا علم آدمی کو اس کے خدا کی پہچان کراتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ مرنے کے بعد جب آدمی آخرت کی مستقل دنیا میں پہنچے گا تو وہاں اس کو کس قسم کے معاملات سے سابقہ پیش آئے گا اور ان معاملات کے اعتبار سے اس کو اپنی موجودہ زندگی میں کس قسم کی تیاری کرنا چاہئے۔ دوسرا علم یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں ہمارے جو مادی اور معاشی مسائل ہیں ان کو کس طرح حل کیا جائے۔

مسلمان کو یہ دونوں علم سیکھنا ہیں۔ اس کو علم دین بھی جاننا چاہئے اور علم دنیا بھی۔ البتہ دونوں کا درجہ الگ الگ ہے۔ قرآن وحدیث کا علم حاصل کرنا مسلمان کی زندگی کا مقصد ہے۔ اور دوسرے علوم کو سیکھنا مسلمان کی دنیوی ضرورت۔ قرآن وحدیث کی باتوں کو جانے بغیر کوئی شخص صحیح معنوں میں مسلمان نہیں ہو سکتا۔ وہ اس سے باخبر نہیں ہو سکتا کہ آخرت کی کامیابی کے لئے اس کو موجودہ زندگی میں کیا کرنا چاہئے۔ مگر دنیوی علوم کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ دنیا میں پیش آنے والے مادی معاملات میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ مثلاً کھیتوں سے اچھی فصل کس طرح اگائی جائے، کارخانوں سے ضروریات زندگی کے سامان کس طرح بنائے جائیں۔ شہروں کی تعمیر میں کن قواعد کا لحاظ کیا جائے، وغیرہ۔ قرآن وحدیث کا علم آدمی کو آخرت کی ابدی زندگی کی تعمیر کی راہ بتاتا ہے اور دوسرے علوم دنیا کی موجودہ زندگی کی تعمیر کی راہوں سے باخبر کرتے ہیں۔

مختلف قسم کے علوم کو سیکھنا مسلمان کے لئے بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا غیر مسلمان کے لئے۔ البتہ مسلمان مقصد اور ضرورت میں فرق کرتا ہے۔ قرآن وحدیث کا علم حاصل کرنے میں اس کا جذبہ دوسرا ہوتا ہے اور دوسرے دنیوی علوم کو حاصل کرنے میں دوسرا۔

مسجد

ایک سیاح نے لکھا ہے کہ میں نے دنیا کے مختلف حصوں کا سفر کرنے کے بعد جو چیزیں نوٹ کیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ دیگر قوموں کے یہاں کثرت سے پرانے قلعے ہر جگہ کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر مسلم ممالک میں حیرت انگیز طور پر فوجی قلعے بہت کم ہیں۔ البتہ مسلم بستیاں مسجد کے اونچے اونچے میناروں سے بھری ہوئی ہیں۔ یہ واقعہ مسلمان اور غیر مسلمان کے مزاجی فرق کو بتاتا ہے۔ غیر مسلم کا اعتماد تمام تر اپنی تدبیروں پر ہوتا ہے۔ اور مسلمان کا اعتماد تمام تر اللہ پر۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم قوموں نے اپنے تحفظ اور استحکام کے لئے اونچی دیواروں والے قلعے کھڑے کئے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کو جہاں جہاں غلبہ حاصل ہوا انھوں نے خدا کے گھر تعمیر کئے۔ بلند و بالا قلعے اگر بزبان حال یہ کہہ رہے تھے کہ "میں بڑا ہوں" تو مسجدوں کے اوپر کھڑے ہو کر انھوں نے اپنی نسلوں اور دنیا کی آبادیوں کو یہ پیغام سنایا کہ "اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے"

مسجد کی حیثیت کسی مقام کے مسلمانوں کے لئے وہی ہے جو کعبہ کی حیثیت ساری دنیا کے سلمانوں کے لئے۔ کعبہ اہل اسلام کا عالمی دینی مرکز ہے اور مسجد اہل اسلام کا مقامی دینی مرکز۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہاں ایک طرف کعبہ کو قبلہ (بقرہ ۱۴۴) کہا گیا ہے، وہیں مقامی مساجد کے لئے بھی یہی لفظ (واجعلوا بیوتکم قبلۃ، یونس) استعمال کیا گیا ہے۔ نماز مومنانہ زندگی کی علامت ہے۔ خدا کا گھر اسی علامت کو قائم کرنے کے لئے ہے۔ مقامی طور پر ہر بستی میں اور بین اقوامی طور پر مرکز اسلام حجاز میں۔

مسجد میں مسلمان روزانہ پانچ وقت باجماعت نماز ادا کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ مسجد فطری طور پر مسلمانوں کا دینی مرکز ہے، اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ مسجد کو مسلم آبادی کے درمیان میں بنایا جائے (وان تُبن فی الدور) مسجد اپنے ماحول اور اپنی سرگرمیوں کے اعتبار سے اس بات کا پیغام ہے کہ خدا کے بندو، عبادت ایک اللہ کے لئے ہے۔ سب مل کر اسی ایک اللہ کے عبادت گزار بن جاؤ۔

اسلام اور کفر

اسلام کا مطلب ہے ماننا اور کفر کا مطلب ہے انکار کرنا۔ انسان بظاہر دنیا میں آزاد ہے کہ جو چاہے بولے اور جو چاہے کرے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز خدا کی ہے۔ کسی کے پاس جو کچھ ہے سب اسی کا دیا ہوا ہے۔ یہاں خدا کے سوا کسی کو کوئی طاقت حاصل نہیں۔ خدا ہر وقت انسان کو پکڑنے اور اس کو سزا دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ اسلام یہ ہے کہ آدمی اس حقیقتِ واقعہ کو مان لے اور اپنی زندگی اس کے مطابق گزارے۔ اس کے مقابلہ میں کفر یہ ہے کہ آدمی اس حقیقتِ واقعہ کو نہ مانے اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق بنانے کے لئے تیار نہ ہو۔

آگ جل رہی ہو تو آدمی یہ اختیار رکھتا ہے کہ اس کے اندر اپنا ہاتھ ڈال دے۔ مگر اختیار کے باوجود وہ آگ کے اندر اپنا ہاتھ نہیں ڈالتا۔ یہی حقیقتِ واقعہ کا اعتراف ہے۔ دنیا میں اگرچہ بظاہر آدمی کو پوری آزادی حاصل ہے۔ مگر یہ آزادی صرف جانچ کے لئے ہے۔ خدا انسان کو آزادی دے کر یہ جانچنا چاہتا ہے کہ وہ آزادی پا کر سرکشی کرتا ہے یا حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کر کے خدا کے آگے جھک جاتا ہے۔ جو شخص خدا کی خدائی کو تسلیم کر کے اپنی زندگی کو حقیقت کے مطابق بنائے، اس نے اسلام قبول کیا۔ ایسے شخص کے لئے خدا کے ابدی انعامات ہیں۔ اس کے برعکس جو شخص اس حقیقت کو نہ مانے اور خدا کو اپنا آقا اور اپنے آپ کو اس کا بندہ بنانے پر راضی نہ ہو اس نے کفر کیا۔ ایسے شخص کو خدا فیصلہ کے دن سخت سزا دے گا۔

جو شخص اسلام کا طریقہ اختیار کرے اس کی پوری زندگی بدل جاتی ہے۔ اس کی سوچ صحیح ترین سوچ ہوتی ہے، کیونکہ وہ حقیقت واقعہ پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کا عمل صحیح ترین عمل ہوتا ہے کیونکہ وہ حقیقتِ واقعہ کے مطابق ہوتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ اس کا سلوک صحیح ترین سلوک ہوتا ہے کیونکہ وہ حقیقتِ واقعہ کو سامنے رکھ کر قائم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کافر ہر معاملہ میں حقیقتِ واقعہ کے خلاف چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا انجام کامل بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

بندہ اور خدا کا معاملہ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور جب میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو کہہ دو کہ میں قریب ہوں۔ پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ پس چاہئے کہ وہ میری پکار کا جواب دیں اور میرے اوپر یقین رکھیں تاکہ وہ فلاح حاصل کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا اور بندے کا معاملہ دوطرفہ معاملہ ہے۔ بندہ وہ چیز دیتا ہے جو اس کے پاس ہے، اس کے بعد خدا اس کو وہ چیز دیتا ہے جو خدا کے پاس ہے۔ بندہ اپنے خدا کو معرفت اور تقویٰ اور شکر کا تحفہ پیش کرتا ہے۔ اس کے جواب میں خدا اس کے لئے رشد (فلاح) کا فیصلہ کرتا ہے (بقرہ)

آدمی کے سامنے ایک معاملہ آتا ہے جس میں بیک وقت دو امکانات ہوتے ہیں۔ ایک شریعت اور اخلاق کے مطابق، دوسرا شریعت اور اخلاق کے خلاف۔ ایسے موقع پر خدا کی پکار کا جواب دینا یہ ہے کہ آدمی خدا کے دئے ہوئے علم کے مطابق صحیح کو پکڑ لے خواہ وہ بظاہر مشکل ہو اور غلط کو چھوڑ دے خواہ وہ بظاہر آسان ہو۔

آدمی کے سامنے بار بار ایسے مواقع آتے ہیں جب کہ وہ ایسے مقام پر کھڑا ہوتا ہے کہ وہ یا تو ظلم اور بے انصافی کرے یا حق اور انصاف سے کام لے۔ ایسے موقع پر خدا کی پکار کا جواب دینا یہ ہے کہ آدمی ظلم اور ناانصافی سے بچے اور اپنے کو حق اور انصاف کے طریقے پر قائم رکھے۔

دنیا میں آدمی کو اپنے وجود کے اندر اور وجود کے باہر جو کچھ ملا ہے اس کو وہ اتفاق کا نتیجہ یا اپنے دست و بازو کی کمائی بھی سمجھ سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کرتے ہوئے ہر چیز کو خدا کی چیز سمجھے۔ اس لئے جب آدمی کو کوئی چیز ملے تو خدا کی پکار کا جواب دینا یہ ہے کہ اس وقت آدمی کہہ اٹھے کہ خدایا تو ہی دینے والا ہے اور تو ہی نے سب کچھ دیا ہے —— بندہ جب اس طرح اپنے دماغ اور دل کا نذرانہ خدا کے سامنے پیش کر دے تو خدا اس کے لئے رُشد کا فیصلہ کر دیتا ہے، جس کا مطلب ہے دنیا میں صالح زندگی اور آخرت میں ابدی جنت۔

دعا کیوں قبول نہیں ہوتی

لوگوں نے ایک بزرگ سے پوچھا: کیا وجہ ہے کہ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں اور ہماری دعا قبول نہیں ہوتی۔ بزرگ نے جواب دیا: اس لئے کہ آپ لوگ خدا سے وہ چیز مانگتے ہیں جو آپ دوسرے انسانوں کو دینے کے لئے تیار نہیں۔ آپ خدا سے مانگتے ہیں کہ وہ آپ کو ظالموں کے ظلم سے بچائے۔ مگر آپ میں سے ایک شخص کو جب کسی کے اوپر غلبہ حاصل ہوتا ہے تو وہ اس کو اپنے ظلم کا مزہ چکھانے سے باز نہیں رہتا۔ آپ خدا سے جان و مال کی امان مانگتے ہیں مگر آپ میں سے ایک شخص کو جب موقع ملتا ہے تو وہ اپنے بھائی کے جان و مال کو اپنے لئے جائز کر لیتا ہے۔ آپ خدا سے باعزت زندگی مانگتے ہیں مگر آپ میں سے ایک شخص اگر کسی کے اوپر قابو پالے تو وہ اس کو بے عزت کر کے خوش ہوتا ہے۔ آپ خدا سے مانگتے ہیں کہ وہ آپ کو دشمن قوموں کی سازش سے بچائے مگر آپ میں سے ایک شخص کو اگر کسی سے اختلاف ہو جائے تو اس کو اکھاڑنے کے لئے وہ ہر قسم کی سازشیں کرنا شروع کر دیتا ہے۔

دعا کی قبولیت کی لازمی شرط یہ ہے کہ آدمی دعا مانگنے میں سنجیدہ ہو۔ اس کی دعا اس کی پوری ہستی کی پکار ہو نہ کہ محض زبان کی حرکت سے نکلے ہوئے الفاظ۔ جب آدمی سنجیدہ ہو تو اس کی زندگی تضاد سے خالی ہو جاتی ہے۔ اس کی دعا میں اور اس کے عمل میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اگر ایک شخص فی الواقع ظلم کو ناپسند کرتا ہے اور دوسرے آدمی کے ظلم کو قابل شکایت سمجھ رہا ہے تو ناممکن ہے کہ وہ خود اپنے دائرے میں ظالم بن جائے۔ اپنے دائرہ اختیار میں ظلم کرنا اور دوسرے کے ظلم پر احتجاج کرنا ایسا تضاد ہے جو ثابت کرتا ہے کہ آدمی اپنے کہنے میں سنجیدہ نہیں ہے، وہ قول بلا فعل (صف) کی سطح پر ہے۔ اور جو شخص قول بلا فعل کی سطح پر ہو اس کی دعا اس کے منہ پر مار دی جاتی ہے نہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت کا شرف حاصل کرے۔ ایک شخص لوگوں کو باہم لڑاتا پھرتا ہو اور خدا سے دعا کرے کہ "خدایا لوگوں کو متحد کر دے"، تو یہ اللہ کی نظر میں دعا نہیں ہے بلکہ ایک مذاق ہے جو دعا کرنے والے کو صرف سزا کا مستحق بناتی ہے۔ دعا کی قبولیت کے لئے ضروری ہے کہ آدمی بندوں کو وہی دے رہا ہو جو وہ خدا سے اپنے لئے مانگ رہا ہے۔ اس سے دوسروں کو وہی رحمت و عنایت ملے جس رحمت و عنایت کی درخواست وہ خدا سے اپنے لئے کر رہا ہے۔ اس کے بغیر دعا ایک جرم ہے نہ کہ حقیقۃً اللہ کے سامنے پیش کی جانے والی درخواست۔

دین کیا ہے

فہرست

دین کیا ہے

دین کے معنی ہیں ذلیل ہونا، فرماں برداری کرنا۔ قومٌ دینٌ : فرماں بردار لوگ۔ حدیث میں ہے۔ الکیس من دان نفسہ وعمل لما بعد الموت (عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کو زیر کرے، اور موت کے بعد کے لئے عمل کرے) دین اسلام سے مراد زندگی گزارنے کا وہ طریقہ ہے جس میں آدمی اپنے آپ کو خدا کے آگے جھکائے ہوئے ہو۔ وہ خدا کا ایسا تابعدار بن جائے کہ اس کے جذبات و احساسات تک خدا کے آگے بچھ جائیں۔ نفسیاتی سطح پر دین جس چیز کا نام ہے، مندرجہ ذیل آیت اس کی مکمل تفسیر پیش کر رہی ہے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ لِيَكْفُرُوْا بِمَا اٰتَيْنٰهُمْ وَلِيَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ

عنکبوت ۶۴-۶۶

دنیا کی زندگی تو کھیل تماشا ہے اور اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے اگر وہ اس کو جانیں۔ پھر جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو وہ اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر کے اس کو پکارنے لگتے ہیں اور جب وہ ان کو بچا کر خشکی پر لاتا ہے تو فوراً ہی شرک کرنے لگتے ہیں۔ تاکہ اللہ کے دیئے ہوئے پر کفر کریں اور فائدہ اٹھائیں۔ عنقریب وہ جان لیں گے۔

جب آدمی کی کشتی سمندر میں ہوتی ہے اور موجوں کے درمیان گھر جاتی ہے۔ آدمی اپنے آپ کو بالکل بے یار و مددگار محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا وجود مکمل طور پر خدا کے اوپر منحصر ہے۔ اپنی بے بسی کے سوا اس وقت اس کو کچھ یاد نہیں رہتا۔ وہ دل و جان سے خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ اپنے پورے وجود کے ساتھ وہ خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ مگر جب وہ سمندر کی لہروں سے بچ کر نکل آتا ہے اور خشکی پر پہنچ جاتا ہے تو تو اس کا حال بالکل دوسرا ہو جاتا ہے۔ اب وہ دنیوی چیزوں میں گم ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی عاجزانہ حیثیت کو بھول جاتا ہے۔ اور کبر و انانیت کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔ خدا اور آخرت کے بجائے دنیا اور دنیا کے مشاغل اس کی دلچسپیوں کا مرکز بن جاتے ہیں ـــــ پہلی حالت دین داری کی حقیقت کو بتا رہی ہے اور دوسری حالت بے دینی کی حقیقت کو۔ گویا دین یہ ہے کہ آدمی کا نفسیاتی وجود پوری طرح خدا کے آگے جھک گیا ہو۔ وہ خدا کو اپنا سب کچھ سمجھنے لگا ہو۔ اس کے مقابلہ میں بے دینی یہ ہے کہ آدمی کے اندر ڈھٹائی ہو۔ آج کی دنیا میں گم ہو کر وہ کل کی دنیا کو بھول جائے۔

دین کی اس حقیقت کو مزید واضح کرنے کے لئے یہاں قرآن کے چند حوالے درج کئے جاتے ہیں:

(یوسف نے کہا، میں نے ان لوگوں کا دین چھوڑ دیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ اور میں نے اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کا دین اختیار کیا ہے۔ ہمارے لئے روا نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر۔ مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اے قیدخانہ کے ساتھیو،

بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا اللہ اکیلا زبردست۔ اللہ کو چھوڑ کر تم جن کی عبادت کرتے ہو وہ تو بس نام ہیں کہ تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں۔ اللہ نے ان کی کوئی سند نہیں اتاری۔ حکم دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔ اس نے فرمادیا ہے کہ اس کے سوا تم کسی کی عبادت نہ کرو۔ یہی درست دین ہے۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (یوسف)

اور اہل کتاب واضح بیان آنے کے بعد متفرق ہو گئے۔ حالاں کہ ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی عبادت کریں اسی کے لئے دین کو خالص کرتے ہوئے۔ بالکل یک سو ہو کر۔ اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اور یہی ہے درست دین۔ (بینہ ۵-۴)

تم سیدھا رکھو اپنا منھ دین کی طرف یک سو ہو کر۔ وہی فطرت اللہ کی جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ بدلنا نہیں اللہ کے بنائے ہوئے کو۔ یہی ہے درست دین۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اللہ کی طرف رجوع ہو کر اس سے ڈرتے رہو۔ اور نماز قائم کرو اور شرک کرنے والوں میں نہ ہو جاؤ جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرلیا اور گروہوں میں بٹ گئے۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے (روم ۳۲-۳۰)

ان آیات کے مطابق دین نام ہے اللہ کو دل سے ماننے کا۔ ہر قسم کے شرک سے بچنے کا۔ آخرت کو اپنی منزل مقصود بنانے کا۔ اللہ کا شکر گزار بن جانے کا، اللہ کو سارے اختیارات کا مالک جاننے کا، صرف اسی کی عبادت کرنے کا، نماز روزہ کی ادائگی کا، خدا کی طرف یکسو ہونے کا، فرقہ بندیوں سے بچنے کا۔ اپنے خود ساختہ دین پر مگن رہنے کے بجائے اللہ اور رسول کے دین کو پکڑنے کا۔ ان کیفیات و اعمال کے ساتھ جو زندگی بنے، وہی دینی زندگی ہے اور مختلف معاملات میں ان کیفیات و اعمال سے مطابقت رکھنے والا جو رویہ ابھرے وہی دینی رویہ ہے۔ گویا دین یہ ہے کہ آدمی مکمل طور پر خدا کا ہو جائے۔ اس کے سوا کوئی اور چیز اس کی عقیدت اور اعتماد کا مرکز نہ رہے۔

ارکان خمسہ

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ دین اسلام کے ارکان پانچ ہیں: کلمہ توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔

دین میں داخلہ جہاں سے شروع ہوتا ہے، وہ کلمہ کا اقرار ہے: لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ اس کلمہ میں دو باتیں ہیں۔ اللہ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت۔ یعنی خدائی کی تمام اوصاف کے ساتھ اللہ ہی کو خدا ماننا۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا وہ مستند نمائندہ ماننا جس سے حقیقت کی معرفت اور خدا کی مرضیات کا علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ کلمہ کوئی لفظی منتر نہیں ہے جس کا صرف لسانی تلفظ کرلینا کافی ہو۔ یہ ایک سنجیدہ فیصلہ کا اعلان ہے۔ یہ ایک طرف اپنے آقا خدا، اور دوسری طرف اپنے رہنما رسول کو پالینے کا اظہار ہے۔ یہ پوری زندگی کا عہد نامہ ہے جو بندہ اپنے خدا کو گواہ بنا کر کرتا ہے۔ اسی لئے قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک ایمان وہی ہے جو داخل القلب ایمان (حجرات) ہو۔ محض زبان سے ان الفاظ کو بول دینا خدا کے یہاں معتبر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں بہت سی ایسی چیزوں کو

"ایمان" میں شمار کیا گیا ہے جن کا تعلق بظاہر عمل سے ہے۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے۔ خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے جس کی شرارتوں سے اس کا پڑوسی امن میں نہ ہو۔"
کلمہ کا اقرار اگر ایک سنجیدہ فیصلہ کے طور پر ظہور میں آئے تو وہ آدمی کی پوری زندگی میں روح بن کر شامل ہو جائے گا۔ بصورت دیگر اس کی حیثیت ایک ایسے لفظی ضمیمہ کی ہو گی جس کا آدمی کی حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔

اس اقرار کے بعد سب سے پہلا فریضہ نماز ہے۔ نماز اسلام کی سب سے اہم عبادت ہے۔ اللہ نے اپنے بندوں پر روزانہ پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں۔ ہر نماز سے پہلے ہاتھ منھ اور پاؤں دھوئے جاتے ہیں جس کو وضو کہتے ہیں۔ نماز میں مختلف آداب اور کلمات اور دعاؤں کو ادا کرتے ہوئے بندہ اپنے مالک کے آگے جھکتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنا سر زمین پر رکھ دیتا ہے۔ وہ خدا کی بڑائی کے مقابلہ میں اپنے چھوٹے ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ اُس کے ساتھ اپنی بندگی کے تعلق کو جوڑتا ہے۔ قیام اور رکوع اور سجدہ گویا خدائی کے سامنے اپنی بندگی کا عملی اعتراف ہے۔ اس طرح بندہ اپنے آپ کو اس مقام عبدیت پر لے جاتا ہے جہاں اس کا خدا اس سے ملاقات کر سکے۔ بندہ اپنے رب کو عجز کی سطح پر پاتا ہے نہ کہ کبر اور انانیت کی سطح پر۔

روزہ سال میں ایک مہینہ کے لئے ماہ رمضان میں فرض کیا گیا ہے۔ روزہ کا وقت ابتدائے سحر سے شروع ہوتا ہے اور سورج ڈوبنے تک رہتا ہے۔ اس دوران میں کھانا پینا مطلق چھوڑ دیا جاتا ہے۔ قرآن کے مطابق روزہ اس لئے فرض کیا گیا ہے کہ بندہ کے اندر تقویٰ اور شکر (بقرہ) کی کیفیت پیدا ہو۔ کھانا اور پانی آدمی کی سب سے بڑی ضرورتیں ہیں۔ جب پیاس سے آدمی کا حلق سوکھ جاتا ہے۔ جب بھوک سے آدمی کا سینہ کھرچنے لگتا ہے اس وقت اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنا کمزور ہے اور خدا کی مدد کا کتنا زیادہ محتاج ہے۔ یہ تجربہ اس کو اللہ کی عظمت اور اس کے مقابلہ میں اپنے عجز کا احساس دلاتا ہے جو کہ تقویٰ کا حاصل ہے۔ پھر شام کو جب وہ کھانا کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے تو وہ اس بات کا تجربہ کرتا ہے کہ اس کے خدا نے کتنی مکمل صورت میں اس کی ضرورتوں کا انتظام کر رکھا ہے۔ اس کا دل احسان مندی کے جذبات سے بھر جاتا ہے۔ اس کی زبان پر حمد اور شکر کے کلمات جاری ہو جاتے ہیں۔

زکوٰۃ مال اور پیداوار میں خدا کا حق ہے۔ ہم دنیا میں جو کچھ کماتے ہیں خواہ وہ مویشی اور زمین کے ذریعہ ہو یا کارخانہ اور دکان کے ذریعہ یا ملازمت اور مزدوری کے ذریعہ، اس میں "ہمارا" حصہ بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ ہمارے اندرونی نظام سے لے کر کائنات تک بے شمار اسباب جب ہماری موافقت میں اکٹھا ہوتے ہیں تب ہم کوئی کمائی کر پاتے ہیں۔ یہ اسباب براہ راست مالک ارض و سما کی طرف سے فراہم کئے جاتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ سال کے آخر میں جب ہم اپنی کمائیوں کا حساب کریں تو اس کا ایک حصہ خدا کی راہ میں نکال کر اس واقعہ کا اعتراف کریں کہ یہ سب کچھ ہم کو خدا کی طرف سے ملا ہے۔ اگر وہ ہماری مدد پر نہ ہوتا تو ہم کسی قسم کی کوئی کمائی نہیں کر سکتے تھے۔ زکوٰۃ یا انفاق دراصل تعلق کی اس اعلیٰ کیفیت کا مظہر ہے جب کہ بندہ بے قرار ہو کر چاہنے لگتا ہے کہ اپنے آقا کے سامنے اپنے آپ کو خالی کر دے۔

اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ اہل ایمان جب کسی کو دے رہے ہوتے ہیں تو ان کی زبان حال پکار رہی ہوتی ہے: ہم تم سے کوئی بدلہ یا شکرانہ نہیں چاہتے۔ یہ تو ہم صرف اللہ کے لئے خرچ کر رہے ہیں۔ (انسان ۹)

حج ایک سالانہ عبادت ہے جو کسی شخص پر زندگی میں ایک بار کے لئے فرض ہے۔ یہ فرض بھی اس وقت ہے جب کہ وہ اپنے مقام سے سفر کر کے حجاز جانے اور وہاں سے واپس آنے پر قادر ہو۔ اور اس کے مواقع رکھتا ہو۔ بصورت دیگر اس پر حج فرض نہ ہوگا۔ حج کے مقامات وہ مقامات ہیں جہاں اسلام کی تاریخ بنی ہے۔ وہاں وہ جگہیں ہیں جہاں پیغمبروں نے خدا کی عبادت کی ہے۔ جہاں ان کی قربانیوں کی یادگاریں ہیں۔ جہاں سے شرک کو دائمی طور پر خارج کر دیا گیا ہے۔ وہ واحد مقام ہے جہاں تاریخ انسانی میں پہلی بار یہ واقعہ ہوا کہ دینیت کو مغلوب کر کے دین کو قیامت تک کے لئے غالب کر دیا گیا۔ ان آثار سے بھرے ہوئے جغرافیہ کو اس بات کے لئے منتخب کیا گیا ہے کہ ساری دنیا کے اہل اسلام ہر سال یہاں جمع ہوں اور سب مل کر اللہ کی عبادت کریں۔ اسلامی اتحاد کا سبق لیں۔ وہاں کی فضاؤں سے نیا ایمانی عزم اور نیا دینی شوق لے کر اپنے وطن کو لوٹیں۔ حج بتاتا ہے کہ کس طرح سارے انسانوں کو اللہ کے گرد جمع ہو جانا چاہئے۔

روزمرہ کی زندگی میں

مذکورہ پانچ ارکان قرآن کے الفاظ میں دین کے معلوم اور موقوت ارکان ہیں۔ مگر جب ایک شخص کی زندگی میں دین شامل ہوتا ہے تو وہ صرف متعین اوقات کے اعمال تک محدود نہیں رہتا وہ اس کی پوری زندگی میں رچ بس جاتا ہے۔ اس کے ہر رویہ سے اس کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ قرآن و حدیث سے اس سلسلے میں جو چیزیں معلوم ہوتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

پہلی چیز ذکر ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے رہو (آل عمران ۱۹۱) حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ تمہاری زبان کو ہر وقت ذکر الٰہی میں تر رہنا چاہئے (لا یزال لسانک رطبا من ذکر اللہ)۔

ذکر کے معنی یاد کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے خوف اور محبت کا تعلق اتنا بڑھا ہوا ہونا چاہئے کہ آدمی کو ہر وقت اس کی یاد آتی رہے۔ یہ ذکر وہ روحانی تار ہے جس کے ذریعہ سے کوئی بندہ اپنے رب سے دائمی ربط Constant touch میں رہتا ہے۔ کبھی دنیا میں اللہ کی کاریگری کو دیکھ کر وہ اللہ کی قدرت و کبریائی کا اعتراف کرتا ہے۔ کبھی اللہ کے احسانات کو یاد کر کے اس کا شکر ادا کرتا ہے۔ کبھی قیامت کی بازپرس کا خوف اس کو تڑپاتا ہے اور وہ اللہ سے بخشش طلب کرنے لگتا ہے۔ کبھی اپنے عجز کا احساس اس کو ابھارتا ہے کہ وہ اللہ سے رحمت و نصرت کی درخواست کرے۔ غرض اس کے حساس قلب میں ہر آن کوئی نہ کوئی ایسی شورش برپا رہتی ہے جو اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے اپنے رب کو پکارتا رہے۔ (اعراف ۲۰۵)

اس ذکر کا نہ کوئی نصاب ہے۔ نہ اس کے الفاظ مقرر ہیں اور نہ اس کی کوئی لگی بندھی صورت ہے۔ یہ تو خدا کی اس آفاقی دنیا میں غوطہ لگانا ہے جہاں تمام تعینات ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر اس کو متعین شکلوں میں محدود کس طرح

کیا جا سکتا ہے ـــــــ اللہ کو یاد کرتے ہوئے قرآن میں تدبر کرتے ہوئے۔ کائنات میں غور کرتے ہوئے، اپنا احتساب کرتے ہوئے، موت اور آخرت کو سوچتے ہوئے بار بار مومن کا جی بھر آتا ہے اور کبھی دل میں اور کبھی زبان سے اس کے اثرات ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی احساس اتنا شدید ہوتا ہے کہ الفاظ بھی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور اللہ کی یاد گرم گرم آنسوؤں کی صورت میں اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑتی ہے۔ یہ ہے ذکر اور یہ ذکر قرآن کے مطابق سب سے بڑی عبادت ہے (عنکبوت ۴۵)

دوسری چیز نُصح (خیر خواہی) ہے۔ اس کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الدین النصیحۃ (دین خیر خواہی کا نام ہے) مومن ہر قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے پاک ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے دل میں دوسرے انسانوں کے لئے خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ نفرت، بغض، حسد، کینہ اور انتقام سے اس کا سینہ خالی ہوتا ہے۔ وہ ہوا کی مانند ہوتا ہے جو سب کے درمیان سے ٹکرائے بغیر گزر جاتی ہے۔ وہ سورج کی مانند ہوتا ہے جو کسی امتیاز کے بغیر ہر ایک کے اوپر چمکتا ہے۔ وہ جڑیوں کی مانند ہوتا ہے جن کے دل میں کسی کے خلاف غصہ اور انتقام نہیں ہوتا۔ مومن خدا کا وہ بندہ ہے جو اپنے کو خدا سے ملا لے۔ وہ بندوں کو اس نظر سے دیکھنے لگتا ہے جس نظر سے لوگوں کا خالق انھیں دیکھ رہا ہے۔ ایسا شخص، حدیث کے الفاظ ہیں، اخلاق خداوندی کا پیکر بن جاتا ہے جس کو اپنے تمام بندوں سے یکساں پیار ہے نہ کہ شیطانی اخلاقیات کا جس کو صرف "اپنے لوگوں" سے دلچسپی ہوتی ہے۔ بقیہ انسانوں کے لئے اس کے پاس نفرت اور عداوت کے سوا اور کچھ نہیں۔

تیسری چیز قسط (انصاف) ہے۔ یعنی دوسروں کے ساتھ تعلقات اور معاملات میں ہمیشہ عدل و انصاف پر قائم رہنا۔ قرآن میں مسلمانوں کو انصاف کا حکم دیا گیا ہے (اعراف ۲۹) نیز فرمایا گیا کہ تم لوگ انصاف پر خوب قائم رہنے والے بنو (نساء ۱۳۵) جو چیزیں آدمی کو انصاف کے راستہ سے ہٹاتی ہیں، ان کی نشان دہی کر کے تاکید کی گئی ہے کہ تم لوگ کسی حال میں انصاف سے نہ ہٹو۔ آدمی تعلقات کے پاس ولحاظ میں انصاف سے ہٹ جاتا ہے۔ فرمایا کہ قرابت داری کا معاملہ ہو تب بھی عدل و انصاف پر قائم رہو (انعام ۱۵۲) ذاتی مفادات و خواہشات کبھی آدمی کو انصاف سے ہٹا دیتی ہیں۔ فرمایا کہ خواہش نفس کا تقاضا ہو تب بھی انصاف کی روش کو نہ چھوڑو (نساء ۱۳۵)۔ بغض اور نفرت میں آدمی انصاف کے حدود کو بھول جاتا ہے۔ فرمایا کہ کسی سے تمہاری دشمنی ہو جائے تب بھی تم اس کے ساتھ انصاف ہی کرو۔ کیونکہ یہی روش تقویٰ کے مطابق ہے (مائدہ ۸)

انصاف کا سب سے زیادہ آسان اور قطعی معیار، حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ آدمی دوسرے کے ساتھ وہی سلوک کرے جو وہ خود اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ حتیٰ کہ فرمایا کہ اس شخص کے اندر ایمان ہی نہیں جو اپنے لئے کچھ اور چاہے اور دوسرے کے لئے کچھ اور (لا یومن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ)

اشاعت دین

دین کسی دین دار کے اندر جو خصوصیات پیدا کرتا ہے، ان میں سے ایک ہے ـــــ دین کو دوسروں تک پہنچانا۔ اس پہنچانے کی دو صورتیں ہیں۔ قرآن میں ایک کو تذکیر اور دوسرے کو انذار (اعراف ۲) کہا گیا ہے۔ اول الذکر کا تعلق مسلمانوں سے ہے، دوسرے کا غیر مسلموں سے۔

تذکیر کے معنی ہیں یاد دلانا۔ اس سے مراد مسلمانوں کو نصیحت و موعظت کرنا ہے۔ مسلمان وہ لوگ ہیں جو دین کو قبول کئے ہوئے ہیں۔ ان کو دینی ذمہ داریوں سے باخبر کرنا، ان کو خود اپنے عہد کو یاد دلانا ہے۔ اسی لئے اس کو تذکیر کا نام دیا گیا ہے۔

تذکیر کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح (نساء ۱۱۴) ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس میں ان تمام آداب کو ملحوظ رکھا جائے جو اصلاحی مہم کو نتیجۃً فساد کی مہم نہ بنا دے ـــــ غلطی پر گرفت میں نرمی کا انداز (آل عمران ۱۵۹) اختیار کیا جائے نہ کہ سخت سست کہنے کا۔ سورہ نحل آیت ۱۲۵ میں بتایا گیا کہ مدعو سے جو بات کہی جائے حکمت کے ساتھ کہی جائے، یعنی دلائل و براہین کی زبان میں ہو نہ کہ محض تحکمانہ انداز میں۔ وہ موعظت حسنہ ہو، یعنی گفتگو میں شفقت اور دل سوزی کی روح بھری ہوئی ہو۔ وہ جدال احسن کے پیرایہ میں ہو، یعنی بحث میں تفہیم اور احقاق حق کا انداز ہو نہ کہ ایک دوسرے پر الزام لگانے اور نیچا دکھانے کا۔

تذکیر کا کام اگر حکمراں طبقہ پر انجام دینا ہو تو مسئلہ اور زیادہ نازک ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ غلط انداز تذکیر سے اگر حکمرانوں کو مشتعل کر دیا جائے تو وہ مسلمانوں کا قتل وخون شروع کر دیں گے اور مسلمانوں کے درمیان باہمی لڑائی اور قتل کا وجود میں آنا اللہ تعالیٰ کو اتنا زیادہ ناپسند ہے کہ ہر قیمت پر اس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حکمرانوں کے بارے میں خصوصیت سے تاکید کی گئی ہے کہ ان کو نصیحت کی جائے تو تنہائی میں کی جائے نہ کہ نعروں اور تقریروں کے ذریعہ:

سئل ابن عباس رضی اللہ عنہما عن امر السلطان بالمعروف ونہیہ عن المنکر فقال: ان کنت فاعلا ولابد ففیما بینک وبینہ

ابن رجب حنبلی، جامع العلوم والحکم۔ مکتبۃ الریاض الحدیثۃ قاہرہ ۱۹۶۲، صفحہ ۷۱

عبد اللہ بن عباس رض سے پوچھا گیا کہ بادشاہ کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کا کیا حکم ہے۔ جواب دیا اگر تم کو کرنا ہی پڑے اور اس کے بغیر چارہ نہ ہو تو بس اپنے اور اس کے درمیان۔

اس سلسلے کی دوسری چیز انذار ہے۔ انذار کے معنی ہیں کسی خطرہ سے آگاہ کرنا، چیتاونی دینا۔ اس سے مراد غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہنچانا ہے۔ چوں کہ اسلام کی پیغام رسانی میں سارا زور آخرت کے مسئلہ پر ہوتا ہے، اس لئے اس کام کو بتانے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا۔ قرآن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت فرمایا کہ وہ تو صرف

ایک عذاب شدید کی چیتاونی دینے والے ہیں (سبا ۴۶)۔ ارشاد ہوا ہے:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ (شوریٰ ۷)

اور ہم نے عربی قرآن اتارا تاکہ تو ڈرا دے مکہ والوں کو اور دوسروں کو اور ان کو جمع ہونے کے دن کی خبر دے دے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ اس دن ایک گروہ جنت میں ہوگا اور ایک گروہ جہنم میں۔

انذار کے کام کے محرک قرآن کے الفاظ میں دو ہوتے ہیں۔ نصیحت (خیر خواہی) اور امانت (اعراف ۶۸) بندۂ مومن دوسرے بندگان خدا پر دین پہنچانے کا جو کام کرتا ہے وہ تمام تر اس جذبہ کے تحت ہوتا ہے کہ لوگ اللہ کے عذاب سے بچ جائیں اور جنت کے راستہ پر چلنے لگیں۔ اللہ کا دین جو اس کے پاس ہے، اس کو وہ اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی امانت سمجھتا ہے اور اپنے اوپر خدا کا یہ فرض سمجھتا ہے کہ اس امانت کو وہ اس کے امانت داروں (عام انسانوں) تک پہنچا دے۔

ہجرت ، جہاد

جب بھی کوئی خدا کا بندہ بے آمیز خدا پرستی کی دعوت دیتا ہے تو اس کا امکان رہتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرف سے اس کو ناموافق ردعمل کا سامنا کرنا پڑے۔ یہ ردعمل ابتداءً الغاء فی الکلام (فصلت ۲۶) کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی داعی کے کلام میں عیب نکالنا۔ حق کی دعوت کے ساتھ خدا کی نصرتیں ہوتی ہیں۔ وہ جب کسی ماحول میں اٹھتی ہے تو اتنی حقیقی اور اتنی مدلل ہوتی ہے کہ سننے والے اس میں کوئی واقعی خامی نکالنے میں اپنے کو عاجز محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس وقت وہ عیب نکالنے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ طرح طرح کے شوشے نکال کر عوام کو اس سے بدگمان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ فکری کش مکش کبھی عملی ٹکراؤ تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ ٹکراؤ اہل ایمان کے لئے جو صورتیں پیدا کرتا ہے انھیں کی آخری اور انتہائی صورتوں کا نام ہجرت اور جہاد ہے۔ گویا ہجرت اور جہاد دین کے وہ اجزاء ہیں جو مخالفین کے پیدا کردہ حالات کے نتیجہ میں ظہور میں آتے ہیں۔

ہجرت کے معنی ہیں چھوڑنا۔ ابتدائی طور پر اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے (مدثر ۵)۔ مگر اپنے آخری مرحلہ میں یہ کبھی گھر بار چھوڑنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ داعی کے مقابلہ میں مدعو ہمیشہ طاقت در حیثیت کے مالک ہوتے ہیں۔ اس لئے جب وہ مخالفت پر اترتے ہیں تو تمام دوسرے طریقے استعمال کرنے کے بعد بالآخر یہ چیلنج دے دیتے ہیں کہ تم یا تو اپنے دین کو چھوڑ دو یا ہماری زمین سے نکل جاؤ (ابراہیم ۱۳) اس وقت اللہ کے بندے اپنے وطن کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام پر چلے جاتے ہیں جہاں وہ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

جہاد کے معنے ہیں کوشش کرنا۔ حق کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے جو کوشش کی جاتی ہے، وہ بھی جہاد ہے (فرقان ۵۲)۔ تاہم مخالفین کی ضد اور ہٹ دھرمی کبھی بڑھ کر اس نوبت کو پہنچ جاتی ہے کہ وہ حق کے داعیوں کی جان کے دشمن بن جاتے ہیں، وہ ان کو بالکل مٹا دینے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اس وقت اہل حق کو اپنے بچاؤ کے لئے اٹھنا

پڑتا ہے۔ اس طرح جو مقابلہ ہوتا ہے، اس کو جہاد کہتے ہیں۔

جہاد بمعنی قتال، وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ کی اصطلاح میں دفاعی جنگ کہا جاتا ہے۔ اس کے شرائط میں سے ایک لازمی شرط یہ ہے کہ جنگ کی ابتدا اولاً دوسروں کی طرف سے کی گئی ہو (توبہ ۱۳)۔ اہل ایمان کے لئے ہر حال میں پر امن تبلیغ کا حکم ہے۔ جنگ کی اجازت ان کے لئے صرف اس صورت میں ہے جب کہ ان کو جنگ کے لئے مجبور (حج ۳۹) کر دیا گیا ہو۔ اسی کے ساتھ اور بھی شرطیں ہیں —— مسلمانوں کی قوت مجتمع ہو، ان کا ایک امیر ہو۔ جس کی تمام لوگ اطاعت کرتے ہوں، وہ منکرین کی بستی سے الگ ہو کر اپنا ایک اجتماعی مرکز بنا چکے ہوں۔ وہ صبر کی صفت اس حد تک اپنے اندر پیدا کر چکے ہوں کہ قلیل تعداد ہوتے ہوئے مخالفین کی کثیر تعداد سے جم کر مقابلہ کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں مکی دور میں ہر قسم کے ظلم کے باوجود تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس کی اجازت صرف مدینہ میں ملی جب کہ مذکورہ شرائط پوری ہو چکی تھیں۔ عبداللہ بن عباس رض کی روایت کے مطابق ستر سے زیادہ بار قتال کی ممانعت آتی رہی۔ اس کے بعد سورۂ حج میں اجازت قتال کی پہلی آیت نازل ہوئی۔

غلبۂ اسلام

دین کی اصل حقیقت تو یہ ہے کہ بندہ اپنے رب سے خوف و محبت کا تعلق جوڑے اور آخرت کی کامیابی کے لئے فکرمند ہو۔ مگر دنیا کی زندگی میں مومن کی ایک اور بھی پسندیدہ چیز (صف ۱۳) ہوتی ہے۔ اور وہ ہے اسلام کا غلبہ۔ یعنی اہلِ حق دوسری قوموں کے مقابلہ میں دبے ہوئے نہ ہوں بلکہ انھیں کو زمین کے اوپر سربلندی حاصل ہو۔

تاہم اہل ایمان کو یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ وہ براہ راست اسلامی اقتدار قائم کرنے کی مہم چلائیں۔ قرآن میں واضح لفظوں میں ارشاد ہوا ہے کہ اقتدار کا مالک اللہ ہے۔ وہی جس کو چاہتا ہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت چھین لیتا ہے (آل عمران ۲۶)۔ انبیاء میں سے کسی نبی نے بھی حکومت قائم کرنے کی مہم نہیں چلائی۔ حضرت داؤد کو حکومت ملی۔ مگر قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ "اے داؤد تم کو یہ اقتدار ہم نے عطا کیا ہے (ص ۲۶)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی بابت قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ	اللہ کا وعدہ ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان کو وہ زمین میں حاکم بنائے گا جیسا کہ اگلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔ اور ان کے دین کو جما دے گا جس کو ان کے لئے پسند کیا ہے اور ان کے ڈر کو امن سے بدل دے گا وہ میری عبادت کریں گے کسی چیز کو میرا شریک نہ بنائیں گے اس کے بعد جو ناشکری کرے گا تو وہی لوگ فاسق ہیں۔ تم

وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (نور ۵۵) لوگ نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

گویا مسلمان کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ نماز قائم رکھے، بالفاظ دیگر اللہ سے لپٹا رہے۔ زکوٰۃ ادا کرے، یعنی بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں مستعد ہو۔ رسول کی اطاعت کرے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ اپنے درمیان سمع وطاعت کے نظام کو انتہائی حد تک مضبوط کرے۔ یہی وہ اعمال ہیں جو رحمت الٰہی (عطیہ اقتدار) کا باعث ہوں گے۔ یہی وہ مومن گروہ ہے جس کو اللہ اقتدار سونپنے کے لئے منتخب کرتا ہے کیونکہ وہی اس کے اہل ہوتے ہیں کہ اقتدار ارضی کو منصوبۂ الٰہی کے مطابق چلائیں۔ ان کے لئے اقتدار کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کو بے خوف وخطر خدا کی عبادت کرنے کے مواقع مل گئے۔ وہ اللہ کے سوا کسی اور شے کو اپنا مرکز توجہ نہیں بناتے۔ وہ کبر اور ظلم سے اپنے آپ کو پاک رکھتے ہیں اور اقتدار کے ملے ہوئے مواقع کو تمکین دین کے لئے استعمال کرتے ہیں نہ کہ تمکین خویش کے لئے۔

خلاصہ

ایک تاجر کو آپ دیکھیں تو مختلف اوقات میں وہ مختلف سرگرمیاں کرتا ہوا دکھائی دے گا۔ کہیں خاموش کہیں بولتا ہوا، کہیں بیٹھا ہوا کہیں سفر کرتا ہوا، کہیں خرچ کرتا ہوا کہیں مقدمہ لڑتا ہوا۔ تاہم اس کی بظاہر مختلف سرگرمیوں کا حاصل صرف ایک ہے: دولتِ دنیا کو پانا۔ اسی طرح ایک مومن مختلف وقتوں میں بظاہر مختلف عبادات واعمال میں مصروف نظر آتا ہے۔ مگر ان سب کا مقصد ایک ہوتا ہے: دولتِ آخرت کو پانا۔

دولتِ آخرت کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی پورے معنوں میں موحد بن جائے اور ہر قسم کے شرک سے بچتا ہوا اپنے رب سے جا ملے:

عن جابر رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: من لقی اللہ لا یشرک بہ شیئا دخل الجنۃ ومن لقیہ یشرک بہ شیئا دخل النار (مسلم)

جو شخص خدا سے اس طرح ملا کہ وہ کسی چیز کو خدا کے ساتھ شریک نہیں کر رہا تھا وہ جنت میں داخل ہوا۔ جو اس طرح ملا کہ وہ خدا کے ساتھ کسی چیز کو شریک کر رہا تھا وہ آگ میں داخل ہوا۔

توحید اور شرک کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ جو شخص خدا کے سامنے عبادتی رسوم ادا کرے وہ موحد ہے۔ اور جو شخص کسی بت کے سامنے عبادتی رسوم ادا کرتا ہو وہ مشرک ہے۔ یہ تو ان کی ظاہری علامتوں میں سے صرف ایک علامت ہے۔ توحید اور شرک کا اصل مطلب اور مطلوب (حج ۔۔۔) بننے کا معاملہ ہے۔ یہ آدمی کی پوری ہستی کا نذرانہ ہے۔ کسی شخص کا معبود وہی ہے جو اس کا حقیقی مطلوب ومقصود ہو۔ جس کی طرف وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ جھکا ہوا ہو۔ جس چیز کو آدمی عظمت کا مقام دے، جس پر وہ بھروسہ کرتا ہو، جس کے لئے اس کے احترام وتقدس کے جذبات وقف ہوں، جس کی یاد میں وہ غرق رہتا ہو، جس کے تصور سے اس کے نازک احساسات

بھڑکتے ہوں، جس سے وہ سب سے زیادہ ڈرتا ہو اور جس سے سب زیادہ محبت کرتا ہو، جس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو اتنا زیادہ شامل (Involve) کر دے کہ وہی اس کا سب کچھ اور وہی اس کی آخری امید بن جائے۔ کسی کو اپنی زندگی میں اس قسم کا برتر مقام دینا ہی اس کو اپنا الٰہ (معبود) بنانا ہے۔ خواہ وہ کوئی دیوتا ہو یا آدمی کا اپنا نفس۔ کوئی جان دار چیز ہو یا بے جان، کوئی زندہ ہستی ہو یا مردہ، اور وہ کئی ہوں یا صرف ایک۔

ساری شریعت کا حاصل یہ ہے کہ آدمی صرف خدا کو اپنا الٰہ بنائے۔ وہ شرک کی تمام قسموں سے بچ کر پورے معنوں میں توحید پرست بن جائے۔ ہر قسم کی عظمت و کبریائی کا مالک صرف ایک اللہ ہے۔ جو آدمی اختیار و اقتدار میں کسی اور کو شریک کرے، وہ اسی واحد سہارے سے محروم ہو جاتا ہے جس کے سوا اس دنیا میں کوئی اور سہارا نہیں۔ ایسے آدمی کی مثال اس شخص کی سی ہے جو آسمان سے گر پڑے (حج ۳۱) اور اس کے بعد ساری کائنات میں اس کے لئے بربادی کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ خدا کے سوا کسی کو عقیدت و اعتماد کا مرکز بنانا اس کو خدا کا برابر ٹھہرانا ہے۔ ایسا عمل اس کائنات میں "ظلم عظیم" ہے اور اس کا انجام دائمی عذاب ہے (من مات وهو يدعو لله ندا دخل النار، بخاری) حتیٰ کہ یہ بھی شرک، سب سے بڑا شرک ہے کہ آدمی اپنی ذات کی نمائش چاہتا ہو۔ اس کا احترام کیا جائے تو وہ خوش ہو، احترام نہ کیا جائے تو وہ بپھر اٹھے۔ ایسا شخص خود اپنے آپ کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہے۔ وہ ایک ایسی برائی میں مبتلا ہے جس سے زیادہ بری چیز اس دنیا میں اور کچھ نہیں:

اخوف ما اخاف علیکم الشرك الاصغر فسئل عنه فقال الرياء (احمد، طبرانی، بیہقی)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تمہارے بارے میں مجھ کو سب سے زیادہ جس چیز کا اندیشہ ہے وہ شرک اصغر ہے۔ پوچھا گیا شرک اصغر کیا ہے۔ فرمایا: ریاء

آدمی کی عبادت اور اس کی اسلامی سرگرمیاں اگر یہ نتیجہ پیدا کریں کہ وہ حقیقی معنوں میں اَلَّا تَتَّخِذُوا مِنْ دُونِي وَكِيلًا (اسراء ۲) کا مصداق بن گیا ہو، ذات خداوندی اس کی تمام یادوں اور توجہات کا مرکز بن جائے، خدا کو الٰہ بنانا اس کے لئے سادہ معنوں میں صرف ایک عقیدہ کی چیز نہ ہو بلکہ وہی اس کا نفسیاتی آسرا ہو جس پر وہ جی رہا ہو —— آدمی کی دینی زندگی اگر یہ نتیجہ پیدا کر رہی ہو تو بلاشبہ وہ دین پر قائم ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو شدید اندیشہ ہے کہ وہ ابھی تک دین کو نہ پا سکا۔ دین کے نام پر وہ کہیں اور اٹکا ہوا ہے۔

صریح نصوص سے ثابت ہے کہ عمل کا دارومدار تمام تر نیت پر ہے۔ اللہ کو صرف وہی عمل مطلوب ہے جو خالصۃً اس کی رضا کے لئے کیا گیا ہو۔ جس عمل میں کوئی اور غرض شامل ہو جائے، اللہ کی نظر میں اس کی کوئی قیمت نہیں —— جو لوگ خدا کے دین کو تجارت بنائیں۔ جو دنیوی فائدوں اور مصلحتوں کے تحت کسی دینی عمل کو اختیار کریں۔ جو کسی دینی عمل کو بطور "کیریر" کے شروع کریں۔ جو ایسی دینی سرگرمیوں میں دلچسپی رکھتے ہوں جن کے ذریعہ عزت و شہرت ملتی ہے جن سے آدمی کی "امیج" میں اضافہ ہوتا ہے۔ جن سے عوامی قیادت حاصل ہوتی ہے۔ ایسے لوگ شدید طور پر اس خطرہ میں مبتلا ہیں کہ ان کے اعمال قیامت میں بے وزن قرار دے دیئے جائیں۔ خواہ ان میں یہ دنیوی محرکات شعوری طور پر داخل ہوئے ہوں یا غیر شعوری طور پر۔

دینی روح کیوں نہیں

مومن کون ہے۔ قرآن کے الفاظ میں مومن وہ ہے جس کا یہ حال ہو کہ جب اس کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو اس کی ہیبت سے اس کا دل دہل اٹھے۔ جب اس کو قرآن کی آیتیں سنائی جائیں تو اس میں اس کو اضافہ ایمان کی غذا ملنے لگے۔ جس کے لئے خدا ایک ایسی لازوال ہستی بن جائے جس پر وہ کامل بھروسہ کر سکتا ہو (انفال)۔ ایمان، خدا اور بندے کا مقام اتصال ہے۔ اس اتصال کا حقیقی طور پر وقوع میں آنا ہی ان کیفیات کے ظہور میں آنے کی یقینی ضمانت ہے۔ پاور ہاؤس اور بلب کا ملاپ اگر نتیجہ پیدا کئے بغیر نہیں رہتا تو خدا اور بندے کا ملاپ کیوں کر نتیجہ سے خالی رہ جائے گا۔

مگر موجودہ زمانہ میں اسلام کی ایسی عجیب وغریب قسم وجود میں آئی ہے جس میں سب کچھ نظر آتا ہے مگر وہی چیز نہیں جس کو حقیقۃً "اسلام" کہا گیا ہے۔ ہمارے زمانہ کے عجائب میں یہ عجوبہ سب سے زیادہ حیرت ناک ہے کہ ہر طرف اسلام کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ مگر حقیقی اسلام کا کہیں وجود نہیں ——— نمازیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے مگر "صلاۃ خشوع" سے مسجدیں خالی ہیں۔ اسلامی مدرسوں کی تعمیرات بلند ہو رہی ہیں مگر وہ لوگ نہیں پیدا ہو رہے ہیں جو اپنی زندگیوں میں بھی اسلام کی تعمیر کی ضرورت محسوس کرتے ہوں۔ اسلام کے نعروں سے فضائیں گونج رہی ہیں مگر اس اسلام کا وجود نہیں جو تنہائیوں میں آدمی کو بے چین کر دے۔ دوسروں کی پیٹھ پر اسلامی کوڑے لگ رہے ہیں مگر اپنی "پیٹھ" کو خدا کے حوالے کرنے والا کوئی نہیں۔ اسلامی تقریروں کی بہار آ رہی ہے مگر خدا کی زمین ایسے لوگوں سے خالی ہے جن کو خدا کے خوف نے بے زبان کر رکھا ہو۔ "احتساب کائنات" کے ہنگامے ہر طرف برپا ہیں مگر احتساب نفس کی ضرورت کسی کو محسوس نہیں ہوتی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے جسم سے اس کی روح نکال دی گئی ہے۔ خود ساختہ طور پر اسلام کا ایسا ایڈیشن تیار کر لیا گیا ہے جو بظاہر اسلام ہے مگر وہی چیز اس میں موجود نہیں جو خدا و رسول کے نزدیک اسلام کا اصل مقصود تھی۔

اس کو سمجھنے کے لئے یہود کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے۔ کیونکہ جو قومیں کتاب الٰہی کی حامل ہوں، ان کے بگاڑ کے اسباب ہمیشہ یکساں ہوتے ہیں۔ یہود کی بابت قرآن میں کہا گیا ہے کہ بعد کے دور میں ان کے اندر قساوت (سخت دلی) آ گئی۔ قساوت کی حالت یہ نہیں ہے کہ دین اپنی صورت کے اعتبار سے باقی نہ رہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ دین کی صورتیں ہمیشہ مکمل طور پر باقی رہتی ہیں۔ البتہ قوم کے اندر سے ان کی روح نکل جاتی ہے۔ قساوت دراصل ذکر اور خشیت کے خاتمہ کا نام ہے (زمر ۲۲-۲۳) نہ کہ ظواہر دین کے خاتمہ کا۔

قوم کے اندر یہ بگاڑ انکار دین کے نام پر نہیں آتا، بلکہ اقرار دین کے جلو میں آتا ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق شیطان ان کو ایسی ایسی تاویلات سمجھاتا ہے جس کی روشنی میں ان کو اپنا انحراف عین دین نظر آنے لگے۔ وہ اپنے اعمال

کو خوبصورت الفاظ میں بیان کر کے اس کو اپنے لئے مزین کر لیتے ہیں (انعام - ۴۳) اس تزئین کی سب سے زیادہ معروف صورت وہ ہے جس کو قرآن میں يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (مائدہ - ۱۳) فرمایا گیا ہے۔ تحریف کے معنی ہیں پھیرنا۔ کلام کو اس کے محل سے پھیرنے کا مطلب یہ ہے کہ کلام کا وہ مطلب و معنی بیان کیا جائے جو متکلم کی مراد نہ ہو۔ گویا یہود کی تزئین یہ تھی کہ وہ اپنی قساوت، بالفاظ دیگر اپنی بے روح دین داری، کو لفظی تاویلات سے ایسا خوش نما بنا لیتے تھے کہ وہی اصل دین نظر آنے لگے۔

تحریف کی صورت عام طور پر وہی ہوتی ہے جس کو موجودہ زمانہ میں غلط تعبیر Misinterpretation کہا جاتا ہے۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ یہود کو یہ خبر دی گئی تھی کہ تم کو تمام اقوام عالم پر فضیلت دی گئی ہے (بقرہ ۴۷) اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ نے تم کو دنیا میں اپنی نمائندگی کے لئے چن لیا ہے۔ تم کو اس مقام پر کھڑا کیا ہے کہ تم خدائی تعلیمات کے حامل بنو اور اس کو خدا کی طرف سے دوسری اقوام تک پہنچاؤ۔ اپنے اصل مفہوم میں یہ آیت نظریاتی فضیلت کے معنی میں تھی۔ مگر یہود نے اس کو نسلی فضیلت کے معنی میں لے لیا۔ یہود کی نسل میں پیدا ہونا اس بات کے لئے کافی بن گیا کہ آدمی اس فضیلت کا مستحق ہو اور خدا کے انعامات اس کو حاصل ہوں۔ کتاب الٰہی کی اس تحریف (لفظ کو اس کے موقع و محل سے پھیرنے) کو قرآن میں اس طرح واضح کیا گیا ہے:

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (بقرہ - ۱۳۵)	وہ کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی ہو جاؤ تو ہدایت یاب ہو جاؤ گے۔ کہہ دو نہیں۔ بلکہ ہم پیروی کرتے ہیں دین ابراہیم کی اور وہ شرک کرنے والوں میں نہ تھا۔

گویا ملت ابراہیمی کا فرد وہ ہے جو شرک سے اپنے کو بچائے اور سچی توحید پر قائم ہو۔ محض نسل ابراہیمی میں ہونے سے کوئی ملت ابراہیمی کا فرد نہیں بن جاتا۔ یہود کو جو "فضیلت" دی گئی وہ اپنے اصل مفہوم میں ایک سنگین ذمہ داری کو یاد دلانے والی چیز تھی۔ مگر موقع و محل سے ہٹنے کے بعد وہ بے خوفی کا محرک بن گئی۔ اللہ کا ایک حکم جو خشیت پیدا کرنے کا سبب بنتا، وہ قساوت پیدا کرنے والا بن گیا —— یہ تھی یہود کی تحریف۔ اپنی اس قسم کی تحریفوں کے ذریعہ انھوں نے دین خداوندی کو ایک بے روح ڈھانچہ بنا کر رکھ دیا تھا۔

حدیث میں پیشین گوئی کی گئی ہے کہ تم لوگ پچھلی امتوں کے راستہ پر چلو گے —— (لتتبعن سنن من کان قبلکم) چنانچہ مسلمانوں میں آج وہ سارے انحراف دیکھے جا سکتے ہیں جو سابق اہل کتاب میں پائے جاتے تھے۔ جس طرح یہود نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اللہ کے خصوصی بندے ہیں اور وہ ضرور نجات پائیں گے۔ اسی طرح ہم نے یہ عقیدہ قائم کر لیا ہے کہ "مسلمان خیر امت ہیں اور وہ سب کے سب مرحوم و مغفور ہیں"۔ یہ بات بجائے خود صد فی صد درست ہے۔ مگر وہ مسلم امت کے کے بارے میں ہے نہ کہ کسی مسلم نسل کے بارے میں۔ امت کو نسل کے معنی میں لینا بلاشبہ یحرفون الکلم عن مواضعہ کا مصداق ہے۔ اپنے نظریاتی مفہوم میں یہ بات ذمہ داری کا احساس دلاتی ہے۔ مگر جب اس کو نسلی مفہوم میں لے لیا گیا تو وہ صرف قساوت اور بے خوفی کا محرک بن کر رہ گئی۔

حقائق کے بجائے خوش خیالیوں پر دین کی بنیاد

یہود کا نظریاتی فضیلت کو نسلی فضیلت کے معنی میں لینا معنی رکھتا تھا کہ یہود کی نسل محض نسل کی حیثیت سے خدا کے نزدیک برگزیدہ ہے۔ اس کے بعد بالکل قدرتی طور پر یہ ہوا کہ خدا پرستی اور یہودیت ہم معنی الفاظ بن گئے۔ ان کا خیال یہ ہوگیا کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں (مائدہ۔ ۱۸) یہودی اور نصرانی پیدا ہونا ہی ہدایت یاب ہونا ہے —— (بقرہ۔ ۱۳۵) ہمارا کوئی آدمی جہنم میں نہ جائے گا اور اگر گیا بھی تو اس کا جانا صرف چند روز کے لئے ہوگا (بقرہ ۸۰)۔ قرآن نے ان کی ان خوش خیالیوں کو امانی (بقرہ ۷۸) کہا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ اس قسم کے امانی خواہ یہود قائم کریں یا مسلمان قائم کریں، خدا کے نزدیک ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ خدا کا ابدی قانون تو یہ ہے کہ جو شخص جیسا کرے، اس کے مطابق اس کو بدلہ دیا جائے (نساء ۱۲۳)

امانی کے معنی ہیں بے بنیاد توقعات۔ عبداللہ بن عباس، مجاہد اور فراء نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ موضوع روایات اور بے سند قصے ہیں جو یہودی علماء و مشائخ نے وضع کئے اور پھر پوری قوم میں رائج ہو گئے (اکاذیب مختلقۃ سمعوھا من علمائھم فقبلوھا علی التقلید، تفسیر نسفی) قوم یہود کے انتہائی مبالغہ آمیز فضائل، یہودیت سے تعلق رکھنے والی معمولی معمولی چیزوں کے مقدس اور متبرک ہونے کی طلسماتی داستانیں کثرت سے ان کے درمیان پھیلی ہوئی تھیں۔ پوری کی پوری قوم حقیقی عمل سے غافل تھی اور انھیں موضوع روایات اور بناوٹی قصے کہانیوں پر جی رہی تھی مثلاً ——

تورات کے الفاظ ایک بار بھی جس کے کان میں پڑ گئے اس پر دوزخ کی آگ حرام ہے۔ اسرائیلی بزرگوں کا نام جس نے احترام و محبت سے لے لیا، اس کے جنتی ہونے میں شبہ نہیں۔ "قیامت کے دن ابراہیمؑ دوزخ کے دروازے پر کھڑے ہوجائیں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو اس میں گرنے نہ دیں گے"

Talmud (Everyman's Library Series)
Edited by Dr. Kohen, p. 404

ٹھیک یہی حال آج مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ کتاب اللہ کے بجائے کتاب الامانی ان کے دین کا ماخذ بنی ہوئی ہے۔ فضائل اعمال کی بے اصل روایات اور بزرگوں کے کشف و کرامت کی فرضی داستانیں بے شمار تعداد میں قوم کے اندر پھیلا دی گئی ہیں اور قوم کی قوم انھیں خوش خیالیوں کے سہارے جی رہی ہے۔

اسلام کی تاریخ میں وضع حدیث کا سلسلہ ابتداءً سیاسی محرک کے تحت شروع ہوا۔ اپنی سیاست کے حق میں دینی تصدیق حاصل کرنے کے لئے ہر فرقہ نے بے شمار حدیثیں گھڑیں اور ان کو رسول اور اصحاب رسول سے منسوب کر کے عوام میں پھیلا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اہل بیت کی فضیلت ثابت کرنے کے لئے جو حدیثیں وضع کی گئیں، صرف ان کی تعداد تقریباً تین سو ہزار ہے۔

یہی زمانہ ہے جب کہ مسلمانوں میں "فضائل اعمال" کی حدیثیں وضع کرنے کا رجحان ابھرا۔ اس کا محرک

بہ تعاجس نے اس سے پہلے عیسائیوں میں مقدس جھوٹ Pious Fraud کا نظریہ پیدا کیا تھا۔حضرت مسیح کے بعد ابتدائی صدیوں میں مسیحیت بڑی ابتر حالت میں تھی۔ اس زمانہ میں مسیحی بزرگوں نے سوچا کہ مسیحیت کی ترقی کی ایک تدبیر یہ ہے کہ اس کی افضلیت ثابت کرنے کے لئے عجائب وغرائب باتیں گھڑی جائیں اور ان کو عوام میں پھیلایا جائے۔ اس مقصد کے لئے وضع حدیث کا ثبوت خود موجودہ مقدس انجیل میں موجود ہے۔ سینٹ پال نے رومیوں کے نام اپنے خط (رومیوں، ۳ : ۷) میں لکھا:

"اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر کیوں گنہگار کی طرح مجھ پر حکم دیا جاتا ہے۔ اور ہم کیوں برائی نہ کریں تاکہ بھلائی پیدا ہو"

قرن اول کے بعد جب مسلمانوں میں باہمی لڑائیاں اور سیاسی جھگڑے بہت بڑھ گئے تو کچھ لوگوں نے "فضائل" کے نام پر جھوٹی حدیثیں وضع کرنی شروع کیں تاکہ لوگوں کو دینی اعمال کی طرف راغب کیا جاسکے۔ ظاہر ہے کہ یہ فضائل جہاد نفس اور انفاق مال جیسی چیزوں کے لئے کارآمد نہ تھے۔ چنانچہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے طلسماتی فوائد بتائے جانے لگے۔ مثلاً کوئی شخص فلاں سورہ روزانہ پڑھے تو وہ خدا کے مقابلہ میں آدمی کا حصار بن جاتی ہے۔ جہنم کے فرشتے جب اس کو عذاب دینے کے لئے آتے ہیں تو وہ ان سے لڑ کر ان کو بھگا دیتی ہے۔ ایک شخص نے سیکڑوں کی تعداد میں اس مضمون کی "حدیثیں" گھڑ کر پھیلائیں کہ فلاں سورہ فلاں وقت "پڑھو" تو اتنا ثواب ہے اور فلاں وقت پڑھو تو اتنا ثواب ہے۔ اس سے پوچھا گیا کہ تم نے دین کے معاملہ میں یہ جرأت کیسے کی۔ اس نے جواب دیا:

قصدت ان اشغل الناس بالقرآن عن غیرہ — میں نے چاہا کہ لوگوں کو دوسرے مشاغل سے ہٹا کر قرآن پڑھنے میں لگا دوں۔

کسی نے حدیث گھڑی کہ کسی شخص کے ایک اولاد ہو اور اس کا نام وہ محمد رکھے تو باپ بیٹا دونوں جنت میں جائیں گے (من ولد له مولود فسماه محمدا كان هو والولد في الجنة) کسی نے حدیث بنائی کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہے اس کو جنت میں سات ہزار شہر ملیں گے۔ ہر شہر میں سات ہزار محل ہوں گے۔ ہر محل میں سات ہزار حوریں ہوں گی (من قال لا اله الا الله اعطى في الجنة سبعين الف مدينة في كل مدينة سبعون الف قصر في كل قصر سبعون الف حوراء) کسی نے کہا کہ جس شخص نے ۱۵ شعبان کو ۱۲ رکعتیں پڑھیں، اس طرح کہ ہر رکعت میں ۳۰ بار قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھا تو وہ نہ صرف خود جنت میں جائے گا بلکہ اپنے خاندان کے دس ایسے آدمیوں کو بھی خدا سے کہہ کر جنت میں لے جائے گا جن پر جہنم واجب ہو چکی ہوگی (من صلى ليلة النصف من شعبان ثنتى عشرة ركعة يقرأ في كل ركعة ثلاثين مرة قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ شفع في عشرة من اهل بيته قد استوجبوا النار)

سخاوی کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے: القول البديع في الصلوٰة على حبيب الشفيع۔ یہ کتاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کے بارے میں ہے۔ پوری کتاب عجائب وغرائب قصوں سے بھری ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک قصہ

ے وسيكون في آخر امتي اناس يحدثونكم مالم تسمعوا انتم ولا آباؤكم فاياكم واياهم (رواه مسلم عن ابي هريرة)

ان کے بیان کے مطابق، یہ ہے :

" ایک عورت حسن بصری کے پاس آئی اور عرض کیا کہ میری لڑکی کا انتقال ہوگیا۔ میری تمنا ہے کہ میں اس کو خواب میں دیکھوں۔ حسن بصری نے کہا کہ عشار کی نماز پڑھ کر چار رکعت نفل نماز پڑھ اور ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ پڑھ اور اس کے بعد لیٹ جا۔ اور سونے تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھتی رہ۔

اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نے لڑکی کو خواب میں دیکھا کہ بے حد سخت عذاب میں ہے۔ تارکول کا لباس جسم پر ہے۔ دونوں ہاتھ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ پاؤں آگ کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں۔ عورت صبح کو اٹھ کر پھر حسن بصری کے پاس گئی۔ اور جو کچھ دیکھا تھا، ان کو بتایا۔

اگلے دن حسن بصری نے خواب میں دیکھا کہ جنت کا ایک باغ ہے۔ اس میں ایک بہت اونچا تخت ہے۔ اس میں ایک حسین وجمیل لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کے سر پر ایک نور کا تاج ہے۔ وہ کہنے لگی حسن! تم نے مجھ کو پہچانا، کہا نہیں۔ بولی، میں وہی لڑکی ہوں جس کی ماں تم سے ملی تھی۔ حسن بصری نے کہا تیری ماں نے تو تیرا حال اس کے برعکس بتایا تھا جو میں دیکھ رہا ہوں۔ لڑکی نے جواب دیا، میری حالت وہی تھی جو ماں نے بیان کی۔ میں نے پوچھا، پھر یہ مرتبہ کیسے حاصل ہوگیا۔ اس نے کہا، ہم ستر ہزار آدمی اسی عذاب میں مبتلا تھے جو میری ماں نے آپ سے بیان کیا۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک بزرگ کا گزر ہمارے قبرستان پر ہوا۔ انھوں نے ایک دفعہ درود پڑھ کر اس کا ثواب ہم سب کو پہنچا دیا۔ ان کا درود اللہ کے یہاں ایسا قبول ہوا کہ اس کی برکت سے ہم سب اس عذاب سے آزاد کر دیئے گئے اور ہم کو وہ رتبہ نصیب ہوا۔ جو تم دیکھ رہے ہو "۔

اس قسم کی بے شمار روایات گھڑ کر ساری امت میں پھیلا دی گئیں۔ اب اگر کچھ لوگ یہ کریں کہ ان " حدیثوں " کو جمع کر کے فضائل اعمال کا صحیفہ مرتب کریں اور اس کی بنیاد پر لوگوں کو دین دار بنانا شروع کریں تو ایک عجیب وغریب قسم کا دین وجود میں آئے گا۔ لوگ بظاہر ذکر اور درود اور تلاوت اور نماز میں مشغول ہوں گے مگر یہ مشاغل ان کے سینہ میں خوف خدا سے کانپنے والا قلب نہیں بنائیں گے۔ بلکہ ایک ایسا قلب وجود میں آئے گا جو اپنے کو خدا کی پکڑ سے بالکل مامون سمجھے گا۔ معمولی معمولی باتوں سے جب ہر صبح وشام جنت کے محلات رزرو ہو رہے ہوں تو آخرت کے خوف سے کانپنے کی کیا ضرورت۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی " امانی " نے اللہ کے دین کو عملاً مذاق بنا کر رکھ دیا۔ وہ دین جس کا مقصد بندہ دل میں خشیت اور اندیشہ کی کیفیت پیدا کرنا تھا۔ وہ صرف قساوت میں اضافہ کا سبب بن گیا۔

خالق کے بجائے مخلوق کا سہارا پکڑنا

قرآن کی ایک آیت ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ (مائدہ ۳۵)	اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور اس کا وسیلہ تلاش کرو۔

اس آیت میں "وسیلہ" کے لفظ کو کچھ لوگوں نے اس مفہوم میں لے لیا جس میں وہ اردو زبان میں استعمال ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جس طرح دنیوی حکمرانوں کے یہاں ذریعے اور وسیلے ہوتے ہیں، اسی طرح خدا کے یہاں بھی وسیلے ہیں۔ یہ وسیلے انبیاء اور اولیاء ہیں۔ ان وسیلوں کو پکڑ لو، ساری خدائی تمھارے ہاتھ میں آجائے گی۔ یہ عقیدہ چونکہ عوامی مزاج سے قریب تھا، اس کو خوب مقبولیت حاصل ہوئی۔ اب یہ حال ہے کہ خدا کے بالمقابل بے شمار زندہ اور مردہ "خدا" پیدا ہو گئے ہیں جن کا دامن لوگوں نے تھام رکھا ہے۔ ان کو یقین ہے کہ یہ خدائی وسیلے دنیا سے لے کر آخرت تک ان کے سارے کام بناتے چلے جائیں گے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا قسم کے عقیدہ کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ عربی زبان میں "وسیلہ" کا مفہوم سرے سے نہیں آتا۔ لفظ وسیلہ مذکورہ آیت میں، اردو (ذریعہ) کے مفہوم میں نہیں ہے، بلکہ اپنے عربی مفہوم (قرب) کے معنی میں ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو اور اس کی فرماں برداری اور اس کے پسندیدہ عمل کے ذریعہ اس کی قربت اور نزدیکی حاصل کرو (تقربوا الیہ بطاعتہ والعمل بمایرضیہ، قتادہ) ابن جریر طبری نے اس کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے: اطلبوا القربۃ الیہ بالعمل بمایرضیہ (اللہ کی نزدیکی اس عمل کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کرو جس عمل کو وہ پسند کرتا ہے)

کسی بندے کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے قریب پہنچ سکے۔ اس آیت میں یہ راز کھولا گیا تھا کہ اس مطلوب کو پانا ہر بندہ کے لئے ممکن ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنے کو اپنے رب کے پسندیدہ راستہ پر لگادے۔ مگر غلط تعبیر نے آدمی کو اس خزانہ سے محروم کر دیا جو اس کے اندر رکھا گیا تھا۔ جس آیت میں خدا کو پانے کا راز بتایا گیا تھا، اس نے لوگوں کو صرف قبروں اور آستانوں تک پہنچانے کا کام انجام دیا۔ وہ آیت جس میں خوف خدا کی غذا تھی، ایک خودساختہ تشریح کے ذریعہ اس میں بے خوفی کا سامان تلاش کر لیا گیا۔ جو قرآن اللہ کی پرستش کی تعلیم دینے آیا تھا۔ اس سے لوگوں نے غیر اللہ کی پرستش کا حکم نکال لیا۔ اس عقیدہ کے تحت جو مذہب بنا، قدرتی طور پر اس میں قبروں کی پرستش اور زندہ "بزرگوں" کی عقیدت نے خوب ترقی کی "اولیاء اللہ" کی فضیلت و کرامت کی بے شمار فرضی کہانیاں گھڑی گئیں۔ تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ یہ حضرات بھی اپنے اندر خدائی طاقتیں رکھتے ہیں۔ بزرگوں کی کراماتی داستانوں کی مقدس طلسم ہوش ربا تیار ہو گئی ہے اور ساری قوم اس کی تلاوت میں مشغول ہے۔ اس کے برعکس اللہ سے خوف و محبت، گناہوں سے بچنے کی تڑپ، آخرت کی بازپرس سے بچنے کا فکر بالکل ختم ہو گیا ہے۔ کیوں کہ "وسیلہ" حاصل کر لینے کے بعد ان چیزوں کے لئے فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔

اس قسم کے تمام عقائد دراصل خدا کی خدائی کا کمتر اندازہ (Underestimation) ہیں۔ جو لوگ زندہ یا مردہ انسانوں سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں، انھیں خبر نہیں کہ یہ ہستیاں ایک مکھی پیدا کرنے پر بھی قادر نہیں (حج ۷۳) جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے "اکابر" کا دامن تھام کر جنت میں پہنچ جائیں گے، ان کو خدا کے قانون جزا و سزا کی سنگینی کا اندازہ نہیں (انعام ۹۱) جو لوگ آخرت کے دن کو اپنے "بڑوں" کی جلوہ گاہ سمجھتے ہیں، ان کو خبر نہیں کہ آخرت جب آئے گی

تو عالم یہ ہوگا کہ سارا آسمان، خدا کے ایک ہاتھ میں لپٹا ہوا ہوگا۔ اور زمین کو خدا اپنی مٹھی میں لے کر فرمائے گا:
انا الملک انا الجبار انا المتکبر، این الجبارون این المتکبرون این ملوک الارض (میں ہوں بادشاہ میں ہوں جبار، میں ہوں کبریائی والا، کہاں ہیں زمین کے بادشاہ کہاں ہیں جبار کہاں ہیں متکبر) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی مسجد میں خطبہ دیتے ہوئے یہ الفاظ دہرائے تو راوی کا بیان ہے کہ:

فرجف برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المنبر حتی قلنا لیخرن بہ (ابن کثیر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسا لرزہ طاری ہوا کہ ہم نے کہا کہ آپ منبر سے گر پڑیں گے

دوسری طرف ہم نے ایسے ایسے "بزرگ" پیدا کر رکھے ہیں جو میدان حشر میں عین خدا کے سامنے ہماری طرف سے وکیل بن کر کھڑے ہو جائیں گے اور اس وقت تک کسی کو جنت میں جانے نہ دیں گے جب تک اپنے تمام معتقدین کو جنت میں نہ بھیج لیں۔

معانی کے بجائے صورتوں کو مطلوب سمجھ لینا

۱۔ قرآن کی سورہ نمبر ۵۴ میں کہا گیا ہے: وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ۔ اس کا ترجمہ کچھ لوگوں نے ان الفاظ میں کیا: "ہم نے سہل کر دیا قرآن کو حفظ کرنے کے لئے، پھر کوئی ہے حفظ کرنے والا"۔ اس ترجمہ کے مطابق سمجھ لیا گیا کہ اس آیت میں قرآن کو رٹ کر یاد کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اب بے شمار لوگ قرآن کو رٹنے میں مشغول ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ اس آیت کے حکم کی تعمیل کر رہے ہیں۔ قرآن کی سورتوں کو یاد کرنا بجائے خود مومن کی ایک ضرورت ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ مذکورہ آیت کا اس قسم کے عمل سے کوئی تعلق نہیں۔

شاہ عبدالقادر صاحب نے آیت کا ترجمہ کیا ہے: "ہم نے آسان کیا قرآن سمجھنے کو پھر ہے کوئی سوچنے والا"۔ مطلب یہ کہ قرآن میں حقائق دینیہ کو مدلل اور قابل فہم انسانی زبان میں پیش کر دیا گیا ہے۔ پھر کوئی ہے جو اس پر دھیان دے اور اس سے اپنے لئے نصیحت اور اصلاح کا سامان حاصل کرے۔ اس آیت میں کتاب الٰہی پر غور و فکر کے لئے اکسایا گیا ہے۔ قرآن کے اندر آدمی کے قلب و دماغ کے لئے جو ربانی غذا رکھی گئی ہے، اس میں سے اپنا حصہ لینے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ مگر ایک معنوی حقیقت کو لفظی تکرار کے معنی میں لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آیت آدمی کے لئے اس قسم کی غذا کا ماخذ نہ رہی۔ وہ الفاظ کو زبانی طور پر رٹنے کے ایک بے کیف عمل کے ہم معنی بن کر رہ گئی۔

۲۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ

جس نے کہا لا الٰہ الا اللہ وہ جنت میں جائے گا۔

اس قسم کی روایات میں لفظ "قول" کو دیکھ کر کچھ لوگوں نے سمجھ لیا کہ بس کلمہ اسلام کا تلفظ ہی جنت میں داخلہ کے لئے کافی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ آدمی کا ایک قول اس کے لئے جنت کا دروازہ کھولتا ہے۔ مگر قول سے مراد ایک حقیقی انسان کا قول ہے نہ کہ کسی کمپیوٹر کا قول۔ ایک حقیقی انسان کا قول اس کی پوری ہستی سے ٹپکتا ہے نہ کہ محض حرکت لسانی سے وجود میں آتا ہے۔ ایک بندہ جب فی الواقع یہ قول دیتا ہے کہ "اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں"، تو وہ محض کچھ رسمی

الفاظ نہیں بولتا۔ وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اس نے خدا کی قدرت کاملہ کے مقابلہ میں اپنے عجز کامل کو پالیا ہے۔ یہ بول اس کی اندرونی ہستی کا لفظی اظہار ہوتا ہے نہ کہ اس کی حقیقی ہستی سے الگ محض حرکت لسانی کی سطح پر چند کلمات کا تلفظ۔

"قول" کی یہ حقیقت قرآن و حدیث سے بخوبی واضح ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ مائدہ میں ایک گروہ کا ذکر ہے جس نے کہا تھا کہ "اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے۔ ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے"۔ اس گروہ کے متعلق قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ان کے اس "قول" کی وجہ سے اللہ نے ان کو جنت دے دی (فاثابھم اللہ بما قالوا جنات - ۸۵)

مگر قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قول محض حرکت لسان نہ تھا بلکہ اعلیٰ نفسیاتی سطح پر عرفان حق کا معاملہ تھا۔ یہ ان کی پوری ہستی تھی جو لفظوں کی صورت میں ابل پڑی تھی۔ اس قسم کا واقعہ اگرچہ بظاہر ایک قولی اقرار ہوتا ہے مگر حقیقۃً وہ کائنات کا سنجیدہ ترین معاملہ ہوتا ہے جس کے ایک سرے پر عاجز اور حقیر بندہ ہوتا ہے اور اس کے دوسرے سرے پر وہ قادر مطلق ہستی ہوتی ہے جس کی تجلیات کو پہاڑ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ صورت حال اس اقرار کو بے حد سنگین واقعہ بنا دیتی ہے۔ اپنی ساری لطافت کے باوجود جب یہ "قول" عالم واقعہ میں ظہور میں آتا ہے تو انسانی شخصیت کے لئے وہ اتنا سنگین ہوتا ہے کہ آنکھوں کی راہ سے آنسوؤں کا سیلاب پھٹ پڑتا ہے (تَرٰىٓ اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ)

وہ اقرار ایمان جو آدمی کو جنت کا مستحق بناتا ہے، قرآن و حدیث کے مطابق، آدمی کی پوری ہستی کا نذرانہ ہے۔ مگر اس سے یہ مفہوم نکال لیا گیا کہ زبان سے کلمہ اسلام کا تلفظ کرو اور سیدھے جنت میں پہنچ جاؤ۔

۳۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا (احزاب) — اے ایمان لانے والو اللہ کو یاد کرو بہت زیادہ

اس آیت میں "ذکر کثیر" کے لفظ کو کچھ لوگوں نے گنتی کے معنوں میں لے لیا۔ وہ اس فکر میں لگ گئے کہ کتنا زیادہ ذکر ہو تو وہ کثیر کہا جائے گا۔ کچھ لوگوں نے تین سو کا نصاب بنایا۔ کسی نے پچاس ہزار کا، کسی نے ایک لاکھ کا۔ اس طرح کے عددی نصاب کا یہ بھی تقاضا تھا کہ ذکر کے لئے کوئی متعین لفظ یا فقرہ ہو۔ کیوں کہ الفاظ کے تعین کی صورت ہی میں اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مقررہ نصاب کا عدد پورا ہوا یا نہیں۔

مگر اس طرح کے کسی عمل کا مذکورہ آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں اللہ کے ذکر سے مراد اللہ کی یاد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کو بہت زیادہ یاد کرو۔ خدا کا اور خدا کی باتوں کا تصور اپنے اوپر اتنا زیادہ طاری کرو کہ وہ ہر وقت تم کو یاد آتا رہے۔ یہ ذکر در اصل گہرے تعلق باللہ کا نتیجہ ہے۔ وہ مصنوعی طور پر نہیں کیا جاتا بلکہ فطری طور پر اس وقت ظہور میں آتا ہے جب کہ آدمی کا اندرون خدا کے خوف و محبت سے بھر گیا ہو۔ بندہ نفسیاتی طور پر اپنے رب سے جڑ گیا ہو۔ ذکر حقیقی کی پہچان یہ ہے کہ تنہائیوں میں بندہ اپنے خدا کو یاد کرے اور شدت یاد سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑیں (ذکر اللہ خالیا ففاضت عیناہ) خدائے ذوالجلال کا ذکر آنسوؤں کے قطرات پر ہوتا ہے نہ کہ تسبیح کے دانوں پر۔

قرآن کا ایک حکم جس میں روح کو تڑپانے اور قلب کو پگھلانے کا سامان تھا، اس کو ورزش لسان کے ہم معنی سمجھ لیا گیا

جو قلب کو صرف سخت کرنے والا ہے نہ کہ وہ لطافتِ احساس کے اس مقام کو پہنچائے جس کو ذکر کہا گیا ہے۔

دعا کے بجائے عملیات

دعا (اللہ سے مانگنا) اہم ترین عبادت ہے۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے الدعاء مخ العبادۃ (دعا عبادت کا مغز ہے) الدعاء ھی العبادۃ (دعا ہی عبادت ہے)۔ مگر یہود کے اثر سے مسلمانوں میں دعا کے بجائے عملیات کا رواج چل پڑا۔

دونوں کا فرق سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ ایک شخص حکومت کے کسی شعبہ میں جگہ حاصل کرنے کے لئے ملازمت کا فارم بھرتا ہے۔ دوسرا شخص اسی ملازمت کے لئے یہ کرتا ہے کہ اپنے گھر میں سر نیچے اور پاؤں اوپر کرکے کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ یہ یقین کرتا ہے کہ اسی حال میں سات دن رہوں گا تو مجھ کو ملازمت مل جائے گی ——— پہلی مثال درخواست کی مثال ہے۔ دوسری مثال کرتب یا عملیات کی مثال۔

خدا سے مانگنے کا طریقہ صرف دعا کا طریقہ ہے۔ دعا یا درخواست وہ چیز ہے جو بندے کو براہ راست خدا سے ملاتی ہے۔ وہ اس کے اندر عبودیت کے جذبات ابھارتی ہے۔ وہ اس کو دین کی حقیقت اعلیٰ سے آشنا کرتی ہے۔ دعا میں بندہ اپنے رب کو یاد کرتا ہے۔ وہ اس کو پکارتا ہے۔ اس سے روتا گڑگڑاتا ہے۔ وہ اس کے قریب پہنچ کر ان ربانی کیفیات کا تجربہ کرتا ہے جو کسی اور طرح آدمی کو نہیں مل سکتیں۔ اللہ سے مانگنے کی کیفیت ابھرنا سب سے بڑا دینی حاصل ہے۔ مگر عملیاتی کرتب دکھانا اتنا ہی بے معنی ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

عملیات کی دو قسمیں ہیں ——— عبادتی عملیات اور ساحرانہ عملیات۔ عبادتی عملیات سے مراد وہ طریقے ہیں جن کے متعلق یقین کر لیا گیا ہے کہ ان کو دہرا لینے سے آخرت کی نعمتوں کے دروازے آدمی کے اوپر کھل جاتے ہیں۔ ساحرانہ عملیات وہ ہیں جو دنیا کی حاجتوں کو پورا کرنے کے لئے گھڑے گئے ہیں۔

راقم الحروف کی ملاقات ایک عالم سے ہوئی۔ ملاقات کے دوران انھوں نے ایک کتاب کا ذکر کیا جس میں محدثین کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے یہ جملہ لکھا گیا تھا: "انھوں نے زبردست محنت کرکے تمام حدیثیں جمع کیں اور ان کو ہمیشہ کے لئے کتابی صورت میں محفوظ کر دیا"۔ موصوف نے انتہائی خفگی کے ساتھ اس فقرہ کا ذکر کیا۔ میں حیران تھا کہ اس فقرہ میں آخر وہ کون سی خرابی ہے جس پر وہ اتنے شدید ردعمل کا اظہار کر رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر وہ بولے "آپ کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ محدثین نے تمام کی تمام حدیثیں جمع کر ڈالی ہیں"۔ مزید پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ مثال کے طور پر صلاۃ معکوس کی روایت محدثین کو نہیں ملی۔ جب کہ فلاں بزرگ نے اس کو اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔

صلاۃ معکوس کا مطلب ہے الٹی نماز۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ بستی کے باہر کوئی ایسا اندھا کنواں تلاش کیا جائے جس کے اوپر درخت اگا ہوا ہو۔ آدمی درخت سے رسی لگا کر اپنا پاؤں اس میں باندھے اور کنوئیں میں سر نیچے پاؤں اوپر کرکے لٹک جائے اور اسی حالت میں نماز ادا کرے۔ بتایا جاتا ہے کہ جو شخص ایک بار بھی یہ نماز پڑھے وہ دونوں

جہان کی سعادتیں سمیٹ لیتا ہے۔ میں نے کہا کہ بزرگ موصوف نے اس روایت کے ساتھ اس کی سند نقل نہیں کی ہے۔ اس لئے کیوں کر اس پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ اس پر موصوف بگڑ گئے اور بات ختم ہوگئی۔

بعد کے دور میں، خصوصاً متصوفانہ حلقوں میں مسلمانوں کے درمیان بہت سے عملیاتی طریقے رائج ہوئے۔ یہ سمجھ لیا گیا کہ ان پراسرار شکلوں کو ان کے ظاہری آداب کے ساتھ دہرا دینے سے معجزاتی نتائج برآمد ہوں گے۔ اس قسم کے عملیات نے خدا کے دین کو اس سطح پر پہنچا دیا جہاں روایتی کہانی کا طلسماتی خزانہ تھا۔ وہ "سم سم" کہنے سے کھلتا تھا۔ دوسرا کوئی لفظ مثلاً جم جم یا دم دم کہنے سے نہیں کھلتا تھا۔ اسی طرح گویا اسلام کے بھی کچھ منتر یا کرتب تھے۔ آدمی نے اگر ان کو ظاہری صحت کے ساتھ دہرا دیا تو اس کے بعد نجات اور سعادت کے تمام دروازے اس کے لئے کھل جائیں گے، ٹھیک ویسے ہی جیسے "سم سم" کہنے سے طلسماتی خزانہ کے دروازہ کا کھل جانا۔ مگر یہ وہ اسلام ہے جو دوسری قوموں کے اثر سے لیا گیا ہے۔ قرآن وحدیث کے اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اسلامی عبادت انابت الی اللہ (زمر ۱۷) کا نام ہے۔ اس کی حقیقت خدا کے آگے دل کا جھکاؤ ہے نہ کہ اعضاء وجوارح کے ذریعہ کوئی کرتب دکھانا۔

قرآن میں ساحرانہ عملیات کو کفر کہا گیا تھا (بقرہ ۱۰۲) مگر ایک خوبصورت تاویل کرکے اس کو اسلام میں داخل کر لیا گیا۔ مولانا اشرف علی تھانوی مذکورہ آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> "سحر میں اگر کلمات کفریہ ہوں مثل استعانت بہ شیاطین یا کواکب وغیرہ تب تو کفر ہے۔ اور اگر کلمات مباحہ ہوں تو اگر کسی کو خلاف اذن شرعی کسی قسم کا ضرر پہنچایا جائے اور کسی غرض ناجائز میں استعمال کیا جاوے تو فسق اور معصیت ہے۔ اور اگر ضرر نہ پہنچایا جائے نہ اور کسی غرض ناجائز میں استعمال کیا جاوے تو اس کو عرف میں سحر نہیں کہتے بلکہ عمل یا تعویذ گنڈہ کہتے ہیں اور وہ مباح ہے۔" (تفسیر بیان القرآن)

اس تاویل کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن جو فلاح آخرت کا راستہ دکھانے کے لئے آیا تھا، اس کو فلاح دنیا کا موضوع بنا لیا گیا۔ ہر قسم کے دنیوی مقاصد میں قرآن کو استعمال کیا جانے لگا۔ اسرائیلی روایات کے تحت عملیات کا جو علم سینہ بہ سینہ چلا آرہا تھا، اس کے علاوہ خود "کتاب محفوظ"، بھی طرح طرح کے عملیاتی نسخوں کا قیمتی ماخذ بن گئی۔

"اعمال قرآنی" کے نام پر مسلمانوں نے جو سفلی طریقے رائج کئے ان میں سے ایک وہ ہے جس کو قرآنی سورتوں کے "خواص"، کہا جاتا ہے۔ یہ خواص سب کے سب دنیوی نوعیت کے ہیں۔ حتی کہ یہود کی تقلید میں ہر سورہ کے اعداد مقرر کئے گئے ہیں اور ان کے نقوش بنا کر حاجات دنیا میں استعمال کیا جاتا ہے۔ بے شمار لوگوں نے تعویذ گنڈوں کی دکانیں کھول لی ہیں اور قرآن کو ایک تجارت بنا کر رکھ دیا ہے۔ مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ سورہ مریم کے اعداد دو لاکھ ننانوے ہزار چھ سو چوالیس ہیں۔ اس کے اعداد کا نقش حسب ذیل ہے۔

۹۶۵۵۱	۹۶۹۴۴	۹۶۵۴۹
۹۶۵۴۹	۹۶۵۴۸	۹۶۵۵۳
۹۶۵۴۷	۹۶۵۵۲	۹۶۵۴۵

ایک بہت بڑے بزرگ لکھتے ہیں — "اگر باغ ویران شدہ میں درختوں کے ساتھ سورہ مریم کا یہ نقش باندھ دیں تو باغ گلہائے شگفتہ اور ثمر سے بھرپور ہو جائے" ان اعمال کے نتیجہ میں نہ صرف قرآن ایک سستا دنیوی نسخہ بن کر رہ گیا بلکہ وہ قوم کے اندر توہمات پیدا کرنے کا سبب بن گیا۔ کیوں کہ اس قسم کے نقش تعویذ سے کبھی کوئی ویران باغ پھولوں اور پھلوں سے لدا ہوا چمن نہیں بن سکتا۔ مزید یہ کہ جس قوم میں اس قسم کی عملیات کا رواج ہو جائے اس کے اندر کبھی صحیح معنوں میں خدا پرستانہ مزاج پیدا نہیں ہو سکتا۔ آدمی جب دعا کرتا ہے تو وہ اللہ سے مانگتا ہے اس کی توجہ تمام تر اللہ کی طرف ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جب وہ عملیات کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو اس کی توجہ اس عمل کے پُراسرار خواص پر لگی رہتی ہے۔ دعا میں آدمی اللہ سے جڑتا ہے اور عملیات میں خود عملیات سے یا ان پراسرار اسباب سے جن کے متعلق اس کا گمان ہوتا ہے کہ وہ عملیات کے پیچھے کام کر رہے ہیں —— صلاۃ التسبیح اور ختم خواجگان سے لے کر نقش تعویذ تک۔ جو بے شمار عملیات مسلمانوں میں رائج ہوئے، انھوں نے دین خداوندی کو دین یہودیت بنا کر رکھ دیا ہے۔

ذاتی حکم کو خارج کی طرف موڑ دینا

قرآن میں اللہ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے: وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ (سیدھی ترازو تولو انصاف سے اور مت گھٹاؤ تول کو) اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ باہمی تعلقات میں عدل پر قائم رہیں۔ کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے نہ کسی کا حق دبائے۔ ترازو کی طرح ہر ایک سے انصاف کا معاملہ کیا جائے۔ یہ آیت آدمی کو ابھارتی ہے کہ وہ اپنی ذات کو عدل و انصاف کی راہ پر ڈال دے۔ لیکن اگر کسی کے ذہن میں آیت کا یہ مطلب بیٹھ جائے کہ "لوگوں کے ترازو کو سیدھا کرو"، تو سارا معاملہ الٹ جائے گا۔ اب اس آیت میں اس کی اپنی ذات کے لئے کوئی غذا نہ ہوگی۔ وہ اس حکم کا مطلب یہ سمجھے گا کہ دوسروں کے اوپر "داروغۂ انصاف" بن کر کھڑا ہو جائے۔ وہ اپنی اصلاح کی فکر کرنے کے بجائے دوسروں سے لڑنا شروع کر دے گا۔ خواہ اس لڑائی کا نتیجہ عملاً شدید تر بے انصافی کو لانے کے ہم معنی کیوں نہ بن جائے۔

یہی صورت ان لوگوں کے ساتھ پیش آئی ہے جو دین کو "اسٹیٹ" کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ذہن کی وجہ سے دین کو ایک ریاستی نظام کے روپ میں دیکھنے لگے ہیں۔ دین ان کے لئے حکومتی امور کا موضوع ہے نہ کہ حقیقۃً ذاتی اصلاح کا موضوع۔ اپنی دینی ذمہ داری کا تصور ان کے ذہن میں یہ ہے کہ دین کو ایک ریاستی نظام کی حیثیت سے زمین پر جاری و نافذ کیا جائے۔ چوں کہ سارے قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں جس سے اس قسم کا دینی مشن اخذ ہوتا ہو۔ اس لئے ان کے ذہن نے نہایت آسان سبیل یہ نکالی کہ انفرادی احکام کو اجتماعیات کی طرف موڑ دیا۔ "ترازو صحیح تولو"، کو اس مفہوم میں لے لیا کہ "لوگوں کے ترازو صحیح کرو"۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن احکام میں فرد کے لئے اپنی ذات کی غذا رکھی گئی تھی، وہ دوسروں کے خلاف تقریر اور ایجی ٹیشن کی خوراک لینے کا ماخذ بن کر رہ گئی۔

ا۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے —— أَقِيمُوا الدِّينَ (شوریٰ ۱۳) اس کا نشانہ آدمی کی اپنی ذات ہے۔ اس کا

مطلب یہ ہے کہ اپنی زندگی کو پوری طرح دین کے سانچے میں ڈھال لو۔ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو درست کرو اور بندوں کے جو حقوق تمھارے اوپر آتے ہیں، ان کو ٹھیک ٹھیک پورا کرو۔ مگر جن لوگوں کے ذہن میں دین کا مذکورہ "انقلابی" مفہوم بیٹھا ہوا ہے، ان کے لئے یہ آیت اس قسم کی ذاتی غذا کا سبب نہ بن سکی۔ انھوں نے اپنے ذہنی شاکلہ کے مطابق اس کا مطلب یہ نکال لیا کہ ——— دین کو بحیثیت ایک ریاستی نظام کے زمین پر نافذ کرو۔ وہ آیت جو آدمی کے اپنے اندرون کو جھنجوڑنے والی تھی، وہ صرف خارجی ہنگامہ آرائی کا عنوان بن کر رہ گئی۔ اس آیت کو پڑھ کر مذکورہ ذہن نے فوراً اس قسم کی تقریر شروع کر دی:

"قرآن مجید کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر پڑھے گا۔ اسے یہ بات صاف نظر آئے گی کہ یہ کتاب اپنے ماننے والوں کو کفر اور کفار کی رعیت فرض کر کے مغلوبانہ حیثیت میں مذہبی زندگی بسر کرنے کا پروگرام نہیں دے رہی ہے۔ بلکہ یہ علانیہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔ اپنے پیرؤوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ دین حق کو فکری، اخلاقی، تہذیبی اور قانونی و سیاسی حیثیت سے غالب کرنے کے لئے جان لڑا دیں اور ان کو انسانی زندگی کی اصلاح کا وہ پروگرام دیتی ہے جس کے بہت بڑے حصہ پر صرف اسی صورت میں عمل کیا جا سکتا ہے جب حکومت کا اقتدار اہل ایمان کے ہاتھ میں ہو۔"

یہ تقریر صرف اس لئے وجود میں آئی کہ وہ حکم جس کا مطلب تھا "دین پر قائم ہو" اس کو اس معنے میں لے لیا گیا کہ ——— "دین کو دوسروں کے اوپر قائم کرو"۔

۲۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ (نساء ۱۳۵) اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے ایمان لانے والو تم میں سے ہر شخص انصاف کو اختیار کرے، عدل کی روش پر خوب خوب قائم ہو جائے۔ اس حکم کا نشانہ آدمی کی اپنی ذات ہے۔ وہ انسان کو خود اپنی اصلاح کے بارے میں پوری طرح متحرک کرنا چاہتی ہے۔ مگر مذکورہ ذہن کے سامنے یہ آیت آئی تو اس نے اس کا ترجمہ کیا: "اے ایمان والو! انصاف کے علم بردار بنو"۔ اور اس کے بعد اس نے ان الفاظ میں اس کی تفسیر شروع کر دی:

"یہ فرمانے پر اکتفا نہیں کیا کہ انصاف کی روش پر چلو۔ بلکہ یہ فرمایا کہ انصاف کے علم بردار بنو۔ تمھارا کام صرف انصاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انصاف کا جھنڈا لے کر اٹھنا ہے۔ تمھیں اس بات پر کمربستہ ہونا چاہئے کہ ظلم مٹے اور اس کی جگہ عدل و راستی قائم ہو۔ عدل کو اپنے قیام کے لئے جس سہارے کی ضرورت ہے، مومن ہونے کی حیثیت سے تمھارا مقام یہ ہے کہ وہ سہارا تم بنو"۔

اس تقریر کو پڑھنے والا اس آیت سے جو اثر لے گا وہ یہ کہ آدمی انصاف کا جھنڈا لے کر اٹھے اور لوگوں کے اوپر انصاف کا نظام قائم کرے۔ بالفاظ دیگر یہ آیت، مذکورہ تشریح کے خانہ میں خارجی مشن کا پیغام بن جاتی ہے۔ حالاں کہ آیت کا اس قسم کے خارجی مشن سے کوئی تعلق نہیں۔ آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ: "اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے بنو"۔ یہ آیت ہر بندۂ مومن کو ذاتی طور پر خطاب کر رہی ہے اور اس کو خدا کا یہ پیغام پہنچا رہی ہے کہ تم اپنی زندگی کے معاملات میں انصاف کی روش پر قائم رہنے کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرو۔ اپنے آپ کو انتہائی

حد تک انصاف کا عامل بناؤ ـــــ آیت کے اگلے الفاظ مزید تاکید کر رہے ہیں کہ جب کسی سے اختلاف ہو جائے اس وقت بھی انصاف کی روش کو نہ چھوڑو۔ ایک حکم الٰہی جس میں ہدایت کی ذاتی غذا تھی، زاویہ نگاہ بدل جانے کی وجہ سے وہ خارجی دنیا کے خلاف تقریری کمال دکھانے کا عنوان بن گیا

۳۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے :

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً (بقرہ ـ ۲۰۸) یہ آیت بھی اہل ایمان کو انفرادی طور پر خطاب کر رہی ہے اور ہر شخص سے کہہ رہی ہے کہ تم اپنی زندگی کو اسلام کے رنگ میں رنگ لو، اپنے عقائد اور اپنے اخلاق و معاملات میں اسلامی تعلیمات کو پوری طرح اختیار کر لو۔ اس میں ہر بندۂ مومن کے لئے ذاتی ہدایت کا سامان ہے۔ اس آیت میں ہر شخص اپنے رب کو اپنے آپ سے خطاب کرتے ہوئے پاتا ہے۔ مگر مذکورہ ذہنی مزاج پیدا ہو جائے تو آیت کو پڑھتے ہی آپ کا ذہن خارجی دنیا کی طرف مڑ جائے گا۔ آپ اس کو تلاوت کر کے حسب ذیل تقریر شروع کر دیں گے :

"لوگو، قرآن کی یہ آیت ہمیں ایک عظیم انقلابی پروگرام دے رہی ہے۔ وہ مسلمانوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ انھیں اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی حکومت کا نظام قائم کر دیں۔ خاندان سے لے کر پارلیمنٹ ہاؤس اور بین اقوامی زندگی تک کوئی گوشہ حکومت خداوندی سے باہر نہ رہے"۔ بظاہر یہ تقریر بڑی شان دار معلوم ہوتی ہے۔ مگر وہ ایک ایسے تقریری ریکارڈ کی مانند ہے جو خالی میدان میں بجایا جا رہا ہو، جس کا نہ کوئی سننے والا ہو اور نہ اثر لینے والا۔

۴ ۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (یوسف ـ ۶۷)

اس آیت کا ترجمہ یہ ہے : "حکم تو بس اللہ ہی کا ہے" ـــ مطلب یہ کہ اس عالم میں طاقت و اقتدار کے تمام سرے خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ انسان خواہ کچھ بھی سوچے اور کتنی ہی تدبیریں کرے۔ مگر وہی ہوگا جس کی اجازت خدا دے گا۔ خدا کی مرضی کے بغیر اس کائنات میں کوئی واقعہ نہیں ہو سکتا۔ یہ آیت آدمی کو یاد دلاتی ہے کہ وہ خدا کے مقابلہ میں کس قدر عاجز ہے۔ وہ یہ سبق دیتی ہے کہ انسان گھمنڈ کی روش ترک کر دے۔ وہ مکمل طور پر خدا پر بھروسہ کرے۔ اپنے معاملات میں اسی سے مدد کی درخواست کرے۔

مگر مذکورہ ذہن کے لئے آیت میں اس قسم کی ذاتی غذا نہیں ہوگی۔ آیت میں ایک ایسے اقتدار کا ذکر ہے جو بالفعل قائم ہے۔ مگر وہ اس سے ایک ایسا اقتدار نکال لے گا جو اسے اپنی انقلابی جدوجہد کے ذریعہ قائم کرنا ہے۔ وہ بس "حکم"، کا لفظ لے گا اور پھر اپنی تقریر شروع کر دے گا:

"اقتدار صرف خدا کا ہے۔ کسی شخص یا گروہ کو حق نہیں کہ زمین پر اپنا قانون جاری کرے۔ حکومتی اقتدار تمام تر خدا کا ہونا چاہئے۔ مومن کا مشن یہ ہے کہ غیر خدائی سیاست کی جتنی قسمیں زمین پر قائم ہیں ان کو ختم کر دے اور زندگی کے تمام شعبوں میں خدا کا اقتدار اعلیٰ قائم کر دے" ـــ آیت کا مدعا یہ تھا کہ خدا کی برتری یاد دلا کر انسان کو اس کا عبادت گزار بننے پر اکسایا جائے۔ مگر فوق الفطری حکم کو سیاسی حکم کے معنی میں لے کر اس سے سیاسی مشن نکال لیا گیا۔

۵ ۔ اسی طرح مثال کے طور پر لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ کو لیجئے۔

الٰہ کا مطلب ہے وہ ہستی جس کی طرف اپنی حاجتوں کے لئے رجوع کیا جائے۔ اور عبادت کے معنی ہیں پرستش۔ یہ مفہوم انسان کے اندر عجز و افتقار کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ اس میں اس کو یہ سبق ملتا ہے کہ بنانے بگاڑنے کا سارا اختیار صرف خدا کے پاس ہے۔ مجھے اپنی فلاح و نجات کے لئے اسی کی طرف دوڑنا چاہئے اور اسی کے آگے اپنے کو ڈال دینا چاہئے۔ لیکن مذکورہ ذہن اس آیت میں الٰہ کے معنی حاکم لے گا اور عبادت کو سیاسی اطاعت کے ہم معنی سمجھنے لگے گا۔ اس آیت کو پڑھ کر اس کے اندر جو جذبہ ابھرے گا وہ یہ کہ خدا ہی سیاسی حکمراں ہے اور اسی کی سیاسی اطاعت زمین پر قائم ہونی چاہئے۔" بظاہر یہ ایک اچھی اور صحیح بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس تشریح کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آیت سے عبودیت کی جو غذا ملنی چاہئے، وہ آدمی کو نہیں ملے گی۔ اس کو پڑھ کر اس کے اندر سیاست آرائی کا ذہن ابھرے گا۔ وہ حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن چلانے کو کام سمجھے گا۔ اس آیت سے اس کو سیاسی اکھیڑ پچھاڑ کی غذا ملے گی نہ کہ اللہ کے آگے اپنے کو جھکا دینے کی۔

ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دین کے مذکورہ تصور کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی کے ذہن میں حکم الٰہی کا نشانہ بدل جائے گا۔ اب اپنی ذات کے بجائے خارج کی دنیا وہ جگہ ہوگی جہاں وہ حکم الٰہی کی تعمیل کرنا چاہے گا۔ وہ اپنی زندگی کو بدلنے کے بجائے "نظام" کو بدلنے پر اپنی ساری نظریں جما دے گا۔ ایسے لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ سے غافل ہوں گے۔ مگر مسائل عالم کے موضوع پر گفتگو کرنے سے ان کی زبان کبھی نہیں تھکے گی۔ نماز کی "اقامت" سے انھیں زیادہ دلچسپی نہ ہوگی مگر وہ حکومت الٰہیہ قائم کرنے کا نعرہ بلند کریں گے۔ ان کا گھر جہاں وہ آج بھی قوام کی حیثیت رکھتے ہیں، اس میں اہل باطل کی روش کی تقلید ہو رہی ہوگی۔ مگر ملک کے اندر وہ قوام بننے کا نعرہ لگائیں گے تاکہ ملک سے باطل نظام کو ہٹایا جا سکے۔ ان کا سینہ خدا کی یاد سے خالی ہوگا مگر وہ براڈکاسٹنگ اسٹیشن پر قبضہ کرنے کی تحریک چلائیں گے تاکہ دنیا بھر میں خدا پرستی کا چرچا کیا جا سکے۔ "جزء دین" پر عمل کرنے میں وہ کوتاہ ہوں گے مگر "کل دین" کے نفاذ کے لئے وہ بین اقوامی کانفرنس کا انعقاد کریں گے۔ خواہ اس کا انعقاد عملاً وقت اور مال کے ضیاع کے ہم معنی کیوں نہ ہو۔

دینی اتحاد کے بجائے دینی اختلاف

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ فرمائی تھی کہ سابق اہل کتاب ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے، تم لوگ ۷۳ فرقوں میں بٹ جاؤ گے۔ یہ تنبیہ آج واقعہ بن چکی ہے۔ مسلمانوں میں مختلف ناموں سے بے شمار فرقے اور جماعتیں وجود میں آگئی ہیں۔ ہر ایک نے اپنا علیحدہ تنظیمی ڈھانچہ بنا رکھا ہے۔ ہر ایک کا اپنا لٹریچر ہے۔ حتیٰ کہ اپنی اپنی شرحیں اور تفسیریں تیار کر کے ہر ایک نے اپنا قرآن و حدیث بھی الگ کر لیا ہے۔ یہ صورت حکم الٰہی کے سراسر خلاف ہے۔ اللہ نے دینی اتحاد کی تاکید فرمائی تھی (آل عمران ۱۰۳) ہم نے اس کو دینی اختلاف میں تبدیل کر لیا۔ ایسی صورت میں کیسے ممکن ہے کہ اللہ کی رحمتیں اور نصرتیں ہمارے اوپر نازل ہوں۔

دینی اختلاف پیدا ہونے کی وجہ ہمیشہ ایک ہی رہی ہے۔ دین کے کسی اضافی جزء کو اعتقاداً یا عملاً وہ اہمیت دینا جو دین کے حقیقی اور اساسی جزء کو ہونی چاہئے۔ دین کے حقیقی حصہ کو قرآن میں الدین (شوریٰ ۱۳) اور اس کے اضافی اجزاء کو شرعۃ اور منہاج (مائدہ ۴۸) کہا گیا ہے۔ الدین سے مراد وہ ابدی تعلیمات ہیں جو تمام پیغمبروں کو یکساں طور پر دی جاتی رہیں۔ مثلاً توحید، اخلاص وغیرہ۔ شرعۃ سے مراد قانونی تفصیلات اور منہاج سے مراد پیغمبر کی سنت یا تعامل ہے۔* یہ تفصیلات اور تعامل وقتی حالات کے تابع ہوتے ہیں، اس لئے ان میں مختلف انبیاء کے یہاں فرق پایا جاتا ہے۔ قرآن میں حکم دیا گیا کہ صرف پہلی چیز کو مدار دین قرار دو۔ دوسرے امور میں توسع کا طریقہ اختیار کرو۔

اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے مندرجہ ذیل آیت پر غور کیجئے:

یاایہاالرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحاً انی بما تعملون علیم۔ وان ھٰذہٖ امتکم واحدۃً وانا ربکم فاتقون (مومنون ۵۳)	اے پیغمبرو پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک کام کرو۔ میں جانتا ہوں جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور یہ تمہارے دین کے لوگ سب ایک دین پر ہیں۔ اور میں تمہارا رب ہوں۔ سو مجھ سے ڈرو۔

اس آیت کے مطابق وہ واحد دین جو تمام پیغمبروں کے درمیان متفق علیہ ہے، یہ تھا ــــــ خوراک میں حلال و حرام کا لحاظ رکھنا، نیک عمل کرنا، اللہ کو علیم و خبیر جانتے ہوئے زندگی گزارنا، اللہ کو اپنا رب اور آقا بنانا، صرف اللہ سے ڈرنا۔ بعض دوسری آیتوں میں چند اور چیزوں کا اضافہ ہے۔ مثلاً حنیفیت، انابت الی اللہ، نماز، روزہ، شرک سے پرہیز (روم ـ ۳۱) اوپر کی آیت میں "عمل صالح" ان سب چیزوں کے لئے جامع لفظ ہے۔ عمل صالح میں مذکورہ متعین اعمال کے علاوہ وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو قرآن کی دوسری آیات سے بالفاظ صریح ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً روزہ، عدل، ترک ظلم وغیرہ۔

یہی ثابت شدہ اور متفق علیہ دین "دین قیم" ہے۔ اور دین میں اصل اہمیت انھیں چیزوں کی ہے۔ انھیں کو مدارِ دعوت بنانا ہے اور انھیں کی بنیاد پر امر و نہی کی مہم چلانا ہے (آل عمران ۱۰۴) ان کے سوا جو چیزیں شریعت اور منہاج سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں اپنے حالات کے لحاظ سے اگرچہ لازماً کوئی نہ کوئی ضابطہ اور طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ مگر اپنی نوعیت کے اعتبار سے ان کی حیثیت ہمیشہ اضافی ہوگی۔ اگر ان کے معاملہ میں وہ شدت اختیار کی جائے جو حقیقی امور کی ہے تو یہ سبل متفرقہ کا اتباع (انعام ۱۵۳) ہے جو صرف اختلاف امت پر منتج ہوتا ہے۔ کیوں کہ الدین ایک ہے۔ جب کہ شریعت اور منہاج میں فرق ہے اور لازماً فرق رہے گا۔ اس فرق کی وجہ سے ان کے معاملہ میں کلی اتحاد ممکن نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اگر آپ ایک ایسا کام کر رہے ہیں جس کی نوعیت شریعت اور منہاج کی ہے تو اس کو یہ عنوان مت

---

* (شرعۃ ومنھاجا) عن ابن عباس سبیلاً وسنۃً وکذا روی عن مجاھد وعکرمۃ وحسن البصری وقتادۃ والضحاک والسدی، ابن کثیر

دیکھئے کہ ـــــــ "یہی تمام انبیار کا مشن تھا"۔ شریعت اور منہاج میں مختلف طریقوں کا امکان ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ایسا ہوگا کہ کسی کے لئے ایک طریقہ قابل ترجیح ہوگا کسی کے لئے دوسرا۔ اب اگر اسی کو انبیار کا اصل مشن بتایا جائے تو مختلف لوگ مختلف چیزوں کو انبیار کا مشن سمجھنے لگیں گے اور نتیجۃً ایک دین میں کئی دین بن جائیں گے۔ اور وہ تفریق فی الدین وجود میں آئے گی جو اللہ کی نظر میں سخت مبغوض ہے۔

اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے شرعۃ اور منہاج کی ایک ایک مثال لیجئے۔

سیکڑوں برس سے مسلمانوں میں بار بار ایسے لوگ اٹھتے رہے ہیں جن کا کہنا تھا کہ لوگو "نماز ادا کرو"۔ مگر ان کوششوں نے امت کے اندر کبھی کوئی نمازی فرقہ پیدا نہیں کیا۔ آج کوئی ایسا تنظیمی ڈھانچہ نہیں ہے جو اس لئے علیحدہ سمجھا جاتا ہو کہ وہ لوگوں کو نماز کی تاکید کرتا ہے۔ اس کے برعکس کچھ اور لوگ اٹھے جنھوں نے اس قسم کے مسائل چھیڑے کہ نماز میں امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنی چاہئے یا نہیں۔ آمین دھیرے سے کہنا افضل ہے یا زور سے کہنا۔ رفع یدین کے ساتھ نماز درست ہے یا اس کے بغیر۔ اس قسم کی بحثوں نے ملت کو فرقوں میں بانٹ دیا۔ الگ الگ مدرسے، الگ الگ مسجدیں، الگ الگ جماعتی حلقے وجود میں آگئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو مسئلہ شرعۃ کی نوعیت کا تھا، اس کو انھوں نے الدین کی حیثیت دے دی۔ دین کا وہ حصہ جس میں ایک سے زیادہ طریقوں کی گنجائش تھی، اس کو دین کے اُس حصہ کی مانند بنانا چاہا جس میں کوئی ایک ہی طریقہ درست ہوتا ہے۔

اب منہاج کی ایک مثال لیجئے۔

مسلمان قرن اول سے لے کر اب تک ہر دور میں حکمرانوں سے نبرد آزما رہے ہیں۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان سیاسی مقابلوں کی وجہ سے امت میں کوئی علیحدہ فرقہ بن گیا ہو جو اس حیثیت سے جانا جاتا ہو کہ یہ "مسلم سیاسی فرقہ" ہے۔ ساری تاریخ میں صرف دو مستثنیٰ مثالیں ملتی ہیں۔ ایک شیعہ۔ دوسرے وہ لوگ جو موجودہ زمانہ میں اپنے کو حکومت الٰہیہ کا علم بردار کہتے ہیں۔ شیعہ گروہ پہلی صدی ہجری میں اسلامی سیاست کا جھنڈا لے کر اٹھا۔ مگر اس کی سیاست، دوسرے سیاسی لوگوں سے بنیادی طور پر مختلف تھی۔ دوسرے لوگوں نے سیاست کو صرف سیاست (بالفاظ دیگر عملی ضرورت) کے طور پر اختیار کیا تھا۔ جب کہ شیعہ حضرات نے سیاست کو مستقل عقیدہ قرار دیا۔ سیاست اپنی نوعیت کے اعتبار سے، منہاج کے ذیل کی چیز تھی جس کی صورت وقتی حالات کے لحاظ سے متعین ہوتی ہے۔ مگر شیعہ گروہ نے سیاست کو الدین کی طرح دائمی حکم ثابت کرنا چاہا ـــ خاص طرح کے مزاج کے سوا عام لوگ ان سے اتفاق نہیں کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امت کے اندر ایک نیا فرقہ وجود میں آگیا۔

موجودہ زمانہ میں جو لوگ حکومت الٰہیہ کے علم بردار ہیں، وہ ایک اور انداز سے اسی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمان کی دائمی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کا سیاسی نظام قائم کرنے کے لئے "اپنی جان لڑائے" کیونکہ یہی اصل دینی مشن ہے اور اسی کے لئے خدا نے اپنے تمام رسول بھیجے تھے۔ اسلامی حکومت بجائے خود یقیناً ایک مطلوب چیز ہے۔ مگر وہ منہاج کے ذیل کی چیز ہے نہ کہ الدین کے ذیل کی۔ وہ دین کا اضافی جزء ہے نہ کہ حقیقی جزء۔ یہ کوئی علی الاطلاق مشن نہیں ہے بلکہ وقتی حالات یہ طے کرتے ہیں کہ اس سلسلہ میں اہل ایمان کی کیا ذمہ داری ہے۔ چنانچہ سارے قرآن میں کوئی ایک آیت ایسی نہیں ہے جس میں بالفاظ صریح اس طرح کا حکم دیا گیا ہو یا اس کو انبیار کا مشن بتایا گیا ہو۔ ایسی حالت میں خاص طرح

کی ذہنی افتاد کے لوگ ہی اس اپچ کا ساتھ دے سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ اس عقیدہ کے گرد جمع ہوئے وہ عام امت سے الگ ایک قسم کا سیاسی فرقہ بن کر رہ گئے۔

اوپر کی آیات میں جن چیزوں کو "الدین" قرار دیا گیا ہے، اگر ان کی اقامت و پیروی کے لئے جدوجہد کی جائے تو امت میں کوئی نیا فرقہ وجود میں نہیں آئے گا۔ کیوں کہ یہ تمام کی تمام متفق علیہ چیزیں ہیں۔ ان کی تحریک سے اتحاد کی فضا ابھرے گی۔ اس کے برعکس شرعۃ اور منہاج کی نوعیت کی چیزوں کو لے کر اٹھنا اور کہنا کہ یہی الدین ہے، صرف تفریق فی الدین کا سبب بنے گا۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں اسی قسم کی چیزوں کو دعوت و تحریک کی بنیاد بنا کر اپنا وہ حال کر لیا ہے جس کی تصویر اس آیت میں نکی گئی ہے:

اَلَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (روم۔ ۳۲)	جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا اور ہو گئے فرقے فرقے۔

یہ فرقہ بندی کوئی معمولی چیز نہیں۔ یہ دین کی اصل روح کو ختم کر دینے والی ہے۔ دینی اتحاد کی فضا ہو تو آدمی خدا سے جڑتا ہے۔ لوگوں کی توجہ دین کے حقیقی تقاضوں پر لگی رہتی ہے۔ اس کے برعکس دینی اختلاف کی فضا ہو تو اصل دینی تقاضے دب جاتے ہیں۔ لوگ اہم کو چھوڑ کر غیر اہم کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اپنے حلقے سے وابستگی کا نام لوگوں کے نزدیک دین بن جاتا ہے۔ ان کو اس اعلیٰ ایمانی سطح کا تجربہ ہی نہیں ہوتا جب کہ آدمی ہر چیز سے اوپر اٹھ کر "خدا کے حضور میں چلنے لگتا ہے"۔

ورنہ ہم سنت الٰہی کی زد میں آجائیں گے

سابق اہل کتاب (بنی اسرائیل) کو خدا کی طرف سے جو مشن سپرد ہوا، وہ تبیین کتاب (آل عمران ۱۸۷) تھا یعنی اللہ کے بندوں کو اللہ کا پیغام پہنچانا۔ بعد کے دور میں جب ان پر زوال آیا تو وہ اس کام کو چھوڑ کر دوسری راہوں پر چل پڑے۔ تاہم اپنے نعروں اور تقریروں میں اب بھی وہ تورات ہی کی زبان استعمال کرتے تھے۔ گویا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اقامتِ تورات کے لئے کر رہے ہیں۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے موجودہ زمانہ کے یہودیوں کی صہیونی تحریک تمام تر ایک قومی تحریک ہے۔ مگر اس کے رہنما اپنی تقریروں اور تحریروں میں تورات کے حوالے دیتے ہیں۔ ایک ایسا کام جس کا خدائی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں، اس کو اس طرح پیش کر رہے ہیں گویا یہ سب کچھ خدائی احکام کی تعمیل میں کیا جا رہا ہے۔

یہود کے اس طرز عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے:

ویحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا فلا تحسبنهم بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (آل عمران ــ ۱۸۸)	وہ چاہتے ہیں کہ جو کام انھوں نے نہیں کیا، اس پر ان کی تعریف ہو۔ ان کو عذاب سے بچاؤ میں نہ سمجھو۔ اور ان کو دردناک سزا ہوگی۔

یہی معاملہ ہر اس قوم کا ہوتا ہے جس کو خدا کی کتاب کا حامل بنایا گیا ہو۔ بعد کے دور میں جب اس قوم پر زوال

آتا ہے اور وہ کتاب اللہ کو ایک چھوڑی ہوئی کتاب (فرقان ۳۰) بنا دیتی ہے تو یہ چھوڑنا صرف عملاً ہوتا ہے نہ کہ لفظاً۔ اس کی زندگی اور اس کی سیاست حقیقۃً دوسری راہوں پر چل رہی ہوتی ہے مگر اس کے رہنما اپنی غیر خدا پرستانہ تحریکوں کو ہمیشہ خدا پرستانہ اصطلاحات میں بیان کرتے ہیں۔ وہ ایک غیر دینی کام پر دین کا کریڈٹ لینا چاہتے ہیں۔" وہ چاہتے ہیں کہ ایک ایسے کام کے لئے ان کی تعریف کی جائے جس کو انھوں نے کیا نہیں"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لمبی مدت گزرنے کی وجہ سے دینی الفاظ اور تصورات اس قوم کی روایات میں شامل ہو جاتے ہیں۔ قومی قیادت کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ قوم کی مانوس دینی اصطلاحات میں کلام کرے۔ اس کے بغیر نہ رہنماؤں کا اعتماد قوم کے اندر قائم ہو سکتا اور نہ عوام کا پر جوش تعاون ان کو مل سکتا ——— یہی حال موجودہ زمانہ میں مسلم قیادت کا ہوا ہے۔ انھوں نے قومی جذبات کے تحت تحریکیں اٹھائیں اور ان کو اسلام کا تقاضا بلکہ انبیاء کا اصل مشن بتاتے رہے۔ انھوں نے ایک ایسے کام کا کریڈٹ لینا چاہا جس کو انھوں نے سرے سے انجام ہی نہیں دیا تھا۔

مسلم قیادت نے موجودہ زمانہ میں مغربی قوموں کے خلاف سیاسی آزادی کی تحریکیں چلائیں اور ان کو "جہاد" کا عنوان دیا۔ حالاں کہ جہاد خدا کے دین کی اشاعت وتبلیغ کے لئے جدوجہد کا نام ہے نہ کہ کسی ایسی سیاست کا جس کا مقصد یہ ہو کہ اجنبی حکمرانوں کو ہٹا کر ملکی لوگوں کو اقتدار کے تخت پر بٹھایا جائے۔ انھوں نے سیکولر مقاصد کے تحت متحدہ قومیت کا نعرہ لگایا اور اس کو جائز ثابت کرنے کے لئے "صحیفہ مدینہ" کا حوالہ دیا۔ حالاں کہ یہ صحیفہ مدینہ کے اوپر اسلام کے غلبہ کا اعلان تھا نہ کہ کسی مشترکہ سیاسی نظام میں مسلمانوں کی شمولیت کا۔ یہ صحیفہ کوئی دوطرفہ معاہدہ نہ تھا۔ وہ "خدا کے پیغمبر محمدؐ کی طرف سے ایک نوشتہ تھا مہاجرین قریش اور اہل یثرب کے لئے"۔ اس میں درج تھا: وانکم مهما اختلفتم فيه من شئ فان مردّه الى الله والى رسوله (اہل مدینہ کے درمیان جب کسی معاملہ میں اختلاف پیدا ہو تو اس کے فیصلہ کے لئے خدا اور اس کے رسول سے رجوع کیا جائے گا)۔ کسی اکثریت کا سیکولر ضمیمہ بننے کی کوشش سے اس صحیفہ کا کیا تعلق۔ انھوں نے معاشی اور سماجی حقوق کے حصول کے لئے احتجاج ومطالبات کی تحریک چلائی اور اپنے منشور میں یہ لکھا کہ ہم خیر امت کا کردار ادا کرنے کے لئے اٹھے ہیں۔ حالاں کہ جن اقوام کے خلاف وہ حقوق طلبی کی مہم لے کر اٹھے تھے، وہ ان کے لئے مدعو کی حیثیت رکھتی تھیں اور مدعو قوم سے "اجر" کا مطالبہ سراسر اسلام کے خلاف ہے۔ انھوں نے انسانی بھائی چارہ اور دنیوی امن کے لئے تقریری مہم چلائی اور کہا کہ یہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن تھا، کیونکہ دور جاہلیت کے حلف الفضول[1] میں آپ شریک ہوئے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ مظلوموں کی مدد اور حق دار کو ان کا حق دلانے کے اس معاہدہ میں آپ نے اپنی پندرہ سال کی عمر میں شرکت فرمائی تھی۔ نبوت ملنے کے بعد آپ نے فرمایا: لو دعیتُ به فی الاسلام لاجبت (زمانہ اسلام میں بھی اگر مجھے اس کے لئے بلایا جائے تو میں لبیک کہوں گا) مگر

---

[1] اس معاہدہ کا نام حلف الفضول اس لئے پڑا کہ اس میں یہ جملہ تھا: تُرَدُّ الفضول الى اهلها (سہیلی، روض الانف) یعنی مال ان کے مالکوں کو لوٹایا جائے گا۔

اولاً تو حلف الفضول تقریری دوڑ دوں کی کوئی مہم نہ تھی۔ وہ عملی دادرسی کا عہد نامہ تھا۔ دوسرے نبوت ملنے کے بعد آپ نے خود حلف الفضول کی تجدید نہیں کی بلکہ اس میں شرکت کو دوسروں کی پکار پر مشروط رکھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حلف الفضول بجائے خود ایک جائز اور مطلوب کام ہونے کے باوجود بہر حال فلاح دنیا کے ذیل کا ایک پروگرام تھا۔ جب کہ نبوت کا اصل مشن فلاح آخرت کا پیغام ہوتا ہے۔ اسی طرح کچھ قائدین نے اپنے ملک کے مسلم حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی مہم چھیڑ دی اور اعلان کیا کہ شریعت اسلامی کے نفاذ اور قیادت صالحہ کے قیام کے لئے ہم ایسا کر رہے ہیں۔ حالاں کہ صریح ہدایات کے مطابق اسلام میں یہ جائز ہی نہیں کہ مسلم حکمرانوں سے سیاسی منازعت کی جائے۔

اس قسم کی تمام "اسلامی" مہمیں جن میں مسلمان موجودہ زمانہ میں مشغول رہے ہیں وہ سب کی سب یُحِبُّونَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا کا مصداق ہیں۔ یہ ایک غیر اسلامی کام کے لئے اسلام کا کریڈٹ لینے کی کوشش ہے۔ اس اس قسم کی کوشش ہمیشہ خدا کی نصرت سے محروم رہتی ہے، اس لئے خواہ وہ کتنے ہی بڑے پیمانہ پر کی جائے، وہ بہر حال بے نتیجہ رہے گی۔ وہ امت کے لئے کسی حقیقی کامیابی کا باعث نہیں بن سکتی۔ بائبل کی روایات کے مطابق دارا بادشاہ (پانچویں صدی قبل مسیح) کے زمانہ میں ایک حجّی نبی گزرے ہیں۔ انھوں نے یہود کی بگڑی ہوئی حالت پر ان کو تنبیہ کی۔ انھوں نے تمثیلی زبان میں کہا:

> "رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی روش پر غور کرو۔ تم نے بہت سا بویا پر تھوڑا کاٹا۔ اور مزدور اپنی مزدوری سوراخ دار تھیلی میں جمع کرتا ہے۔ تم نے بہت کی امید رکھی اور دیکھو تھوڑا ملا اور جب تم اسے اپنے گھر میں لائے تو میں نے اسے اڑا دیا۔ کیوں۔ اس لئے کہ میرا گھر ویران ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنے گھر کو دوڑا چلا جاتا ہے۔ اس لئے نہ آسمان سے اوس گرتی ہے اور نہ زمین اپنا حاصل دیتی ہے۔ (باب اول)

یہی موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا انجام ہوا ہے۔ انھوں نے "بہت بویا پر تھوڑا کاٹا"۔ عالی شان تحریکوں اور دھواں دھار کانفرنسوں کا حاصل عملاً اتنا کم ہوتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہمارا ہر قائد اپنی "محنت کی کمائی" کو سوراخ دار تھیلی میں جمع کر رہا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۳ – ۱۷۶۲) نے احمد شاہ ابدالی کے ذریعہ مرہٹوں پر حملہ کرایا۔ سید احمد بریلوی (۱۷۸۶ – ۱۸۳۱) نے سکھوں سے جہاد کیا۔ مگر عملاً اس کا فائدہ صرف انگریز کو پہنچا۔ سید قطب مصری (۱۹۰۶ – ۱۹۶۶) اور ان کے ساتھیوں نے شاہ فاروق کے خلاف قربانیاں دیں۔ مگر اس کا فائدہ تمام تر فوجی افسروں کے حصہ میں چلا گیا ۔۔۔ پاکستان میں اسلام پسندوں نے جمہوریت کے ذریعہ اسلام کا اقتدار لانے کے لئے ۳۰ سال تک سرفروشی کی۔ مگر اس کا فائدہ مسٹر بھٹو اور جنرل ضیاء الحق جیسے لوگوں کو ملا۔ ۱۹۴۸ میں جامعہ ازہر سے ایک جلوس نکلا جس کی قیادت شیخ حسن البنا (۱۹۰۶ – ۱۹۴۸) کر رہے تھے۔ ہزاروں پرجوش مسلمانوں نے قاہرہ کی سڑکوں پر لبیک یا فلسطین (اے فلسطین ہم حاضر ہیں) کے نعروں کے ساتھ اسرائیل کے خلاف اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ پچھلے ۵۰ سال میں اس مہم میں جان و مال کی اتنی زیادہ

قربانیاں دی گئی ہیں جو تین سو سالہ صلیبی جنگوں کی مجموعی قربانی سے بھی زیادہ ہیں۔ مگر فلسطین کا مسئلہ نہ صرف یہ کہ حل نہیں ہوا۔ بلکہ جہاں وہ ۱۹۴۴ میں تھا، آج اس سے کہیں زیادہ دور جا چکا ہے۔

اس مدت میں ہمارے درمیان ایسے قائدین اٹھے جن کو بادشاہوں تک کا تعاون حاصل تھا (شاہ ولی اللہ، جمال الدین افغانی) ہم نے ایسی تحریکیں اٹھائیں جنھوں نے عظیم ترین آبادی والے ملک کے تقریباً تمام مسلمانوں کی تائید حاصل کرلی (مسلم لیگ) حتیٰ کہ ہمارے درمیان ایسی بھی تحریکیں اٹھیں جن کو تمام عالم اسلام کی مشترکہ حمایت حاصل تھی (فلسطینی تحریک) اس کے باوجود صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکی۔ آج بھی یہ حال ہے کہ کسی جماعت کو یہ کہنے کا موقع مل رہا ہے کہ اس کے دینی اجتماعات میں دس دس لاکھ مسلمان شریک ہوتے ہیں (ہندستان) کسی اسلامی تحریک کے قائدین اپنی مقبولیت کو بتانے کے لئے یہ پُر فخر الفاظ بول رہے ہیں کہ ملک کا ہر فرد ان کے اسلامی نظام کے پروگرام سے اتفاق کرتا ہے (پاکستان) یہ سب کچھ ہے مگر وہی چیز حاصل نہیں ہوتی جو تمام قائدین اور جماعتوں کا مشترک مقصد ہے یعنی اسلام کا غلبہ۔

اصل یہ ہے کہ مسلمان کی حیثیت اس دنیا میں خدا کے نمائندہ کی ہے۔ وہ آسمانی کتاب کے حامل ہیں۔ ایسے کسی گروہ کی قسمت تمام تر اس کتاب کے ساتھ بندھی ہوئی ہوتی ہے۔ خدا کی نظر میں ان کی قیمت اسی وقت ہے جب کہ وہ دنیا کی قوموں کے سامنے خدا کی کتاب کا اعلان و اظہار کر رہے ہوں۔ اس کام کو چھوڑنے کے بعد وہ خدا کی نظر میں اسی طرح بے قیمت ہو جائیں گے جس طرح پچھلے حاملین کتاب بے قیمت ہو گئے۔ کوئی دوسرا کام خواہ کتنے ہی بڑے پیمانہ پر کیا جائے، خدا کی نظر میں ہم کو قیمت والا نہیں بنا سکتا۔

۱۹۶۲ میں چین نے ہندستان کی مشرقی سرحد پر حملہ کیا۔ چینی فوجیں آسام کے علاقہ میں گھس آئیں۔ اس وقت تیز پور (آسام) میں جو ہندستانی کمشنر تھا وہ اپنا دفتر چھوڑ کر بھاگ گیا اور اپنے وطن میں آکر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مقیم ہو گیا۔ حکومت کو معلوم ہوا تو اس نے کمشنر کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا۔ اس پر سرکاری ڈیوٹی چھوڑنے کا مقدمہ چلایا گیا اور اس کو سخت سزا دی گئی۔ بچوں میں رہنا یا اپنے گھر کا انتظام سنبھالنا عام آدمیوں کے لئے کوئی غلط بات نہیں۔ مگر کمشنر کے لئے یہی بات ناقابل معافی جرم بن گئی۔ کیوں کہ کمشنر کی قیمت "تیز پور" میں تھی۔ گھر کے اندر نہ تھی۔ اگر وہ اپنے ڈیوٹی کے مقام پر جما رہتا تو اس وقت وہ حکومت کا نشان ہوتا۔ بلکہ وہ حکومت کے لئے عزت کا سوال بن جاتا۔ حکومت اس کو بچانے کے لئے اپنی پوری طاقت لگا دیتی۔ مگر جب اس نے اپنی وہ جگہ چھوڑ دی جہاں اس کو رکھا گیا تھا تو حکومت کی نظر میں اس نے اپنی قیمت کھو دی۔ اب وہ ہر حال میں مجرم تھا۔ خواہ کسی اور میدان میں وہ کتنی ہی سرگرمیاں دکھا رہا ہو، خواہ وہ بظاہر صحیح اور مفید ہی کام کیوں نہ کر رہا ہو۔

ہماری نجات اور کامیابی کی واحد صورت یہ ہے کہ ہم خدا کی کتاب کی طرف لوٹیں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو اندیشہ ہے کہ ہم بھی اسی طرح سنت الٰہی کی زد میں آجائیں جس طرح اس سے پہلے یہود آ گئے۔ اور اس کے بعد نہ دنیا میں ہماری کوئی قیمت ہو اور نہ آخرت میں۔ دوسرے دوسرے کاموں کو دعوت قرآن اور احیاء سنت کا نام دینا صرف ہمارے وزر (بوجھ) میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ کسی بھی حال میں ہماری نجات کا سبب نہیں بن سکتا۔

ایمانی طاقت

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ کو محوری طاقتوں کے مقابلہ میں کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر "فریڈم ایٹ مڈ نائٹ" کے مصنف کے الفاظ میں جنگ کے بعد برطانیہ کے پاس اتنا تیل بھی نہ تھا کہ وہ اپنی فتح کی خوشی میں چراغ جلا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ میں فتح پانے کے باوجود وہاں یہ انقلاب آیا کہ ایک طرف اندرونی طور پر فاتح چرچل کی حکومت ختم ہوگئی اور دوسری طرف برطانیہ کو اپنے نوآبادیاتی علاقوں کو آزادی دینے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔

یہی معاملہ فرد کے لئے بھی ہے اور یہی قوم کے لئے بھی۔ جنگ ہتھیاروں سے لڑی جاتی ہے۔ مگر ہتھیار صرف تباہی لاتے ہیں، وہ کبھی کوئی صالح نتیجہ پیدا نہیں کرتے۔ ہتھیار کی طاقت کا حصول ہمیشہ اپنی بربادی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ مزید اس اضافہ کے ساتھ کہ ہتھیاروں کے ذریعہ جیتنے والا بھی اتنا ہی ہارتا ہے جتنا ہارنے والا۔ کیونکہ جب لڑائی ختم ہوتی ہے تو دونوں فریق تباہ ہو چکے ہوتے ہیں۔

مگر یہاں ایک اور ہتھیار ہے۔ اس کی طاقت زیادہ ہے اور اس کی فتح بھی یقینی۔ یہ ہے ایمان ویقین کی طاقت۔ اخلاق وانسانیت کی طاقت، اصول ونظریات کی طاقت۔ اس کی قوت بے پناہ ہے۔ اس کی مار ہمیشہ بے خطا ہوتی ہے۔ اس سے آدمی کے اندر وہ ہمت پیدا ہوتی ہے کہ بظاہر خالی ہاتھ ہو کر بھی اپنے حریف سے کامیاب مقابلہ کر سکے۔ یہ ایک ایسی تسخیری قوت ہے جو دشمن کو اپنا دوست بنا لیتی ہے، جو غیر کو اپنے اثاثہ میں شامل کر لیتی ہے۔

جنگ ومقابلہ کے طریقہ میں ہتھیار استعمال ہوتے ہیں اور ایمان اور اخلاق کے طریقہ میں صبر۔ صبر بے ہتھیار والی لڑائی کا ہتھیار ہے۔ عام طور پر ایسا ہے کہ جب کسی کی طرف سے کوئی ناپسندیدہ بات سامنے آتی ہے تو آدمی صرف ایک بات سوچتا ہے — "یہ ہمارا مخالف ہے اس کو کچل ڈالو"۔ اور پھر ہر ایک اپنی طاقت اور حالات کے بقدر دوسرے کو کچلنے کی کارروائی شروع کر دیتا ہے۔ مگر یہ انسان کے امکانات کا بہت ناقص اندازہ ہے۔ خدا نے انسان کی نفسیات میں بے حد لچک رکھی ہے۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ انسان کبھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتا۔ وہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ اسی لئے قرآن وحدیث میں صبر کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ صبر کسی بے عملی کا نام نہیں۔ صبر کا مطلب وقتی تلخیوں کو برداشت کر کے مستقبل کے انسان کا انتظار کرنا ہے۔ ہر آدمی کے اندر ہمیشہ ایک اور انسان چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اور صابرانہ طریقہ اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس آنے والے وقت کو آنے کا موقع دیا جائے جب کہ "آج" کے انسان کے اندر چھپا ہوا "کل" کا انسان برآمد ہو جائے۔

خدا کا اعتماد سب سے بڑا اعتماد

دوسری جنگ عظیم میں جب اتحادی طاقتوں نے بالآخر جرمنی کو شکست دے دی تو تمام نازی لیڈروں کو اسی برلن میں پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا گیا جہاں وہ ساری دنیا کے قتل کا منصوبہ بنایا کرتے تھے یہ واقعہ اکتوبر ۱۹۴۶ کا ہے۔ ہٹلر اور گوئرنگ نے تو پہلے ہی خودکشی کرلی تھی۔ اس کے بعد ربن ٹراپ، کیٹل، کیلٹن برنر، الفریڈ روزن برگ، فرنیک، ولہم فرک جولیس، ساکل، جوڈل، سسس انکوارٹ اور دوسرے نازی لیڈر جو زندہ بچے تھے، ایک ایک کرکے ختم کر دیے گئے۔

یہ وہ لیڈر تھے جنھوں نے چالیس لاکھ یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور ان کی املاک پر قبضہ کرلیا تھا۔ انھوں نے ایک ایسی خونی جنگ چھیڑی تھی جس میں ان کے "مفروضہ دشمنوں کے علاوہ خود جرمن قوم کے ۲۰ لاکھ سپاہی کام آئے۔ انھوں نے لاکھوں انسانوں کو بیگار کیمپوں (Concentration Camp) میں جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ ان کی درندگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے ملک کے بوڑھے، معذور اور بیمار لوگوں کو —— "جرمنی کے لئے بے فائدہ" قرار دے کر گولی سے اڑا دیتے۔ مقتول بچوں، لاشوں سے اٹے ہوئے گڑھوں اور بیواؤں اور یتیموں کے غول کو دیکھ کر بھی ان کا پتھر جیسا دل پسیجنا نہیں جانتا تھا۔

مگر شکست کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ جب وہ پھانسی کے تختے کے سامنے لائے گئے تو ان کے چہرے زرد تھے۔ ان کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں، وہ کچھ بولنا چاہتے تو معلوم ہوتا کہ زبان ان کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ شعلہ بیان لیڈر گویائی کی طاقت کھو چکے تھے۔ جو دوسروں کی زندگیوں سے کھیلتے تھے وہ اپنے انجام کو دیکھ کر پاگل ہو گئے۔

جس بہادری کا انحصار صرف مادی سہارے پر ہو وہ اس وقت بزدلی میں تبدیل ہو جاتی ہے جبکہ مادی سہارا اس سے چھن جائے۔ البتہ جس کا اعتماد خدائے لازوال پر ہو، وہ ہر حال میں شجاعت وعزیمت کی چٹان بنا رہتا ہے۔ خواہ مادی سہارے اس کا ساتھ دے رہے ہوں یا اس قسم کے تمام خارجی سہاروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔

اگر خدا کی مدد کا یقین دلوں میں زندہ ہو تو آدمی کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہو سکتا۔ وہ طاقت ور دشمنوں میں گھر کر بھی عزم وہمت کی چٹان بنا رہے گا۔ قاتلوں اور غارت گروں کے ہجوم سے بھی وہ اس طرح زندہ سلامت نکل آئے گا جیسے وہاں کسی کا وجود ہی نہ تھا۔

اندھیرے کے بعد اجالا

قبائلی نظام میں آدمی قبیلہ کی حمایت کے تحت زندگی گزارتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے ابتدائی زمانہ میں اپنے چچا ابوطالب کی حمایت میں رہے جو قبیلہ بنو ہاشم کے سردار تھے۔ نبوت کے دسویں سال ابوطالب کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد قبائلی روایات کے مطابق ابولہب قبیلہ بنو ہاشم کا سردار مقرر ہوا۔ اس نے آپ کی حمایت سے انکار کردیا۔ اب آپ نے ارادہ کیا کہ کسی دوسرے قبیلہ کی حمایت حاصل کرکے اپنا دعوتی کام جاری رکھیں۔ اس غرض کے تحت آپ نے طائف کا سفر فرمایا۔

طائف مکہ کے جنوب مشرق میں ۶۵ میل کے فاصلہ پر ایک سرسبز و شاداب بستی تھی۔ وہاں آپ کے بعض رشتہ دار تھے۔ چنانچہ آپ اپنے خادم زید بن حارثہ کو لے کر طائف پہنچے۔ اس وقت وہاں کی آبادی میں تین ممتاز سردار تھے۔ عبدیالیل، مسعود اور حبیب۔ آپ ان تینوں سے ملے۔ مگر ہر ایک نے آپ کا ساتھ دینے یا آپ کی حمایت کرنے سے انکار کردیا۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا: خدا نے اگر تم کو رسول بنایا ہو تو میں کعبہ کا پردہ پھاڑ ڈالوں۔ دوسرے نے کہا: خدا کو کیا تمھارے سوا کوئی نہ ملا تھا جس کو وہ رسول بنا کر بھیجتا۔ تیسرے نے کہا: خدا کی قسم میں تم سے بات نہیں کروں گا۔ اگر تم رسول ہو تو تمھارا جواب دینا گستاخی ہے اور اگر تم جھوٹے ہو تو میرے لئے مناسب نہیں کہ میں تم سے بات کروں (فقال له احدهم هو يمرط ثياب الكعبة إن كان الله ارسلك۔ وقال الآخر اما وجد الله احداً ايرسله غيرك۔ وقال الثالث والله لا اكلمك ابداً۔ لئن كنت رسولا من الله كما تقول لانت اعظم خطراً من ان ارد عليك الكلام ولئن كنت تكذب على الله ما ينبغي لي ان اكلمك، سيرة ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۲۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غمگین ہو کر واپس ہوئے۔ مگر ان لوگوں نے پھر بھی آپ کو نہ بخشا۔ انھوں نے بستی کے لڑکوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔ وہ گالیوں اور پتھروں سے آپ کا پیچھا کرتے رہے۔ آپ کے خادم زید بن حارثہ نے اپنے کمبل سے آپ کو آڑ میں لینے کی کوشش کی۔ مگر وہ آپ کو بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور آپ کا جسم لہولہان ہوگیا۔

بستی سے کچھ دور جا کر عتبہ اور شیبہ دو بھائیوں کا انگور کا باغ تھا۔ یہاں پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی اور آپ نے اس باغ میں پناہ لی۔ آپ زخموں سے چور تھے اور اللہ سے دعا کر رہے تھے کہ خدایا میری مدد فرما۔ مجھے تنہا نہ چھوڑ دے۔

عتبہ اور شیبہ دونوں مشرک تھے۔ مگر جب انھوں نے آپ کا حال دیکھا تو ان کو آپ کے اوپر

رحم آگیا۔ انھوں نے اپنے نصرانی غلام کو بلایا جس کا نام عداس تھا۔ انھوں نے عداس سے کہا کہ ان انگوروں کے کچھ خوشے لو اور ان کو ایک برتن میں رکھ کر اس آدمی کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ اس میں سے کھائے۔ عداس نے ایسا ہی کیا۔ وہ انگور لے کر آیا اور اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھ دیا اور کہا کہ یہ کھاؤ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس کو اپنے ہاتھ میں لیا تو بسم اللہ کہا اور پھر کھایا۔

عداس نے آپ کے چہرہ کی طرف دیکھا اور کہا: خدا کی قسم یہ جو آپ نے کہا، اس ملک کے لوگ ایسا نہیں کہتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اے عداس، تم کس ملک کے رہنے والے ہو اور تمھارا دین کیا ہے۔ عداس نے کہا: میں نصرانی ہوں اور میں نینوا (عراق) کا رہنے والا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: مرد صالح یونس بن متی کے شہر کا۔ عداس نے کہا: آپ کو کیسے معلوم کہ یونس بن متی کون تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: وہ میرے بھائی ہیں۔ وہ نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں (ذاک اخی۔ کان نبیا وانا نبی) یہ سن کر عداس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھک پڑا اور آپ کے سر اور ہاتھ اور پاؤں کو چومنے لگا۔

عتبہ اور شیبہ اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا: دیکھو اس شخص نے تمھارے غلام کو خراب کر دیا۔ عداس جب لوٹ کر آیا تو انھوں نے اس سے کہا: عداس تمھارا برا ہو۔ تم کو کیا ہوا کہ تم اس کے سر اور ہاتھ اور پاؤں کو چومنے لگے۔ عداس نے کہا اے میرے آقا، زمین پر اس سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ اس آدمی نے مجھ کو ایسی بات بتائی جس کو صرف ایک نبی ہی جان سکتا ہے۔ دونوں نے کہا: اے عداس، تمھارا برا ہو۔ وہ تم کو تمھارے دین سے پھیر نہ دے۔ کیونکہ تیرا دین اس کے دین سے بہتر ہے (سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۳۰)

خدا کے رسول کو ایک ہی سفر میں مختلف لوگوں سے تین الگ الگ قسم کے سلوک کا تجربہ ہوا:

ایک نے آپ کے اوپر پتھر پھینکے۔

دوسرے نے آپ کی ضیافت کی۔

تیسرے نے آپ کی نبوت کا اقرار کر لیا۔

اس واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ یہ سبق کہ اس دنیا میں امکانات کی کوئی حد نہیں۔ یہاں اگر چٹیل میدان ہیں تو وہیں سایہ دار درخت بھی کھڑے ہوئے ہیں۔ دنیا کی زندگی میں کچھ لوگوں سے اگر برے سلوک کا تجربہ ہو تو آدمی کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ آدمی اگر خود سچائی پر قائم رہے۔ وہ اپنے دل کو منفی جذبات سے بچائے تو ضرور اس کو خدا کی مدد حاصل ہوگی۔ ایک قسم کے لوگ اگر اس کا ساتھ نہ دیں گے تو کچھ دوسرے لوگوں کے دل اس کے لئے نرم کر دئے جائیں گے۔

موت کے غار میں بھی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں دعوت کا آغاز کیا تو آپ کی شدید ترین مخالفت کی گئی۔ آپ کو ہر قسم کی تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ آپ کو دبانے اور ناکام کرنے کے لئے وہ لوگ جو کچھ کر سکتے تھے وہ سب انھوں نے کیا۔ مگر آپ کا مشن بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ مدینہ کے لوگوں تک اسلام کی آواز پہنچی۔ وہاں کثرت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ آپ کے ساتھ دوسرے مسلمانوں کو بھی مکہ والے بہت ستاتے تھے۔ آپ نے مکہ کے مسلمانوں سے کہا مدینہ میں اللہ نے تمھارے لئے کچھ بھائی اور مددگار مہیا کر دئے ہیں، تم لوگ وہاں چلے جاؤ۔ لوگ ایک ایک کر کے جانے لگے۔ قریش کو اس منصوبہ کا علم ہوا تو انھوں نے کوشش کی کہ لوگوں کو جانے سے روکیں۔ کچھ لوگوں کو مارا، کچھ لوگوں کو پکڑ کر گھروں میں بند کر دیا۔ تاہم بیشتر لوگ کسی نہ کسی طرح مکہ سے مدینہ پہنچ گئے۔

آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باری تھی۔ قریش کو اندازہ ہو گیا کہ تمام مسلمانوں کو مدینہ بھیجنے کے بعد اب پیغمبر اسلام خود بھی مدینہ چلے جائیں گے۔ چنانچہ بنو ہاشم کے سوا تمام قبائل قریش کے سردار دار الندوہ (قصی بن کلاب کا مکان) میں جمع ہوئے۔ مشورہ میں مختلف تجویزیں سامنے آئیں۔ بالآخر اس رائے پر اتفاق ہوا کہ ہر قبیلہ کا ایک ایک آدمی تلوار لے اور بیک وقت حملہ آور ہو کر محمدؐ کو قتل کر دے۔ اس طرح محمدؐ کا خون تمام قبائل میں تقسیم ہو جائے گا۔ بنو ہاشم تمام قبائل کا مقابلہ نہ کر سکیں گے اور قصاص کے بجائے دیت پر راضی ہو جائیں گے۔ اس کے بعد اگلی رات کو تمام سرداروں نے آپ کا مکان گھیر لیا۔ تاکہ صبح کو جب آپ گھر سے باہر نکلیں تو اچانک حملہ کر کے آپ کا خاتمہ کر دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان تمام حالات کی خبر تھی اور آپ بھی خاموشی کے ساتھ اپنی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے، چنانچہ اپنے طے شدہ منصوبہ کے مطابق آپ اسی رات کو ابو بکر صدیق رضؓ کے ساتھ مکہ سے نکل گئے۔ آپ مکہ سے چل کر چار میل کے فاصلہ پر جبل ثور کے ایک غار میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ آپ کو اندازہ تھا کہ قریش کو جب معلوم ہو گا کہ آپ مکہ سے چلے گئے ہیں تو وہ آپ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نکلیں گے۔ اس لئے آپ چاہتے تھے کہ چند دن غار ثور میں گزاریں اور جب قریش کی تلاش رکے تو مدینہ کا سفر کریں۔

اب قریش کے سوار چاروں طرف آپ کی تلاش میں دوڑنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک دستہ غار ثور تک بھی پہنچ گیا۔ یہ لوگ تلواریں لئے ہوئے غار ثور کے پاس اس طرح کھڑے تھے کہ ان کے پاؤں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کو دکھائی دے رہے تھے۔ یہ انتہائی خطرناک لمحہ تھا۔ ابو بکر صدیق نے کہا: اے خدا کے رسول، دشمن تو یہاں تک پہنچ گیا۔ آپ نے کہا لاتحزن ان اللہ معنا (غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے) پھر اطمینان کے ساتھ فرمایا: اے ابو بکر، ان دو کے بارے میں تمھارا کیا گمان ہے جن کا تیسرا اللہ ہو (یا ابا بکر ما ظنک باثنین اللہ ثالثھما)

بے خوفی کا راز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے ایک غزوہ ذات الرقاع ہے جو سنہ ۴ھ میں پیش آیا۔ اس غزوہ کے واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے صحیح بخاری (کتاب المغازی) میں نقل ہوا ہے۔ سیرت کی کتابوں میں بھی یہ واقعہ معمولی فرق کے ساتھ آیا ہے۔

بنو غطفان کا ایک شخص جس کا نام غورث ابن الحارث تھا، اس نے اپنی قوم سے کہا: کیا میں تمھارے لئے محمد کو قتل کر دوں (الا اقتل لکم محمداً) انھوں نے کہا ضرور، مگر تم کیسے ان کو قتل کرو گے۔ غورث نے کہا: میں ان کو غفلت کی حالت میں پکڑلوں گا اور قتل کر دوں گا۔ اس کے بعد غورث روانہ ہوا۔ وہ ایک مقام پر پہنچا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ اس مقام پر درخت اور جھاڑیاں تھیں لوگ جھاڑیوں کے سایہ میں لیٹے ہوئے تھے۔ رسول اللہ علیہ وسلم بھی ایک درخت کے نیچے آرام کر رہے تھے اور اپنی تلوار آپ نے درخت کی شاخ سے لٹکا دی تھی۔ اتنے میں مذکورہ اعرابی (غورث) آپ کو تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچا۔ اس نے جب دیکھا کہ آپ تنہا لیٹے ہوئے ہیں اور آپ کی تلوار بھی آپ سے الگ درخت کے اوپر لٹک رہی ہے تو اس نے بڑھ کر آپ کی تلوار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پھر تلوار کھینچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھا اور کہا: آپ کو کون مجھ سے بچائے گا (یا محمد من یمنعک منی) آپ نے فرمایا اللہ عز وجل۔ اعرابی نے تلوار کو ہلاتے ہوئے کہا: اپنی اس تلوار کی طرف دیکھو جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ کیا تم کو اس سے ڈر نہیں معلوم ہوتا۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ میں تم سے کیوں ڈروں۔ جب کہ مجھے یقین ہے کہ اللہ مجھے بچائے گا (یمنعنی اللہ منک) آپ کے پُر اعتماد جواب کے بعد اعرابی کو اقدام کی ہمت نہ ہوئی۔ اس نے تلوار میان میں ڈال کر آپ کو واپس کر دی (فشام الاعرابی السیف) اب آپ نے اعرابی کو بٹھایا اور لوگوں کو آواز دی۔ لوگ آئے تو دیکھا کہ ایک اعرابی آپ کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ آپ نے پورا قصہ بتایا۔ اعرابی سہما ہوا تھا کہ اب شاید تلوار میری گردن پر چلے گی۔ مگر آپ نے اس کو چھوڑ دیا۔ اس کو کوئی سزا نہ دی (سیرت ابن ہشام جلد ۳، تفسیر ابن کثیر جلد اول)

جو لوگ اللہ پر پورا بھروسہ کر لیں ان کو کسی دوسری چیز کا خوف نہیں رہتا۔ یہ عقیدہ کہ اللہ ایک زندہ اور طاقت ور ہستی کی حیثیت سے ہر وقت موجود ہے، ان کو ہر دوسری طاقت کے مقابلہ میں نڈر بنا دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دشمن کے مقابلہ میں کسی شخص کی سب سے بڑی طاقت بے خوفی ہے۔ دشمن کو اگر یقین ہو جائے کہ اس کا حریف اس سے نہیں ڈرتا تو وہ خود اس سے ڈرنے لگتا ہے۔

خدا کی مدد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے ایک غزوۂ خندق ہے جو شوال ۵ ھ میں پیش آیا۔ اس کو غزوۂ احزاب بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی فوجوں کا غزوہ۔ اس جنگ میں عرب کے مختلف قبیلوں نے مل کر مدینہ پر حملہ کر دیا تھا۔ قبائل قریش، قبائل غطفان اور قبائل یہود کے دس ہزار سے زیادہ افراد اس میں شریک تھے۔ یہ حملہ کتنا شدید تھا، اس کا اندازہ قرآن کے ان الفاظ سے ہوتا ہے: "جب وہ اوپر سے اور نیچے سے تمھارے اوپر چڑھ آئے۔ اس وقت ڈر کی وجہ سے تمھاری آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منھ کو آ گئے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت اہل ایمان کی بڑی جانچ ہوئی اور وہ بہت ہلا مارے گئے (احزاب) مخالفین اسلام کا یہ لشکر پوری طرح ہتھیار بند تھا۔ اس میں ساڑھے چار ہزار اونٹ اور تین سو گھوڑے تھے۔

دشمنوں نے مدینہ کو اس طرح گھیرے میں لے لیا کہ باہر سے ہر قسم کی امداد آنا بند ہو گئی۔ سامان رسد کی اتنی کمی ہوئی کہ لوگ فاقے کرنے لگے۔ اسی دوران کا واقعہ ہے کہ ایک صحابی نے بھوک کی شکایت کی اور کرتا اٹھا کر دکھایا کہ پیٹ پر ایک پتھر باندھ رکھا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں اپنا کرتا اٹھایا تو آپ کے پیٹ پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معلوم ہوا کہ مختلف قبائل ایک ساتھ ہو کر مدینہ پر حملہ کرنے والے ہیں تو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ سلمان فارسی کی رائے کے مطابق طے ہوا کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے۔ اس وقت مدینہ تین طرف سے پہاڑوں، گھنے درختوں اور مکانات کی دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔ شمال مغربی حصہ خالی تھا۔ طے ہوا کہ اس کھلے ہوئے حصہ میں دو پہاڑوں کے درمیان خندق کھودی جائے۔ چنانچہ چھ دن کی لگاتار محنت سے ایک خندق کھود کر تیار کی گئی۔ یہ خندق دشمنوں کی یلغار کو روکنے کے لیے اتنی کارآمد ثابت ہوئی کہ اس غزوہ کا نام غزوۂ خندق پڑ گیا۔

سیرت کی کتابوں میں خندق کی تفصیلات جب ہم پڑھتے ہیں تو ایک سوال سامنے آتا ہے۔ "ایک معمولی خندق دشمنوں کی فوج کو روکنے کا سبب کیسے بن گئی" مذکورہ تفصیلات کے مطابق یہ خندق تقریباً چھ کیلو میٹر لمبی تھی۔ اور اس کی گہرائی اور چوڑائی ایک معمولی نہر سے زیادہ نہ تھی۔ وہ تقریباً ڈھائی میٹر گہری اور تقریباً تین میٹر چوڑی تھی۔ اس قسم کی ایک خندق ایک مسلح فوج کے لیے ایک نالی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ وہ لوگ بآسانی اس کو عبور کر کے مدینہ میں داخل ہو سکتے تھے۔ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس خندق کے باوجود مسلمان دشمن فوج کی تیروں کی زد میں تھے۔ جیسا کہ حضرت سعد بن معاذؓ کو تیر لگنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم کچھ لوگ خندق کے دوسری طرف پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ عمرو بن عبدود اور اس کے کچھ ساتھیوں نے گھوڑے پر سوار ہو کر خندق کا جائزہ لیا اور ایک جگہ خندق کو کچھ کم چوڑی دیکھ کر وہاں ٹھہرے اور گھوڑا کدا کر خندق کے دوسری طرف پہنچ گئے۔ اس کے بعد عمرو بن عبدود کا مقابلہ حضرت علی بن ابی طالبؓ سے ہوا جس میں عمرو بن عبدود مارا گیا۔ تقریباً ایک مہینہ کا یہ محاصرہ اپنے آخری دنوں میں آندھی

اور طوفان کے بعد ختم ہوگیا۔ آندھی نے دشمن کے لشکر میں اتنی بدحواسی پیدا کی کہ ابوسفیان نے اونٹ کی رسی کھولے بغیر اونٹ پر بیٹھ کر اس کو ہانکنا شروع کر دیا۔ پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ باقی ہے کہ ۱۰ ہزار سے زیادہ تعداد کی مسلح فوجیں خندق کو عبور کر کے مدینہ میں کیوں نہ داخل ہوئیں جہاں تین ہزار آدمیوں کا بے سروسامان قافلہ ان کی یلغار کو روکنے کے لئے بالکل ناکافی تھا۔

اس سوال کا جواب خدا کی ایک سنت میں ملتا ہے۔ وہ سنت یہ کہ اللہ اہل ایمان کی طاقت ان کے دشمنوں کو بڑھا کر دکھاتا ہے تاکہ وہ مرعوب اور ہیبت زدہ ہو جائیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے "ہم منکروں کے دلوں میں تمہارا رعب ڈال دیں گے۔ کیوں کہ انھوں نے ایسی چیزوں کو خدا کا شریک ٹھہرایا جن کے حق میں خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری (آل عمران ۱۵۱) اللہ تعالیٰ کی یہ نصرت رعب غزوۂ خندق میں اور دوسرے مواقع پر ظاہر ہوئی۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کی کھودی ہوئی نالی ان کے دشمنوں کو بہت بڑی خندق کی صورت میں دکھائی دی۔ تاہم مسلمانوں کو اپنے ہاتھوں کو تھکا کر ایک "نالی" کھودنا ضروری ہے۔ اگر وہ نالی کھودنے میں اپنے ہاتھوں کو نہ تھکائیں تو خدا ان کی نالی کو خندق بنا کر کس طرح دوسروں کو دکھائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی نصرت رعب جو قرن اول کے مسلمانوں کو کمال درجہ میں حاصل ہوئی وہ بعد کے دور کے مسلمانوں کو بھی مل سکتی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ اس راستہ پر چلیں جس راستہ پر صحابہ خدا کے رسول کی رہنمائی میں چلے۔ کسی اور راستہ پر چلنے والے شیطان کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ پھر ان کو خدا کی نصرت کس طرح ملے گی۔ اللہ کی نصرت کا مستحق آدمی اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو حق کے ساتھ اس طرح شامل کرے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے اس کو وہ حق کے حوالے کر دے، وہ اپنے سر کا تاج دوسرے کے سر پر رکھ دے جیسا کہ ہجرت کے بعد مدینہ کے لوگوں نے کیا۔

خدا کی نصرت کا مستحق بننے کی شرط ایک لفظ میں یہ ہے کہ "جب تم مدد کرو گے تو تمھاری مدد کی جائے گی"۔ خدا ہماری مدد پر اس وقت آتا ہے جب کہ ہم دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کریں جو ہم خدا سے اپنے لئے چاہتے ہیں۔ ہماری ذات سے اگر دوسروں کو زحمت پہنچ رہی ہو تو خدا کے فرشتے ہمارے لیے خدا کی رحمت کا تحفہ لے کر نہیں آسکتے۔ اگر ہمارا یہ حال ہو کہ جس پر ہمارا قابو چلے اس کو ہم ناحق ستانے لگیں تو ناممکن ہے کہ خدا وہاں ہماری مدد کرے جہاں کوئی دوسرا ہمارے اوپر قابو پا کر ہمیں ستانے لگتا ہے۔ ایک آدمی اپنی مصیبت میں ہم کو پکارے اور ہم استطاعت کے باوجود اس کی پکار پر دھیان نہ دیں تو کبھی یہ ممکن نہیں کہ خدا اس وقت ہماری پکار کو سنے جب کہ کوئی طاقت ور ہمارے اوپر چڑھ آتا ہے اور ہم خدا کو پکارنے لگتے ہیں۔ دنیا کی زندگی میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے مقابلہ میں آدمی طاقت ور ہوتا ہے اور کسی کے مقابلہ میں کمزور۔ یہی صورت حال نصرت خداوندی کے معاملہ میں آدمی کے امتحان کا پرچہ ہے۔ کوئی شخص یا قوم اپنے طاقت وروں کے مقابلہ میں خدا کی جو نصرت چاہے اس کا ثبوت اس کو اپنے کمزوروں کے معاملہ میں دینا پڑتا ہے اگر آدمی اپنے کمزوروں پر ظلم کرتا ہو تو اپنے طاقت وروں کے مقابلہ میں وہ خدا کی مدد کا مستحق نہیں بن سکتا، خواہ وہ کتنا ہی خدا کو پکارے، خواہ وہ کتنا ہی یوم دعا منائے۔

رسول کی پیروی سے

فتح مکہ کے بعد عرب کے قبائل کثرت سے مسلمان ہوئے۔ مگر یہ لوگ زیادہ تر اسلام کا سیاسی غلبہ دیکھ کر مسلمان ہوئے تھے۔ ان کے اندر وہ ذہنی و فکری انقلاب نہیں آیا تھا جو ابتدائی لوگوں میں آیا تھا۔ اسلام کے بعض احکام، خاص طور پر زکوٰۃ ان کی آزادانہ زندگی کے لئے ناقابل برداشت معلوم ہونے لگی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے چند ماہ پہلے یمن اور نجد کے علاقوں میں ان کے درمیان ایسے لیڈر ابھرے جو اسلام کا ایسا تصور پیش کرتے تھے جس میں زکوٰۃ کو منسوخ کر دیا گیا تھا۔ ان لیڈروں، مثلاً اسود اور مسیلمہ نے اپنی بات کو خدا کی بات ثابت کرنے کے لئے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ تاکہ جس الہامی زبان میں زکوٰۃ کو فرض کیا گیا ہے اسی الہامی زبان میں اس کی فرضیت کو ساقط کیا جا سکے۔ اس قسم کی "نبوت" ان قبائل کی پسند کے عین مطابق ثابت ہوئی جو زکوٰۃ کو اپنے اوپر ایک بوجھ خیال کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے جوق در جوق ان جھوٹے مدعیانِ نبوت کا ساتھ دینا شروع کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ان لوگوں کا حوصلہ اور بڑھا اور یہ فتنہ تیزی سے پھیلنے لگا۔ حتیٰ کہ یہ حال ہوا کہ مکہ، مدینہ اور طائف کے سوا تمام عرب میں بیشتر لوگ باغی ہو گئے۔ اسی کے ساتھ یہ خبریں بھی پھیلنے لگیں کہ یہ لوگ منظم ہو کر مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری زمانہ میں جو کام کئے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ آپ نے اسامہ بن زید کی قیادت میں ایک لشکر تیار کیا اور اس کو حکم دیا کہ وہ رومیوں کے مقابلہ کے لئے شام کی طرف جائے جہاں اس سے پہلے موتہ کے مقام پر رومیوں نے اسامہ کے والد حضرت زید کو شہید کیا تھا۔ یہ لشکر روانہ ہو کر ابھی مدینہ کے باہر پہنچا تھا کہ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر ملی اور وہ خلیفہ اول کے حکم کے انتظار میں وہیں ٹھہر گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت صدیق اکبر نے اس لشکر کو آگے روانہ کرنا چاہا تو بیشتر صحابہ نے اختلاف کیا۔ انھوں نے کہا کہ سارا عرب باغی ہو رہا ہے اور کسی بھی وقت مدینہ پر حملہ ہو سکتا ہے۔ ایسی حالت میں لشکر کو مدینہ کے دفاع کے لئے یہاں رکھنا چاہئے نہ کہ ایسے نازک موقع پر اس کو دور بھیج دیا جائے۔ مگر حضرت ابو بکر صدیق نے ایسی کسی رائے کو ماننے سے شدت کے ساتھ انکار کر دیا۔

تمام بڑے بڑے صحابہ اسامہ بن زید رضہ کی سرداری میں مدینہ کے باہر جمع تھے۔ اس وقت لوگوں کے اندر دو باتیں بحث کا موضوع بنی ہوئی تھیں۔ ایک یہ کہ اتنے نازک موقع پر اسلامی لشکر کا مدینہ سے دور

جانا حکمت کے خلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ اسامہ بن زید ایک غلام کے لڑکے تھے اس لیے بہت سے لوگوں کو ان کی سرداری پر انقباض تھا۔ نیز وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اسامہ ابھی صرف سترہ سال کے نوجوان ہیں اور ان کی ماتحتی میں بڑے بڑے صحابہ ہیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ کسی معمر قریشی کو سردار مقرر کر دیا جائے تو زیادہ بہتر ہو۔

عمر فاروق رضؓ بھی ابتداءً اس لشکر میں شامل تھے، وہ لوگوں کا پیغام لے کر حضرت ابوبکر رضؓ کے پاس روانہ ہوئے۔ حضرت ابوبکر نے پہلی بات سن کر فرمایا: لشکر کی روانگی کے بعد اگر میں مدینہ میں تنہا رہ جاؤں اور درندے مجھ کو پھاڑ کھائیں تب بھی میں ایک ایسے لشکر کی روانگی کو روک نہیں سکتا جس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روانہ فرمایا ہو۔ دوسرے پیغام کو سن کر آپ نے فرمایا "کیا ان کے دلوں میں ابھی تک جاہلی فخر و تکبر کا اثر باقی ہے" یہ کہہ کر آپ اٹھے اور لشکر کو خود رخصت کرنے کے لیے پیدل چل کر لشکر گاہ تک پہنچے۔ اسامہ بن زید کو ان کے لشکر کے ساتھ روانہ کیا، جب اسامہ اپنی سواری پر چلے تو آپ ان کے ساتھ ساتھ باتیں کرتے ہوئے چلنے لگے۔ اسامہ نے کہا کہ یا تو آپ بھی سوار ہو جائیں، یا میں سواری سے اتر جاؤں۔ حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا: نہ میں سوار ہوں گا اور نہ تم کو سواری سے اترنے کی ضرورت ہے۔ یہ خلیفہ اول کی طرف سے گویا لوگوں کے سوال کا عملی جواب تھا۔ خلیفہ کو اسامہ کی رکاب میں چلتے دیکھ کر سب کا انقباض ختم ہو گیا۔

اسامہ کی سرکردگی میں صحابہ کا لشکر رومی علاقہ کی طرف روانہ ہوا تو اس کی خبریں چاروں طرف پھیل گئیں۔ بہت سے مخالفین کے لیے یہ مسلمانوں کے اعتماد کا مظاہرہ بن گیا۔ انھوں نے سوچا کہ مدینہ والوں کے پاس کافی طاقت ہوگی جبھی تو وہ اس نازک وقت میں اتنا بڑا لشکر دار السلطنت سے دور بھیج رہے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے سوچا کہ مدینہ پر اقدام کرنے میں ہم کو توقف کرنا چاہئے۔ پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ مسلمانوں اور رومیوں کی جنگ کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اگر مسلمانوں کو اس جنگ میں شکست ہوتی ہے تو وہ اور زیادہ کمزور ہو جائیں گے اور اس کے بعد ان کے اوپر اقدام کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔

اسامہ بن زید کے لشکر کو رومیوں کے خلاف مہم میں زبردست کامیابی ہوئی۔ اس مہم میں ان کو چالیس دن لگے۔ اسامہ بن زید اس مہم کی قیادت کے لیے موزوں ترین شخص تھے۔ کیونکہ ان کے باپ زید بن حارثہ کو رومیوں نے موتہ کی جنگ میں شہید کیا تھا اور ان کے دل میں اپنے باپ کا انتقام لینے کا جذبہ بھڑک رہا تھا، اسامہ کی رہنمائی میں اسلامی لشکر انتہائی بے جگری سے لڑا اور رومیوں کو شکست دی۔ اس کے بعد وہ کافی قیدی اور مال غنیمت لے کر مدینہ واپس آئے۔ یہ دیکھ کر باغیوں کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ اور نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ ان کو زیر کر لیا گیا ـــــ رسول کی پیروی ان کے لئے دشمنوں پر غلبہ کا ذریعہ بن گئی۔

۴۲۷

عزت کیسے ملتی ہے

سنہ ۱۶ھ میں مسلمان فوجیں حضرت ابوعبیدہؓ کی قیادت میں شام کو فتح کرتے ہوئے فلسطین تک پہنچ گئیں۔ عیسائی بیت المقدس میں قلعہ بند ہو گئے اور مسلم فوجوں نے اس کو اپنے محاصرہ میں لے لیا۔ اس وقت عیسائیوں کی طرف سے صلح کی پیش کش ہوئی جس میں ایک خاص شرط یہ تھی کہ خلیفہ (عمر فاروقؓ) خود آکر عہدنامہ کی تکمیل کریں۔ حضرت ابوعبیدہ نے عیسائیوں کی اس پیش کش سے خلیفہ دوم کو مطلع کیا۔ آپ نے اصحاب سے مشورہ کیا اور بالآخر مدینہ سے نکل کر فلسطین کے لئے روانہ ہوئے۔

حضرت عمر فاروق کے ساتھ ایک اونٹ تھا اور ایک خادم۔ جب آپ مدینہ کے باہر پہنچے تو آپ نے خادم سے کہا۔ ہم دو ہیں اور سواری ایک ہے۔ اگر میں سواری پر بیٹھوں اور تم پیدل چلو تو میں تمہارے اوپر ظلم کروں گا۔ اور اگر تم سواری پر بیٹھو اور میں پیدل چلوں تو تم میرے اوپر ظلم کروگے۔ اگر ہم دونوں اکھٹے سوار ہو جائیں تو ہم جانور کی پیٹھ توڑ ڈالیں گے۔ اس لئے ہم کو چاہئے کہ ہم راستہ کی تین باریاں مقرر کرلیں۔ چنانچہ سارا سفر اس طرح طے ہوا کہ ایک بار عمر فاروق بیٹھتے اور خادم اونٹ کی نکیل پکڑ کر چلتا۔ پھر خادم بیٹھتا اور عمر فاروقؓ اونٹ کی نکیل پکڑ کر چلتے۔ اس کے بعد کچھ دور تک اونٹ خالی چلتا اور دونوں اس کے ساتھ پیدل چل رہے ہوتے۔ اس طرح سارا سفر طے ہوتا رہا۔

حاکم نے روایت کیا ہے کہ اس سفر کے دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ جب آپ اسلامی لشکر سے ملے تو ان لوگوں نے دیکھا کہ آپ ایک تہ بند باندھے ہوئے ہیں اور کسی قسم کا کوئی سامان آپ کے پاس نہیں ہے۔ حضرت ابوعبیدہ (فوج کے افسراعلیٰ) نے کہا کہ اے امیرالمومنین آپ کو عیسائیوں کے فوجی افسروں اور ان کے مذہبی عہدیداروں سے ملنا ہے اور آپ اس حال میں ہیں۔ عمر فاروق نے کہا: اے ابوعبیدہ، کاش یہ بات تمہارے سوا کوئی اور کہتا۔ ہم دنیا میں سب سے پست قوم تھے پھر اللہ نے اسلام کے ذریعہ ہم کو عزت دی۔ جب بھی ہم اس کے سوا کسی اور چیز کے ذریعہ عزت چاہیں گے تو اللہ ہم کو ذلیل کردے گا (انا کنا اذل قوم فاعزنا اللہ بالاسلام فمہما نطلب العز بغیر ما اعزنا اللہ بہ اذلنا اللہ)

عزت اور ذلت کو اللہ کی طرف سے سمجھنا ایک ایسا عقیدہ ہے جو آدمی کو بغیر کسی ہتھیار کے ہتھیار والا بنا دیتا ہے۔ یہ عقیدہ آدمی کو ایک ایسی خود اعتمادی سکھاتا ہے جو کسی خارجی سہارے کے بغیر اپنی اندرونی طاقت کے اوپر قائم ہوتی ہے اس کا خزانہ آدمی کے اندر رہتا ہے نہ کہ اس کے باہر اور جس طاقت کی بنیاد اندرونی جذبہ پر ہو اس کو کوئی چھیننے والا کبھی چھین نہیں سکتا۔

خدا کی مدد

تاریخ کی کتابوں کی یہ روایت مشہور ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے زمانے میں ایک بار جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے۔ اچانک ان کی زبان سے نکلا: یا ساریۃ الجبل (اے ساریہ پہاڑ کی طرف) ساریہ ایک فوجی سردار تھے اور ان کی سرکردگی میں مسلح افواج ایران کے کسی مقام پر لڑ رہی تھیں۔ اس جنگ کے دوران ایک موقع ایسا آیا کہ دشمن کا پلہ بھاری ہو گیا اور اندیشہ پیدا ہو گیا کہ وہ مسلمانوں کو گھیرے میں لے کر ان کا خاتمہ کر دیں گے۔ اس وقت بہترین فوجی حکمت عملی یہ تھی کہ پیچھے ہٹ کر پہاڑ کی اوٹ لے لی جائے تاکہ دشمن کے مقابلہ کا مسئلہ صرف ایک طرف کے رہے۔

مگر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ صاحب معاملہ اپنے مخصوص حالات میں گھرا ہونے کی وجہ سے بے لاگ طور پر سوچ نہیں پاتا۔ اور یہ بات اس سے اوجھل رہ جاتی ہے کہ اس ہنگامی موقع پر اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس وقت اللہ کی مدد خارج سے ہوتی ہے۔ یہی صورت مذکورہ بالا معاملہ میں پیش آئی۔ اللہ نے حضرت عمر فاروق کو مدینہ میں وہ بات سجھا دی جو حضرت ساریہ سے ایران میں اوجھل ہو رہی تھی۔ اسلامی فوج کا قاصد بعد کو جب جنگ کی خبر لے کر آیا تو اس نے بتایا: اے امیر المومنین، ہم شکست کھانے کے قریب تھے کہ ہم نے فضا سے آواز سنی یا ساریۃ الجبل اس آواز سے ہم ہوشیار ہو گئے۔ ہم نے اپنے لشکر کی پیٹھ پہاڑ کے قریب کر دی اور اللہ نے دشمن کو شکست دی اور ہم کو فتح یاب کیا۔

اس طرح کے اور واقعات بھی تاریخ کی کتابوں میں آئے ہیں۔ مثلاً اموی خلیفہ ہشام بن عبد الملک (متوفی ۱۲۵ھ) کے زمانے میں افریقہ میں بربری قبائل سے مقابلہ میں اسلامی فوج کو شکست ہوئی۔ اس فوج میں زیادہ تر شام کے لوگ تھے اور فوج کی تعداد کم تھی۔ ہشام کو خبر پہنچی تو اس نے قسم کھائی کہ اگر میں زندہ رہا تو اہل بربر پر ایک لاکھ آدمیوں کا لشکر بھیجوں گا اور یہ سب میرے تنخواہ دار فوجی ہوں گے۔ اس کے بعد پھر ایک لاکھ بھیجوں گا، اور برابر بھیجتا رہوں گا۔ یہاں تک کہ میرے اور میرے بیٹوں اور پوتوں کے سوا کوئی باقی نہ رہے۔ پھر ان میں بھی قرعہ ڈالوں گا۔ اور اگر میرے نام پر قرعہ نکلا تو میں خود لڑنے کے لئے نکلوں گا" اس کے بعد ہشام نے بشر بن صفوان گورنر افریقہ کے بھائی حنظلہ بن صفوان کلبی کو پچاس ہزار فوج دے کر روانہ کیا۔

اس جنگ کے دوران خلیفہ ہشام بیمار پڑ گیا۔ مگر اس کا دل برابر میدان مقابلہ کی طرف لگا ہوا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن شدت مرض میں اس کی زبان سے نکلا: "حنظلہ! میسرہ کے دونوں لشکروں میں سے پہلے ایک سے جنگ کرو"۔ پاس بیٹھے ہوئے لوگ سمجھے کہ خلیفہ ہذیان کی حالت میں بڑبڑا رہا ہے۔ مگر دمشق کی آواز حنظلہ کو افریقہ میں پہنچ گئی۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پہلے اس لشکر سے نپٹے جو مقام قرن میں تھا۔ ایک لشکر کو ختم کرنے کے بعد دوسرے لشکر پر حملہ کیا جو مقام اصنام میں تھا اور فتح پائی۔ دو لشکروں کو اس طرح الگ الگ شکست دینے کا یہ واقعہ ۱۲۴ھ کا ہے

مجھ کو زیادہ قیمت مل رہی ہے

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں قحط پڑا اور لوگ سخت پریشان ہو گئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم لوگ نہ گھبراؤ۔ اللہ جلد ہی تمھارے لئے کشادگی کی صورت پیدا کر دے گا۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کا تجارتی قافلہ شام سے آیا، اس میں ایک ہزار اونٹ تھے اور سب کے سب گیہوں اور کھانے کی چیزوں سے لدے ہوئے تھے۔ یہ خبر مدینہ میں پھیلی تو شہر کے تاجر عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے۔ انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ باہر آئے۔ ان کے پاس ایک چادر تھی جس کو وہ اپنے کندھے پر اس طرح ڈالے ہوئے تھے کہ اس کا ایک سرا سامنے کی طرف لٹک رہا تھا اور دوسرا سرا پیچھے کی طرف۔

عثمان رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تم لوگ کیوں آئے ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ تاجروں نے کہا: ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ آپ کے پاس ایک ہزار اونٹ گیہوں اور غذائی سامان آیا ہے۔ ہم ان کو خریدنا چاہتے ہیں۔ آپ ہمارے ہاتھ یہ غذائی سامان بیچ دیں تاکہ ہم اس کو مدینہ کے ضرورت مندوں تک پہنچا سکیں۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا۔ اندر آؤ اور گھر میں بیٹھ کر بات کرو۔ وہ لوگ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ غذائی اشیاء کے ایک ہزار ڈھیر گھر کے اندر پڑے ہوئے ہیں۔

اب بات چیت شروع ہوئی۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: میری شام کی خریداری پر تم مجھ کو کتنا زیادہ نفع دو گے۔ انھوں نے کہا: دس درہم پر بارہ درہم۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھ کو اس سے زیادہ قیمت مل رہی ہے۔ انھوں نے کہا: دس درہم پر چودہ درہم۔ حضرت عثمان نے کہا مجھ کو اس سے زیادہ قیمت مل رہی ہے۔ انھوں نے کہا اچھا دس درہم پر پندرہ درہم۔ حضرت عثمان نے کہا کہ مجھ کو اس سے بھی زیادہ مل رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کون آپ کو اس سے زیادہ دے رہا ہے۔ جب کہ مدینہ کے جتنے تاجر ہیں سب یہاں جمع ہیں۔ حضرت عثمان نے کہا کہ مجھ کو ہر ایک درہم کے بدلے دس درہم مل رہا ہے۔ پھر کیا تم اس سے زیادہ دے سکتے ہو۔ انھوں نے کہا نہیں۔ حضرت عثمان نے فرمایا کہ اللہ نے اپنی کتاب پاک میں فرمایا ہے کہ جو شخص نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لئے اس کا دس گنا بدلہ ہے (انعام ۱۶۰) تو اے مدینہ کے تاجرو، گواہ رہو کہ میں نے یہ تمام غذائی سامان اللہ کے لئے شہر کے ضرورت مندوں پر صدقہ کر دیا (العبقریات الاسلامیہ ۵۰۲) خدا کے وعدوں پر یقین آدمی کے حوصلے کو اتنا بلند کر دیتا ہے کہ بڑی سے بڑی قربانی بھی اس کے لئے کوئی مشکل چیز نہیں رہتی۔

یہ یقین کی طاقت تھی

قریش کے لوگوں میں ایک شخص عَمرو بن عبدوُد نام کا تھا۔ وہ غیر معمولی ڈیل ڈول کا پہلوان آدمی تھا۔ بدر کی لڑائی میں وہ قریش کی طرف سے شریک ہوا اور زخمی ہو کر بھاگا۔ اسی زخم کی وجہ سے وہ اُحد کی لڑائی میں شریک نہ ہو سکا۔ غزوۂ خندق کا وقت آیا تو وہ بڑی شان کے ساتھ نکلا۔ ایک مقام پر جہاں خندق کی چوڑائی نسبتاً کم تھی وہ گھوڑا کدا کر مسلمانوں کی طرف آگیا اور آواز دی کہ کون مجھ سے جنگ کرتا ہے۔ علی بن ابی طالبؓ اٹھے اور کہا کہ اے خدا کے رسول مجھے اس سے لڑنے کی اجازت دیجئے۔ آپ نے کہا کہ یہ عمرو بن عبدود ہے، بیٹھو (انہ عمرو اجلس) وہ بیٹھ گئے۔ عمرو بن عبدود نے دوبارہ آواز دی کہ تمھاری وہ جنت کہاں ہے جس کے متعلق تمھارا گمان ہے کہ تم میں سے جو شخص مارا جائے گا وہ اس میں داخل ہوگا۔ حضرت علی دوبارہ اٹھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ان کو بٹھا دیا۔ اس نے تیسری بار آواز دی۔ حضرت علی پھر اٹھے۔ رسول اللہ نے پھر فرمایا کہ یہ عمرو ہے (انہ عمرو) حضرت علی نے کہا: خواہ وہ عمرو ہی کیوں نہ ہو (وان کان عمروا) اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اجازت دے دی۔

حضرت علی نکلے تو دیو پیکر عمرو بن عبدود کے مقابلہ میں وہ بچہ دکھائی دیتے تھے۔ عمرو بن عبدود نے کہا: اے میرے بھتیجے، مجھ کو ناپسند ہے کہ میں تمھارا خون بہاؤں۔ حضرت علی نے کہا: مگر خدا کی قسم میں تمھارا خون بہانے کو برا نہیں سمجھتا۔ یہ سن کر عمرو بن عبدود غصہ میں آگیا۔ وہ اپنے گھوڑے سے اتر پڑا اور حضرت علی پر اتنی زور سے تلوار ماری کہ وہ ان کی ڈھال کو توڑتی ہوئی ان کے سر تک پہنچ گئی۔ مگر زخم کھا کر حضرت علی کی شجاعت میں اور اضافہ ہو گیا۔ حضرت علی نے انتہائی تیزی کے ساتھ جوابی وار کیا۔ حضرت علی کی تلوار عمرو بن عبدود کے کندھے پر پڑی اور اس کی گردن کی رگ کٹ گئی۔ وہ اپنے بھاری بھرکم جسم کے ساتھ زمین پر گر پڑا اور اس کے گرنے سے غبار اڑا۔ اس کے بعد تکبیر کی آواز سنائی دی تو صحابہ نے جان لیا کہ حضرت علی نے عمرو بن عبدود کو قتل کر دیا ہے۔ اس موقع پر حضرت علی کی طرف ایک نظم منسوب ہے جس کے دو شعر یہ ہیں:

اليوم يمنعني الفرار حفيظتي   ومصمم في الرأس ليس بنابي

لا تحسبن الله خاذل دينه   ونبيه يا معشر الاحزاب

میرے تحفظ (ایمانی) نے آج مجھ کو بھاگنے سے روک دیا اور ضرب (دشمن کے) سر سے چوکنے والی نہیں۔ اے مسلمانوں کی جماعت، تم ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ اللہ اپنے دین اور اپنے نبی کو رسوا کرے گا۔

بہادری یہ ہے

حضرت عثمان کی شہادت کے بعد حضرت علی چوتھے خلیفہ مقرر ہوئے۔ اس وقت ملکی انتظام منتشر ہو رہا تھا۔ حضرت علی نے نظم و نسق کو از سر نو درست کرنے کے لئے حضرت عثمان کے زمانہ کے عمال بدل دئے۔ امیر معاویہ شام کے عامل (گورنر) چلے آ رہے تھے۔ حضرت علی نے ان کی جگہ سہل بن حنیف کو حکومت شام کا فرمان دے کر روانہ کیا۔ وہ تبوک پہنچے تھے کہ امیر معاویہ کے سواروں نے روکا اور سہل کو مدینہ واپس ہونے پر مجبور کیا۔ حضرت علی نے امیر معاویہ کو لکھا کہ مہاجرین و انصار نے اتفاق عام کے ساتھ میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ اس لئے تم یا تو میری اطاعت کر دیا جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اس کے بعد مزید اسباب جمع ہوتے گئے، یہاں تک کہ جمل اور صفین کی لڑائیاں پیش آئیں جن میں تقریباً ۸۰ ہزار مسلمان خود مسلمانوں کی تلوار سے ہلاک ہو گئے۔

جنگ صفین (۳۷ھ) کے آخر زمانہ کا واقعہ ہے۔ حضرت علی فوج کے آگے تھے۔ وہ صفوں کو چیرتے ہوئے امیر معاویہ کے مقصورہ تک پہنچ گئے۔ انھوں نے پکار کر کہا "معاویہ، خلق خدا کا خون کیوں بہاتے ہو۔ آؤ ہم تم لڑ کر باہم فیصلہ کر لیں" امیر معاویہ کے ساتھی عمرو بن العاص نے کہا: بات تو انصاف کی ہے۔ امیر معاویہ نے کہا: کیا تم کو معلوم نہیں کہ جو اس شخص سے مقابلہ کرتا ہے وہ زندہ نہیں بچتا۔ عمرو بن العاص نے دوبارہ کہا: جو کچھ بھی ہو، تم کو مقابلہ کے لئے نکلنا چاہئے۔ امیر معاویہ نے کہا: تم چاہتے ہو کہ مجھ کو مروا کر میرے منصب پر قابض ہو جاؤ۔

امیر معاویہ جب سامنے نہیں آئے تو عمرو بن العاص خود حضرت علی سے مقابلہ کے لئے نکلے۔ دیر تک دونوں میں شمشیر زنی کا مقابلہ ہوتا رہا۔ آخر حضرت علی نے ایسا سخت وار کیا جس سے بچنا ممکن نہ تھا۔ عمرو بن العاص بدحواس ہو کر اپنے گھوڑے سے لڑکھڑائے اور زمین پر اس طرح گر پڑے کہ ان کا جسم ننگا ہو گیا۔ حضرت علی نے جب عمرو بن العاص کو برہنہ حالت میں زمین پر پڑا ہوا دیکھا تو اپنا منھ پھیر لیا اور ان کو چھوڑ کر اپنی فوج میں واپس آ گئے۔

عمرو بن العاص بے حد ہوشیار آدمی تھے۔ وہ امیر معاویہ کے دست راست تھے۔ حضرت علی اس وقت عمرو بن العاص کا خاتمہ کر کے امیر معاویہ کی مخالفانہ مہم کا خاتمہ کر سکتے تھے۔ مگر حریف کو برہنہ حالت میں دیکھ کر انھیں شرم آ گئی۔ اپنے سخت ترین مدمقابل پر پوری طرح قابو پانے کے باوجود وہ اس کو چھوڑ کر چلے آئے۔ ان کی بہادری نے گوارا نہ کیا کہ وہ عاجز حریف کو اپنی تلوار کا نشانہ بنائیں۔

سچائی کا زور

ابن ہشام نے نقل کیا ہے کہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلے جس نے لوگوں کے سامنے بآواز بلند قرآن پڑھا وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ایک روز جمع ہوئے۔ انھوں نے کہا: خدا کی قسم قریش نے ابھی تک اس قرآن کو بلند آواز سے نہیں سنا۔ کیا کوئی ہے جو قریش کے لوگوں کو قرآن سنائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے کہا، میں سناؤں گا۔ عبداللہ بن مسعود دبلے اور کمزور جسم کے تھے۔ مکہ میں ان کا کوئی قبیلہ بھی نہ تھا جو ان کی حمایت کرے۔ وہ اس وقت لوگوں کی بکریاں چراتے تھے اور "ابن ام عبد" کے نام سے جانے جاتے تھے۔ چنانچہ آپ کے ساتھیوں نے کہا کہ تمھارے بارے میں ہمیں ڈر ہے۔ اس کام کے لئے ہم ایسا آدمی چاہتے ہیں جس کا مکہ میں قبیلہ ہو اور قریش جب اس پر حملہ کریں تو اس کا قبیلہ قریش کو روکے۔ عبداللہ بن مسعود نے کہا: مجھے جانے دو، کیونکہ اللہ میری مدد کرے گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود روانہ ہوئے اور اس مقام پر پہنچے جہاں قریش کے لوگ جمع تھے۔ وہ ان کے پاس کھڑے ہوگئے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا اور اس کے بعد بلند آواز سے سورہ رحمٰن پڑھنا شروع کیا۔ وہ پڑھتے رہے یہاں تک کہ قریش نے آپس میں پوچھنا شروع کیا کہ یہ "ابن ام عبد کیا پڑھ رہا ہے"۔ کسی نے کہا کہ یہ اس کلام کا کوئی حصہ ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اترا ہے۔ یہ سن کر وہ اٹھے اور عبداللہ بن مسعود کے منھ پر مارنا شروع کیا۔ تاہم وہ برابر پڑھتے رہے۔ اس کے بعد جب عبداللہ بن مسعود اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آئے تو ان کے چہرے پر مار کا نشان ظاہر ہو چکا تھا۔ لوگوں نے دیکھ کر کہا: تمھارے بارے میں ہم کو اسی کا اندیشہ تھا۔ عبداللہ بن مسعود نے کہا: خدا کے دشمن آج مجھ کو جتنا کمزور معلوم ہوئے اتنا کمزور مجھے کبھی معلوم نہیں ہوئے تھے اور اگر تم چاہو تو کل پھر میں اسی طرح جاکر ان کو قرآن سناؤں گا (ما اعداء اللہ اھون علیّ منھم الآن ولئن شئتم لاغادِیَنّھم بمثلھا غداً) سیرۃ ابن ہشام، جزء اول، صفحہ ۳۳۷)

ایک کمزور اور بے سہارا آدمی کے اندر یہ قوت کہاں سے آئی کہ وہ کسی مادی تحفظ کے بغیر دشمنوں کے مجمع میں گھس گیا اور ان کو بلند آواز سے وہ کلام سنانے لگا جس کا سننا ان کو سب سے زیادہ ناگوار تھا۔ اس قوت کا راز سچائی پر یقین ہے۔ عبداللہ بن مسعود کو کامل یقین تھا کہ وہ حق پر ہیں اور قریش باطل پر۔ قریش نے جب عبداللہ بن مسعود کو مارنا شروع کیا تو ان کا یقین اور بڑھ گیا۔ کیوں کہ ان کے دل نے کہا کہ قریش کے پاس دلیل کی زبان میں ان کے جواب کے لئے کچھ نہیں ہے۔ ان کی جارحیت صرف اس بات کا ثبوت

تھی کہ دلیل کے میدان میں وہ اپنے کو باطل بے بس پا رہے ہیں، عبداللہ بن مسعود سچائی کے زور سے زور آور تھے، اور یقیناً سچائی کا زور سب سے بڑا زور ہوتا ہے۔

دنیا کی رزم گاہ میں بہادر بننے کا راز یہ نہیں ہے کہ آدمی پر مشکلات نہ گزریں۔ مشکلات تو اس دنیا میں ہر ایک کے لئے آتی ہیں۔ بہادری کا اصل راز یہ ہے کہ آدمی کے پاس کوئی ایسا یقین ہو جو اپنے مقصد کے مقابلہ میں مشکلات کو اس کے لئے حقیر بنا دے۔ دکھوں کی اس دنیا میں مشکلات کو وہی شخص جھیلتا ہے جس کو مشکلات سے بڑی کوئی چیز مل گئی ہو۔

مومن کو یہ چیز کمال درجہ میں حاصل ہوتی ہے۔ اس کے پاس ایک ایسا حق ہوتا ہے جس کی عظمت اور صداقت پر اسے ادنیٰ شبہ نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ اسے یقین ہوتا ہے کہ اس راہ میں ہر قربانی آخرت میں اس کی کامیابیوں میں اضافہ کرنے کے ہم معنی ہوگی۔ یہ یقین اس کے لئے حق کے اعلان کو ایک ایسی لذت بنا دیتا ہے جس کا سرور کبھی ختم نہ ہو۔ مخالفین کی جارحیت صرف اس کے اس یقین میں اضافہ کرتی ہے کہ وہ سراسر حق پر ہے اور اس کے مخالفین سراسر باطل پر۔ جارحیت دراصل سچائی کے میدان میں اپنی شکست کا اعلان ہے۔ مخالفین کی جارحیت ایمان و اسلام کے داعی کے لئے اس بات کا ثبوت ہوتی ہے کہ اس کے مخالفین دلیل کے میدان میں اپنی بازی ہار چکے ہیں۔ کیوں کہ جس کے پاس دلیل کی طاقت ہو وہ کبھی جارحیت کی طاقت استعمال نہیں کرتا۔

سچائی ایک اعلیٰ ترین ذہنی یافت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سچائی کی طاقت کا خزانہ آدمی کے اپنے اندر ہوتا ہے۔ جب کہ دوسری تمام طاقتیں خارجی طاقتیں ہیں، ان کا خزانہ آدمی کے اپنے وجود کے باہر ہوتا ہے۔ دوسری طاقتوں کا ذخیرہ محدود ہوتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی وقت ختم ہو جاتا ہے۔ یہ چیزیں نازک حالات میں خود اپنے بچاؤ کی فکر میں لگ جاتی ہیں، اس بنا پر وہ نازک مواقع پر آدمی کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ مگر سچائی کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ سچائی وہ انتھاہ طاقت ہے جس کا ذخیرہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ سچائی جب ایک بار کسی کو مل جائے تو وہ اس کی جان کے ساتھ ساتھ باقی رہتی ہے، وہ کسی حال میں اس سے جدا نہیں ہوتی۔ سچائی کی طاقت آخر وقت تک آدمی کا سہارا بنی رہتی ہے۔ حتی کہ اس وقت بھی جب کہ بظاہر اس کے ساتھ کوئی طاقت موجود نہیں ہوتی۔

مومن کو جو سچائی ملتی ہے وہ خود خدا ہوتا ہے۔ مومن خدا کو سب سے بڑی حقیقت کے طور پر پالیتا ہے۔ پھر جو سب سے بڑی ہستی کو پالے وہ اس کے بعد کسی چھوٹی چیز سے کیوں ڈرے گا۔ اس کے بعد تو کوئی چیز ڈرنے کے لئے باقی ہی نہیں رہتی۔

دو لاکھ کے مقابلہ میں تین ہزار

صلح حدیبیہ کے بعد ۸ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعوتی خطوط اطراف کے حکمرانوں کے نام روانہ کئے ان میں سے ایک خط حاکم بصریٰ کے نام تھا جو آپ نے حارث بن عمیر ازدی رض کے ہاتھ روانہ کیا۔ وہ آپ کا مکتوب لے کر شام کے سرحدی مقام موتہ پہنچے تھے کہ وہاں کے حاکم شرحبیل بن عمرو غسانی نے ان کو گرفتار کر لیا اور اس کے بعد قتل کرا دیا۔ یہ شرحبیل قیصر روم کی طرف سے اس علاقہ کا حاکم تھا۔ اس واقعہ سے ان سابقہ خبروں کی تصدیق ہو گئی کہ رومی حکومت مدینہ کی اسلامی حکومت کے بارے میں جارحانہ ارادے رکھتی ہے۔ چنانچہ جب حضرت حارث کے قتل کی خبر مدینہ پہنچی تو آپ نے اس غسانی حاکم کی جارحیت کا جواب دینے کے لئے فوراً ایک فوج روانہ کی۔ اس فوج میں تین ہزار مسلمان تھے اور اس کا سردار حضرت زید بن حارثہ رض کو بنایا گیا تھا۔

زید بن حارثہ رض کی قیادت میں یہ لشکر روانہ ہو کر معان (شام) پہنچا تو معلوم ہوا کہ غسانی حاکم نے دوسرے قبائل کی مدد سے ایک لاکھ کی فوج جمع کر لی ہے، اسی کے ساتھ خود قیصر روم ایک لاکھ فوج کے ساتھ اس کی مدد پر آرہا ہے۔ اس خبر کے بعد اسلامی فوج معان میں دو دن تک رکی رہی اور باہم مشورے ہوتے رہے، بہت سے لوگوں کی رائے تھی کہ تین ہزار اور دو لاکھ کا تناسب بہت غیر معمولی ہے۔ اس لئے ہم کو چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خط لکھ کر صورت حال سے مطلع کریں۔ تاکہ آپ یا تو ہماری مدد کے لئے مزید فوج بھیجیں یا دوسرا مناسب حکم دیں، آخر عبداللہ بن رواحہ کھڑے ہوئے اور انھوں نے مسلمانوں کو ابھارتے ہوئے کہا: اے لوگو خدا کی قسم جس سے تم گھبرا رہے ہو وہ تو وہی چیز ہے جس کی طلب میں تم نکلے ہو۔ یعنی شہادت۔ ہم گنتی یا قوت یا کثرت کی بنا پر نہیں لڑتے۔ ہم تو اس دین کے ذریعہ لڑتے ہیں جس سے اللہ نے ہم کو عزت دی ہے، پس آگے بڑھو۔ کیوں کہ اس کا نتیجہ دو میں سے ایک خوبی سے خالی نہیں۔ یا فتح یا شہادت (سیرت ابن ہشام)

حضرت عبداللہ بن رواحہ کی اس تقریر کے بعد لوگ بول اٹھے: خدا کی قسم ابن رواحہ نے صحیح کہا۔ چنانچہ لوگ آگے بڑھے اور اس قدر بے جگری سے لڑے کہ دشمنوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ اس جنگ میں اگرچہ مسلمانوں کی کافی جانیں گئیں۔ مگر دو لاکھ رومیوں کے مقابلہ میں تین ہزار نے محض اپنے ایمان کی بدولت ایسی بہادری دکھائی کہ رومی ہمیشہ کے لئے مرعوب ہو گئے اور اس کے بعد وہ کبھی مسلمانوں پر فتح نہ پا سکے۔

ایمانی غیرت

جنگ قادسیہ (۱۴ھ) کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی فوج میں ایک شخص ابو محجن ثقفی تھے۔ وہ بہت بہادر تھے۔ مگر کبھی کبھی شراب پی لیا کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کو کوڑے لگتے تھے۔ بالآخر حضرت سعد بن ابی وقاص نے ان کو ایک خیمہ میں قید کر دیا۔ ایک روز حضرت سعد زخمی تھے اور اپنے خیمہ کے پاس بلندی پر بیٹھ کر فوج کو ہدایات دے رہے تھے۔ اس دن ایرانی فوج کا زور بہت زیادہ تھا اور مسلمان ان کو پسپا کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے۔ ابو محجن ثقفی بیڑیاں پہنے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے دکھ کے عالم میں یہ شعر پڑھا:

کفی حزنا ان تلتقی الخیل بالقنا　　　واترک مشدودا علیّ وثاقیا

غمگین ہونے کے لئے یہ کافی ہے سوار نیزوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہوں اور مجھے بیڑیوں میں باندھ کر چھوڑ دیا جائے

ابو محجن ثقفی نے حضرت سعد کی بیوی کے پاس ایک باندی کے ذریعہ یہ پیغام بھیجا کہ آج میری بیڑیاں کھول دو اور مجھ کو سعد کا گھوڑا اور ان کا ہتھیار دے دو۔ اگر میں زندہ رہا تو ابو محجن پہلا شخص ہو گا جو تمھاری طرف لوٹ کر آئے گا اور دوبارہ بیڑیاں پہن لے گا۔ حضرت سعد کی بیوی کو یہ پیغام ملا تو انھوں نے ابو محجن ثقفی کی بیڑیاں کھول دیں اور گھوڑا اور ہتھیار بھی ان کے حوالے کر دیا۔ اب وہ گھوڑا دوڑاتے ہوئے نکلے اور مسلمانوں کے لشکر میں جا کر شامل ہو گئے۔ وہ اتنی بے جگری سے لڑے کہ جدھر گھستے دشمنوں کا صفایا کر دیتے۔ حضرت سعد دور سے ان کو دیکھتے اور تعجب کرتے کہ یہ سوار کون ہے۔

بالآخر مسلمانوں کو کامیابی ہوئی۔ ابو محجن فوراً لوٹے اور گھوڑا اور ہتھیار واپس کر کے دوبارہ بیڑیاں پہن لیں۔ حضرت سعد شام کو گھر میں آئے تو ان کی بیوی نے پوچھا کہ آج تمھاری لڑائی کیسی رہی۔ انھوں نے کہا کہ آج کی لڑائی بڑی سخت تھی۔ یہاں تک کہ اللہ نے ایک شخص کو چتکبرے گھوڑے پر سوار کر کے بھیج دیا۔ اگر میں نے ابو محجن کو زنجیروں میں باندھا نہ ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ ابو محجن کے حملے ہیں۔ بیوی نے کہا کہ خدا کی قسم وہ ابو محجن ہی تھے۔ اس کے بعد انھوں نے سارا قصہ بتایا۔ حضرت سعد نے ابو محجن کو بلایا اور ان کی زنجیریں کھول دیں اور کہا: خدا کی قسم اب میں شراب پینے پر تم کو سزا نہیں دوں گا۔ ابو محجن ثقفی نے کہا: میں بھی خدا کی قسم اب کبھی شراب نہ پیوں گا (وانا واللہ لا اشربہا ابدا)

غیرت مند آدمی ایک معمولی واقعہ سے بھی تڑپ اٹھتا ہے۔ مگر جو شخص غیرت سے خالی ہو اس کی اصلاح کے لئے کوئی بڑی سے بڑی چیز بھی ناکافی ثابت ہوتی ہے۔

انصاف کی جیت

حضرت عمر بن عبد العزیز (۱۰۱- ۶۲ ھ) پانچویں خلیفہ راشد ہیں۔ آپ کے خادم ابو امیہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز آپ کی اہلیہ سے کہا کہ مسور کی دال کھاتے کھاتے میرا برا حال ہو گیا ہے۔ خاتون نے جواب دیا: تمہارے خلیفہ کا بھی روز کا کھانا یہی ہے۔ آپ سے پہلے خلیفہ کی حفاظت کے لئے ایک سو سپاہی مقرر تھے، جب آپ خلیفہ ہوئے تو آپ نے سب کو دوسرے سرکاری کاموں میں لگا دیا اور فرمایا: میری حفاظت کے لئے قضاو قدر ہی کافی ہے۔ یہ اس شخص کا حال تھا جس کی سلطنت کے حدود سندھ سے لے کر فرانس تک پھیلے ہوئے تھے۔

آپ کی خلافت کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ سمرقند کے باشندوں کا ایک وفد آیا۔ اس نے ایک فوجی سردار قتیبہ بن مسلم باہلی کے بارے میں یہ شکایت کی کہ اسلامی قاعدہ کے مطابق انھوں نے ہم کو پیشگی تنبیہ نہیں کی اور ہمارے شہر میں اچانک اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ لہذا ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے۔ سمرقند کی فتح حضرت عمر بن عبد العزیز سے پہلے ہوئی تھی۔ اور اب اس پر سات سال گزر چکے تھے۔ مگر آپ نے انصاف کے تقاضے کو پورا کرنا ضروری سمجھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے عراق کے حاکم کو لکھا کہ سمرقند کے لوگوں کے مقدمہ کی سماعت کے لئے ایک خصوصی قاضی مقرر کریں۔ عراق کے حاکم نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور جمیع بن حاضر الباہلی کو اس کا قاضی مقرر کیا۔ ان کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ دونوں فریق نے آزادانہ طور پر اپنے اپنے دلائل پیش کئے۔ آخر میں قاضی نے سمرقند والوں کی شکایت کو درست قرار دیتے ہوئے فیصلہ سنایا کہ ——
مسلمانوں کی فوج سمرقند کو چھوڑ کر باہر آ جائے اور اہلِ سمرقند کو ان کا قلعہ اور تمام دوسری چیزیں واپس کر دی جائیں۔ اس کے بعد اسلامی قاعدہ کے مطابق مسلمانوں کا فوجی سردار ان کے سامنے ضروری شرطیں پیش کرے۔ اگر وہ تمام شرطوں کو ماننے سے انکار کر دیں تو پھر اس کے بعد ان سے جنگ کی جائے۔

اسلامی فوج اس وقت فاتحانہ حیثیت رکھتی تھی۔ اس نے چین جیسے ملک کے بادشاہوں کو بھی ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر جب قاضی نے اپنا فیصلہ سنایا تو اسلامی فوج کے سردار نے کسی بحث کے بغیر اس کو مان لیا۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ پوری فوج سمرقند چھوڑ کر نکل آئے۔ تاہم اس پر عمل درآمد کی نوبت نہیں آئی۔ سمرقند کے لوگوں نے جب دیکھا کہ مسلمان اس قدر با اصول اور انصاف پسند ہیں تو وہ حیران رہ گئے۔ اس سے پہلے انھوں نے کبھی ایسے بے لاگ انصاف کا تجربہ نہیں کیا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مسلم فوج کا آنا ان کے لئے رحمت کا آنا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی مرضی اور خوشی سے مسلم حکومت کو قبول کر لیا۔ وہ کہہ اٹھے: خوش آمدید، ہم آپ کے مطیع و فرماں بردار ہیں (مرحبا سمعنا واطعنا، فتوح البلدان للبلاذری)

کھجور کی چپل پہننے والے

موجودہ افغانستان قدیم زمانہ میں سجستان کہا جاتا تھا۔ اس کا دارالسلطنت کابل تھا۔ یہاں ایک ترک راجہ کی حکومت تھی۔ وہ بدھ مذہب کو مانتا تھا اور اس کا خاندانی لقب رتبیل (زندبیل) تھا۔ یہ علاقہ امیر معاویہ کے زمانہ میں اسلامی خلافت میں شامل ہوا۔ رتبیل نے ابتداءً اسلامی فوجوں سے مقابلہ کیا۔ اس کے بعد اس نے دس لاکھ درہم سالانہ خراج پر معاہدہ کرکے اپنے لئے امان حاصل کرلی۔ رتبیل ایک مدت تک خراج دیتا رہا۔ اس کے بعد اس نے خراج دینا بند کردیا۔ اس کے علاقہ پر بار بار فوجیں بھیجی گئیں مگر وہ مطیع نہ ہوا۔

اس سلسلہ میں تاریخوں میں جو واقعات آتے ہیں ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ یزید بن عبدالملک اموی (م ۱۰۵ھ) کے زمانہ میں جب خلافت دمشق کے کچھ نمائندے اس کے پاس خراج طلب کرنے کے لئے پہنچے تو اس نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "وہ لوگ کہاں گئے جو پہلے آیا کرتے تھے۔ ان کے پیٹ فاقہ کشوں کی طرح دبے ہوئے تھے۔ پیشانیوں پر سیاہ نشان پڑے رہتے تھے اور وہ کھجوروں کی چپلیں پہنا کرتے تھے" راوی کا بیان ہے کہ یہ کہہ کر رتبیل نے خراج دینے سے انکار کردیا اور تقریباً چوتھائی صدی تک وہ اسلامی حکومت سے آزاد رہا۔

صحابہ کے زمانہ کے سیدھے سادے معمولی لوگ رتبیل کی نظر میں اس سے زیادہ طاقتور تھے جتنا کہ بنوامیہ کے زمانہ کے شان و شوکت والے لوگ۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی آدمی کی طاقت کا راز اس کے جسم پر دکھائی دینے والی ظاہری رونقیں نہیں ہیں بلکہ اس کی اندرونی صلاحیت ہے۔ یہ اندرونی صلاحیت پہلے کے لوگوں میں بہت زیادہ تھی اگرچہ ظاہری طور پر وہ معمولی حالت میں دکھائی دیتے تھے۔

طاقتور وہ ہے جس کی ضروریات مختصر ہوں۔ جس کی آرزوئیں محدود ہوں۔ جو لذت اور جاہ کا طالب نہ ہو۔ جس کو تواضع میں تسکین ملتی ہو نہ کہ اپنے کو بڑا بنانے میں۔ ایسا آدمی نفسیاتی پیچیدگیوں سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے لئے صحیح فیصلہ کرنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی۔ مصلحتوں کا خیال کبھی اس کا قدم نہیں روکتا۔ اپنے مقصد کی خاطر قربانی کی حد تک جانے میں اس کے لئے کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔

اس کے برعکس جو لوگ مصنوعی چیزوں میں گھرے ہوئے ہوں وہ زندگی کی حقیقی معرفت سے محروم رہتے ہیں۔ غیر ضروری تکلفات ان کے لئے ایسا بندھن بن جاتے ہیں کہ وہ نہ تو کسی بات کو صحیح رنگ میں دیکھ پاتے اور نہ اس میں اپنے آپ کو واقعی طور پر شامل کرسکتے۔ وہ ذات کے لئے زیادہ اور مقصد کے لئے کم ہو کر رہ جاتے ہیں

پتھر کھسک گیا

بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے بیان کیا۔ سننے والوں میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان میں سے تین آدمی ایک سفر پر نکلے۔ چلتے چلتے رات ہوگئی تو رات گزارنے کے لئے وہ ایک غار میں داخل ہوگئے۔ پہاڑوں پر اکثر پتھر گرنے [Land Slide] کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ رات کے وقت اوپر سے ایک بڑا پتھر لڑھک کر گرا اور اس کی وجہ سے غار کا منھ بند ہوگیا۔ انھوں نے کہا کہ اس چٹان سے نجات کی ہمارے پاس اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں ہے کہ ہم اپنے نیک عمل کا واسطہ دے کر اللہ سے دعا کریں۔

اب ایک شخص دعا کرنے بیٹھا۔ اس نے کہا: خدایا، میرے باپ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ میرا معمول تھا کہ روزانہ شام کو جب میں اپنے جانور چرا کر لوٹتا تو جب تک میں ان دونوں کو دودھ نہ پلا لیتا نہ خود دودھ پیتا اور نہ کسی اور کو پلاتا۔ ایک دن میں چارہ کی تلاش میں دور نکل گیا۔ شام کو واپسی میں اتنی دیر ہوئی کہ میرے ماں باپ سو گئے۔ میں نے ان دونوں کے لئے دودھ نکال کر تیار کیا۔ جب ان کے پاس دودھ لے کر پہنچا تو دونوں کو سوتا ہوا پایا۔ مجھے یہ گوارا نہ ہوا کہ میں ان کو جگاؤں اور مجھ کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ میں ان سے پہلے دودھ بیوی اور اپنے بچوں کو پلاؤں۔ میں ان کے پاس کھڑا ہوگیا۔ میرے ہاتھ میں پیالہ تھا اور میں اس انتظار میں تھا کہ جب وہ جاگیں تو میں ان کو دودھ پیش کروں۔ اسی حال میں صبح ہوگئی۔ بچے میرے پاؤں کے پاس بلبلاتے رہے۔ صبح کو وہ دونوں اٹھے اور انھوں نے دودھ پیا۔ اس کے بعد ہم سب لوگوں نے دودھ پیا۔ میرے اللہ یہ عمل اگر میں نے تیری رضا کے لئے کیا ہے تو اس چٹان کی مصیبت سے تو ہم کو نجات دے دے۔ چنانچہ چٹان تھوڑی سی کھسک گئی مگر اتنی زیادہ نہیں کہ وہ تینوں نکل سکیں۔

اب دوسرے آدمی نے دعا شروع کی۔ اس نے کہا: خدایا، میرے چچا کی ایک لڑکی تھی۔ وہ مجھ کو بہت محبوب تھی، اس سے مجھ کو اسی قسم کی شدید محبت تھی جو مردوں کو عورتوں سے ہوتی ہے۔ میں نے اس سے اپنے نفس کی خواہش پوری کرنی چاہی مگر وہ منع کرتی رہی۔ کچھ عرصہ بعد وہ قحط سالی کی مصیبت میں پریشان ہوئی۔ وہ مدد کے لئے میرے پاس آئی۔ میں نے اس کو ۱۲۰ دینار اس شرط پر دئے کہ وہ مجھ کو اپنے اوپر قابو دے دے۔ وہ اس کے لئے تیار ہوگئی۔ یہاں تک کہ جب میں اس کے اوپر پوری طرح قادر ہوگیا اور اس کے دونوں پیروں کے درمیان بیٹھ گیا تو اس نے کہا: خدا سے ڈر اور مہر کو اس کے حق کے بغیر نہ توڑ۔ میں اس سے باز آگیا حالاں کہ وہ مجھ کو

تمام لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب تھی۔ اور جو دینار میں نے اس کو دئے تھے وہ بھی اس سے واپس نہیں لئے۔ خدایا، اگر میں نے یہ کام تیری رضا کے لئے کیا ہے تو اس مصیبت سے تو ہم کو نجات دے دے جس میں ہم اس وقت پھنسے ہوئے ہیں۔ چنانچہ چٹان تھوڑی سی ہٹ گئی مگر اتنی نہیں کہ وہ نکل سکیں۔

اب تیسرے آدمی نے دعا کی۔ اس نے کہا۔ خدایا، میں نے کچھ مزدور اجرت پر رکھے۔ کام کے بعد میں نے سب کو اجرت دے دی۔ مگر ایک مزدور اپنی اجرت چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے اس کی چھوڑی ہوئی رقم کو کاروبار میں لگا دیا۔ اس سے مجھ کو بہت زیادہ مالی فائدہ ہوا۔ کچھ عرصہ بعد وہ آدمی واپس آیا اور کہا: اے اللہ کے بندے، میری اجرت مجھ کو دے دے۔ میں نے اس سے کہا: یہ اونٹ، یہ گائیں، یہ بکریاں اور یہ غلام جو تم دیکھ رہے ہو یہ سب تمھاری مزدوری ہے۔ اس نے کہا: اے خدا کے بندے، مجھ سے مذاق نہ کر۔ میں نے کہا کہ میں تم سے مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ یہ سب تمھارا ہی ہے۔ اس کے بعد اس نے سب چیزیں لیں اور ان کو اس طرح ہنکائے گیا کہ ان میں سے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ خدایا، اگر یہ میں نے تیری رضا کے لئے کیا ہے تو اس مصیبت سے تو ہم کو نجات دے دے۔ اس کے بعد چٹان ہٹ گئی اور وہ تینوں باہر نکل کر روانہ ہو گئے (بخاری ومسلم)

یہ روایت صحیحین میں آئی ہے اور اس کے واقعہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دعا ایسی چیز ہے جو پتھر کی چٹان کو بھی اپنی جگہ سے کھسکا دیتی ہے۔ مگر یہ وہ دعا نہیں ہے جو زبان سے بس الفاظ کی صورت میں نکلتی ہے اور آدمی کی حقیقی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مذکورہ مثال بتاتی ہے کہ دعا سے چٹان کھسکنے کا واقعہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے تابع کر دیں، جو اپنے اوپر خدا کو نگراں بنالیں۔ حتی کہ بھوک کی شدت اور بیوی بچوں کی محبت بھی ان کو خدا کی پسندیدہ راہ سے نہ ہٹا سکے۔ انتہائی نازک جذباتی مواقع پر بھی خدا کی یاد دلانا ان کو چونکا دینے کے لئے کافی ہو، ہیجان خیز لمحات میں بھی جب خدا کا نام لے لیا جائے تو ان کے چلتے ہوئے قدم رک جائیں، اور ان کے اٹھے ہوئے ہاتھ اپنی حرکت بند کر دیں۔ آخرت کے حساب کا اندیشہ ان پر اتنا زیادہ طاری ہو کہ ایک حق دار کا حق ادا کرنے کی خاطر اگر ان کو اپنا سارا اثاثہ دے دینا پڑے تو اس سے بھی وہ دریغ نہ کریں۔ ایک آدمی اگر اپنا مطالبہ لے کر ان کے سامنے کھڑا ہو جائے تو وہ فوراً اس کو مان لیں خواہ مطالبہ کرنے والا کتنا ہی بے زور ہو اور اس کے مقابلہ میں ان کو کتنی ہی زیادہ قوت حاصل ہو۔

خدا کے بندے وہ ہیں جو اپنے نفس کو کچلنے اور اپنے فائدوں کو ذبح کرنے کی قیمت پر خدا کو اختیار کرتے ہیں۔ اور جو لوگ اس طرح خدا کو اپنا لیں وہ اگر کہیں کہ خدایا تو اس پتھر کی چٹان کو کھسکا دے تو خدا پتھر کی چٹان کو بھی ان کے لئے کھسکا دیتا ہے۔

ظالم کا دل ہل گیا

ساتویں صدی ہجری میں تاتاری قبائل نے اسلامی سلطنت پر حملہ کیا اور عراق، ایران، ترکستان میں مسلم تہذیب وسلطنت کو زیر وزبر کر ڈالا۔ مگر اس کے بعد اللہ نے ان کے دلوں کو نرم کیا اور تقریباً پوری کی پوری قوم مسلمان ہو کر اسلام کی پاسبان بن گئی۔ اس زمانہ کے دعوتی واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ شیخ جمال الدین ایرانی کہیں جا رہے تھے۔ اتفاق سے انھیں دنوں ایک تاتاری شہزادہ تغلق تیمور شکار کے لئے نکلا ہوا تھا۔ یہ شہزادہ تاتاریوں کی چغتائی شاخ کا ولی عہد تھا جو ایران پر حکومت کر رہی تھی۔ شیخ جمال الدین ایرانی چلتے ہوئے اس علاقہ میں پہنچ گئے جہاں شہزادہ شکار کھیل رہا تھا۔ تاتاری اس زمانہ میں ایرانیوں کو منحوس سمجھتے تھے۔ شہزادہ کے سپاہیوں نے شکارگاہ میں ایک ایرانی کی موجودگی کو برا فال سمجھا اور ان کو پکڑ لیا۔ اس کے بعد وہ اس گستاخ ایرانی کو شہزادہ کے پاس لے گئے۔ شہزادہ ان کو دیکھ کر سخت برہم ہوا۔ غصہ کی حالت میں اس کی زبان سے نکلا: تم ایرانیوں سے تو ایک کتا اچھا ہے۔ شیخ جمال الدین تاتاری کے اس نفرت انگیز سوال کو سن کر سنجیدہ انداز میں بولے: اگر ہم کو سچا دین نہ ملا ہوتا تو یقیناً ہم کتے سے بھی زیادہ برے ہوتے۔

تاتاری اگرچہ وحشی تھے مگر ان میں فطری مردانگی کا جوہر موجود تھا۔ وہ منافقت سے خالی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ کا یہ جواب تغلق تیمور کے لئے سخت جھنجھوڑنے والا ثابت ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ جب میں شکار سے فارغ ہو جاؤں تو اس ایرانی کو میری خدمت میں حاضر کرو۔ شیخ جمال الدین جب حاضر کئے گئے تو وہ ان کو تنہائی میں لے گیا اور ان سے پوچھا کہ یہ دین کیا ہے۔ شیخ جمال الدین نے نڈر ہو کر اس کے سامنے اسلام کی تعلیمات پیش کیں۔ اس گفتگو نے تاتاری شہزادہ کا دل ہلا دیا۔ بے دینی کی حالت میں مرنا اسے بڑا خطرناک معلوم ہونے لگا۔ وہ اس پر آمادہ ہو گیا کہ اسلام قبول کرے۔ تاہم ابھی وہ ولی عہد تھا، بادشاہ نہ تھا۔ اس نے کہا کہ اس وقت اگر میں اسلام قبول کرتا ہوں تو میں اپنی رعایا کو اسلام کے دین پر نہیں لا سکتا۔ اس نے شیخ جمال الدین سے کہا: اچھا اس وقت تم جاؤ۔ جب تم سنو کہ میری تاج پوشی ہوئی ہے اور میں تخت پر بیٹھ گیا ہوں تو اس وقت تم میرے پاس آنا۔

شیخ جمال الدین اپنے گھر واپس آ گئے اور اس وقت کا انتظار کرنے لگے جب کہ تغلق تیمور کی تخت نشینی کی خبر انھیں معلوم ہو۔ مگر یہ وقت ان کی زندگی میں نہیں آیا۔ یہاں تک کہ وہ مرض الموت میں مبتلا ہو گئے۔ اس وقت انھوں نے اپنے لڑکے شیخ رشید الدین کو بلایا اور تاتاری شہزادہ کا قصہ بتا کر کہا کہ دیکھو میں ایک مبارک گھڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا آنا میری زندگی میں مقدر نہیں۔ اس لئے میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ جب تم سنو کہ تغلق تیمور کی تاج پوشی ہوئی ہے تو تم وہاں جانا اور اس کو میرا اسلام کہنا

اور بے خوفی کے ساتھ اس کو شکار کا واقعہ یاد دلانا جو میرے ساتھ پیش آیا تھا۔شاید اللہ اس کا سینہ حق کے لئے کھول دے۔

اس کے بعد شیخ جمال الدین کا انتقال ہوگیا۔باپ کی وصیت کے مطابق ان کے لڑکے شیخ رشید الدین تاتاری شہزادہ کی تخت نشینی کا انتظار کرنے لگے۔جلد ہی ان کو خبر ملی کہ تغلق تیمور تخت پر بیٹھ گیا ہے۔اب وہ اپنے وطن سے روانہ ہوئے۔منزل پر پہنچے تو دربانوں نے خیمہ کے اندر جانے سے روک دیا۔کیوں کہ ان کے پاس دربانوں کو بتانے کے لئے کوئی بات نہ تھی کہ وہ کیوں بادشاہ سے ملنا چاہتے ہیں۔اس کے بعد انھوں نے یہ کیا کہ خیمہ کے قریب ایک درخت کے نیچے پڑاؤ ڈال کر ٹھہر گئے۔

ایک روز وہ فجر کے لئے اٹھے۔اول وقت تھا اور فضا میں ابھی سناٹا چھایا ہوا تھا۔انھوں نے بلند آواز سے اذان دینا شروع کیا۔یہ آواز خیمہ کے اس حصہ تک پہنچ گئی جہاں شاہ تغلق تیمور سو رہا تھا۔بادشاہ کو ایسے وقت میں یہ آواز بے معنی شور معلوم ہوئی۔اس نے اپنے ملازموں سے کہا کہ دیکھو یہ کون پاگل ہے جو اس وقت ہمارے خیمہ کے پاس شور کر رہا ہے۔اس کو پکڑ کر ہمارے پاس حاضر کرو۔چنانچہ شیخ رشید الدین فوراً بادشاہ کی خدمت میں حاضر کر دئے گئے۔

اب بادشاہ نے ان سے سوال وجواب شروع کیا کہ تم کون ہو اور کیوں ہمارے خیمہ کے پاس شور کر رہے ہو۔شیخ رشید الدین نے اپنے والد شیخ جمال الدین کی پوری کہانی سنائی اور کہا کہ آپ کے سوال کے جواب میں جب میرے والد نے کہا تھا کہ اگر ہم کو سچا دین نہ ملا ہوتا تو یقیناً ہم کتے سے بھی زیادہ برے ہوتے تو آپ نے کہا تھا کہ اس وقت میں کچھ نہیں کہتا مگر جب میری تخت نشینی ہوجائے تو تم میرے پاس آنا۔مگر اس کے انتظار میں میرے والد کا آخری وقت آگیا۔اب ان کی وصیت کے مطابق میں آپ کے پاس وہ بات یاد دلانے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

بادشاہ نے پورے قصہ کو غور کے ساتھ سنا۔آخر میں بولا کہ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔میں تمھارے انتظار میں تھا۔اس کے بعد اس نے اپنے وزیر کو بلایا اور کہا کہ ایک راز میرے سینہ میں تھا جس کو آج اس ایرانی فقیر نے یاد دلایا ہے۔میرا ارادہ ہے کہ میں اسلام قبول کرلوں۔تمھاری کیا رائے ہے۔وزیر نے کہا کہ میں بھی یہی راز اپنے سینہ میں لئے ہوئے ہوں۔میں سمجھ چکا ہوں کہ سچا دین یہی ہے۔اس کے بعد بادشاہ اور وزیر دونوں شیخ رشید الدین کے ہاتھ پر مسلمان ہوگئے۔اس کے بعد بقیہ درباریوں نے بھی اسلام قبول کرلیا۔بادشاہ کے قبول اسلام کے بعد پہلے ہی دن ایک لاکھ ساٹھ ہزار آدمیوں نے اسلام قبول کرلیا اور بالآخر ایران کی پوری تاتاری قوم نے بھی۔

بڑھیا کی دلیری

عباسی خلیفہ مامون الرشید (۲۱۸ - ۱۰۷ھ) اپنے سیاسی مخالفین کے لئے نہایت بے رحم تھا مگر عام لوگوں کے ساتھ وہ ہمیشہ ہمدردی سے پیش آتا تھا۔ ایک روز اس کے دربار میں بغداد کی ایک بوڑھی عورت آئی۔ اس نے خلیفہ مامون سے شکایت کی کہ میں ایک غریب عورت ہوں۔ میرے پاس ایک زمین تھی جس کو ایک ظالم نے مجھ سے چھین لیا۔ میں نے کتنی ہی فریاد کی مگر اس نے نہیں سنا۔ میری دادرسی کی جائے۔ مامون نے پوچھا: وہ کون ظالم ہے جس نے تمہارے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے، بڑھیا نے اشارہ سے بتایا کہ وہ وہی ہے جو اس وقت آپ کے پہلو میں بیٹھا ہوا ہے۔ مامون نے دیکھا تو وہ اس کا لڑکا عباس تھا۔ مامون نے اپنے وزیر کو حکم دیا کہ وہ شہزادہ کو پکڑ کر اٹھائے اور اس کو لے جاکر بڑھیا کے برابر کھڑا کر دے۔ وزیر نے ایسا ہی کیا۔ اب مامون نے حکم دیا کہ دونوں اپنا اپنا بیان دیں۔

شہزادہ عباس رک رک کر آہستہ آواز میں بولتا تھا۔ لیکن بڑھیا بلند آواز میں بول رہی تھی۔ وزیر نے بڑھیا کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ آہستہ بولو، خلیفہ کے سامنے زور زور سے بولنا آداب کے خلاف ہے۔ مامون نے اپنے وزیر کو روکا اور کہا: اس کو آزاد چھوڑ دو، جس طرح چاہے اسے کہنے دو۔ سچائی نے بڑھیا کی زبان تیز کر دی ہے اور شہزادہ کو اس کے جھوٹ نے گونگا بنا دیا ہے۔ بڑھیا کا دعویٰ صحیح تھا۔ چنانچہ مقدمہ کا فیصلہ بڑھیا کے حق میں ہوا اور اس کی زمین شہزادہ سے لے کر اس کو واپس کر دی گئی (عقد الفرید جلد اول)

سچائی اپنی ذات میں ایک طاقت ہے۔ سچائی پر ہونے کا احساس آدمی کو دلیر بنا دیتا ہے۔ سچا آدمی بے دھڑک ہو کر بولتا ہے۔ سچے آدمی کا بیان تضاد اور تصنع سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے کلام میں کوئی جھول نہیں ہوتا۔ سچا آدمی بولتا ہے تو اس کے چہرے پر احساس جرم کا کوئی نشان نہیں ہوتا۔ اس کی آواز جھجک سے خالی ہوتی ہے۔ اس بنا پر سچے آدمی کی آواز میں قوت آجاتی ہے۔ وہ سننے والے کو مفتوح کر لیتی ہے۔

اس کے برعکس جس آدمی کا معاملہ جھوٹ پر مبنی ہو وہ کبھی قوت کے ساتھ نہیں بول سکتا۔ وہ ہمیشہ احساس جرم میں مبتلا رہتا ہے جس کا اثر اس کے لہجہ پر آجاتا ہے۔ اس کا چہرہ بتا دیتا ہے کہ وہ بے یقینی کے ساتھ بول رہا ہے۔ جھوٹ کو سچ بنانے کی کوشش میں اس کے بیان کے اندر تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ زبان رکھنے کے باوجود وہ بے زبان ہو جاتا ہے۔

اچھی زندگی

متوکل علی اللہ (۲۴۷ - ۲۰۷ ھ) ایک عباسی خلیفہ تھا۔ فتح بن خاقان کہتے ہیں کہ ایک روز میں خلیفہ متوکل کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت وہ سر نیچا کیے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ میں نے کہا: امیر المومنین، آپ کچھ فکرمند معلوم ہوتے ہیں۔ حالاں کہ آپ وہ شخص ہیں جس کو روئے زمین پر سب سے زیادہ آسائش کے سامان حاصل ہیں۔ خلیفہ متوکل نے میری بات سن کر اپنا سر اٹھایا اور کہا:

> اے فتح، مجھ سے زیادہ اچھی زندگی اس شخص کی ہے جس کے پاس ایک کشادہ مکان ہو، نیک بیوی ہو، بقدر ضرورت روزی کا انتظام ہو، نہ ہم اس کو جانتے ہوں کہ اس کو تکلیف دیں اور نہ وہ ہمارا محتاج ہو کہ ہم اس کو رسوا کریں (تاریخ الخلفاء، صفحہ ۲۴۱)

"اچھی زندگی" اس کا نام نہیں کہ آدمی کے پاس زندگی کے ساز و سامان کی کثرت ہو۔ اچھی زندگی کا راز قناعت ہے۔ قناعت کی دولت اسے ملتی ہے جو بقدر ضرورت چیزوں پر راضی ہو جائے اور شہرت و عزت سے بے نیاز ہو کر جینا جانتا ہو۔

کسی کو بقدر ضرورت روزی حاصل ہو تو اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔ بقدر ضرورت روزی پر مطمئن نہ ہونا صرف حرص کی بنا پر ہوتا ہے اور حریص آدمی کے لئے کبھی اطمینان نہیں۔ کیونکہ بقدر ضرورت کی تو حد ہے مگر حرص کی کوئی حد نہیں۔

بیوی اس لئے ہے کہ وہ زندگی کی رفیق بنے اور آدمی کے لئے گھریلو سکون کا ذریعہ ہو۔ مگر یہ فائدہ صرف نیک اور صالح بیوی سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسری تمام خصوصیات جو آدمی ایک عورت میں تلاش کرتا ہے وہ زوال پذیر بھی ہیں اور نئے نئے مسائل پیدا کرنے والی بھی۔

کسی کے پاس کشادہ مکان ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو خود اپنی ایک دنیا حاصل ہے جہاں وہ اپنی پسند کے مطابق ایک زندگی بنا کر اس کے اندر رہ سکتا ہے۔ دانش مند آدمی کے لئے کشادہ مکان گویا طوفان نوح کے درمیان ایک کشتی نوح ہے۔

گم نامی آدمی کے لئے سب سے بڑی عافیت ہے۔ کیوں کہ جو شخص نام حاصل کرے اس کو حاسدین کے حسد سے بچنا ممکن نہیں۔ اسی طرح جس شخص کو خدا نے دوسروں کی محتاجی سے بچایا ہو اس سے بڑا خوش قسمت اور کوئی نہیں۔ کیوں کہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ عین اس مقام پر آدمی کو ذلیل کر دیتے ہیں جہاں وہ حاجت مند بن کر ان کے سامنے آیا ہو۔

بارش شروع ہوگئی

چوتھی صدی ہجری کا واقعہ ہے۔ اندلس میں سلطان عبدالرحمٰن الناصر کی حکومت تھی۔ اس کا دارالسلطنت قرطبہ تھا۔ قاضی منذر بن سعید اس وقت قرطبہ کے قاضی تھے اور اسی کے ساتھ وہ قرطبہ کی جامع مسجد میں نماز کی امامت کی خدمت بھی انجام دے رہے تھے۔ وہ بہت اچھے خطیب تھے اور اسی کے ساتھ بہت بڑے عالم بھی۔

سلطان عبدالرحمٰن الناصر کو عمارتوں کا بہت شوق تھا۔ اس نے الزہرار کے نام سے ایک شاہی بستی بسائی اور اس میں شاندار محل تعمیر کیے۔ ان تعمیرات کے آخری دنوں میں سلطان اتنا مشغول رہا کہ مسلسل تین جمعہ میں وہ مسجد نہ پہنچ سکا۔ چوتھے جمعہ کو جب وہ جامع مسجد آیا تو اس کی موجودگی میں قاضی منذر نے جو خطبہ دیا اس میں نام لیے بغیر سلطان پر سخت تنقید کی۔ قاضی منذر نے ایسی آیتیں پڑھیں جن میں دنیا میں عمارتیں کھڑی کرنے اور آخرت سے غافل ہو جانے پر وعیدیں تھیں۔ مثلاً: کیا تم ہر بلندی پر عبث یادگاریں تعمیر کرتے ہو اور شاندار محل بناتے ہو گویا کہ تم کو ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہے۔ اور جب تم کسی پر حملہ کرتے ہو تو جبارانہ حملہ کرتے ہو۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو (شعراء) تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی اور وہ اس کو لے کر جہنم کی آگ میں جا گری۔ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ہے، ہمیشہ ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی یہاں تک کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ اور اللہ علیم وحکیم ہے (توبہ) اسی طرح قاضی منذر نے اس مضمون کی بہت سی حدیثیں سنائیں اور ان کی تشریح کی۔ اپنے خطبہ میں اگرچہ انھوں نے سلطان کا نام نہیں لیا مگر مسجد کا ہر نمازی سمجھ رہا تھا کہ ان سخت تنقیدوں کا مخاطب کون ہے اور وہ کس کے اوپر پڑ رہی ہیں۔

تنقید یوں بھی آدمی کے اوپر بہت سخت ہوتی ہے اور جب مجمع عام میں کسی پر تنقید کی جائے تو وہ اور بھی زیادہ ناگواری کا باعث ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ یہ تنقید ایک ماتحت کی زبان سے اپنے حاکم کے اوپر تھی۔ اور جب کوئی حاکم اپنے ماتحت کو تنقید کرتے ہوئے سنتا ہے تو اس پر کبر کا سخت دورہ پڑتا ہے۔ بڑے بڑے شریف اور دیندار لوگ بھی اس وقت قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔ مگر سلطان نے حد درجہ ضبط سے کام لیا۔ اگرچہ

سلطان پر اس تنقید کا بہت زیادہ اثر تھا مگر وہ مسجد میں کچھ نہ بولا اور نماز کے بعد خاموشی سے اٹھ کر باہر آگیا۔

گھر پہنچ کر سلطان نے اپنے لڑکے الحکم سے کہا کہ آج قاضی منذر نے مجھ کو بہت تکلیف دی۔ اب میں نے طے کر لیا ہے کہ ان کے پیچھے جمعہ کی نماز کبھی نہیں پڑھوں گا۔ الحکم نے کہا: قاضی منذر کا امام ہونا یا نہ ہونا آپ کے اختیار میں ہے۔ آپ ان کو معزول کر دیجئے اور ان کی جگہ دوسرا کوئی امام مقرر کر دیجئے جو ایسی گستاخی نہ کرے۔ یہ سن کر سلطان غصہ میں آگیا۔ اس نے اپنے لڑکے کو ڈانٹ کر کہا: تمھارا برا ہو، ایک شخص جو ہدایت سے دور ہے اور راستہ سے بھٹکا ہوا ہے کیا اس کی خوشی کی خاطر قاضی منذر جیسے خوبیوں والے آدمی کو معزول کر دیا جائے گا۔ یہ بات کبھی نہیں ہو سکتی (ھذا مما لا یکون) مجھے ان کی باتوں سے چوٹ لگی اس لئے میں نے ان کے پیچھے جمعہ نہ پڑھنے کی قسم کھالی۔ میری خواہش ہے کہ اس قسم کے کفارہ کی کوئی صورت نکل آئے۔ تاہم قاضی منذر ہماری زندگی میں اور اپنی زندگی میں لوگوں کو نماز پڑھاتے رہیں گے (بل یصلی بالناس حیاتنا وحیاتہ انشاء اللہ تعالیٰ) چنانچہ قاضی منذر بدستور جمعہ کی نماز پڑھاتے رہے۔ عبد الرحمٰن الناصر کے انتقال کے بعد اس کے لڑکے نے بھی ان کے مقام کو اسی طرح باقی رکھا۔

سلطان عبد الرحمٰن الناصر کے زمانہ میں ایک بار قحط پڑا۔ بہت سخت حالات پیدا ہو گئے۔ سلطان نے اپنا ایک خاص آدمی قاضی منذر بن سعید کے پاس بھیجا اور درخواست کی کہ آپ استسقار کی نماز پڑھائیں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بارش برسائے۔ قاضی منذر نے سلطان کے قاصد سے پوچھا کہ سلطان نے میرے پاس دعا کا پیغام بھیجا ہے مگر وہ خود کیا کر رہے ہیں۔ قاصد نے کہا: آج سے زیادہ ہم نے کبھی ان کو اللہ سے ڈرنے والا نہیں پایا۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ حیران و پریشان ہیں۔ تنہائی میں پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ مٹی کے فرش پر نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہے تھے اور اللہ سے کہہ رہے تھے: خدایا میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے کیا تو میرے گناہوں کی وجہ سے لوگوں کو عذاب دے گا حالاں کہ تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے (ھذہ ناصیتی بیدک، اتراک تعذب بی الرعیۃ وانت ارحم الراحمین)

یہ سن کر قاضی منذر کے چہرے پر اطمینان ظاہر ہو گیا۔ انھوں نے قاصد سے کہا: اپنے ساتھ بارش لے کر واپس جاؤ۔ اب ضرور بارش ہو گی۔ کیوں کہ زمین کا حاکم جب تضرع کرتا ہے تو آسمان کا حاکم ضرور رحم فرماتا ہے (اذا خشع جبار الارض فقد رحم جبار السماء) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قاصد واپس ہو کر گھر پہنچا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔

ایک سچی بات

شیخ حمید الدین ابوحاکم قریشی (۴۷۔۵۰۰ھ) ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو کیچ اور مکران کے علاقہ پر حکومت کر رہا تھا۔ اپنے والد سلطان بہاء الدین کے انتقال کے بعد وہ تخت سلطنت پر بیٹھے اور ۲۱ سال تک شان وشوکت کے ساتھ حکومت کی۔

"ذکر کرام" میں ان کے واقعات کے ذیل میں لکھا ہے کہ شیخ حمید الدین کے ساتھ ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا جس نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا اور "سلطان کے بجائے ان کو "شیخ" بنا دیا۔

شیخ حمید الدین اپنی حکومت کے زمانہ میں دوپہر کو اپنے ایک باغ میں قیلولہ کیا کرتے تھے۔ اس باغ میں ان کا ایک محل تھا۔ اس محل کی نگرانی نونیت نامی ایک خادمہ کے سپرد تھی۔ اس خادمہ کے ذمہ یہ کام تھا کہ ہر روز وقت پر بستر بچھا دے تاکہ شیخ حمید الدین آکر اس پر آرام کر سکیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز شیخ کے آنے سے پہلے خادمہ نے بستر بچھایا تو اس کو بستر بہت اچھا لگا۔ وہ اس پر کچھ دیر کے لئے لیٹ گئی۔ ابھی وہ بستر سے اٹھی نہیں تھی کہ اس کو نیند آگئی۔ شیخ حمید الدین جب معمول کے مطابق آرام کرنے کے لئے محل پہنچے تو دیکھا کہ خادمہ نونیت بستر پر پڑی سو رہی ہے۔ سلطان کے بستر پر خادمہ کو سویا ہوا دیکھ کر انھیں غصہ آگیا۔ انھوں نے حکم دیا کہ اس گستاخی پر خادمہ کو سو کوڑوں کی سزا دی جائے۔

حکم کی فوراً تعمیل ہوئی اور خادمہ کو کوڑے مارے جانے لگے۔ مگر شیخ حمید الدین کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ خادمہ آہ و واویلا نہیں کر رہی ہے، بلکہ ہر کوڑے پر ہنس پڑتی ہے۔ انھوں نے سزا کو روک کر خادمہ کو بلایا اور اس سے خلاف معمول ہنسنے کی وجہ پوچھی۔ خادمہ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا:

> مجھے خیال آیا کہ جب اس نرم بستر پر ایک بے اختیارانہ نیند کی یہ سزا ہے تو ان لوگوں کا انجام کیا ہوگا جو روزانہ اس نرم بستر پر آرام کرتے ہیں۔

خادمہ کے اس جواب کا شیخ حمید الدین پر اتنا اثر ہوا کہ ان کی زندگی بالکل بدل گئی۔ وہ دنیا اور اس کی لذتوں سے بے رغبت ہو گئے۔ یہاں تک کہ درویشی کی زندگی اختیار کر لی۔ سلطنت چھوڑ کر شیخ حمید الدین لاہور آئے۔ یہاں حضرت سید احمد توختہ (جو ان کے نانا بھی ہوتے تھے) کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے ہاتھ پر طریقہ شطاریہ میں بیعت کی اور ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد ان کی خلافت حاصل کی۔ شیخ حمید الدین نے ۱۶۷ سال کی عمر پائی۔ آخر عمر میں وہ اُچ اور سکھر کے درمیانی علاقہ میں تبلیغ وارشاد کا کام کرتے رہے۔ اس علاقہ میں بہت سے لوگ ان کے ہاتھ پر ایمان لائے (تذکرہ صوفیاء پنجاب از اعجاز الحق قدوسی)

آدمی کی فطرت زندہ ہو تو ایک جملہ اس کو تڑپانے کے لئے کافی ہے۔ اور اگر فطرت مردہ ہو جائے تو ہزاروں تقریریں بھی اس کو حرکت میں لانے کے لئے ناکام ثابت ہوتی ہیں۔

اعلیٰ کردار کی ایک مثال

مشرقی بنگال مسلم دور حکومت میں دہلی کی مرکزی سلطنت کے ماتحت تھا۔ درمیان میں کئی بار ایسا ہوا کہ وہاں کا گورنر مرکز سے باغی ہو کر خود بادشاہ بن بیٹھا۔ انھیں میں سے ایک سلطان غیاث الدین ہے جس نے دہلی کی مرکزی سلطنت سے بغاوت کر کے مشرقی بنگال میں خود مختار حکومت قائم کر لی تھی۔ اس زمانہ میں ڈھاکہ کا شہر وجود میں نہ آیا تھا اور حکومت کا مستقر سونار گاؤں تھا۔ اس مسلمان بادشاہ کا ایک واقعہ ایک انگریز مورخ ایف بی بریڈلے برٹ (Bradley Birt) نے نقل کیا ہے۔ اس کی کتاب DACCA: The Romance of one Eastern Capital کے دوسرے اڈیشن مطبوعہ لندن ۱۹۱۴ میں یہ واقعہ اس طرح درج ہے:

"ایک دن شاہ غیاث الدین تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا۔ اتفاق سے اس کے تیر سے ایک بیوہ عورت کا اکلوتا لڑکا زخمی ہو گیا۔ بیوہ عورت کو معلوم نہ تھا کہ یہ تیر بادشاہ نے چلایا ہے۔ وہ قاضی شرع کے پاس فریاد لے کر گئی۔ قاضی نے اپنی فراست سے اندازہ لگایا کہ یہ تیر بادشاہ کا ہی چلایا ہوا تھا۔ وہ دیر تک مذبذب رہا کہ بادشاہ کے خوف اور خوف خدا میں سے کس کو ترجیح دوں۔ بالآخر خدا کا خوف قاضی صاحب پر غالب آیا اور انھوں نے بادشاہ کو جواب دہی کے لئے اپنی عدالت میں طلب کیا۔ بادشاہ کو جونہی بلاوا پہنچا وہ بلا کسی تامل کے قاضی کی عدالت کی طرف روانہ ہوا۔ لیکن اس نے اپنے کپڑوں میں ایک چھوٹی سی تلوار بھی چھپالی۔ قاضی صاحب نے عدالت میں بادشاہ کا کسی قسم کا احترام نہیں کیا۔ اور معاملہ کی جانچ کے بعد حکم دیا کہ وہ اس بیوہ عورت کو معقول مالی معاوضہ دے کر اس سے اپنا قصور معاف کرائے ۔ بادشاہ نے بے چون و چرا اس حکم کی تعمیل کی اور بیوہ عورت کو ایک بڑی رقم پیش کر کے اس سے اپنا قصور معاف کرایا۔ مقدمہ ختم ہونے کے بعد قاضی صاحب اپنی کرسی عدالت سے اٹھ کر بادشاہ کے قدموں پر گر پڑے۔ بادشاہ نے فوراً انھیں اٹھایا اور وہ تلوار ان کو دکھائی جو وہ اپنے کپڑوں میں چھپائے ہوئے تھا اور کہا کہ یہ تلوار میں اس لئے لایا تھا کہ اگر تم میرے اس مقدمہ میں شریعت کے حکم سے ذرا بھی روگردانی کروگے تو میں تمھارا سر اڑا دوں گا۔ لیکن تم نے شرع کے مطابق فیصلہ صادر کرنے میں میرا کوئی خوف نہیں کیا اس کے لئے تم انتہائی اعزاز کے مستحق ہو (صفحہ ۵۵-۵۶)

شریعت کی پابندی کی یہ مثال قائم کرنے والے بادشاہ کا مقبرہ اس کتاب کی اشاعت کے وقت تک سونار گاؤں میں موجود تھا (صدق جدید ۲ مئی ۱۹۸۰)

کسی قوم کی ترقی کا راز یہ ہے کہ اس کے اندر اس قسم کے زندہ افراد موجود ہوں۔ زندہ افراد کی موجودگی سے قوم زندہ ہوتی ہے اور زندہ افراد نہ ہونے سے قوم مرجاتی ہے۔ زندہ آدمی وہ ہے جو مصلحت کے مقابلہ میں اصول کو اہمیت دیتا ہو۔ جو اپنی غلطی پر عذرات اور توجیہات کا پردہ ڈالنے کے بجائے اس کو مان لیتا ہو، جو ذاتی شکایت کو نظر انداز کر دے نہ کہ اس کی بنا پر کسی کو اپنا دشمن سمجھ لے۔ جو اس وقت بھی ایک انسان کی قدر کر سکے جب کہ اس نے اس کے خلاف کارروائی کی ہو۔

سچائی کی فتح

تیرھویں صدی ہجری کے وسط کا واقعہ ہے جب کہ ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ کاندھلہ (ضلع مظفر نگر، یوپی) کی جامع مسجد کی تعمیر شروع ہوئی تو مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں میں نزاع شروع ہوگئی۔ یہ نزاع مسجد سے متصل ایک زمین کے بارے میں تھی۔ مسلمان اس زمین کو مسجد کی ملکیت قرار دے کر مسجد میں شامل کرنا چاہتے تھے اور ہندوؤں کا اصرار تھا کہ یہ قدیم مندر کا حصہ ہے۔ جھگڑا بڑھا تو معاملہ عدالت تک پہنچا اور کئی سال تک اس کا مقدمہ چلتا رہا۔

مجسٹریٹ انگریز تھا۔ جو شواہد اس کے سامنے پیش کیے گئے وہ اتنے قطعی نہ تھے کہ انکی بنیاد پر وہ کسی ایک فریق کے حق میں فیصلہ کرسکے۔ بالآخر مجسٹریٹ نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے الگ الگ گفتگو کی۔ اس نے مسلمانوں سے کہا کہ کیا تمھاری نظر میں کوئی ایسا ہندو ہے جو یہ گواہی دے کہ یہ زمین مسجد کی ملکیت ہے۔ اگر تم کسی ایسے ہندو کا نام بتاؤ تو میں اس کے بیان پر زمین کا فیصلہ کردوں گا۔ مسلمانوں نے کہا کہ ہم کسی ہندو کا نام نہیں بتا سکتے۔ یہ ایک مذہبی معاملہ ہے اور ہم کو کسی ہندو سے یہ امید نہیں کہ ایسے مذہبی معاملہ میں وہ جانب داری کے بغیر بالکل سچ بات کہہ سکے اور یہ گواہی دے کہ زمین مسجد کی ملکیت ہے۔

اس کے بعد انگریز مجسٹریٹ نے ہندوؤں کو بلایا اور کہا کہ کیا تم کسی ایسے مسلمان کا نام بتا سکتے ہو جو تمھارے دعوے کی تصدیق کرے اور یہ گواہی دے کہ یہ زمین مندر کی ملکیت ہے۔ اگر تم ایسے کسی مسلمان کا نام بتاؤ تو میں اس کے بیان پر زمین کا فیصلہ تمھارے حق میں کر دوں گا۔ ہندوؤں نے باہم مشورہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے مجسٹریٹ سے کہا کہ یہ مسئلہ قومی عزت کا معاملہ بن گیا ہے۔ اس لئے بہت مشکل ہے کہ کوئی مسلمان یہ گواہی دے کہ یہ زمین مندر کی ہے تاہم ہماری بستی میں ایک بزرگ ایسے ہیں جن سے ہم کو امید ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولیں گے۔

ہندوؤں نے جس مسلمان کا نام بتایا وہ مولانا مظفر حسین کاندھلوی کے والد مولانا محمود بخش (م ۱۲۵۸ھ) تھے مجسٹریٹ کا کیمپ اس وقت کاندھلہ کے قریب موضع ایلم میں تھا۔ اس نے فوراً مولانا محمود بخش کے یہاں پیغام بھیجا کہ وہ کچہری پہنچ کر متعلقہ مسئلہ میں اپنا بیان دیں۔ مجسٹریٹ کا بھیجا ہوا آدمی جب مولانا موصوف کے پاس پہنچا تو انھوں نے کہا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ فرنگی کا منھ کبھی نہیں دیکھوں گا۔ مجسٹریٹ نے دوبارہ اپنا چپراسی بھیج کر کہلایا کہ اس کا انتظام رہے گا کہ میں یا کوئی دوسرا انگریز آپ کے سامنے نہ پڑے۔ آپ مہربانی کرکے تشریف لائیں۔ کیونکہ آپ ہی کے بیان پر ایک اہم مقدمہ کا فیصلہ ہونا ہے۔ اس نے مزید کہلایا کہ آپ

کی مذہبی کتاب قرآن میں یہ حکم ہے کہ کسی معاملہ میں کسی کے پاس گواہی ہو تو وہ اس کو پیش کرے، وہ ہرگز اس کو نہ چھپائے۔

اب مولانا محمود بخش کاندھلوی مجسٹریٹ کی عدالت میں تشریف لائے۔ مجسٹریٹ خیمہ کے اندر دروازہ کے پاس بیٹھ گیا۔ مولانا دروازہ کے پاس باہر کی طرف کھڑے ہو گئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی بڑی تعداد خیمہ کے باہر جمع تھی۔ ہر ایک ملے جلے جذبات کے ساتھ منتظر تھا کہ دیکھئے آج کیا پیش آتا ہے۔ اندر بیٹھے ہوئے مجسٹریٹ نے بلند آواز سے پوچھا کہ مولانا محمود بخش صاحب یہ بتایئے کہ یہ متنازعہ جگہ ہندوؤں کی ہے یا مسلمانوں کی ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ جگہ ہندوؤں کی ہے، مسلمانوں کا دعویٰ اس کے بارہ میں غلط ہے۔ مجسٹریٹ نے مولانا محمود بخش صاحب کے اسی بیان پر اپنا فیصلہ دے دیا اور وہ زمین ہندوؤں کو مل گئی۔ یہ زمین کاندھلہ کی موجودہ جامع مسجد کی جنوب مشرقی دیوار سے ملی ہوئی ہے۔ ہندوؤں نے مجسٹریٹ کے فیصلہ کے فوراً بعد یہاں مندر تعمیر کر دیا۔ اب بھی اس جگہ پر وہ مندر موجود ہے۔

مسلمان کچہری سے اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کے چہرے اداس تھے اور ان کے دلوں میں شکست کا احساس چھایا ہوا تھا۔ بہت سے لوگوں نے کہا کہ "مولوی نے قوم کو غیروں کے سامنے رسوا کر دیا" مسلمانوں کو معلوم نہ تھا کہ قانون کی عدالت کا فیصلہ اگرچہ ہو چکا ہے مگر اخلاق کی عدالت کا فیصلہ ابھی باقی ہے۔ مولانا محمود بخش کی اس سچائی اور بے لاگ حق پرستی کا ہندوؤں پر بہت اثر پڑا۔ وہ مولانا کی سچائی کے واقعہ میں اس دین کی سچائی کو دیکھنے لگے جس نے ان کے اندر یہ زبردست قوت پیدا کی کہ وہ ایک نہایت نازک قومی معاملہ میں بھی انصاف سے نہیں ہٹے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاندھلہ کے کئی ہندو خاندان اسلام سے متاثر ہوئے اور مولانا محمود بخش کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔ ان نومسلم خاندانوں میں سے ایک گھرانہ ۱۹۴۷ تک کاندھلہ میں موجود تھا جو تقسیم کے بعد پاکستان چلا گیا۔

مسلمان اپنا مقدمہ ہار گئے مگر اسلام اپنا مقدمہ جیت گیا۔

دو شخصوں یا گروہوں میں جب بھی کوئی نزاعی معاملہ پیش آتا ہے تو عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ہر ایک کی نظر مفاد اور مصلحت کی طرف چلی جاتی ہے۔ جس چیز میں بظاہر فائدہ نظر آئے، جو قومی وقار کے مطابق ہو۔ جس میں دنیوی سربلندی حاصل ہوتی ہو، آدمی بس اسی کی طرف جھک جاتا ہے۔ مگر حقیقی کامیابی کا راستہ یہ ہے کہ معاملہ کو حق اور ناحق اور انصاف اور بے انصافی کی نظر سے دیکھا جائے۔ جو طریقہ حق کے مطابق ہو اس کو اختیار کر لیا جائے اور جو طریقہ حق کے خلاف ہو اس کو چھوڑ دیا جائے۔ یہ اصولی موقف ہے اور اس دنیا میں بالآخر اصولی موقف کامیاب ہوتا ہے نہ کہ افادی موقف۔

زندہ رہنمائی

اسلام انسان کے لئے خدا کی ابدی رہنمائی ہے۔ اسلام کی صورت میں خدا نے وہ تمام بنیادی اصول بتادئے ہیں جو انسان کو موجودہ دنیا کی زندگی میں سچائی اور انصاف پر قائم رکھنے والے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ مزید انتظام کیا گیا ہے کہ رسول اور اصحاب رسول کی زندگیوں کے ذریعہ ان اصولوں کا مکمل عملی نمونہ بھی ایک شاندار تاریخ کی صورت میں ہمارے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ اسلام کی یہ تاریخ ہر موڑ پر ایک زندہ رہنما کی طرح کھڑی ہوئی ہر آدمی کو بتا رہی ہے کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

ایک غریب مسلمان دن بھر کی محنت کے بعد شام کو اپنے گھر واپس آیا۔ اس کو بھوک لگی ہوئی تھی۔ اس کی بیوی کھانا لائی تو وہ صرف ارہر کی دال اور جو کی روٹی تھی۔ مسلمان اس کو دیکھ کر جھنجلا اٹھا کہ دن بھر کی محنت کے بعد ہم کو یہی کھانا ملا ہے اور کتنے لوگ بغیر محنت کے عمدہ عمدہ کھانا کھا رہے ہیں۔ مگر معاً بعد اس کو خیال آیا کہ خدا کے محبوب پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کھانا تو اس سے بھی زیادہ معمولی ہوتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔ انسانوں کے درمیان معاشی اونچ نیچ اس کو اصل مسئلہ کی نسبت سے غیر اہم نظر آنے لگی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنا کھانا کھایا اور رات کی نماز پڑھ کر سو گیا۔

دنیا کی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی چلتے چلتے سیدھے راستہ کے اِدھر اُدھر بھٹک جاتا ہے۔ وہ اہم اور غیر اہم کے فرق کو بھول جاتا ہے۔ اس کی نظر اصل نشانہ سے ہٹ کر وقتی چیزوں میں الجھ جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر اسلام کی تاریخ آدمی کے لئے ایک معیار کا کام دیتی ہے۔ وہ زندہ نمونوں کے ذریعہ آدمی کی تصحیح کرتی رہتی ہے۔ ایک "عام" آدمی بھی اس میں اپنا سبق پا سکتا ہے اور ایک "خاص" آدمی بھی۔

۳ مئی ۱۹۶۹ کو سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کی اچانک وفات ہوئی تو مسٹر وی وی گری نائب صدر تھے۔ اس کے بعد دستور ہند کے مطابق وہ قائم مقام صدر ہو گئے۔ تاہم جلد ہی انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے عہدہ سے استعفا دے دیں اور صدارتی الکشن کا مقابلہ کریں۔ ان کے استعفا کے بعد جو قانونی صورت پیدا ہوئی اس کے مطابق جناب محمد ہدایت اللہ (پیدائش ۱۹۰۵) ہندستان کے ایکٹنگ صدر مقرر ہوئے جو اس وقت ہندستانی سپریم کوٹ کے چیف جسٹس تھے۔ ان کی صدارت ۳۵ دن (۲۰ جولائی تا ۲۴ اگست ۱۹۶۹) جاری رہی۔

دنیا کی سب سے بڑی جمہوریہ کے صدر کی حیثیت سے جناب محمد ہدایت صاحب کو جو تجربات ہوئے ان کو انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری (My Own Boswell) میں درج کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ بڑا سبق آموز ہے۔

۱۵ اگست ۱۹۶۹ کو راشٹرپتی بھون کے مغل گارڈن میں یوم آزادی کی تقریب تھی۔ محمد ہدایت اللہ صاحب بحیثیت صدر روایتی جلوس کے ساتھ راشٹرپتی بھون سے نکلے۔ اعلیٰ فوجی افسران، اے ڈی سی کا عملہ، صدارتی باڈی گارڈ سب جلو میں چل رہے تھے۔ ان کا پرشوکت یونیفارم اور منظم انداز میں حرکت کرنا راشٹرپتی بھون کے شاہانہ ماحول میں عجیب شان دار منظر پیش کر رہا تھا۔ محمد ہدایت اللہ صاحب کہتے ہیں کہ اپنے گرد یہ شان و شوکت دیکھ کر مجھے کسی قدر فخر کا احساس ہونے لگا:

I felt a little pride (p. 245)

مگر اگلے ہی لمحہ ان کو فاروق اعظم رض کا وہ واقعہ یاد آگیا جو معمولی فرق کے ساتھ تاریخ کی مختلف کتابوں میں آیا ہے۔

شام وفلسطین کی جنگ کے آخری مرحلہ میں عیسائیوں نے پیش کش کی کہ وہ ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ خلیفہ اسلام خود سفر کر کے یہاں آئیں۔ خلیفہ دوم ایک اونٹ اور ایک غلام کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ دمشق کے قریب جابیہ کے مقام پر پہنچے تو ابوعبیدہ بن الجراح اور خالد بن ولید اور اسلامی فوج کے دوسرے سرداروں نے آپ کا استقبال کیا۔ جابیہ میں کئی دن تک قیام رہا اور عیسائیوں سے گفتگو کے بعد یہیں معاہدہ لکھا گیا۔

معاہدہ کی تکمیل کے بعد عمر فاروق رض بیت المقدس کے لئے روانہ ہوئے۔ آپ کے جسم پر پرانے نہایت معمولی کپڑے تھے۔ آپ کی سواری ایک دبلی اونٹنی تھی۔ چنانچہ لوگوں نے آپ کی خدمت میں نیا کپڑا اور ترکی نسل کا عمدہ گھوڑا پیش کیا اور اصرار کیا کہ آپ اونٹنی کو چھوڑ دیں اور اسی گھوڑے پر سفر کر کے جائیں۔ آپ گھوڑے پر سوار ہوئے تو وہ عجیب شان کے ساتھ چلنے لگا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد عمر فاروق رض گھوڑے سے اتر گئے اور کہا کہ میری اونٹنی لاؤ، میں اسی پر سوار ہو کر جاؤں گا۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو کہا: میرے دل میں بڑائی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی بڑائی کا جذبہ ہو وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

محمد ہدایت اللہ صاحب کو جب یہ واقعہ یاد آیا تو ان کے دل کی کیفیت بدل گئی۔ اس وقت ان کا جو حال ہوا اس کو وہ ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں —— مجھے اپنے اوپر شرم آنے لگی۔ میں نے اسی وقت اس احساس کو اپنے اندر سے نکال دیا اور دوسری چیزوں کے بارے میں سوچنے لگا:

I felt ashamed of myself and put aside the feeling
at once and begun thinking of other things. (246)

اسلامی تاریخ ہر آدمی کے لئے ایک زندہ نمونہ ہے۔ وہ ہر موقع پر آدمی کو متوازن بناتی ہے۔ اسلامی تاریخ کے اندر کسی "بادشاہ" کے لئے بھی اتنی ہی رہنمائی ہے جتنی ایک "معمولی" انسان کے لئے۔

قناعت

مولانا حمید الدین فراہی (۱۹۳۰-۱۸۶۳) ایک مخلص عالم تھے۔ ابتداءً وہ علی گڑھ اور حیدرآباد کی یونیورسٹیوں میں استاد رہے۔ آخر عمر میں وہ مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر اعظم گڑھ) میں مقیم ہوگئے اور قرآن اور تعلیم دین کی خدمت کرتے ہوئے عمر گزار دی۔ مولانا عبد الماجد دریابادی نے ان کی وفات کے بعد جو مضمون لکھا اس کا ایک ٹکڑا یہ تھا:

> سادہ کھاتے، سادہ پہنتے۔ دنیا سے بہ قدر ضرورت لیتے کھانا کھا رہے ہیں، دسترخوان پر صرف دال اور روٹی ہے۔ دال میں نمک کم ہے۔ بلا کسی ناخوشی کے اوپر سے نمک ملایا اور چہرہ تک سے ناگواری نہ ظاہر ہونے دی۔ دوسرے دن پھر وہی کھانا آج نمک بہت زائد ہوگیا ہے اسی انداز سے اٹھے اور آج پانی ملا کر پھر اس ناخوش گوار کو خوش گوار بنا لیا شریک طالب علم کچھ جھنجلائے، کچھ دنگ رہ گئے منہ سب نے بنایا فرمایا بھائی بات کچھ نہیں ایک چٹنی تیار رکھو بغیر پیسہ کوڑی کے خرچ سے تیار ہو جاتی ہے۔ جس کھانے میں ملا لوگے۔ مزہ دار ہو جائے گا۔ چٹنی کا نام ہے قناعت!

قناعت محض ایک درویشانہ عادت نہیں۔ وہ زندگی کی ایک زبردست حقیقت ہے۔ قناعت دراصل اس پختہ مزاجی کا نام ہے کہ آدمی ان حالات کے ساتھ موافقت کر کے رہ سکے جن کو وہ بدل نہیں سکتا۔ موجودہ دنیا میں اس مزاج کی ضرورت ایک عام آدمی کو بھی ہوتی ہے اور ایک بادشاہ کو بھی۔ عام آدمی کو اگر یہ نعمت حاصل ہو جائے تو وہ اپنے بے مزہ سالن کو ہنسی خوشی کھا کر اپنے کام میں لگ جائے گا۔ نہ کہ وہ اس پر غصہ ہو کر اپنے وقت اور اپنی طاقت کو خواہ مخواہ برباد کرے۔ اسی طرح اگر "بادشاہ" کو یہ نعمت مل جائے تو وہ عوام کے جمہوری رجحانات سے موافقت کر کے اپنی بادشاہت کو دیر تک باقی رکھ سکتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ عوامی تقاضوں سے لڑنے لگے اور بالآخر اپنے تخت و تاج کو کھو دے۔ قناعت اکثر نفسیاتی امراض کا علاج ہے۔

امریکہ کے ایک شخص نے اندیشے (Fears) کے بارے میں معلومات جمع کیں۔ بہت سے لوگوں سے مل کر اس نے پوچھا کہ آپ کو کس قسم کے اندیشے لاحق ہوئے اور ان کا انجام کیا رہا۔ تحقیق کے بعد اس نے پایا کہ بیشتر اندیشے ایسے تھے جو صرف اندیشے ثابت ہوئے، وہ کبھی واقعہ نہیں بنے۔ حالاں کہ ان لوگوں نے اپنے ان امکانی اندیشوں کے غم میں اپنی صحتیں برباد کر لیں اور دوسرے بہت سے نقصانات کر ڈالے۔

○ اندیشہ، ہر آدمی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ہر آدمی اپنے حالات کے اعتبار سے طرح طرح کے اندیشوں میں

مبتلا رہتا ہے جو اس کے سکون کو غارت کرتے رہتے ہیں۔ آدمی کے اندر اگر قناعت کا مزاج آجائے تو اس کو خود بخود اس قسم کے پیشگی اندیشوں سے نجات مل جائے گی۔ جب آدمی کا حال یہ ہو کہ اس کو جو مل جائے اسی پر وہ راضی رہے تو اندیشوں کی بنیاد پر پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔ قناعت کا ہر شخص کو یہ پیغام ہے —— دیوی نقصان کا غم نہ کرو۔ اگر وہ ہو چکا ہے تو وہ ایک ہونے والی بات تھی جو ہوئی۔ اور اگر وہ صرف ایک اندیشہ ہے تو بہت سے اندیشے ایسے ہیں کہ آدمی ان کے لئے اپنے آپ کو پریشان کرتا ہے حالاں کہ وہ کبھی واقع نہیں ہوتے۔

قناعت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ آدمی کو دنیا کے مسائل میں غیر ضروری طور پر الجھنے سے بچاتی ہے اور اس طرح اس کو موقع دیتی ہے کہ وہ اپنے وقت اور اپنی قوت کو زیادہ سے زیادہ آخرت کے کاموں میں لگا سکے۔ آخرت کے مسافر کے لئے قناعت اتنی ہی ضروری ہے جتنا دنیا کے مسافر کے لئے حرص۔ جس آدمی کے اندر حرص نہ ہو وہ متاع دنیا کا مالک نہیں بن سکتا۔ اسی طرح جس کے اندر قناعت نہ ہو وہ متاع آخرت کو پانے سے محروم رہے گا۔

قناعت کی اسی اہمیت کی بنا پر دین میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ جس کو بقدر ضرورت رزق ملا اور اللہ نے اس کو جو کچھ دیا اس پر اس نے قناعت کیا (قد افلح من اسلم و رُزِقَ کفافاً وقنّعہ اللہ بما آتاہ، اخرجہ مسلم والترمذی)

انسان کی خواہشیں لامحدود ہیں اور دنیا کی چیزیں محدود۔ آدمی دنیا کی چیزیں خواہ کتنی ہی زیادہ حاصل کرلے وہ اس کی تسکین کے لئے ہمیشہ ناکافی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ پانے والا بھی اس دنیا میں اتنا ہی پریشان رہتا ہے جتنا کم پانے والا۔ اس لئے اس دنیا میں اگر کوئی چیز آدمی کی تسکین کا ذریعہ بن سکتی ہے تو وہ قناعت ہے۔ کیونکہ قناعت تو ہر حد پر مطمئن ہو جاتی ہے جب کہ حرص کسی حد پر مطمئن نہیں ہوتی۔

قناعت دراصل حقیقت پسندی کا دوسرا نام ہے۔ ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں مختلف وجوہ سے ہماری مرضی کے خلاف واقعات پیش آتے ہیں۔ کہیں دوسرے کو زیادہ مل جاتا ہے اور ہم کو کم۔ کہیں خود اپنی حاصل شدہ چیز کو پوری طرح استعمال کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کہیں ایسا ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ پاتے ہیں وہ اس سے بہت کم ہوتا ہے جو ہم اپنے اندازہ کے مطابق اپنے لئے چاہتے تھے۔ کہیں کوئی ناگہانی حادثہ پیش آکر ہمارے بنے بنائے معاملہ کو بگاڑ دیتا ہے۔ ایسے تمام مواقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ نقصان کے بعد نقصان کے غم سے اپنے کو بچایا جائے۔ اور قناعت آدمی کی زندگی میں یہی اہم خدمت انجام دیتی ہے۔ قناعت آدمی کو بے صبری سے بچاتی ہے۔ وہ تلخ یادوں کو بھلاتی ہے۔ وہ زندگی کی ناخوش گواریوں کو خوش گوار بنا دیتی ہے۔

توبہ نے طاقت ور بنا دیا

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جادوگر جب فرعون کے پاس جمع ہوئے تو انھوں نے فرعون سے کہا: اگر ہم موسیٰ کے مقابلہ میں غالب رہے تو ہم کو اس کا انعام تو ضرور ملے گا۔ فرعون نے کہا ہاں۔ اس کے بعد جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لکڑیاں پھینکیں جو دیکھنے والوں کو رینگتے ہوئے سانپ کی مانند نظر آنے لگیں۔ اب حضرت موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا۔ آپ کا عصا اژدہا بن کر گھوما تو اس کا اثر یہ ہوا کہ جادوگروں کی ہر لکڑی لکڑی اور ہر رسی رسی ہو کر رہ گئی۔ جادوگر سمجھ گئے کہ موسیٰ نے جو چیز دکھائی ہے وہ جادو نہیں بلکہ خدائی معجزہ ہے۔ ان کا سینہ حق کے لئے کھل گیا۔ اور انھوں نے اسی وقت ایمان قبول کر لیا۔ فرعون غضب ناک ہو کر بولا: تم لوگ موسیٰ کے مومن بن گئے قبل اس کے کہ میں تم کو اس کی اجازت دوں۔ یہ تم لوگوں کی خفیہ سازش ہے۔ میں تمھارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا اور پھر تم سب لوگوں کو سولی پر چڑھا دوں گا (اعراف) —— جادوگروں نے جواب دیا: اس ذات کی قسم جس نے ہم کو پیدا کیا ہے، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ خدا کی روشن نشانیوں کے مقابلہ میں ہم تم کو ترجیح دیں۔ تم جو کچھ کرنا چاہو کر لو۔ تم صرف اسی دنیا کی زندگی کا فیصلہ کر سکتے ہو اور اللہ زیادہ اچھا ہے اور وہ باقی رہنے والا ہے (طٰہٰ)

وہی جادوگر جو ابھی فرعون کے سامنے خوشامدی باتیں کر رہے تھے اور اس کے انعام اور اعزاز کے طالب تھے وہی تھوڑی دیر بعد اتنے دلیر اور بلند حوصلہ ہو گئے کہ فرعون کی انھیں کوئی پروا نہ رہی۔ حتیٰ کہ فرعون کی طرف سے سخت ترین سزا کی دھمکی بھی انھیں مرعوب نہ کر سکی۔ وہ کیا چیز تھی جس نے جادوگروں کو اچانک پستی سے بلندی اور بزدلی سے بہادری تک پہنچا دیا۔ وہ ایمان کی طاقت تھی۔ انھوں نے انسانوں سے گزر کر خدا کو پا لیا تھا، پھر ان کو انسانوں کا ڈر کیوں ہوتا۔

شہر کے مسلم محلہ کو تخریب کاروں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ مسلمان اپنے گھروں سے نکلے تو تخریب کاروں نے پتھر پھینکنے شروع کئے۔ مسلمانوں نے بھی اس کے جواب میں پتھر پھینکے۔ تخریب کاروں کو جب پتھراؤ سے کامیابی ہوتی نظر نہ آئی تو انھوں نے بندوقوں سے فائر کئے جس سے کچھ مسلمان زخمی ہو گئے۔ اس کے بعد مسلمان بھاگے اور اپنے گھروں میں داخل ہو گئے۔ اب تخریب کاروں کا حوصلہ بڑھا۔ وہ آگے بڑھ کر محلہ میں گھس گئے اور مسلمانوں کے مکانوں اور دکانوں میں آگ لگانا شروع کر دیا۔

یہ بڑا نازک موقع تھا۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ اب محلہ کے ایک بدنام شخص کو اللہ نے ہمت دی اور اس نے مسئلہ کو حل کر دیا۔ اس شخص میں اور کوئی برائی نہ تھی۔ البتہ وہ شراب پیتا تھا۔ وہ اپنے

کمرہ میں داخل ہوا۔ اس نے تیمم کیا اور سجدہ میں گر پڑا۔ سجدہ کی حالت میں اس نے دعا کی: خدایا آج تو ہماری عزت رکھ لے اور ہماری مدد کر۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد میں کبھی شراب نہیں پیوں گا۔ اس نے یہ دعا کی اور اس کے بعد پڑوسی کی بندوق لی اور تھیلہ میں کارتوس بھر کر مجمع میں گھس گیا۔ اس نے چن چن کر تخریب کاروں کو اپنی بندوق کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ اگرچہ وہ خود بھی ہر وقت تخریب کاروں کے نشانہ کی زد پر تھا مگر اس وقت ڈر اس کے دل سے بالکل نکل گیا تھا۔ وہ پوری بے خوفی کے ساتھ اپنا کام کرتا رہا۔ تخریب کاروں نے جب دیکھا کہ ان کے بہت سے ساتھی خاک و خون میں تڑپ رہے ہیں اور "ہائے مار ڈالا" کی چیخیں بلند ہو رہی ہیں تو ان کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

قرآن میں ہے کہ اللہ کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں اور نیک عمل اس کو بلند کرتا ہے (فاطر ۱۰) مذکورہ مسلمان کی دعا کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔ اس نے جب اپنی دعا کے ساتھ شراب چھوڑنے کا عہد کیا تو اس نے ایک نیک عمل کیا۔ اس نیک عمل کی وجہ سے اس کی دعا اوپر اٹھ کر فوراً خدا کی بارگاہ میں پہنچی اور مقبول ہوئی۔ جب بھی آدمی اپنی دعا کے ساتھ اس قسم کا کوئی نیک عمل کرے تو اس کی دعا ضرور قبولیت کا شرف حاصل کرتی ہے۔ دعا کے ساتھ اس کے موافق نیک عمل دعا کے معاملہ میں آدمی کے سنجیدہ ہونے کا ثبوت ہے، اور جب آدمی اپنی مانگ میں سنجیدہ ہو تو اس کی مانگ ضرور پوری کی جاتی ہے۔

اس واقعہ کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے۔ جب آدمی نے یہ کہا کہ "خدایا میں آج سے شراب کو چھوڑتا ہوں تو میری مدد کر" تو اس نے اپنی طاقت کو بڑھایا۔ کیوں کہ اب اس نے خدا کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ اگر وہ صرف "خدایا مدد کر" کے الفاظ بولتا تو اس سے اس کے اندر وہ یقین نہ آتا۔ کیوں کہ یہ چھپا ہوا خیال پھر بھی اس کے دل میں باقی رہتا کہ میں خدا کو پکار رہا ہوں حالاں کہ میں خدا کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ جب اس نے شراب چھوڑنے کا عزم کیا تو بھرپور طور پر اس کو یہ امید پیدا ہو گئی کہ اب خدا ضرور میری مدد کرے گا۔ کیونکہ اب اس نے اپنے اور خدا کے درمیان پڑے ہوئے پردہ کو ہٹا دیا تھا۔ پہلی صورت میں اس کی مثال اگر چور کی سی تھی تو اب اس کی مثال اس شخص کی سی ہو گئی جس نے سامان کی قیمت اس کے دکان دار کو ادا کر دی ہو۔ اس کی توبہ نے اس کو نڈر بنایا اور اس کی قوت میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ توبہ کے فوراً بعد اس کے اندر سے احساس جرم نکل گیا۔ اس کا یہ اندیشہ مٹ گیا کہ میں خدا سے دور ہوں۔ اب وہ خدا کی مدد کو اپنے حق میں یقینی سمجھنے لگا۔ اس کے اور خدا کے درمیان جو رکاوٹ تھی جب اس رکاوٹ کو اس نے دور کر دیا تو اندیشوں کے تمام غبار اس کے دل سے ہٹ گئے۔ خدا اس کو اپنا نظر آنے لگا، کیوں کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا بنا چکا تھا۔

موت کے عقیدہ نے زندگی دے دی

ایک نوجوان نے عربی مدرسہ سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد ان کا ارادہ مزید تعلیم حاصل کرنے کا تھا۔ اسی دوران گھر سے ایک خبر آئی جس نے ان کے حوصلے ختم کر دیے۔ خبر یہ تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا ہے ان کے گھر پر معمولی کھیتی باڑی تھی۔ اسی میں محنت کرکے ان کے والد صاحب گھر کا کام چلاتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد گھر پر صرف ان کی بیوی تھیں اور چند چھوٹے بچے۔ اب مذکورہ نوجوان ہی گھر کے بڑے کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کو اپنی ذمہ داری کا شدید احساس ہوا۔ والد صاحب کی وفات کا مطلب ان کے لئے صرف ایک تھا۔ یہ کہ وہ مزید تعلیم کا ارادہ ترک کرکے اپنے گھر چلے جائیں اور اپنے والد صاحب کی طرح کھیتی باڑی کے کام میں لگ کر گھر کا انتظام سنبھالیں۔

مدرسہ میں ایک بزرگ سے ان کا قریبی تعلق تھا۔ اس کے بعد وہ ان سے ملے اور کہا "حضرت اب میں یہاں سے جا رہا ہوں اور آپ سے آخری ملاقات کے لئے آیا ہوں" بزرگ نے کہا: آخر کیا بات ہے۔ کہاں جا رہے ہو۔ انھوں نے بتایا کہ والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے اور میں ہی اپنے گھر میں سب سے بڑا ہوں۔ اس لئے اب مجھ ہی کو گھر کا انتظام سنبھالنا ہے۔ شاید قدرت کو یہی منظور ہے کہ میرے ہاتھوں میں "قلم" کے بجائے "ہل" ہو۔ بظاہر اب میرے لئے مزید تعلیم کا کوئی سوال نہیں۔ بزرگ یہ سن کر خاموش ہو گئے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بولے: "کیا موت آپ کے لئے نہیں ہے۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ گھر پہنچ کر آپ کا انتقال نہیں ہو جائے گا۔ پھر اگر آپ کا بھی انتقال ہوگیا تو" اس کے بعد بزرگ نے کہا کہ کسی گھر کا سنبھالنے والا کوئی بڑا نہیں ہوتا۔ ہر گھر کا سرپرست اور کفیل اللہ تعالیٰ ہے کسی کے جینے مرنے سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ اپنے تعلیمی منصوبہ کو جاری رکھئے اور گھر کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیجئے۔ "آپ تھوڑی دیر کے لئے سمجھ لیجئے کہ میرا بھی انتقال ہوگیا ہے۔"

یہ بات نوجوان کے دل کو لگ گئی۔ انھوں نے گھر کا خیال چھوڑ دیا اور اس کے معاملہ کو اللہ کے حوالے کرکے اپنی تعلیمی جدوجہد شروع کر دی۔ انھوں نے مدینہ کے جامعہ اسلامیہ میں درخواست بھیجی اور اس کے لئے ضروری کوششیں کرنے لگے۔ کوشش کامیاب رہی اور ان کا داخلہ جامعہ اسلامیہ (مدینہ) میں ہوگیا۔ انھوں نے مدینہ کا سفر کرکے جامعہ اسلامیہ میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ وہاں سے فراغت کے بعد وہ سعودی عرب کے دارالافتاء کے تحت افریقہ کے ایک ملک میں مبلغ اور استاد کی حیثیت سے بھیج دیے گئے۔ ۱۱ اپریل ۱۹۸۰ کو ایک ملاقات میں انھوں نے راقم الحروف کو بتایا کہ افریقہ میں رہتے ہوئے ان کو دس سال ہو چکے ہیں۔ اور ان کی موجودہ زندگی سے وہ اور ان کے گھر والے دونوں مطمئن ہیں۔ وہ اپنے کو ایک کامیاب انسان سمجھتے ہیں اور یہ کامیابی ان کو اس مختصر جملہ سے ہوئی کہ ——— سمجھ لیجئے کہ آپ کا بھی انتقال ہوگیا ہے

موت کا عقیدہ بظاہر منفی عقیدہ ہے۔ مگر وہ اپنے اندر زبردست مثبت اثرات رکھتا ہے۔ جس کو موت کا یقین ہو، زندگی کے بارے میں اس کا یقین بڑھ جاتا ہے۔ جیا اپنے کو مرتا ہوا دیکھ لے وہ اپنی زندگی میں زیادہ باعمل ہو جاتا ہے۔

اخلاق کی طاقت

۱۹۲۳ کا واقعہ ہے۔ فتح گڑھ (اتر پردیش) کے علاقہ میں سکھوا نامی ڈاکو نے سنسنی پھیلا رکھی تھی۔ اس کی لوٹ مار بے پناہ ہوتی جا رہی تھی۔ پولیس کے افراد تک کے لئے ممکن نہیں رہا تھا کہ اس کی گولیوں کا نشانہ بننے سے بچ سکیں۔ مگر عین اس زمانہ میں بھی ایک اعلیٰ انتظامی افسر اس کی فہرستِ انتقام سے مستثنیٰ تھا۔ یہ سید صدیق حسن آئی سی ایس (وفات ۱۹۶۳) تھے۔ صدیق حسن صاحب اس زمانہ میں فتح گڑھ میں جوائنٹ مجسٹریٹ تھے۔ سکھوا ڈاکو کے خلاف پولس کی مہم انھیں کی ماتحتی میں چلائی گئی۔ مہینوں کی جد و جہد کے بعد سکھوا ڈاکو گرفتار ہوا اور صدیق حسن صاحب نے اس کے مقدمہ کی سماعت کر کے اس کو سزا کا حکم سنایا۔ مگر عین اس زمانہ میں جب کہ صدیق حسن صاحب سکھوا ڈاکو کے خلاف مہم کی قیادت کر رہے تھے، سکھوا ڈاکو نے ان کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔ گرفتاری کے بعد اس نے بتایا کہ وہ اکثر رات کو صدیق حسن صاحب کے بنگلہ پر آتا تھا۔ مگر ان کی شرافت کا خیال کر کے کبھی ان پر گولی نہیں چلائی۔

سید صدیق حسن صاحب کی وہ کیا بات تھی جس کی وجہ سے ایک ڈاکو بھی ان کی تعریف اور عزت کرتا تھا۔ اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوتا ہے جو خود سکھوا ڈاکو نے بتایا۔ اس نے کہا کہ ایک بار پولس والے اس کو گرفتار کر کے سید صدیق حسن صاحب کے بنگلہ پر لائے۔ یہ سردی کا زمانہ تھا۔ سکھوا نے صدیق حسن صاحب سے کہا: "جنٹ صاحب آپ کا سکھوا سردی کھا رہا ہے"۔ یہ سن کر صدیق حسن صاحب فوراً اندر گئے۔ اپنی نئی ریشمی قمیص اور کمبل لائے اور اس کو ڈاکو کے حوالے کرتے ہوئے کہا: "لو اس کو استعمال کرو۔ یہ تمھارے لئے ہے" (۱۷ مئی ۱۹۶۸)

کوئی شخص خواہ کتنا ہی نہتا ہو اس کے پاس ایک ایسا ہتھیار موجود رہتا ہے جس سے وہ اپنے حریف کو جیت سکے۔ یہ اخلاق کا ہتھیار ہے۔ ایک حکیم صاحب تھے۔ وہ شہر میں مطب کرتے تھے اور ہفتہ میں ایک دن اپنے گاؤں آیا کرتے تھے۔ ان سے ان کے گاؤں کے بعض لوگوں کو دشمنی ہو گئی۔ انھوں نے ایک آدمی کو چند سو روپے دئے اور کہا کہ رات کو جب حکیم صاحب واپس آ رہے ہوں تو ان کو پکڑ کر مار ڈالو۔ غریب آدمی روپے کے لالچ میں تیار ہو گیا اور گاؤں کے باہر پل کے پاس چھپ کر بیٹھ گیا۔ حکیم صاحب پل کے پاس پہنچے تو وہ جھپٹ کر سامنے آ گیا۔ حکیم صاحب اس کو دیکھتے ہی پہچان گئے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ وہ ان کو مار ڈالنا چاہتا ہے تو انھوں نے کہا کہ ذرا ٹھہرو۔ اس کے بعد انھوں نے کہا "کیا تم کو وہ دن یاد نہیں جب تم اپنے چھوٹے بچے کو ٹوکرے میں رکھ کر میرے پاس لائے تھے۔ بیماری نے اس کا برا حال کر دیا تھا اور تمھارے پاس علاج کے لئے پیسے نہیں تھے۔ میں نے تمھارے لڑکے کا مفت علاج کیا اور وہ اچھا ہو گیا۔ کیا میرے اس احسان کا بدلہ یہی ہے جو تم اب میرے ساتھ کرنا چاہتے ہو"۔ یہ سنتے ہی آدمی نے اپنی لاٹھی پھینک دی اور حکیم صاحب کے پاؤں پر گر پڑا۔ اس نے کہا: "آپ نے سچ کہا۔ میں روپے کے لالچ میں آپ کو مارنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ مگر اب میں کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ آپ مجھے معاف کر دیں"۔ ایک جانور کو کسی قسم کی اخلاقی دلیل حملہ کرنے سے روک نہیں سکتی۔ مگر انسان کو جیتنے کے لئے ایک اخلاقی دلیل بھی کافی ہے بشرطیکہ وہ حقیقی معنوں میں ایک اخلاقی دلیل ہو نہ کہ محض الفاظ کا ایک مجموعہ۔

اسی سے تعمیرِ دنیا بھی

ایک مرتبہ مجھے مسلم نوجوانوں کے ایک اجتماع میں بلایا گیا۔ میں نے وہاں آخرت کے موضوع پر کچھ باتیں عرض کیں۔ میں نے کہا کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈرے اور آخرت کی فکر رکھتے ہوئے زندگی گزارے۔ میں اپنی بات پوری کر کے چپ ہوا تو ایک نوجوان نے کہا "یہ تو خیر ٹھیک ہے، اب اصل بات شروع کیجئے" ان کو کسی نے بتایا تھا کہ میں "تعمیر ملت" کے موضوع پر کچھ باتیں پیش کروں گا۔ "آخرت" کا وعظ سن کر انھیں محسوس ہوا کہ میں نے اصل بات نہیں کہی، میں نے مسلمانوں کے دنیوی مسائل کا کوئی حل پیش نہیں کیا۔

میں نے کہا کہ دنیا کی تعمیر آخرت کی تعمیر سے الگ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تعمیر آخرت ہی میں تعمیر دنیا کا راز بھی چھپا ہوا ہے۔ پھر میں نے کہا کہ دنیا کی تعمیر کے لئے مسلمانوں کو تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ وہ ایک باشعور قوم بنیں۔ دوسرے یہ کہ انھیں اقتصادی خوش حالی حاصل ہو۔ تیسرے یہ کہ وہ ایک طاقتور قوم ہوں۔ اور یہ تینوں چیزیں آخرت کے عقیدہ سے کمال درجہ میں حاصل ہوتی ہیں۔

۱۔ آخرت کا عقیدہ انسانی شعور کو بیدار کرنے کی سب سے زیادہ کامیاب تدبیر ہے۔ آخرت پسندی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی غیبی حقیقتوں کے بارے میں حد درجہ حساس ہو جائے۔ جس آدمی کا شعور اتنا بیدار ہو کہ وہ نہ دکھائی دینے والی چیزوں کو دیکھنے لگے وہ دکھائی دینے والی چیزوں کو اور بھی زیادہ دیکھنے والا بن جائے گا۔ آخرت کوئی رسمی عقیدہ نہیں، وہ انسان کے شعور کو آخری حد تک جگا دینے والی سب سے بڑی انقلابی تدبیر ہے۔ آخرت کے عقیدہ سے سنجیدگی اور احتیاط پیدا ہوتی ہے۔ یہ عقیدہ آدمی کو سوچنے والا اور حقیقت پسند انسان بناتا ہے۔ ایسا آدمی ہر معاملہ کو اس کے انجام کے اعتبار سے دیکھتا ہے۔ وہ چیزوں کو ان کی اصلیت اور واقعیت کے اعتبار سے جانچنے لگتا ہے نہ کہ محض ان کی ظاہری صورت کے اعتبار سے۔ یہ باتیں جس کے اندر پیدا ہو جائیں وہ سب سے زیادہ باشعور انسان بن جاتا ہے، وہ دنیا سے لے کر آخرت تک تمام چیزوں کو خدائی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔

اس کی بہترین واقعاتی مثال صحابہ کرام کا گروہ ہے۔ انھوں نے مشکل ترین حالات میں دعوت اسلامی کے کام کو منظم کیا اور قدیم آباد دنیا کے بڑے حصہ کو نہ صرف مسلمان بنایا بلکہ ان کی زبان اور تہذیب تک کو بدل ڈالا۔ یہ سب کام وہ کبھی نہیں کر سکتے تھے اگر وہ شعور کی اعلیٰ سطح پر نہ پہنچ گئے ہوتے۔

۲۔ اقتصادی ترقی ہمیشہ دو چیزوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ محنت اور دیانت داری۔ اور آخرت کے عقیدہ سے یہ دونوں چیزیں کمال درجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ آخرت کا عقیدہ آدمی کے دل میں یہ بات بٹھا دیتا ہے کہ عمل کئے بغیر کسی کو کوئی انعام نہیں مل سکتا۔ آخرت کا عقیدہ آدمی کو بتاتا ہے کہ خدا کے یہاں صرف سچائی اور اخلاص کی قیمت ہے۔

جھوٹ اور فریب کی اس کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ اس طرح جو شخص حقیقی معنوں میں آخرت پسند ہو جائے وہ اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر محنتی اور دیانت دار بن جاتا ہے۔ اور جس شخص کے اندر یہ دونوں خصوصیات پیدا ہو جائیں وہ صفر سے آغاز کر کے بھی بڑی بڑی ترقیاں حاصل کر سکتا ہے۔ اقتصادیات کی دنیا میں کسی کے لئے سب سے بڑا سرمایہ محنت اور دیانت داری ہے اور یہ دونوں چیزیں آخرت کے عقیدہ کا براہ راست نتیجہ ہیں۔ جس شخص کے اندر آخرت کا احساس ہوگا اس کے اندر لازمی طور پر محنت بھی ہوگی اور دیانت داری بھی۔

اس کی ایک واضح مثال صحابہ و تابعین کا گروہ ہے۔ یہ لوگ اپنے وطن سے بے سروسامانی کی حالت میں نکلے۔ مادی وسائل کے اعتبار سے کوئی چیز ان کے پاس نہ تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنے وقت کی تجارتوں پر قبضہ کر لیا، وہ ایشیا اور افریقہ سے لے کر یورپ تک کی منڈیوں پر چھا گئے۔ ان کی اس اقتصادی کامیابی کا راز یہی دو چیزیں تھیں ——— محنت اور دیانت داری۔

۳۔ کسی قوم کی طاقت کا سب سے بڑا ذریعہ اتحاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اتحاد کا دوسرا نام طاقت ہے اور اختلاف کا دوسرا نام کمزوری۔ کسی گروہ کے افراد میں جب اتحاد ٹوٹتا ہے تو اس کی وجہ کیا ہوتی ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہوتی ہے اور وہ افراد کی انانیت ہے۔ اگر ہر فرد میں تواضع آجائے، ہر آدمی اپنی "انا" کو ختم کر چکا ہو تو وہاں اختلاف کا سرے سے خاتمہ ہو جائے گا۔ اور آخرت کا عقیدہ سب سے زیادہ یہی چیز پیدا کرتا ہے۔ جس شخص کے دل میں خدا کی ہیبت اور آخرت کا فکر بیٹھ جائے اس کے اندر سے گھمنڈ اور بڑائی کے تمام احساسات نکل جاتے ہیں۔ خدا کی پکڑ کا اندیشہ اس کو ایک بے "میں" والا انسان بنا دیتا ہے۔ یہی کیفیت اتحاد کی سب سے بڑی بنیاد ہے۔ جس قوم کے افراد سے گھمنڈ اور انانیت نکل جائے ان کے اندر سے گویا اختلاف کی جڑ ختم ہو گئی۔ ایسے لوگ سب سے زیادہ متحد قوم بن جاتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا میں اتحاد سے بڑی کوئی دوسری طاقت نہیں۔

اس کی واقعاتی مثال اسلام کی تاریخ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں جو لوگ تیار ہوئے وہ بہت زیادہ اللہ سے ڈرنے والے اور آخرت کی فکر کرنے والے تھے چنانچہ ان ابتدائی مسلمانوں میں بے پناہ اتحاد پایا جاتا تھا۔ اسی اتحاد کی طاقت سے انھوں نے اپنے سے زیادہ طاقت ور اور اپنے سے زیادہ سامان والے دشمنوں کو مغلوب کر لیا۔ مگر بعد کے دور میں جو لوگ اسلام کی صفوں میں شامل ہوئے ان میں آخرت کا عقیدہ اتنا گہرا اور اتنا زندہ نہ تھا۔ چنانچہ ہر ایک یہ چاہنے لگا کہ اس کی بات مانی جائے، اس کی بڑائی تسلیم کی جائے، اس کے نتیجہ میں ایسا اختلاف پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی طاقت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ وہ لوگ جو اب تک کفر و شرک کا زور توڑنے میں لگے ہوئے تھے وہ خود آپس میں ایک دوسرے کو برباد کرنے میں لگ گئے۔

جب ذہن کے پردے ہٹ جائیں

ملک عبدالشکور بی اے (پیدائش ۱۹۴۶) بدھل (راجوری) کے رہنے والے ہیں۔ وہ سگرٹ کے عادی تھے اور روزانہ تین پیکٹ پی جاتے تھے۔ "سگرٹ پینا صحت کے لئے مضر ہے"۔ "سگرٹ پینا اپنے کمائے ہوئے پیسہ کو آگ لگانا ہے"۔ اس قسم کی کوئی بھی دلیل ان کو سگرٹ چھوڑنے پر آمادہ نہیں کر سکتی تھی۔ حتی کہ وہ اپنے دوستوں کو بھی اصرار کر کے پلاتے۔ چار پینے کے بعد وہ سگرٹ کا کش لینے کو اتنا ضروری سمجھتے تھے کہ وہ اپنے دوستوں سے کہتے "جو آدمی چائے پی کر سگرٹ نہ پئے اس کو چائے پینے کا حق نہیں"۔

مگر ایک چھوٹے سے واقعہ نے ان کی محبوب سگرٹ ان سے چھڑا دی۔ سگرٹ کے ٹکڑے جو وہ پینے کے بعد پھینکتے ان کو ان کا تین سالہ بچہ فاروق قیصر اٹھا لیتا اور منھ میں لگا کر پیتا۔ ملک عبدالشکور صاحب اس کو منع کرتے مگر وہ نہ مانتا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ بچہ کی ماں نے سختی سے بچہ کو منع کیا تو بچہ نے کہا: "ابا بھی تو پیتے ہیں"۔ ملک عبدالشکور صاحب نے بچہ کی زبان سے یہ سنا تو ان کو سخت جھٹکا لگا۔ اگرچہ وہ دوستوں کے سامنے اپنی سگرٹ نوشی پر قصیدہ پڑھتے تھے مگر ان کا دل خوب جانتا تھا کہ سگرٹ پینا ایک بری عادت ہے جس کا انجام نہ صرف صحت اور پیسہ کی بربادی ہے بلکہ وہ اخلاق کو بھی بگاڑنے والا ہے۔ جب کوئی شخص ان سے سگرٹ چھوڑنے کو کہتا تو وہ اس کے خلاف لفظی دلائل کا انبار لگا دیتے۔ مگر ان دلائل کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ وہ اپنے ایک "نشہ" کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے اور اس کے لئے بھی تیار نہ تھے کہ اپنی غلطی کو مان لیں۔ اس لئے وہ لفظی تاویلات کے سہارے اپنے کو حق بجانب ثابت کرتے تھے۔ وہ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے کہ سگرٹ کے خلاف کسی دلیل پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں۔

مگر جب سگرٹ کا سوال بچہ کی زندگی کا سوال بن گیا تو اچانک وہ سنجیدہ ہو گئے۔ ان کے ذہن سے وہ تمام پردے ہٹ گئے جنھوں نے ایک سادہ سی حقیقت کو سمجھنا ان کے لئے ناممکن بنا دیا تھا۔ جو شخص مضبوط دلائل کے آگے ہتھیار ڈالنے پر تیار نہ ہوتا تھا وہ ایک بچہ کے کمزور الفاظ کے آگے بالکل ڈھ گیا۔ "اگر میں خود سگرٹ پیتا رہوں تو میں اپنے بچہ کو سگرٹ پینے سے باز نہیں رکھ سکتا"۔ انھوں نے سوچا۔ بچہ کا یہ کہنا کہ "ابا بھی تو پیتے ہیں" ان کے لئے ایک ایسا ہتھوڑا بن گیا جس کی ضرب کو برداشت کرنے کی طاقت ان کے اندر نہ تھی۔ بچہ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ان کو سخت جھٹکا لگا۔ انھوں نے ایک لمحہ کے اندر وہ فیصلہ کر لیا جس کے لئے ان کے دوستوں کی مہینوں اور سالوں کی کوشش بھی ناکافی ثابت ہوئی تھی۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ انھوں نے طے کر لیا کہ وہ سگرٹ پینا بالکل چھوڑ دیں گے۔ انھوں نے نہ صرف اگلے دن سگرٹ نہیں پی بلکہ مستقل طور پر سگرٹ نوشی ترک کر دی۔

باپ کو سگرٹ سے محبت تھی۔ مگر بیٹے سے اس سے زیادہ محبت تھی۔ اس نے بیٹے کی خاطر سگرٹ کو چھوڑ دیا۔ اسی طرح ہر آدمی کو اپنے مفادات اور مصالح سے محبت ہوتی ہے۔ اسلام یہ ہے کہ خدا کی محبت اتنی بڑھ جائے کہ اس کی خاطر آدمی دنیا کے مفادات اور مصالح کو قربان کر دے۔ (۲۰ ستمبر ۱۹۷۹)

صرف الفاظ سے

امام حسن بصری (م ۱۱۰ھ) اور حجاج بن یوسف (م ۹۵ھ) کا زمانہ ایک ہی تھا۔ حسن بصری کی صاف گوئی حجاج کو بہت تکلیف پہنچاتی تھی۔ اس نے طے کیا کہ حسن بصری کو قتل کرادے۔ چنانچہ اس نے حسن بصری کو اپنے دربار میں بلایا۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ ان کو زندہ واپس نہیں جانے دے گا۔ میمون بن مہران بتاتے ہیں کہ حسن بصری جب دربار میں داخل ہوئے اور حجاج کے سامنے کھڑے ہوئے تو یہ گفتگو ہوئی: حسن بصری نے کہا اے حجاج، تمہارے اور آدم کے درمیان کتنے باپ ہیں۔ حجاج نے جواب دیا کہ بہت۔ حسن بصری نے کہا کہ اب وہ کہاں ہیں۔ حجاج نے کہا کہ وہ مر گئے۔ حسن بصری کا مطلب یہ تھا کہ جہاں تم مجھ کو پہنچانا چاہتے ہو اسی راستہ پر تم خود بھی تیزی سے جارہے ہو۔ حجاج اگرچہ ایک ظالم حکمراں تھا۔ مگر یہ الفاظ سن کر اس نے سر جھکالیا۔ اس کے بعد حسن بصری محفوظ حالت میں دربار سے باہر نکل آئے (فلما قام الحسن بين يدي الحجاج قال له يا حجاج كم بينك وبين آدم من اب۔ قال كثير۔ قال فاين هم۔ قال ماتوا۔ ثم نكس الحجاج راسه وخرج الحسن لم يمسسه منه سوء)

اِس پل پر یا اُس پل پر

ملک شاہ سلجوقی کی شاہی سواری ایک روز ایک پل سے گزر رہی تھی۔ ایک بڑھیا وہاں آکر کھڑی ہوگئی۔ بادشاہ اس کے قریب پہنچا تو بڑھیا نے پکار کر کہا: اے بادشاہ بتا میرا اور تیرا انصاف اِس پل پر ہوگا یا اُس پل (صراط) پر۔ ملک شاہ پر اس جملہ کا بے حد اثر ہوا۔ وہ گھبرا کر سواری سے اتر پڑا اور کہا: ماں، اُس پل پر کس کی ہمت ہے کہ کھڑا ہوسکے۔ بہتر ہے کہ میرا اور تمہارا حساب اسی پل پر ہوجائے۔ اس کے بعد بڑھیا نے بتایا کہ سپاہیوں نے اس کی گائے پکڑ کر ذبح کر دی ہے، میں تم سے اس ظلم کا انصاف چاہتی ہوں۔ ملک شاہ سلجوقی وہیں ٹھہر گیا اور معاملہ کی تحقیق شروع کردی۔ جب ثابت ہوگیا کہ بڑھیا کی شکایت صحیح ہے تو اس نے اسی وقت مجرموں کو سزا دی۔ اس کے بعد اس نے بڑھیا سے معافی مانگی اور گائے کی اصل قیمت سے بہت زیادہ معاوضہ دے کر بڑھیا کو راضی کیا۔

کتے سے بھی زیادہ برا

تاتاری جب بغداد کی سلطنت پر غالب آگئے تو ان کے اندر احساس برتری پیدا ہوگیا۔ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں سے بہت اونچا سمجھنے لگے۔ ایک تاتاری شہزادہ ایک بار گھوڑے پر سوار ہوکر شکار کے لئے جارہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا کتا بھی تھا۔ راستہ میں ایک مسلمان بزرگ ملے۔ اس نے مسلمان بزرگ کو اپنے پاس

بلایا اور کہا: "تم اچھے ہو یا میرا کتا" مسلمان بزرگ نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا: اگر میرا خاتمہ ایمان پر ہو تو میں اچھا ورنہ تمھارا کتا اچھا" یہ جملہ اس وقت اتنا مؤثر ثابت ہوا کہ تاتاری شہزادہ کا دل بل گیا۔ وہ اس "ایمان" کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا جس پر آدمی کا خاتمہ نہ ہو تو وہ کتے سے بدتر ہو جاتا ہے۔ اس تلاش کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر وہ مسلمان ہو گیا۔

غریبی کا مطلب بے وقوفی نہیں

کچھ معزز لوگ ایک مقام پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے اتنے میں ایک بھکاری عورت آئی۔ اس نے سوال کیا مگر کسی نے اس کو جواب نہ دیا۔ اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ اب بھی کسی نے اس کو جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی، لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اس سے زیادہ ضروری گفتگو میں مصروف ہیں کہ ایک بھکاری عورت کا جواب دیں۔ بھکاری عورت اس کے باوجود بار بار اپنے سوال کو دہراتی رہی۔ مجلس میں ایک معزز بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کو اس مسلسل مداخلت پر غصہ آگیا۔ انھوں نے سخت لہجہ میں کہا: "بڑی بے وقوف معلوم ہوتی ہے" عورت نے یہ سنا تو بولی: "بابا غریب آدمی بے وقوف ہی ہوتے ہیں" یہ کہا اور چلی گئی۔ اس واقعہ کے بعد مذکورہ بزرگ اکثر کہا کرتے تھے: "اس بھکاری عورت نے مجھ کو جو جواب دیا اس سے زیادہ سخت جواب مجھ کو ساری زندگی میں کسی نے نہیں دیا۔"

غم آدمی کو گہرا بنا دیتا ہے

اسی طرح ایک مجلس تھی۔ عمدہ قالین پر کچھ خوش پوش اور معزز افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک آدمی پھٹے حال آیا۔ وہ بلا اجازت مجلس میں بیٹھ گیا۔ ایک صاحب نے اس کو منع کیا کہ یہاں مت بیٹھو۔ بار بار منع کرنے کے بعد بھی جب وہ نہ مانا تو انھوں نے اس کو پکڑ کر مجلس سے اٹھا دیا اور کہا "جا اپنا کام کر" وہ اٹھا اور یہ کہتا ہوا چلا گیا: "ایک ہی راستہ سے آئے ہیں، ایک ہی راستہ سے جائیں گے دونوں" آدمی کا یہ جملہ اتنا مؤثر ثابت ہوا کہ اس کے بعد مجلس کا رنگ بدل گیا۔ لوگ خاموش ہو گئے اور تھوڑی دیر بعد اٹھ اٹھ کر چلے گئے۔

کبھی آدمی کی زبان سے ایک جملہ نکلتا ہے مگر وہ جملہ محض کچھ الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ سننے والے کے دل میں برچھی کی طرح چبھتا ہے۔ وہ آدمی کو تیر اور تلوار کے بغیر ذبح کر دیتا ہے۔ مگر برچھی کی مانند چبھنے والے جملے صرف انھیں لوگوں کی زبان سے نکلتے ہیں جو اس سے پہلے اپنے سینہ میں برچھی چبھا چکے ہوں۔

حیاتِ طیّبہؒ

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام کے سادہ اور مختصر تعارف کے لئے کتابوں کے ایک سٹ کی ضرورت عام طور پر محسوس کی جاتی رہی ہے۔ یہ سٹ بچوں کے لئے درسی نصاب کے طور پر استعمال ہوگا اور اسی کے ساتھ بڑوں کے درمیان اسلام کے تعارفی مطالعہ کے لئے بھی کار آمد ہوگا۔

اس سلسلے میں خدا کے فضل سے پانچ مختصر کتابوں کا ایک سٹ تیار ہوگیا ہے۔ یہ سٹ بالترتیب حسب ذیل ہے:

۱۔ سچا راستہ
۲۔ دینی تعلیم
۳۔ حیات طیبہ
۴۔ باغ جنت
۵۔ نار جہنم

زیر نظر رسالہ (حیات طیبہ) اس سلسلہ کا تیسرا نمبر ہے۔ فی الحال یہ مکمل سٹ اردو زبان میں شائع کیا جارہا ہے۔ اس کے بعد انشاء اللہ اس کو دوسری زبانوں میں بھی شائع کیا جائے گا۔

حیات طیبہ نامی زیر نظر کتاب تمام کی تمام قرآنی آیتوں کے ترجمہ پر مشتمل ہے۔ اس میں کوئی تعبیری یا تشریحی اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ قرآنی آیات کا انتخاب ایک خاص ترتیب سے نقل کیا گیا ہے اور ہر ٹکڑے پر اس کے مضمون کی مناسبت سے ایک مختصر عنوان قائم کردیا گیا ہے۔ عنوان کے سوا پوری کتاب میں مرتب نے کوئی اور اضافہ نہیں کیا ہے۔ اس طرح یہ رسالہ اسلام کے تعارف کے لئے ایک مستند اور براہ راست مجموعہ بن گیا ہے۔

زیر نظر کتاب کا نام قرآن کی اس آیت سے لیا گیا ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَ

جو کوئی نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان والا ہو تو ہم اس کو دنیا

لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (النحل ۹۷) میں اچھی زندگی عطا کریں گے اور آخرت میں ان کے اچھے کاموں کے بدلے ان کا اجر عطا کریں گے

اس آیت میں حیات طیبہ سے کیا مراد ہے، اس کی وضاحت آیت کے اگلے ٹکڑے (باحسن ما کانوا یعملون) سے ہو رہی ہے۔ اس سے مراد حسن عمل کی زندگی ہے۔ صحابہ اور تابعین عام طور پر اس کا یہی مفہوم لیتے تھے جس کی ترجمانی ضحاک کے اس قول سے ہوتی ہے کہ اس سے مراد دنیا میں رزق حلال پر قانع رہنا اور خدا کی عبادت کرنا ہے (ھی الرزق الحلال والعبادۃ فی الدنیا، تفسیر ابن کثیر)

اللہ پر ایمان لانا اور اللہ کے احکام کی تعمیل میں لگنا اپنے آپ کو اللہ کی نصرت کا مستحق بنانا ہے۔ جب کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو اس کو خدا کا خصوصی فیضان ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ عبادت کے وقت اس کو قربت خداوندی کا تجربہ ہونے لگتا ہے۔ زندگی کے مشاغل میں پھنسنے کے باوجود وہ خدا کی یاد سے غافل نہیں ہونے پاتا۔ دنیا کی چیزوں میں اس کو عبرت اور نصیحت کی غذا ملتی ہے۔ معاملات اور مسائل میں اس کو خدائی طریقہ اختیار کرنے کی توفیق حاصل ہوتی ہے۔ دوستی ہو یا دشمنی ہر حال میں اس کے اندر یہ جذبہ ابھرتا ہے کہ وہ حق پر قائم رہے۔ وہ اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں اس صراط مستقیم پر چلنے لگتا ہے جو خدا کو پسند ہے۔

یہ حیات طیبہ اپنی فکری اور عملی تفصیلات میں کیسی ہوتی ہے اس کو قرآن میں بہت واضح طور پر بتا دیا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں قرآن کی ان آیتوں کا انتخاب کیا گیا ہے جن سے اس حیات طیبہ کے مختلف بنیادی پہلو قرآن کے مخصوص اسلوب میں سامنے آتے ہیں۔ اس طرح یہ اقتباسات گویا حیات طیبہ کا تعارف بھی ہیں اور اس کا مستند نمونہ بھی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کتابوں کو ایک مفید دعوتی اور تعلیمی مجموعہ بنائے۔

وحید الدین ۲۳ مئی ۱۹۸۲

اللہ ایک ہے

کہو وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ (سورہ اخلاص)۔ لوگو عبادت کرو اپنے رب کی جس نے تم کو اور تم سے قبل والوں کو پیدا کیا تاکہ تم بچ جاؤ۔ وہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنادیا۔ اور اوپر سے پانی برسایا۔ پھر تمہاری غذا کے لئے ہر طرح کی پیداوار نکالی۔ پس تم کسی کو اللہ کا برابر نہ ٹھہراؤ حالانکہ تم جانتے ہو۔ (البقرہ ۲۲—۲۱)۔ یقیناً اللہ اس کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔ اس کے سوا اور گناہوں کو معاف کردے گا جسے وہ معاف کرنا چاہے۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔ (النسار ۱۱۶)

سب سے اوپر، سب سے بڑا

اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ ہے، سب کو تھامے ہوئے ہے۔ اس کو نہ اونگھ لگتی اور نہ نیند آتی۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کے سامنے بغیر اس کی اجازت کے سفارش کر سکے۔ جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے سب کا اسے علم ہے۔ اس کے علم کے کسی گوشہ پر بھی کوئی شخص حاوی نہیں ہوسکتا مگر جو وہ چاہے۔ اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین پر چھایا ہوا ہے۔ ان کی نگہبانی اس کے لئے تھکا دینے والا کام نہیں۔ وہی سب سے اوپر ہے، وہی سب سے بڑا۔ (البقرہ ۲۵۵)

اللہ کی نشانیاں

تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر اپنے عرش پر متمکن ہوا۔ وہ رات کو دن پر ڈھانکتا ہے، دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے۔ سورج اور چاند اور ستارے اس کے حکم کے تابع ہیں۔

آگاہ، اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور اسی کے لئے ہے حکم فرمانا۔ بڑی برکت والا ہے، اللہ جو رب ہے سارے جہان کا۔ اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے، یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں خرابی نہ ڈالو اس کی اصلاح کے بعد اور اللہ کو پکارو ڈر کے ساتھ اور امید کے ساتھ۔ بیشک اللہ کی رحمت نیک کام کرنے والوں کے قریب ہے۔ اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت سے پہلے خوش خبری لئے ہوئے بھیجتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ بھاری بادلوں کو اٹھالیتی ہیں تو ہم ان کو کسی مردہ بستی کی طرف ہانک دیتے ہیں، پھر ہم اس بادل سے پانی نکالتے ہیں، اس کے بعد ہم اس سے طرح طرح کے پھل نکالتے ہیں اسی طرح ہم مردوں کو نکالیں گے، تاکہ تم غور کرو۔ اور جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے رب کے حکم سے اپنا اپنا سبزہ نکالتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا، اس طرح ہم نشانیوں کو پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو شکر کرنے والے ہیں (الاعراف ۵۸-۵۴)

آسمانوں اور زمین میں

پس تسبیح کرو اللہ کی جب کہ تم شام کرتے ہو اور جب کہ تم صبح کرتے ہو اور اسی کے لئے حمد ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔ اور اس کی تسبیح کرو تیسرے پہر اور جب کہ تم پر ظہر کا وقت آتا ہے۔ خدا زندہ میں سے مردہ کو نکالتا ہے اور مردہ میں سے زندہ کو نکالتا ہے اور زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے، اسی طرح تم لوگ بھی نکالے جاؤ گے۔ اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر یکایک تم بشر ہو کر زمین میں پھیل گئے اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمھارے لئے تمھاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور اس نے تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور کرتے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمھاری زبانوں اور تمھارے رنگوں کا اختلاف، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں علم

والوں کے لئے۔ اور اس کی نشانیوں میں سے ہے تمہارا رات اور دن کا سونا اور تمہارا اس کے فضل کو تلاش کرنا، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تم کو بجلی کی چمک دکھاتا ہے خوف اور لالچ کے ساتھ، اور آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل والے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں، پھر جیسے ہی اس نے تم کو پکارا، تم اچانک زمین سے نکل آؤ گے۔ اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب اس کے بندے ہیں، سب اسی کے تابع ہیں۔ اور وہی ہے جو پیدائش کی ابتدا کرتا ہے پھر وہی ہے جو اس کا اعادہ کرے گا، اور یہ اس کے لئے بہت آسان ہے۔ اور آسمانوں اور زمین میں اس کی صفت سب سے برتر ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے (الروم ۲۷-۱۷)

کائنات کی پکار

بے شک اللہ دانہ اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے۔ وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے۔ اور وہی مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے، پھر تم کدھر بہکے جا رہے ہو۔ وہی صبح کو نکالتا ہے۔ اس نے رات کو سکون کا وقت بنایا ہے۔ اس نے سورج اور چاند کا حساب مقرر کیا ہے۔ یہ سب عزیز و علیم کا ٹھہرایا ہوا اندازہ ہے۔ اور وہی ہے جس نے تمہارے لئے ستاروں کو بنایا تاکہ تم اس سے خشکی اور سمندر میں راستہ معلوم کرو۔ ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ پھر ہر ایک کے لئے ایک جائے قرار ہے اور ایک اس کے سونپے جانے کی جگہ۔ ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں ان لوگوں کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر ہم نے اس کے ذریعہ سے ہر قسم کی نباتات اگائی۔ پھر ہم نے اس سے ہریالی پیدا کی جس سے ہم تہ بہ تہ چڑھے ہوئے دانے نکالتے ہیں۔ اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے جو بوجھ سے جھکے پڑتے ہیں اور انگور اور زیتون اور انار کے باغ جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور پھر ایک دوسرے سے جدا جدا بھی۔ اس کے پھل کو دیکھو جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کو، ان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں۔ اور لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک بنا لیا۔ حالانکہ خدا نے ان کو پیدا کیا ہے۔

اور انھوں نے خدا کے لئے بیٹے بیٹیاں گھڑ لیں بغیر علم کے، حالانکہ وہ پاک اور برتر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے حالانکہ کوئی اس کی شریک زندگی نہیں۔ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ یہ ہے اللہ تمھارا رب۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ ہر چیز کا خالق ہے لہذا تم اسی کی عبادت کرو۔ اور وہ ہر چیز کا کفیل ہے۔ نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے اور وہ باریک بین اور باخبر ہے (الانعام ۱۰۴ — ۹۶)

عرش عظیم والا

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمھیں بے کار پیدا کیا ہے اور تم کو ہماری طرف پلٹنا نہیں ہوگا۔ پس برتر ہے اللہ، بادشاہِ حقیقی، کوئی اس کے سوا معبود نہیں، وہ مالک ہے عرشِ عظیم کا۔ اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے تو اس کے پاس اس کے لئے کوئی دلیل نہیں، اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے، ایسے منکر کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ اور کہو کہ اے ہمارے رب مغفرت فرما اور رحم کر، تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے (المومنون ۱۱۸ — ۱۱۵)

محبت اللہ سے

بے شک آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لئے ہوئے سمندروں میں چلتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے اوپر سے اتارا پھر اس سے زمین کو موت کے بعد زندگی بخشی اور اس نے زمین میں ہر قسم کے جان دار پھیلا دئے اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمانوں اور زمین کے درمیان مسخر ہیں، نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے۔ اور لوگوں میں ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر بناتے ہیں، وہ ان سے محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ کے ساتھ کرنی چاہیے۔ حالانکہ ایمان لانے والے اللہ کو سب سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ اور اگر یہ ظالم دیکھ لیں اس وقت کو جب کہ وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ ساری قوت اللہ کے لئے ہے اور یہ کہ اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔ جب کہ پیروی کرنے والوں سے وہ لوگ بے تعلقی ظاہر کریں گے جن کی پیروی کی گئی تھی اور وہ عذاب کو دیکھیں گے اور ان کے تمام اسباب ٹوٹ جائیں گے اور پیرو کہیں گے کہ کاش ہم کو پھر دنیا کی طرف لوٹ جانا ملتا تو ہم بھی ان سے بیزاری دکھاتے جس طرح

وہ ہم سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں۔ اس طرح اللہ ان کے کام ان کو حسرت کے لئے دکھائے گا اور وہ ہرگز آگ سے نکل نہ سکیں گے۔ اے لوگو زمین میں جو حلال اور پاک چیزیں ہیں ان میں سے کھاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو، بے شک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے وہ تم کو برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور یہ کہ تم اللہ کے نام پر وہ باتیں کہو جن کو تم نہیں جانتے (البقرہ ۱۶۹ ــ ۱۶۴)

خدا کے پیغمبر

جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا تو انھیں کے لئے امن ہے۔ اور وہی ہدایت پائے ہوئے ہیں اور یہ ہماری حجت ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم پر دی۔ ہم جن کو چاہتے ہیں بلند مرتبے عطا کرتے ہیں۔ بے شک تیرا رب حکیم اور علیم ہے۔ پھر ہم نے ابراہیم کو، اسحاق اور یعقوب دئے۔ ہم نے ہر ایک کو راہ راست دکھائی اور ہم نے نوح کو اس سے پہلے راہ راست دکھائی اور اس کی نسل میں داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو، اور ہم اسی طرح نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔ اور اسی طرح زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو ہدایت دی۔ ان میں سے ہر ایک صالح تھا۔ اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو بھی اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے دنیا والوں پر فضیلت دی۔ اور ان کے آبا میں اور ان کی اولاد میں اور ان کے بھائیوں میں اور ہم نے ان کو چن لیا اور ان کو سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اس کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اور اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا عمل غارت ہو جاتا۔ یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی۔ اب اگر یہ لوگ ان کا انکار کرتے ہیں تو ہم نے ایسے لوگوں کو اس پر مقرر کر دیا ہے جو اس کے منکر نہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی، تم انھیں کے راستے پر چلو۔ کہو، میں اس کام پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ یہ تو صرف ایک نصیحت ہے دنیا والوں کے لئے (الانعام ۹۱ - ۸۳)

جنت اور جہنم

اور لوگوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے، اور قیامت کے دن زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہوں گے، وہ پاک اور برتر ہے اس شرک سے جو لوگ کرتے ہیں۔ اور صور پھونکا جائے گا پھر بے ہوش ہو جائیں گے جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین

ہیں ہیں مگر جس کو اللہ چاہے، پھر دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو یکایک وہ اٹھ کر دیکھنے لگیں گے۔ زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی اور کتاب لاکر رکھ دی جائے گی اور پیغمبر اور گواہ حاضر کر دئے جائیں گے اور لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔ اور ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور اللہ لوگوں کے عمل سے خوب واقف ہے۔ اور کفر کرنے والے جہنم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھول دئے جائیں گے اور اس کے کارندے ان سے کہیں گے، کیا تمھارے پاس تمھارے اندر سے ایسے پیغمبر نہیں آئے جو تم کو تمھارے رب کی آیتیں سنائیں اور تم کو اس دن کی ملاقات سے ڈرائیں، وہ کہیں گے کیوں نہیں، مگر منکروں کے اوپر خدا کا حکم عذاب ثابت ہو گیا۔ کہا جائے گا کہ داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں، ہمیشہ رہنے کے لئے۔ یہ ایک بری جگہ ہے گھمنڈ کرنے والوں کے لئے۔ اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے انھیں گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جایا جایا ئے گا، یہاں تک کہ وہ جب وہاں پہنچیں گے اور اس کے دروازے کھولے جائیں گے، اور اس کے ذمہ دار اُن سے کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو، تم بہت اچھے آئے، پس داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ کے لئے۔ اور وہ کہیں گے شکر ہے اللہ کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچا کر دیا اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا، ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنائیں، پس کیا خوب بدلہ ہے عمل کرنے والوں کا۔ اور تم دیکھو گے کہ فرشتے عرش کے گرد گھیرا بنائے ہوئے اپنے رب کی حمد و تسبیح کر رہے ہیں۔ اور لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا کہ ساری تعریف اللہ کے لئے ہے جو رب ہے سارے جہان کا (الزمر ۷۵ - ۶۷)

نماز

میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری بندگی کر اور نماز قائم کر میری یاد کے لئے (طٰہٰ - ۱۴)۔ نماز قائم کر دن ڈھلے سے لے کر رات کے اندھیرے تک اور فجر کے وقت قرآن بے شک فجر کا قرآن مشہود ہوتا ہے۔ اور رات کے وقت تہجد پڑھو، یہ تمھارے لئے نفل ہے، قریب ہے کہ تیرا رب تجھ کو مقام محمود پر اٹھائے (بنی اسرائیل ۷۹ - ۷۸)۔ اور نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر۔ بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں، یہ ایک یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لئے جو نصیحت پکڑیں اور صبر کرو اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا (ہود ۱۱۵ - ۱۱۴)۔ اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھو، اور بیچ کی نماز کی، اور اللہ کے آگے جھک کر کھڑے ہو (البقرہ - ۲۳۸)۔ اور جب

نماز سے فارغ ہوجاؤ تو کھڑے اور لیٹے اور بیٹھے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے رہو اور جب تم کو اطمینان ہوجائے تو پھر نماز قائم کرو بلاشبہ نماز ایمان والوں پر وقت کے ساتھ فرض کی گئی ہے (النساء – ۱۰۳)۔ پڑھو اس کتاب کو جو تمہاری طرف وحی کی گئی ہے اور نماز قائم کرو، یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے، اللہ جانتا ہے جو کچھ تم لوگ کرتے ہو (العنکبوت – ۴۵)

روزہ

اے ایمان والو تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح تم سے اگلوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم پرہیزگار بنو۔ گنتی کے چند دن ہیں، پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کرلے۔ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہیں ان کے ذمہ فدیہ ہے، ایک روزے کا بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا۔ اور جو اپنی خوشی سے زیادہ دے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے۔ اور اگر تم روزہ رکھو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم سمجھو۔ رمضان کا مہینہ، اس میں قرآن اتارا گیا جو انسانوں کے لئے ہدایت ہے اور روشن دلیلیں ہیں راہ پانے کی اور حق کو باطل سے جدا کرنے کی۔ پس تم میں سے جو شخص اس مہینہ کو پائے تو وہ ضرور اس کا روزہ رکھے۔ اور جو شخص بیمار ہو یا مسافر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں تعداد پوری کرلے۔ اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے وہ تمہارے لئے دشواری نہیں چاہتا۔ اور تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کرلو اور تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو اس بات پر کہ اس نے تم کو ہدایت دی اور تاکہ تم شکرگزار بنو۔ اور جب میرے بندے تم سے میرے بارے میں پوچھیں تو کہہ دو کہ میں ان سے قریب ہوں، پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کو سنتا ہوں اور جواب دیتا ہوں۔ پس انھیں چاہئے کہ وہ میری پکار پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ سیدھے راستے کو پالیں (البقرہ ۸۶-۱۸۳)

انفاق

اے ایمان والو، جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرو، قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی کام آئے گی اور جو انکار کرنے والے ہیں وہی دراصل ظالم ہیں (البقرہ ۲۵۴) جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور اس کی ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی

راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ دکھ دیتے ہیں انھیں کے لئے اللہ کا ثواب ہے ان کے رب کے پاس۔ ان کے لئے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ نرم جواب دینا اور درگذر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری لگی ہوئی ہو، اور اللہ بے نیاز اور تحمل والا ہے۔ اے ایمان والو، احسان جتا کر اور دکھ دے کر اپنی خیرات کو اکارت نہ کرو، اس شخص کی طرح جو اپنا مال دکھاوا کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان ہو جس پر کچھ مٹی ہو، پھر جب اس پر زور کا مینھ برسا تو مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان رہ گئی۔ ایسے لوگ اپنی کمائی سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکیں گے اور اللہ منکروں کو سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ کی خوشی حاصل کرنے کے لئے اور اپنے دلوں کو ثابت کر کے خرچ کرتے ہیں اس باغ کی طرح ہے جو بلند زمین پر ہو، اس پر زور کی بارش ہوئی تو وہ دگنا پھل لایا اور اگر بارش نہ ہوئی تو پھوار ہی کافی ہے۔ اور اللہ خوب دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اس باغ میں اس کے لئے ہر قسم کے پھل ہوں اور اس پر بڑھاپا آجائے اور اس کے بچے کمزور ہوں، اس وقت باغ پر ایک بگولہ آپڑے جس میں آگ ہو اور وہ باغ جل جائے۔ اللہ اس طرح اپنی باتیں تمھارے سامنے بیان کرتا ہے تاکہ تم سوچو۔ اے ایمان والو، اپنے کمائے ہوئے ستھرے مال میں سے خرچ کرو اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمھارے لئے زمین سے پیدا کی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں دینے کے لئے بری چیز چھانٹنے لگو، حالانکہ وہی چیز اگر تمھیں لینا ہو تو تم ہرگز اس کو لینا گوارا نہ کرو مگر یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ۔ اور جان لو کہ اللہ بے نیاز ہے خوبیوں والا ہے۔ شیطان تم کو تنگ دستی سے ڈراتا ہے اور بے حیائی کی راہ سجھاتا ہے اور اللہ تم کو وعدہ دیتا ہے اپنی بخشش کا اور فضل کا۔ اور اللہ وسعت والا جاننے والا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت ملی اس کو بہت بڑی خوبی مل گئی اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں (۲۶۱ــ۲۶۹)

عمرہ اور حج

حج اور عمرہ کو پورا کرو اللہ کے لئے۔ اور اگر تم روک دئے جاؤ تو جو قربانی میسر آئے اسی کو پیش کر دو اور اپنے سر نہ مونڈو جب تک کہ قربانی اپنے ٹھکانے نہ پہنچ جائے۔ مگر جو شخص مریض ہو یا اس کو سر کی تکلیف ہو تو اس کے لئے فدیہ ہے روزے رکھنا یا صدقہ دینا یا قربانی کرنا۔ پھر جب تم کو امن ہو جائے

توجو شخص حج کے ساتھ عمرہ کو ملائے تو اس پر قربانی ہے جو اسے میسر آئے، اور اگر قربانی میسر نہ ہو تو تین روزے حج کے زمانہ میں اور سات گھر پہنچ کر، اس طرح وہ پورے دس روزے رکھے یہ حکم اس کے لئے ہے جس کا گھر مسجدِ حرام کے قریب نہ ہو اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ حج کے چند معلوم مہینے ہیں، جو شخص ان مہینوں میں حج کی نیت کرے تو اس کے لئے حج کے دوران میں کوئی شہوانی فعل اور کوئی بدعملی اور کوئی لڑائی جھگڑے کی بات جائز نہیں، اور جو نیکی تم کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے۔ اور زادِ راہ لے لیا کرو، سب سے بہتر زادِ راہ تقویٰ ہے پس مجھ سے ڈرو اے عقل والو۔ تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو، پھر جب عرفات سے چلو تو مشعرِ حرام (مزدلفہ) کے پاس ٹھہر کر اللہ کو یاد کرو اور اس کو اس طرح یاد کرو جیسا کہ اس نے تمھیں سکھایا ہے، ورنہ اس سے پہلے تم بھٹکے ہوئے لوگ تھے اس کے بعد طواف کے لئے پھر وہاں سے سب لوگ پھریں اور اللہ سے معافی چاہو، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ پھر جب اپنے حج کے ارکان پورے کر لو تو اللہ کو یاد کرو جیسے کہ تم اپنے باپ دادا کو یاد کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔ پس کوئی ہے جو کہتا ہے کہ اے ہمارے رب ہم کو دنیا میں دیدے، اور اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور کوئی کہتا ہے کہ اے ہمارے رب ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھلائی دے اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ یہی لوگ اپنی کمائی کے مطابق حصہ پائیں گے اور اللہ جلد حساب کرنے والا ہے۔ اور اللہ کو یاد کرو گنتی کے چند دنوں میں، پھر جو شخص دو ہی دن میں جلدی چلا گیا تو اس پر گناہ نہیں اور جو شخص ٹھہر گیا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں اس کے لئے جو اللہ سے ڈرے، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ تم سب اسی کے پاس جمع کئے جاؤ گے (البقرہ ۲۰۳ — ۱۹۶)

قربانی

ہر امت کے لئے ہم نے قربانی کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا ہے تاکہ لوگ ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انھیں دئے ہیں۔ پس تمھارا خدا ایک ہی خدا ہے، تم اسی کے تابعدار بنو اور بشارت دے دو عاجزی کرنے والوں کو۔ جن کا حال یہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں اور مصیبتوں پر صبر کرنے والے اور نماز قائم کرنے والے اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور قربانی کے جانوروں کو ہم نے تمھارے لئے اللہ کی علامت بنایا ہے، ان میں تمھارے لئے بھلائی ہے۔ پس انھیں کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لو اور جب ان کی پیٹھیں زمین پر لگ جائیں تو ان میں سے خود بھی

کھاؤ اور کھلاؤ قناعت سے بیٹھنے والوں کو اور ان کو بھی جو اپنی حاجت پیش کریں۔ ان جانوروں کو ہم نے تمھارے بس میں کر دیا ہے تاکہ تم شکر ادا کرو۔ اللہ کو نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون بلکہ اللہ کو تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اس طرح اللہ نے ان کو تمھارے بس میں کر دیا ہے تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو اس بات پر کہ اس نے تم کو راہ بتائی اور خوش خبری دے دو نیکی کرنے والوں کو (الحج ۳۶ ـ ۳۷)

اللہ کی بندگی

اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں ہے اور تم اپنے جی کی بات کو خواہ ظاہر کر دیا اس کو چھپاؤ، اللہ بہر حال تم سے اس کا حساب لے گا۔ پھر وہ جس کو چاہے گا بخشے گا جس کو چاہے گا عذاب دے گا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر اتری ہے اور مسلمانوں نے بھی، سب ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، ان کا کہنا ہے کہ ہم اللہ کے پیغمبروں میں تفریق نہیں کرتے، اور انھوں نے کہا کہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی، ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب، اور تیری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا، ہر ایک کو ملتا ہے جو اس نے کمایا اور ہر ایک پر پڑتا ہے جو اس نے کیا۔ اے ہمارے رب ہم کو نہ پکڑ اگر ہم بھولیں یا چوکیں، اے ہمارے رب ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے اگلوں پر ڈالا تھا، اے ہمارے رب ہم پر وہ بوجھ نہ رکھ جس کو اٹھانے کی ہم کو طاقت نہیں۔ اور ہم سے درگذر کر اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما، تو ہی ہمارا مولیٰ ہے، بس منکروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر (البقرہ۔ آخر)

شریعت

تیرے رب نے حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمھارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انھیں اُف بھی نہ کہو اور نہ انھیں جھڑکو اور ان سے احترام کے ساتھ بات کرو۔ اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک جاؤ اور کہو کہ اے ہمارے رب ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے مجھ کو پالا جب میں چھوٹا تھا۔ تمھارا رب خوب جانتا ہے جو تمھارے دلوں میں ہے۔ اگر تم نیک بن کر رہو تو وہ پلٹ آنے والوں کو معاف کر دیتا ہے۔ اور رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین کو اور مسافر کو، اور فضول خرچی نہ کرو۔ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے

بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ اور اگر تمھیں ان سے اعراض کرنا ہو اس بنا پر کہ ابھی تم اللہ کی اس رحمت کو جس کے تم امیدوار ہو تلاش کر رہے ہو تو ان کو نرم جواب دو۔ اور اپنا ہاتھ نہ تو گردن سے باندھ لو اور نہ اس کو بالکل کھلا چھوڑ دو کہ تم ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔ تیرا رب جس کے لئے چاہتا ہے رزق کو کھول دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے اسے تنگ کر دیتا ہے وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور ان کو دیکھ رہا ہے۔ اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم انھیں بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی۔ بے شک ان کو قتل کرنا بڑا گناہ ہے۔ اور زنا کے قریب نہ جاؤ وہ بے حیائی ہے اور بری راہ۔ اور اس جان کو قتل نہ کرو جس کو اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ، اور جو ظلم سے مارا جائے تو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کا حق دیا ہے، پس وہ قتل کرنے میں حد سے نہ نکلیں، اس کی مدد کی جائے گی۔ اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر جس طرح کہ بہتر ہو یہاں تک کہ وہ اپنی پوری عمر کو پہنچ جائے، اور عہد کو پورا کرو، بے شک عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اور جب ناپ کر دو تو پورا بھر کر دو اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو۔ یہ بہتر ہے اور اس کا انجام اچھا ہے۔ اور ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمھیں علم نہ ہو، بے شک کان اور آنکھ اور دل سب کے بارے میں پوچھ ہوگی۔ اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو، تم زمین کو پھاڑ نہیں سکتے اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے۔ ان میں سے ہر برا کام تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ یہ حکمت کی باتیں ہیں جو تیرے رب نے وحی کی، اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنا ورنہ تم جہنم میں ڈال دئے جاؤ گے ملامت زدہ ہو کر اور بھلائی سے محروم ہو کر (بنی اسرائیل ۳۹ — ۲۳)

رحمان کے بندے

اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے الجھیں تو وہ کہہ دیتے ہیں تم کو سلام۔ اور جو اپنے رب کے حضور سجدہ اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔ اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو جہنم کے عذاب سے بچالے اس کا عذاب تو لپٹ جانے والا ہے۔ وہ بڑا ہی برا ٹھکانا اور مقام ہے۔ اور جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ بخل، بلکہ ان کا خرچ دونوں کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔ اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور وہ اللہ کی حرام کی ہوئی جان کو ناحق قتل نہیں کرتے اور نہ وہ زنا کرتے ہیں اور جو کوئی یہ کام کرے وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا۔ قیامت کے روز اس کو دہرا عذاب دیا جائے گا اور اسی میں وہ ہمیشہ ذلت

ئے ساتھ رہے گا۔ الا یہ کہ کوئی توبہ کرے اور ایمان لائے اور عمل صالح کرے تو ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور جو شخص توبہ کرے اور نیک عمل کرے تو وہ اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنا چاہئے۔ اور وہ لوگ جو جھوٹ کی گواہی نہیں دیتے اور جب وہ کسی لغو چیز پر گزرتے ہیں تو شرافت کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ اور جنھیں اگر ان کے رب کی آیتوں سے نصیحت کی جائے تو وہ اس پر اندھے بہرے کی طرح نہیں گرتے۔ اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا۔ یہی لوگ بالا خانوں میں جگہ پائیں گے کیونکہ انھوں نے صبر کیا اور اس میں ان کا استقبال تحیۃ اور سلام کے ساتھ ہوگا۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ کیا ہی اچھا ہے وہ ٹھکانا اور وہ مقام (الفرقان ۷۶ ـ ۶۳)

بھروسہ اللہ پر

اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ اے ایمان لانے والو تمھاری بیویوں اور تمھاری اولاد میں تمھارے دشمن ہیں، ان سے ہوشیار رہو اور اگر تم معاف کردو اور درگزر کرو اور بخش دو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ تمھارے مال اور تمھاری اولاد ایک آزمائش ہیں۔ اور اللہ ہی کے پاس بڑا اجر ہے۔ پس اللہ سے ڈرو جتنا تمھارے بس میں ہے اور سنو اور اطاعت کرو اور اپنے مال خرچ کرو۔ یہ تمھارے لئے بہتر ہے۔ اور جو اپنے دل کی تنگی سے محفوظ رہا تو ایسے ہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ اگر تم اللہ کو قرض حسن دو تو وہ تم کو کئی گنا بڑھا کر دے گا اور تم کو بخش دے گا۔ اللہ قدرداں اور بردبار ہے۔ وہ حاضر اور غائب کو جاننے والا ہے اور دانا اور زبردست ہے (التغابن ۱۸ ـ ۱۳)

حکمت کی باتیں

اور جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا اے بیٹے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کر شرک بلاشبہ بڑا ظلم ہے۔ اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے بارے میں تاکید کی، اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور اس کا دودھ چھوٹنے میں دو سال لگے، یہ کہ میرا شکر کرو اور اپنے والدین کا، میری ہی طرف پلٹ کر آنا ہے۔ اور اگر وہ تم پر دباؤ ڈالیں کہ تم میرے ساتھ کسی ایسے کو شریک کرو جس کو تم نہیں جانتے تو ان کی بات نہ ماننا، اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرو اور پیروی اس شخص کے راستہ کی کرو جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ پھر تم سب کو میری طرف پلٹنا ہے، اس

وقت میں تم کو بتادوں گا کہ تم کیسے عمل کر رہے تھے۔ اے بیٹے، کوئی چیز رائی کے دانہ کے برابر ہو، وہ کسی چٹان میں ہو یا آسمانوں میں یا زمین میں، اللہ اس کو نکال لائے گا وہ لطیف و خبیر ہے۔ بیٹے، نماز قائم کر اور نیکی کا حکم دے اور بدی سے منع کر اور جو مصیبت پڑے اس پر صبر کر، بے شک یہ ہمت کے کام ہیں۔ اور لوگوں سے منھ نہ پھیر اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، اللہ کسی خود پسند اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو پست رکھ، سب آوازوں سے زیادہ بری آواز گدھے کی آواز ہے (لقمان ۱۹-۱۳)

اللہ سے ڈرنے والے

لوگ تم سے انفال کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہو کہ انفال اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہیں۔ پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور آپس کے معاملات درست رکھو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔ ایمان والے تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جائیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں، ان کے لئے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں اور بخشش ہے اور بہترین رزق ہے (الانفال ۴-۱)

حیات طیبہ

اللہ حکم دیتا ہے انصاف کا اور بھلائی کا اور قرابت والوں کے ساتھ صلہ رحمی کرنے کا اور وہ منع کرتا ہے بے حیائی سے اور بدی سے اور زیادتی سے، اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو عہد کرنے کے بعد اور اپنی قسموں کو پختہ کرنے کے بعد نہ توڑو جب کہ تم اللہ کو اپنے اوپر ضامن بنا چکے ہو، اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور تم اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے محنت سے سوت کاتا اور پھر اس کو توڑ ڈالا، تم اپنی قسموں کو ایک دوسرے کے معاملات میں دخل دینے کا بہانہ بناتے ہو تاکہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے بڑھ جائے۔ بے شک اللہ اس کے ذریعہ تم کو پرکھتا ہے اور وہ قیامت کے دن تمھارے اختلاف کی حقیقت کھول دے گا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ تم سب کو ایک امت بنا دیتا۔ مگر وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے اور ضرور تم سے تمھارے اعمال

کی پوچھ ہوگی اور تم اپنی قسموں کو آپس میں ایک دوسرے کو دھوکا دینے کا ذریعہ نہ بناؤ کہ کوئی قدم جمنے کے بعد اکھڑ جائے اور تم اس بات کی سزا چکھو کہ تم نے اللہ کے راستہ سے روکا، اور تم کو بڑا عذاب ہو۔ اور اللہ کے عہد کو تھوڑے فائدے کے بدلے نہ بیچو، جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ تمھارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو۔ جو تمھارے پاس ہے وہ سب ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ ہمیشہ رہنے والا ہے، اور ہم صبر کرنے والوں کو ان کے عمل کا بہترین بدلہ دیں گے۔ جو شخص بھی نیک کام کرے گا، وہ مرد ہو یا عورت، اگر وہ مومن ہے تو ہم اس کو اچھی زندگی بسر کرائیں گے اور ان کو ان کے بہترین کاموں کے مطابق بدلہ دیں گے (النحل ۹۷-۹۰)

حرام و حلال

کہو، آؤ میں تمھیں سناؤں کہ تمھارے رب نے تمھارے لئے کیا چیزیں حرام کی ہیں۔ یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے مار نہ ڈالو۔ ہم تم کو بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی۔ بے شرمی کی باتوں کے قریب نہ جاؤ۔ خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی۔ اور کسی جان کو ہلاک نہ کرو جس کو اللہ نے حرام ٹھیرایا ہے۔ مگر حق کے ساتھ۔ اللہ ان باتوں کی تمھیں ہدایت کرتا ہے تاکہ تم سوچو۔ اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ۔ مگر ایسے طریقے سے جو بہتر ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے۔ اور ناپ اور تول میں انصاف کرو۔ ہم کسی شخص پر اتنی ہی ذمہ داری ڈالتے ہیں جتنا اس کے بس میں ہو۔ اور جب بات کہو تو انصاف کی بات کہو خواہ اپنے رشتہ دار کے خلاف کیوں نہ ہو۔ اور اللہ کے عہد کو پورا۔ اللہ تمھیں ان کی ہدایت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو، اور یہی راستہ میرا سیدھا راستہ ہے۔ تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو، کہ وہ اللہ کے راستے سے ہٹا کر تم کو متفرق کر دیں گے۔ اللہ اس کی تم کو ہدایت کرتا ہے تاکہ تم بچو (الانعام ۱۵۲-۱۵۴)

کہو، میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ یہ ہیں — فحش کام خواہ کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ اور ناحق زیادتی اور یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرو جس کے لئے اس نے سند نہیں اتاری۔ اور یہ کہ اللہ پر ایسی بات کہو جس کا تمھیں علم نہیں۔ ہر گروہ کے لئے ایک مدت ہے، پھر جب ان کی مدت آجاتی ہے تو ایک گھڑی کی دیر یا جلدی نہیں ہوتی۔ اے بنی آدم، جب تمھارے پاس تم میں سے رسول آئیں جو تم کو میری آیتیں سنائیں تو جو کوئی ڈرے گا اور اصلاح کرے گا تو اس کے لئے نہ خوف ہے اور نہ غم۔ اور جو لوگ ہماری نشانیوں کو جھٹلائیں گے اور ان سے سرکشی کریں گے تو وہی آگ والے ہیں

جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے (الاعراف ۳۶ - ۳۳)

جنتی انسان

بے شک انسان بے صبر پیدا کیا گیا ہے۔ اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے۔ اور جب اس کو خوش حالی نصیب ہوتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو نماز پڑھنے والے ہیں۔ جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں۔ جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا مقرر حق ہے۔ اور جو روزِ جزا کو سچا مانتے ہیں اور جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں۔ ان کے رب کا عذاب اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں اور اپنی مملوکہ عورتوں کے کہ ان کے لئے ان پر کوئی ملامت نہیں۔ البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں تو وہی ہیں حد سے نکل جانے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں کی اور اپنے عہد کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور جو اپنی گواہیوں میں سچائی پر قائم رہتے ہیں۔ اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ عزت کے ساتھ جنت کے باغوں میں رہیں گے (المعارج ۳۵ - ۱۹)

اطمینان والی روح

انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اس کو آزماتا ہے اور اس کو عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو عزت دار بنایا۔ اور جب اس کو دوسری طرح آزماتا ہے اور اس کی روزی اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو ذلیل کر دیا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ تم لوگ یتیم کے ساتھ عزت کا سلوک نہیں کرتے۔ میراث کا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔ اور مال کی محبت میں بری طرح پڑے ہوئے ہو۔ ہرگز نہیں۔ جب زمین کو توڑ توڑ کر ریزہ کر دیا جائے گا اور تمھارا رب ظاہر ہوگا اور فرشتے قطار در قطار آئیں گے۔ اور جہنم اس روز سامنے لائی جائے گی۔ اس دن انسان کو سمجھ آجائے گی۔ مگر اب سمجھ میں آنے کا موقع کہاں۔ آدمی کہے گا، کاش میں نے اپنی اس زندگی کے لئے آگے کچھ بھیجا ہوتا۔ اس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں۔ اور اللہ جیسا باندھے گا ویسا باندھنے والا کوئی نہیں۔ اے اطمینان والی روح، چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو اللہ سے راضی، اللہ تجھ سے راضی۔ شامل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں (الفجر ۳۰ – ۱۵)

اللہ والے

اے ایمان والو، سود کئی کئی حصہ بڑھا کر نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم کامیاب ہو۔ اور اس آگ سے ڈرو جو منکروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ اللہ اور رسول کا حکم مانو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ اور اپنے رب کی بخشش کی طرف دوڑو اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت سارے آسمان اور زمین ہیں اور جو اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ جو فراغت اور تنگی دونوں میں خرچ کرتے ہیں۔ جو غصہ کو پی جانے والے ہیں، اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔ ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان سے کوئی برا کام ہو جاتا ہے یا اپنی جان پر کوئی ظلم کر بیٹھتے ہیں تو اللہ انھیں یاد آجاتا ہے۔ اور وہ اپنے گناہوں سے معافی مانگنے لگتے ہیں اور کون معاف کر سکتا ہے گناہوں کو اللہ کے سوا۔ اور یہ لوگ اپنے فعل پر اصرار نہیں کرتے درآں حالیکہ وہ جان رہے ہوں۔ ایسے لوگوں کی جزا ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کر دے گا۔ اور ایسے باغوں میں انھیں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ کیسا اچھا بدلہ ہے عمل کرنے والوں کے لئے (آل عمران ۱۳۰ - ۱۳۶)

اصلاح کا طریقہ

اور جو کچھ تم کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور جو بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں اور جب انھیں غصہ آجائے تو وہ معاف کر دیتے ہیں۔ اور جنھوں نے اپنے رب کی پکار پر لبیک کہی اور انھوں نے نماز قائم کی اور وہ اپنے کام باہم مشورہ سے کرتے ہیں۔ اور ان کو ہم نے ان کو جو رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جب ان پر چڑھائی کی جائے تو وہ ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے، پھر جو شخص معاف کر دے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو ظلم کے بعد بدلہ لے تو ایسے لوگوں پر کوئی الزام نہیں۔ الزام کے قابل تو وہ ہیں جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اور جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے تو یقیناً یہ ہمت کے کام ہیں (الشوریٰ ۳۶ - ۴۳)

کامیاب تجارت

اے ایمان والو، کیا میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تم کو دردناک عذاب سے بچا دے۔ تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔ اللہ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور بہترین گھر ابدی جنتوں میں، یہ ہے بڑی کامیابی اور دوسری چیز جو تم چاہتے ہو، اللہ کی طرف سے نصرت اور جلد فتح، اور ایمان والوں کو خوشخبری دے دو۔ اے ایمان لانے والو، اللہ کے مددگار بنو، جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کہ کون ہے اللہ کی طرف میرا مددگار۔ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ پس بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ نے انکار کیا۔ پس ہم نے ایمان لانے والوں کی تائید کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں، اور وہ غالب ہو گئے (الصف ۱۴-۱۰)

نیکی کی حقیقت

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے پورب کی طرف کر لو یا پچھم کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر اور آسمانی کتابوں پر اور پیغمبروں پر، اور اپنا پسندیدہ مال رشتہ داروں کو دے اور یتیموں کو اور مسکینوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے کے لئے، اور وہ نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اور وہ لوگ کہ جب عہد کریں تو اپنے عہد کو پورا کریں اور صبر کرنے والے تنگی اور مصیبت کے وقت اور جہاد کے وقت، یہی سچے لوگ ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں (البقرہ ۱۷۷)

اللہ کی مہمانی

کیا انکار کرنے والے یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا کارساز بنا لیں، ہم نے انکار کرنے والوں کی مہمانی کے لئے جہنم بنا رکھی ہے۔ کہو، کیا ہم تم کو بتائیں کہ عمل کے اعتبار سے سب سے زیادہ گھاٹے والے کون ہیں۔ وہ لوگ جن کی ساری کوشش دنیا کی زندگی میں بھٹکتی رہی، اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا انکار کیا اور اس کی ملاقات کا یقین نہ کیا۔ پس ان کے اعمال اکارت ہو گئے۔ قیامت کے دن ہم ان کو کوئی وزن نہ دیں گے۔ ان کا بدلہ جہنم ہے، اس انکار کے

سبب سے جو انھوں نے کیا، اور انھوں نے میری نشانیوں اور میرے پیغمبروں کا مذاق اڑایا۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیا ان کی میزبانی کے لئے فردوس کے باغ ہوں گے جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور کبھی اس سے نکلنا نہ چاہیں گے۔ کہو، اگر سمندر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لئے روشنائی بن جائے تو سمندر ختم ہو جائے گا مگر میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں گی، خواہ ہم اتنی ہی روشنائی اور لے آئیں۔ کہو کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا، میری طرف وحی کی گئی ہے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے، پس جو شخص اپنے رب سے ملنے کا امیدوار ہو اس کو چاہئے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے (الکہف ۱۱۰ - ۱۰۲)

مومن کی معاشی زندگی

اے ایمان لانے والو جب پکارا جائے نماز کے لئے جمعہ کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمھارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔ پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔ اور اللہ کو بہت یاد کرو، تاکہ تم کامیاب ہو۔ اور جب انھوں نے تجارت اور کھیل تماشا دیکھا تو اس کی طرف دوڑ پڑے اور تم کو کھڑا چھوڑ دیا۔ ان سے کہو کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے کھیل تماشے سے اور تجارت سے۔ اور اللہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے (الجمعہ ۹ - ۱۱)

فردوس والے

کامیاب ہو گئے ایمان لانے والے۔ جو اپنی نماز میں جھکنے والے ہیں۔ اور جو لغو چیزوں سے دور رہتے ہیں۔ اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوا اپنی بیویوں کے یا ان عورتوں کے جو ان کی ملک میں ہیں، کہ ان پر انھیں کوئی ملامت نہیں۔ مگر جو اس کے علاوہ چاہیں تو وہ حد سے بڑھنے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہیں۔ اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ وارث ہیں جو فردوس کی وراثت پائیں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے (المومنون ۱ - ۱۱)

سب کچھ اللہ کے لئے

اللہ نے ایمان والوں سے ان کی جان اور مال خرید لیا ہے اس قیمت پر کہ ان کے لئے جنت ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور پھر مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں ان سے اللہ کا وعدہ ہے تورات میں انجیل میں اور قرآن میں، اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدہ کا پورا کرنے والا ہو۔ پس خوشی مناؤ اپنے اس معاملہ پر جو تم نے اللہ سے

کیاہے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ وہ ہیں اللہ کی طرف پلٹنے والے، اس کی عبادت کرنے والے، اس کا شکر کرنے والے اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے، اس کے آگے رکوع اور سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے، اور خوش خبری دے دو ایمان لانے والوں کو (التوبہ ۱۱۲ — ۱۱۱)

مومن اللہ کا درخت ہے

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کیسی مثال بیان کی، کلمۂ طیبہ ایسا ہی ہے جیسے شجرۂ طیبہ (اچھا درخت) اس کی جڑ گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ ہر وقت اپنے رب کے حکم سے اپنا پھل دیتا ہے، یہ مثال اللہ لوگوں کے لئے بیان کرتا ہے تاکہ وہ سوچیں۔ اور کلمۂ خبیثہ کی مثال شجرۂ خبیثہ (برے درخت) جیسی ہے جو زمین کے اوپر سے اکھاڑ لیا جائے، اس کے لئے کوئی ٹھیراؤ نہیں۔ اللہ ایمان والوں کو ایک قولِ ثابت کے ذریعہ دنیا و آخرت میں جماؤ عطا کرتا ہے اور ظالموں کو بھٹکا دیتا ہے اور اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے (ابراہیم ۲۷-۲۴)

اچھی نصیحت

اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے سپرد کر دو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ بے شک اللہ تم کو بہت اچھی بات کی نصیحت کرتا ہے۔ اور یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے (النساء ۵۸) جس کو ڈر ہوگا وہ نصیحت پکڑے گا۔ اور اس سے گریز کرے گا وہ بدبخت جس کو بڑی آگ میں جانا ہے، پھر وہ نہ اس میں مرے گا اور نہ جئے گا۔ کامیاب ہوگیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے رب کا نام یاد کیا، پھر نماز ادا کی۔ مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ حالانکہ آخرت زیادہ بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے (الاعلیٰ ۱۷-۱۰)

تباہی کس کے لئے

تباہی ہے اس شخص کی جو عیب نکالتا ہے اور غیبت کرتا ہے۔ جس نے مال جمع کیا اور اس کو گن گن کر رکھا۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔ ہرگز نہیں۔ وہ شخص تو روندنے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا۔ اور تم کیا جانو کہ وہ روندنے والی جگہ کیا ہے۔ وہ اللہ کی سلگائی ہوئی آگ ہے جو دلوں

تک جا پہنچے گی۔ وہ ان پر بند کر دی جائے گی، اونچے اونچے ستونوں میں (ہمزہ)

نشانیوں کو جھٹلانے والے

جو شخص میری نصیحت سے منہ پھیرے گا، اس کے لئے ہے تنگ زندگی اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا کہ اے میرے رب کیوں تو نے مجھ کو اندھا اٹھایا، دنیا میں تو میں آنکھ والا تھا۔ اللہ فرمائے گا، ہاں، اسی طرح پہنچی تھیں تمہارے پاس ہماری نشانیاں، پھر تم نے ان کو بھلا دیا۔ اسی طرح آج تم کو بھلایا جا رہا ہے۔ اسی طرح ہم حد سے گزرنے والے اور اپنے رب کی نشانیاں نہ ماننے والے کو بدلہ دیتے ہیں، اور آخرت کا عذاب بڑا سخت اور بہت باقی رہنے والا ہے (طٰہٰ ۱۲۷ — ۱۲۴)

انصاف کی گواہی

اے ایمان والو اللہ کے لئے کھڑے ہونے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو اور کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم انصاف کو چھوڑ دو، انصاف کرو۔ یہی بات تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اللہ کا وعدہ ہے ایمان والوں سے اور نیک عمل کرنے والوں سے کہ ان کے لئے بڑی بخشش اور ثواب ہے۔ اور جن لوگوں نے انکار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا تو وہی ہیں دوزخ میں جلنے والے (المائدہ ۱۰ — ۸)

اختلاف نہیں

اے ایمان والو جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو امید ہے کہ تم کامیاب ہو گے۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تم کم زور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور تم ان لوگوں جیسے نہ بنو جو اپنے گھر سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھاتے ہوئے نکلے، اور وہ اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں اور اللہ اُن کے عمل کا احاطہ کئے ہوئے ہے (الانفال ۴۷ — ۴۵)

اسلامی معاشرت

اے ایمان لانے والو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لو، ایسا نہ ہو کہ تم

کسی گروہ پر نادانی سے جا پڑو پھر تمھیں اپنے کیے پر پچھتانا ہو اور جان لو کہ تمھارے درمیان اللہ کا رسول ہے، اگر وہ بہت سے معاملات میں تمھاری بات مان لے تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے، مگر اللہ نے تمھارے اندر ایمان کی محبت ڈال دی اور اس کو تمھارے لئے دل پسند بنا دیا اور کفر اور گناہ اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا، یہی لوگ نیک راستہ پر ہیں۔ اللہ کے فضل اور احسان سے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ اور اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ ملاپ کرا دو اور انصاف کرو کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ بے شک مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں پس اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ اے ایمان والو ایک گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے، ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے کہ وہ اُن سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کو بُرے نام سے یاد کرو، گنہ گاری برا نام ہے ایمان کے بعد، اور جو باز نہ آئے تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔ اے ایمان والو، بدگمانیوں سے بچو، یقیناً بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور کسی کا بھید نہ ٹٹولو، اور ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے برا نہ کہو کیا تم میں سے کوئی اس کو پسند کرے گا کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے، تم خود اس سے گھن کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔ اے لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھارے قبیلے اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو یقیناً اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے، بے شک اللہ علیم و خبیر ہے (الحجرات ۱۳-۶)

اللہ کی طرف دعوت

اپنے رب کے راستہ کی طرف پکارو، حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ۔ اور لوگوں سے بحث کرو ایسے طریقے سے جو بہتر ہو۔ تمھارا رب زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون سیدھے راستے پر ہے۔ اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو بس اتنا ہی لو جتنا کہ تم پر زیادتی کی گئی ہے۔ اور اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں کے لئے بہتر ہے۔ اور صبر سے کام لو، تمھارا صبر اللہ ہی کے لئے ہے، اور ان پر غم نہ کرو اور ان کی کارروائیوں پر دل تنگ نہ ہو۔ اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اس سے

ڈریں۔ اور جو نیک عمل کرتے ہیں (النحل ۲۸ ـ ۱۲۵)

اللہ کی بڑائی کرو

اے اوڑھ کر لیٹنے والے، اٹھ اور لوگوں کو خبردار کر۔ اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کر۔ اور اپنے آپ کو پاک رکھ۔ اور گندگی سے دور رہ۔ اور ایسا نہ کر کہ احسان کرے اور بہت بدلہ چاہے۔ اور اپنے رب کی خاطر صبر کر۔ پھر جب صور میں پھونک ماری جائے گی، وہ دن بڑا ہی مشکل دن ہوگا، منکروں کے لئے آسان نہ ہوگا (۱۰ ـ ۱) ہرگز نہیں، قسم ہے چاند کی اور رات کی جب کہ وہ پلٹتی ہے اور صبح کی جب کہ وہ روشن ہوتی ہے۔ دوزخ بڑی چیزوں میں سے ایک ہے۔ انسان کے لئے ڈراوا۔ تم میں سے اس شخص کے لئے جو آگے بڑھنا چاہے یا پیچھے رہ جانا چاہے۔ ہر آدمی اپنے کئے کاموں میں پھنسا ہوا ہے۔ دائیں طرف والوں کے سوا، وہ باغوں میں ہوں گے۔ وہ مجرموں سے پوچھیں گے، تم کو کیا چیز دوزخ میں لے گئی۔ وہ کہیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں نہ تھے اور ہم محتاج کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ اور ہم باتیں بنانے والوں کے ساتھ باتیں بناتے تھے۔ اور ہم انصاف کے دن کو جھٹلاتے تھے۔ یہاں تک کہ آ پہنچی ہم پر وہ یقینی بات۔ اس وقت سفارش کرنے والوں کی سفارش ان کے کام نہ آئے گی (المدثر ۴۸ ـ ۳۲)

آخرت بہتر ہے

کامیاب ہو گیا وہ جس نے پاکی اختیار کی۔ اور اپنے رب کا نام یاد کیا اور نماز پڑھی۔ مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے۔ یہی بات پچھلے صحیفوں میں بھی کہی گئی تھی ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں (الاعلیٰ ۱۸ ـ ۱۵)

جن کی کوششیں قابل قدر ٹھہریں گی

ہم نے انسان کو پیدا کیا پانی کی ایک مخلوط بوند سے تاکہ ہم اس کا امتحان لیں۔ پس ہم نے اس کو سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اس کو راستہ دکھایا، چاہے وہ شکر کرنے والا بنے یا انکار کرنے والا۔ ہم نے انکار کرنے والوں کے لئے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ بے شک نیک لوگ شراب کے ایسے پیالے پئیں گے جن میں چشمۂ کافور کی آمیزش ہوگی۔ اس چشمہ سے اللہ کے بندے پئیں گے، وہ

وہ اس کی شاخیں نکال لیں گے جس طرف چاہیں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو نذر پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی۔ اور وہ اللہ کی محبت میں مسکین کو اور یتیم کو اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم تم کو صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں۔ ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔ ہم کو تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا ڈر لگا ہوا ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہوگا۔ تو اللہ نے ان کو اس دن کی آفت سے بچالیا اور ان کو تازگی اور سرور سے نوازا۔ اور انھوں نے جو صبر کیا اس کے بدلے میں ان کو جنت اور ریشمی لباس عطا فرمایا۔ وہاں وہ اونچی مسندوں پر ٹیک لگائے ہوئے ہوں گے۔ نہ ان کو دھوپ کی گرمی ستائے گی اور نہ جاڑے کی سردی۔ جنت کی چھاؤں ان پر جھکی ہوئی سایہ کر رہی ہوگی۔ اور اس کے پھل ہر وقت ان کی دسترس میں ہوں گے اور ان کے سامنے چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے گردش میں ہوں گے۔ وہ نہایت موزوں انداز سے بھرے ہوں گے۔ اور وہاں ان کو ایک اور شراب کے پیالے پلائے جائیں گے جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی۔ یہ اس میں ایک چشمہ ہے جس کو سلسبیل کہا جاتا ہے۔ اور ان کی خدمت کے لئے ایسے لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ ایک ہی سن پر رہیں گے۔ تم انھیں دیکھو تو سمجھو کہ موتی ہیں جو بکھیر دیے گئے ہیں۔ وہاں تم جدھر بھی نظر ڈالو گے عظیم نعمت اور عظیم بادشاہی دیکھو گے۔ ان کے اوپر باریک ریشم کے سبز لباس اور اطلس و دیبا کے کپڑے ہوں گے۔ ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ اور ان کا رب ان کو پاکیزہ مشروب پلائے گا۔ بے شک یہ تمھارے عمل کا بدلہ ہے اور تمھاری سعی مقبول ہوئی (الدھر)

جزا و سزا کا دن

جب آسمان پھٹ جائے گا۔ اور جب تارے بکھر جائیں گے۔ اور جب سمندر پھاڑ دیے جائیں گے۔ اور جب قبریں کھول دی جائیں گی۔ اس وقت ہر آدمی جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور جو اس نے پیچھے چھوڑا۔ اے انسان، کس چیز نے تجھ کو اپنے رب کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا جس نے تجھ کو پیدا کیا۔ پھر تجھے درست کیا اور تجھ کو متناسب بنایا۔ جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ کر تیار کیا۔ ہرگز نہیں، بلکہ تم لوگ جزا و سزا کو جھٹلاتے ہو۔ حالانکہ تمھارے اوپر نگراں مقرر ہیں۔ معزز لکھنے والے جو تمھارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔ بے شک نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے اور بے شک برے لوگ جہنم میں جائیں گے۔ جزا کے دن وہ اس میں داخل ہوں گے اور وہ اس سے ہرگز غائب نہ ہو سکیں گے۔ اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ جزا کا دن کیا ہے۔ ہاں، تم کیا جانتے ہو کہ وہ جزا کا دن کیا ہے۔ یہ وہ دن ہے جب کہ

ایک شخص کے لئے دوسرے کے لئے کچھ کرنا ممکن نہ ہوگا۔ اور اس دن فیصلہ صرف اللہ کے اختیار میں ہوگا (الانفطار)

خدا کا مقبول دین

آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لئے خاص کر دیں گے جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہیں اور نہ فساد کرنا، اور عاقبت متقیوں ہی کے لئے ہے۔ جو کوئی بھلائی لے کر آئے گا اس کے لئے اس سے بہتر بھلائی ہے۔ اور جو برائی لے کر آئے تو برائیاں کرنے والے وہی سزا پائیں گے جو وہ کرتے تھے (قصص ۸۴-۸۳) جس شخص نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔ جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو بری خواہشات سے روکا، اس کا ٹھکانا جنت ہے۔ (النازعات ۴۱-۳۸) جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو اختیار کرے گا، وہ ہرگز اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ شخص آخرت میں ناکام و نامراد ہوگا (آل عمران ۸۵)

دعا

سب تعریف صرف اللہ کے لئے ہے جو تمام کائنات کا پروردگار ہے۔ بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے۔ بدلہ کے دن کا مالک ہے۔ خدایا، ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ ہم کو سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا جو تیرے معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں (الفاتحہ)

اے ہمارے رب

اے ہمارے رب، ہماری بھول اور ہماری غلطیوں پر ہم کو نہ پکڑ۔ اے ہمارے رب، ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے ہمارے رب، ہم پر وہ بوجھ نہ رکھ جس کو اٹھانے کی ہمیں طاقت نہیں۔ ہم کو معاف کر، ہمیں بخش دے۔ ہم پر رحم فرما۔ تو ہمارا مولا ہے، پس تو انکار کرنے والوں کے مقابلہ میں ہماری مدد کر (البقرہ ۲۸۶) اے اللہ، سلطنت کے مالک، تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔ تو جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کرے۔ سب خوبی تیرے ہاتھ میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے

اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، تو مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے اور تو جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے (آل عمران ۲۷ - ۲۶)

ہم کو بچالے

اے ہمارے رب، ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا (الفرقان ۷۴) اے میرے رب، مجھے نصیب کر کہ میں تیرے احسان کا شکر کروں جو تو نے میرے اوپر اور میرے والدین کے اوپر کیا ہے اور یہ کہ میں نیک کام کروں جو تجھ کو پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھ کو اپنے صالح بندوں میں داخل کرلے (النمل ۱۹) اے ہمارے رب، تیرا رحم اور تیرا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے، تو ان لوگوں کو بخش دے جنھوں نے توبہ کی اور تیرے راستہ پر چلے اور ان کو دوزخ کے عذاب سے بچالے۔ اے رب، اور انھیں داخل کر ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں جن کا وعدہ تو نے ان سے کیا ہے اور ان کے والدین اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے جو صالح ہوں ان کو بھی۔ تو زبردست ہے حکمت والا ہے۔ اور بچالے ان کو خرابیوں سے اور جس کو تو اس دن خرابیوں سے بچالے اس پر تو نے بڑا رحم کیا۔ اور یہی بڑی کامیابی ہے (المومن ۹-۷)

ہماری مدد کر

اے ہمارے رب، ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور ہم کو آخرت میں بھلائی دے۔ اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچا (البقرہ ۲۰۱) اے ہمارے رب، ہمارے اوپر صبر انڈیل دے اور ہمارے قدموں کو جمادے اور منکر لوگوں کے اوپر ہماری مدد کر (البقرہ ۲۵۰) اے ہمارے رب، ہمارے دلوں کو تو ہدایت دینے کے بعد پھیر نہ دے۔ اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما۔ بے شک تو ہی سب کچھ دینے والا ہے (آل عمران ۸) اے ہمارے رب، ہم ایمان لائے۔ ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچا (آل عمران ۱۶)

ہمارے سینہ کو پاک کردے

اے ہمارے رب، ہم کو بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے لئے کدورت نہ رکھ۔ اے ہمارے رب، تو بہت مہربان اور رحم والا ہے (الحشر ۱۰) اے ہمارے رب، ہم نے تیرے اوپر بھروسہ کیا اور ہم نے تیری طرف رجوع کیا اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔

اے ہمارے رب، ہمیں منکر لوگوں کے لئے فتنہ نہ بنا اور ہمیں بخش دے، بے شک تو زبردست ہے، حکمت والا ہے (۵-۴) اے ہمارے رب ہمارے لئے ہمارے نور کو کامل دے اور ہم کو بخش دے، تو ہر چیز پر قادر ہے (التحریم ۸)

اچھا خاتمہ کر

اے ہمارے رب، تونے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا، تو پاک ہے، پس ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب، تونے جس کو آگ میں ڈالا اس کو تو نے واقعی رسوا کر دیا۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ اے ہمارے رب، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف پکار رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ۔ پس ہم ایمان لائے۔ اے ہمارے رب ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ اے ہمارے رب، تونے جو وعدے اپنے رسولوں کی معرفت ہم سے کئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہم کو رسوائی میں نہ ڈال۔ بے شک تو اپنے وعدہ کے خلاف کرنے والا نہیں (آل عمران ۹۴-۱۹۱)

ہم پر رحم کر

اے میرے رب، مجھ کو نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد کو بھی۔ اے رب، میری دعا قبول کر۔ اے ہمارے رب، مجھ کو اور میرے والدین کو اور تمام ایمان والوں کو اس دن معاف کر دے جب کہ حساب قائم ہوگا (ابراہیم ۴۱-۴۰) اے میرے رب تو میرے والدین پر رحم کر جس طرح انھوں نے مجھے پالا جب کہ میں چھوٹا تھا (بنی اسرائیل ۲۵)

ہم کو فتنہ نہ بنا

اے ہمارے رب، ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہم کو معاف نہ کرے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے (الاعراف ۲۳) اے ہمارے رب، ہمارے اوپر صبر انڈیل دے اور ہم کو اس حال میں دنیا سے اٹھا کہ ہم تیرے فرماں بردار ہوں (الاعراف ۱۲۶) اے رب، تو ہی ہمارا مددگار ہے۔ پس ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو سب سے اچھا بخشنے والا ہے۔ تو ہمارے لئے اس

دنیا میں بھی بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی، ہم نے تیری طرف رجوع کیا (الاعراف ۵۶ - ۱۵۵) اے ہمارے رب، ہمیں ظالم لوگوں کے لئے فتنہ نہ بنا۔ اور اپنی رحمت سے ہم کو منکروں سے نجات دے (یونس ۸۶ - ۸۵) اے زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے، تو ہی میرا رفیق ہے دنیا میں اور آخرت میں۔ میرا خاتمہ اسلام پر کر اور مجھ کو نیکوں کے ساتھ شامل کر دے (یوسف ۱۰۱)

ہمارے کام کو درست کر دے

اے میرے رب، تو مجھ کو جہاں لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے مجھ کو نکال سچائی کے ساتھ نکال، اور اپنی طرف سے ایک قوت کو میرا مددگار بنا دے (بنی اسرائیل ۸۰) اے ہمارے رب، ہمیں اپنے پاس سے رحمت دے اور ہمارے لئے ہمارے کام میں درستی فرما (الکہف ۱۰)

مجھے اکیلا نہ چھوڑ

اے میرے رب، میرا سینہ کھول دے اور میرے کام کو میرے لئے آسان کر دے۔ اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ لیں (طہ ۲۸ - ۲۵) اے میرے رب، مجھے زیادہ علم عطا کر (طہ ۱۱۴) اے رب، مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو سب سے بڑا مہربان ہے (الانبیاء ۸۳) اے میرے رب، مجھے اکیلا نہ چھوڑ دے اور تو سب سے اچھا وارث ہے (الانبیاء ۸۹) اے میرے رب، مجھے برکت والی جگہ میں اتار اور تو سب سے بہتر اتارنے والا ہے (المومنون ۲۹) اے میرے رب، اپنے یہاں جنت میں میرے لئے ایک گھر بنا دے (التحریم ۱۱) اے میرے رب، جو بھلائی تو میرے اوپر اتارے میں اس کا محتاج ہوں (القصص ۲۴) اے میرے رب، مفسد لوگوں کے مقابلہ میں میری مدد کر (العنکبوت ۳۰) اے رب، میں مغلوب ہو گیا، پس تو میرا بدلہ لے لے (القمر ۱۰)

عذاب سے بچا

اے میرے رب، میں تیری پناہ چاہتا ہوں شیطانوں کی اکساہٹ سے۔ اور اے میرے رب، میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ وہ میرے پاس آئیں (المومنون ۹۹ - ۹۸) اے ہمارے رب، ہم ایمان لائے، تو ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے (المومنون ۱۰۹) اے ہمارے رب، جہنم کے عذاب کو ہم سے ہٹا دے، بیشک اس کا عذاب پکڑ لینے والا ہے (الفرقان ۶۵)

۲۹۵